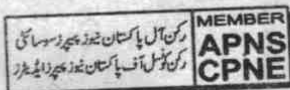
جنوری 2024

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ



MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

واٹس ایپ 03172266944

بیادِ انشاء جی













جنوری 2024
جلد 51 شمارہ 09
قیمت 150 روپے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ——— 1,800 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، یورپ — 25000 روپے
سالانہ خریداری کی ای میل کریں
subscriptions@khawateendigest.com

خط و کتابت کا پتہ
خواتین ڈائجسٹ
37-اردو بازار کراچی

افسانے

نظمیں غزلیں

رنگا رنگ پھول

پکوان

میری بیاض سے

نفسیات

بیوٹی بکس



خواتین ڈائجسٹ جنوری 24 کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔
2024 کا سورج طلوع ہو رہا ہے
جاتے سال کی اداس ساعتوں میں آنے والے وقت کی روشن امیدیں لیے ایک اور نئے سال کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔
قارئین کو نیا سال مبارک
ہماری دعا ہے کہ نیا سال ہم سب کے لیے صحت، خوش حالی، امن اور محبتوں کا سال ہو، مالک ارض و سما ہمیں تمام آفات سے دور رکھے۔ آمین۔
سال گزشتہ پر نظر ڈالیں تو سب سے بڑا سانحہ اسرائیل کی غزہ پر وحشیانہ بمباری تھی جس میں ہزاروں عورتیں، مرد اور بچے شہید ہو چکے ہیں۔ اور تا حال یہ سلسلہ جاری ہے۔
وطن عزیز کا منظر نامہ بھی زیادہ خوش کن نہیں۔ بے یقینی اور مایوسی کے گہرے بادل چھائے رہے۔ مہنگائی میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ البتہ ایک خوش آئند بات ہوئی کہ پاکستان دیوالیہ ہونے سے بچ گیا۔ آنے والے منظر ابھی دھندلے ہیں لیکن امید جوت جلاتی ہے کہ رب کے کرم سے ہم اس بھنور سے نکل آئیں گے۔

انشاجی

انشاجی نے لکھا تھا۔ ہم جنگل کے جوگی ہم کو ایک جگہ آرام کہاں...... نگر نگر پھرنے والے جوگی، چاند کے شیدائی انشاجی اتنی دور نکل گئے کہ ان کو چاہنے والے راہ تکتے رہ گئے۔
انشاجی شاعر بھی تھے مزاح نگار بھی۔ بقول مختار زمن ان کے اشعار میں آہوں کا دھواں ہے۔ عشق کی آگ سلگتی بھڑکتی رہتی ہے۔ درد کی ٹیسیں اٹھتی ہیں۔ بول میٹھے ہیں، غضب کی گھلاوٹ ہے اور یہی انشاجی جب مزاح لکھتے ہیں تو وہ فقرے بازیاں ہیں کہ پڑھنے والے لوٹن کبوتر بن جاتے ہیں۔
احمد ندیم قاسمی نے سچ ہی لکھا ہے
"انشاجی کی جب برسی منائی جاتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم خود زندگی کی برسی منا رہے ہوں۔"
11 جنوری 1978 کو انشاجی دنیا سے رخصت ہوئے لیکن دلوں میں آج بھی زندہ ہیں۔

سانحہ ارتحال

ہم جب دنیا میں آنکھ کھولتے ہیں تو بہت سے رشتے ہم سے وابستہ ہو جاتے ہیں یہ خونی رشتے ہوتے ہیں لیکن کچھ رشتے تعلق، دوستی اور محبت کے ہوتے ہیں۔ ان کے نقوش بہت گہرے ہوتے ہیں۔ انیس الرحمٰن سے ہم سب کا ایسا ہی رشتہ تھا۔
انیس، بہت بااخلاق اور ذمہ داری سے اپنے فرائض نبھانے والے تھے۔ آفس میں بھی کسی سے معمولی سی تکرار بھی نہیں ہوئی۔ وہ سب کے انیس بھائی تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ آفس میں کسی ساتھی کی طبیعت خراب ہوتی تو وہ اس کا کام بھی بڑی خاموشی سے کر دیتے۔ آفس آنے والوں میں پہلا نمبر ان کا ہوتا اور آفس سے جانے والوں میں آخری نمبر۔
انیس کی طبیعت میں جو لحاظ، مروت اور دردمندی تھی، وہ بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔
قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے،اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے،وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کررہے ہیں،وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

دعا کی درخواست کرنے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
''اور اس (بات) کی وصیت ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو کی اور یعقوب نے بھی ''اے بیٹو! بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اس دین کو پسند کیا ہے، پس جب تمہیں موت آئے تو اس حال میں آئے کہ تم مسلمان ہو۔کیا تم اس وقت حاضر تھے جب یعقوب علیہ السلام کو موت آئی، جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے کہا ہم آپ کے اور آپ کے باپ دادا، ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام کے معبود کی عبادت کریں گے جو ایک ہے اور ہم اس کے فرماں بردار ہیں۔''
فائدہ آیات:۔
اس میں موت کے وقت وصیت کرنے کا ذکر ہے جس سے امام نووی رحمتہ اللہ علیہ نے استدلال فرمایا ہے کہ سفر کے وقت بھی وصیت کرنا جائز ہے کیونکہ موت کا تو کوئی وقت مقرر ہی نہیں اور سفر میں موت کا امکان حضر (اقامت) سے زیادہ بہتر ہے، اس لیے سفر کے وقت بھی وصیت کر دینا بہتر ہے۔

کم تر لوگ

حضرت مصعب بن سعد بن ابی وقاص بیان کرتے ہیں کہ (ان کے والد حضرت سعد کو یہ خیال ہوا کہ انہیں اپنے سے کم تر لوگوں پر فضیلت حاصل ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
''تم لوگ تو ان ہی کمزوروں کی وجہ سے مدد کیے اور رزق دیے جاتے ہو۔ (پھر ان سے برتر ہونے کے زعم کا کیا جواز ہے۔)''

فوائد ومسائل

1۔اس میں بہرہ ور طبقات کو نصیحت کی گئی ہے کہ وہ اپنے سے کم تر اور بے وسیلہ لوگوں کو حقیر اور اپنے کو ان سے برتر نہ سمجھیں بلکہ ان کا احترام اور ان سے تعاون کریں۔کیا پتا اللہ تعالیٰ ان ہی کی وجہ سے

تمہیں بھی روزی اور دشمن پر غلبہ عطا فرما رہا ہو۔

حضرت ابو درداعویمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مجھے تم کمزوروں میں تلاش کرو یقیناً تمہاری اپنے ان ضعفاء کی وجہ سے مدد کی جاتی اور تمہیں روزی دی جاتی ہے۔" (اسے ابوداؤد نے عمدہ سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

2۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ کمزور اور غریبوں کے دل دنیا کی خوب صورتی اور جاذبیت سے پاک ہوتے ہیں۔ اس لیے ان میں اخلاص اور انابت الی اللہ کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے ان کی دعائیں بھی بارگاہ الٰہی میں مقبول ہوتی ہیں۔

3۔ اس کو سنن نسائی کی ایک دوسری حدیث میں زیادہ وضاحت سے بیان فرمایا گیا ہے۔ "اللہ تعالیٰ اس امت کی مدد فرماتا ہے۔ اس امت کے کمزور لوگوں کی دعا، نماز اور ان کے اخلاص کی وجہ سے۔"

4۔ ابو داؤد میں ہے۔ "میرے لیے کمزور مسلمان کو تلاش کرو۔" (تاکہ میں ان کی مخلصانہ دعاؤں سے مدد حاصل کروں۔)

دین دار عورت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"عورت سے چار وجوہ کی بنا پر نکاح کیا جاتا ہے اس کے مال کی بنا پر، اس کے خاندانی حسب و نسب کی بنا پر، اس کے حسن و جمال کی بنا پر اور اس کے دین کی بنا پر۔ چنانچہ تو دین دار عورت (سے نکاح کرنے میں کامیابی) حاصل کر، تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں۔" (بخاری و مسلم)

اس کے معنی ہیں کہ لوگ عام طور پر نکاح کرتے وقت ان چار چیزوں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ تیری خواہش یہ ہونی چاہیے کہ دین دار عورت سے نکاح ہو اور اسی کی کوشش بھی ہو اور اس کی رفاقت اختیار کرنے کی خواہش بھی ہو۔

فوائد و مسائل

1۔ ایک دین دار عورت ہی صحیح معنوں میں نیک چلن، شوہر کی اطاعت گزار اور وفادار ہوتی ہے جس سے انسان کی زندگی بھی خوش گوار گزرتی ہے اور آئندہ نسل کی اصلاح و تربیت کے لیے بھی وہ مفید اور موثر ثابت ہوتی ہے جب کہ اس خوبی سے محروم دوسری تین قسم کی عورتیں انسان کے لیے بالعموم زحمت کا اور اولاد کے لیے بھی بگاڑ ہی کا باعث ہوتی ہے، اس لیے عورت کے انتخاب میں دین کو مقدم رکھا جائے۔

2۔ لڑکیوں کے رشتے کرتے وقت بھی اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ لڑکا نیک ہو۔ مال و دولت کے لالچ میں بے دین کو رشتہ دینے کے بہت زیادہ نقصانات ہیں کہ دنیا میں پریشانی کے ساتھ ساتھ اپنی آئندہ نسل کو بھی اپنے ہاتھوں خراب کرتا ہے۔

مومن کو ساتھی بناؤ

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کسی مومن ہی کو ساتھی بناؤ اور تمہارا کھانا صرف پرہیز گار ہی کھائے۔" (ابوداؤد اور ترمذی)

فوائد و مسائل

1۔ اس حدیث میں کفار سے دوستی اور ہم نشینی کی ممانعت اور صرف اہل تقویٰ کے ساتھ دوستانہ اور برادرانہ تعلق قائم کرنے کی تاکید ہے۔

2۔ دعوت میں نیک اور متقی لوگوں کو بلایا جائے اور فی سبیل اللہ خرچ کرتے وقت بھی نیک نمازیوں کو منتخب کرنا چاہیے، البتہ انسانیت کے تقاضے کے مطابق کافروں کو بھی دیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر مسلمان اور کافر دونوں ضرورت مند ہوں تو

مسلمان کو ترجیح دینا ضروری ہے۔

دوست کا دین

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے چنانچہ تمہارا ہر آدمی یہ ضرور دیکھے کہ وہ کس کے ساتھ دوستی کر رہا ہے۔''

(اسے ابو داؤد اور ترمذی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے اور امام ترمذی فرماتے ہیں، یہ حدیث حسن ہے۔)

فائدہ:۔اس میں بھی دین دار لوگوں کے ساتھ ہی دوستی کرنے کی ترغیب اور غیر دین داروں سے بچنے کی تاکید ہے۔ دور حاضر میں کیونکہ عزت اور وقار کے پیمانے بدل گئے ہیں، اس لیے کئی اچھے بھلے لوگ بھی نیک اور دین دار لوگوں کے بجائے بے دین، دنیا پرست لوگوں سے دوستی لگاتے ہیں اور دین داروں سے نہ صرف بے رخی برتتے ہیں بلکہ انہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو کسی بھی اعتبار سے صحیح نہیں۔

محبت

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ اس کی محبت ہوگی۔'' (بخاری و مسلم)

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آدمی کچھ لوگوں سے محبت کرتا ہے، حالانکہ وہ ان سے ملا نہیں (یعنی ان کے ہم رتبہ نہیں)؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''آدمی ان کے ساتھ ہوگا جن سے وہ محبت کرتا ہوگا۔''

فوائد و مسائل:

1۔اس میں اہل خیر و صلاح کے ساتھ محبت رکھنے کی فضیلت کے علاوہ اللہ کے فضل و کرم کا بھی بیان ہے کہ وہ ان سے محبت رکھنے کی وجہ سے ان سے کم مرتبہ لوگوں کو بھی بلند تر درجوں پر فائز کر کے محبوبین کے ساتھ ملا دے گا۔

2۔ اس میں یہ ترغیب ہے کہ برے اور بدکردار لوگوں کے ساتھ خصوصی تعلق اور محبت نہایت خطرناک ہے کہ کہیں انسان کا حشر ان ہی کے ساتھ نہ ہو۔اعاذنا اللہ منہ۔

اللہ کے لیے محبت کی فضیلت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور جو ان کے ساتھ ہیں، وہ کافروں پر سخت اور آپس میں نرم دل ہیں...... آخر سورت تک...... (سورہ فتح۔29)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔''اور (مال فے ان لوگوں کے لیے ہے) جنہوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین) سے پہلے (ایمان لا چکے تھے) وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے۔'' (الحشر۔9)

فائدہ آیات: ان دونوں آیتوں میں اس بات کا اظہار ہے کہ مومنوں کا تعلق آپس میں محبت اور دوستی کا ہونا چاہیے، جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین آپس میں دوستی اور محبت تھی اور یہ دینی محبت صرف اللہ کے لیے تھی، اس سے کوئی دنیوی مفاد اور غرض وابستہ نہیں تھی۔ اہل ایمان کی محبت اسی طرح دنیوی اغراض و مفادات سے بالا ہونی چاہیے۔

ایمان کی لذت

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''تین خصلتیں ایسی ہیں جن میں وہ ہوں گی، وہ ان کی بدولت ایمان کی لذت اور مٹھاس محسوس کرے گا۔ یہ کہ اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اسے ان کے ماسوا ہر چیز (پوری کائنات) سے زیادہ

محبوب ہو۔

اور یہ کہ وہ کسی آدمی سے صرف اللہ کے لیے محبت رکھے۔

اور یہ کہ وہ دوبارہ کفر میں لوٹنے کو، جب کہ اس سے اللہ نے اسے بچالیا، اس طرح برا سمجھے جیسے آگ میں ڈالے جانے کو وہ برا سمجھتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اس میں محض اللہ کے لیے محبت رکھنے کو ان خصائل حمیدہ میں شمار کیا گیا ہے جن کی بدولت انسان کو ایمان کی لذت محسوس ہوتی ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ اس محبت میں دنیوی مفادات کے نشیب و فراز کے ساتھ اتار چڑھاؤ نہیں آتا بلکہ یہ محبت ہر صورت میں قائم اور محبوب کا اکرام و احترام لازماً برقرار رہتا ہے، چاہے فریق ثانی (محبوب) کا رویہ پسندیدہ ہو یا ناپسندیدہ۔

2۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت تو ایمان کی بنیاد ہے اور کائنات کی ہر چیز سے اس محبت کے زیادہ ہونے کا مطلب ہے کہ ان کے احکام و فرامین کی اطاعت اور ان کی رضا مندی، بیوی بچوں، ماں باپ وغیرہ کی خواہشات اور دنیا کے ہر مفاد اور غرض پر بالا ہو اور جب ان دونوں کا ٹکراؤ ہو تو اللہ کی رضا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کو اولیت و اہمیت دی جائے۔

کفر سے کراہت کا مطلب، اللہ کی نافرمانیوں سے اجتناب ہے کہ کہیں ارتکاب معصیت، اللہ کی ناراضی کا سبب نہ بن جائے۔

سات قسم کے لوگ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"سات (قسم کے) آدمی ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس (قیامت کے) دن جب کہ اس کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا، اپنے (عرش کے) سائے میں جگہ دے گا۔

1۔ انصاف کرنے والا حکمران۔

2۔ وہ نوجوان جو اللہ عزوجل کی عبادت میں پروان چڑھے۔

3۔ وہ آدمی جس کا دل مسجد کے ساتھ اٹکا ہوا ہو (مسجد کی خاص محبت اس کے دل میں ہو۔ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار میں مسجد کے لیے بے قرار ہو)

4۔ وہ دو آدمی جو ایک دوسرے سے صرف اللہ کے لیے محبت کرتے ہیں۔ اسی پر وہ باہم جمع ہوتے اور اسی پر ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔

5۔ وہ آدمی جسے کوئی حسین و جمیل عورت دعوت گناہ دے لیکن وہ اس کے جواب میں کہے "میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں۔"

6۔ وہ آدمی جس نے کوئی صدقہ کیا اور اسے چھپایا حتیٰ کہ اس کے بائیں ہاتھ کو علم نہیں کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔

7۔ وہ آدمی جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور (اس کے خوف سے) اس کی آنکھیں بہہ پڑیں۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اس روایت میں سات افراد بیان کیے گئے ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ قیامت والے دن اپنے عرش کا سایہ عطا فرمائے گا۔ بعض اور روایت میں ان مذکورہ اعمال کے علاوہ بھی کچھ اور عملوں پر اسی مقام خاص کی نوید بیان کی گئی ہے۔ بعض علماء نے ان اعمال کی تعداد ستر تک بیان کی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعمال مختلف احوال اور اوقات میں بیان فرمائے ہیں، اس لیے ان میں کوئی منافات نہیں ہے۔

2۔ جو شخص گناہ پر قدرت کے باوجود اسے ترک کر دیتا ہے تو اس کا ترک کرنا بھی اس کی نیکی شمار ہوگی اور یہ اتنی بڑی نیکی ہے کہ اس نیکی کا واسطہ دے کر کی گئی

دعا سے غار کے دروازے سے پتھر بھی سرک گیا تھا۔

جنت میں داخلہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''میں نے ایک آدمی کو جنت میں چلتے پھرتے دیکھا، اس نے اس درخت کو کاٹ دیا تھا جو راستے کے درمیان میں تھا اور مسلمان کو تکلیف دیتا تھا۔'' (مسلم)

کانٹے دار شاخ

بخاری و مسلم کی ایک روایت میں ہے ''ایک دفعہ ایک آدمی راستے پر چل رہا تھا، اس نے راستے پر ایک کانٹے دار شاخ دیکھی، اس نے اسے پیچھے کر دیا۔ اللہ نے اس کے اس عمل کی قدر فرمائی اور اس کو بخش دیا۔''

فوائد و مسائل:

1۔ لوگوں کو تکلیف اور نقصان سے بچانا اللہ کو بہت پسند ہے حتیٰ کہ راستوں سے تکلیف دہ چیزوں کو ہٹا دینا بھی اللہ کو بڑا محبوب ہے۔ اسی طرح اس کے برعکس راستوں کو تنگ یا بند کر دینا، جس سے لوگوں کو تکلیف ہو، جیسے شادی بیاہ کے موقعوں پر لوگ نہایت دیدہ دلیری سے ایسی مذموم حرکتیں کرتے ہیں یا بعض دکان دار اور اہل مکان تجاوزات کھڑی کر کے لوگوں کو ایذا پہنچاتے ہیں، یہ کام اللہ کی ناراضی اور اس کے غضب کا باعث ہیں۔

2۔ نیکی کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے، خواہ ظاہری طور پر وہ معمولی ہی کیوں نہ ہو۔

مسجد جانا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جو شخص صبح کو یا شام کو مسجد کی طرف جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں، جب بھی وہ صبح یا شام کو مسجد کی طرف جاتا ہے، مہمانی تیار کرتا ہے۔'' (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اس میں مسجد میں جانے اور نماز باجماعت پڑھنے کی ترغیب ہے۔

2۔ بادشاہ اگر کسی کی دعوت کرے تو اسے قبول کرنے کی وہ ہر ممکن کوشش کرے گا کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے، اس کی مہمانی کو اگر ہم ٹھکرائیں گے تو اس سے بڑی بدبختی کیا ہے اور نماز باجماعت ادا نہ کرنا، اس دعوت کو ٹھکرانے کے مترادف ہے۔

تحفہ کی اہمیت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اے مسلمانوں کی عورتو! کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن (کے ہدیے) کو حقیر نہ سمجھے، اگرچہ وہ بکری کا کھر ہی ہو۔'' (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ کسی کے ہدیے کو حقیر نہ سمجھا جائے کیونکہ وہ اخلاص سے بھیجا گیا ہوگا تو تھوڑا ہونے کے باوجود، وہ عنداللہ بڑا ہوگا۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے لیے ہدیہ بھیجنے کو حقیر نہ سمجھے، خواہ بکری کا کھر ہی ہو، یعنی اس کے ہدیہ بھیجنے کو بھی معمولی خیال نہ کرے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ہدیے کی قیمت کو نہ دیکھیے بلکہ دینے والے کے جذبات اور دل پر نگاہ رکھیے۔

حیا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''ایمان کی ستر یا ساٹھ سے کچھ اوپر شاخیں ہیں۔ ان میں سب سے افضل، لا الہ الا اللہ کہنا ہے اور سب سے ادنیٰ، راستے سے تکلیف دہ چیز (پتھر، کانٹے وغیرہ) کا ہٹانا ہے اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔'' (بخاری و مسلم)

☆☆

یادیں ۔ باتیں

اے حمید

اے حمید انشاجی کے گہرے دوست تھے۔ یہ تعلق دوستی کا تھا۔ یہ رشتہ محبت کا تھا۔ دونوں نے بہت وقت ساتھ بتایا۔ ہوٹلوں میں سرِشام محفلیں جمتیں۔ دونوں ساتھ گھومتے۔ اے حمید نے انشاجی کے ساتھ گزارا وقت اس کتاب میں سمیٹا ہے اس کتاب کے بارے میں اے حمید نے لکھا۔

"اس کتاب میں آپ کو رنگ بھی نظر آئیں گے۔ خوشبوئیں بھی محسوس ہوں گی شکلیں بھی نظر آئیں گی، آوازیں بھی اپنی طرف بلائیں گی، کبھی شکل خوشبو دے گی۔ کبھی خوشبو سے آواز آئے گی۔ کبھی آواز شکل بن کر سامنے آئے گی اور کبھی آواز گلاب کی خوشبو میں ڈھلتی محسوس ہوگی۔ جیسے جیسے یہ منظر میں دیکھتا گیا ہوں ویسے ویسے انہیں لکھتا چلا گیا ہوں۔ یہ بکھری یادوں کے رنگ ہیں، چہرے ہیں، خوشبوئیں ہیں، آوازیں ہیں، میں چاہتا ہوں آپ بھی انہیں ان کے قدرتی موڈ میں دیکھیں۔ محسوس کریں اور ان کی سرگوشیاں سنیں، پھول مرجھا جاتا ہے مگر اس کی خوشبو کبھی نہیں مرجھاتی، وہ اپنے پھول کی یاد بن کر یادوں کے گلدان میں ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔"

انشاجی دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اے حمید بھی اب دنیا میں نہیں لیکن ان دونوں کی تحریروں کی خوشبو آج بھی تازہ ہے۔

درج ذیل اقتباس اے حمید کی کتاب (یادیں، باتیں، بہار خزاں) سے لیا گیا ہے۔

نظم سنانے کے بعد ابن انشاء نے جیب سے رومال نکال کر اپنے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھا اور عینک کے شیشے صاف کرنے لگا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ دن کافی گرم تھا اور ہوا بند تھی۔ املتاس کے زرد فانوس اپنی شاخوں پر ساکن تھے۔ دھوپ کی چمک سے درخت کی چھاؤں میں زرد غبار شیشے کی طرح روشن تھا۔ جیسے درختوں کی شاخوں سے لٹکتے سارے زرد فانوس جگمگا اٹھے ہوں۔ مئی کا دن آہستہ آہستہ گرم ہو رہا تھا۔ دھوپ کی دھیمی دھیمی تپش اور پھولوں کی زرد روشنی کا چمکتا گرم غبار مجھے ابن انشاء کی نظم کا ایک حصہ معلوم ہونے لگا تھا۔

"کہیں سے ٹھنڈا پانی پیا جائے۔" ابن انشاء نے کہا۔

ہم درختوں کی چھاؤں میں چلتے اوپن ایئر کیفے میں آ کر سائے میں بیٹھ گئے ہم نے ٹھنڈا پانی پیا۔ پھر چائے آ گئی۔ اور ہم خدا جانے کس موضوع پر باتیں کرنے لگے۔ کبھی ہنستے، کبھی مسکراتے..... ہمیں ہنستا مسکراتا دیکھ کر سنبل کے گھنے پیڑ پر سرخ پھولوں کے پاس بیٹھی ایک بلبل ہمیں گردن ٹیڑھی کر کے دیکھ رہی تھی۔ بلبلیں سنبل کے گھنے پیڑوں پر اب بھی بیٹھتی ہیں۔

لارنس باغ کی جنوبی گراؤنڈ میں املتاس کا درخت ویسے ہی کھڑا ہے۔ مئی جون کے دنوں میں اس کی ٹہنیوں پر زرد پھولوں کے چینی فانوس آج بھی کھلتے ہیں اور ہوا کے ہلکے سے جھونکے کے ساتھ جھولنے لگتے ہیں۔ اوپن ایئر کیفے میں چائے کی گرم گرم خوشبو آج بھی شام کی ہوا کے ساتھ اڑتی ہے اور املتاس کی چھاؤں میں روشن دھوپ میں زرد مہکتا غبار

چمکتا ہے۔

لیکن وہ جیب سے کاغذ کا پرزہ نکال کر دھیمے لہجے میں نظمیں سنانے والا، رومال سے اپنی عینک کے شیشے صاف کرنے والا اور سنبل پر بیٹھی بلبل کو دیکھ کر خوش ہونے والا ابن انشاء نظر نہیں آتا۔ میں اکیلا لارنس باغ کی جنوبی گراؤنڈ کی طرف نہیں جاتا۔ املتاس کے زرد پھولوں نے مجھ سے پوچھا کہ ابن انشاء کہاں ہے تو میں کیا جواب دوں گا؟ میں پھر اوپن ایئر کیفے نہیں گیا۔ مجھے یقین ہے سنبل کی شاخ پر بیٹھی سرخ چونچ والی بلبل مجھ سے ضرور پوچھے گی کہ وہ شرما شرما کر نظمیں سنانے والا جو تمہارے ساتھ آیا کرتا تھا، کہاں چلا گیا؟ تو پھر میں اسے کیا جواب دوں گا؟ ہمیں تو یقین آگیا ہے کہ ابن انشاء ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہے، لیکن شاید بلبل کو یقین نہ آئے۔ اور وہ بار بار مجھ سے پوچھتی رہے۔

وہ کہاں چلا گیا؟ وہ کہاں چلا گیا؟

”سویرا، رسالے کا دفتر میکلوڈ روڈ سے اٹھ کر لوہاری دروازے آگیا۔ دفتر کے پیچھے ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جہاں بیٹھ کر سعادت حسن منٹو آتش تر سے شغل کیا کرتے تھے۔ ایک روز منٹو صاحب کے ساتھ ظہیر کاشمیری بھی بیٹھے تھے۔ ظہیر کاشمیری نے کہا، ٹھمری میں زیادہ اچھی گاتا ہوں۔ منٹو صاحب نے کہا۔

”اوئے تمہیں کیا معلوم ٹھمری کیا ہوتی ہے۔“

ابن انشاء نے کہا۔

”اس کا فیصلہ تو اسی طرح ہو سکتا ہے کہ آپ دونوں حضرات ایک ایک ٹھمری گائیں۔“ منٹو صاحب نے سنہری عینک کے پیچھے سے اپنی موٹی موٹی آنکھیں جھکا کر کہا۔

”جو ٹھمری ظہیر کاشمیری گائے گا، وہی میں گا کر سناؤں گا۔“

ظہیر کاشمیری نے ٹھمری گانی شروع کی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ٹھمری کے بول تھے۔

سیاں نے انگلی مروری رے
رام قسم میں سرما گئی

خدا جانے یہ ٹھمری تھی کہ کیا تھا۔ بہر حال کاشمیری لہک لہک کر بس گائے جا رہا تھا۔ ابن انشاء نے کاغذ قلم لے لیا تھا اور اس پر کچھ لکھتا جا رہا تھا۔ منٹو صاحب آنکھیں لال کیے ظہیر کاشمیری کو دیکھ رہے تھے اور بار بار ناک سکیڑ کر ناپسندیدگی کا اظہار کر رہے تھے ایک جگہ انہوں نے ہاتھ لہرا کر نعرہ لگایا۔

”یہ بے سرا ہو رہا ہے۔“

ابن انشاء نے کہا۔

”میں نے نوٹ کر لیا۔ فکر نہ کریں۔“

ظہیر کاشمیری چیخ کر بولا۔

”میں نے ممتاز بیگم اور بھائی لال کو ٹھمری گاتے سنا ہے۔ میں کیسے بے سرا ہو سکتا ہوں؟“

ابن انشا کہنے لگا۔

”بھئی آپ لوگوں نے مجھے جج مقرر کیا ہے تو فیصلہ بھی میرے اوپر چھوڑیں۔“

ہاں منٹو صاحب۔ اب آپ کی باری ہے۔“

اب منٹو صاحب نے اپنی پتلی سی کمزور آواز میں وہی ٹھمری گانی شروع کی۔ وہ کلاونتوں کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر گا رہے تھے اور جب سم پر آتے تو زور سے اپنے گھٹنے پر ہاتھ مارتے۔ ایک بار انہوں نے بے خیالی سے ابن انشاء کے گھٹنے پر ہاتھ مار دیا۔ ابن انشاء اچھل کر میرے قریب ہو گیا۔ ٹھمری ختم ہو گئی۔ منٹو صاحب اپنی سرخ آنکھوں سے ابن انشاء کو دیکھتے ہوئے بولے۔

”بتاؤ کون سر میں تھا؟“

ابن انشاء نے اپنے لکھے ہوئے کاغذ کو گردن گھما پھرا کر دو تین بار غور سے پڑھا۔ پھر اسے تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

”میں فیصلہ محفوظ رکھتا ہوں۔“

دونوں گویے خالی بوتلیں اٹھا کر اس کی طرف لپکے۔ میں اور ابن انشاء دوسرے دروازے سے بھاگ کر گلی میں آگئے۔ ہنس ہنس کر ہمارا برا حال ہو رہا تھا۔

☆☆

نیا سال - امید کی کرن

ادارہ

بھاگتے دوڑتے وقت نے ایک اور سال کی مسافت طے کرلی ہے۔ وقت تو اپنی مخصوص رفتار سے گامزن ہے لیکن نہ جانے کیوں ایسا لگتا ہے جسے سال ہوا کی مانند گزر رہے ہوں۔

حالات خواہ کچھ بھی ہوں، اچھے ہوں یا برے، آنے والے کل کے لیے ہمارے دلوں میں خواہشوں اور آرزوؤں کا ایک جہاں آباد رہتا ہے۔ امید کی ایک کرن جھلملاتی رہتی ہے۔

نئے سال کے آغاز پر ہم نے قارئین سے سروے کیا ہے۔ سوالات یہ ہیں۔

1۔ گلزار کی ایک چھوٹی سی نظم ہے۔

دل درد کا ٹکڑا ہے، پتھر کی ڈلی سی ہے
ایک اندھا کنواں ہے یا، ایک بند گلی سی ہے
ایک چھوٹا سا لمحہ ہے، جو ختم نہیں ہوتا
میں لاکھ جلاتا ہوں، یہ بھسم نہیں ہوتا

ایسا کوئی لمحہ آپ کی زندگی میں ہے جو بھلائے، نہیں بھولتا۔ کوئی ایسا دکھ، پشیمانی یا کوئی ایسی بات جو آپ نے کسی کو کہہ دی یا کسی نے آپ کو کہی۔

2۔ کچھ سودے بظاہر خسارے کے نظر آتے ہیں۔ ایسے بے لوث کام جن سے کوئی مادی فائدہ نہیں ہوتا لیکن ایک روحانی سکون کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ آپ کے ساتھ ایسا کوئی واقعہ پیش آیا؟

3۔ ثمرہ بخاری کے افسانوں میں سفر کا ذکر بہت ہوتا ہے۔ ہماری اکثر قارئین کا میکہ اور سسرال الگ الگ شہروں میں ہوتا ہے کچھ قارئین کے رشتہ دار دوسرے شہروں میں بستے ہیں۔ اس لیے انہیں سفر کے مواقع ملتے رہتے ہیں۔ اپنے کسی دلچسپ سفر کا احوال لکھیے۔

صدف ناصر ...... گوجرانوالہ

میاں کے ننھیال والے لاہور ہوتے ہیں۔ ہر ماہ ہی ہم سب کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ''ساس'' کی بھانجی کی شادی تھی۔ ہم گوجرانوالہ سے لاہور دو بائیک پر سر سے پاؤں تک تیار شیار روانہ ہوئے۔ کامونکی تک پہنچے تھیں کہ ''ہیلمٹ'' نہ ہونے کی وجہ سے چالان ہو گئے ہمارے۔ (پانچ پانچ سو) ساس صاحبہ نے وارڈن آفیسر سے کہہ دیا۔

''بھائی ہم جلدی میں نکلے ہیں۔'' ہماری فوتگی ہوگئی ہے۔ (ہاہاہا)

وارڈن آفیسر نے ہمیں سرتا پاؤں گھور گھور کر دیکھا اور کہا۔

''اتنی تیاری فوتگی کے لیے کی ہے۔''

ساتھ ہی ساس صاحبہ کا موبائل بج اٹھا۔ اور ان کی ہر عورت والی عادت کہ اسپیکر آن کر کے ہی کال سنتی ہے۔

کال اٹینڈ کی ''خالہ ساس پورے والیوم ساتھ بولیں۔''

''باجی کتھے رہ گئے او، بارات دے آن وچ



تھوڑا ہی ٹائم رہ گیا ہے۔"

بس جی! سر عام بھانڈا پھوٹا، وارڈن کا غصے اور ہم ینگ پارٹی کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔ چالان فیسیں بھریں، ساس کی گالیاں کھائیں، کہتیں۔

"میں تہاڈے پیسے بچان واسطے، جھوٹ بولیا، تسی ہنس ہنس کے دوہرے ہندے پیے ہو۔"

بندہ پوچھے جھوٹ بولنے سے پہلے ہم سب کے حلیے تو ملاحظہ فرماتیں۔

مہوش چدھر + فائقہ چدھر ......لودھراں

پنڈی بھٹیاں

1۔ یہ ایک ایسا لمحہ ہے جو مجھے زندگی میں نہ کبھی بھولا ہے نہ کبھی بھولے گا۔

تیرہ دسمبر کا دن تھا۔ میرے ماموں فجر کے وقت ان کی وفات ہوئی۔ بہت دکھ ہوا سارا دن روتے ہوئے گزرا۔ دو بجے ان کا جنازہ ہوا تھا۔ میرے ماموں ڈیرے دار تھے۔ اور مہمان بے شمار تھے، کام والی تقریباً پچیس تھیں اور ہم سب کزنز بھی مہمانوں کو کھانا کھلا رہے تھے پھر بھی ہم ان کے ساتھ پورے نہیں آ رہے تھے۔

کھانے کے فوراً بعد چائے سروے کر رہی تھی ایک عورت کے دوپٹے پہ چائے گر گئی، اس نے میری اتنی انسلٹ کی۔ میں بتا نہیں سکتی۔ سارے مہمانوں کے سامنے میں تو رونے والی ہو گئی، وہ کہے گی۔ اتنی بڑی ہو گئی ہو۔ تمہیں چائے پلانی بھی نہیں آتی اور پتا نہیں کہ اس نے کیا کیا بولا میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔

یہ وہ دن ہے جو میں بھلائے بھی بھول نہیں سکتی۔

2۔ یہ ایک ایسا بے لوث کام ہے، جس نے مجھے کوئی فائدہ تو نہیں دیا لیکن سکون بہت آیا ہے۔ ہمارے ہمسائیوں کا ایک لڑکا ہے جس کی تقریباً عمر 36 سال ہو گئی ہے وہ معذور ہے چل سکتا ہے اس کی ماں اسے کھانا نہیں کھانے دیتی جب بھی کھانا کھانے لگے جوتا پکڑ کے اس کی پٹائی کر دیتی ہے وہ بے چارہ بھوکا پیاسا روتا رہتا ہے، کیا ایسی بھی مائیں ہوتی ہیں۔ میں رات کا کھانا خود دے کر آتی ہوں۔ جلدی واپس آ جاؤں تو اس کی ماں خود کھا لیتی ہے تو میں کھانا دینے جاتی ہوں تو رک جاتی ہوں جب کھا لے تو واپس آتی ہوں تو، اس کام میں مجھے فائدہ کوئی نہیں لیکن دل کو سکون بہت ملتا ہے۔

(مہوش! یہ کام کبھی چھوڑیے گا نہیں، بہت نیکی کا کام ہے کسی بھوکے کو کھانا کھلانا اللہ تعالیٰ آپ کو دو جہاں میں اس کا اجر دے۔ آمین۔)

3۔ الحمدللہ ابھی تو میں ان میریڈ ہوں ویسے میری سترہ دسمبر کو شادی ہے، ابھی میکے سسرال کا تو پتا نہیں تو آتے ہیں سفر کی طرف ہمارے رشتہ دار کی شادی تھی فیصل آباد تو ہم سب کزنز مل کر گئی تھیں۔

ہمارے گاؤں سے لے کر تین گھنٹے کا سفر فیصل آباد تک تھا تو بہت انجوائے کیا پہلی دفعہ ہم لوکل بس میں گئی تھیں میں اور میری بہنیں اور ماموں زاد، چاچو زاد اور بھابھی اور ساتھ میں ایک پھوپھو بھی اور بھائی لوگوں میں کوئی نہیں تھا اتنا مزہ آیا تھا کہ میں بتا نہیں سکتی۔

زرینہ خانم لغاری......مظفر گڑھ

1۔ ''کئی ایسی باتیں ہوتی ہیں جو ہماری پشیمانی کا باعث بنتی ہیں بعض دفعہ کسی کا کہا ہوا بول دل چیر دیتا ہے ہماری تائی اماں تھیں، ان کی اولاد نہیں تھی ایک دفعہ میری بھانجی کو دیکھ کر انہوں نے کہا دیکھو کیسی پیانولی سی ہے۔'' مجھے تو جد جان سے بھی پیاری لگتی تھی جھٹ بدتمیزی سے تائی اماں کو کہا۔

''تم ایسی ہی بچی پیدا کر لیتیں۔ اپنے تو ہیں ہی نہیں'' یہ سن کر تائی اماں گم صم ہو گئیں۔ آج تک اپنی بات کی مجھے پشیمانی ہے۔

مجھے اللہ تعالیٰ نے بے اولاد رکھا، بعض دفعہ سوچتی ہوں شاید یہ تائی اماں کے دل دکھانے کی سزا ہے اب بعض دفعہ لوگ مجھے کہہ دیتے ہیں آپ کے بچے ہوں تو آپ کو پتا چلے یہ جملہ میرا دل چیر دیتا ہے۔

2۔ قریبی ملنے والا ایک بھائی بنا ہوا ہے کئی دفعہ مجھ سے ادھار لے جاتا ہے، کبھی پندرہ سو کبھی دو ہزار کبھی واپس کرتا ہے اور کبھی واپس کرنا بھول جاتا ہے مزدور آدمی ہے گزر بسر مشکل سے ہوتا ہے رقم واپس نہ بھی کرے تو دل کو روحانی سکون ہوتا ہے کہ ہم کسی غریب کے کام آئے۔ دو ایک بچیوں کے رشتے کروائے ہیں۔ مجھے کوئی مفاد نہیں تھا بچیاں اپنے گھروں میں خوش وخرم زندگی گزار رہی ہیں دل کو بہت خوشی ہوتی ہے۔

3۔ سفر تو زندگی میں بہت کیے میرے والد صاحب کی ملازمت تھی اور آئے روز ان کے تبادلے ہوتے رہتے تھے ہم سرگودھا بہاول پور، راولپنڈی، جہلم، لاہور میں رہائش پذیر رہے۔ نئے نئے شہر دیکھے، ایک دفعہ ملتان سے راولپنڈی کا سفر تھا۔ لیہ اسٹیشن پر گاڑی رکی دو نوجوان لڑکے ڈبے میں داخل ہوئے ایک بریف کیس ان کے ہاتھ میں تھا انہوں نے آ کر برتھ کے اوپر رکھ دیا تھوڑی دیر کے بعد دوبارہ آئے اور بولے۔

''اس ڈبے میں جگہ نہیں ہے دوسرے میں جلتے ہیں۔'' پھر برتھ سے دو اٹیچی کیس اٹھا کر چلے گئے ٹرین چل پڑی تو تھوڑی دیر بعد ایک صاحب آئے بولے میرا اٹیچی کیس غائب ہے۔ دوسرے صاحب کا بریف کیس نہیں تھا۔

سب نے کہا کہ ''ابھی دو لڑکے اٹیچی کیس اور بریف کیس لے کر گئے ہیں۔'' ایک لاوارث بریف کیس پڑا تھا اسے جب کھولا تو وہ خالی تھا۔

وہ لڑکے خالی بریف کیس رکھ کر بھرے ہوئے لے کر چمپت ہو گئے تھے۔

عروج عباس......کراچی

1۔ وہ لمحہ میری زندگی میں 2018ء میں آیا، جب میرے ابو کو پہلا مائنر سا فالج کا اٹیک ہوا بظاہر تو وہ صحت یاب ہو گئے لیکن ان کے دماغ پر اثر باقی رہا۔ وہ باپ جو میرے لاڈ اٹھاتے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا، وہ جو کبھی کوئی زخم دیکھنے کے لیے بھی اپنے پیروں کو مجھے ہاتھ نہ لگانے دیتے تھے اور اس دن میں ان کے پیر پکڑ کے بیٹھی کہ اب کچھ بولیں گے، ڈانٹیں گے لیکن وہ ہوش وحواس میں نہ تھے ورنہ بہت سرزنش کرتے۔

2۔ دوسرا سوال روحانی سکون کے حوالے سے تو سب بہنوں سے اپنے تدریسی تجربہ کی ایک نہایت دلچسپ یاد بتاتی ہوں جس کی وجہ سے مجھے میرے شاگرد روحانی مما کہنے لگے اور یہ لفظ جب وہ اتنی محبت سے ادا کرتے، مجھے بہت روحانی خوشی حاصل ہوتی، یوں تو میں بی اے تک پڑھاتی ہوں لیکن چھوٹے بچوں کو پڑھانا ان کے ساتھ انجوائے کرنا نہ





صرف میرا شوق بلکہ ایک کتھارسس بھی تھی۔

میرا ایک نیا شاگرد جو بمشکل تین سال کا تھا۔ اس کے پہلے دن اس کی مما چھوڑ کے جانے لگی تو ہر بچے کی طرح اس نے بھی رونا شروع کر دیا، بہت ترلے منتوں سے، بہت سے وعدے کر کے اور چیزیں دے کے وہ اسے چھوڑ کے چلی گئی، وہ گیٹ سے باہر نکلی بچے نے رونا شروع کر دیا، میں نے اسے اٹھایا، پانی پلایا اور اسے کہا۔

"میں بھی آپ کی مما ہوں۔" وہ چونکا اور کنفیوژن کا شکار ہوا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کی روحانی مما ہوں۔" اس نے میرے پیچھے دہرایا۔

"روحانی مما!"

میں نے کہا "جی بیٹا۔" بس پھر وہ آہستہ آہستہ مانوس ہوتا گیا اور اکثر لاڈ میں مجھے روحانی مما کہتا پھر اس کے دیکھا دیکھی دوسرے بچے بھی روحانی مما کہنا شروع ہو گئے۔ ویسے ٹیوشن کے سب بچے اس سے پہلے آپی کہتے تھے۔

3۔ تیسرے سوال کا جواب پھر ماضی میں لے جائے گا اور گاؤں کے سفر اور یادگار باتوں پہ تو پورا ایک سفرنامہ لکھا جا سکتا اس لیے ماضی کی کتاب کو بند کرتے ہیں اور آپ کی خدمت میں اپنا ایک شعر عرض کرتی ہوں۔

ہم ٹھہرے رہے اور آس پاس سب سفر میں ہے
ہم کو تلاش اک ہمسفر کی اس سفر میں ہے

صائمہ گل ...... مردان

1۔ پہلا سوال تھوڑا تلخ سا ہے دکھ اور پشیمانی کا تاثر لیے جبکہ میں نئے سال کی ابتدا ہنستے مسکراتے ہوئے کرنے کی حامی ہوں۔ اس لیے پہلا سوال اسکپ کر رہی ہوں۔

2۔ تو جناب اس کا تعلق ایک لوہے کی باسکٹ نما ٹوکری سے ہے جو میری ساس جن کی عمر ماشاء اللہ 89 سال ہے، ان کی ماں کی نشانی ہے۔ یہ ٹوکری باہر صحن میں کپڑے پھیلانے والے تار سے ٹنگی ہوتی تھی، گرمیوں میں رات کو اس میں دودھ گوشت یا سالن وغیرہ رکھا جاتا تھا۔ وقت بدلا۔ بجلی والا فریج آیا اب اس کی ضرورت نہ رہی...... میرے میاں نے کہا "اسے کاٹھ کباڑ میں ڈال دو......" بے بے چپ سی ہو گئی۔

ایک عورت ہی عورت کے احساسات سمجھ سکتی ہے اور پھر وہ جو "میکے" سے متعلق ہو۔ تو چاہے ماں بیٹی ہو یا ساس بہو، دکھ سکھ ہو یا کسی چیز سے اٹیچمنٹ سب سانجھا ہو جاتا ہے۔

میں نے ٹوکری اٹھائی۔ بچے کو پچاس روپے پکڑا کر دکان سے ٹیپ اور پنک ربن منگوائی۔ ربن سے پوری ٹوکری کور کی، اپنے جہیز کے گلدستوں سے پھول نکال کر نیا گلدستہ تیار کیا۔

برآمدے کی چھت پر کیل ٹھونک کر فانوس کی طرح آویزاں کیا۔ لیجیے جی سارا برآمدہ ہی مسکرا اٹھا۔ بے بے بھی خوش، بچے بھی خوش اور ہم تو ہیں ہی سب کی خوشی میں خوش رہنے والے بندے۔

3۔ کافی دلچسپ اور مزے کا ہے۔ تو انتظار کس بات کا چلیے تھوڑا پیچھے چلتے ہیں، اگست میں جب میاں صاحب کزنز کے ساتھ چترال اور شندور کا پانچ روزہ ٹرپ لگا کر آئے تو بچوں نے شور مچا دیا، اب ہمیں بھی گھمانے لے جائیں چنانچہ 18 اگست سہ پہر چار میاں صاحب کا کہنا تھا جی ٹی سے جایا جائے۔ جی ٹی روڈ سے کلڈنہ آرمی ریسٹ ہاؤس قریب پڑتا ہے۔ (ہمارا قیام آرمی ریسٹ ہاؤس میں تھا۔ میاں صاحب پاک آرمی سے وابستہ ہیں۔

چنانچہ جی ٹی روڈ پر فیصلہ ہو گیا ہے جیسے ہی مری کی اونچی لہراتی بل کھاتی چڑھائیاں شروع ہوئیں، میری اوئی اماں وائی اماں شروع ہوگئی۔ سارے چھوٹے بڑے گناہ یاد آنے لگے۔ سامنے سے جیسے ہی کوئی تیز رفتار کوچ یا ٹرک آتا آنکھیں بند کر کے استغفار کا ورد کرنے لگتی۔

"یا اللہ بس کسی طرح خیریت سے پہنچا دے میں پھر کبھی ساجدہ آپی کو تنگ نہیں کروں گی۔"

ساجدہ آپی جو مجھ سے ڈھائی سال بڑی ہیں کبھی کہتی ہوں رات کو خواب میں تم کفن میں لپٹی نظر آئیں، کبھی کہتی ہوں تمہارا سوئم تھا کبھی عامر بھائی "ساجدہ آپی کے شوہر" ان کی دوسری شادی ہو رہی ہوتی ہے) اور وہ صدقوں پہ صدقے دیے جاتی ہیں۔ خیر سکون کا سانس لیا جب بڑے بڑے سارے گیٹ پر ویلکم ٹو کلڈنہ آرمی ریسٹ ہاؤس پر نظر پڑی۔ تو خدا کا شکر ادا کیا۔

ابھی ہنسی مذاق میں ایوبیہ پہنچے بادلوں میں گھرا ایوبیہ کافی اونچائی پر ہے۔ چیئر لفٹ سیاسی ایشوز کی بنا پر بند تھی۔ بچوں کے منہ لٹک گئے۔ ان کو آئس کریم کھلا کر خوش کیا۔ مرد حضرات نے کوکنگ کی ذمہ داری نبھائی اور ہم خواتین نے خوب ریلکس ہو کر سسرال نامے پر تبادلہ خیال کیا۔ ہی ہی ہی۔

عصر کے ٹائم ایوبیہ سے واپسی ہوئی تھوڑا ریسٹ کیا، چائے کا دور چلا، مغرب کے بعد مال روڈ کے لیے نکل پڑے۔ کافی رش تھا گاڑیاں رینگ رینگ کر چل رہی تھیں۔

ونڈو شاپنگ کرتے آئس کریم کھائی برگر اڑائے رات ڈھائی بجے ہماری واپسی ہوئی تھکن سے برا حال تھا۔ کھانے کی طلب باقی نہ رہی تھی۔ عشاء پڑھ کر لیٹے اور ایک دو تین گڑیاں گنتے گنتے سو گئے۔

دوسرے دن واپسی تھی۔ میری اوئی اماں وائی اماں کو مدنظر رکھتے ہوئے واپسی کا سفر ایکسپریس وے سے طے ہوا۔

اسلام آباد پہنچے تو ہم خواتین شاپنگ مال دیکھ کر للچا گئیں میاں صاحب بولے۔

"پہلے لنچ کر لیں پھر آرام سے شاپنگ کر لینا ہم نے کہا صرف ونڈو شاپنگ ہی کرنی ہے۔ دس پندرہ منٹ ہی لگیں گے۔ سوا دو گھنٹے بعد دونوں ہاتھوں میں تین تین چار چار بیگز اٹھائے کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ باہر آئے تو سب کا بھوک سے برا حال تھا۔ جبکہ مرد حضرات کا غصے سے...... خیر جی ہم نے پیسے ایسے ہی تو خرچ نہیں کیے تھے۔ ان کے اور بچوں کے لیے چند چیزیں اور سسرال والوں کے لیے چند ایک تحائف ہی لیے تھے لیکن مرد حضرات کہاں ان باریکیوں کو سمجھ سکتے ہیں خیر وہاں قریبی ہوٹل سے لنچ کیا اور مسکراتے ہوئے اسلام آباد کو گڈ بائے کہہ کر واپسی کی راہ لی۔

ریحانہ چوہدری...... مدو کے اندھیریا گڑیاں

1۔ عمر گزری تو یہ خیال آیا
کتنے دکھ تھے کہاں سنبھال آیا
پہلے تو ٹھیک ہی گزر رہی تھی
جب عروج آیا، تب زوال آیا

سوال دیکھا تو عمر رفتہ کے گوشواروں پہ نظر دوڑائی رونگٹے کھڑے ہو گئے، پشیمانی سی پشیمانی تھی





جس سے سامنا ہوا۔

کون سا دکھ ہے جو کہا جائے؟
ذکر کس پشیمانی کا کیا جائے؟
دکھ تو اک قیمتی اثاثہ ہیں!
کیوں ان کا تذکرہ کیا جائے؟

اور پھر بھلا کسی کو ہمارے دکھوں سے کیا دلچسپی؟ ہاں مگر ایک تازہ تازہ دکھ ہے اور شکایت بھی اور وہ بھی کسی اور سے نہیں بلکہ آپ ہی لوگوں سے۔ آپ نے میری نظم دسمبر کے شمارے میں شائع تو کی مگر شروع سے آدھی حذف کر دی۔ پڑھ کے خوشی تو کیا ہوتی؟ دل کو تکلیف ہوئی کہ پڑھنے والے کیا سوچیں گے کہ نہ سر نہ پیر، سو چپ چاپ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ آپ تو بادشاہ لوگ ہیں۔ ڈائجسٹ آپ کی ریاست اور ہم قارئین آپ کی عوام اور عوام کی حالت سے تو آج کل ہر ایک واقف ہے۔

2۔ جی جناب! میں تو رہتی ایسے موقعے کی تلاش میں ہوں۔ بلکہ میرا تو کہنا اور ماننا ہے کہ!

بارے دنیا میں رہو، غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

اللہ کی رضا کے لیے اس کے بندوں کو راضی کرنے کی کوشش میں کئی طرح کے نازیبا القابات بھی سماعتوں سے ٹکراتے ہیں جنھیں سن کر دکھی دل سے مسکرانا بھی پڑتا ہے۔

3۔ زندگی تو ہے ہی اک سفر مسلسل۔ مگر آج جو میں آپ کے ساتھ شیئر کرنے جا رہی ہوں وہ واقعہ ہے اگست 2007ء کا۔ ان دنوں چونکہ چھٹیاں تھیں تو ہم لوگ شادیوال (میکے) گئے ہوئے تھے۔ واپسی پہ گجرات سے سیلنگ فین بھی خریدے۔ ان دنوں رکشہ کی سواری اتنی عام نہیں ہوئی تھی تو ہم گجرات سے سیالکوٹ جانے والی بس پہ سوار ہو کے سمبڑیال سے پیچھے رندھیر موڑ اترتے اور اسپیشل ٹانگے پہ سوار ہو کے رندھیر آتے سو جناب جب رندھیر پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہاں تو سیلاب آیا ہوا ہے۔ اب رندھیر سے مدو کے، کے درمیان بہت پہلے ایک پلی ہوتی تھی جو بعد میں ٹوٹ گئی تو وہ جگہ غیب یعنی غائب کے نام سے المعروف تھی اپنی گہرائی کی وجہ سے۔

تو تانگہ وہاں پہنچا تو کیا دیکھتے ہیں کہ غیب کے دونوں کناروں پہ تماشا دیکھنے والوں کا ہجوم کھڑا تھا۔ تانگہ بان جی دار تھا۔ وہ تانگے سے نیچے اتر گیا اور گھوڑے کی لگام پکڑ کر آگے آگے چلنے لگا۔ اب ہم نے پاؤں سیٹ کے اوپر کر لیے بچے تب چھوٹے تھے انہیں گود میں بٹھا لیا۔ پانی تانگے کے اندر سے گزر رہا تھا گھوڑے کا صرف سر پانی سے باہر تھا اور ایسے ہی تانگہ بان کا بھی اوپر والا تھوڑا سا حصہ ہی باہر تھا میں بچوں کو گود میں دبائے دعائیں مانگ رہی تھی کہ اللہ خیریت سے یہ تھوڑا سا فاصلہ طے ہو جائے۔

خدا خدا کر کے بحفاظت دوسرے کنارے پہ پہنچے۔

صد شکر کہ اب غیب پہ پل بن گیا ہے اور ویسے بھی 2014 کے بعد اتنا بڑا سیلاب بھی نہیں آیا۔ آپ کے صفحات کی کمی بھی پیش نظر ہے ورنہ واقعات تو کئی دامن کھینچ رہے ہیں کہ ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔

گوشی جمال...... منڈی یزمان

بہت ہی جاں لیوا دکھ ابا سے بچھڑنے کا ہے۔ چوبیس سال پہلے ابا جان جب ہم اس قابل بھی نہ تھے ان کی اچھے سے خدمت کرتے، اس وقت تو ایسی عمر تھی صرف اپنی خواہشات منوانے کے دن تھے اور ابا اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ ابا ایک سال بیمار رہے بڑی آپا اور بھائی نے ان کی خوب خدمت کی۔

مجھے یاد ہے میں ابا کے پاس بیٹھ کر بڑی آپا کی تقلید کرتے ہوئے جب ابا کے پاؤں، ٹانگیں اور ننھے ننھے ہاتھوں سے سر کو دباتی تو شدید تکلیف کے باوجود بھی ابا مسکراتے اور سکون سے آنکھیں بند کر لیتے جیسے ان کو بہت سکون محسوس ہوتا ہو۔ اب وہ لمحات شدت سے یاد آتے ہیں دل دکھ و پشیمانی سے بھر جاتا ہے کہ کاش ابا حیات ہوتے ان کی خوب اچھے سے خدمت کرتے۔

ابا کی رمضان المبارک میں وفات ہوئی رات دس بجے ہم چھوٹے بچوں کو اماں اور گڈی آپا نے سلا دیا۔ اماں اور آپا نماز عشاء کے بعد تراویح پڑھ کر آپا ابا کو دوائی پلانے آئیں تو ابا کی سانس بند تھی۔ اس دن میں نے ابا کی ٹانگیں دبائی ہی نہیں اور صبح ہمیں سب بچوں کو پتا چلا تو دل میں حسرت رہ گئی ابا سے آخری ملاقات بھی نہ ہو سکی۔

2۔ اک عجیب سی خوشی کا احساس ہوتا ہے جب میں بے لوث کسی دوسرے کے کام آؤں، اپنا نفع نقصان کی پروا کیے بغیر بھی مالی مدد بھی کسی اور طریقے سے۔ روحانیت سے لگاؤ بہت گہرا ہے۔

چار سال ہو گئے، میں نے گاؤں میں سپر اسٹور کھولا ہوا ہے کم منافع میں عمدہ کوالٹی کی اشیاء فراہم کرنا چاہے اس میں مجھے اتنا فائدہ بھی نہ ہو لیکن دل کو سکون بہت ملتا ہے۔ کسی کی معمولی سی اعانت، ہر ممکن کوشش سے ہر کسی کے کام بڑھ چڑھ کر کرنا۔ خاندان میں شادی یا فوتگی پر اپنی ذمہ داریوں کو بہ احسن طریقے سے انجام دینا میری فطرت میں شامل ہے چاہے تھکن جتنی مرضی ہو۔

بڑی بہنیں جن کے گھر نہیں بن سکے وہ اپنے بچوں سمیت میکے کی چوکھٹ پر بیٹھی ہیں ایسے میں مجھے اچھی تعلیم کے باوجود کوئی ڈھنگ کی نوکری نہیں ملی۔ کچھ زمینیں ہیں لیکن ان سے تمام ضروریات پوری نہیں ہو سکتی تھیں۔ گھر کے حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے ٹھان لی کچھ نہ کچھ کر کے بڑی بہنوں اور ان کے بچوں کی کفالت کرنی ہے تو پھر اماں کی زندگی میں ہی یہ ذمہ داری دکان کی صورت اٹھائی پرچون کی کہہ لیں یا سپر اسٹور کہہ لیں۔ گاؤں میں بنالی۔ گھر سے اجازت نامہ لے کر۔

اماں کی دعاؤں سے چار سال سے کامیابی سے چل رہی ہے۔ بس اماں نہیں رہیں یہ صدمہ تا حیات رہے گا۔ والدین کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔

3۔ بدولت کا ابھی تا حیات کوئی سسرال نہیں والدین کے گھر میں سب کا بڑا ہوں ہے لیکن بڑے تین بھائی شادی شدہ ہیں اور الگ الگ شہروں میں رہتے ہیں، ان کے ہاں آنا جانا لگا رہتا ہے۔

بہت سارے قیمتی اور دل فریب سفر جس میں میرے شانہ بشانہ بھانجی زوبی اور ان کی والدہ ماجدہ گڈی آپا سر فہرست ہیں۔ یہ سفر کا شغل فرما لیتی ہیں۔ ویسے تو چھوٹی آپا شاذ مہر گھومنے پھرنے کی کافی شوقین واقع ہوئی ہیں بذلہ سنج۔ کہیں بھی بیٹھے صرف اپنی سناتی ہیں اگلے بندے کی کوئی پروا نہیں ہاہاہا۔

بیٹی عنایہ ماں سے چار قدم آگے لور لور پھرنا، اچھا کھانا اور لڑائی جھگڑے میں سب کو مات دینا اولین ترجیح ہے۔

سفر کے بہت سارے دلچسپ واقعات ہیں کچھ میں نہیں آ رہا کون سا لکھوں؟







البتہ ایک بات رہ گئی منجھلی آپا شاہانہ کو سفر سے بہت چڑ ہے۔ بہت بھاگتی ہیں کسی بھی سفر سے۔ موصوفہ کو الٹیاں دو کلو میٹر سفر کرنے کے بعد ہی شروع ہو جاتی ہیں، حالانکہ گاڑی میں شیشہ کھول کر بیٹھتی ہیں لیکن ان کی بیٹی عمائمہ سیر وسیاحت کی بے حد شوقین چاہے اسکول کا ٹرپ ہو یا فیملی فنکشن کوئی اٹینڈ کرنے جانا ہو۔ سب سے آگے۔

سفر کا ایک دلچسپ واقعہ پیش خدمت ہے۔ گڈی آپا کا سسرال صادق آباد ہے۔ بہنوئی موصوف جو کہ پھوپھو کے بیٹے ہیں۔

دو عدد شادیوں کے کارنامے انجام دے چکے ہیں۔ آپا کی صرف ایک بیٹی زوبی ہے جبکہ دوسری شادی بیٹے کی خواہش پر عشق لڑا کر کی جس میں پھوپھو صاحبہ کا کافی رول ہے، آپا کی شادی کو محض دو سال ہوئے تھے اور اللہ نے بیٹی سے نوازا لیکن بیٹے کی خواہش زوروں پر اور دوسری شادی کروا کر پھوپھو نے دم لیا۔ آپا اپنی بے قدری پہ دکھی میکہ میں آبسیں۔ بس اب بھی کبھار مہمان بن کر صادق آباد جاتی ہیں گھر کی دعوے دار نہیں۔ بیس سال سے میکہ میں براجمان ہیں...... گنی چنی بار ہی وہاں گئیں۔ البتہ بھانجی زوبی چلی جاتی ہے۔ بہن بھائیوں اور پاپا سے ملنے۔

میرا تو وہاں بچپن میں چکر لگا تھا پھر نوعیت ایسی ہوگئی، آنا جانا بند۔ ننھے ارشان کی سالگرہ آگئی اور زوبی کو لینے اس بار صادق آباد سے کوئی نہیں آیا۔ یہ موصوفہ اپنے ارادوں پہ ڈٹی رہیں اور خود جانے کا پروگرام ترتیب دے لیا ہمراہ گڈی آپا اور اس بار مجھے قائل کر لیا چکنی چپڑی باتوں سے ہائے اور بابا۔ میں بھی آنا فانا تیار۔ چلو صادق آباد میں بھی اپنے ہوش وحواس میں دیکھ آؤں۔

وہاں ہماری خالہ کی بیٹی آپا شادو بھی رہتی ہیں وہ بھی آئے دن سر کھاتی، آپ لوگ میرے گھر نہیں آتے۔ سوچا اس بار ان سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔

صبح نہار منہ گڈی آپا اور زوبی بوائل انڈوں کو چائے کے ساتھ تناول فرما رہی تھیں، آپا شاہانہ نے مولی کے پراٹھے گرما گرم زوبی کو پیش کر دیے۔

"سفر کرنا ہے تھوڑا ہاتھ ہلکا رکھو لڑکی!" ڈکار مارتی اندر باہر گھوم کر تیاریوں میں مشغول۔ گاجری سوٹ پہن کر آپا گاجر بنی تیار۔ زوبی تیز ریڈ کلر کے بڑے پھولوں والی ایئر لائن فراک پہنے، میں بلیک ٹراؤزر اوپر سے بلیک اسکن لائننگ والی شرٹ اور ہمارے قافلہ بہاول پور میں صادق آباد ٹرمینل کی طرف رواں دواں۔

زوبی نے فیصل موور گاڑی میں بیٹھنے سے انکار کر دیا کہ وہ بند شیشوں والی گاڑی میں نہیں بیٹھے گی الٹی آ جائے گی نان اے سی میں سفر کرتے ہیں۔ تقریباً چار گھنٹے کا سفر تھا۔ زوبی جو سب سے پہلے منی کوچ نظر

آئی اس میں جھٹ سے چڑھ گئی۔ یہ بھی نہیں دیکھا لوکل ہے یا سیدھی صادق آباد جائے گی ہم نے بھی برابر سیٹ سنبھال لی۔ کنڈیکٹر نے بولا ”ٹکٹ اندر بیٹھ کر ہی وصولیں گے۔“ ہمارے علاوہ تین سے چار سواریاں اور ہوں گی۔

زوبی نے پاپ کارن کا بڑا پیکٹ لے لیا جبکہ میں اور باجی نے گنڈیریاں لے لیں۔ سفر شروع۔ زوبی پاپ کارن کھاتے اور باتیں کرتے سفر انجوائے کرنے لگی مجھے واش روم جانا تھا۔ اب گاڑی پتا نہیں کس اسٹاپ پہ رکے گی۔ برداشت کرکے بیٹھے رہے ٹوٹی پھوٹی سڑک کے جھٹکے پسلیاں توڑ رہے تھے۔ کتنی فضول سڑک ہے۔ لوکل گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ ہر چھوٹے بڑے اسٹاپ پہ رک رہی۔

”آپا مجھے لگ رہا یہ سفر ایسے آٹھ گھنٹوں میں طے ہوگا۔“ زوبی کی جلد بازی کو کوستے ہم دونوں کے موڈ آف۔

ایک جگہ پہ گاڑی رکی واش روم کی حاجت کے لیے اکثر سواریاں نیچے اتریں۔ میں نے اور گڈی آپا نے بھی ایک لیڈیز واش روم کی طرف دوڑ لگائی۔ ارے یہ کیا؟ یہاں تو بس دو ہی واش روم۔ دونوں میں مرد گھسے ہوئے کافی انتظار کے بعد باری نہ آئی اور گاڑی نے ہارن بجادیا۔ مجبوراً گاڑی میں واپس۔ برداشت کے علاوہ کیا کر سکتے تھے۔

رحیم یار خان جا کر ساری سواریاں اتر گئیں اور ہم تینوں کو بھی ڈرائیور نے بائی پاس پر اتار دیا۔

”ہم آگے نہیں جائیں گے آپ یہاں سے صادق آباد کی اور گاڑی پکڑ لیں۔“

”ستیاناس جائے تیرا زوبی کیسی گھٹیا گاڑی میں سوار کرادیا۔“ ہم تینوں ہونق صورتیں لیے سڑک پہ غصے سے میرا برا حال، گڈی آپا اور زوبی آئیں بائیں شائیں کرنے لگیں۔ جو گاڑی آئے سواریوں سے کھچا کھچ بھری۔

پیٹرولنگ پولیس کے اہلکار وہاں گاڑی میں کب کے کھڑے ہمارا تماشا دیکھ رہے تھے ان میں سے ایک سپاہی آکر مخاطب ہوا۔ ہم دونوں حیرانگی میں غرق۔

”میں آپ کی کوئی مدد کرسکتا ہوں۔ کافی دیر سے آپ تینوں اتنے بڑے بیگ کو گھسیٹتی ادھر ادھر لپک رہی ہیں، کہاں جانا ہے آپ نے؟“

میں نے فوراً جواب دیا ”بھائی صادق آباد کی کسی گاڑی میں بٹھادیں، مہربانی ہوگی آپ کی۔“

اس بے چارے نے مطلوبہ گاڑی کو روکا۔

”ہائیں یہ کیا......؟“ اس میں صرف دو سیٹیں تھیں پھر کیا تھا شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ دو سیٹوں پر ہم تینوں نے کیسے گھس کر سفر کیا۔ مت پوچھیں۔

آپا شادو دو گھنٹے سے آگے اسٹاپ پر آکر بیٹھی ہمارا انتظار کررہی تھیں۔ ہم نے اس حالت میں پہلے ان کے گھر جانے کا فیصلہ ہی کیا۔

وہ آگے سے بے حال ہوتی فوراً ہماری طرف لپکیں۔

”لی کڑیو کتھے رہ گئیں۔ میں دو گھنٹے سے روڈ پہ آنے والی ہر بس، کوچ چیک کررہی ہوں۔“

آپا ہمیں گھر لے چلیں جلدی، ساری روداد سناتے ہیں۔ پھر آپا کے گھر سالگرہ پر جائیں گے۔“

یوں یہ چار گھنٹے کا سفر آٹھ گھنٹوں میں ختم ہوا۔

صفیہ مہر فرحان......رحیم یار خان

زندگی ہو اور پچھتاوے نہ ہوں ایسا ہوں ہی نہیں سکتا۔ 2023ء مجھے تازندگی یاد رہے گا کہ اس نے مجھ سے میری اکلوتی اولاد چھین لی، اک صبح اٹھتے ہی زونائشہ مسلسل چیخنے لگی میں، کبھی ایسے ہی رو رہی ہے پھر لمحوں میں بخار چڑھ گیا۔ صبح صبح جس ہسپتال گئے سارے بند پھر رحیم یار سٹی کے شیخ زید میں گئے وہاں ڈاکٹر مایوس۔ میں نے بھائی سے رو کر التجا کی کہ بیٹی کو سی ایم ایچ لے چلتے ہیں لیکن جب تک وہ تاعمر کے لیے سو چکی تھی۔ پچھتاوا یہ کہ شاید میں نے علاج میں تاخیر کردی، چھ ماہ ہوگئے ہیں لیکن بیٹی کی یاد اس کے

جانے کا دکھ کم ہی نہیں ہوتا۔ اللہ مجھے زونائشہ جیسی بیٹی دے ہر وقت دعا گو رہتی ہو،

"پیاری صفیہ! آپ کا دکھ بڑا ہے لیکن پچھتاوا غلط ہے۔ یہ سوچ غلط ہے کہ آپ سی ایم ایچ لے جاتیں تو زونائشہ بچ جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے جتنے سانس لکھے ہیں، وہ کم یا زیادہ نہیں ہو سکتے چاہے ہم جتنی بھی کوشش کر لیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو زونائشہ کا نعم البدل عطا فرمائے آمین۔)

2۔ روح کے سکون کے لیے ہمارے جیسے سادہ لوگوں کے لیے پانچ وقت کی نماز ہی ہے چھوٹی چھوٹی نیکیاں ہر انسان کرنے کی کوشش کرتا ہے، عالمہ ہیں ہمارے جاننے والوں میں سے تو وہ جب بیٹی کی تعزیت کے لیے میرے پاس آئیں تو جاتے سے میں نے انہیں کچھ پیسے پکڑائے کہ ہر جمعہ جو آپ درس دیتی ہیں، اس بار ان عورتوں کے کھانے کا انتظام کر لیجیے گا اور میرے لیے سکون کی دعا کروایئے گا تو بظاہر ہے تو چھوٹا عمل لیکن یہ کر کے مجھے سکون کا احساس ہوا تھا۔

3۔ دو ماہ پہلے میں میری نند اور میرے شوہر ہم میرے چھوٹے ماموں ان کے (شوہر) کے چاچو کے گھر راولپنڈی گئے تھے، تو مامی کے ساتھ بہت مزہ آیا تھا، مامی روز رات کو بازار لے جاتی تھیں آئس کریم کھلانے اور شوہر سیخیں لے آتے اور ہم ساتھ والوں کے امرود کے پیڑ سے امرود توڑتے تھے۔ ایوب پارک جناح پارک، سی ایم ایچ دیکھنے گئے ماموں فوج میں ڈاکٹر ہیں اور آخر میں دامن کوہ بھی گئے سفر ویسے بھی مجھے اٹریکٹ کرتے ہیں لیکن بہت اچھا لگا یہ سفر اب ماموں کی پوسٹنگ کراچی ہوئی ہے ملیر کینٹ تو اس گرمیوں کی چھٹیاں وہی جانے کا پروگرام ڈن ہے ان شاء اللہ تو اس بار آپ کا کراچی دیکھیں گے۔ (صفیہ کراچی آئیں تو ہم سے ضرور ملیں))

سعدیہ مصطفیٰ......مڑھ بھنگواں

1۔ مجھے وہ لوگ بالکل اٹریکٹ نہیں کرتے جو ہر وقت اپنے ماضی کے دکھوں میں غموں میں مبتلا رہتے ہیں۔ جن کی سوچ صرف اتنی ہی ہوتی ہے کہ فلاں نے مجھے یا میں نے فلاں کو یہ کیوں کہہ دیا۔

پھر بھی انسان ہوں بہت سارے دکھ ہیں پریشانیاں ہیں۔ خواب تھے نہیں ہو سکے پورے بہت سارے ایسے جملے ایسی باتیں بھی تھیں۔ جو زندہ درگور کرنے کے لیے ہی کافی تھیں۔ شعلہ برساتی آنکھیں زہر ٹپکتے لفظ بھی سنے۔ سہے برداشت کیے لیکن اس سوال کے جواب میں کوئی بھی بات لکھ نہیں سکتی۔ کہ آگے بڑھ گئی ہوں۔

2۔ میرا فیورٹ سوال بہت شکریہ پیاری مدیرہ اس سوال کے لیے واقعی کچھ سودے خسارے کے ہی تو ہوتے ہیں۔ جیسے میں نے اپنا بچپن کا خواب جس کا انتظار بہت سارے سال کیا، پورا ہو۔ اور جب وہ وقت آیا خواب کو پورا کرنے کا تو چھوٹی عزیز بہن کو وہ خواب دے دیا۔ کالج جوائن کرنا، ایف ایس سی کی ٹاپ اسٹوڈنٹ بننا خواب تھا میرا کچھ وجوہات کی بنا پر ایڈمشن نہ ہو سکا اور لعل مسٹر کا ہو گیا۔

لیکن اگر سوال کے دوسرے کا جواب لکھوں تو یہ بہت مزے کا حصہ ہے میں کاؤنسلنگ بہت اچھی کرتی ہوں۔ اپنی فرینڈز، اسٹاف ممبرز اور بہت سارے لوگوں کی کاؤنسلنگ کی ان کو موٹیویٹ کیا۔ ان کو ان کی زندگی میں واپس کامیاب اور خوش دیکھ کر روحانی سکون ملتا ہے۔

تیسرے سوال کا جواب بھی لکھا تو پھر۔ آگے سمجھ دار ہیں آپ میری طرف سے میری بہت پیاری بہت عزیز بہت مہربان ایک دوست ایک ٹیچر مس نورالعین کو نیا سال مبارک ہو۔ کامیابیوں سے نوازے آمین۔

مقبول مصنفہ

نازیہ جمال سے ملاقات

شاہین رشید



نازیہ کی پہلی ہی تحریر موصول ہوئی تو صاف ستھرا عمدہ کاغذ، بہترین لکھائی اور سطر چھوڑ کر صفحے کی ایک جانب لکھی گئی تحریر نے فوراً متوجہ کرلیا۔ کہانی بھی اچھی تھی، اسی ماہ پرچے میں شائع ہوگئی۔

اس کے بعد نازیہ کی شاید ہی کوئی تحریر ہو جو ناقابل اشاعت کی فہرست میں آئی ہو۔ نازیہ کا انداز بیاں سادہ اور دل نشین اور وہ سنجیدہ مسائل کو بھی اتنے رواں انداز میں لکھتی ہیں کہ پڑھنے والے کو کوئی الجھن محسوس نہیں ہوتی۔ اب کافی عرصہ سے انہوں نے لکھنا چھوڑ رکھا ہے۔

س: ''نازیہ! آپ اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں بتائیے؟''

ج: میرے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں میری بہن شازیہ نے اتنا تفصیلی اور وضاحت سے لکھا ہے کہ پڑھ کر مزہ آ گیا۔ صرف مجھے ہی نہیں سب کو۔ اپنے والدین کی ساتوں اولادوں میں سے میرا نمبر سب سے پہلا ہے۔ ہم چار بہنیں ہیں چارپائی کے چار مضبوط پائے۔

ہمارا گھرانہ تعلیم یافتہ، باشعور، بہترین دینی و سماجی اقدار سے مالا مال ہے۔ میرے والد کی سخاوت اور مہمان نوازی پورے علاقے میں ضرب المثل مانی جاتی ہے۔

رات کا ایک بج رہا ہو کوئی بھولا بھٹکا مسافر کسی بے نوا راہی کو بھی جمال عبدالناصر کے ڈیرے سے پیٹ بھر کر کھانا اور بستر ضرور ملے گا۔ بڑے بڑے روٴسا، ایم این ایز، ایم پی ایز کو والد صاحب کے ڈیرے پہ بہترین ضیافتوں سے لطف اندوز ہوتے دیکھا۔ اسی معیار کے کھانے مفلوک الحال فقیروں اور مجذوب ملنگوں کو کھا کر دعائیں دیتے سنا۔

میں دو ہفتے قبل نومبر میں امی کے گھر گئی تو باہر کے خرگوشوں کی ایک بڑی کھیپ تیار ملی۔ سفید، سرخ، بھورے خرگوش۔

فیصل بھائی صبح صبح اپنے اصیل، پالتو مرغوں کی سیوا میں لگے رہتے۔ انہی مرغوں میں سے دو مرغوں کی ضیافت میرے لیے آسیہ نے لذیذ ثوبت کی صورت میں تیار کی۔

صبح اٹھی تو ڈیرے سے اٹھ کے سفید اجلا اجلا پپی گھر میں آ گیا۔ جس کا نام میرے بھانجے زین نے ''بگولہ'' رکھا تھا۔

امی ہنس کر بولیں۔

''نازی! بگولے کو تمہاری آمد کی اطلاع مل گئی ہے۔ تمہارے دیدار کو آ گیا ہے۔''

امی کی بات بجا کہ بگولے کی تیسری نسل ہمارے گھر میں پرورش پا رہی ہے۔ البتہ بگلوں کی جوڑی کی آنکھوں میں میرے لیے اجنبیت تھی اور



انداز میں نخوت، میری دو سالہ پیاری سی بھتیجی دعا فاطمہ جب مجھے وڈی بوا کہتی ہے تو مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔ شازیہ کے "بٹرکپ" محمد خان نے سب کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔

سرسبز و شاداب پھل دار درختوں کے سائے میں پلتے، پالتو جانور، وقتاً فوقتاً کسی مہمان کی آمد پہ خاطرداری کی مصروفیت۔

امی کا وسیع و عریض صحن، اب پورشنز میں تقسیم ہو چکا ہے۔ مگر امی ابو کے بابرکت وجود کی بدولت گھر میں وہی محبت، بے تکلفی اور خلوص کی فضا قائم ہے۔ جس میں، میں پلی بڑھی۔"

س: "آپ کی شادی کب ہوئی اور بچے کتنے ہیں؟"

ج: "آج سے پندرہ سال قبل، جب عمر عزیز نے دو دہائیاں مکمل کیں تو میرے والدین نے ہر اچھے اور ذمہ دار والدین کی طرح مجھے وداع کرنے کا ارادہ کیا۔ انتخاب مرحومہ دادی جان کے عزیز ٹھہرے۔

نصیب ایک ان دیکھی دیوار ہوتی ہے اور پہیلی جسے روز اول سے کوئی انسان بوجھ نہیں پایا ہے۔ بے جوڑ بندھن ڈھیلے ہی بندھتے ہیں۔ تعلیم کی کمی، شعور کا فقدان، گھر میں رچی پست ذہنیت۔ یوں یہ رشتہ سال بھر میں ہی ختم ہو گیا۔

دھانی سائے سیاہ رنگ میں ڈھل گئے اور گلابی دوپہروں میں زردی گھل گئی تھی۔ "زرد موسم" کی ایمن کا گھر اجڑنے پر میری امی ہفتہ بھر روئی تھیں تو بیٹی کے غم نے ان پہ کیا قیامت ڈھائی ہو گی۔ اہل درد اندازہ کر سکتے ہیں۔

جب میں اپنی زندگی کی بدترین ذہنی ابتری کا شکار تھی، تب میرے مہربان اور شفیق والدین نے مجھے اپنے لطف و کرم کی ٹھنڈی چھاؤں میں سمیٹ لیا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے رویے سے ایک دن بھی باور نہیں کرایا تھا کہ میں کسی "زلزلے" کے ملبے میں دب گئی ہوں یا اس گھر میں "بھونچال" کی ساعت بھی گزری ہے۔ بلکہ میرے والد مجھے روز مضبوطی اور بہادری کا ایک سبق پڑھاتے تھے۔ ان کی دعاؤں، محبتوں اور خصوصی توجہ کی بدولت بہت جلد ایک نارمل زندگی کی جانب لوٹ آئی۔ ان کی شفقتوں کی مقروض ہوں میں اور عنایتوں پہ شکرگزار۔

اللہ تعالیٰ میرے والدین کو ایک لمبی صحت اور ایمان والی زندگی عطا فرمائے۔ اور ان کا سایہ ہمیشہ

سانحہ ارتحال

آپ کی پسندیدہ مصنفہ ام طیفور کے شریک حیات کفیل احمد صاحب دنیا سے رخصت ہو گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

عزیز شوہر کی اچانک وفات ام طیفور کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ دکھ کی اس گھڑی میں ہم ان کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہمت و حوصلہ دے کہ وہ اس صدمہ کو برداشت کر سکیں اور کفیل احمد صاحب کی مغفرت فرمائے۔ (آمین)

ہمارے سروں پہ قائم رکھے۔ آمین

ابھی سال ہی گزرا تھا اس "سانحے" کو کہ کاتب تقدیر نے ایک اور قیامت ہم پہ ڈھادی۔ جی ہاں، قیامت صغریٰ۔ آسمان کی نیلاہٹ پہ ایک دم سے چھائی سرخی دیکھ کے ہم سب دھک رہ گئے تھے۔

شازیہ کی مایوں والے دن ہماری پیاری خالہ جان فرحت النساء اپنے تین بچوں کے ساتھ ایک ٹریفک حادثے میں داعی اجل کو لبیک کہہ گئیں۔

ہمارا شہزادوں سی آن بان رکھنے والا بھرو بجیلا بھائی ملک خاور عباس جس کی شادی پہ ہم نے "اتن" ڈانس کرنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ ہماری دودھ بکھن سے بنی ڈاکٹر مہر النساء جو میڈیکل کی تعلیم مکمل کر کے شادی میں شرکت کے لیے آرہی تھی۔

اور ہم سب کی ہر دل عزیز مصنفہ فرحانہ ناز ملک جنہیں ہم پیار سے بے بی باجی بلاتے تھے، چاروں ایک ہی مقام پر ایک ہی لمحے میں ہم سب کو داغ مفارقت دے گئے۔

شازیہ کی شادی درد و اذیت کی گھڑی میں بدل گئی تھی۔

نو برس بیت چکے ہیں۔ مگر ان چاروں کے جانے کا غم آنسو بن کر ہمارے آنکھوں سے بہتا رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ میری خالہ جان اور ان کے بچوں کو جوار خاص میں جگہ دے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین)

آ پھر شروع سے شروع کریں
آ پھر تجھے میں اپنا نام بتاؤں

جنوری 2018ء میں، میں نے ازدواجی زندگی کا ایک نیا سفر شروع کیا۔ جو بہت مبارک، سہل اور خوشیوں بھرا ثابت ہوا میرے لیے۔ الحمدللہ۔

صاحب پہلے فرحانہ ناز ملک کے شوہر نام دار تھے۔ پھر وقت کی الٹ پھیر اور تقدیر کے فیصلوں نے انہیں میرا ہم سفر بنا دیا۔

فرحانہ باجی ان کی رفاقت میں فرحاں رہتی تھیں تو میں ان کی ہمراہی پہ نازاں......

میرے شوہر ملک بشیر احمد ایک انتہائی مہذب متحمل مزاج اور متوازن شخصیت کے مالک انسان ہیں۔ ٹھنڈے پانیوں جیسا پرسکون مزاج ہے ان کا اور میں قدرے پارہ صفت عورت۔ تندی اور دھیمے پن کا یہ امتزاج وقت پہ بڑے خوب صورت نقوش چھوڑ رہا ہے۔

کرن کی مدیرہ روبینہ شریف نے ایک بار کہا تھا۔

"تمہارے شوہر کتنے لکی انسان ہیں جنہیں دو رائٹرز بیویاں نصیب میں ملی ہیں۔ ورنہ کسی کو تو ایک بھی نہیں ملتی۔" اور میں ہنستے ہوئے انہیں اکثر یہ بات جتاتی رہتی ہوں۔

میری طرح یہ بھی ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ سے منسلک ہیں۔ اس لیے ہماری روٹین میں مطابقت پائی جاتی ہے۔ اور کمال کی ذہنی ہم آہنگی۔ الحمد اللہ میں اپنی رب کریم کی بہت شکر گزار ہوں جس نے میرے صبر کا انعام ایک بہترین شریک حیات کی صورت میں دیا۔ یہ شعر میرے اسٹیٹس کی زینت بنا میرے جذبات کی خوب ترجمانی کرتا رہتا ہے۔

زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے
تو بہت دیر سے ملا ہے مجھے

میرے نصیب کی ساری محبتیں میرے شوہر نے مجھ پہ نچھاور کی ہیں۔

میں صاحب اولاد نہیں ہوں مگر فرحانہ باجی کے تینوں بچے میری ممتا کی تسکین کا بخوبی سامان بنے ہوئے ہیں۔

بڑے دانیال کا اپنی مما کے ساتھ شدید ایکسی ڈینٹ ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور تمام چاہنے والوں کی خصوصی دعاؤں سے بہت جلد رو بہ صحت ہو کر اس وقت دیار غیر میں میڈیکل کی تعلیم کے حصول کے سلسلے میں مقیم ہے۔ ہماری دعا ہے کہ وہ طب کے میدان میں کامیابی کے اونچے اونچے جھنڈے

گاڑے۔(آمین)"

س: "سوشل میڈیا کا استعمال کرتی ہیں؟ سوشل میڈیا پہ آپ کا انتخاب؟"

ج: آج کل کے دور میں سوشل میڈیا کا استعمال ناگزیر ہے۔ اگر بندر "ادراں" رکھے تو اس "ادرک" میں کافی مزہ ہے۔ میرے خیال میں اگر آپ شور سے بچنے کے لیے دروازہ بند کرتے ہیں تو روشنی بھی اندر نہیں آسکے گی۔ میں اپنی جاب کے حوالے سے "نئی تازی" سوشل میڈیا سے لیتی رہتی ہوں۔ دوسرا کوکنگ اور کپڑوں کی ڈیزائننگ کے لیے دوسروں کے ہنر سے مستفید ہونے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتی۔

س: "ٹی وی پہ لکھنے کا ارادہ ہے؟"

ج: ٹی وی پہ لکھنا تو درکنار میں ٹی وی دیکھتی ہی کم ہوں۔ ٹی وی امی کے گھر خوب دیکھا اور لڑجھگڑ کے دیکھا۔ ایک ٹی وی ریموٹ پہ جھپٹنے والے کئی ہاتھ ...... سعدیہ کو انڈین سوپ ڈرامے پسند تھے۔ تو آسیہ کو کرکٹ میچ اور انگلش موویز دیکھنے کا کریز تھا۔ شازیہ پاکستانی ڈراموں کی شوقین اور مجھے نیوز چینلز اور سیاسی حالات پہ تجزیہ کاروں کے لمبے لمبے تبصرے۔

فیصل بھائی جان انڈین ایکشن موویز کے دیوانے، بس ایک انار اور سو بیمار والی صورت حال ہو جاتی تھی۔

تنازعہ زیادہ بڑھتا تو باہر چھت پہ جا کے کیبل کا کنکشن ہی الگ کر ڈالتا، ادھر ہم مزاہ کرکرا ہونے پر کیبل والوں کو جی بھر کر کوستے۔ باہر کی کارستانی کا پول اگلے دن کھل جاتا تھا۔

عمیرہ احمد، فرحت اشتیاق کے ناولز پہ بنی ڈرامے میں بہت شوق سے دیکھتی تھی۔ اب موبائل نے ٹی وی کے اچھے متبادل کی جگہ لے لی ہے۔ مگر وہ گزرا ہوا وقت واپس نہیں آسکتا جب آسیہ، افہام و تفہیم سے وقفے کے دوران سب کو اپنا من پسند چینل دیکھنے کا سیٹ اپ بنا لیتی تھی۔

میری یہ خواہش ضرور ہے کہ شازیہ ٹی وی پہ کچھ لکھے۔ اسکرین پہ اس کا نام ہو۔

س: "تعلیم اور روزمرہ کی مصروفیات کے بارے میں بتائیں؟"

ج: میری تعلیم الحمد اللہ اتنی ہے کہ گورنمنٹ اسکول میں تدریسی فرائض سرانجام دے رہی ہوں۔ میرا اسکول ڈی جی خان سے بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ جاب کے حوالے سے میری صبح بہت جلدی ہوتی ہے۔ نماز کے وقت ناشتے کے بعد اسکول وین مجھے لینے آجاتی ہے۔ میرا پیشہ میری عبادت ہے۔ میں نے اپنی سہولت کے لیے ایک جزوقتی ملازمہ بھی رکھی ہوئی ہے مگر مجھے گھر کے کام، اپنے ہاتھوں سے انجام دینا اچھا لگتا ہے۔ میرے شوہر کو میرے ہاتھ کی بنی چائے پسند ہے۔

فارغ وقت میں بہنوں کے ساتھ دن بھر کی روداد گروپ میں شیئر کرتی ہوں۔

جاب کا آدھے گھنٹے کا سفر میرے لیے

انتقال پرملال

محترمہ رضیہ جمیل کے برادر محترم خالد جمیل صاحب دنیا سے رخصت ہو گئے

انا للہ وانا الیہ راجعون

مرحوم خالد جمیل بہت مشفق، ملنسار اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ باپ کے بعد وہ سب بہن بھائیوں کے لیے باپ کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کی وفات متعلقین کے لیے بڑا صدمہ ہے، اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ (آمین)

ہرگز تھکاوٹ کا سبب نہیں بنتا کیونکہ ٹیچنگ ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ہماری امی ریٹائرڈ ٹیچر ہیں۔ ہم چاروں بہنوں نے شادی سے قبل شہر کے بہترین پرائیویٹ اسکولز میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ گھر پہ ایک ٹیوشن سینٹر بھی کامیابی سے چلایا۔ گھر کے چاروں کونوں میں پڑھائی، چار باجیاں اور اردگرد بچوں کا ہجوم یہ مکمل منظر اب بھی ذہن کے پردے پہ بلنک کرجاتا ہے۔

سعدیہ اپنی شادی کے بعد اس سینٹر کو جہیز میں لے گئی کہ ہم بہنوں کا زیور گہنوں کے بغیر گزارہ تو ہوسکتا ہے مگر کوئی ایسا دن آئے، جس دن کوئی بچہ ہم سے نہ پڑھ پائے، خدا نہ کرے۔ علم عبادت تو درس گاہ کا مقام......؟

اب سعدیہ کا گھر کم سن آوازوں سے بھرا رہتا ہے۔ دیے سے دیا جلاتا ہے۔

لکھنا پڑھنا۔

میرا اور شازیہ کا لکھنا، بلکہ چاروں بہنوں کا ڈائجسٹ پڑھنا سب ہمارے گھر کے ''علم دوست'' ماحول کی مرہون منت ہے، جو یقیناً ہمارے تعلیم یافتہ روشن خیال ماں باپ کا عنایت کردہ تھا۔

دادا اور نانا جان مرحومین اخبار بینی کے عادی، گھر میں تمام معیاری اخبارات اور ہفت روزے باقاعدگی سے آتے تھے۔ امی اور خالائیں ڈائجسٹوں کی رسیا...... ایسے میں ہم بہنوں کا ڈائجسٹ پڑھنا یا لکھنے کے لیے قلم اٹھانا کچھ اچنبھے کی بات نہیں۔ گھر کے علم پرور ماحول اور والدین کی حوصلہ افزائی کی بدولت، ہم جمال سسٹرز کے نام معیاری پرچوں کی زینت بنے۔

جب میرے خاندان کی خواندہ و نیم خواندہ مائیں، اپنی بیٹیوں کے ساتھ اسٹار پلس کے ڈھائیں ڈھائیں اور سازشوں سے بھرپور ڈراموں سے لطف اندوز ہورہی تھیں۔ عین اسی وقت ہم ماں بیٹیوں میں اس بات پہ شرط لگی ہوئی تھی کہ زرد موسم میں ''ظا'' کی پہیلی طارق سے حل ہوگی یا ظاہر سے۔

شوق کا یہ عالم، بڑی خالہ شمع (شازیہ کی ساس) کے گھر سے رسالہ آیا جو فارغ تھی جھپٹ کر رسالہ پڑھنے بیٹھ گئی۔ اگر اتفاق سے کوئی دو ہی فارغ ہوں تو اس کا یہ حل کہ چارپائی پہ بیٹھ کے ٹانگیں لٹکائے مشترکہ جڑے گھٹنے پہ رکھ کر رسالہ پڑھا جاتا۔ باآواز بلند تبصرے کھی کھی، آپسی کی دہائی۔

''خبردار کسی قسط کا تجسس خراب مت کرو۔ ہمارا پڑھنے میں مزہ خراب ہوجائے گا۔''

س: ''لکھنے کا آغاز کب کیا؟''

ج: میں نے ایک قول پڑھا تھا۔ ''پڑھو، پڑھو اور خوب پڑھو اور جب اٹھنے لگ جاؤ تب لکھو۔ میں ایسی تو نہیں البتہ تھوڑی بہت چھلکی تھی۔ خواتین شعاع اور کرن کے مستقل سلسلوں میں شرکت کی صورت۔''

میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں میں خاندان کی وہ واحد لڑکی تھی، جس نے بلا جھجک نوعمری میں معیاری رسالے پڑھے اور ڈٹ کر دوسروں کو پڑھنے کی ترغیب دلائی۔ کم فہم عزیزوں کے حوصلہ شکن جملے سنے، تمسخرانہ، مشکوک نگاہوں کا سامنا کیا۔

س: ''تم اتنی عمر میں رسالے پڑھتی ہو؟ پھر تم اسکول کا بستہ پڑھ چکیں؟''

ج: ''اچھا اگر پڑھتی بھی ہو تو اتنا دھڑلے سے بتانے کی کیا ضرورت ہے؟ چھپ کے پڑھ لیا کرو۔'' ہمدردانہ مشورہ خیرخواہی سے گندھا ہوا۔

''چھپ کر کیوں؟'' خود کو اس تربیت سازی کے کتب کا طفل مان چکی تھی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ ماؤں نے ان بہترین رسالوں کو اپنی بیٹیوں کے لیے شجر ممنوعہ کیوں بنا رکھا تھا۔ تعلیم اور شعور کی کمی، زندگی کی سب سے بڑی کمی ہوتی ہے۔''

س: ''پہلی تحریر کب شائع ہوئی؟''

ج: ''میرا پہلا افسانہ 2008ء میں کرن میں شائع ہوا تھا۔ اعزازیہ پانچ سو ملا تھا۔ جو اس وقت دنیا کی بہت بڑی دولت معلوم ہوتی تھی۔ بہت پذیرائی ملی تھی۔ ہمارا لکھنا امی کے لیے فخر وانبساط کا سبب بنا تو میں اگلے دس سال تک لکھتی گئی۔ پہچان کا ایک دروازہ

مجھ پہ کھلا تھا۔ زندگی ایک اچھوتے سرور سے آشنا ہوئی۔ کتاب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ تھی۔"

س: "وسیع حلقہ قارئین ملا؟"

ج: "وہ نام، پہچان اور تعارف، گزری زندگی کا اہم اور روشن ترین باب ہے۔ جو کتاب زندگی میں خواتین کے توسط سے شامل ہوا۔ شکریہ خواتین ڈائجسٹ۔"

س: "لکھنے کا محرک کیا بنا؟"

ج: "لکھنے کا محرک کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ آپ کے ذاتی جذبات، احساسات، کوئی واقعہ یا اچھوتا خیال۔"

امی کے گھر جہاں تنہائی ملی، لکھ لیتی تھی۔ زرد پھول گراتے دھریک کے درخت کے نیچے درجنوں افسانے لکھے۔ لکھنے میں اتنی مگن ہوتی تھی کہ میرے لکھنے کا ساتھ پڑا سامان پیلے پھولوں سے اٹ جاتا تھا۔ اور ساتھ میں چائے کا کپ چسکیاں لیتے ہوئے، قلم چلتا رہتا، نرمی سے گرتے پھولوں سے بھرے کپ کو دیکھنا بھی میرے لیے قلم میں روانی کا سبب بنتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے نیچے آرام سے اترتے پیلے پھول نہیں۔ بلکہ میری تحریر کے جملے ہوں، جنہیں میں کاغذ پہ اتارتی جاتی تھی۔

س: "شادی کے بعد نام میں تبدیلی نہیں کی؟"

ج: "میں نے شادی کے بعد کچھ ایسا خاص نہیں لکھا۔ اس لیے اپنے نام میں تبدیلی کی نوبت نہ آ سکی۔ البتہ شازیہ نے ابو کے نام کے آگے اپنے شوہر کا نام بہت خوب صورتی سے سیٹ کر دیا ہے۔ مجھے اپنا نام بے حد مکمل لگتا ہے۔ نازیہ جمال، اسی نام سے مجھے پہچان ملی۔ یہ نام بڑا بابرکت ہے میرے لیے۔"

س: "آپ کا مزاج کیسا ہے؟ غصہ آتا ہے؟"

ج: میرا مزاج بہت سادہ ہے۔ میں ہر بات تقریباً ہر معاملے میں خیر کا پہلو ڈھونڈنے والی بندی ہوں۔ ہمدردی و اپنائیت میری نمایاں خوبیاں ہیں۔ ہر کام توجہ اور محبت سے کرتی ہوں۔

مجھے دل کے چھوٹے اور تنگ نظر لوگ بہت برے لگتے ہیں۔ دل کی بہت فیاض ہوں۔ ہاتھ کی کھلی اور ہر عادت مجھے اپنے ابو سے ورثے میں ملی ہے۔

ہم نے اپنے والد کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس قول پہ ہمیشہ کاربند پایا۔ "رزق سخاوت میں پوشیدہ ہے۔ جبکہ تم اسے محنت میں تلاش کرتے ہو۔"

بہت اچھی رازدار ہوں۔ اس معاملے میں "یارم" کے کردار "سائی" سے بھی بہت آگے کی چیز ہوں۔"

"اپنی پرسکون اور آسودہ زندگی کا صدقہ مٹھی بھر کے دیتی رہتی ہوں۔"

س: "موجودہ حالات کے حوالے سے کیا کہیں گی؟"

ج: ملکی حوالے سے جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں انہوں نے دل و دماغ کو افسردگی سے بوجھل کر دیا ہے۔ جس شعبے میں جھانکیں، آنکھیں بھر آتی ہیں۔ ایک تو موسمی اسموگ، اوپر سے یاس و ناامیدی کی کثیف فضا نے جیسے سانس لینا دوبھر کر دیا ہے۔

گھر کے پاس آٹا تقسیم کے دوران بھگدڑ مچنے سے کئی افراد کچلے گئے۔ بجلی کے بل اتنے زیادہ آئے ہیں کہ ہم تنخواہ دار طبقے کی جو چیخیں نکلی ہیں سو نکلی ہیں جو مزدور اور دیہاڑی دار طبقے پہ مہنگائی کا قہر ٹوٹا ہے، انہیں دل خون کے آنسو روتا ہے۔

کلاس کی ایک بچی کے کانوں سے سونے کی بالیاں غائب تھیں۔ پوچھنے پہ بتایا بجلی کا بل بھرنے کے لیے ابا نے بیچ دیں۔

"اے غربت تیکوں چیر گھتاں؟"

"بس رب کریم سے دعا ہے کہ آنے والا ہر سال ہمارے ملک کے لیے امن و ترقی کا سال ثابت ہو۔"

آخر میں شاہین کا بے حد شکریہ جنہوں نے بے حد قیمتی صفحات پہ مجھے کچھ لکھنے کا موقع فراہم کیا۔ سات سال بعد میرا کاغذ اور قلم سے ناتا جوڑا۔

اور پیاری احسل کے لیے ڈھیروں دعائیں اور پیار۔ اس درخواست کے ساتھ مجھے یہ پرچہ اس پتے پر مل جائے گا۔ میں یہ پرچہ سنبھال کے رکھوں گی۔ (صرف اپنے انٹرویو والا پرچہ)

☆☆

باتیں غنیٰ علی عمیر سے

شاہین رشید

1۔ ''اصلی نام؟''
''غنیٰ علی عمیر۔''
2۔ ''پیار کا نام؟''
''غنو۔''
3۔ ''تاریخ پیدائش/سال؟''
''26 جنوری/1994ء۔''
4۔ ''قد/ستارہ؟''
''5 فٹ 7 انچ۔''
5۔ ''مادری زبان؟''
''پنجابی اور اردو۔''
6۔ ''فیملی ممبر/آپ کا نمبر؟''
''پانچ بہن بھائی/میرا نمبر آخری ہے۔''
7۔ ''اس فیلڈ میں کیسے آئیں گھر والوں کا ردعمل؟''
''اسکول کے زمانے سے شوق تھا اس فیلڈ میں آنے کا اور اتفاق سے چانس بھی مل گیا۔ گھر والے خوش نہیں تھے۔''
8۔ ''تعلیم؟/شادی؟''
''اے لیول/ الحمد للہ شادی ہو گئی ہے اور دو بچے ہیں ماشاءاللہ۔''
9۔ ''پہلا ڈرامہ/شہرت؟''
''رنگ ریزہ اور قلم نے شہرت دی۔''
10۔ ''بچپن میں کس سے بہت ڈر لگتا تھا؟''
''بابا سے اور بڑی بہن سے۔''
11۔ ''بچپن کی بری عادت؟''
''درختوں کے اوپر چڑھنا۔''
12۔ ''آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟''
''سات بج کر تیس منٹ پر۔''
13۔ ''صبح اٹھتے ہی کس چیز کی طلب ہوتی ہے؟''
''ناشتے کی۔''
14۔ ''کیا برداشت نہیں بھوک یا غصہ؟''
''غصہ برداشت نہیں ہے۔''
15۔ ''پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہیں؟''
''اب تو سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔''
16۔ ''سیاست میں کون پسند ہے؟''
''کوئی بھی نہیں۔''
17۔ ''کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟''
''سوئیزرلینڈ کی۔''
18۔ ''کس چیز پر پیسہ خرچ کر کے پچھتاتی ہیں؟''
''کسی چیز پر بھی نہیں۔''
19۔ ''کھیلوں سے آپ کا لگاؤ/کون سا کھیل پسند ہے؟''
''ہاں ہے/بیڈمنٹن۔''
20۔ ''کس بات پر آپ کی آواز اونچی ہو جاتی ہے؟''
''جب کچھ لوگ مجھے ہراس کرتے ہیں۔''
21۔ ''تین چیزیں جنہیں خریدنا آپ کا خواب ہے؟''
''Range rover کار خریدنا میرا خواب ہے۔''
22۔ ''کس کی خاطر فیلڈ چھوڑ سکتی ہیں؟''
''اپنی فیملی کی خاطر۔''
23۔ ''کون سا کام ایسا ہے جو پہلے کبھی نہیں کیا تھا اب کرنے لگی ہیں؟''
''نیند سے بار بار جاگنا۔''
24۔ ''خاندان میں کون جلدی ناراض ہو جاتا ہے؟''
''خفصہ باجی۔''
25۔ ''زندگی میں کچھ واپس ملنے کا چانس ملے تو کیا واپس لینا چاہیں گی؟''



"ایسا کچھ نہیں چاہیے ماضی سے۔"

26۔ "گھر میں آپ کے فیصلے پر مداخلت کون کرتا ہے؟"

"میرے شوہر۔"

27۔ "بیمار ہونے پر بیماری کو سیریس لیتی ہیں؟"

"لیتی ہوں پر زیادہ نہیں۔"

28۔ "اس فیلڈ میں کیا کیا کر چکی ہیں؟"

"صرف ایکٹنگ کی ہے اور ایکٹنگ میرا جنون ہے۔"

29۔ "رول کون سے اچھے لگتے ہیں نگیٹو یا پوزیٹو؟"

"دونوں اچھے لگتے ہیں اور جس میں اداکاری کا مارجن ہو اور کچھ نیا کرنے کو ملے، وہ رول مجھے پسند ہیں۔"

30۔ "کوئی فیصلہ جو غلط ثابت ہوا ہو؟"

"مجھے لگتا ہے کہ اگر میں اپنی تعلیم جاری رکھتی تو زیادہ اچھا ہوتا۔"

31۔ "کچن سے آپ کا لگاؤ؟ کبھی شیف بننے کا سوچا؟"

"مجھے کوکنگ کرنا پسند ہے اپنے میاں صاحب کے لیے خاص طور پر یورپین فوڈ۔"

32۔ "گھر میں کس کی بات کو اہمیت دی جاتی ہے؟"

"میرے میاں صاحب کی ان کی بات آخری ہوتی ہے۔"

33۔ "کس شخصیت پر چاہتے ہوئے بھی غصہ نہیں کر سکتیں؟"

"اپنے بچوں پر غصہ آئے بھی تو نہیں کرتی۔"

34۔ "میٹھے اور نمکین میں کیا پسند ہے؟"

"دونوں پسند ہیں اور کیا کیا پسند ہے تو اس کا انحصار میرے موڈ پر ہے۔"

35۔ "کس مہینہ کا انتظار رہتا ہے؟"

"آئی لو رمضان اور مجھے سب کے لیے افطاری بنانا بہت پسند ہے۔"

سانحہ ارتحال

ہم سب کو دنیا سے چلے جانا ہے۔ یہ قدرت کا اٹل ضابطہ ہے، زندگی کے کھیل تماشے میں کھو کر ہم اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ جب زندگی سے پیارے رشتے، دوست احباب بچھڑتے ہیں تو اس سنگین حقیقت کا احساس گہرا ہو جاتا ہے۔

محمود احمد صاحب جو جگت ماموں تھے ان سے رشتہ بھی تھا اور وہ ہمارے ساتھی بھی تھے۔ ایک عمر کا تعلق تھا۔ ایک پل میں ختم ہو گیا اور وہ دنیا چھوڑ کر چلے گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

احمد ماموں ہمارے گھر کے ایک فرد کی طرح تھے ان کی ابدی جدائی بہت تکلیف دہ ہے لیکن مشیت ایزدی کے سامنے چارہ ہی کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ آمین

36۔ "ملک کی ترقی کی راہ میں کون رکاوٹ ہے حکمران یا عوام؟"
"اس کا جواب تو اب اللہ کے پاس ہے۔"
37۔ "کبھی غربت میں وقت گزارا؟"
"جی...... بالکل گزارا ہے۔"
38۔ "طالب علمی کے زمانے میں کس مضمون کو نا پسند کرتی تھیں؟"
"اکاؤنٹس کو......"
39۔ "ڈاکٹر، حکیم اور ہومیو پیتھک کس پر یقین ہے؟"
"سب پر ہی ہے جو بیماری کو دور کردے۔"
40۔ "دنیا کا سب سے بورنگ کام؟"
"ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر کاٹنا اگر کمپنی اچھی نہ ہو تو۔"
41۔ "کیا دل سے اترا ہوا انسان پہلے جیسا مقام حاصل کرسکتا ہے؟"
"کبھی نہیں۔"
42۔ "رینگنے والے کیڑوں میں کس سے ڈر لگتا ہے؟"
"لال بیگ سے گھن آتی ہے۔"
43۔ "ملک کے لیے کون سا نظام حکومت بہتر رہے گا؟"
"کوئی بھی نہیں۔ اللہ پر چھوڑ دیا ہے یہ معاملہ۔"
44۔ "گھر کا کون سا کام کرنا پسند نہیں؟"
"سب کام پسند ہیں الحمدللہ۔"
45۔ "غصے میں منہ سے کیا نکلتا ہے کبھی توڑ پھوڑ کی؟"
"ہاہاہا...... نہیں۔ میں غصے میں اکیلی بیٹھ جاتی ہوں۔"
46۔ "ٹی وی ٹاک شو یا مارننگ شو میں پسندیدہ اینکر؟"
"آج کل دو اینکر پرسن مجھے پسند ہیں اور بہترین بھی ہیں۔ ایک تو "تابش ہاشمی" اور دوسری "ندا یاسر" کیونکہ یہ دونوں بات کو اور میڈیا کو سمجھتے ہیں۔"
47۔ "آپ کا راز دار کون ہے؟"
"میرے میاں صاحب۔"
48۔ "فیملی یا خاندان میں کسی فرد سے کوئی شکایت؟"
"کسی سے نہیں، لیکن سب کو مجھ سے ہی شکایت ہوگی کیونکہ میں بچپن میں بہت شرارتی تھی۔"
49۔ "کون سی تاریخیں یاد رکھتی ہیں؟"
"خاص موقعوں کی اور سالگرہ کی وغیرہ کی۔"
50۔ "ایک کھانا جو ہمیشہ کھانے کے لیے تیار رہتی ہوں؟"
"دال چاول۔"
51۔ "کیا اپنا ڈرامہ بار بار دیکھتی ہیں؟"
"نہیں بھئی۔ ٹائم ہی نہیں ملتا۔"
52۔ "گھر میں کون پڑھاکو تھا؟"
"سب سے بڑی بہن اقصیٰ باجی۔"
53۔ "ایک غلطی جس پر کبھی معافی نہیں مانگی؟"
"اگر اپنے سین کو بار بار کروں تو کبھی معافی نہیں مانگی۔"
54۔ "مشکل میں کس کو کال کرتی ہیں؟"
"شوہر کو اور اپنی بڑی بہن اقصیٰ کو۔ لیکن شوہر جلدی فون اٹھا لیتے ہیں۔"
55۔ "بچپن میں کس وجہ سے مار کھاتی تھیں؟"
"یہی ایکٹنگ کے چکر میں بہت ماریں کھائی ہیں، چھپ چھپ کر اداکاری کرتی تھی۔"
56۔ "گھر میں کون بی بی سی ہے؟"
"میں ہی ہوں جو نہیں بولنا ہوتا، وہ بھی بول دیتی ہوں۔"
57۔ "کن چیزوں پر زیادہ خرچ کرتی ہیں؟"
"بچوں کے کپڑوں پر۔"
58۔ "کون سا رول کرنا چاہتی ہیں؟"
"ایک اسٹرونگ خاتون کا جو ہر چیز Achieve کرنا چاہتی ہے یا کرسکتی ہے جو محنت پر


MARHABA
SINCE 1975





یقین رکھتی ہے جو یہ جانتی ہے کہ کیا غلط ہے کیا صحیح اور جو اللہ پر یقین رکھتی ہو۔"

59۔ "کس سیاست دان کا رول کرنا چاہتی ہیں؟"
"بے نظیر بھٹو کا رول کرنا چاہتی ہوں۔"

60۔ "گھر میں بچت کی عادت کس کو ہے؟"
"مجھے ہی ہے۔"

61۔ "علم نجوم پر یقین ہے، کبھی نجومی کو ہاتھ دکھایا؟"
"میں اسے صرف فن کے لیے لیتی ہوں۔ مجھے ان پر کوئی بھروسا نہیں ہے۔"

62۔ "کس کام کے لیے بہت سوچتی ہیں؟"
"کسی کے لیے گفٹ لینے سے پہلے۔"

63۔ "کب جھوٹ کا سہارا لیتی ہیں؟"
"جھوٹ بولنے سے بچتی ہوں۔"

64۔ "تقریب میں جانے کے لیے کس کی مرضی سے تیار ہوتی ہیں؟"
"میاں جی کی مرضی سے۔"

65۔ "ادھار کس سے بلا جھجک مانگ لیتی ہیں؟"
"اب کافی ٹائم سے ادھار نہیں لیا کسی سے۔"

66۔ "کس کے روٹھ جانے پر پریشان ہو جاتی ہیں؟"
"شوہر صاحب کے۔"

67۔ "پسندیدہ موسم؟"
"سردیاں بہت پسند ہیں اور بارش بھی بے حد پسند ہے۔"

68۔ "گھر میں کس کی زبان کو بریک لگانا مشکل ہے؟"
"میری زبان کو۔ میرے میاں کہتے ہیں، میری زبان میں کوئی فلٹر نہیں۔"

69۔ "خواتین رائٹرز میں پسندیدہ رائٹر؟"
"فائزہ افتخار، عمیرہ احمد۔"

70۔ "آپ کی فیملی میں کون حاتم طائی ہے؟"
"میرا بھائی ہے مگر زیادہ نہیں۔"

71۔ "شاپنگ کے لیے نکلتی ہیں تو پہلے کس کا خیال آتا ہے؟"
"بچوں کے لیے شاپنگ کرنا مجھے بہت پسند ہے۔"

72۔ "اپنی تعریف سن کر کیسا محسوس ہوتا ہے؟"
"اچھا اور ڈر بھی لگ جاتا ہے۔"

73۔ "کبھی چھپ چھپ کر دوسروں کی باتیں سنیں؟"
"ہاں...... امی کی بہت بار باتیں سنیں۔"

74۔ "کبھی ڈیتھ سین کرنا پڑے تو؟"
"کرلوں گی سب، مسئلہ نہیں۔"

۔ "بچت کس شکل میں کرتی ہیں؟"
"پیسے ہی نہیں بچتے اس مہنگائی میں تو بچت کیا ہوگی۔"

"شادی میں کون سی رسموں کے خلاف ہیں؟"
"جہیز...... شدید ناپسند ہے۔ آپ کو اپنی سب سے قیمتی چیز والدین دے رہے ہوتے ہیں۔ مگر جہیز بھی لازمی چاہیے ہوتا ہے۔ اس لیے اس رسم کے خلاف ہوں۔"

۔ "کون سا کھانا کھانا مشکل لگتا ہے؟"
"کڑھی چاول بہت بھاری لگتے ہیں۔"

۔ "آپ کے موبائل پر صبح سویرے پہلا میسج کس کا آتا ہے؟"
"میرے ابو کا۔"

۔ "پسندیدہ مہینہ؟"
"رمضان المبارک بہت پسند ہے۔"

91۔ "کھانا کہاں کھانا پسند کرتی ہیں۔ بیڈ، چٹائی یا ڈائیننگ ٹیبل؟"
"ڈائننگ ٹیبل پہ۔"

92۔ "گھر میں کس کے لیے اپنا شیڈول بدل سکتی ہیں؟"
"اپنے شوہر کے لیے۔"

93۔ "اچھی بری خبر پہلے کس کو سناتی ہیں؟"
"اپنے شوہر کو۔"

94۔ "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"اللہ مالک ہے۔ مسئلہ نہیں، میری قسمت میں لکھا ہوگا۔" ☆☆☆



نامۂ خاتون



خط بھجوانے کے لیے پتا۔
خواتین ڈائجسٹ۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:Info@khawateendigest.com

صفیہ مہر فرحان...... کوٹلی مراد تحصیل خان پور

سب سے پہلے میں خط پڑھتی ہوں، گوشی جمال کا خط بہت پسند آتا ہے، لڑکی ہو کر گھر کے لیے دکان کھول لی۔ قابل تحسین، میرا بھی بڑا دل کرتا ہے کہ کچھ کروں، کوئی کاروبار چھوٹا ہی سہی" رابیل سعید کا خط بھی اچھا تھا بہت سی بہنیں نئی تھیں خط کی محفل میں۔ راحت جبیں کا ناول، انگنا پھول کھلیں گے میں، ثانیہ کی سمجھ نہیں آتی عبید کو پا کر بھی مطمئن نہیں ہو پا رہی۔

افسانہ، دنیا کا سوال، یہی ہوتا ہے۔ بہنوں کو لگتا ہے کہ بھائی عیاشی کر رہے ہیں لیکن وہ بھی مہنگائی کو بھگت رہے ہوتے ہیں۔ لبنیٰ آصف کا "غلطی" مائیں نادانیوں میں اکثر یہ غلطی کر جاتی ہیں، اچھا پوائنٹ لائی ہیں لبنیٰ جی "عنبرین ابدال کا ناولٹ" خوش رنگ تتلی...... "انعم کو خوش دیکھ کر دوسری بہنوں کی حیرت پر حیرت ہوتی رہی کہ بہنوں انعم بھی سسرال میں ہی تھی، کوئی پرستان میں نہیں۔

فلک تنویر کا مکمل ناول "اس کی آنکھوں کے راز" شاید انہوں نے کوئی سچا واقعہ اپنے قلم سے لکھ کر خوب صورت کہانی کی تشکیل کر کے ہمیں دیا۔ نمرہ احمد نے "نملا" لکھ کر ہم پر احسان کر دیا، مزہ کم ہونے میں نہیں آ رہا۔ نوشین فیاض، فراق موسم ابھی پڑھ رہی ہوں سوری "احد" صوفیہ بٹ کا لمبا ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے احمل اسود کو پسند کرتی تھی۔ اب رام کو لکی کو اور اسود بھی ابھی تک خاموش ہے، نظمیں، غزلیں ہر بار کی طرح اچھی لگیں۔ خاتون کی ڈائری طیبہ ہاشمی کی ڈائری دل کو لگی، موسم کے پکوان ہم گاؤں کے باشندے ایسے پکوان پکا۔ نہ لگیں تو بہت سی چیزیں ملتی نہیں۔ سادہ پکوان کی ترکیب دیا کریں۔ آپ کا باورچی خانہ میں شبانہ نسیم کی کھیر آسان سی لگ رہی ہے بنانے کا ارادہ کر چکی ہوں میں، میری بیاض سے، فائقہ کپیل کا شعر بھایا، نفسیاتی الجھنیں، سب کی اپنی الجھنیں ہیں، کوئی مکمل زندگی نہیں گزار پاتا۔

ج۔ پیاری صفیہ......! زرینہ لغاری اور ریحانہ چوہدری پرچے میں شامل ہیں۔ کوثر خالد پتا نہیں کہاں غائب ہو گئی ہیں۔ ہمیں بھی ان کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔ ان کا فون بھی بند جا رہا ہے۔ اللہ کرے خیریت سے ہوں۔ کوثر پلیز رابطہ کریں۔ آپ کی مسلسل خاموشی ہمیں تشویش میں مبتلا کر رہی ہے۔ صوفیہ بٹ کے ناول میں احمل اسود سے انسیت ضرور کرتی ہے لیکن بالکل اسی طرح جیسے ہمایوں اور دیگر لڑکوں سے وہ انہیں بھائی ہی سمجھتی ہے۔

صدف ناصر...... گوجرانوالہ

ٹائٹل گرل فریش فریش مسکراہٹ لیے اچھی لگی۔ آپ کو بھی یہ سن کر اچھا لگے گا کہ اس سال کا ہمارا بھی یہ بارہواں تبصرہ ہے۔ غیر حاضری ہماری ڈکشنری میں نہیں۔ ہمیں داد دیجیے۔ "کہنی سنی" کے سانحات نے اداس اداس کر دیا۔ مگر سچ فرمایا آپ نے نہ ہی ہم پر کوئی اثر ہے نہ کوئی سبق ہی سیکھا ہے۔

"سروے"۔ کے سوالات "رمشا روشن" طرح اس مرتبہ ہمیں بھی سمجھ میں نہیں آئے۔ (پہلے دو سوال) (ہاہاہا) "کرن کرن روشنی" کا ہر لفظ با معنی اور خیر و عافیت کا ذخیرہ

لیے ہوئے ہے۔ "رمشا خان" سے ملاقات کے لیے تہہ دل سے "شاہین" کے شکر گزار ہیں۔ "ہمارے نام" ہر دل عزیز سلسلہ۔ "کوشی" نے حسب معمول دل خوش کیا۔ آپ کو غلطی لگی نومبر کے باورچی خانہ کو "ناہید اسماعیل" نے نہیں بلکہ "ارم احتشام" نے رونق بخشی ہے، سب ہی بہنوں کے تبصرے جاندار رہے۔

"انگنا پھول کھلیں گے" کے پھول ڈھونڈنے نکلے تو کانٹے ہی ملے۔ غصے سے برا حال ہے ہمارا کیونکہ پچھلے ماہ بھی اور اس ماہ بھی اس تحریر میں کوئی اور قسط وار تحریر لگا دی گئی ہے۔ (غلطی سے) کوئی معذرت، مانی اور بی بی جان کی کہانی ہے۔

"اس کی آنکھوں کے راز" فلک تنویر نے عمیرا احمد کی یاد دلا دی۔ بلاشبہ بہترین لوک داستان۔ بہترین انداز بیان۔ وگمہ اور دوران آفریدی یادگار کردار۔

"فراق موسم ٹھہر گئے ہیں" عورت کو یہی سکھایا جاتا ہے کہ اصل محبت شادی کے بعد شوہر سے ہے۔ تو "رابعہ" نے محبت، وفاداری، خلوص کی انتہا کر ڈالی۔ بیس سال اور بدلے میں ملا کیا۔ "احمل" اور "توصیف حیدر" نامی سزائیں۔ جنھوں نے اپنی کمزوریوں اور لغزشوں کو محبت کا نام دے ڈالا۔ اور "رابعہ" کو لولے لنگڑے جواز کی بنا پر (کہ محبت نہیں ہے) بے مراد ٹھہرایا۔ میں نہیں مانتی۔ سوری! ایک بہترین بیوی کے ساتھ یہ سلوک بدترین رہا۔

"افسانوں" کی بات کریں تو "قرۃ العین خرم" کا افسانہ ٹاپ کلاس رہا۔ واقعی اکثریت میں بیٹیاں اپنے حقوق تو خوب یاد رکھتی ہیں، مگر فرائض یکسر بھول جاتی ہیں۔ "غلطی" نے بھی ہماری غلطیوں کو خوب سنوارا۔

"ریحانہ وقاص" نے "راجا مہاراجا" لکھ کر پھر سے دل جیت لیے۔ "سمیرا" کے راجا کا خوب علاج کیا گیا۔ پڑھ کر ہنسی آ گئی۔ شکر ہے کسی جگہ ہنسی آئی ہے، ورنہ تحریروں میں اب مزاح ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل رہا۔ "سرسوں کا ساگ اور مکئی کی روٹی" نے دل باغ باغ کر دیا۔ "فش بالز" نئی اور آسان ریسپی۔ لازمی ٹرائی کریں گے۔ ان شاء اللہ! "باورچی خانہ" شبانہ تسیم کی "کھیر" کی ڈش پسند آئی۔

"میری بیاض سے" صرف "فاکہہ سہیل" کا بھیجا شعر اچھا لگا ہے۔ "نفسیاتی ازدواجی الجھنیں" میں "عدنان بھائی" نے سب کی الجھنیں خوب سلجھائیں، اگر کوئی سلجھا لے خود کو تو۔

جلتے پیروں (پاؤں) کا بھی کوئی ٹوٹکہ بتا دیں۔ کیونکہ ڈاکٹر کے پاس جانا ہمیں پسند نہیں۔ لیں جی! تبصرہ ختم شد۔ مجموعی طور پر ماہ دسمبر کا شمارہ 99% رہا۔ ایک پرسنٹ میں "انگنا پھول کھلیں گے" کی کاپی پیسٹ نے تنگ کیا۔ مزاح کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ داد تو آپ کو ہر ماہ ہی دیتے ہیں۔

ج۔ پیاری صدف.....! آپ کے سروے کا تیسرے سوال کا جواب ہم نے سروے میں شامل کر لیا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر سوال کا جواب دیا جائے اگر آپ کو کوئی سوال مشکل لگے تو چھوڑ سکتی ہیں۔ آپ کا جواب بہت دلچسپ ہے۔ پرچا اسٹال سے چیک کرالیں بائینڈنگ کی غلطی سے ایسا ہوا ہے۔

تبصرہ تو ہمیشہ ہی بہت جامع اور مکمل ہوتا ہے۔

سعدیہ مصطفیٰ.....مڑھ بھنگواں

"کہنی سُنی" سال نو سروے" کے سوالات بہت اچھے تھے۔ اچھا لگا دوسرا سوال۔

"کرن کرن روشنی" آل ٹائم فیورٹ "بیسٹ ٹاپک" تھا۔

"شازیہ الطاف" کا انٹرویو ایسا تھا جیسے ہم کوئی افسانہ پڑھ رہے ہیں۔ ان کے انٹرویو کی نوے فیصد باتیں ماضی کی تھیں (بچپن) مگر وہ ماضی آج ہمارے "حال" میں واقعات ہو رہے ہیں۔ بھئی ہمارا ابھی بچپن ہے ناں اس لیے۔

"ہمارے نام میں" اپنا نام دیکھ کر ہمیشہ کی طرح اچھا لگا۔ آپ نے "ہمارے نام میں" سعدیہ مصطفیٰ" کے آگے "مڑھ بھنگواں" کی جگہ "گاؤں گڑھ بھنگواں" لکھا تھا۔

"غلطی" از دا بیسٹ افسانہ۔ آل موسٹ یہ سب ہی گھروں کا "کامن" مسئلہ ہے۔

اگر بات "مالا" کی کروں تو..... "کتنا اچھا لکھتی ہیں ناں "نمرہ احمد"۔ چلو شکر ہے "ماہر" نے ایک عادت تو

چھوڑی کسی کے پیچھے بھاگنے والی عادت)۔

"فراق موسم ٹھہر گئے" ناول کا نام دلکش سا لگا۔"خاتون کی ڈائری" میں پہلی غزل دسمبر کے حوالے سے تھی پسند آئی۔یار دسمبر ویسے اتنا اداس کیوں ہوتا ہے۔

ج:۔پیاری سعدیہ......!معذرت کہ آپ کے گاؤں کا نام غلط شائع ہو گیا۔معذرت کرنے میں شرمندگی کی کوئی بات نہیں، غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے لیکن غلطی ہو جانے پر اس پر ڈٹے رہنا کم عقلی کی دلیل ہے۔

خواتین کی محفل میں شرکت کے لیے شکریہ۔

حزنہ کرن......گوجرانوالہ

اس مہینے خواتین جلدی مل گیا۔لیکن میں بیمار پڑ گئی تھی۔ہم اپنے کالج کے ٹرپ پہ گئے تھے۔اسلام آباد تو ٹرپ سے واپس آ کر جتنی بھی لڑکیاں گئی تھیں ۔وہ سب بیمار ہو گئیں اور اب اللہ کا شکر ہے ٹھیک ہو گئے ہیں۔اب چلتے ہیں۔تبصرے کی طرف۔ٹائٹل گرل بالکل بھی پسند نہ آئی۔ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار دے رہی ہیں۔نفسیاتی الجھنیں پڑھ کر بہت دکھ ہوتا ہے۔عدنان بھائی مجھے بہت پسند ہیں۔کیونکہ میرا بھی خواب ہے کہ میں سائیکالوجسٹ بنوں۔بس گھر والے مان جائیں۔وہ کہتے ہیں کہ سائیکالوجی پڑھ کر تم خود پاگل ہو جاؤ گی۔"ہمارے نام" میں گوشی جمال سے ہی تو رونق لگتی ہے۔گوشی جی آپ قارئین کی محفل کی جان ہیں۔صائمہ گل جی کا خط پڑھ کر بھوک لگ گئی۔امی کے بعد تو اب ترس ترس کے ساگ کھانے کو ملتا ہے۔اگر ماسی بھیج دیں تو۔مجھے گاؤں جانے کا شوق ہے مگر کبھی گئی نہیں۔رمشا خان کا انٹرویو اچھا رہا،وہ ایک بہترین ایکٹریس ہیں۔شازیہ جی سے بھی ملاقات اچھی رہی۔ان کے بچپن کا سن کر دل کیا کاش ہمارا بھی بچپن ایسا ہوتا،افسانوں میں "غلطی" بہت پسند آیا۔باقی دونوں افسانے بھی اچھے تھے۔اور "آنگنا پھول کھلیں گے" میں ثانیہ کا اچانک سے اتنا اچھا ہو جانا ہضم نہیں ہو رہا۔اور جہاں تک میرا خیال ہے۔ارم کی شادی عفان سے ہی ہو گی۔"مالا" دل کرتا ہے نمرہ جی کے ہاتھ چوم لوں۔میں ان کی بہت بڑی فین ہوں۔یہ قسط بہت مزے کی تھی کیونکہ مالا اور ماہر کی ملاقات ہو گئی اور ہمارا ماہر ماموں بننے سے بچ گیا۔شکر ہے(ہاہاہا)ناولٹ "خوش رنگ تتلی" اچھا تھا اس سے ہمارے جیسی کنواری لڑکیوں کو ایک اچھا سبق سیکھنے کو ملا۔مکمل ناول میں "فراق موسم ٹھہر گئے ہیں" بہت زیادہ پسند آیا۔اور "دانہ پانی" کا دوسرا سیزن کب آئے گا۔"آپ کا باورچی خانہ" میں شبانہ نسیم کی کھیر کی ترکیب نوٹ کر لی شادی کے بعد بناؤں گی اپنی (ہاہاہا)

ج:۔پیاری حزنہ!آپ کی خوش مزاجی بہت اچھی لگی۔اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ اسی طرح ہنستا رکھے۔آمین۔اسلام آباد کی آب و ہوا تو بہت اچھی ہے آپ سب وہاں سے آ کر کیوں بیمار ہو گئیں۔اور ہنستی ہوئی ٹائٹل گرل آپ کو کیوں اچھی نہیں لگی بھئی وہ بھی آپ کی طرح خوش اخلاق تھی۔

نصرت زاہد......لاہور

کھلی کھلی سی رنگت والے خوب صورت ڈریس میں ہنستی مسکراتی ماڈل کو دیکھ کر ایک خوش گوار تاثر کا احساس ہوا۔کہنی سنی پڑھ کر دل دکھی ہو گیا۔ملک کی باگ ڈور کوئی ایسا حکمران سنبھالے جو بہترین فیصلے کرنے کی صلاحیت کے ساتھ عوام کی بھلائی کے لیے دردِ دل رکھتا ہو۔کرن کرن روشنی سے دل کو منور کرتے ہوئے آگے بڑھے۔

سادہ سی پیاری سی شازیہ کا انٹرویو بہت اچھا تھا۔بچے اور گھر کے لوگ ہمیشہ دلوں میں قابل قدر جگہ بناتے ہیں شازیہ صاحبہ بھی ان ہی پیارے لوگوں میں سے ایک ہیں۔ہمارے نام میں سب بہنوں کے خطوط اچھے تھے گوشی جمال کا ناک میں سرسوں کا تیل لگانے والا ٹوٹکہ بہت کارآمد ہے اور میرا آزمودہ بھی ہے ہمارے فیملی ڈاکٹر بھی یہ ٹوٹکہ استعمال کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

چلیں اچھا ہوا ارم نہیں مانا اور اسود کا رستہ صاف ہو گیا۔بس اچھے چوہدری (ہمایوں) کو ذرا سائیڈ پر

بقیہ صفحہ 201 پر

راحت جبین

آنگنا پھول کھلیں گے

چودھویں قسط

"کس بات کا جشن ہو رہا ہے؟" سب نے چونک کر نمووارد کو دیکھا۔

ثانیہ بے اختیار کھڑی ہوئی۔ سامنے کھڑی نتاشا کو دیکھ کر اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔

"میں تو ملنے آئی تھی ارم سے، مجھے نہیں پتا تھا...... یہاں کوئی رسم ہو رہی ہے۔" وہ مسکرائی۔

"آجاؤ بیٹی! خیر سے تمہاری سہیلی کی منگنی ہو رہی ہے۔" دادی نے نتاشا کو پہچانا نہیں تھا۔ وہ سمجھیں ارم کی کوئی سہیلی ہے۔

"پھر تو میں بہت اچھے موقع پر آئی۔" نتاشا چہکی...... ارم نے پزل ہو کر ثانیہ کو دیکھا۔

"ہاں ہاں بہت اچھے موقع پر پہنچی ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ ابھی منہ میٹھا کرواتے ہیں...... ایں...... تم کیوں رک گئیں...... رسم کرو......" دادی نے نادرہ کو ٹوکا...... پھر خوش ہو کر سب کو بتایا......



''ہم تو انگوٹھی بھی ساتھ ہی لائے تھے۔''

نتاشا بیٹھتے بیٹھتے رک گئی...... اس نے بے حد حیرت سے پورے ماحول کو دیکھا۔ گویا اب غور کیا۔

''انگوٹھی نادرہ آنٹی کیوں پہنائیں گی......''

پتا نہیں سوال کس سے تھا...... جواب ترنت دادی کی طرف سے آیا۔

''اب لڑکا نہیں آیا تو لڑکے کی ماں ہی پہنائے گی۔''

نتاشا کا منہ کھل گیا۔ اس نے بے یقینی سے ثانیہ کو دیکھا۔ ثانیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''میرے ساتھ چلو نتاشا! میں تمہیں پوری بات بتاتی ہوں......'' نتاشا ہاتھ چھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹی۔

''کیوں جاؤں......؟ پھر مڑ کر سب کو دیکھا۔ ''رشتہ میرے گھر بھیجا......اور انگوٹھی ارم کو پہنائی جا رہی ہے''

جنہیں نہیں بھی پتا تھا...... وہ بھی حق دق ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔

''انکل! آنٹی! یہ کیا تماشا؟''

ارم نے خفت سے سر جھکا لیا...... قصوروار نہیں تھی۔ مگر شرمندگی ہونے لگی۔

''مجھے کیا پتا...... میں تو بس آیا تھا۔ ان سے پوچھو......'' شبیر صاحب نے کنی کترائی۔

عبید کی سنجیدہ اور ناراض نگاہ ثانیہ پر جم گئی۔ ثانیہ اس نگاہ کی تپش کو پوری طرح محسوس کر رہی تھی۔ اسے کسی بھی طرح اس سچویشن کو سنبھالنا تھا۔

''نتاشا! آئی ایم سوری میں تم سے بہت شرمندہ ہوں...... ہمیں نہیں پتا تھا کہ ارم اور وسیم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں؟''



''پتا نہیں تھا تو میرے گھر کیا لینے آئی تھیں۔ نتاشا چلائی۔

''اور یہ تو ممکن ہی نہیں کہ تم نے ارم کو یہ بات نہ بتائی ہو۔ تم اس سے ہر بات کرتی ہو۔'' توفیق اور آسیہ پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ عبید کا ضبط جواب دے گیا۔ اس کی بہن کا اتنا خاص دن خراب ہو رہا تھا۔

''دیکھیں آپ کا جو بھی مسئلہ ہے آپ گھر جا کر حل کریں۔ یہ موقع نہیں ہے ایسی باتوں کا۔

''مسئلہ یہاں ہے تو حل بھی یہیں کروں گی۔'' اس نے بھڑک کر ارم کو دیکھا۔

''تمہیں شرم آنی چاہیے تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وسیم کے ساتھ میرا رشتہ طے ہو رہا ہے اس پر ڈورے ڈالتے...... اس پر اپنی اداؤں کا جال پھینکتے تمہیں ذرا حیا نہیں آئی۔''

''بس بہت ہو گیا بیٹا! یہ کیا بے ہودگی ہے......'' توفیق صاحب کو غصہ آ گیا۔ ''آپ جائیں یہاں سے۔''

''بی بی! ہمیں رشتہ کرنا ہے اپنے جیسوں میں۔ تمہارے جیسی زبان دراز لڑکی کے ساتھ ہمارا گزارہ ہی نہیں۔ اب جاؤ۔ دفع ہو یہاں سے، جوتوں سمیت ہماری آنکھوں میں گھسی آ رہی ہو۔'' دادی نے مزید لتاڑا۔

''نتاشا! چلو یہاں سے...... مت تماشا کرو......'' ثانیہ نے اس کا بازو پکڑا۔ ''یہ میرا سسرال ہے تم ہرٹ ہوئی ہو میں تم سے معافی مانگتی ہوں...... خدا کے لیے چلو میرے ساتھ۔'' وہ غصے میں آگ بگولہ ہوتی نتاشا کو گھسیٹ کر وہاں سے لے جانے لگی۔ نتاشا کی زبان گویا زہر اگل رہی تھی۔ اس کا ہر لفظ ارم کے وجود کو نیلو نیل کرتا گیا۔

''میرے گھر والے اس رشتے کے لیے ہاں کر بیٹھے تھے۔ اور تم نے مجھ سے میرا منگیتر چھین لیا۔ کبھی خوش نہیں رہو گی۔ میری بددعا ہے۔''

وہ غاصب نہیں تھی مگر غاصب کہلائی۔

وہ حیادار تھی، مگر بے حیا کہلائی......

اس نے کسی غیر مرد کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا تھا مگر ڈورے ڈالنے والی کہی گئی۔ ارم کا جسم پسینہ پسینہ ہونے لگا۔

ہر کوئی بول رہا تھا۔ اور نجانے کیا بول رہا تھا۔

نتاشا کو ثانیہ گھر سے باہر نکال لائی مگر اس کی آواز اب بھی گھر کی فضاؤں میں چلا رہی تھی۔

توفیق گلہ کر رہے تھے۔ انہیں پہلے نتاشا کے گھر والوں کو بتانا چاہیے تھا۔

''اس گھر کی عورتیں......'' شبیر صاحب پھدک رہے تھے۔

دادی نتاشا کو کوس رہی تھیں۔

آسیہ کو قلق ہونے لگا کیا انہوں نے غلط فیصلہ کر لیا......؟ یہ گھرانہ ان کی نفیس طبیعت بیٹی کے قابل کہاں تھا۔

''بیٹیوں کے معاملات بہت نازک ہوتے ہیں۔ اتنی لاپروائی نہیں دکھائی جا سکتی۔'' ثانیہ تیر کی طرح ارم کے پاس آئی۔

''میں بہت معذرت چاہتی ہوں...... آئی ایم سوری یار...... اس کا منہ توڑ کر آئی ہوں۔ خوامخواہ تمہیں اتنی باتیں سنا گئی۔ اس سب میں تمہارا قصور تو نہیں تھا......'' اس نے جلدی سے ٹشو کھینچا اور ارم کے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کرنے لگی۔

''دفع مارو ایسی منہ پھاڑ دیدہ ہوائی لڑکی ہماری ارم کے قدموں کی دھول کے برابر بھی نہیں ہے......'' دادی نے ہاتھ جھاڑے۔

''اب ختم کرو بہت تماشا ہو گیا...... جلدی سے رسم کرو۔'' اور مٹھائی اس کے منہ میں ٹھونسی۔

رابعہ چپ اور گم صم تھی۔ رہ رہ کر گھر والوں پر غصہ آ رہا تھا...... سب ان کی بے وقوفیاں جو آج گلے پڑ رہی تھیں۔

نادرہ نے شرمندگی سے پرس سے انگوٹھی نکالی اور ارم کا ہاتھ پکڑا۔ مگر اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔"

"کیا مطلب؟" ثانیہ سٹپٹائی......

ارم کھڑی ہوگئی، اس نے ایک نظر اپنے ماں باپ اور عبید کو دیکھا۔ ثانیہ نے نتاشا کو بھیج کر جو الفاظ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہے تھے۔ وہ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔

("کمینی کیا کچھ بولتی چلی گئی۔ گلی کے آخر تک مجھے باتیں سناتے۔ ارم پر الزام لگاتے ہوئے گئی ہے۔ نجانے کس کس نے سنا ہوگا......)

"جس رشتے نے بننے سے پہلے ہی میری ذات پر سوالیہ نشان لگا دیا ہو...... میرے کردار کو مشکوک کر دیا ہو...... میں وہ رشتہ کیسے نباہ سکتی ہوں......"

جہاں سب ہکا بکا رہ گئے۔ وہیں نجانے کیوں مگر آسیہ اور توفیق نے اپنے اندر سکون سا اترتا محسوس کیا۔

ارم نے آگے ہو کر دادی کا گھٹنا ہولے سے چھوا۔

"مجھے معاف کر دیں دادی! لیکن مجھے یہ رشتہ قبول نہیں ہے۔"

وہ کہہ کر رکی نہیں۔ تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔

پیچھے اتنی گہری خاموشی تھی۔ جیسے کائنات سے سارے لفظ اٹھ گئے ہوں۔

☆☆☆

پورے گھر کی خاموشی کو اس کے قدموں کی چاپ روندر رہی تھی۔ بے چینی...... جوش...... ہیجان آمیز سرخوشی اسے بیٹھنے نہیں دے رہی تھی۔

ابھی گھر والے خوش خبری لے کر آتے ہوں گے۔

جس کی ہمراہی کے خواب دیکھے وہ اس کے نام کر دی گئی ہے۔

وسیم کی نگاہیں بھٹک بھٹک کر دروازے سے لپٹ رہی تھیں۔ مگر وہ واپس ہوئے تو چپ گم صم نظریں چراتے کوئی اس کمرے میں گھسا تو کوئی اس میں، دادی مٹی کی ڈھیری کی طرح تخت پر ڈھے گئیں۔

"کیا ہوا؟"

"انکار ہو گیا......" ثانیہ نے تھکے تھکے انداز میں بتایا وہ بھی ساتھ ہی چلی آئی تھی۔

"انکار کیسے ہو سکتا ہے......" وسیم کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"بتاتی ہوں......" نادرہ کے دل میں نجانے کیا آئی، وسیم کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے گئیں، ثانیہ دادی کے پاس بیٹھ گئی جو سرد آہیں بھر بھر کے ماحول کو مزید ٹھنڈا کر رہی تھیں۔ انہیں دکھ ہی بہت ہوا تھا، آسیہ کی بیٹی گھر میں آجاتی تو ان کا بڑھاپا ہی سنور جاتا۔

"اچھا کوئی بات نہیں زیادہ دل پر نہ لیں۔" ثانیہ نے تسلی دی۔

"تمہیں وہیں رہنا چاہیے تھا......" دادی نے ٹوکا۔

"مجھے غصہ آ رہا تھا۔ میرا بھائی اس قابل نہیں تھا کہ اسے یوں ٹھکرایا جائے۔" دادی کو حیرت کے ساتھ ہلکی سی خوشی ہوئی، ثانیہ نے غصے کو ٹالنا سیکھ لیا تھا۔

"بڑی غیرت والی ہے ارم، عزت پر بات آئی تو کس دلیری سے خود کو علیحدہ کر لیا۔ اتنی سی عمر میں ایسی سوچ...... ہاں بھئی بیٹی کس کی ہے، ماں کی تربیت نظر آ رہی ہے۔"

دادی اپنے دھیان میں بول رہی تھیں۔

ثانیہ کو تکلیف سی ہوئی، اندر کچھ ٹوٹ پھوٹ شروع ہو گئی ارم کے لیے سب کچھ اتنا آسان کیوں تھا۔

ہاں وہ وسیم سے محبت جو نہیں کرتی۔ ورنہ کھونا اتنا آسان نہ ہوتا، وہ اٹھ کر اندر آ گئی۔

"ارم نے خود انکار کیا ہے؟......" نادرہ نے بے حد مختصر لفظوں میں قصہ سمیٹ دیا تھا۔ نتاشا کا ذکر گول کر گئیں۔ اب جان چھوٹ ہی گئی تھی تو اچھی بات تھی۔ وہ ارم کو بہو بنانا ہی نہیں چاہتی تھیں۔

وسیم ٹھہر رہ گیا، اس کی انگلیوں کی پوروں میں اب بھی گلاب کی خوشبو مہکتی تھی۔

☆☆☆

اس کی انگلی کی پور میں اب بھی کانٹے کی چبھن تھی۔

عبید اس سے الجھ رہا تھا۔

"تم نے جلد بازی کیوں کی۔ ہم اپنی قسمت کا فیصلہ دوسروں کی خواہشوں پر نہیں کر سکتے۔ کوئی کچھ بھی کہہ دے، ہم اسی رخ پر چل پڑیں گے۔ یہ ہماری زندگی ہے اسے، ہم دوسروں کی خواہشوں پر نہیں جی سکتے......"

("پسندیدگی ہو یا محبت...... میرے لیے سب سے آخری نمبر پر ہے...... میرے لیے میرا وقار میرا کردار اور میری عزت نفس سب سے پہلے ہے)

وہ یہ الفاظ کہنا چاہتی تھی۔ مگر نہیں کہا۔ ثانیہ اور عبید ایسی باتیں اپنی ذات پر لے جاتے تھے، بس اتنا ہی کہا اور چپ سادھ لی۔

"کیا کروں گی، ایسے رشتے کا...... جس کے ہونے سے پہلے ہی میرے کردار پر انگلیاں اٹھنے لگیں۔"

عبید تاسف سے بہن کو دیکھنے لگا۔

"اتنا اچھا نہیں بنتے ارم! زندگی گزارنے کے لیے تھوڑی خود غرضی بھی ضروری ہے۔"

"تھوڑی ہو یا زیادہ جہاں غرض آجائے وہاں بات ہی ختم ہو جاتی ہے......"

وہ اپنی ذات میں درویش تھی......

عبید مزید کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ مگر نادرہ نے بہت کچھ کہا۔

"تمہیں سمجھ میں نہیں آتا، اس لڑکی نے تمہیں بے وقوف بنایا ہے۔ وہ تو تم سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی، بس ہمارے گھر میں فساد ڈالنا چاہتی تھی۔ جس طرح ان کے گھر میں ثانیہ کی وجہ سے ہوا۔"

"امی! کیا بات کر رہی ہیں...... ایسا کچھ نہیں تھا۔ ارم ایسی لڑکی نہیں ہے......" ثانیہ ہکا بکا رہ گئی، رابعہ ٹکر ٹکر ماں کا منہ دیکھنے لگی۔

"کیوں ہمارے گھر فساد نہیں ہوا، یہ ہمارے آگے کھڑا نہیں ہوا، اور اب منہ پھاڑ کر انکار کر دیا۔ میری بات مان لو۔ وہ صرف ثانیہ سے بدلہ لے رہی تھی، بڑی معصوم بنتی ہے معصوم ہے نہیں۔ پہلے میرے بیٹے کو محبت کے جال میں پھنسایا اب نہ کر دی کیا چاہتی ہے میرا بیٹا جا کر اس کی منتیں کرے۔"

"امی! ایسا نہیں ہے اس نے یہ سب نتاشا......" نتاشا کا نام ابھی منہ سے نکلا بھی نہ تھا کہ نادرہ نے رابعہ کو تاڑ کر رکھ دیا۔

"چپ کر اسے بہانا چاہیے تھا بہانا۔"

وسیم کو چپ لگ گئی۔

وہ رات اس پر بہت بھاری۔

پہلی محبت...... پہلا پیار پہلا احساس۔

وہ ارم سے پوچھنا چاہتا تھا مگر پوچھ نہ سکا، چپ چاپ واپس لوٹ آیا۔

"وہ اسے اپنے پیچھے بھگانا چاہتی تھی...... تاکہ وہ اسی طرح گھر والوں سے بغاوت کرے جس طرح عبید

نے کی، وہ پھر بھی اس کی نہ ہوتی۔ معصوم چہرے والی مکار لڑکی...... میں نہ تمہاری منت کروں گا۔ نہ تمہارے پیچھے بھاگوں گا۔

"اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔"

☆☆☆

آسیہ اور توفیق مطمئن تھے۔ انہیں لگتا تھا ارم نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔ وہ خاموشی سے بیٹھ کر اس کے بھیجے پیغام ڈیلیٹ کرنے لگی، یہ سارے پہلے کے پیغام تھے، بعد میں تو وہ گم ہی ہو گیا۔ کوئی پیغام کوئی کال کچھ بھی نہیں۔

"شاید ناراض ہو گیا ہے۔"

"اس نے تاسف سے سوچا اور ڈیلیٹ کا آپشن دبا دیا۔

"محبت کی نشانیاں مٹاتے دکھ تو ہوتا ہے ارم!"

اس کے عقب سے ثانیہ کی آواز ابھری، ارم نے موبائل آف کر کے گود میں رکھا اور کیاری کو دیکھنے لگی جس میں گیندے کے پھول کھلے تھے۔

ثانیہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"تم کچھ بھی کہو مگر دکھ تمہاری آنکھوں سے عیاں ہے۔"

ارم نے نظریں چرائیں۔ دکھ تو ہوا تھا۔ جھوٹ کیسے بولتی۔

"میں بھی اسی تکلیف سے گزری تھی...... جب تم لوگوں نے عبید کو مجھ سے دور کرنے کی کوشش کی میں اس لیے تمہارا درد سمجھ سکتی ہوں......"

اس نے بے حد خلوص اور دل داری سے ارم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔

ارم اسے روکنا چاہتی تھی کہ وہ اس موضوع پر بات ہی نہیں کرنا چاہتی۔ مگر چپ رہی......

"امی کہتی ہیں تم نے ہم سے بدلہ لیا ہے۔"

ارم نے تحیر سے ثانیہ کو دیکھا......

"لیکن مجھے ان کی بات پر یقین نہیں آیا، تم ایسی لڑکی نہیں ہو۔"

"سب کچھ تمہارے سامنے ہے ثانیہ!"

"ارم یہ مت کہنا میں تمہیں اکسا رہی ہوں......" ثانیہ کے لہجے میں تذبذب تھا۔

"تم نتاشا کی باتوں سے ڈر گئی ہو۔ لیکن وقت تو اب بھی تمہارے ہاتھ میں ہے...... تھوڑی سی بدنامی مول لے کر محبت مل جائے تو۔"

ارم نے ہاتھ چھڑا لیا اور نرمی سے گویا ہوئی......

"میں ایسی محبت کو دیکھنا بھی گوارا نہ کروں، جس کی قیمت میری نیک نامی ہو۔"

ثانیہ ایک لمحے کو گنگ سی ہو گئی۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے کتنی مختلف تھیں۔ ایک ثانیہ تھی جس نے عبید کو پانے کے لیے خود کو ساری دنیا کے سامنے تماشا بنا لیا۔ اور ایک یہ تھی ارم جو اپنے کردار پر ذرا سی چھینٹ برداشت نہ کر سکی۔ اور اپنی ہر خواہش سے دستبردار ہو گئی۔

دونوں میں سے ٹھیک کون تھا؟......

اس کے ذہن میں سوالیہ نشان ناچنے لگے اور رات کو عبید کے بازو پر سر رکھتے اس نے وہ سوال عبید سے بھی کر لیا۔ وہ نظریں چرا گیا۔

''وسیم بھائی کی اتنی بری حالت تھی، ویسے ارم نے بہت زیادتی کی ہے۔ کسی کی باتوں میں آ کر کیسے میرے بھائی کا دل توڑ دیا اور ایک میں تھی۔'' اس نے ذرا سا توقف کیا۔ بس یہی خواہش تھی کوئی کہہ دے اس نے بالکل ٹھیک کیا سب کچھ بھاڑ میں جائے بس محبت زندہ باد۔

''ایک میں تھی جو تمہیں پانے کے لیے ساری دنیا سے لڑ گئی۔''

اس کے لہجے میں فخر در آیا ہے کسی میں اتنی جرأت......

''ارم مختلف مزاج کی لڑکی ہے...... اس کی سوچ بھی الگ ہے۔'' عبید نے بہت احتیاط سے الفاظ کا چناؤ کیا۔ ورنہ ارم کے رویے نے اسے بھی سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کی محبت غلط نہیں تھی مگر اس محبت کو پانے کے لیے جو طریقہ ثانیہ نے اختیار کیا تھا وہ اسے تھوڑا سا پریشان کر دیتا تھا۔

''میں بہت شرمندہ ہوں۔ ننا شا نے بہت غلط کیا......'' ثانیہ نے اس کے لہجے کا گریز پا لیا۔ تب ہی دل کی چبھن کو دبا کر بات ہی بدل دی۔

''اس میں تمہارا کیا قصور وہ تمہیں بھی کتنی باتیں سنا کر گئی ہے۔'' جب وہ کوئی بات مان کر سوری کرتی تھی تو بہت پیاری لگتی۔ وہ ہٹ دھرم سی ثانیہ غائب ہوتی جا رہی تھی گویا عبید کی محبت نے اسے دھیرے دھیرے بدلنا شروع کر دیا تھا۔

اور تبدیلی کا یہ عمل بہت مثبت اور خوش گوار تھا۔

☆☆☆

''کتنی پیاری ہیں، میں تو کہتی ہوں بی بی جان فوراً رشتہ ڈال دیں۔'' مسرت نے خوب دور نزدیک سے تصویر کا جائزہ لے کر بڑے ہی جوش میں کہا۔

''خاندان بھی اچھا ہے۔ دور پار سے ہماری برادری ہی ہے اپنے بیٹے کے ولیمے پر بھی بلایا تھا میں نے بہانے سے عفان کو بھیجا بھی...... کہ شاید کوئی لڑکی نظر کو بھا جائے...... مگر وہ تو کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتا پھر بہانے سے شادی کی تصویریں بھی منگوالیں ایک نظر دیکھا اور صاف انکار......''

انہوں نے افسردگی سے کہہ کر تصویر مسرت کے ہاتھ سے لے لی وہ چوتھے دن ہی واپس آ گئی تھی۔ کہ اب اس گھر کا مسرت کے بغیر گزارہ ہی نہیں تھا کچھ دن عفان کی غیر موجودگی میں آتی رہی...... لیکن ایک دن گیٹ پر ٹکراؤ ہو ہی گیا۔

عفان کو بھی چپ ہونا ہی پڑا۔

''لگتا ہے آپ کو کچھ زیادہ ہی پسند آ گئی ہے۔''

''اپنے کام سے کام رکھا کرو۔'' عفان کو بھی بے وقت آنا تھا وہ کان دبا کر بھاگی۔ اسے آج دیر سے آفس جانا تھا...... اس کے لیے تیار ہو کر نکلا تھا...... سیاہ پینٹ شرٹ بال جیل لگا کر سیٹ کیے تھے...... شاید کوئی آفیشل میٹنگ تھی...... ورنہ وہ اتنا تیار آفس کے لیے بھی نہیں ہوتا تھا......

''ماشاءاللہ! بہت پیارے لگ رہے ہو...... دولہا بن کر تو بہت ہی پیارے لگو گے......'' عفان کو ہنسی آ گئی۔

''دن میں خواب دیکھنا بند کریں۔''

''کچھ خواب سورج کی روشنی میں دیکھے جاتے ہیں اور ان کی تعبیر دن کی روشنی میں ہی ملتی ہے، کاش تمہیں کسی سے محبت ہی ہو جائے۔'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑی تصویر کو دیکھتے حسرت سے کہا......

''محبت بے کار جذبہ ہے...... وقتی اور ناپائیدار......'' طنزیہ مسکراہٹ......

''خدا کرے میری دعا پوری ہو جائے پھر تمہیں اس جذبے کی صداقت پر یقین آئے گا......'' اس کی

مسکراہٹ سمٹ گئی......

قبرستان کی خاموشی......موت کی خوشبو اوڑھے سرخ گلاب......اس پر لکھا کتبہ محبت کا نوحہ تھا۔

''میں نے اس جذبے کی صداقت کو زبیر کے ساتھ ہی دفنا دیا تھا۔''

بی بی جان کا رنگ پھیکا پڑ گیا......مگر وہ یہ دیکھنے کے لیے رکا نہیں تھا......چلا گیا تھا۔

☆☆☆

آج کے دن کا آغاز اچھا نہیں تھا تو کچھ نہ کچھ گڑبڑ آفس میں بھی چلتی رہی۔ مزدوروں کا معمولی بات پر جھگڑا بڑھا تو وقتی طور پر کام بھی رک گیا۔ اسے خود جا کر مداخلت کرنا پڑی جس کی وجہ سے میٹنگ لیٹ ہوگئی۔ ابھی آفس پہنچا ہی تھا کہ گھر سے کالز پر کالز آنے لگیں۔ دوسری طرف مسرت تھی۔

''چھوٹے صاحب! وہ بیگم صاحبہ......''

''دیکھو بی بی! اگر بیگم صاحبہ نے تمہیں اپنے ساتھ کسی نئے ڈرامے میں شامل کیا ہے۔ تو میرے پاس اس وقت بالکل فرصت نہیں ہے۔'' صبح والی بات ابھی تک اس کے ذہن سے محو نہیں ہوئی تھی۔

''وہ صبح سے کمرے میں بند ہیں۔ دروازہ نہیں کھول رہیں۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔''

وہ آفس کا دروازہ کھولتے کھولتے رک گیا۔

اندر اس کے کلائنٹ اس کا انتظار کر رہے تھے۔

''یہ گھبراہٹوں کے دورے تمہیں دوسرے تیسرے دن پڑتے ہی رہتے ہیں۔ میری میٹنگ اسٹارٹ ہونے والی ہے۔ اب بار بار کال کر کے تنگ نہ کرنا۔''

اس نے غصے سے موبائل آف کیا۔ یہ پہلی بار نہیں تھا۔ وہ جب بھی زیادہ ناراض ہوتیں۔ اسی طرح کمرہ بند کر لیتی تھیں۔ وہ شروع شروع میں گھبرا کر جاتا۔ پھر سمجھ آ گئی۔ وہ دروازہ اپنی مرضی سے ہی کھولتی تھیں۔

''کیا ہوا۔'' چوکیدار نے پوچھا۔ اسے مسرت نے گھبرا کر بلا لیا تھا اس کے کہنے پر عفان کو کال کی تھی۔

''انہوں نے تو میری بات ہی نہیں سنی۔ لیکن میں سچ کہہ رہی ہوں۔ کچھ گڑبڑ ہے میرا دل گھبرا رہا ہے۔ پہلے میرے دروازہ بجانے پر وہ اندر سے ڈانٹ دیتی تھیں۔ اب تو کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ مائی دادو......دادو پکارتا رہا کبھی ایسا ہوا ہے کہ انہوں نے مائی کی بات کا جواب نہ دیا ہو۔'' مسرت سچ میں گھبرائی ہوئی تھی۔ آج واقعی کچھ غیر معمولی تھا۔

''گھر کی چابیاں تو ہوں گی تمہارے پاس کھول کر دیکھ لو۔ کہیں کچھ برا نہ ہو جائے۔''

''چھوٹے صاحب کے کمرے میں ہیں۔ میں لاتی ہوں۔'' وہ عفان کے کمرے تک بھاگی۔ اس کے واپس آنے تک چوکیدار نے بھی کئی بار آوازیں اور دستک دی۔ مگر جواب ندارد تھا۔

اور جب مسرت دروازہ کھول کر اندر گھسی تو وہ بیڈ سے نیچے اوندھے منہ گری تھیں۔

مسرت کی چیخیں نکل گئیں۔

☆☆☆

''ارم!'' ثانیہ اندر آئی۔ موبائل پر مصروف ارم نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''تمہارے لیے کھانا یہیں لے آؤں۔''

''کیوں باقی لوگ کھانا نہیں کھائیں گے۔'' ارم نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں، میں تو تمہاری وجہ سے کہہ رہی تھی۔'' ثانیہ نے دھیمے سے کہا۔

''ثانیہ! میں بالکل نارمل ہوں۔ تمہیں یقین کیوں نہیں آ رہا۔'' ارم موبائل رکھ کر کھڑی ہوگئی۔

"جانتی ہوں تم بہت مضبوط ہو۔" ثانیہ نے ستائشی انداز میں کہا۔
"اور تم بہت اچھی تب ہی تو میرا اتنا خیال رکھتی ہو۔ ورنہ اس انکار پر مجھ سے ناراض بھی ہو سکتی تھیں۔"
"میں نے اچھا ہونا تم سے سیکھا ہے۔" ثانیہ نے آرام سے اعتراف کیا۔
"واقعی......" ارم کو خوش گوار حیرت ہوئی۔
"ہوں اب آجاؤ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"
"ہاں چلو۔" ارم نے جلدی سے چپل پہنے۔ تب ہی نگاہ ڈریسنگ پر گئی۔ وہاں وسیم کا دیا پرفیوم رکھا تھا۔
"ثانیہ!"
ثانیہ رک گئی۔
ارم نے پرفیوم اٹھا کر اس کی طرف پرفیوم بڑھایا۔
"پلیز اسے تم رکھ لو۔ میرے پاس اب اس کو رکھنے کا کوئی جواز نہیں۔"
ثانیہ نے بوتل ہاتھ میں لے لی۔ پھر گہری سانس لے کر ارم کو دیکھا۔
"یہ وسیم نے نہیں دیا تھا۔"
ارم نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔
"میں چاہتی تھی کہ تم دونوں کے درمیان بہت اسٹرونگ فیلنگز ہوں۔ جیسی میرے اور عبید کے درمیان ہیں۔ بس اسی لیے یہ وسیم کے نام سے تمہیں دے دیا۔ کیونکہ تم دونوں کے درمیان بہت جھجک تھی۔ میں وہ دوری اور جھجک مٹانا چاہتی تھی۔"
وہ دھیمے لہجے میں اعتراف کرتی چلی گئی۔
ارم نے ایک لفظ نہیں کہا بس اسے گلے لگا لیا۔
"مطلب یہ پرفیوم میں رکھ سکتی ہوں۔ اپنی سہیلی کا تحفہ سمجھ کر......"
دونوں بے اختیار ہنس دیں۔
"اب جلدی سے کھانا کھالیں۔ پھر ہمیں شاپنگ پر جانا ہے۔"
"شاپنگ؟" ارم نے حیران ہو کر پوچھا۔
"ہاں باہر نکلیں گے گھومیں پھریں گے اور بہت سا انجوائے کریں گے۔"
"میرا موڈ نہیں ہے۔"
"بن جائے گا جب ساتھ نکلیں گے۔" ثانیہ نے بات ہی ختم کر دی۔
مگر عین وقت پر ثانیہ کو رابعہ کی کال آ گئی۔ اسے بچوں کو لے کر ڈاکٹر کے پاس جانا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ ثانیہ اس کے ساتھ جائے ورنہ دونوں بچوں کو سنبھالنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا۔

☆☆☆

"ہاں تو رابعہ کا زیادہ ضروری ہے۔ ارم کا کیا ہے دونوں پھر کسی دن چلی جانا۔" آسیہ نے خوش دلی سے اجازت دے دی۔
"ہاں تم جاؤ۔ میرا تو ویسے بھی موڈ نہیں تھا۔" ارم نے خوش دلی سے کہا تو ثانیہ معذرت کرتی چلی گئی۔
آسیہ کی مسکراتی نظروں نے بہت دور تک اس کا پیچھا کیا۔
"کیا ہوا اماں! آج تو بہو کو بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی ہیں۔" ارم نے شرارت سے کہا۔
"میں تو ہمیشہ ایسی ہی نظروں سے دیکھتی ہوں۔" وہ جھینپ گئیں۔

"کچھ بھول رہی ہیں آپ یہ وہی ثانیہ ہے۔ جو۔" ارم نے انہیں کچھ یاد کروانا چاہا مگر آسیہ نے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

"پرانی باتیں یاد کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب اس نے ہمیں اپنا مان لیا تو ہم نے بھی اسے سر آنکھوں پر بٹھالیا ہے۔ وہ کتنے خلوص سے اس گھر اور مکینوں کے ساتھ رشتہ نباہ رہی ہے تو مجھے بھی پیاری لگتی ہے۔"

"یعنی وہ سارے خدشے ختم کہ کہیں وہ بیٹے کو لے کر الگ نہ ہو جائے۔"

"ہاں۔" انہوں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ "اب تو مجھے اپنے پوتا پوتی کا انتظار ہے۔"

"ابھی سے؟" ارم نے آنکھیں پھیلائیں۔

"ہاں ابھی سے۔" آسیہ نے زور دے کر کہا۔ ماں بیٹی دونوں ہنس دیں۔

☆☆☆

دوپہر کو عبید گھر آ گیا۔ آتے ہی شور مچا دیا۔

"جلدی سے ریڈی ہو جاؤ۔ تم لوگوں کے پاس بس دو گھنٹے ہیں۔ شاپنگ کے لیے۔"

"شاپنگ کے لیے؟" ارم نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ "لیکن ثانیہ تو رابعہ کی ساتھ گئی ہے۔"

"حد ہے یار مجھے پھر کیوں کال کی؟" وہ بےزار ہوا۔

"اسے اچانک جانا پڑ گیا۔" آسیہ نے مداخلت کی۔

"چلو پھر تم تیار ہو جاؤ۔" عبید کو اچانک خیال آیا وہ بھی بہت دنوں سے گھر سے نہیں نکلی۔

"لیکن مجھے تو کچھ بھی نہیں لینا۔"

"کبھی کبھی بغیر وجہ کے بھی شاپنگ کر لیتے ہیں۔ کچھ ثانیہ سے ہی سیکھ لو۔" وہ اسے کھینچ کر لے گیا۔ اور کاش وہ اس دن عبید کے ساتھ مال نہ جاتی۔ وہ نہ کچھ دیکھتی۔

کبھی کبھی حقیقت چھپی رہے تو سکون رہتا ہے۔

عیاں ہو جائے تو سب برباد ہو جاتا ہے۔

جیسے اس کا ثانیہ پر کیا اعتبار برباد ہوا۔

جب اس نے مال میں ثانیہ اور ثنا شا کو ایک ساتھ کھڑے دیکھا۔

وہ اوپر تھی اور وہ دونوں نیچے تھیں۔ ایک ساتھ کھڑی ایک دوسرے سے بات کرتیں۔

جتنا سب کچھ ثنا شا ان کے گھر کر کے گئی تھی۔

کیا اس کے بعد ان دونوں کو ایک ساتھ ہونا چاہیے تھا۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ عبید کچھ دور ایک جینٹس کلاتھنگ شاپ پر تھا۔ وہ جیولری دیکھنے باہر نکلی تھی۔ وہ تیزی سے بھاگی اور ٹکرائی۔

"کیا ٹکرانا آپ کی ہابی ہے۔" وہ بھنا کر بولا۔

"جی ہاں۔" چکراتے سر کو سنبھالتی وہ اس سے زیادہ تیور دکھا گئی۔

"اور یہ شوق پورا کرنے کے لیے آپ کو میں ہی ملتا ہوں۔"

"ارے آپ ہیں کون؟ خوامخواہ فری ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ غصے سے لتاڑ کرتی اس کی طرف دیکھے بھاگی۔

مگر اس نے دیکھ لیا تھا اور پہچان بھی۔ وہ عبید کو کھینچتی ہوئی وہاں تک لائی۔ وہ پوچھتا رہ گیا۔ مگر اب وہ دونوں وہاں نہیں تھیں۔

"میں نے ابھی دیکھا۔ ثانیہ اور ثنا شا ایک ساتھ تھیں۔"

"یار کیسے ممکن ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو گی۔" پھر بھی ارم کی تسلی کے لیے وہ اس کے ساتھ نیچے تک گیا۔ ثانیہ کو کال بھی کی مگر اس نے کال نہیں اٹھائی۔ ارم کو چپ سی لگ گئی۔ اس کا موڈ بہت خراب تھا۔

"بس گھر چلو عبید......" وہ بے زار ہو گئی۔

ان کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی ثانیہ واپس آ گئی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی لڑنے لگی۔

"یہ کیا اکیلے اکیلے شاپنگ کے لیے نکل گئے۔ میں نے کہا بھی تھا کہ مجھے بھی شاپنگ کرنی ہے۔"

"ہاں مگر تمہیں تو شاپنگ نتاشا کے ساتھ کرنا تھی۔ تب ہی تو رابعہ کا بہانا بنا کر چلی گئیں۔" ارم پھٹ پڑی۔ یہ اس کا انداز تھا نہ طریقہ۔

"کیا کہہ رہی ہو۔" ثانیہ بوکھلا گئی۔

"اب تم جھوٹ نہیں بول سکتی۔ میں نے تمہیں خود اپنی آنکھوں سے نتاشا کے ساتھ دیکھا ہے۔"

وہ اتنے زور سے چلائی کہ توفیق اور آسیہ گھبرا کر وہاں آ گئے۔

"یہ مجھ سے کس لہجے میں بات کر رہی ہو۔"

"جو تم ڈیزرو کرتی ہو۔"

"ارم! آرام سے......" عبید کو ٹوکنا پڑا۔

"کیا آرام سے جو لڑکی میرے گھر آ کر اتنا تماشا کر گئی۔ میرے کردار پر اتنے الزام لگا گئی۔ تم اس کے ساتھ شاپنگ کرتی پھر رہی ہو۔"

"مگر ثانیہ تو رابعہ کے ساتھ گئی تھی۔" آسیہ حیران پریشان ثانیہ کو دیکھنے لگیں۔ جس کا چہرہ ضبط سے سرخ ہو رہا تھا۔

"جھوٹ بول کر گئی تھی۔ اور جو کچھ میں دیکھ آئی ہوں۔ وہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اس دن نتاشا کو ثانیہ نے بلایا تھا۔ ورنہ جو لڑکی پہلے کبھی میرے گھر نہیں آئی وہ عین میری منگنی کے دن وہاں کیوں پہنچی۔ وسیم کے نام پر تم نے مجھے برفیوم گفٹ کیا۔ اس سے ملاقات کے لیے چھت پر بھیجا۔ تم میرے ساتھ کیا کرنا چاہ رہی تھیں ثانیہ!"

وہ مٹھیاں بھینچ کر چلا رہی تھی۔ توفیق نے بے اختیار ارم کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ انہوں نے کبھی ارم کا ایسا غصہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو بہت تحمل مزاج اور برداشت والی تھی۔ آج تحمل کا دامن ہاتھ سے چھوٹا تھا تو کچھ تو ہوا ہو گا۔

"میں کیا کرنا چاہ رہی تھی؟" ثانیہ نے پوچھا اس کا چہرہ ہی نہیں آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں۔

"تم صرف مجھے بدنام کرنا چاہتی تھیں۔ اور جب کچھ نہ ہوا تو نتاشا کو بلا لیا۔"

"بس کرو ارم! تم ہر چیز خود سے ہی فرض کرتی جا رہی ہو۔" اب عبید سے رہا نہ گیا تو اسے ٹوکنا پڑا۔

"تو پوچھیں یہ ہم سے رابعہ کا نام لے کر جھوٹ بول کر نتاشا کے ساتھ مال میں کیا کر رہی تھی۔"

سب کی استفہامیہ نگاہیں ثانیہ پر جم گئیں۔

ثانیہ کو اپنا آپ عدالت میں کھڑے مجرم کا سا محسوس ہوا۔

"بتا دو ثانیہ! جو بھی بات ہے۔ کلیئر کر دو تا کہ یہ تماشا ختم ہو۔"

وہ چپ کر کے وہاں سے چلی جانا چاہتی تھی مگر عبید کے کہنے پر رک گئی۔ اسے وضاحت دینے کی عادت نہیں تھی۔ مگر اسے عبید کی خاطر وضاحت دینا تھی۔ جن سے محبت ہو ان کی آنکھوں میں بدگمانی نہیں دیکھی جاتی۔

"میں پہلے سے جانتی ہوں ارم تم میرے اور عبید کے رشتے کے خلاف ہو۔ کچھ بھی کر کے مجھے عبید کی نظروں سے گرانا چاہتی ہو۔ اور اللہ نے تمہیں وہ موقعہ دے دیا۔ انکل آنٹی میں ارم کی کسی بات کے لیے جواب دہ نہیں ہوں۔ لیکن صرف عبید کی خاطر وضاحت دے رہی ہوں۔"

وہ ایک لمحے کو چپ ہوئی۔ ارم اسی طرح اسے گھورتی رہی۔

"مجھے اس طرح دیکھنا بند کرو۔" ثانیہ کو غصہ آگیا۔

"ڈاکٹر کی اپائنٹمنٹ کینسل ہوئی تو میں رابعہ کے ساتھ مال چلی گئی۔ اسے اپنے بچوں کے لیے کچھ چیزیں خریدنا تھیں۔ مجھے وہاں نتاشا مل گئی۔ میں اس سے بس یہ پوچھنے کھڑی ہوگئی کہ اس نے ایسا کیوں کیا اور اسی بات پر ہمارا جھگڑا ہو گیا۔ تو مجھے سب چھوڑ کر گھر واپس آنا تھا۔ صرف اس لیے کہ تم مجھے اس گھر میں برداشت ہی نہیں کر سکتی۔ میں کتنی بھی کوشش کرلوں۔ تم لوگوں کے لیے پرائی ہی رہوں گی۔ تو ٹھیک ہے۔ میں ہی چلی جاتی ہوں۔"

اس نے بات تو تحمل سے شروع کی تھی۔ مگر کرتے کرتے تحمل جواب دے گیا۔ وہ روتی ہوئی وہاں سے بھاگ گئی۔

"اس کے ڈرامے دیکھیں وہاں رابعہ نہیں تھی اور نہ اس کا نتاشا کے ساتھ کوئی جھگڑا ہو رہا تھا۔"

"بس کرو ارم!" عبید نے غصے سے ٹوکا۔

"وہ جھوٹ بول رہی ہے بھائی میں نے خود......"

"آنکھوں دیکھی ہر بات ٹھیک نہیں ہوتی۔ تمہیں غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے۔ ثانیہ نے جو کہا وہ ٹھیک بھی ہو سکتا ہے۔"

"یعنی میں جھوٹ بول رہی ہوں۔" وہ اپنے موقف سے ہٹنے کو تیار نہ تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے ختم کرو اس بات کو۔ اتنی بڑی بات نہیں ہے سر راہ کوئی بھی مل سکتا ہے۔ ارم اپنے کمرے میں جاؤ۔" توفیق صاحب نے بات کو رفع دفع کرنے کی کوشش کی۔

"ثانیہ نے جو کچھ کیا۔ وہ ہمارے سامنے ہے۔ وسیم کی منگنی تقریباً طے تھی۔ یہ جان کر کہ تم وسیم کو پسند کرتی ہو اس نے تمہاری خاطر اسٹینڈ لیا۔ اپنے گھر والوں کو لے آئی۔ اس لڑکی نے ہمارے سامنے ثانیہ کی کتنی بے عزتی کی اور۔"

ارم نے تحیر و بے یقینی سے عبید کو دیکھا۔

اس کا بھائی ثانیہ کی خاطر اس کو جھوٹا ثابت کر رہا تھا۔ اس سے لڑ رہا تھا۔ یعنی عبید کو اس کی کسی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

"اچھا بس ختم کرو اس بات کو......" توفیق صاحب نے بے اختیار ٹوکا۔

"ارم! خدا کے لیے ثانیہ نے بہت خلوص سے تم سب کو اپنا لیا ہے۔ تم بھی دل بڑا کرو۔ اسے اس گھر کا حصہ مان لو۔" عبید کہہ کر چلا گیا۔

ارم کی آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر گئیں۔ آنسو آنکھوں میں بے یقینی سے جم گئے۔ آسیہ نے اس کا بازو پکڑا تو وہ چھلک گئی۔

"آپ نے دیکھا عبید نے مجھ سے کس طرح بات کی، میری ہر بات کو جھوٹ سمجھ کر ثانیہ کو سچا ثابت کیا ہے۔"

آسیہ نے اسے پیار سے اپنے ساتھ لگا لیا۔ توفیق صاحب نے ارم کے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ مگر دونوں نے کسی کی حمایت میں ایک لفظ نہ کہا۔ واقعہ ان کی آنکھوں کے سامنے نہیں ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے ارم کو غلط فہمی ہوئی ہو۔ کون جانے ثانیہ جھوٹ ہی بول رہی ہو۔ اس لیے انہوں نے اس واقعے پر خاموشی اختیار کر کے ارم کو بس تسلیاں ہی دی تھیں۔

مگر کوئی بھی تسلی ثانیہ کے دل پر پھاہا نہ رکھ سکی۔ اس نے سامان باندھ لیا تھا۔

عبید نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا جو بیگ کی زپ بند کر رہے تھے۔

"یار! اس طرح تو مت کرو۔"

ثانیہ نے سر اٹھا کر عبید کو دیکھا۔ وہ بیگ کے دوسری طرف کھڑا اسے روک رہا تھا۔

"دیکھو، تمہاری خاطر ان سے لڑ کر آ رہا ہوں۔"

"تم بے شک مت لڑو۔ تم بے شک ارم کی ہر بات پر اعتبار کرو۔ لیکن اگر میں اس وقت یہاں رکی تو طوفان اٹھا دوں گی۔ کیونکہ میں بے وجہ کی الزام تراشیاں برداشت نہیں کر سکتی۔"

اس نے عبید کا ہاتھ جھٹک کر زپ بند کی اور بیگ اٹھا لیا۔

عبید چپ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ مگر پکارا نہیں۔

اس نے اپنی طبیعت اور خواہش کے برخلاف اس کے گھر والوں کے ساتھ رہنے اور بنا کر رکھنے کی کوشش کی تھی۔ ثانیہ کا غصہ بجا تھا، عبید کو یہی لگا وہ آج رات اپنے میکے میں گزارے گی تو صبح تک غصہ اتر جائے گا۔

☆☆☆

عفان اتنا شرمندہ تھا کہ بی بی جان سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔ وہ بھی جب سے گھر آئی تھیں۔ اس سے ایک بار بھی ہم کلام نہ ہوئیں۔ جب بھی کسی کا فون آتا رونا شروع ہو جاتیں۔

"میری کسی کو پرواہ ہی نہیں۔ اسے نظر نہیں آتا۔ میری کیا حالت ہے۔ اکیلے نہیں رہ سکتی ہوں۔ اس سے کہو۔ بچے کو ماں کے حوالے کرے اور مجھے کسی اولڈ ہوم میں داخل کروا کر آزاد گھومے۔"

پھر وہ سب باری باری کال کر کے شروع ہو جاتے۔

"نہیں سنبھال سکتے تو ہمارے پاس بھیج دو۔"

"جیسے ان کی بیویاں دیدہ دل فرش راہ کیے بیٹھی ہیں۔"

وہ زچ ہونے لگا۔

"آپ کیا سب سے میری شکایتیں کرتی رہتی ہیں۔" مسرت ان کے پیروں کی مالش کر رہی تھی۔ وہ مانی کو اٹھائے ان کے کمرے میں آ گیا۔

"اپنی اولاد سے باتیں کرنے کے لیے مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ رکھائی سے بولیں۔

"اور میں کون ہوں۔" وہ کھڑکی کے پاس والے کاؤچ پر بیٹھ گیا۔

"میری کسی اولاد نے مجھے اتنا نہیں ستایا عفان۔" ان کی آواز بھر آئی۔

"آپ کو اس بات پر اتنا یقین ہے کہ آنے والی ہم سب کو جوڑ کر رکھے گی۔"

"نہ رکھے۔ تمہاری تنہائی تو ختم ہو گی۔ مجھے مرنے سے پہلے یہ سکون تو ہو گا کہ تمہارے گھر کو آباد دیکھ لیا ہے۔"

عفان خاموشی سے مانی کے بال سنوارتا رہا۔ مانی کی توجہ ہاتھ میں پکڑے کھلونے پر تھی۔

"کیا نام ہے اس کا......" عفان نے کچھ لمحوں کے بعد پوچھا۔

"کس کا؟" ان کا دھیان نہیں۔ لیکن مسرت کے چہرے پر ایک دم جوش کے تاثرات ابھرے۔

"وہی ہے جس کی خاطر بار بار امریکہ سے کال کروا کر، میری بے عزتی کرواتی رہیں بار بار اسپتال پہنچ جاتی ہیں۔" وہ بہت سنجیدہ تھا۔

"ارم......" مسرت نے ترنت بتایا۔

ایک لمحے کو بی بی جان کا دل بلیوں اچھلا۔ دوسرے لمحے وہ بے نیازی کی چادر اوڑھ گئیں۔

"وہ لڑکی اتنی فالتو نہیں ہے کہ اب تک تمہارے انتظار میں بیٹھی رہے۔"

"آپ کی قسمت۔" عفان کندھے اچکا کر کھڑا ہو گیا۔ "ورنہ میں تو مان ہی گیا تھا۔ چلو بیٹا۔" اس نے مانی کی انگلی پکڑی۔

"ٹک کر بیٹھو۔ کیا پتا تمہاری قسمت ساتھ دے ہی دے۔ میرا موبائل دو مسرت۔"

"لیکن میری ایک شرط ہے۔"
"کیسی شرط۔"
اور شرط سن کر وہ دونوں ہکا بکا رہ گئیں۔
"کوئی فلم چل رہی ہے۔"
"یہی سمجھ لیں۔" وہ اطمینان سے کہہ کر چلا گیا۔
مطلب گیند اب ان کے کورٹ میں تھی۔
وہ حیران پریشان مسرت کا منہ دیکھنے لگیں۔

☆☆☆

"دیکھ یہ شوربہ ہے یا کچا پانی۔" دادی پیالہ سامنے رکھے شبیر کے سامنے دہائیاں دے رہی تھیں۔ سردی کتنی بڑھ گئی تھی اور سینہ بھی جکڑا ہوا تھا۔ ان کا دل گرم گرم شوربے میں روٹی ڈبو کر کھانے کو کر رہا تھا۔
"مرغی کو اندر سے ڈبکی دے کر نکال لیا تھا۔ یہ شوربا ہے یا اس کے غسل کا پانی۔"
"میں کیا کروں اماں، یہ بدبخت عورت میری سنتی کہاں ہے۔" شبیر نے بے چارگی سے کہا۔ زیادہ شور مچانے سے گریز کیا ورنہ نادرہ کا کیا بھروسا اس پانی میں مزید پانی ملا کر انہیں روٹی دے دیتی۔
"وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ عورتیں زیادہ ہی ڈھیٹ اور نافرمان ہو جاتی ہیں۔" انہوں نے بے حد تاسف سے سوچا۔
کچن میں بھنی ہوئی مسالے دار بوٹیاں کھاتی نادرہ دل میں خوب ہنسیں۔
"ساری زندگی مجھے بھی پانی روٹی کے ساتھ ملا تھا۔ اب تم لوگوں کی باری ہے۔" وہ منہ صاف کر کے باہر نکلیں۔
تب ہی ثانیہ دھپ دھپ کرتی آ گئی۔ اس کا اس تیور میں گھر آنا انہونی نہیں تھا۔ اس کے ساتھ بھرا ہوا بیگ تھا۔
"کیا ہوا؟" وہ لپک کر پاس آئیں۔ "کیا ہو گیا ہے۔ کوئی جھگڑا ہو گیا۔ کپڑے کیوں لے آئی۔ ہائے میں مر گئی۔ کہیں انہوں نے تمہیں گھر سے تو نہیں نکال دیا۔"
اس دوران اس نے بیگ دادی کے تخت پر پھینکا۔ اور مڑ کر ماں کو دیکھا۔
"میں رابعہ نہیں ہوں جسے کوئی گھر سے نکال سکے۔ خود چھوڑ آئی ہوں۔"
"مگر کیوں؟"
"کیوں کیا پوچھ رہی ہو۔" شبیر باہر نکلے۔ "شروع ہو گئی ہوں گی اس کی زبان درازیاں، رابعہ کو دیکھا ہے کبھی ناراض ہو کر گھر چھوڑا ہو۔"
"اس کی نوبت ہی کہاں آتی تھی۔ چھ مہینے تو پھوپھو ویسے ہی اسے گھر سے نکال دیتی تھیں۔" وہ پہلے ہی تپی ہوئی تھی۔ شبیر خود بخود دم ہو گئے۔
"اب اس کے طعنے دینا بند بھی کر دو۔ اچھی بیٹیاں اس طرح گھر نہیں چھوڑتیں جس گھر میں ڈولی جائے۔ وہاں سے ان کا جنازہ ہی اٹھتا ہے۔"
غصے کے باوجود ثانیہ کو ہنسی آ گئی۔
"ڈولی جنازہ کس زمانے کی باتیں کر رہے ہیں ابا! نہ میں یہاں سے ڈولی میں گئی اور نہ وہاں سے ابھی میرا ارادہ جنازہ اٹھانے کا ہے۔ اپنی مرضی سے آئی ہوں۔ اپنی مرضی سے ہی جاؤں گی۔"
وہ بیگ اٹھا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شبیر نے تاسف سے بیٹی کو دیکھا۔
"اس کو سمجھانا۔ اچھی سسرال ملی ہے تو قدر کرے۔ بیٹیاں شوہر کے ساتھ میکے آتی ہی اچھی لگتی ہیں۔"

"جواب تو اپنی بیٹی کا سن ہی لیا ہے۔ جو باپ کی نہیں سنتی۔ وہ میری کیا سنے گی۔" نادرہ ثانیہ کے پیچھے لپکیں۔ انہیں سارا معاملہ جاننے کی جلدی تھی۔

☆☆☆

بظاہر تو سب کچھ معمول کے مطابق ہی تھا۔ مگر گھر کی فضا میں عجیب سی اداسی اور خاموشی رچی بسی تھی۔ پھولوں کی کیاریاں مرجھائی اور پودے سر جھکائے تھے۔ خزاں کی پیلاہٹ ان کا پیراہن تھی۔

اس گھر میں خزاں کبھی بھی اتنی اداس نہ تھی۔

ارم کو مایوسی ہوئی کسی نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا۔

عبید کسی سے کہتا تو کچھ نہ تھا۔ بس خاموشی سے دفتر سے آتا اور کمرے میں گھس جاتا۔

توفیق اور آسیہ تھوڑا وقت گزرنے کے انتظار میں تھے کہ فریقین کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے۔

"جاؤ بہو کو لے آؤ۔" توفیق صاحب نے مشورہ دیا۔ "بچی ہے جذباتی ہو گئی۔"

"ہم میں سے تو کسی نے اسے ایک لفظ نہیں کہا اور وہ گھر ہی چھوڑ گئی۔" آسیہ نے شاکی انداز میں کہا۔ گھر کی بات گھر میں ہی رہنی چاہیے تھی۔ اب اس کے گھر والے بھی پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

"آپ لوگ کیوں فکر کر رہے ہیں۔" ارم چائے لائی تھی۔

"عبید اسے زیادہ دن ناراض رہنے نہیں دے گا۔" اس کا لہجہ پھیکا اور بجھا ہوا تھا۔ اس گھر میں پہلا جھگڑا اسی کی وجہ سے ہو گیا۔ لیکن وہ جب جب سوچتی اسے اپنی بات ٹھیک ہی لگتی۔

"عبید تو اپنی بہن کو بھی زیادہ دن ناراض نہیں دیکھ سکتا۔" وہ اندر داخل ہوا۔ ارم خاموشی سے چائے نکالنے لگی۔

"مجھے بھی دے دینا۔" وہ توفیق صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔

ارم نے ہاتھ میں پکڑا کپ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"جاؤ ثانیہ کو بھی لے آؤ۔" آسیہ نے کہا۔

"آ جائے گی۔ کیوں فکر کرتے ہیں۔"

"آئے گی لیکن پہلے خوب نخرے دکھائے گی۔" ارم نے تاسف سے سوچا۔ مگر کہنے سے گریز ہی کیا۔ امی ابو کو بھی اسی بات کی فکر ہے کہ بہو گھر آ جائے کسی نے نہیں پوچھا کہ اس نے ثناشا کی ساتھ مل کر میرا تماشہ کیوں بنایا۔

گھر والوں کے رویے پر وہ دل برداشتہ تھی۔ جسے لوگ اس کا وہم قرار دے رہے تھے۔ اسے وہ اب بھی حقیقت ہی لگتی۔

☆☆☆

ٹھنڈ کی وجہ سے دادی کو کمرے میں شفٹ کرنا پڑا۔ گویا قید تنہائی ہی نصیب ہو گئی۔ گھر کا کوئی بھی فرد جلدی کمرے میں جھانکتا ہی نہیں تھا۔ ٹھنڈ کی وجہ سے ٹانگوں میں درد مستقل رہنے لگا تو نقل و حرکت مزید محدود ہو گئی۔ انہیں ایک ایک چیز کے لیے کئی کئی بار آوازیں دینا پڑتیں۔ تب جا کر سنوائی ہوتی۔ اس لیے انہیں اس بات کی بھی خبر نہ تھی کہ ثانیہ ناراض ہو کر آئی ہے۔ پھر بھی کئی بار ٹوک چکی تھیں۔

"ہر وقت یہاں نہ گھسی رہا کر اپنے گھر پر توجہ دے۔"

"میرا گھر میری توجہ کے بغیر بھی اچھا چل رہا ہے۔"

وہ لاپروائی سے کینو کھاتی [illegible]

[illegible]

[illegible] وہاں پر عبید کی ٹی کالز تھیں۔ مگر وہ اٹھاتی ہی نہیں تھی۔ آفس جانے سے پہلے آیا تو نادرہ نے باہر سے ہی ٹال دیا۔ وہ تو ابھی سوئی ہوئی ہے نہیں اٹھی۔

واپسی پر وہ پھر آ گیا۔
ثانیہ نے کمرے میں جا کر لاک لگا لیا۔
نادرہ شرمندہ ہو گئیں۔اب وہ اوور ہو رہی تھی۔
"اسے سمجھائیں خالہ، اتنی چھوٹی سی بات پر ناراض ہو کر بیٹھ گئی۔"
"چھوٹی بات تو نہیں تھی۔" وہ دبے دبے لفظوں میں بولیں۔
عبید نے ان کی بات کو نظر انداز کر کے دستک دی۔
"ثانیہ! یہ کیا بے وقوفی ہے یار۔"
ثانیہ نے چپ سادھ لی۔
"ابھی غصے میں ہے تو۔"
"اور کتنے دن غصہ رہے گا۔ اس طرح تو مسئلے حل نہیں ہوتے خالہ۔" عبید تھوڑا چڑ کر بولا۔ پھر دوبارہ دستک دی۔
"ثانیہ! دروازہ کھولو، میں بات کرنی ہے۔"
ثانیہ نے بے حد غصے سے دروازہ کھولا۔
"مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔ ساری باتیں تمہاری بہن نے کر لی تھیں۔"
عبید نے آگے ہو کر اس کا ہاتھ ہٹایا اور کمرے میں چلا گیا۔
نادرہ کھسیانی سی ہو کر کچن میں چلی گئیں۔
"تم اس طرح زبردستی میرے کمرے میں داخل نہیں ہو سکتے۔"
"میں ہی تو ہو سکتا ہوں۔" وہ جا کر بیڈ پر بیٹھ گیا دونوں ہاتھ عقب میں رکھ کر اسے اطمینان سے دیکھنے لگا۔
"مجھے اس طرح مت دیکھو۔"
"تو کس طرح دیکھوں۔"
"میری بات سنو۔" وہ انگلی اٹھا کر پاس آئی۔ عبید نے ہاتھ پکڑ لیا اور جھٹکے سے پاس بٹھا لیا۔
"مجھے اس طرح چھوڑ کر آتے تمہیں ترس نہ آیا۔"
وہ ایک لمحے کو گڑبڑائی۔ پھر اکڑ گئی۔
"کسی کو مجھ پر الزام لگاتے ترس آیا؟"
"اب تم غلط بات کر رہی ہو۔ کسی نے تم پر الزام نہیں لگایا۔"
"ارم نے......" اس نے تیزی سے کچھ کہنا چاہا۔ مگر عبید نے اس کی بات کاٹ دی۔
"کسی نے اس کی بات پر اعتبار کیا نہیں نا۔ اسے بس غلط فہمی ہو گئی تھی۔"
"اعتبار نہیں کیا تو اسے کچھ کہا بھی تو نہیں۔"
"تم کون سا وہاں رکیں۔ بس بیگ پیک کیا اور آ گئیں۔" اس نے شکوہ کیا۔
"تو کیا کرتی وہاں بیٹھ کر وضاحتیں دیتی رہتی۔" وہ جل بھن گئی۔
"کیا ہے یار۔" عبید نے اس کے کاندھے پر بکھرے بال سمیٹے۔ "ابھی تو انجوائے کرنے کے دن ہیں۔ ان جھگڑوں کے لیے تو عمر پڑی ہے۔"
"اور میرا کوئی ارادہ نہیں۔ ساری عمر ان جھگڑوں کو نمٹانے کا۔" وہ جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔
"اب تم اوور ہو رہی ہو۔ بات کو ختم کرو۔"

"ٹھیک ہے میں بات ختم کر دیتی ہوں۔ ارم سے کہو، مجھ سے معافی مانگے۔" عبید سنجیدہ ہو گیا۔
"اب تم بات کو بڑھا رہی ہو۔"
"میں صرف بات کو ختم کر رہی ہوں۔ دیکھو عبید۔" اس نے قریب آ کر دونوں ہاتھ عبید کے کندھوں پر رکھے اس کی صراحی دار گردن میں پڑا لاکٹ عبید کی نگاہوں کے سامنے جھولنے لگا۔ اس نے لاکٹ سے نظریں ہٹا کر ثانیہ کے چہرے کو دیکھا۔
"لڑکے اپنے گھر والوں کے بارے میں بڑے خوش گمان ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ میری تمام تر کوششوں کے باوجود انہوں نے مجھے اب تک تسلیم نہیں کیا۔ وہ سب بظاہر بہت اچھے ہیں۔ مگر کچھ نہ کچھ ایسا کرتے ہی رہیں گے جو میرے اور تمہارے درمیان اختلاف کا باعث بنیں۔ میں نے آج انہیں نہ روکا تو یہ سلسلہ کبھی نہیں رکے گا۔"
عبید اس کے ہاتھ ہٹا کر کھڑا ہو گیا۔ سنجیدہ اور بدگمان۔
ثانیہ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔
"سمجھنے کی کوشش کرو۔ ارم مجھ سے بدلہ لے رہی ہے۔ وہ اب بھی وسیم بھائی کو پسند کرتی ہے اس نے جذباتی ہو کر اور خود کو با کردار ثابت کرنے کے لیے انکار تو کر دیا لیکن اب اس سے برداشت نہیں ہو رہا۔ وہ پچھتا رہی ہے اور اس کا بدلہ مجھ سے لے رہی ہے۔"
"فالتو کی باتیں مت کرو۔" عبید کی آواز بلند ہو گئی۔
باہر دروازے میں بتول کا راستہ روک کر کھڑی نادرہ کے کان کھڑے ہوئے تو بتول بھی چونکتی ہوئی۔
کوئی تو بات تھی جو نادرہ اسے اندر بلانے کے بجائے دروازے سے ٹرخا رہی تھیں۔
"میں نے کہا نا بعد میں آ جانا۔ سالن بنا رہی ہوں۔"
"میں کون سا سالن مانگنے آئی ہوں۔" اس نے کمال بے تکلفی سے راستہ لیا اور اندر۔
"میں فالتو کی باتیں نہیں کر رہی۔ وہ حقیقت بتا رہی ہوں۔ جو تمہیں نظر نہیں آ رہی۔"
"تمہارا جتنے دن دل چاہتا ہے یہاں رہ لو۔ جب دماغ ٹھیک ہو جائے تو آ جانا۔"
عبید کو غصہ آ گیا۔ تو اسے ہٹا کر باہر نکلا۔
ثانیہ ششدر سی رہ گئی۔ پھر پیچھے لپکی۔
"ٹھیک ہے تو پھر ان ہی کے پاس جا کر بیٹھو، جن کا دماغ ٹھیک ہے۔" عبید کو غصے میں جاتا دیکھ کر نادرہ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔
"عبید بیٹا، میری بات تو سنو۔"
مگر وہ نہیں رکا خاموشی اور تیزی سے بیرونی دروازہ عبور کر گیا۔
"ہائے اللہ تو چار دن میں جھگڑے بھی شروع ہو گئے۔" بتول نے تعجب سے ثانیہ کو دیکھا۔
"تو آپ کو کیا تکلیف ہے؟" وہ بدلحاظی سے بولی تو نادرہ نے بے اختیار ٹوکا وہ ماں پر ہی الٹ پڑی۔
"کیا ضرورت تھی اسے پیچھے سے آوازیں دینے کی۔"
"اے لو اتنی بدتمیزی سے اپنی سسرال میں بھی بات کرتی ہو گی۔ تب ہی تو چار دنوں میں جھگڑے شروع ہو گئے۔"
"خالہ! آپ تو یہاں سے جائیں۔ خوامخواہ پرائے پھڈے میں ٹانگ نہ اڑا لیا کریں۔" اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔
خالہ کی آنکھیں ابل آئیں۔

"اس کو سمجھاؤ نادرہ، ایسی منہ زور لڑکیوں کے گھر نہیں بستے۔"

"اجڑ گئی تو آپ کے گھر نہیں آؤں گی۔" ثانیہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تو نادرہ نے اپنا ہی سر پیٹ لیا۔

"تمہارے جیسی میری بیٹی ہوتی سو جوتے بھی مارتی اور سسرال بھی چھوڑ کر آتی۔" بتول اونچی آواز میں باتیں سنائے گئی۔ اندر سے دادی کی پکاریں آنے لگیں۔

"کوئی مجھے بھی تو بتاؤ کس بات کا شور ہے۔"

نجانے کون سالائیو شو تھا۔ جسے دیکھنے سے وہ محروم رہ گئی تھیں۔

"بارہ گز کی تمہاری زبان ہے۔ ہر کسی سے لڑنے لڑانے کھڑی ہو جاتی ہو۔ ابھی جا کر پورے محلے میں بتائے گی۔"

"کرتی پھرے۔" ثانیہ نے غصے سے ہاتھ جھٹکا۔

"لینے آیا تھا تو چلی جاتیں نا۔"

"چلی ہی جاؤں گی ساری زندگی یہیں بیٹھنے کا ارادہ تو نہیں ہے۔" وہ واپس کمرے میں چلی گئی۔ دادی کی دہائیاں شروع ہو گئیں۔

"اف...... اس بڑھیا کا گلا کون دبائے۔" نادرہ نے دانت پیسے ذہن تو بتول میں پھنسا تھا اور ٹھیک ہی پھنسا تھا۔ وہ سیدھی آصفہ کے گھر گئی تھی۔ جس کے اپنے ہی دکھڑے تھے۔ موسمیاں چھیل کاٹ کر کھاتی اپنے غم سناتے لگی۔

"برے حالوں میں ہوں۔ ایک بیٹا دربدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ اور دوسرا بیوی کو پیارا ہو گیا۔ ایک بھائی تھا وہ بھی حال پوچھنے نہیں آتا۔"

"لو وہ تو خود برے حالوں میں ہے۔ چار دن کی بیاہی لڑکی جب لڑ جھگڑ کر گھر بیٹھ جائے تو ماں باپ کی کیا حالت ہو گی۔"

"ایں۔" آصفہ کا منہ کھل گیا۔ آنکھوں میں اشتیاق امڈ آیا۔ جس نے بتول کے جوش کو مہمیز کر دیا۔ کچھ دیکھا ،کچھ ان دیکھا۔ چار باتیں خود سے ملا کر رائی کا پہاڑ بن گیا۔ آصفہ نے رابعہ کو بھی بلا لیا۔

"آ جاؤ تم بھی سن لو۔ اپنی بہن کے کرتوت۔"

رابعہ کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔

☆☆☆

"رابعہ نے کہا اور تم نے فون کھڑکا دیا۔ اندازہ بھی ہے اس ارم نے کیسے ثانیہ کا جینا حرام کیا ہوا ہے؟"

ثانیہ اپنے لیے ناشتہ بنا رہی تھی۔ جب نادرہ کی آواز کانوں میں پڑی۔ اسے اندازہ ہو گیا۔ رابعہ کس کو کال کر سکتی ہے۔ وسیم کی کال اور صبح صبح، ثانیہ نے چولہا بند کیا اور دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔ نادرہ دادی کے تخت پر بیٹھی کہہ رہی تھیں۔

"اس کا منصوبہ جو ناکام ہو گیا۔ اس نے تو سوچا تھا انکار کے بعد تم اس کے پیچھے پاگل ہو رہے ہو گے۔ جب ایسا نہیں ہوا تو سارا غصہ ثانیہ پر نکالنے لگی۔"

ثانیہ نے آنکھیں پھیلا کر ماں کو دیکھا۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی میں عبید سے بات کروں گا۔"

ثانیہ نے دونوں ہاتھ ہلا کر منع کیا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ خوامخواہ بات بگڑے گی۔ عبید کو سب پتا ہے اور اس نے وعدہ کیا ہے۔ وہ سب ٹھیک کرے گا۔" انہوں نے جلدی سے تسلی کروائی۔

"اچھی بات ہے۔ ورنہ مجھے بتائیے گا۔ میں خود بات کرلوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" نادرہ نے جلدی سے کال کاٹ کر کوفت سے ثانیہ کو دیکھا۔

"سارے زمانے میں ڈھول بج گیا ہے۔ اب تو چلی جاؤ۔"

"رابعہ کو کیا ضرورت تھی وسیم کو بتانے کی...... اور یہ آپ ارم کے بارے میں کیا کہہ رہی تھیں۔"

"اچھا ہے نا اس کے دل میں کوئی تھوڑا سا بھی ارم کا خیال ہوگا تو نکل جائے گا۔"

"ہوں یہ صبح سے دادی کی آواز نہیں آئی۔"

ثانیہ کو اچانک خیال آیا تو بند دروازے کو دیکھا۔

"اوئی ماں! میں تو بھول گئی۔ اس کو تو صبح کی چائے نہیں دی۔"

نادرہ نے سر پر ہاتھ مارا۔

"جا دیکھ باتھ روم لے کر جا۔ میں چائے بناتی ہوں۔"

ثانیہ نے جا کر دروازہ کھولا۔ بند کمرے میں نیم تاریکی۔ سیلن اور ناگواری بو تھی۔ ثانیہ کو خیال آیا۔ اس نے تو کل سے دادی کو نہیں دیکھا۔ وہ لحاف اوڑھے لیٹی تھیں۔ پاس ہی میز پر ان کی دوائیاں رات کی بچی چائے، بچا ہوا دلیہ، دورس، سرسوں کے تیل کی شیشی، کنگھا اور نجانے کیا کیا الم غلم بھرا تھا۔

"دادی......" اس نے پکارنے کے ساتھ ساتھ رضائی ہلائی۔

کوئی جواب نہ پا کر اس کا دل دھڑکا۔ پتا نہیں دھڑکا تھا یا خواہش۔

"کہیں گزر تو نہیں گئیں۔"

اس نے رضائی ہٹائی۔

چہرے کی جھریوں میں آنسوؤں کی ندیاں رواں تھیں۔ گندمی رنگت سیاہی مائل تھی۔ آنکھوں میں بے بسی اور بے وقعتی کا عنصر، مگر اتنا کچھ دیکھنے کے لیے وہاں رکی کہاں تھی۔ ناگوار بو محسوس ہوتے ہی سانس بند کر کے پیچھے ہٹی۔

"کیا ہے دادی، آپ نے بستر گندہ کر دیا۔"

دادی کے پپڑی زدہ لب پھڑپھڑائے مگر بولا نہیں گیا۔ وہ خود ہی دیوار کا سہارا لے کر واش روم چلی جاتی تھیں۔ مگر سردی میں ٹانگوں کا اکڑاؤ اور درد اتنا بڑھ جاتا کہ اٹھنا کار دشوار تھا۔ باتھ روم بھی اٹیچڈ نہیں تھا۔ اور یہاں تو صبح سے گیارہ بجے تک کسی نے جھانکا بھی نہ تھا۔ ورنہ سہارے کے لیے کہہ دیتیں۔ بہت آوازیں دیں۔ مگر اتنی صبح اور سردی کی وجہ سے بستر اور کمرے کو کون چھوڑتا۔

ثانیہ نادرہ کو پکارتی باہر نکل گئی۔

نادرہ کی بڑبڑاہٹیں کچن سے ہی شروع ہوگئی تھیں۔

"یا اللہ اب اس زندگی کا فائدہ ہی کیا ہے۔" انہوں نے آہ بھری۔

کس ناگواری غصے اور بڑبڑاہٹوں کے ساتھ ان دونوں نے، دادی کو صاف ستھرا کر کے باہر تخت پر بٹھایا۔

کمرے میں بکھراؤ ویسے ہی تھا۔ جب رابعہ اور شبیر چلے آئے۔

انہیں دیکھ کر دادی کو رونا آ گیا۔ کسی اپنے کو دیکھ کر رونا آ ہی جاتا ہے۔ وہ بیٹا تھا۔ اسے گھر سے نکلنے سے پہلے ماں کے کمرے میں جھانکنا چاہیے تھا۔ وہ نادرہ پر برسنے لگے۔

"دو دو عورتیں ہیں اس گھر میں دیکھ نہیں سکتیں۔ وہ صبح سے بھوکی پیاسی کمرے میں پڑی ہیں۔"

"مجھے تو کسی یتیم خانے میں جمع کروا دو۔ میرا اب اس گھر میں کوئی والی وارث نہیں ہے۔" دادی رونے لگیں۔

"جتنا ہوتا ہے کرتی ہوں نا۔" نادرہ دل میں شرمندہ تھیں مگر ڈھٹائی اختیار کر گئیں۔ شبیر مزید بولنے لگے تو

ثانیہ کو غصہ آ گیا۔

"بس کریں ابا! آپ کی ماں میری ماں کی ذمہ داری نہیں ہیں۔ دادی کے لیے کوئی نوکرانی رکھوا کر دیں۔"

"تمہاری تو دادی ہیں۔ تم دیکھ لیا کرو یہیں ہوتی ہو۔" رابعہ تڑپ کر بولی۔ "مگر تمہارے کاغذوں میں تو کوئی بھی کسی کی ذمہ داری نہیں ہے۔ ایک بوڑھا انسان بے بسی کی حالت میں پڑا ہے۔ اور تم یہاں بیٹھ کر اس بات کا تعین کر رہی ہو کہ کون کس کی ذمہ داری ہے کیا اللہ اس بات کا حساب نہیں لے گا۔"

"ہمارے مذہب میں ساس، بہو کی ذمہ داری نہیں ہے۔" ثانیہ نے دانت پیسے۔

"ہاں وہ مذہب، جو ہمسائے کے حقوق بھی بتاتا ہے۔ اس نے ساس کے حقوق نہیں بتائے۔ گھر میں موجود ایک بوڑھی معذور ہوتی عورت کے حقوق نہیں بتائے۔ شاید کچھ چیزیں اللہ تعالیٰ نے انسان کی فہم وفراست پر چھوڑ دی تھیں۔ اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ بے شک انسان خسارے میں ہے۔ چلیں دادی بھینس کے آگے بین کیا بجانی۔ ان پر تو جیسے بڑھاپا آنا ہی نہیں ہے۔"

رابعہ کے لہجے کا طنز اور غصہ حد سے سوا تھا۔

وہ ابھی ابھی دادی کا کمرہ سمیٹ کر آئی تھی۔ سہارا دے کر کمرے میں لے آئی۔ شبیر بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے کچھ کہنا چاہا۔

"بس ان کا دماغ۔"

"تیرا دماغ ہے؟" دادی نے نڈھال انداز میں شبیر کو دیکھا۔ پھر رابعہ کو دیکھ کر شکایت لگائی۔

"اس کا فرض نہیں ہے کہ اٹھ کر پہلے ماں کے کمرے میں جھانک لے کہ اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ پر جس کو ماں کی ہی ضرورت نہیں ہے وہ کیوں دیکھے گا۔"

شبیر نے شرمندگی سے گردن جھکا دی۔

"ابا! دادی ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔ آپ کی جنت ہیں۔ آپ لاپرواہی برتیں گے تو کوئی اور کیوں دیکھے گا۔"

دادی نے پیار سے رابعہ کو دیکھا۔

"ایک ہی ہیرا ہے اس گھر میں۔"

پھر کچھ یاد آ گیا تو سرد سی آہ بھری۔

"یا پھر وہ آ جاتی...... ارم میرے وسیم کی زندگی میں تو اس کی زندگی سنور جاتی۔"

رابعہ نے بھی تاسف سے سر جھٹکا۔ اس رشتے کے نہ ہونے کا اسے بھی قلق تھا۔

☆☆☆

ارم نے بے حد حیرت سے موبائل پر آتی وسیم کی کال کو دیکھا۔ اس نے منگنی والے دن کے بعد سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ تو اب کیوں؟

کیا وسیم بھائی نتاشا اور ثانیہ کی ملی بھگت کے بارے میں جانتے ہیں؟ بیل دوبارہ آنے لگی۔

"اب کال کر ہی رہے ہیں تو تم بھی سب بتا دو ارم۔"

اس نے کال لے کر مدھم آواز میں سلام کیا۔

"میں تو تمہیں بہت معصوم سمجھتا تھا ارم۔" وسیم نے چھوٹتے ہی کہا۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



عارفہ فضل شاہ

گھر اسکینہ

صحن میں لگی کیاریوں سے دھنیا، پودینہ توڑ کر شگفتہ نے چٹنی بنائی اور کٹوری میں رکھ کر ڈھانپ دی۔ اماں نے تندور میں بالن ڈال کر روٹیاں لگائیں۔ پلیٹ میں مکھن کا پیڑا رکھ کر سالن ڈالا اور ابا کو کھانا دے دیا۔

سبزی میں مکھن ڈال کر چٹنی کے ساتھ تندور کی روٹی ابا کی پسندیدہ غذا تھی۔ ابا کھانا کھا کر ظہر کی نماز کو روانہ ہوئے تو اماں نے شگفتہ کو کھانا کھانے کے لیے بلایا مگر شگفتہ کے حلق سے نوالہ فیکے کے کہاں اتر سکتا تھا۔ فیکا قریبی مارکیٹ تک گیا تھا۔

بھائی کا خیال آتے ہی شگفتہ کے ہونٹوں پر نرم سی مسکان بکھر گئی۔

☆☆☆

رفیق احمد عرف فیکا شگفتہ کا لاڈلا بھائی اور اماں، ابا کی امیدوں کا واحد مرکز تھا۔ شگفتہ کے لیے خواتین کے رسالے لانے والا فیکا خود بھی ماہناموں اور ناولز کا شوقین تھا۔ اماں نے کبھی اعتراض نہیں کیا اور ابا بھی اس بات پر خوش تھے کہ ڈیجیٹل دور میں ان کے بچے موبائل اور ٹی وی سے دور رہ کر صاف ستھرے ادب کے شیدائی تھے۔

دونوں بہن بھائی اپنی اپنی ذمہ داریاں نبھا کر گرمیوں کی دوپہروں اور سردیوں کی لمبی راتوں میں کہانیاں پڑھتے اور پھر سر جوڑ کر تبصرے کرتے رہتے۔

ناولوں کا شوقین فیکا نہ جانے کب خود کو بھی ہیرو سمجھنے لگا۔ ابا اپنی زمینوں پر کھیتی باڑی میں مصروف رہتے تھے۔

فیکے نے میٹرک کیا تو اس کے بعد ابا کا ہاتھ بٹانے لگا۔ زرعی زمینیں سونا تو نہیں اگلتی تھیں لیکن دونوں باپ بیٹا محنت کرتے تھے تو ان کے گھر کی گاڑی بہت اچھے سے چل رہی تھی۔

اماں سادہ سی گھریلو خاتون تھیں۔ صوم وصلواۃ کی پابند اماں نے اپنے دونوں بچوں کی تربیت بہت اچھی کی تھی۔ فیکا ماں باپ کا فرماں بردار تھا اور شگفتہ گھر کے ہر کام میں طاق۔

پچھلے سال فصل کی کٹائی کے موسم میں شگفتہ کی بات ابا کے بھتیجے سے طے کر دی گئی، جو کام کے سلسلے میں قریبی شہر میں مقیم تھا۔ راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔

فیکے کی نیا ابھی پار نہیں لگی تھی لیکن اسے یقین تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی نٹ کھٹ حسینہ افسانوی انداز میں انٹری دے گی اور اس کی زندگی گل، گلزار بنا دے گی۔

☆☆☆

دوست کی شادی کے ہنگامے جاگے تو فیکے کی دلی مراد بر آئی۔ شاہ بالا بنا دعوتیں اڑاتا فیکا پرعزم تھا۔ صبح صبح تیل سے چپڑے بالوں کی سائیڈ مانگ نکال کر دوست کے گھر کی راہ لیتا اور واپسی رات گئے ہوتی۔ ان دنوں فیکے کی زندگی کا مقصد صرف یہی تھا کہ سب کی خدمت کی جائے۔



افسانوں اور ناولز میں بھی تو ایسا ہی ہوتا ہے ناں۔ معصوم، بھولی بھالی، خدمت گزار ہیروئن سب سے نک چڑھے اور اکڑو ہیرو کو پسند آجاتی ہے۔

فیکا ہیروئن تو نہیں تھا لیکن ہیرو تو تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ اپنی بے لوث خدمت سے شادی والے گھر میں کسی نہ کسی اکھڑ حسینہ کو پسند آجائے گا۔ لڑکیاں بالیاں، ہنستی کھلکھلاتی، اٹھکیلیاں کرتی ہوئی نظر آتیں تو فیکا ان میں اپنی شہزادی ڈھونڈنے لگتا۔

بھائی تو کوئی نہیں تھا فیکے کی ساری امیدیں اس دوست سے وابستہ تھیں، اس کی سالیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا فیکا بہت خوش تھا۔

ہفتے عشرے بعد شادی تو ختم ہوگئی لیکن فیکے کی دلی مراد پوری نہ ہوسکی۔

"اونہہ، نکمی لڑکیاں ویسے تو دن رات شہزادے کے انتظار میں رہتی ہیں۔ سپنے سجاتی ہیں مگر اصل زندگی میں ہیرو ملتا ہے تو سمجھ ہی نہیں پاتیں۔ بزدل کہیں کی۔"

فیکا سوچوں میں غلطاں کھیتوں کی طرف روانہ ہوگیا۔"

اتنے دن وہ مصروف رہا تو ابا اکیلا ہی کھیتوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہا۔ آج فیکے نے کھیتوں کو پانی دینے کا سوچا۔

☆☆☆

کچھ دن گزرے تو اماں نے گھر میں محفل نعت کا اہتمام کروایا۔ خاندان اور گلی محلے کی ہی لڑکیاں مدعو کی گئیں۔ بچپن کا ساتھ تھا۔ سب کے ساتھ اچھی دعا سلام تھی۔ فیکا تھا بھی اکلوتا لہٰذا سودا سلف لانے کی ذمہ داری بھی اس کی تھی۔ سامان لانے سے لے کر دریاں بچھانے تک ہر کام میں پیش پیش تھا۔

خدمت گزاری کا تجربہ تو ناکام تھا لہٰذا فیکے نے آئیڈیا نمبر دو سوچا۔ ہماری پیاری رائیٹرز اکڑو، مغرور، غصے والا ہیرو بھی تو دکھاتی ہیں۔ لہٰذا فیکے نے بھی ایسا ہی روپ دھارا۔ کزنز نے سلام کیا تو آنکھوں میں غصہ بھر کر ایک ابرو چڑھایا اور بغیر سلام کا جواب دیے لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ گلی میں بچے کھیل رہے تھے۔ انہیں وقت کے ضیاع پر ڈانٹا اور بھگا دیا آواز قدرے اونچی رکھی تا کہ گھر میں موجود لڑکیاں سن سکیں۔

برف لے کر گھر آیا تو خاندان کی بڑی بوڑھیوں کے آگے سر جھکایا لیکن ان کے کچھ پوچھنے سے قبل ہی تن فن کرتا کمرے کے اندر چلا گیا۔

"پتا نہیں اسے کیا ہوا ہے؟" ہر کسی کے چہرے پہ حیرت تھی۔

اماں سے مزید صبر کرنا مشکل ہوگیا۔ لڑکیاں تو خاک متاثر ہوتیں، اماں نے مہمانوں کے سامنے ہی اس بدتمیزی پلس بدتہذیبی پر فیکے کے وہ لتے لیے کہ الامان۔

لڑکیوں کی دبی دبی ہنسی نے تو اس کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ مصنوعی غصہ اصلی غصے میں بدل گیا لیکن اماں کے سامنے دوبارہ غلطی نہیں کی اور خاموشی سے سر جھکا کر نکل گیا۔

''دوغلی کہیں کی، لڑکیاں ہوتی ہی ایسی ہیں۔

ناول میں، سب سے اکھڑ لڑکا ان کا آئیڈیل ہوتا ہے۔ آج میں ملا تو دانت اندر نہیں ہو رہے۔ اونہہ۔''

☆☆☆

بقر عید کے بعد شگفتہ کی شادی کی تاریخ طے کر دی گئی۔ اماں کا سب سے اچھا تعلق اور ناتا تھا۔ لہذا ہر وقت کوئی نہ کوئی ہاتھ بٹانے کو موجود رہتا۔ جوڑے ٹانکے جاتے۔ برتن سنبھالے جاتے اور بستروں کو دھوپ لگوائی جاتی۔ سکھی سہیلیاں کام بھی کرتی جاتیں اور چھیڑ چھاڑ بھی جاری رہتی۔

دوست کے پاس ٹک ٹاک پر ویڈیو دیکھی تو فیکے نے بھی ماڈرن بننے کا سوچا۔ سادگی کا تو زمانہ ہی نہیں۔ سب سے زیادہ وائرل ہونے والی وڈیو میں موجود لڑکے کے اسٹائل کو کاپی کیا اور حجام کی دکان پر جا بیٹھا۔

دائیں ابرو میں کٹ لگائے سر کے آدھے بال کٹوا کر آدھا گنجا آدھا بالوں والا سر لیے فیکا گھر پہنچا تو اماں نے تو سینہ تھام لیا۔

''ارے میرا سادہ معصوم بچہ۔ کس سے جھگڑا ہو گیا؟ ٹھیک تو ہو؟ ارے کیا حلیہ کر دیا ہے۔ اللہ خیر۔''

اماں کی چچی نے باقاعدہ بین ڈال دیے، کچھ عمر کا تقاضا تھا کچھ نظر کی کمزوری۔ ان کے زمانے میں تو بچے لڑ جھگڑ کر آتے تب ایسی اجڑی حالت ہوتی تھی۔ سادہ لوح چچی کو کیا پتا یہ تو اب فیشن ہے۔

گھر میں موجود باقی خواتین نے حجام کو کوسنا شروع کر دیا۔ انہیں لگا اس کی غیر ذمے داری اور غلطی سے یہ سب ہوا ہے۔ اماں الگ پریشان۔

گاؤں کے سادہ، معصوم، پرخلوص لوگ جو ٹک ٹاک، وائرل ویڈیوز اور واہیات فیشن سے بے خبر تھے۔ اپنی اپنی رائے دے رہے تھے۔ لڑکیاں، بالیاں شگفتہ سمیت جانتی تھیں کہ فیکا ماڈرن بننے کے چکر میں پھنس گیا ہے۔

فیکے کے ذہن میں تو انگلی پہ پلو لپیٹ کر مسکراتی، شرماتی لجاتی ہیروئن تھی۔ اس نے جب دوپٹہ منہ میں ٹھونس ٹھونس کر ہنسی روکتی لڑکیوں کو دیکھا تو باہر کی راہ لی۔

''ایسے ہی لوگوں کو فالو کر کر کے انہیں آسمان پہ بٹھا دیا ہے۔ بھنویں کٹے، ادھ گنجے لڑکے راتوں رات شہرت پا گئے ہیں اور مجھے دیکھ کر ان کی ہنسی نہیں رک رہی۔ حد ہے منافقت کی۔''

حسب معمول لڑکیوں کو دل میں کوستا ہوا فیکا بے سمت ہی چلتا گیا۔

☆☆☆

شگفتہ کی بارات پہ کلائی پہ گھڑی باندھ کر مختلف کاموں میں مصروف فیکا منتظر تھا کہ کسی حسینہ کا پلو اٹکے گا اور اس کی محبت بھری داستان کا آغاز ہو جائے گا۔

بارات کے ساتھ آنے والی لڑکیوں نے بھائی بھائی کی تان اڑائے رکھی تو گھر میں موجود لڑکیاں بھی بھائی کا راگ ہی الاپ رہی تھیں۔ مختلف جذباتی مناظر کے بعد بارات شگفتہ کو لے کر روانہ ہوئی۔

''بانکا سجیلا نوجوان ان کو نظر ہی نہیں آ رہا۔ میں بات کر رہا ہوں اور ان کی بھائی بھائی کی گردان ہی ختم نہیں ہو رہی۔''

کچھ بہن کے چلے جانے کا غم تھا کچھ اپنی ناقدری کا افسوس۔ فیکے نے سوچوں کو جھٹکا اور اماں، ابا کے پاس جا بیٹھا۔ تینوں کی رات شگفتہ کو یاد کرتے ہوئے گزری۔ ابا اس کا بچپن اور اس سے متعلقہ باتیں یاد کرتے رہے جبکہ اماں اس لمس کو یاد کر رہی تھیں، جب ننھی گڑیا نے ان کی گود میں آنکھیں کھولی تھیں۔

"بیٹیاں کتنی جلدی بڑی ہو جاتی ہیں۔ آنگن ہی ویران نہیں ہوا بلکہ دل کا ایک کونا بھی آج سنسان لگ رہا ہے۔"

ابا کی بات پہ فیکے کی آنکھیں جھلملا گئیں۔ دوستوں جیسی بہن چلی گئی تھی۔ اس کے اچھے نصیب کی دعا کرتے فیکے نے آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

کچھ شادی کی تھکاوٹ تھی اور کچھ بدلتے موسم کے اثرات۔ اماں کو بخار ہوا تو کمزوری کی وجہ سے اٹھنے کے قابل بھی نہ رہیں۔

شگفتہ تو بیاہ کر شہر جا چکی تھی لہذا اسے پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ابا صبح کھیتوں پہ جاتے تو کبھی دوپہر اور کبھی شام ڈھلے واپسی ہوتی۔ ایسی صورت حال میں فیکے نے اماں کی خدمت میں دن رات ایک کر دیا۔ کبھی اماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتا تو کبھی ڈاکٹر کو ہی گھر بلا لاتا۔

رسالوں اور ناولوں نے اسے احساس کرنا بھی سکھایا تھا اور ماہناموں میں موجود کھانوں کی تراکیب نے اسے اچھا خاصا سگھڑ بھی بنا دیا تھا۔ گھر کی جھاڑ پونچھ سے لے کر اماں کی دوائیوں تک کا دھیان رکھتا۔ پرہیزی کھانے بناتا تو اپنے اور ابا کے لیے بھجیا بنا لیتا۔ دن بھر گھر کے کاموں میں اور اماں کی تیمار داری میں مصروف فیکا گھن چکر بنا رہتا۔ بیٹیاں تو ازل سے بیٹا بن کر دکھاتی آئی ہیں لیکن فیکے نے بیٹا ہو کر بھی اصل معنوں میں اماں کی غم گسار خدمت گار بیٹی بن کر دکھا دیا۔

دو ہفتے اس نے اماں کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ شگفتہ کو خبر ملی تو فوراً شوہر کے ہمراہ چلی آئی۔ فیکے نے دونوں کی خوب مہمان نوازی کی۔ شگفتہ نے زبردستی بھی کی۔ ڈانٹا، جھڑکا بھی مگر فیکے نے اسے کوئی بھی کام نہیں کرنے دیا۔

اماں کی طبیعت بہتر ہوئی تو فیکے نے بہن اور بہنوئی کو تحفے، تحائف اور گاؤں کی سوغاتوں کے ساتھ رخصت کر دیا۔ اماں کی طرف سے مطمئن ہو کر اور بھائی کی محبتوں کی ممنون شگفتہ نے فیکے کے ہاتھ چوم لیے۔

☆☆☆

معمولات زندگی اپنی پرانی ڈگر پر چل پڑے۔ فیکے نے بھی دوبارہ ابا کے ساتھ کھیتوں پہ جانا شروع کر دیا۔ اماں کو تنہائی نے تنگ کیا تو بہو لانے کی فکر لاحق ہوگئی۔

اماں اور ابا نے باہمی مشورے سے اماں کی ماموں زاد کی بیٹی کا انتخاب کیا تو فیکے نے ماں باپ کی خواہش پر سر جھکا دیا۔

شگفتہ نے اگلے مہینے چکر لگایا تو باقاعدہ رشتہ ڈالا گیا۔ رسمی مہلت مانگنے کے بعد ہاں کر دی گئی تو گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

کافی دنوں بعد فرصت ملی تو فیکے نے پسندیدہ ناول مکمل کیا اور آنکھیں موند لیں۔

"کیا ہوا جو تم میری زندگی میں افسانوی انداز میں نہیں آئیں۔ میں تاعمر تمہیں اپنے دل کی رانی اور ہیروئن بنا کر رکھوں گا۔"

خیالوں میں اپنی ہونے والی بیوی سے مخاطب فیکا اس بات سے بے خبر تھا کہ ماں باپ کا فرماں بردار، بہن کا غم گسار اور آنے والی لڑکی کے لیے مثبت جذبات رکھنے والا فیکا ہی تو اصل زندگی کا ہیرو ہے۔ احساس کرنے والا محبت سے پیش آنے والا، صاف نیت فیکا، چمکتا، کھنکتا۔

کھرا سکہ۔ آج کے دور میں جب ہر کسی کو اپنی اپنی پڑی تھی فیکے کا سونے سے بنا دل دوسروں کے لیے دھڑکتا تھا۔



حمیرا شفیع

ہیپی نیو ایئر

ساری نوجوان پارٹی فہد کے کمرے میں جمع تھی جبکہ وہ خود ندارد تھا۔ تائی جی کو تو یہی بتایا تھا کہ ایک اہم ٹیسٹ ہے اسی لیے سب کمبائن اسٹڈی کے لیے آئے ہیں۔ وہ بے چاری فلاسک بھر کے چائے کا رکھ گئی تھیں اور ریحان کو کچھ نوٹ بھی تھمائے تھے کہ نکڑ کی دکان سے بسکٹ اور نمکو وغیرہ لے آئے۔ وہ اپنے پاس سے مزید پیسے ملا کر ٹھیلے والے سے برگر بنوا لایا تھا۔ اور اس کے معنوی نہ نہ کرنے کے باوجود تائی جی نے اسے بقایا پیسے بٹوے سے نکال کر دیے تھے اور اب وہ سب چائے کے ساتھ ساتھ گرم گرما برگر سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔ فہد کے حصے کا برگر پلیٹ میں ڈھک کر رکھ دیا گیا تھا۔

”خود ہی میٹنگ کال کی تھی اور اب نجانے کہاں غائب ہے؟ موبائل بھی بند جا رہا ہے۔“ قاریہ نے نزاکت سے برگر کو کترتے ہوئے کہا۔

”مجھے میسج آیا ہے کہ جلد پہنچنے والا ہوں۔“ چسما تو فرقان چائے کے بڑے بڑے گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔

”ویسے یہ اپنے فہد نے کمرے کی ڈیکوریشن تو لاجواب کی ہے۔“ زیاد نے گرد و پیش کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”تائی جی کا اتنا خرچا کروایا ہے اس نے سارا فرنیچر بھی بدلا۔ تائی جی نے بہت کہا کہ تمہاری دلہن نیا لائے گی مگر کہنے لگا کہ جب لائے گی دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو نیا بنوا کر دیں۔“

عرشی نے بھی اپنے لیپ ٹاپ سے سر اٹھا کر کہا۔ اتنے میں ہانپتا کانپتا فہد بھی آ پہنچا۔

”سوری دوستو! ایک جگری یار مشکل میں تھا۔ اسی کی مدد کے لیے گیا تھا۔“

”اچھا خیر ہے! اب جلدی سے بتاؤ کہ تم نے موجودہ درپیش مسئلہ کا کیا حل سوچا ہے۔“ فرقان نے عینک اتار کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔

”میں تو بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تم بتاؤ عرشی کہ تم کیا ہوم ورک کر کے آئی ہو؟“ اس نے ڈائری پر نظریں جماتے ہوئے عرشی سے کہا جو بڑے منظم طریقے سے ہر مسئلے کے تمام ممکنہ حل لکھ کر لاتی تھی۔

”ہنہ......“ عرشی سے ہنکارا ابھرا۔

”میں نے بہت سوچ وبچار کر کے دو تین حل لکھے ہیں۔“ وہ ڈائری پر جھکتے ہوئے بولی۔

”پہلا حل تو یہ ہے کہ ہم دو ہزار چوبیس کو ویلکم کرنے کے لیے جو پارٹی ارینج کر رہے ہیں اسے کینسل کر دیں۔“ اس نے اپنے تئیں ایک چھوٹا سا بم پھوڑا۔

”ہرگز نہیں۔“ ”ریجیکٹ“ ”نو نو“، ”ناممکن“ ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

”سارا سال تو ہم اپنی پڑھائی میں مصروف رہتے ہیں۔ کسی فیملی فنکشن میں بھی سب اکٹھے شریک نہیں ہوتے کہ کبھی کسی کے فائنل ہو رہے ہوتے ہیں اور کسی کے ہونے والے ہوتے ہیں۔ دسمبر کی چھٹیاں ہی سب کی ایک ساتھ ہوتی ہیں۔ یہی ایک پارٹی تو یادگار ہوتی ہے۔ اب اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں۔“ قاریہ تو کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئی۔

"ملکہ جذبات! رک جائیں، آپ شاید دادی اماں اور دادا ابو کی دھمکی بھول گئیں، انہوں نے کہا تھا کہ اگر آئندہ گھر میں اس نوعیت کی کوئی خرافات ہوئی۔ میرا مطلب ہے نیو ایئر پارٹی وغیرہ تو وہ یہ گھر چھوڑ کر کسی اولڈ ہوم وغیرہ میں چلے جائیں گے۔" ریحان نے یاد دلایا۔ کچھ دیر تک خاموش رہی۔ پھر فاریہ دوبارہ بولی۔

"عرشی! اس کے علاوہ تم نے اور کیا آپشن سوچا ہے۔"

"ہاں! دوسرا آپشن یہ ہے کہ ہم پارٹی کسی ہوٹلووٹل میں کریں۔"

"یہ تو بالکل ناممکن ہے۔ ہم لڑکیوں کو تو قطعی اجازت نہیں ملے گی۔ تایا جی اس معاملے میں بہت سخت ہیں۔" اریبہ نے اس آپشن پر مایوسی سے سر ہلایا۔

"ایک تو ہمارا یہ گھر بہت غلط ڈیزائن ہوا ہے۔ کوئی پرائیویسی ہی نہیں ہے۔ تینوں پورشنز اس طرح ملے ہیں کہ ایک جگہ ہونے والی سرگرمی کی خبر فوراً سارے میں وائرل ہو جاتی ہے۔" ریحان کو گھر کی تعمیر و بناوٹ پر اعتراض تھا۔

"پھر شومئی قسمت سے دادا دادی کا کمرہ عین اس مقام پر واقع ہے کہ پل پل کی خبر باآسانی ان تک پہنچ جاتی ہے۔

پھر اس قسم کی پارٹیوں وغیرہ کے تو وہ ازلی دشمن ہیں۔ پچھلی بار انہوں نے ساری روداد چھوٹے چاچو سے کہی۔ چھوٹے چاچو نے دو چار مزید گل پھندے لگا کر منجھلی پھوپھو کو بتایا اور منجھلی پھوپھو نے مزید مرچ مسالہ لگا کر ناروے والی پھوپھو کو رام کہانی سنائی اور نقصان یہ ہوا کہ وہ جو ہمارے امپورٹڈ گفٹ آتے تھے وہ بند ہو گئے۔"

"پچھلے سال سے ننھا سا پرفیوم تک نہیں بھیجا انہوں نے۔" فرقان نے رونی صورت بنا کر کہا۔

"حالانکہ میں نے تو اپنے منہ سے لیدر بیگ کی فرمائش کی تھی وہ بھی نہیں آیا۔" عرشی کو بھی بیگ نہ ملنے کا صدمہ تھا۔

"ایک آپشن یہ بھی ہے کہ پارٹی کسی فیملی فرینڈ کے ہاں رکھ لی جائے۔" فرقان دور کی کوڑی لایا۔

"یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ لڑکیوں کو پھر بھی اجازت نہیں ملے گی۔" فاریہ نے مایوسی سے سر ہلایا کیونکہ اس معاملے میں اس کے ابا تمام اباؤں سے سخت تھے۔

"پھر اس کے علاوہ تو اور کوئی آپشنز نہیں ہے۔" عرشی نے بے دلی سے ڈائری بند کی۔

"مگر میرے پاس ایک آپشن اور بھی ہے۔" فہد نے تجسس سے بھرپور لہجے میں کہا۔

"ارے تو جلدی پھوٹو" سب ہی ہمہ تن گوش

ہوئے۔

☆☆☆

یکم جنوری 2024 کی حسین صبح تھی۔ سورج گرم نرم مہربان کرنیں فراخ دلی سے سارے میں بکھیر رہا تھا۔ دادی جان اپنا پاندان کھولے بیٹھی تھیں۔ جب عرشی ہاتھوں میں ایک شاپر تھامے اندر داخل ہوئی۔

"دادی جان! ہیپی نیو ایئر" اس نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر چٹا چٹ ان کے دونوں رخسار چومے۔

"ارے! نیا سال آ بھی گیا! اب تو یہ ماہ و سال بھی کتنی جلدی جلدی گزرنے لگے ہیں۔" ان کے لہجے میں کچھ اداسی کچھ ملال سا تھا۔

"اداس نہ ہوں دادو! ان شاءاللہ یہ سال اپنے دامن میں کچھ اچھا ہی لے کر آئے گا۔ آپ فٹافٹ یہ پہن لیں۔" اس نے شاپر کھولا اس کے اندر سفید سلک کا میس ساغرارہ سوٹ نکلا۔ سفید شیفون کے دوپٹے پر سلور کرن جگمگا رہی تھی۔

"یہ میں نے عرشی اور اریبہ نے آپ کے لیے اسپیشل آن لائن منگوایا ہے۔" وہ فخریہ بتا رہی تھی۔

"خواہ مخواہ اتنا خرچا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب اس عمر میں ایسے چونچلے اچھے لگتے ہیں کیا۔"

"کیوں نہیں اچھے لگتے۔ بس آپ جلدی سے پہن کر تیار ہو جائیں آج کچھ گیسٹ آپ سے ملنے آ رہے ہیں۔"

"ہیں گیسٹ...... کون آ رہا ہے؟"

"اف دادو! کچھ سسپنس بھی رہنے دیا کریں نا۔"

دوسری طرف فہد نے بھی دادا ابو کو بڑے جتنوں سے سفید کڑکڑاتے کرتا شلوار کے ساتھ کالی واسکٹ پہنا کر تیار کر دیا تھا۔ انہیں بھی یہی بتایا تھا کہ کچھ مہمان ان سے ملنے آ رہے ہیں۔

اب دونوں گیٹ کے عین سامنے دھوپ میں بیٹھے معزز مہمانان گرامی کا انتظار کر رہے تھے۔ گیٹ ادھ کھلا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک گاڑی آ کر رکی۔ اسے ایک فرنچ کٹ داڑھی والا لڑکا چلا رہا تھا۔ اس نے اتر کر ڈگی سے ایک وہیل چیئر نکالی اور پھر پیچھے بیٹھی عورت کو احتیاط سے تھام کر وہیل چیئر پر بٹھایا اور پھر اسے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ دادی کچھ دیر گم صم سی آنے والی مہمان عورت کو دیکھتی رہیں اور پھر ایک دم پہچان کے رنگ ان کے چہرے سے چھلکے اور وہ فرط جذبات سے آگے بڑھیں۔

"نفیسہ...... نفیسہ...... تم"

ان کے منہ سے بے ربط سے جملے برآمد ہوئے اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی خود آگے بڑھ کر عورت سے لپٹ گئیں۔ وہ ان کی دیرینہ دوست تھی جن سے کبھی کبھار ہی فون پر رابطہ ہوتا تھا۔ یوں تو دونوں ایک ہی شہر کی باسی تھیں مگر کئی سالوں سے مل نہیں پائی تھیں۔

نفیسہ ایک حادثے میں ٹانگوں سے معذور ہو چکی تھیں جبکہ وہ بھی گھٹنوں کے درد کی وجہ سے کہیں بھی آنے جانے سے قاصر تھیں۔ یوں ایک دوسرے کو روبرو پا کر دونوں ہی آب دیدہ ہو گئیں۔ کتنی دیر تک ایک دوسرے سے لپٹی رہیں۔ ایک دوسرے کے مانوس لمس کی خوشبو کو اندر اتارتی رہیں۔

تائی اماں وہاں چلی آئیں۔ انہوں نے دونوں کو نرمی سے جدا کیا اور انہیں لیے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئیں۔

تھوڑی دیر بعد گیٹ کے سامنے ایک رکشہ آ کر رکا اور اس کے اندر سے ہانپتے کانپتے کھچڑی بالوں والے بزرگ برآمد ہوئے۔ ابھی وہ اپنا چشمہ سیٹ کر کے گیٹ کی جانب دیکھ ہی رہے تھے کہ دادا ابو ان کے استقبال کے لیے تیزی سے آگے بڑھے۔

"ارے پروفیسر...... تو......" دادا ابو کی خوشی دیدنی تھی۔ ان کا جگری یار ان کے سامنے کھڑا تھا۔

کافی عرصے سے اس کی کوئی خیر خبر ہی نہیں آئی تھی۔ وہ تو سمجھے تھے کہ شاید اللہ میاں کے ہاں حاضر ہو چکا ہے۔ ایک دو سپارے پڑھ کر بھی بخش چکے تھے۔ مگر اب اس کی زبانی پتا چلا کہ وہ بیرون ملک

اپنے بڑے بیٹے کے پاس شفٹ ہو گئے تھے۔اب پردیس کی زندگی سے آزاد ہو کر مستقل یہیں رہنے آ چکے تھے۔

پھر تھوڑے وقفے کے بعد دادا اور دادی جان کے مزید دو احباب چلے آئے۔اچھی خاصی چہل پہل سی ہو گئی۔دونوں انگشت بدنداں تھے۔الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔آج ان سب کو بیک وقت ان کی یاد کیسے آ گئی۔

”کہیں ہمارے مرنے کی کوئی خبر تو نہیں وائرل ہو گئی۔جو تم سب یوں بھاگم بھاگ چلے آئے۔“ دادا جان نے چوہدری رفیق کا بازو تھام کر سرگوشی کی۔

”ارے خدانخواستہ مرنے کی خبر کیوں آئے گی۔تمہارے پوتے فہد کی جانب سے یہ ٹیکسٹ میسج موصول ہوا تھا۔“ انہوں نے موبائل کی اسکرین روشن کی دادا جان نے بغور دیکھا لکھا تھا۔

محترم / محترمہ

السلام علیکم

آپ کو ہماری جانب سے نیا سال مبارک ہو۔

خدا کرے یہ سال اپنے دامن میں آپ کے اور آپ کے اہل خانہ کے لیے ڈھیروں خوشیاں اور خیر و عافیت لے کر آئے (آمین) نئے سال کی آمد پر ہم اپنے دادا جان اور دادی جان کی سترویں ویڈنگ انی ورسری سیلیبریٹ کر رہے ہیں اور دل و جان سے آپ کی شرکت کے متمنی ہیں۔

منجانب

فہد اینڈ کمپنی

انوکھا کارڈ پڑھ کر دادا جان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”ہیں..... یہ کیا.....“ [illegible] کارنامے پر انہیں غصے کے بجائے پیار آیا۔مگر ان کی شادی تو شاید چیت یا ہاڑھ کے مہینے میں ہوئی تھی۔چلو خیر..... ایسا ہی سہی۔

اچھا خاصا دعوت کا سماں بندھ گیا۔تائی جی کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے کہ اب اچانک اتنے مہمانوں کی خاطر تواضع کیسے ہو گی مگر فہد نے انہیں اس زحمت سے بھی بچا لیا۔اس نے کھانا آرڈر کر دیا تھا اور بزرگوں کی وجہ سے مرچ مسالے بھی ہلکے رکھوائے تھے۔

عین اس وقت جب دادا دادی اپنے مہمانوں میں مصروف تھے۔فہد اینڈ کمپنی بالائی منزل پر نیو ایئر پارٹی منا رہی تھی۔اونچا اونچا میوزک بج رہا تھا۔خوب غل غپاڑہ ہو رہا تھا۔مگر حیرت ہے آج دادا دادی کا بلڈ پریشر بالکل نارمل تھا کیونکہ وہ خود بھی اپنے دوست احباب کے ساتھ مصروف تھے۔

”ویسے فہد یار! تمہارا آئیڈیا تو لاجواب ہے۔آج اگر ساری رات بھی پارٹی جاری رہی تو شاید کوئی ہنگامی صورت حال وقوع پذیر نہیں ہو گی۔“ ریحان نے بامشکل ایک بڑی سی پیسٹری نگلتے ہوئے کہا۔

”واقعی! بزرگوں کو ہمارا ہلہ گلا صرف اس لیے برا برا لگتا ہے کیونکہ ہم انہیں خوشی منانے کا موقع فراہم نہیں کرتے۔وہ خود اپنے لیے کوئی اہتمام کر نہیں سکتے۔“ عرشی نے بھی اظہار رائے کیا۔

”مگر ایک مسئلہ ہے۔تم بیک وقت ان دو پارٹیوں کا بجٹ کیسے مینج کرو گے۔ہم تو کنگال ہو جائیں گے یار! کوئی ادھار بھی نہ دے شاید۔“ اکنامکس کا اسٹوڈنٹ زیاد جمع تفریق کا کھاتہ کھول کر بیٹھ گیا۔

”تم فکر نہ کرو یار! دادا دادی کے مہمان گفٹ کیش کی صورت میں ہی لائے ہیں۔میں نے ان کے ہاتھوں میں لفافے دیکھے تھے۔ویسے بھی ایسی ہنگامی دعوت پر گفٹ کیش کی صورت میں ہی ہوتا ہے۔

دادا کے سامنے دو چار آنسو بہاؤں گا تو وہ خود بخود سارا کیش حوالے کر دیں گے۔“ فہد خباثت سے مسکرایا اور باقی سب۔اس کی ذہانت پلس چالاکی پر واش اش کر اٹھے۔آج اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ واقعی ان کا لیڈر بننے کا اہل تھا۔

☆☆

نگہت سیما

چلو تم کو بتاتے ہیں

"کیا یہ سچ ہے غزنی بھائی کہ عشق میں ہجر و وصال...... دوری اور حضوری کوئی معنی نہیں رکھتی۔"

رمیز نے کتاب سے نظریں ہٹا کر غضنفر ملک کی طرف دیکھا جو بہت دیر سے گود میں رکھی فائل پر نظریں جمائے نہ جانے کن سوچوں میں کھوئے ہوئے تھے۔

"ہوں!" انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور فائل بند کردی۔

"کیا کہہ رہے تھے تم؟"

"یہاں لکھا ہے کہ عشق میں ہجر و وصال، دوری اور حضوری کوئی معنی نہیں رکھتی تو میں آپ سے پوچھ رہا تھا کہ کیا یہ صحیح لکھا ہے لکھنے والے نے۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں رمزی۔ یہ تو لکھنے والے کا اپنا تجربہ اور مشاہدہ ہوگا۔"

ان کی ہر دم اجالے بکھیرتی آنکھوں میں مدت ہوئی جیسے اندھیروں نے بسیرا کرلیا تھا۔

"آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے غزنی بھائی! کیا دانیہ آپی کا نہ ملنا آپ کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا؟ کیا آپ کو وہ یاد نہیں آتیں؟ کیا فرحت بھابی کے سنگ چلتے ہوئے یہ خیال نہیں آتا کہ یہاں تو اسے ہونا چاہیے تھا۔"

"پاگل ہو تم ......" انہوں نے گھبرا کر اپنے کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ "لکھنے والا عشق کی بات کر رہا ہے جبکہ میرے اور دانیہ کے درمیان صرف پسندیدگی تھی۔"

"صرف پسندیدگی ...... پلیز غزنی بھائی! مجھ سے تو جھوٹ نہ بولیں اور گھبرائیں نہیں ہماری بھابی جان اس وقت گھر پر نہیں ہیں وہ اس وقت اپنی دلاری بہن کے ساتھ شاپنگ کے لیے نکلی ہیں۔"

وہ جانتا تھا کہ غضنفر فرحت کی شکی طبیعت کی وجہ سے محتاط رہتے تھے۔ اس لیے کوشش کرتے تھے کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے فرحت کا موڈ خراب ہو۔ یہ الگ بات تھی کہ فرحت کو موڈ خراب کرنے کے لیے کسی وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

اسے تو بس لڑنے اور جھگڑنے کے لیے بہانا چاہیے ہوتا تھا۔ اس وقت آفس سے آکر وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے اس کے پاس لاؤنج میں ہی بیٹھ گئے تھے اس لیے انہیں علم نہیں تھا کہ فرحت گھر پر نہیں ہے۔

"ہاں" "تم محبت کہہ سکتے ہو۔ ہمارے درمیان کمٹمنٹ تھی۔ پسندیدگی تھی۔ ساتھ زندگی گزارنے کا عہد تھا تو عہد نہیں نبھا سکا میں۔ جس کی وجہ سے مجھے شرمندگی ہے بس۔"

وہ فائل اٹھا کر رمیز کی طرف دیکھے بغیر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تو رمیز نے ایک گہری سانس لے کر پھر کتاب اٹھائی لیکن اب دل پڑھنے کی طرف مائل نہیں تھا۔

یہ کوئی بہت پرانی بات تو نہیں تھی صرف چند سال پہلے جب غضنفر باہر سے تعلیم مکمل کر کے آئے تھے تو خاندان بھر میں ان کی خوب دعوتیں ہو رہی تھیں۔ خاص کر لڑکیوں کی مائیں ان پر خوب مہربان تھیں کہ ان کی شخصیت تھی ہی ایسی۔

بے حد خوش مزاج۔ ملنسار۔ بات کرنے کا فن جانتے تھے۔ جس محفل میں ہوتے چھا جاتے تھے۔ خاندان کی کوئی تقریب ہو یا سکول کالج کی کوئی ایکٹیویٹی ہر ایک میں نمایاں نظر آتے تھے اور اب تو باہر

سے اعلا تعلیم حاصل کر کے آئے تھے تو مزید نکھر گئے تھے۔ ان کی شخصیت میں ایک ایسی طلسماتی کشش پیدا ہو گئی تھی جو سب کو اپنی طرف متوجہ کرتی تھی۔ ان کی خوب صورت روشن آنکھیں، پل پل مسکراتے ہونٹ اور باتوں کا سحر مخاطب کو گرویدہ کر لیتا۔ ہمدرد، نرم خو اور ہر ایک کے کام آنے والے۔

مُکمل ناول



مزاج کی شوخی برقرار تھی لیکن زیادہ مہذب اور باوقار ہوگئے تھے۔ برجستہ بات کرتے تو لطف آجاتا۔ تو اس روز بڑی خالہ کے ہاں دعوت تھی اور بڑی خالہ کی شادی چونکہ چھوٹے تایا سے ہوئی تھی تو ننھیال و ددھیال سب ہی مدعو تھے ایسے میں نوجوان پارٹی نے انہیں گھیر لیا کہ سب کو ہی تجسس تھا کہ ایسی شان دار اور پرسحر شخصیت کا مالک ہونے کے باوجود تنہا کیسے لوٹ آئے اور وہ مسلسل مسکرائے جارہے تھے اور ان کی روشن آنکھوں میں اجالے سے تڑپ رہے تھے۔

"یار! تم بتاتے کیوں نہیں۔" فیصل نے تفتیشی نظروں سے انہیں گھورا تھا۔ "ایسے کیسے لوٹ آئے۔"

"جیسے سب لوٹ کر آتے ہیں۔" فیصل بڑی خالہ کے بیٹے اور ان کے ہم عمر تھے۔

"مطلب، ٹکٹ لیا اور جہاز میں بیٹھے پھر ایئر پورٹ پر اترے اور وہاں سے گھر۔"

"زیادہ بنیں مت۔" فارینہ چلائی، وہ فیصل کی بیوی اور چھوٹی خالہ کی بیٹی تھی۔

"ہمارا مطلب ہے" اکیلے کیسے آئے۔"

"اچھا یہ مطلب ہے تمہارا۔" آنکھوں میں شرارت لیے وہ سادگی سے کہہ رہے تھے۔ "تو جب اکیلے گئے تو اکیلے ہی آنا تھا نا۔ کیا پورے لندن کے لوگوں کو ساتھ لے آتے۔"

فارینہ نے برا سا منہ بنایا تو فیصل اس کی مدد کو بڑھا۔

"یار! اب زیادہ ڈرامے مت کرو، سیدھے سیدھے بتاؤ وہاں اتنا حسن بکھرا پڑا ہے کیسے دامن بچا لائے۔"

"حسن میں تو یہاں بھی کچھ کم نہیں پھر بدیسی مال کیوں درآمد کرتے۔"

غزنی کا لہجہ ذومعنی تھا۔ لڑکیوں کے چہرے گلابی ہوگئے۔ فرحت جو کم پڑھی لکھی ہونے کی وجہ سے اپنے جذبات چھپا نہیں سکی تھی، شرما کر اپنا آنچل مروڑنے لگی تو رمیز نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ چھپائی۔ یعنی اب فرحت جیسی لڑکیاں بھی غزنی بھائی کے امیدواروں میں شامل ہیں۔ یہ نہیں تھا کہ فرحت شکل وصورت کی بری تھی۔ خوب صورت نہ تھی لیکن بدصورت بھی نہ تھی۔ رنگ بھی گورا تھا اور قد بت بھی اچھا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ پھپھو نے اس کی تربیت کی طرف کوئی خاص دھیان نہ دیا تھا۔

انتہائی منہ پھٹ اور بدتمیز سی تھی، اکثر جب سب اکٹھے ہوتے تو اس کی کسی نہ کسی سے زوردار لڑائی ہوتی۔ بظاہر معمولی سی بات پر۔ لگائی بجھائی کی بھی عادت تھی اس پر خود کو بہت عقل مند سمجھتی تھی۔ وہ رمیز اور غزنی کی چھوٹی پھپھو کی بیٹی تھی۔ دراصل بڑی پھپھو اور چھوٹی پھپھو کی شادیاں ایک ہی گھر میں دو بھائیوں سے ہوئی تھیں۔ ان کے سسرال میں پیسے کی تو فراوانی تھی لیکن تعلیم اور تہذیب ندارد۔ تب کم عمری میں شادیاں ہوتی تھیں۔

چھوٹی پھپھو چودہ سال کی اور بڑی پھپھو سولہ سال کی تھیں جب بیاہ کر سسرال گئیں تو ان کے رنگ میں رنگ گئیں۔ بیٹوں نے بھی بمشکل دس دس جماعتیں پڑھی تھیں اور بیٹیاں تو پرائمری بھی نہ پاس کرسکی تھیں فرحت نے بھی تیسری جماعت میں پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ نواز ملک نے ایک بار ان سے کہا بھی تھا کہ اگر گاؤں میں لڑکیوں کا ہائی اسکول نہیں ہے تو بچیوں کو ان کے گھر بھجوا دیں۔ یہاں رہ کر پڑھ لیں گی۔

"لو ہم نے ان سے کون سا نوکری کروانی ہے بھائی۔"

رضوانہ پھپھو نے جواباً کہا تھا۔ یہی وجہ تھی جب بھی سب خاندان والے اکٹھے ہوتے تو دونوں پھوپھیوں کی اولادیں سب سے الگ ہی لگتیں۔

"اچھا بہت ہوچکی غزنی! سچ سچ بتاؤ کتنی ڈوبیں ان سنہری جھیلوں میں یہ تو ہو نہیں سکتا کہ کوئی ان خوب صورت آنکھوں کی کشش کے دائرے میں آیا ہو اور بچ نہ سکا ہو۔"

فیصل نے بے تکلفی سے اس کے کندھے پر

ہاتھ مارا تھا۔
"کیا خبر کوئی ڈوب ہی گیا ہو۔" غزنی کا انداز بدستور تھا۔
"نہیں۔" فارینہ اچھل کر ان کے سامنے آ بیٹھی۔
"یعنی اس کا مطلب ہے کوئی ہے۔ تو پھر صاف صاف بتاتے کیوں نہیں اور اسے ساتھ کیوں نہیں لائے۔ آپ کو کیا پتا آپ کی شادی کو لے کر سارے خاندان میں کس قدر ہلچل ہے۔"
"بتادوں گا اور سب سے پہلے تمہیں ہی بتاؤں گا۔"
غزنی فارینہ کو سگی بہنوں کی طرح چاہتے تھے کہ فارینہ نے اپنے بچپن کے چند سال خالہ کی بیماری کی وجہ سے ان کے ہاں گزارے تھے۔
"وعدہ۔" فارینہ نے ہاتھ آگے بڑھایا۔
"ہاں وعدہ۔" تب ہی رمیز کی نظریں فرحت کی طرف اٹھی تھیں، وہ ناگواری سے اس بے تکلفی کو دیکھ رہی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں شک وشبے کی پرچھائیاں سی تھیں۔ کیا وہ نہیں جانتی کہ فارینہ کو اماں نے دودھ پلایا ہے اور غزنی اور خود اس نے نیلی اور فارینہ میں کوئی فرق نہیں سمجھا تھا اور وہ ان سے ایسے ہی لاڈ کرتی تھی جیسے انیلا۔
اس وقت تو غزنی نے سب کو ہنسی مذاق میں ٹال دیا۔ لیکن واپسی پر رمیز نے شرارت سے پوچھا۔
"سچ بتائیں غزنی بھائی! کیا آپ سچ میں اپنا دل بحفاظت بچا کر لے آئے ہیں۔"
نواز ملک کی گاڑی میں بڑی خالہ اور ان کی بیٹی بھی آئی تھیں کہ ان کے شوہر ملک سے باہر تھے اور بیٹا اپنی جاب پر تھا۔ وہ آرمی میں تھا۔ ایک ہی کالونی میں گھر تھے سو نواز ملک نے ہی انہیں پک اور ڈراپ کرنے کی ذمہ داری لی تھی، سو غزنی کی گاڑی میں وہ دونوں ہی تھے۔
"یعنی آپ کا دل پوری طرح محفوظ ہے۔" اور غزنی کی آنکھوں میں ایک ساتھ بہت سی روشنیاں جل اٹھیں۔
"وہ تو گیا۔"
انہوں نے بند مٹھی کھولتے ہوئے یوں اشارہ کیا جیسے کوئی پرندہ ہاتھوں سے اڑا جا رہا ہو۔
رمیز نے حیران ہو کر ان کے لاابالی انداز کو دیکھا۔
"مطلب یعنی آپ گویا کہ لیکن پھر کہاں گئی وہ مغربی حسینہ جس نے اس مشرقی شہزادے کا دل تسخیر کیا۔"
"مغربی حسینہ...... یہ میں نے کب کہا۔"
غزنی نے ذرا سا رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔
"تو پھر......؟"
"پھر یہ کہ میرا دل تو پہلے ہی الجھ گیا تھا۔ باہر تو میں بعد میں گیا تھا۔ لیکن یہ بندھن باہر جا کر بھی کمزور نہیں ہوا۔" غزنی کے لبوں پر مستقل مسکراہٹ تھی ہوئی تھی۔
"تو آپ نے اب تک اماں سے بات کیوں نہیں کی۔" رمیز نے بے قراری سے پوچھا۔
"کیونکہ وہ اپنے والدین کے ساتھ کراچی گئی ہوئی ہے کسی عزیز کی شادی میں۔ وہ لوگ آجائیں تو پھر بات کروں گا اماں سے۔"
"اوہو بھائی! آپ پہلے ہی بات کر لیجیے گا اماں سے بلکہ آج ہی...... آپ کو نہیں پتا، کتنے لوگوں کی نظریں ہیں آپ پر۔ سب ہی رشتہ داروں کے ہاں لڑکیاں ہیں تو بس آپ اماں سے کہیے گا کہ اگر آپ پھپھو کے ہاں شادی کریں گی تو ماموں ناراض ہو جائیں گے اور ماموں کے ہاں تو...... بس سب کو راضی رکھنے کا ایک طریقہ ہے کہ خاندان سے باہر شادی ہو تو آپ نے اسی لیے خاندان سے باہر ایک لڑکی پسند کر لی ہے وغیرہ وغیرہ۔"
"اچھا دادا ابو! صبح بات کر لوں گا اماں سے۔"
وہ ہنسے تھے۔
"اور ہاں، کوئی تصویر تو ہو گی نا آپ کے پاس

اور نام کیا ہے ہماری ہونے والی بھابی کا۔“
وہ بے تابی سے پوچھ رہا تھا۔
”نام دانیہ ہے اور تصویر نہیں ہے گروپ فوٹو ہے سب یونیورسٹی فیلوز کا۔ گھر جا کر دیکھ لینا۔ ابو اس کے کسی کالج کے پرنسپل ہیں اور اماں ڈاکٹر۔ تین بھائی ہیں اور ایک وہ۔ بھائی تینوں بڑے ہیں اور وہ سب سے چھوٹی۔“
غزنی نے مسکرا کر اسے دیکھا۔
”میں نے کوئی ان کا شجرہ نسب تھوڑا ہی پوچھا ہے۔ مجھے تو دانیہ بھابی کے متعلق بتایئے۔ کب ملے اور کہاں۔“
”دانیہ سے پہلی بار یونیورسٹی میں ہی ملاقات ہوئی تھی۔ ہمارے ہی ڈپارٹمنٹ میں ایڈمیشن لیا تھا اس نے۔ شروع میں تو اس کی ذہانت اور سلجھی ہوئی طبیعت نے متاثر کیا اور پھر۔“
وہ ہولے ہولے اسے بتانے لگے کہ کب اس کی رفاقت کے خواب دیکھنے لگے۔

لیکن ان کے خواب بکھر گئے اور ان کی روشن آنکھوں میں ہمیشہ کے لیے اندھیروں نے بسیرا کر لیا۔ یہ اس سے اگلے روز کی بات تھی۔ چھٹی کا دن تھا رمیز ناشتہ کر کے غضنفر کے کمرے میں آیا تھا۔
”جی غزنی بھائی! اب ذرا دانیہ بھابی کی تصویر تو دکھایئے۔“
”بتایا تو تھا الگ سے تصویر نہیں ہے میرے پاس۔ گروپ میں ہے۔“
غزنی نے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز کھینچی اور دو گروپ تصویریں نکال کر اس کی طرف بڑھائیں تو اس نے تصویریں لیتے ہوئے بے تابی سے ان پر نظر ڈالی۔ اور پھر ایک تصویر پر ہاتھ رکھا۔
”یہ...... یہ ہیں دانیہ بھابی...... ہیں نا۔“
اور وہ بے اختیار ہنس دیے۔
”ہاں یہ ہی دانیہ ہے۔“
”ایسی ہی کوئی لڑکی آپ کے ساتھ سج سکتی ہے۔ حسن ہی نہیں ایک وقار سا بھی ہے ان کی شخصیت میں۔ آج آپ اماں سے ضرور بات کر لیجئے گا۔“
”ہاں آج بات کروں گا۔“
غزنی نے تصویریں لے کر دراز میں رکھیں تب ہی انیلا نے ذرا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔
”ابا آپ کو بلا رہے ہیں۔“ اطلاع دے کر وہ وہاں سے ہی پلٹ گئی تھی۔
”یہ تو بتایا ہی نہیں نیلی نے کہ کسے بلا رہے ہیں۔“
رمیز بھی غزنی کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا تھا۔ ملک نواز لاؤنج میں ہی صوفے پر نیم دراز اخبار پڑھ رہے تھے، انہیں دیکھ کر وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ اور اخبار پاس ہی رکھ دیا۔
”آپ نے کسے بلایا تھا ابا؟“
رمیز نے پوچھا تو انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔
”بلایا تو میں نے غزنی کو تھا لیکن خیر، تم بھی بیٹھو۔“
”جی ابا جی! کوئی کام ہے مجھ سے۔“ غزنی کا انداز ہمیشہ کی طرح مؤدب تھا۔
”کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کرنی بس یہ بتانا تھا کہ رات میں نے تمہاری بات آپا زرینہ کی بیٹی سے پکی کر دی ہے۔“
”مگر یہ کیسے ممکن ہے ابا جان؟“ غزنی کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔
”کیوں ممکن نہیں ہے۔“ ملک نواز نے عینک کے پیچھے سے انہیں گھورا۔
”گھر کی بات ہے۔ کل زرینہ آپا اور بھائی نذیر نے خواہش ظاہر کی تو میں نے بات طے کر دی تمہیں کیا اعتراض ہے بھلا اور ہاں نیلی کو بھی رضوانہ آپا اور بھائی نصیر نے اپنے اجمل کے لیے مانگ لیا۔ اور ہمارا خیال ہے کہ اگلے ماہ کی کوئی تاریخ شادی کے لیے رکھ لیتے ہیں۔“
”مگر ابا جان۔“ رمیز نے اعتراض کیا تھا۔

"ان کا ماحول ہمارے ماحول سے بالکل مختلف ہے نہ غزنی بھائی خوش رہ سکیں گے اور نہ ہی نیلی آپی۔"
"کیوں کیا خرابی ہے ان کے ماحول میں؟"
ملک نواز کو رمیز کا اس طرح بولنا برا لگا تھا۔
"آپ جانتے ہیں ابا جی! کیا خرابی ہے ان کے ماحول میں۔" سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے رمیز ملک نواز کا لاڈلا تھا اور بے دھڑک بات کہہ دیتا تھا۔
"عجب جاہلانہ سا ماحول ہے۔ اجمل بھائی کی عادتیں بھی بڑی عجیب سی ہیں اور تعلیم میٹرک فیل ہیں جبکہ نیلی آپی نے بی ایس سی کیا ہے اور ماسٹرز کرنا چاہتی ہیں اسی طرح فرحی بھی تقریباً ان پڑھ ہی ہے اور غزنی بھائی اتنے ایجوکیٹڈ۔"
"تمہاری ماں بھی پڑھی لکھی نہیں تھی لیکن میں نے گزارہ کیا بلکہ بہترین زندگی گزاری ہے۔"
"بے شک اماں زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہیں صرف پرائمری پاس ہیں لیکن وہ بہت باشعور اور عقل مند ہیں رشتوں کو نبھانا اور جوڑنا جانتی ہیں۔" انہوں نے اپنی اولاد کی بہترین تربیت کی ہے۔ آپ تو خود بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ پھر بیس تیس سال پہلے تک یہ باتیں زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھیں لیکن آج کے دور کا تقاضا ہے کہ میاں بیوی کے مزاج میں ہم آہنگی ہو۔ انڈرسٹینڈنگ ہو...... اور۔"
"بس۔" ملک نواز نے ہاتھ اوپر اٹھایا۔
"اب تم مجھے بتاؤ گے کہ کیا غلط ہے اور کیا صحیح ہے۔"
"لیکن ابا جی! میرے لیے بھی یہ بہت مشکل ہے۔ فرحی کے اور میرے مزاج میں بہت فرق ہے۔"
غزنی کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔
"کیوں؟ مشکل کیوں؟ کہیں اور شادی کرنا چاہتے ہو۔"
"ابا جی۔" رمیز نے پھر دخل اندازی کی تھی۔
"غزنی بھائی جیسے ڈیسنٹ شخص کو کسی اجڈ گنوار کے پلے باندھ دینا۔ کیا انصاف ہے اور پھر نیلی آپی نے کیا قصور کیا۔"
"تم چپ رہو رمزی! زیادہ بڑھ بڑھ کر بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ملک نواز نے اسے ڈانٹ دیا اور غزنی کی طرف دیکھا۔
"میں زبان دے چکا ہوں غزنی اور اپنی بات سے پھرنے والا نہیں ہوں۔ تمہیں اگر اپنی مرضی کرنی ہے تو میری لاش سے گزر کر ہی اپنی مرضی کرنا۔ میں خود کو گولی مار لوں گا لیکن زرینہ آپا اور رضوانہ آپا کے سامنے شرمندہ نہیں ہوں گا۔"
"لیکن ابا جی پلیز۔"
غزنی کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن ملک نواز تیزی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔
"غزنی بھائی تھوڑی سی ہمت کریں۔ وہ بد زبان فرحی ہرگز آپ کے لائق نہیں ہے۔"
"رمزی۔"
غزنی ششدر سے کھڑے تھے تب ہی ملک نواز ہاتھ میں پسٹل اٹھائے کمرے سے باہر نکلے۔ اور پسٹل اپنی کنپٹی پر رکھ لیا۔
"ہاں اب بتاؤ غزنی! تمہیں میرا فیصلہ منظور ہے یا۔" پل بھر کے لیے رمیز اور غزنی دونوں ہی ساکت کھڑے رہ گئے پھر غزنی نے آگے بڑھ کر پستول ان کے ہاتھ سے لے لیا۔
"مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہے۔"
ان کی آواز لڑکھڑا رہی تھی اور روشن آنکھوں کے اجالوں میں یکدم شام اتر آئی تھی۔ وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر تیزی سے باہر نکل گئے تو رمیز نے شاکی نظروں سے ملک نواز کو دیکھا۔
"جو یہ ہی کچھ کرنا تھا تو ہمیں اتنا پڑھایا لکھایا کیوں۔ ہمیں بھی جاہل ہی رہنے دیا ہوتا اپنے بھانجے بھانجیوں کی طرح۔"
وہ بھی غزنی کے پیچھے باہر نکل آیا۔ غزنی کمرے میں سر تھامے بیٹھے تھے، بے حد مایوس اور دل شکستہ سے رمیز چند لمحے انہیں دیکھتا رہا پھر ان کے قریب بیٹھتے ہوئے دلگیر لہجے میں کہا۔

"آپ نے ابا کی بات کیوں مانی غزنی بھائی! فرحی ہرگز بھی آپ کے قابل نہیں ہے۔ آپ اسے اتنا نہیں جانتے، جتنا میں جانتا ہوں وہ بے حد ضدی ہٹ دھرم اور بدمزاج ہے۔"

لاڈلا اور چھوٹا ہونے کی وجہ سے ملک نواز جب بھی بہنوں سے ملنے جاتے اسے ساتھ لے جاتے تھے۔ اپنے بچپن میں وہ بہت بار ان کے ساتھ گیا تھا جب کہ غزنی بہت کم ہی جاتا تھا۔ غزنی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ رمیز کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں جلتے خوابوں کی راکھ سی اڑتی محسوس ہوئی تھی اسے۔

"اب بھی وقت ہے غزنی بھائی آپ انکار کر دیں۔ ابا سچ میں خود کو تھوڑا ہی گولی مارتے آپ کو ڈرا رہے تھے۔ آپ پلیز، خود کو ابا کے لیے قربان نہ کریں۔ کچھ صلہ نہیں ملے گا آپ کو۔ اگر ابا کو خاندان میں ہی آپ کی شادی کرنا تھی تو اور بھی لڑکیاں تھیں خاندان میں سلجھی ہوئی پڑھی لکھی۔"

"رمزی۔" غزنی نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

"ابا نے مجھے تراشا خراشا، اس قابل کیا تو کیا میں آج ابا کو اپنی بہنوں کے سامنے شرمندہ کردوں کیا میں انہیں اپنی خوشی کے لیے خود کو گولی مارنے دوں۔ نہیں رمزی نہیں۔ بس اب اس موضوع پر بات نہیں کرنا مجھ سے...... اور پلیز مجھے کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دو۔"

اور رمیز بے بسی سے انہیں دیکھتا ہوا کمرے سے نکل آیا تھا۔ وہ غزنی سے چار سال چھوٹا تھا۔ لیکن دونوں کے درمیان دوستی تھی۔

وہ غزنی سے بے حد محبت کرتا تھا اور غزنی کو بھی وہ بہت پیارا تھا۔ وہ غزنی کی طرح متحمل مزاج نہیں تھا۔ غزنی ماں پر گیا تھا نرم اور دھیمے مزاج والا جبکہ وہ ابا پر گیا تھا۔ تھوڑا غصیلا اور غلط بات برداشت نہ کرنے والا۔ وہ غزنی کے کمرے سے نکل کر سیدھا ماں کے پاس آیا تھا جو پہلے ہی اداس سی بیٹھی تھیں۔ نیلی آپی ان کی گود میں سر رکھے لیٹی تھیں اور وہ ان کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔

"اماں جی۔" وہ اپنا غصہ ضبط نہیں کر رہا تھا۔

"آپ ابا سے بات کریں، وہ نیلی آپی اور غزنی بھائی کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔"

اماں نے نظریں اٹھائیں۔ سرخ سوجی ہوئی آنکھیں جیسے روتی رہی ہوں۔

"وہ کوئی بات سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں رمزی۔"

"غزنی بھائی تو ابا کی خاطر قربانی دینے کو تیار ہیں لیکن نیلی آپی۔ خدا کے لیے اماں ان کو تو قربان مت کریں۔"

"بات کی تھی میں نے لیکن وہ کہتے ہیں زرینہ کے گھر رشتہ کروں اور رضوانہ آپا کے گھر نہ کروں تو انہوں نے تو ناراض ہو جانا ہے۔"

"تو ہو جائیں ناراض اب ابا جی اپنی بہنوں کی خاطر اپنے بچوں کو قربان کر دیں گے۔ بہت پچھتائیں گے۔ وہ اماں جی دیکھ لیجیے گا۔"

☆☆☆

وہ کتنے ہی دن غصے سے کھولتا رہا لیکن ہوا وہی جو ملک نواز نے چاہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ غزنی نے دانیہ سے کیا کہا تھا۔ اور دانیہ نے کیسے اسے سہا ہوگا لیکن غزنی ہمیشہ کے لیے اپنے آپ سے بچھڑ گئے تھے۔ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ انہیں ملک نواز سے تو کوئی گلہ نہ تھا۔ وہ باپ تھے ان کے اور حق تھا انہیں ان کے متعلق فیصلہ کرنے کا لیکن وہ خود سے اور دانیہ سے شرمندہ تھے اگر انہیں اندازہ ہوتا کہ ساری عمر دوستانہ رویہ رکھنے والے ابا انہیں یوں پابہ زنجیر کر دیں گے تو وہ دانیہ کو کوئی خواب نہ دکھاتے۔ اس کا دل تو نہ ٹوٹتا۔ صرف ان کا ہی دل ٹوٹتا۔ وہ اس سے کمٹمنٹ نہ کرتے اس کے خواب تو لاکھ نہ ہوتے۔

لیکن اب کیا ہو سکتا تھا انہوں نے ابا سے نہ کوئی گلہ کیا تھا نہ احتجاج۔ ان میں ولیوں کا سا توکل اور درویشوں کی سی بے نیازی آ گئی تھی۔ وہ فرحی کو بھی خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ملک نواز جو کہتے مان لیتے، انہوں نے کہا فرحی کو لے کر مری شری گھما

لاؤ دہ خاموشی سے لے گئے۔ رمیز کو یوں لگتا جیسے ان کی نظروں میں اپنی خوشیوں اور آرزوؤں کی کوئی اہمیت نہ رہی ہو جیسے انہوں نے اپنا آپ ایک طرف رکھ دیا ہو اور پھر اسے بھول گئے ہوں۔

لیکن رمیز سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہوتا تھا وہ دل ہی دل میں ملک نواز سے سخت ناراض تھا۔ خود سے اس نے ان سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ وہ کچھ پوچھتے تو جواب دے دیتا۔ ورنہ خاموش ہی رہتا۔ کھانے کی ٹیبل پر بھی سر جھکائے خاموشی سے کھانا کھاتا اور اٹھ جاتا۔

وہ ایم فل کے لیے امریکہ جانے والا تھا۔ اس کا تمام پیپر ورک مکمل ہو چکا تھا۔ اسکالر شپ بھی مل رہا تھا لیکن اس نے سب پیپرز پھاڑ دیے تھے۔ ابا کی ڈانٹ ڈپٹ اور اماں کے سمجھانے کا بھی کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ شاید غیر ارادی طور پر ابا کی خواہش کی نفی کر رہا تھا۔ جب ابا کی طرف سے دباؤ بڑھا تو اس نے اماں سے صاف صاف کہہ دیا کہ ابا کو اگر بہت شوق ہے نا مجھے باہر بھیجنے کا تو ٹھیک ہے، میں چلا جاتا ہوں لیکن میں پھر مڑ کر واپس نہیں آؤں گا۔ تاکہ ابا مرنے کی دھمکی دے کر مجھے زرینہ پھپھو کی دوسری صاحبزادی محترمہ راحت صاحبہ کے پلے نہ باندھ سکیں۔ اور سب جانتے تھے کہ اگر وہ ایسا کہہ رہا ہے تو ایسا ہی کرے گا اس لیے سب خاموش ہو گئے تھے۔

شاید وقت کے ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو جاتا اگر جو فرحی اور غزنی خوش ہوتے۔ غزنی اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کرتے تھے اسے خوش رکھنے کی لیکن اس نے تو جیسے گھر میں قدم رکھتے ہی سب کے خلاف محاذ کھول لیا تھا۔ اماں اسے زہر لگتی تھیں کہ بقول اس کے ساسیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ زہریلی اور خطرناک۔

غزنی کو آفس سے دیر ہو جاتی تو واویلا مچا دیتی کہ ضرور کسی لڑکی کے ساتھ گھوم رہا ہو گا۔ وہ کسی تقریب میں ماموں زاد یا خالہ زاد بہنوں سے بات کر لیتے تو گھر آ کر فساد برپا کر دیتی تنگ آ کر غزنی نے خاندان کی کسی بھی تقریب میں جانا چھوڑ دیا۔ وہ پورے خلوص کے ساتھ اس رشتے کو نبھانا چاہتے تھے۔ اس کی ہر خواہش کو پورا کرنا فرض سمجھتے تھے کہ وہ خوش رہے۔ نیلی اول تو آتی ہی نہیں تھی لیکن کبھی ایک آدھ دن کے لیے آ جاتی تو اس کا موڈ خراب ہو جاتا تھا۔ وہ کمرے سے باہر ہی نہ نکلتی تھی۔

غزنی اپنے ساتھ اس کی ہر زیادتی برداشت کر لیتے تھے لیکن نیلی تو انہیں بے حد عزیز تھی، اس کے ساتھ اس کا رویہ انہیں برا لگتا۔ وہ اپنے مخصوص نرم اور دھیمے انداز میں سمجھاتے لیکن فرحی کہاں کسی کی سننے والی تھی سو جھگڑا ہو جاتا۔ یہ جھگڑا دونوں میاں بیوی کے درمیان ہوتا لیکن زد میں سارا خاندان ہی آ جاتا۔ وہ جاہل عورتوں کی طرح سب کو ہی کوسنے دیتی۔ زرمینہ یاں کو دیکھ کر کڑھتا جو بالکل چپ اور خاموش ہو گئی تھیں۔ انہیں غزنی کی یہ زندگی رلاتی اور نیلی کی چپ اور خاموشی اذیت دیتی تھی۔ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتی تھی لیکن اس کی بجھی بجھی آنکھیں اور بے رونق چہرہ بتاتا تھا کہ وہ خوش گوار زندگی نہیں گزار رہی اور رمیز کو ملک نواز پر غصہ آتا۔

ساری غلطی ابا کی ہے۔ ان کے غلط فیصلوں نے ان کی اپنی زندگیاں تباہ کر دیں بلکہ فرحی کی شادی بھی کہیں اپنے ہی جیسے کسی شخص سے ہوتی تو وہ زیادہ خوش رہتی۔ غزنی کے ساتھ وہ احساس کمتری کا شکار ہو گئی تھی اور اس طرح لڑ جھگڑ کر اپنا احساس کمتری دور کرتی تھی۔

یہ رمیز کا خیال تھا لیکن اماں اسے سمجھاتیں اپنے ابا سے ناراضی ختم کر دے۔ رحمی...... ان کے نصیب میں یہ ہی لکھا تھا۔ جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں بچے۔

میں ان سے ناراض نہیں ہوں اماں۔ بس ان کے غلط فیصلے پر غصہ ہے۔ انہیں احساس ہے کہ ان سے غلط فیصلہ ہوا لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا۔ غزنی بھائی کو کہیں کہ جان چھڑائیں فرحی بھابی سے اور......"

"آج یہ بات کہی ہے آئندہ مت کہنا۔ فرحی کو

گھر بھیجا تو نیلی بھی واپس آجائے گی۔ بے شک نیلی فرحی کی بھابی نہیں ہے لیکن اجمل کزن ہے اس کا۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ شاید کچھ اور وقت گزرے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔"

لیکن کچھ بھی تو ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ دو بیٹوں کے بعد بھی فرحی کا مزاج ویسا ہی تھا۔ اب تو وہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی غصے میں دھنک کر رکھ دیتی تھی۔ جبکہ ان تینوں، بہن بھائیوں کو اماں اور ابا کسی نے انگلی تک سے چھوا نہ تھا۔ غلطی پر نرمی سے سمجھا دیتے کہ آئندہ ایسا نہ ہو۔ لیکن مار۔ ایک دو بار اماں ابا نے بچوں کو مارنے سے منع کیا تو فرحی نے ہنگامہ کر دیا کہ وہ کون ہوتے ہیں اسے اپنے بچوں کو مارنے سے منع کرنے والے اور بے چارے بچوں کی اور شامت آجاتی تو اماں ابا نے ٹوکنا چھوڑ دیا تو اب اندر ہی اندر نیا مسئلہ شروع ہو گیا تھا۔ فرحی کو الگ گھر کی ہوک اٹھی تھی۔ بند کمرے میں ہر دوسرے دن جھگڑا ہوتا۔ فرحی کی بلند آواز اور غزنی کا وہی دھیما اور نرم لہجہ۔ رمیز کا دل غزنی کے لیے گداز ہوتا رہتا۔ وہ کیسے گم صم سے ہو کر رہ گئے تھے۔

ان کی پوری شخصیت کسی گہرے درد میں ڈھل گئی تھی۔ سب کی موجودگی میں بھی چپ گم صم آنکھوں میں کوئی سوز رہ رہ کر لودے اٹھتا جیسے دور کہیں جنگلوں میں آگ جلتی ہو مگر اس کی تپش اور روشنی پتوں سے چھن چھن کر باہر آجائے۔ وہ جو محفلوں کی جان ہوا کرتے تھے، اب بھری محفل میں بھی ایک جامد خاموشی ان پر طاری ہوتی جو رمیز کے دل کو پگھلاتی اور موم کرتی تھی۔

ان کی روشن آنکھیں بجھ گئی تھیں اور ہونٹوں کی ہنسی مر گئی تھی۔ کبھی کبھی تو اسے ان پر ہی غصہ آتا کہ انہوں نے کیوں ابا کی بات مانی۔ مگر وہ بے چارے بھی کیا کرتے ابا نے ایسا ترپ کا پتا چلا تھا کہ وہ ہار گئے۔ لیکن وہ ابا کو اپنی زندگی کے متعلق ایسا کوئی فیصلہ نہیں کرنے دے گا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچ رکھا تھا ایسے میں راحت بی بی کی آمد اور فرحی کا اچانک ہی مہربان ہو جانا خصوصاً اس پر، وہ کوئی بچہ نہیں تھا کہ اس التفات اور مہربانی کو نہ سمجھتا۔ اس نے بھی صاف صاف اماں سے کہہ دیا۔

"میرے بھائی کے ہونٹوں کی ہنسی چھین لی ہے ابا کی بھانجی نے اور اب اپنی بہن کو میرے سر پر مسلط کرنا چاہتی ہیں تو آپ انہیں صاف صاف بتا دیجیے کہ میں غزنی نہیں ہوں جو ابا کی بات پر سر جھکا دوں گا۔"

"رمزی۔"

اماں نے دروازے کے باہر کھڑی فرحی کی جھلک دیکھ لی تھی اور کسی جھگڑے کے ڈر سے زرد پڑ گئی تھیں۔ لیکن نہیں جانتی تھیں کہ رمیز نے فرحی کو سنانے کے لیے ہی یہ بات کہی تھی اور وہ بھی فرحی کو دیکھ چکا تھا۔ فرحی کی ایک عادت چھپ چھپ کر باتیں سننے اور لگائی بجھائی کرنے کی بھی تھی۔ راحت تو چلی گئی تھی لیکن بند کمرے میں ہونے والے جھگڑے کی آوازیں اب باہر تک آنے لگی تھیں۔ دونوں بچے الگ سہمے سہمے سے رہتے تھے۔ آخر ایک روز ملک نواز نے ناشتے کی ٹیبل پر غزنی سے پوچھ لیا۔

"تم دونوں کے درمیان کیا مسئلہ ہے غزنی۔ زندگی اس طرح لڑ جھگڑ کر نہیں گزر تی بیٹا۔ جو بھی بات ہے، اسے اگر خود حل نہیں کر سکتے تو ہمیں بتاؤ، ہو سکتا ہے، ہم کچھ مدد کر سکیں۔"

"کچھ نہیں ابا جی! بس یوں ہی فرحی کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ آجاتا ہے تو۔" انہوں نے جھکی نظروں سے جواب دیا تھا لیکن فرحت بی بی پھٹ پڑی تھیں۔

"بات صرف اتنی سی ہے ماموں جی! کہ میں الگ گھر میں رہنا چاہتی ہیں۔ ہر لڑکی کی طرح میری بھی خواہش ہے کہ میرا اپنا الگ گھر ہو۔ لیکن یہ میری بات سننے کے لیے تیار ہی نہیں۔"

ملک نواز اس وقت تو خاموش ہو گئے تھے لیکن بعد میں انہوں نے غزنی کو سمجھایا کہ فرحی کی بات مان کر الگ گھر لے لو۔ روز روز کے جھگڑوں سے نجات

مل جائے گی لیکن غزنی نے صاف انکار کر دیا۔

"ہر گز نہیں۔ ایک ہی شہر میں الگ گھر لے کر کیوں رہوں ابا جی۔ آخر یہاں اسے کیا تکلیف ہے۔ میں نے کبھی اس کی کسی بات سے انکار نہیں کیا لیکن یہ بات نہیں مان سکتا۔ آج وہ الگ گھر کی بات کر رہی ہے کل کو وہ کہے گی کہ آپ لوگوں سے ملوں بھی نہیں، نہ چھوڑ دوں سب کو تو۔ کیا اس کی خوشی کے لیے چھوڑ دوں سب کو۔"

ملک نواز خاموش ہو گئے تھے لیکن روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کر انہوں نے اپنی ٹرانسفر لاہور کروالی تھی۔ اس طرح فرحی کا الگ رہنے کا مطالبہ بھی پورا ہو گیا تھا اور وہ ایک ہی شہر میں الگ گھر لے کر رہنا نہیں پڑا تھا۔ ان کا ہی نہیں سب کا خیال تھا کہ اب فرحی خوش ہو گی اور غزنی کے ساتھ اس کا جھگڑا نہیں ہوتا ہو گا لیکن یہ خام خیالی تھی رمیز کو دو تین بار لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ......

وہی ہے چال بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

☆☆

ایک سال لاہور رہنے کے بعد ایک بار پھر غزنی کا تبادلہ اپنے شہر میں ہو گیا تھا۔ حالانکہ اپنے والدین کو پریشانی سے بچانے کے لیے انہوں نے بہت کوشش کی تھی کہ تبادلہ رک سکے لیکن ایسا نہیں ہو سکا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر اس بار فرحی نے الگ گھر میں رہنے کی بات نہیں کی تھی کہ شاید ایک سال میں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گیا تھا۔

یہاں تو سب کچھ ہو جاتا تھا اور اسے ہاتھ بھی نہ ہلانے پڑتے تھے۔ کچن کا سارا کام اماں کام والی لڑکی شمو کی مدد سے خود ہی کرتی تھیں۔ باقی کاموں کے لیے ماسیاں تھیں تو شاید فرحی نے سوچا ہو کہ یہاں رہنے میں ہی فائدہ ہے یہ رمیز کا خیال تھا۔ خود اس کے ذہن میں کیا تھا یہ وہ خود ہی جانتی تھی۔

چند دن پہلے وہ میکے گئی تو واپسی پر اپنی چھوٹی بہن راحت کو بھی لیتی آئی تھی۔ اب دونوں بہنیں یا تو سارا دن ٹی وی دیکھتیں یا شاپنگ کے لیے نکل جاتیں۔ بچے زیادہ تر اماں کے پاس ہی رہتے تھے جو ان کے واپس آجانے سے بہت خوش تھیں۔ دونوں پوتوں میں ان کی جان تھی۔ یہ ایک سال ان کی جدائی میں وہ بے حد اداس رہی تھیں۔ بچے بھی ماں کے مقابلے میں ان سے زیادہ قریب تھے۔

راحت کا مزاج فرحت کے مقابلے میں کچھ دھیما تھا اور وہ کچھ خاموش طبع بھی تھی۔ بہن کی طرح پٹر پٹر نہیں بولتی تھی، البتہ پڑھی لکھی وہ بھی نہ تھی یا شاید پانچ جماعتیں پڑھ رکھی ہوں۔ رمیز کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا کہ وہ پڑھی لکھی ہے یا نہیں لیکن جب اماں نے اسے بتایا کہ فرحی نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اس کی اور راحت کی شادی کی بات کی ہے تو وہ بھڑک اٹھا۔

"میرے ہیرے جیسے بھائی کی زندگی کی خوشیاں کھا کر اب مجھ پر نظر ہے ان کی۔ کہہ دیں اس سے کہ یہ خیال دل سے نکال دے۔ میں غزنی بھائی کی طرح بلیک میل نہیں ہوں گا۔ اس لیے کسی کو بھی کوئی جذباتی سین کری ایٹ تخلیق کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اور جیسے میں تو مری جا رہی ہوں اپنی بہن کا رشتہ تم سے کرنے کے لیے۔ منہ دھو رکھو، میری بہن کے لیے بہت رشتے ہیں۔"

دروازے کے باہر کھڑی فرحت غصے سے دروازہ دھکیلتی اندر آئی تھی۔ وہی اس کی کن سوئیاں لینے کی عادت۔

"چلو اچھا ہوا، آپ نے خود ہی سن لیا کہ مجھے کوئی شوق نہیں آپ کی بہن سے شادی کرنے کا۔"

"وہ تو جیسے تمہارے انتظار میں بیٹھی ہے نا......

اور میں نے تمہارے بھائی کی زندگی کی کون سی خوشیاں کھالی ہیں۔ بلکہ اس نے مجھے کوئی خوشی نہیں دی آج تک۔ میری تو قسمت ہی خراب تھی جو۔"

اور پھر تو فرحی کے وہ ہنگامہ کیا کہ اللہ کی پناہ۔ اور غزنی کے گھر آنے پر جو رونا پیٹنا مچایا تو ملک نواز

بھی سر پکڑ کر بیٹھ گئے تھے اور وہ اسی وقت راحت کو ساتھ لے کر میکے روانہ ہو گئی اور رمیز نے شکر کیا کہ اس کے سر سے بلا ٹلی۔ ورنہ ابا سے کیا بعید تھا کہ فرحت اور اپنی بہن کی خواہش جان کر وہ اس کی گردن پر بھی تلوار رکھ دیتے لیکن اس نے بھی سوچ رکھا تھا کہ وہ ہرگز ابا کی بات نہیں مانے گا۔ وہ غزنی بھائی کی طرح کمزور نہیں پڑے گا۔

ابا کے بہن بھائیوں کا کیا پتا، کون کب اپنی صاحبزادی کے لیے ابا کو مجبور کر دے۔ چھوٹے تایا، بڑے تایا یا پھر زرینہ پھپھو اپنی دختر نیک اختر راحت بیگم کے لیے۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ غزنی اور نیلی کی حالت انہیں بھی دکھ دیتی تھی۔ اور اس کے لیے وہ خود کو ہی الزام دیتے تھے اور کتنی ہی بار انہوں نے نزہت بیگم سے اعتراف کیا تھا کہ ان سے غزنی اور نیلی کے معاملے میں غلطی ہو گئی تھی بلکہ ہر روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کر ایک روز انہوں نے غزنی سے کہا تھا کہ اگر وہ چاہے تو فرحی کو طلاق دے دے۔ وہ منع نہیں کریں گے۔ اور تب غزنی نے زخمی نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

"اور اس طلاق کا نتیجہ کیا ہو گا۔ آپ نے سوچا۔ آپ کی بہنیں چھوٹ جائیں گی اور ہو سکتا ہے بھائیوں کو بھی لگے کہ ان کی بھانجی کے ساتھ ظلم ہوا ہے اور وہ بھی آپ سے قطع تعلق کر لیں۔ پھر نیلی ہے۔ ردعمل کے طور پر وہ نیلی کو بھی گھر بھجوا دیں گے۔ ٹھیک ہے وہ خوش نہیں ہے۔ اس کی وہاں زندگی بہت مشکل ہے پھر بھی اس کی بیٹی اور بیٹا ہے۔ میرے دو بچے ہیں۔ ان کا کیا ہو گا۔ نہیں ابا! میں یہ ظلم نہیں کر سکتا۔ اب میں بے سکون رہوں یا ناخوش، مجھے نیلی کے ساتھ ہی زندگی گزارنی ہے اپنے بچوں فرحی کے بچوں اور نیلی کی خاطر...... اور آپ کے لیے ابا...... آپ پریشان نہ ہوں شاید وقت گزرنے کے ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔"

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ کچھ ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ فرحی ویسی ہی تھی ہر تیسرے چوتھے روز کسی نہ کسی بات کو لے کر ہنگامہ کر دیتی۔" البتہ اجمل اب نیلی کا کچھ خیال رکھنے لگا تھا۔

☆☆☆

لیکن ملک نواز نے سوچ لیا تھا کہ رمیز کا رشتہ وہ بہت سوچ سمجھ کر کریں گے۔ کوئی ایسی لڑکی جو رشتے بنا کر رکھنا جانتی ہو۔ مہذب اور پڑھی لکھی ہو۔ جو رمیز کی زندگی کی صحیح اور سچی ساتھی ہو۔ یوں تو خاندان میں بھی لڑکیاں تھیں اور وہ فرحی کی طرح ان پڑھ جاہل نہیں تھیں لیکن جس طرح رمیز غزنی کی شادی کو لے کر چڑا ہوا تھا۔ ان کا خیال تھا وہ خاندان میں شادی نہیں کرے گا اس لیے انہوں نے نزہت بیگم سے کہا تھا کہ۔

"رمیز اب برسر روزگار ہے، اس لیے اس کی شادی ہو جانی چاہیے۔ یہ ہی صحیح عمر ہوتی ہے۔ صحیح وقت پر بچوں کی شادی ہو جائے تو ان کے بھٹکنے کا امکان نہیں ہوتا۔ لیکن بہتر ہے کہ آپ اس کے لیے خاندان سے باہر اس کے معیار کی کوئی لڑکی دیکھیں۔ لیکن پہلے رمیز سے بھی پوچھ لیں کہ اگر اس کی کوئی پسند ہو تو۔" اور رمیز کو نزہت بیگم کی بات سن کر حیرت ہوئی تھی۔

"کمال ہے، انہیں میری پسند جاننے کا خیال کیسے آ گیا۔ غزنی بھائی کے وقت تو انہیں یہ خیال نہیں آیا تھا۔ بہرحال میری کوئی پسند نہیں ہے۔ اور ابھی مجھے شادی بھی نہیں کرنی۔"

اور نزہت بیگم ابھی کچھ کہنا ہی چاہتی تھیں کہ غزنی کے کمرے سے فرحی کے زور زور سے بولنے کی آواز آئی تو رمیز کے لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ایسی شادی سے میں کنوارا ہی بھلا۔"

"ابھی شادی نہیں کرے گا تو کیا بوڑھا ہو کر کرے گا۔"

نزہت بیگم نے ملک نواز کو بتایا تو انہوں نے کہا۔

"سمجھاؤ اسے اور اس کی کوئی پسند نہیں ہے تو

ادھر ادھر لڑکی دیکھو۔ اپنے جاننے والوں سے بھی کہو۔ میں سوچ رہا ہوں رمیز کے فرض سے فارغ ہو کر ہم دونوں حج پر چلیں۔"

☆☆☆

نزہت بیگم نے اپنی جان پہچان والی خواتین اور ایک دو پڑوسنوں سے بھی کہہ دیا تھا، اس سے پہلے کہ کوئی انہیں ایسی لڑکی کے متعلق بتاتا ملک نواز کو آمنہ پسند آ گئی تھی۔

آمنہ ان کے بے حد اچھے دوست سعید احمد کی بیٹی تھی جو اپنی جاب کے سلسلے میں لاہور میں مقیم تھے اور چند ماہ پہلے ہی واپس اپنے شہر میں سیٹل ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ریٹائرمنٹ سے تین سال پہلے ہی ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔ ملک نواز تین چار بار ان سے ملنے جا چکے تھے۔ سعید احمد کی بیوی اور بچوں سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ ان کی بڑی بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔ اس سے چھوٹا بیٹا تعلیم ختم کر کے جاب کر رہا تھا جبکہ آمنہ نے ابھی ماسٹرز کیا تھا اور سب سے چھوٹا ابھی یونیورسٹی میں تھا۔ اس روز وہ سعید احمد سے ملنے گئے تو انہوں نے اصرار کر کے کھانے پر روک لیا۔ اور اس روز انہوں نے آمنہ کو بغور دیکھا تھا۔ خوش شکل، سرو قد، سلجھی ہوئی اعلا تعلیم یافتہ، وہ رمیز کے لیے ایسی ہی لڑکی چاہتے تھے۔ دھیمے لہجے میں باتیں کرتی آمنہ انہیں بہت اچھی لگی تھی۔

تاہم گھر میں بات کرنے سے پہلے وہ دو تین بار اور سعید احمد کے ہاں گئے تھے اور بطور خاص آمنہ سے بات چیت کی۔ اس کی دلچسپیوں اور مشاغل کے متعلق پوچھتے رہے۔ مختلف موضوعات پر بات بھی کی۔ اس کے خیالات اور سوچ سے بھی متاثر ہوئے اور بالآخر انہوں نے نزہت بیگم سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا انہیں اپنے لاڈلے رمیز کے لیے آمنہ بہترین انتخاب لگی تھی لیکن ابھی انہوں نے نزہت سے بات نہیں کی تھی کہ سعید احمد کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔

انہیں ہلکا سا ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ ان کے بیٹے نے انہیں فون کر کے بتایا تو وہ آفس سے سیدھے ہاسپٹل چلے گئے۔ سعید احمد کو کچھ دیر پہلے ہی آئی سی یو سے کمرے میں منتقل کیا گیا تھا اور وہ کافی بہتر تھے۔ بچپن کی دوستی تھی۔ اس لیے بے تکلفی سے ایک دوسرے سے اپنے دکھ سکھ کہہ لیتے تھے۔

"یہ کیا یار! دل کو روگ لگا بیٹھے۔ اور وہ جو میری ریٹائرمنٹ کے بعد ہم نے گھومنے کا پروگرام بنایا تھا اس کا کیا ہوگا۔"

"جو اللہ کو منظور ہوگا ملک! انسان کے ارادوں کا کیا ہے۔ وہ تو جانے کیا کیا منصوبے بناتا رہتا ہے۔ ارادہ تھا آمنہ اور اظہار کی اکٹھی شادی کروں گا۔ لیکن اظہار کے سسرال والے جلدی شادی کرنا چاہتے ہیں جبکہ آمنہ کے لیے ابھی تک کوئی موزوں رشتہ نہیں مل رہا۔ حالانکہ بہت رشتے آتے ہیں لیکن دل کو کوئی بھاتا ہی نہیں ہے۔ دعا کرنا یار اللہ مجھے اتنی مہلت دے کہ میں اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے رخصت کر سکوں۔"

سعید احمد کی آواز بھرا گئی تھی۔

"بے فکر رہو تم۔ اپنے تینوں بچوں کی شادیاں اپنے ہاتھوں سے کرو گے اور آمنہ کی تو تم فکر نہ کرو۔ آج سے وہ میری بیٹی ہے۔ رمیز کو تو تم جانتے ہی ہو نا۔ جب کہو گے بارات لے کر آ جاؤں گا۔ جس سے چاہو، رمیز کے متعلق پوچھ لو۔"

وہ ملک نواز تھے۔ بہت بار کی طرح اس وقت بھی فوری فیصلہ کیا تھا انہوں نے اور آمنہ کو تو یوں بھی وہ پہلے ہی رمیز کے لیے منتخب کر چکے تھے۔

"تمہارے بیٹوں کے متعلق مجھے کسی سے کچھ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے ملک! کون نہیں جانتا ان کے متعلق۔ یہ تو ہماری خوش نصیبی ہے لیکن تم رمیز سے بھی بات کر لو۔ کیا خبر اس کی کوئی پسند ہو۔"

"ارے نہیں یار ایسی کوئی بات نہیں ہے چند دن پہلے ہی تمہاری بھابی نے بات کی تھی اس سے اور اس نے بتایا تھا کہ وہ کسی کو پسند نہیں کرتا۔"

ملک نواز نے خوش دلی سے کہا تو ایک اطمینان بھری مسکراہٹ سعید احمد کے لبوں پر نمودار ہوئی۔

"اگر رمیز آمنہ سے ملنا چاہے تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ دونوں بچے ایک دوسرے کو دیکھ لیں گے۔ کسی روز گھر پر لے آنا رمیز کو۔"

سعید احمد ان کے مقابلے میں بچوں کی رائے کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

"چلو ٹھیک ہے۔ رمیز سے بات کروں گا۔ لیکن بس آج سے آمنہ میری بیٹی ہے۔" ملک نواز نے ان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ جسے نم آنکھوں سے سعید احمد نے گرم جوشی سے تھاما۔

"تم ہاسپٹل سے آجاؤ تو تمہاری بھابی کو لے کر آؤں گا رسماً بات کرنے۔ ساتھ ہی شادی کی تاریخ بھی طے کرلیں گے۔ تم اظہار کے سسرال والوں سے تاریخ وغیرہ کے سلسلے میں مشورہ کرلینا۔"

ملک نواز بے حد خوش اور مطمئن سے گھر آئے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ رمیز جو غزنی اور نیلی کے متعلق ان کے فیصلے کی وجہ سے کچھ خفا خفا اور ناراض سا رہتا تھا۔ اپنے متعلق ان کے کیے گئے فیصلے پر یقیناً خوش ہو گا کہ آمنہ ایسی ہی تھی کہ کوئی بھی اس کا ساتھ پا کر فخر محسوس کرتا۔

حالانکہ بڑے بھائی نے دو تین بار ان سے کہا تھا کہ وہ رمیز کی شادی طے کرتے وقت زرینہ آپا اور شہباز بھائی کی بیٹی کے متعلق بھی سوچیں۔ لیکن وہ اپنی غلطی کو دہرانا نہیں چاہتے تھے حالانکہ شہباز بھائی کی بیٹی یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی۔ اور اچھی شکل کی خوش اخلاق بچی تھی۔ لیکن غزنی کی تکلیف دہ زندگی کی وجہ سے رمیز جس طرح خاندان والوں سے خصوصاً ددھیال والوں سے چڑا ہوا تھا۔ انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر خاندان سے باہر اس کی شادی کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ یہ تو جانتے تھے کہ وہ کچھ خفا اور ناراض سا ہے لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ اس کے اندر اتنا غصہ بھرا ہے کہ وہ ان کی منتخب کردہ کسی بھی لڑکی سے شادی کرنے سے صاف انکار کردے گا۔ نزہت بیگم نے جب اسے آمنہ کے ساتھ بات طے ہونے کا بتایا تو اس نے صاف انکار کردیا۔

"مجھے کسی آمنہ شامنہ سے شادی نہیں کرنی۔ حیرت ہے غزنی بھائی کی زندگی دیکھ کر بھی ابا کو عقل نہیں آئی اور انہوں نے خود ہی خود فیصلہ کر کے اس پر مہر لگادی لیکن میں غزنی نہیں ہوں۔ ابا کو بتا دیں، مجھے ان کا فیصلہ منظور نہیں ہے۔"

"لیکن رمزی! آمنہ بہت اچھی لڑکی ہے اعلا تعلیم یافتہ اور مہذب خوش اخلاق میں ایک دو بار ملی ہوں اس سے اور پھر تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ تم کسی کو بھی پسند نہیں کرتے۔"

نزہت بیگم اس کے ردعمل پر پریشان ہو گئی تھیں۔

"ہاں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ابا اپنی پسند کی لڑکی مجھ پر مسلط کردیں۔"

"لیکن پھر تمہیں کیا اعتراض ہے جب تم کسی کو پسند بھی نہیں کرتے تو۔"

نزہت بیگم کو اس کا یوں انکار کرنا سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

نہیں کرتا تھا وہ کسی کو پسند۔ غزنی بھائی کی طرح اس کی کسی سے کمٹ منٹ بھی نہیں تھی پھر بھی۔

"پسند۔" وہ چونکا تھا اور تصور میں ایک سراپا لہرایا تھا دلکش، بھر وقد، بڑی بڑی سحر انگیز آنکھیں۔

اس کے دل میں کہیں ہلچل سی ہوئی تھی۔ وہ کون تھی۔ کیا نام تھا، اس کا وہ نہیں جانتا تھا۔ پہلی بار اس نے اسے اپنے دوست سعد کے گھر میں دیکھا تھا۔ سعد اس کا بے تکلف دوست تھا۔ اور اس کے گھر میں بھی اس کا آنا جانا تھا۔ اس کی امی اسے اپنا دوسرا بیٹا کہتی تھیں۔ سعد کی چھوٹی بہن بھی اسے اپنا بھائی سمجھتی تھیں۔

اس روز وہ سعد کی امی سے ملنے۔ گھر کے اندر گیا تھا اور اس نے رافعہ، سعد کی بہن کے ساتھ اسے لاؤنج سے باہر آتے دیکھا تھا۔ رافعہ اسے سلام کر کے اس کے ساتھ ہی باہر نکل گئی۔ شاید وہ رافعہ کی کوئی

سہیلی یا ان کی کوئی عزیز ہوگی۔ لیکن کتنی عجیب بات تھی کہ ایک سرسری نظر ڈالنے کے باوجود کئی روز تک یونہی کام کرتے ہوئے اس کا خیال آجاتا تھا اور جب تقریباً وہ اسے بھول چکا تھا تو رافعہ کی شادی کا سلسلہ چل نکلا۔

شادی کی تیاری کے سلسلے میں وہ سعد کی مدد کر رہا تھا کہ اس کے ابو ملک سے باہر تھے اور سعد اکیلا تھا سو وہ اس کے ساتھ ہی بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ کارڈ چھپوانے تھے، ہال بک کروانا تھا اور دوسرے کئی کام کہ اس کے ابو شادی سے صرف تین دن پہلے آرہے تھے۔ اس سلسلے میں کئی بار گھر کے اندر بھی جانا ہوا اور دو تین بار اس کا اس سے بھی سامنا ہوا۔ اور ہر بار ہی اس لڑکی نے اسے چونکایا تھا، وہ اس کے رکھ رکھاؤ سے متاثر ہوا تھا۔ بطور خاص کسی نے اس کا اس سے تعارف نہیں کروایا تھا۔ البتہ سعد نے بتایا تھا کہ وہ رافعہ کی دوست ہے اور رافعہ کے اصرار پر شاپنگ وغیرہ کے لیے امی اور اس کے ساتھ جارہی تھی۔

''دراصل رافو تو بالکل بدھو ہے اور اماں کو آج کل کے فیشن کا زیادہ پتا نہیں تو ما نو ہی اماں کے ساتھ بازاروں میں خوار ہو رہی ہے۔ گڑیا اور پومی تو ابھی بہت چھوٹی ہیں، انہیں ان باتوں......''

''مانو یقیناً اس کا پیار کا نام ہوگا۔'' اس نے تب سوچا تھا۔ بہر حال جو بھی تھا، وہ شاید اس لڑکی سے کسی حد تک متاثر ضرور ہوا تھا۔ جو اس وقت اس کا سراپا اس کے تصور میں چلا آیا تھا۔ بے اختیار ایک مدھم سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہوئی اور نزہت نے کسی قدر حیرانی سے اسے دیکھا۔

''رمزی بیٹا! تمہارے ابا نے اپنے دوست سے بات کرلی ہے۔ اور آمنہ بہت پیاری بچی ہے تم خوش رہو گے۔''

''تو'' اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ ''میں ابا کی کسی بات کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ اول تو مجھے شادی ہی نہیں کرنی اور اگر کبھی کی بھی تو اپنی مرضی اور اپنی پسند سے کروں گا۔''

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا لاؤنج سے باہر نکل گیا اور نزہت پریشان سی بیٹھی رہ گئیں۔ ان کا خیال تھا کہ ابھی غصہ دکھا رہا ہے، ایک دو روز میں وہ اسے منالیں گی۔ سب ہی جانتے تھے کہ اسے غزنی سے کتنا پیار تھا۔ آئیڈیل تھے وہ اس کا اور ان کی ناکام ازدواجی زندگی اسے اذیت دیتی تھی لیکن اس کی نہ ہاں میں نہیں بدلی تھی۔

☆☆☆

''کیا بچوں جیسی ضد کر رہے ہو رمزی۔ آمنہ بے حد اچھی لڑکی ہے تم اس کی رفاقت میں بے حد اچھی زندگی گزارو گے۔'' غزنی نے سمجھایا تھا۔

''میں بچوں جیسی ضد کر رہا ہوں یا ابا مجھ پر اپنا فیصلہ مسلط کرنا چاہتے ہیں جیسے انہوں نے آپ پر کیا۔ نیلی پر کیا۔ آپ کو تو خود پر ترس نہیں آتا۔ لیکن نیلی آپا کی حالت دیکھی ہے۔ آپ نے۔ کیسے بجھ کر رہ گئی ہیں۔ ایک بالکل مختلف ماحول نے انہیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ ڈار سے بچھڑی کونج کی طرح بے قرار اور مضطرب۔ آپ کو تو انہوں نے سولی پر چڑھایا ہی تھا۔ نیلی آپا کا ہی کچھ خیال کر لیتے۔''

وہ بولا تو بولتا چلا گیا۔

''کیا میں نے یا نیلی نے تم سے کوئی گلہ یا شکوہ کیا رمزی۔ جو کچھ ہمارے مقدر میں لکھا تھا ہو گیا۔ اب کیا تم مقدر کو بدل سکتے ہو جو ضد لگائے بیٹھے ہو۔''

غزنی سے ابا اور اماں کی پریشانی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

''اور کیا اب تم ابا کو ان کی غلطیوں کی سزا دو گے۔''

''پتا نہیں، میں انہیں سزا دے رہا ہوں یا اپنے آپ کو۔''

اماں ابا کا دل دکھا کر وہ بھی خوش نہ تھا۔

''غزنی بھائی پلیز آپ نہیں سمجھ سکتے میرے احساسات کو۔ یہ احساس کہ ابا مجھے ایک بے جان چیز کی طرح ٹریٹ کر رہے ہیں جب کہ میں ایک جیتا جاگتا انسان ہوں۔ جذبات و احساسات رکھنے والا،

اس لیے مجھے ابا کا طے کیا ہوا رشتہ منظور نہیں ہے۔"

"رمزی تم! بلاوجہ ضد میں آئے ہوئے ہو۔ حالانکہ تمہارے پاس اس کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ اگر تمہاری کسی سے کمٹ منٹ ہوتی تو کوئی جواز بھی ہوتا تمہارے انکار کا۔"

غزنی کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ایسا مت کرو رمزی۔"

"ہاں، شاید میرے پاس کوئی معقول وجہ نہیں ہے لیکن میں بغیر کسی معقول وجہ کے بھی انکار کا حق رکھتا ہوں۔"

تصور میں رافعہ کی دوست کا سراپا لہرایا۔ وہ سحر سا طاری کرتی دلکش آنکھیں۔

"کیا ابا تمہارے اس حق کو تسلیم کریں گے۔" غزنی نے ان کی طرف دیکھا۔

"نہ کریں لیکن وہ مجھ پر اپنی مرضی نہیں ٹھونس سکتے۔ جیسے آپ کے ساتھ کیا۔" غزنی اس کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔ فرحی اگر ذرا سی بھی سمجھدار ہوتی تو شاید اب تک رمیز کا غصہ ختم ہو چکا ہوتا۔ لیکن اسے تو نباہ کرنا آتا ہی نہیں تھا۔

"میری زندگی جیسی بھی گزر رہی ہے، مجھے ابا کی بات مان کر کوئی پچھتاوا نہیں ہے کہ ان کا حق ہے مجھ پر۔"

غزنی کا خیال تھا کہ وہ کم از کم ان کی بات ضرور مان لے گا۔ بھلے ابا پر اسے کتنا ہی غصہ کیوں نہ ہو۔ لیکن جب رمیز اپنی بات پر قائم رہا تو اس نے چھوٹے ماموں سے کہا کہ اسے سمجھائیں چھوٹے ماموں کے ساتھ رمیز کی بہت بنتی تھی۔ اور ان کا رویہ بھی بھانجوں بھانجیوں کے ساتھ بہت دوستانہ ہوتا تھا۔ لیکن رمیز نے انہیں بھی صاف انکار کردیا۔

"آپ انصاف سے بتائیں ماموں جان! ہمیں کیا اپنی مرضی کی زندگی بسر کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

"وہ تو ہے لیکن والدین کے بھی تو کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ اگر تمہارے ابا نے تمہاری بات طے کر دی ہے تو اس میں کیا حرج ہے جبکہ آپا بتا رہی تھیں کہ وہ لڑکی اعلا تعلیم یافتہ، خوب صورت اور سلیقہ شعار ہے۔ اور تم صرف اس لیے انکار کر رہے ہو کہ وہ تمہارا نہیں تمہارے ابا کا انتخاب ہے۔"

ماموں بہرحال اسے قائل کرنا چاہتے تھے۔

"ابا کی تو بات چھوڑیں آپ، انہوں نے زندگی بھر اپنا ہی حکم چلایا۔ اپنی بہنوں کی خاطر اپنی اولاد کی زندگیاں داؤ پر لگا دیں۔ لیکن میں ان کی ڈکٹیٹرشپ کے سامنے سر نہیں جھکا سکتا۔"

اس کے اندر جانے کتنا غصہ بھرا تھا کہ جو کم ہونے میں ہی نہیں آرہا تھا۔

"تو کیا ٹکراؤ گے ان سے۔ لیکن اپنا ہی سر پھوڑو گے۔" وہ حیران تھے کہ وہ اتنا ضدی تو نہ تھا پھر۔

"بلا سے پھوٹ جائے مگر انہیں بھی تو پتا چلے کہ کوئی ہے جو ان کے فیصلوں سے ٹکرا سکتا ہے اور یہ صرف رمیز ہی کہہ سکتا تھا۔"

"بے وقوف! باپ کو سبق سکھانا چاہتے ہو۔" انہوں نے اسے جھڑکا۔

"کچھ بھی ہو، آپ ان تک میرا انکار پہنچا دیں کہ اول تو میں نے شادی ہی نہیں کرنی اور اگر کبھی کی بھی تو اپنی مرضی سے۔"

"کوئی فائدہ نہیں رمزی! تمہارے ابا نہیں مانیں گے۔ اپنے دوست کو زبان دی ہے انہوں نے۔" انہوں نے مایوسی سے کہا۔ "وہ بہرحال اپنی بات منوالیں گے تم سے اس لیے ضد کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"کیسے جیسے غزنی بھائی سے منوائی تھی لیکن میں غزنی نہیں ہوں۔ نہ دھونس دھمکیوں میں آنے والا ہوں۔ نہ غزنی بھائی کی طرح بلیک میل ہونے والا۔"

وہ غزنی کی طرح نہیں تھا سب ہی کہتے تھے غزنی بالکل اماں پر گیا ہے۔ نرم دل، دھیمے مزاج والا۔ صابر اور وہ ابا کی کاپی ہے۔ ویسے ہی غصے کا تیز

اور اپنی بات منوانے والا۔

ماموں نے مایوس ہو کر نزہت بیگم کو اس کا انکار پہنچا دیا۔ اور جب نزہت بیگم نے آخری کوشش بھی کر کے دیکھ لی تو ملک نواز کو بتا دیا کہ وہ کسی صورت راضی نہیں ہے۔

"وہ راضی ہو یا نہ ہو، شادی اس کی وہاں ہی ہو گی جہاں میں چاہوں گا۔"

ان کی اونچی آواز لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھتے رمیز نے سنی تو اس کے لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ ابھری۔

"مگر جب زندگی اس نے گزارنی ہے تو اس کی بات مان لیں۔" نزہت بیگم کا لہجہ دبا دبا سا تھا۔

"باپ ہے نا وہ میرا، جو اس کی بات مان لوں۔"

وہ اور بھی مشتعل ہو گئے تھے۔

"کبھی کبھی اولاد کی مرضی کو مقدم رکھنا پڑتا ہے ملک صاحب۔" نزہت بیگم کی آواز مزید مدھم ہوئی تھی۔

"زیادہ وکالت کی ضرورت نہیں ہے۔ پوچھا تھا نا تم نے اس سے اور اس نے کہا تھا کہ اس کی کوئی پسند نہیں۔ پھر خوامخواہ ضد کر رہا ہے، جانتا ہوں میں لیکن اس سے کہو راہ راست پر آ جائے۔ ورنہ۔"

"ورنہ کیا کر لیں گے وہ بھلا۔" اس کے ہونٹ بھنچ گئے اور وہ ٹی وی بند کر کے اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔

آنکھیں بند کیں تو چھم سے وہ اس کے تصور میں آ گئی۔ رافو کی رخصتی والے روز بار بار ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھتی وہ جیسے اسے اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ تو کیا وہ اس سے متاثر ہو رہا تھا اور کیا ماموں اور غزنی کو سمجھانے کے باوجود وہ اس لیے نہیں مان رہا تھا کہ اس کے دل میں کہیں اس کا خیال موجود تھا۔

لیکن نہیں۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اس خیال کو رد کر دیا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے، وہ تو اس کے متعلق جانتا تک نہیں۔ کیا خبر وہ کہیں کمیٹڈ ہو۔ منگنی یا نکاح ہو چکا ہو۔ کسی سے متاثر ہو جانے کا یا کسی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ اسے اپنی زندگی میں شامل کر لیا جائے۔ وہ ایک اچھی سلجھی ہوئی لڑکی ہے تو اس لیے۔ اور اپنے آپ کو مطمئن کر کے اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھی کتاب اٹھا لی جو آج ہی وہ خرید کر لایا تھا۔ اور ابھی اس نے چند صفحے ہی پڑھے تھے کہ نزہت بیگم نے نیم وا دروازے کو ذرا سا کھولا۔

"رمزی! تمہارے ابا تمہیں بلا رہے ہیں۔"

وہ یکدم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ معمول سے کہیں زیادہ سنجیدہ تھیں اور ان کی آنکھوں سے پریشانی سی جھلکتی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتا، وہ واپس مڑ گئیں۔

جلدی سے سلیپر پہن کر وہ باہر نکلا تو وہ کچن کی طرف جا رہی تھیں۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے کچھ دیر لاؤنج میں ہی رک کر اپنے بکھرے بالوں کو انگلیوں سے سمیٹ کر پیچھے کیا اور خود کو کمپوز کرتا ہوا ملک نواز کے بیڈ روم کی طرف بڑھا۔

جانتا تھا کہ جلد یا بدیر اس کی پیشی ہونے والی ہے۔ دروازے کے باہر بھی وہ چند لمحے رکا تھا۔ آخر وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ یہ نہیں تھا کہ ابا کوئی ظالم اور بے رحم قسم کے انسان تھے اور انہیں اپنی اولاد سے محبت نہیں تھی۔ لیکن انہیں نہ سننے کی عادت نہیں تھی اور ہمیشہ اپنی منواتے تھے۔ اور غیر ارادی طور پر ان کی بات کی نفی کر کے وہ انہیں احساس دلانا چاہتا تھا کہ وہ ہمیشہ صحیح نہیں ہو سکتے کہیں پر وہ بھی غلط ہو سکتے ہیں جیسے غزنی اور نیلی کے معاملے میں۔ سر جھٹک کر اس نے دروازے پر دستک دی۔

"آ جاؤ۔" ملک نواز کی آواز بھاری سی تھی۔

"جی ابا جی! آپ نے بلایا تھا۔" اس نے اندر قدم رکھا۔

"ہاں۔" وہ بیڈ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھے تھے پیشانی پر بل پڑے تھے۔

"سعید احمد میرے دوست ہیں۔ تم انہیں اچھی

طرح جانتے ہو گئی۔ بار ہا مل چکے ہو ان کی بیٹی آمنہ بہت پیاری بچی ہے۔ اعلا تعلیم یافتہ، سلیقہ شعار۔ پھر کس وجہ سے تم انکار کر رہے ہو۔ تم خاندان میں شادی کے خلاف تھے تو میں نے خاندان میں اچھی لڑکیاں ہوتے ہوئے بھی کہیں بھی تمہاری بات طے نہیں کی۔ لیکن آمنہ مجھے بہت اچھی لگی، بالکل تمہارے معیار کے مطابق۔ پھر آخر کس وجہ سے انکار کر رہے ہو۔"

"کوئی وجہ نہیں لیکن مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔ مجھے شادی نہیں کرنی۔" وہ نگاہیں جھکائے کھڑا تھا۔

"رمیز۔" ان کی نظروں میں سرزنش تھی۔ "کیا تمہاری ماں نے تمہیں نہیں بتایا کہ میں نے سعید احمد کو زبان دی ہے اور خود اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں ساری زندگی سعید کا سامنا نہ کر سکوں۔ کبھی اس سے نظر نہ ملا سکوں۔ تمہارے نزدیک میری بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ تم اپنے باپ کو بے عزت کروانا چاہتے ہو۔ میں نے کتنے مان سے کہا تھا کہ رمیز کو اعتراض نہیں ہوگا اور بہت جلد ہم منگنی کی رسم ادا کرنے آئیں گے۔ بات تو طے ہو چکی ہے رمیز اب کیسے میں......"

"تو اس میں میرا کیا قصور ہے ابا جی! فیصلہ آپ نے کیا تھا تو اب آپ ہی خود انہیں منع کریں گے۔ جیسے بھی۔" اس نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔

"ہاں ٹھیک کہتے ہو تم...... سارا قصور میرا ہے تو سزا بھی مجھے ہی ملنی چاہیے۔ سعید کا سامنا کرنے سے بہتر ہے کہ خود کو ہی ختم کر لوں۔ شرمندگی سے تو بچ جاؤں گا۔"

انہوں نے یکدم ہاتھ بڑھا کر بیڈ سائیڈ دراز کھولا اور اس میں رکھا اپنا ریوالور نکالا (جو کچھ عرصہ پہلے ہی لیا تھا) اور اپنی کنپٹی پر رکھا۔

"وہی پرانا حربہ...... وہ دل ہی دل میں ہنسا آپ اگر میرے باپ ہیں تو میں بھی آپ کا بیٹا ہوں آپ کی چال آپ کی طرف ہی الٹا دوں گا اور اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر پستول ان کے ہاتھ سے لے کر اپنی کنپٹی پر رکھ لیا۔"

"ٹھیک ہے، جب میں نہیں رہوں گا تو آپ کو بھی شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔"

ہولے سے ہنستے ہوئے اس نے ٹریگر پر انگلی رکھی تو ملک نواز نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھ کر پستول اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ چند لمحے ہاتھ سینے پر رکھے گہرے گہرے سانس لیتے رہے پھر پستول واپس دراز میں ڈالتے ہوئے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"جاؤ رمیز! آج سے تم آزاد ہو۔ آج کے بعد تمہاری زندگی کے کسی بھی معاملے سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہوگا۔"

اس سے ان کی آنکھوں میں اتنی شکستگی، بے بسی اور اذیت تھی کہ رمیز کا دل سینے کے اندر بری طرح مچلا جیسے ابھی سینے کی چار دیواری توڑ کر باہر آگرے گا۔

"سوری ابا جی۔" اس کے ہونٹوں سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی۔

"بس۔" انہوں نے ذرا سا ہاتھ اونچا کیا۔

"جاؤ۔" اور نظریں جھکالیں۔ لمحہ بھر وہ کھڑا رہا پھر بنا کچھ کہے ہولے ہولے چلتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔

تو آج اس نے ابا کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر ہی دیا تھا۔ وہ خوش ہونا چاہتا تھا لیکن خوش نہیں ہو پا رہا تھا ایک غیر محسوس سی اداسی تھی جو دل پر چھائی تھی، ایک ملال سا تھا جس نے سارے وجود کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔

ابا نے ہمیشہ انہیں اچھا کھلایا۔ اچھا پہنایا بہترین اداروں میں تعلیم دلوائی۔ ہر خواہش پوری کی تھی اسے یاد آیا جب وہ تیرہ چودہ سال کا تھا تو سائیکل لینا چاہتا تھا۔ ان ہی دنوں ابا نے نیلی آپا اور عزنی بھائی کی یونیورسٹیوں کی فیس بھری تھی۔ اماں کا پتے کا آپریشن ہوا تھا۔ پرائیویٹ ہسپتال کی فیس۔ ان کے پاس بالکل گنجائش نہیں تھی۔ ایک سولہ گریڈ

کے افسر کی تنخواہ ہی کتنی ہوتی ہے۔ ساری بچت خرچ ہو چکی تھی اور فوری طور پر اس کی فرمائش پوری کرنا ممکن نہ تھا۔ اماں نے اسے سمجھایا تھا۔ کچھ صبر کرلو ذرا سا ہاتھ کھلا ہوتا ہے تو پھر لے لینا سائیکل۔" لیکن وہ اداس تھا اس کے دونوں دوستوں کے پاس سائیکل تھی اور پتا نہیں ابا کا ہاتھ کب کھلا ہو گا اور اسے سائیکل ملے گی لیکن ابا دو دن بعد ہی اس کے لیے سائیکل لے آئے تھے۔

"میرے بچوں نے کب کبھی کوئی فرمائش کی ہے نزہت! ایک دوست سے کچھ رقم ادھار لے لی ہے۔" اماں کے استفسار پر انہوں نے کہا تھا۔

"چھ سات ماہ بعد اگر میں اسے سائیکل لے کر دیتا تو اسے اتنی خوشی نہ ہوتی۔"

پھر اسے اپنے ابا سے شکوہ کیوں تھا۔ کیا صرف اس لیے کہ غزنی اور نیلی کے لیے کیا گیا ان کا فیصلہ غلط تھا۔ اس فیصلے نے ان کی زندگیوں کے سارے رنگ چرا لیے تھے۔ لیکن نہیں ابا کی اپنی بات منوانے کی عادت نے شاید بہت پہلے ہی کہیں اس کے دل میں کوئی گرہ ڈال دی تھی۔ جب وہ اسکول میں تھا تب اپنی اسکول کی کرکٹ ٹیم کا اچھا کھلاڑی تھا۔ تب اس نے سوچا تھا کہ وہ کرکٹر بنے گا اس کے لیے وہ کوئی کرکٹ کلب جوائن کرنا چاہتا تھا تاکہ مزید اپنا کھیل نکھار سکے لیکن ابا نے صاف منع کر دیا تھا۔ اسکول کی حد تک تو ٹھیک ہے۔ لیکن کلب وغیرہ جوائن کرنے کی ضرورت نہیں اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دو۔ یا پھر جب وہ فائن آرٹس میں جانا چاہتا تھا۔ تب انہوں نے منع کر دیا تھا۔

"اس فیلڈ میں کوئی خاص اسکوپ نہیں ہے۔ چند ایک خوش قسمت ہی کچھ کامیاب ہوتے ہیں۔ باقی دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ انجینئر بن جاؤ۔ آرکیٹیکٹ بن جاؤ۔ سول انجینئرنگ مکینیکل، الیکٹریکل جس میں بھی تمہارا انٹرسٹ ہو لیکن فائن آرٹس نہیں۔"

ہاں شاید تب ہی کوئی گرہ اس کے اندر بنی تھی اور یہ گانٹھ اس وقت مضبوط ہوئی جب انہوں نے غزنی اور نیلی کا رشتہ طے کرتے وقت کسی کی بات نہیں سنی۔ اگر ان کی زندگی خوش گوار ہوتی وہ فرحی کو ہر وقت لڑتے جھگڑتے، چلاتے اور نیلی کی اپنے شوہر کے ہاتھوں درگت بنتے نہ دیکھتا تو شاید یہ گرہ خود ہی کھل جاتی اور آج ابا کے طے کیے ہوئے رشتے پر اسے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ یہ ابا کے غلط فیصلے کا ردعمل تھا اس نے خود کو جواز دے کر مطمئن کرنا چاہا لیکن مطمئن نہ ہو سکا۔

عجیب سی بے چینی اور اضطراب تھا جو اسے سکون سے بیٹھنے نہیں دے رہا تھا کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا کبھی بیٹھ جاتا۔ ابا کی وہ نظریں جو اس کی طرف اٹھی تھیں جن میں بے یقینی تھی، بے بسی تھی اور شکستگی۔ وہ ٹوٹ پھوٹ جو ان کی آنکھوں میں نظر آ رہی تھی، وہ اس کے دل کو مسل رہی تھی ایک لمحہ کے لیے اس کا جی چاہا وہ ان سے جا کر کہے۔ "میں ہارا ابا آپ جیت گئے مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہے۔" لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے سر جھٹکا۔ نہیں انہیں بھی تو پتا چلنا چاہیے کہ ان کا کیا گیا ہر فیصلہ سب کو قبول نہیں ہو سکتا۔

"بے وقوف! اپنے باپ کو سبق سکھانا چاہتے ہو۔"

ماموں کی کہی بات یاد آئی تو ساتھ ہی غزنی کی آواز کانوں میں گونجی۔

"تو تم ابا کو ان کی غلطیوں کی سزا دینا چاہتے ہو۔"

"نہیں، بھلا میں کیوں ایسا کروں گا۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں تو بس۔ ہاں میں تو بس۔ اور وہ جھنجلا کر کھڑا ہو گیا۔

"آخر کیا کیا ہے میں نے، اپنا حق ہی تو استعمال کیا ہے بس نہیں کرنی مجھے اس بہترین لڑکی آمنہ سے شادی تو بس نہیں۔"

"ہاں ابا کو میرے انکار نے دکھ پہنچایا ہے۔ شاید وہ مجھ سے ناراض بھی ہو گئے ہوں گے لیکن کتنے دن ناراض رہیں گے وہ مجھ سے، خود ہی راضی ہو

جائیں گے۔ بقول سب کے لاڈلا ہوں۔ ان کا۔ وہ نہ راضی ہوئے تو منالوں گا۔" اس نے خود کو تسلی دی۔

☆☆☆

وہ سعد کی طرف چلا آیا تھا کہ وہ ایسا دوست تھا جس سے وہ دل کی بات کر سکتا تھا اور اس سے سب کچھ کہہ کر دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کی، سعد نے بہت توجہ سے اس کی بات سنی تھی۔

"اب تم ہی بتاؤ، کیا میں نے ابا کی بات نہ مان کر غلط کیا ہے۔ جب ابا نے غزنی بھائی پر اپنا فیصلہ مسلط کیا تو میں نے تب ہی سوچ لیا تھا کہ اگر ابا نے میرے لیے اس طرح کا کچھ فیصلہ کیا تو میں ہرگز نہیں مانوں گا۔"

"تمہارے ابا کو غزنی بھائی اور نیلی آپا سے شاید تم سے زیادہ محبت ہو گی رمیز۔ کون ماں باپ اپنی اولاد کا برا چاہتے ہیں۔ انہوں نے بھی اپنی طرف سے اچھا ہی کیا ہو گا۔ اور انہیں بھی ان کی ناخوش گوار زندگی کو دیکھ کر اتنا ہی دکھ ہوتا ہو گا جتنا تمہیں ہوتا ہے۔ اور اب بھی انہوں نے تمہارے لیے جس لڑکی کو چنا۔ وہ یقیناً بہت اچھی ہو گی۔ ورنہ تمہارے خاندان میں بھی لڑکیاں تھیں۔"

سعد نے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"تم نہیں سمجھ سکتے سعد! ابا نے پہلے اپنی بہنوں کی خاطر اولاد کی خوشی قربان کی اور اب اپنے دوست کی خاطر۔ میرا رشتہ طے کر آئے۔ سعید انکل ابا کے بچپن کے دوست ہیں۔ کئی سال پہلے اپنی جاب کے سلسلے میں وہ لاہور چلے گئے تھے اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد واپس راولپنڈی آ گئے ہیں۔ پچھلے دنوں ان کو دل کی تکلیف ہوئی تو ابا نے وہاں ہاسپٹل میں ہی بیٹھے بیٹھے میرا رشتہ ان کی بیٹی سے کر دیا کہ بس آج سے آمنہ میری بیٹی ہے۔ تم اس کی فکر سے آزاد ہو جاؤ۔ اور ابا ایسے ہی ہیں یوں ہی اچانک فیصلہ کرتے ہیں اور پھر اس پر ڈٹ جاتے ہیں لیکن اس بار۔"

"ٹھہرو ٹھہرو۔" سعد نے اسے ٹوکا۔ "کیا نام بتایا ہے تم نے اپنے ابا کے دوست کا اور ان کی بیٹی کا۔"

"سعید احمد اور بیٹی کا نام آمنہ ہے۔"

"تو تم صرف اپنے ابا کی ضد میں انکار کر رہے ہو جبکہ بقول تمہارے وہ اعلا تعلیم یافتہ ہے۔" سعد نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"چھوڑ دیار! چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔"

رمیز یکدم ہی بیزار سا ہو گیا تھا۔ سعد سے سب کچھ کہہ دینے کے باوجود دل کا بوجھ کم نہیں ہوا تھا۔

لانگ ڈرائیو کے بعد طبیعت کچھ بحال ہوئی تو سعد کے اصرار پر باہر سے ہی کھانا کھا کر جب وہ گھر آیا تو نزہت بیگم اور غزنی لاؤنج میں بیٹھے تھے۔

"کھانا لگواؤں۔" نزہت بیگم نے پوچھا۔

آپ نے کھالیا۔

"نہیں ہم سب ابھی ہاسپٹل سے آئے ہیں۔" نزہت بیگم ہانپیں۔

"کیا ہوا، کون بیمار تھا، ابا کہاں ہیں۔" وہ پریشان ہو گیا۔

"ابا کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔ بی پی کبھی ہائی ہو جاتا، کبھی یکدم لو۔ گھبراہٹ ہو رہی تھی تو احتیاطاً ہاسپٹل لے گئے۔"

غزنی نے بتایا۔

"اور اب...... اب کیسے ہیں وہ۔" وہ بے چینی سے ان کے کمرے کی طرف بڑھا۔

"اب ٹھیک ہیں اور سو رہے ہیں۔"

نزہت بیگم نے بتایا تو وہ جاتے جاتے رک گیا۔

"میں نے سعد کے ساتھ کھانا کھالیا تھا۔"

"مجھے بھی بھوک نہیں ہے اماں۔" غزنی بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"تھوڑا سا کچھ کھا لیتے بیٹا، دن کو بھی پتا نہیں تم نے ٹھیک سے کھایا ہو گا یا نہیں۔"

"غزنی صبح فرحی کو گاؤں چھوڑنے گئے تھے کہ اس کے کسی بھتیجے کی سالگرہ وغیرہ تھی۔"

"نہیں اماں! جی نہیں چاہ رہا آپ شفیق کے ہاتھ دودھ بھجوا دیجئے گا۔"

شفیق ملازم لڑکا تھا تیرہ چودہ سال کا جسے انیلا کی شادی اور شمو کے جانے کے بعد انہوں نے مستقل رکھ لیا تھا جبکہ اس کی ماں دن کو صفائی اور برتن وغیرہ دھو کر چلی جاتی تھی۔ ہفتے بعد کپڑے بھی وہی دھوتی تھی۔ شفیق کو انہوں نے ویسے تو اس کی ماں کے اصرار پر رکھا تھا لیکن اس کی وجہ سے انہیں بہت سہولت ہو گئی تھی۔ گیٹ کھولنے بند کرنے کے علاوہ باہر سے کچھ چھوٹا موٹا سودا لاتا اور کچن کے کام میں بھی ان کا ہاتھ بٹا دیتا تھا۔ فرسٹ فلور پر موجود کمرہ اسے دے دیا گیا تھا۔ جو اسی غرض سے بنایا گیا تھا۔

غزنی شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے اور نزہت بیگم کچن میں تو وہ کچھ دیر یوں ہی لاؤنج میں کھڑا رہا۔ ابا کو پہلے تو کبھی بی پی کا کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ پھر کیا میرے انکار کی وجہ سے انہیں صدمہ پہنچا ہے اور بی پی کا ایشو ہوا...... وہ پشیمان سا ہوا۔ اگر خدانخواستہ بی پی زیادہ شوٹ کر جاتا تو انہیں نہ سننے کی عادت کب تھی۔ آج تک کب کسی نے ان کے حکم سے انکار کیا تھا۔ تو کیا صبح جا کر ان سے معافی مانگ لوں اور کہوں کہ مجھے ان کا فیصلہ منظور ہے۔ وہ یونہی سوچتا ہوا اپنے کمرے میں آیا اور پھر رات دیر تک اسے نیند نہیں آئی۔ کبھی فرحی تصور میں چلی آتی۔ لڑتی جھگڑتی۔ چلا چلا کر غزنی اور اماں کو برا بھلا کہتی۔ کبھی روتی اپنے شوہر کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوئی نکلی۔ کبھی اسے ابا سے شکوہ ہونے لگتا کبھی وہ پریشان ہو جاتا کہ خدانخواستہ ابا کو کچھ ہو جاتا تو ساری زندگی وہ خود کو معاف نہ کر پاتا۔

☆☆☆

رات چونکہ بہت دیر سے نیند آئی تھی اس لیے صبح بھی کچھ دیر سے آنکھ کھلی۔ آفس سے لیٹ ہو رہا تھا اس لیے جلدی جلدی تیار ہو کر باہر آیا۔ غزنی اکیلے ناشتہ کر رہے تھے۔

"ابا کیا چلے گئے دفتر اور کیسی طبیعت ہے ان کی؟"

"اللہ کا شکر ہے، ٹھیک ہیں لیکن میں نے آفس جانے سے منع کر دیا کہ ایک دن ریسٹ کر لیں۔"

غزنی اسے روزمرہ سے زیادہ سنجیدہ لگے تھے۔

"اماں جی! ابا کی طبیعت کیسی ہے اب۔"

"ٹھیک ہیں اب۔" وہ اٹھیں۔ "آملیٹ بنواؤں یا فرائی لو گے۔"

"نہیں اماں جی! پہلے ہی لیٹ ہو گیا ہوں ناشتہ نہیں کروں گا۔"

وہ ملک نواز کے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ دیوار کی طرف کروٹ کیے لیٹے ہوئے تھے۔

"السلام علیکم ابا جی کیسی طبیعت ہے اب آپ کی۔"

لیکن جب انہوں نے جواب نہیں دیا تو وہ دبے قدموں کمرے سے باہر نکل آیا کہ شاید وہ سو رہے تھے۔ پھر وہ اماں اور غزنی کو خدا حافظ کہتا ہوا وہ تیزی سے نکل گیا۔

آفس میں بھی اس کا دل نہیں لگا تھا اور گھنٹہ بھر پہلے ہی اٹھ آیا۔ وہ خود اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھا۔ شاید رات ٹھیک سے نیند نہ آنے کی وجہ سے ایسی بے کلی سی ہو رہی ہے۔ اس نے سوچا تھا کہ گھر جا کر سو جائے گا اور ایک بھرپور نیند لے کر فریش ہو جائے گا۔ ملک نواز لاؤنج میں ہی بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ سلام کر کے اس نے ان کی طبیعت کا حال پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔"

مختصراً کہہ کر وہ پھر اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ لمحہ بھر یوں ہی کھڑا رہا کہ شاید وہ

اس سے جلدی آ جانے کی وجہ پوچھیں لیکن انہوں نے کتاب سے نظریں نہ اٹھائیں تو وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ظاہر ہے وہ اس سے ناراض تھے۔ لیکن کتنے دن ناراض رہیں گے۔ ہو جائیں گے خود ہی راضی۔ مدھم سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا۔ پہلے اس نے سوچا کہ سعد کی طرف چلا جائے لیکن پھر ارادہ بدل دیا اور لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گیا۔

شفیق کھانے کے لیے بلانے آیا تو اس نے لیپ ٹاپ بند کیا۔ ملک نواز ڈائننگ روم میں نہیں آئے تھے، انہوں نے کھانا کمرے میں ہی کھایا تھا۔ وہ اماں اور غزنی تھے۔ گھر میں اتنی خاموشی تھی کہ اس کا دل گھبرانے لگا۔ بچے بھی نہیں تھے ورنہ ان کی وجہ سے رونق سی ہوتی تھی۔ کھانا بھی خاموشی سے کھایا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید غزنی یا اماں اس سے اس کے متعلق بات کریں اور اسے سمجھانے کی کوشش کریں لیکن کسی نے اس موضوع پر بات نہیں کی تھی۔

☆☆☆

اگلے دو دن بھی ایسا ہی رہا۔ ناشتہ اور رات کا کھانا ملک نواز نے اپنے کمرے میں ہی کھایا۔ اس روز اتوار تھا۔ اتوار کو ہمیشہ معمول سے ہٹ کر ناشتہ بنتا تھا اور کچھ دیر سے کیا جاتا تھا۔ کبھی باہر سے بھی منگوا لیا جاتا تھا۔ سو وہ جاگنے کے بعد بھی کچھ دیر اپنے فون کے ساتھ مصروف رہا۔ شفیق بلانے آیا تو پچھلے دو دن کی طرح ناشتے کی ٹیبل پر اماں اور غزنی ہی تھے۔ آج نان چنے اور نہاری باہر سے ہی منگوائی گئی تھی۔

”کیا ابا آج بھی کمرے میں ہی ناشتہ کریں گے۔ میں بلا لاتا ہوں۔“

”نہیں، وہ کر چکے ہیں۔ ہلکا ناشتا لیا تھا انہوں نے کارن فلیکس اور دودھ۔ تم کر لو ناشتا ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

وہ خاموشی سے ناشتہ کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ ایسا کب تک چلے گا۔ آج وہ ابا سے بات کرے گا اور انہیں راضی کرے گا۔ غزنی کو آج فرحی اور بچوں کو لینے جانا تھا اور اسے فرحی کے آنے سے پہلے ہی ابا کا موڈ ٹھیک کرنا تھا۔ اب ایسا بھی کیا ہوا تھا کہ ابا یوں منہ پھلائے بیٹھے ہیں اور فرحی تو یوں بھی راحت کی وجہ سے اس سے چڑی ہوئی تھی اور اسے ذرا بھی بھنک پڑی تو اس نے تو طعنے دے دے کر بے چارے غزنی بھائی کا ناطقہ بند کر دینا تھا اور پھر ادھر ادھر فون کر کر کے اطلاع دینی تھی کہ رمیز ملک کس قدر ناخلف اور نافرمان اولاد ہے تو یہ طے تھا کہ اسے آج ہر صورت ابا کی ناراضی دور کرنا تھی۔

ناشتہ کر کے وہ کمرے میں آیا تو اس کا فون بج رہا تھا۔ اس نے اٹھا کر دیکھا کوئی اجنبی نمبر تھا اس نے اٹینڈ کر لیا۔

”ہیلو۔ کیا آپ رمیز ملک ہیں۔“ آواز کسی لڑکی کی تھی۔

”جی لیکن آپ کون؟“ وہ حیران ہوا۔

”تعارف تو ہوتا رہے گا۔ اور وہ کچھ ایسا ضروری بھی نہیں۔ مجھے آپ سے ایک بات پوچھنی ہے۔“

لڑکی ہولے سے ہنسی۔

”لیکن میں تو آپ کو جانتا نہیں ہوں۔ ایک اجنبی سے کیا پوچھنا چاہتی ہیں آپ۔“

وہ الجھا۔

”لیکن میرے لیے تو آپ اجنبی نہیں ہیں۔ میں آپ کو جانتی ہوں۔“

اس بار رمیز کو لڑکی کا لہجہ اور آواز کچھ مانوس سی لگی۔ لیکن اس کے کبھی کسی لڑکی سے ایسے تعلقات نہیں رہے تھے کہ اس کا فون نمبر اس کے پاس ہوتا۔

”تو کیا میں بھی آپ کو جانتا ہوں۔ اور میرا فون نمبر کہاں سے ملا آپ کو۔“

”ممکن ہے، جانتے ہوں۔“ لڑکی کا لہجہ مبہم

ساتھا۔

"اچھا اب زیادہ سسپنس نہ پھیلائیں۔ صاف صاف بات کریں۔" وہ جھنجلایا۔

"تو صاف صاف یہ کہ آپ جو آمنہ کے ساتھ رشتہ کرنے سے انکار کر رہے ہیں تو کیا کسی اور میں انٹرسٹڈ ہیں۔"

"کیا۔"

لڑکی نے بھی صاف بات کی تو رمیز کا منہ پل بھر کے لیے حیرت سے مکمل کر بند ہو گیا۔ کیا ابا نے سعید احمد کو میرے انکار کا بتا دیا ہے۔ لیکن نہیں اماں غزنی بھائی کو بتا رہی تھیں کہ انہوں نے ہفتہ بھر کی چھٹی لے لی ہے۔ اور وہ گھر سے کہیں گئے بھی نہیں ۔ یہ اسے شفیق نے بتایا تھا تو ہو سکتا ہے۔ فون پر بات کر لی ہو۔ حالانکہ ایسی بات اور وہ بھی دوست سے، فون پر تو کرنے کی نہیں تھی۔

"کیا آپ آمنہ ہیں۔" اسے شک ہوا۔

"نہیں آمنہ کی دوست۔"

تو دوست صاحبہ میں کسی میں انٹرسٹڈ ہوں یا نہیں، اس سے آپ کی صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔"

اب وہ بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔

"میری صحت پر تو واقعی کوئی اثر نہیں پڑتا مگر میری دوست بہت اپ سیٹ ہے۔ وہ اپنے خوب صورت جذبے کسی ایسے شخص کے نام نہیں کرنا چاہتی جو پہلے ہی کسی میں انوالو ہو۔"

"اور یہ خدشہ محترمہ کے ذہن میں کیسے جاگا۔" اس نے پوچھا۔

"آپ نے جو اپنے گھر والوں کو مجبور کیا ہے کہ انکار کر دیں تو اس کا کوئی جواز تو ہو گا آخر۔"

لڑکی کی بات سن کر وہ پھر حیران ہوا۔

"مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میرے گھر کی بات آپ تک کیسے پہنچی۔"

"تو کیا یہ غلط ہے کہ آپ نے آمنہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔" اس نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیا۔

"نہیں، کچھ ایسا غلط بھی نہیں لیکن جو آپ سوچ رہی ہیں ویسا بھی نہیں۔"

اس کی جھنجلاہٹ ختم ہو گئی تھی اور اب وہ بات کر کے محظوظ ہو رہا تھا۔

"یعنی آپ کسی میں انٹرسٹڈ نہیں ہیں۔" وہ خوش ہوئی تھی۔

"ہاں۔"

"تو پھر آپ نے میری دوست کو کیوں ریجیکٹ کیا۔ کیا کمی تھی اس میں، کوئی تو وجہ ہو گی نا۔" دوسری طرف افسوس سے پوچھا گیا۔

"آپ کی دوست میں یقیناً کوئی کمی نہیں ہو گی میں لیکن میں فی الحال اس جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ آپ کی دوست ہوتی یا کوئی اور لڑکی۔"

رمیز نے سنجیدگی سے کہا۔

"آپ تو اس جھنجٹ میں نہیں پڑنا چاہتے تھے لیکن میری دوست کا دل تو ٹوٹ گیا نا۔ اس نے آپ کے حوالے سے کئی خوب صورت خواب اپنی آنکھوں میں سجا لیے تھے۔"

لڑکی نے مدھم آواز میں کہا۔

"میرے حوالے سے۔" رمیز حیران ہوا۔

"لیکن میں نہ تو کبھی آپ کی دوست سے ملا اور نہ کبھی بات ہوئی پھر بھلا۔"

"جانتی ہوں۔" اس نے رمیز کی بات کاٹی۔

"لیکن آپ کے والد اور ان کے والدین کے درمیان بات تو طے پا چکی تھی اور وہ بے وقوف خواب دیکھنے لگی، یہ سوچے بنا کہ بہت سے خواب بے تعبیر رہ جاتے ہیں۔"

رمیز لاجواب ہو گیا۔ یہ ابا نے بہت زیادتی کر دی اس لڑکی کے ساتھ بھی لیکن میرا بھلا اس میں کیا قصور ہے۔ سوائے اس کے کہ میں اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے بسر کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے سوچا۔

"کیا سوچنے لگے آپ۔" اس نے پوچھا تو

وہ چونکا۔

"کچھ نہیں، آپ کی دوست کا میری وجہ سے اگر دل دکھا تو میری طرف سے معذرت کر دیجیے گا کہ شادی سے انکار خالص میرا ذاتی مسئلہ ہے آپ کی دوست میں کوئی کمی نہیں ہے۔"

"لیکن آپ محض اپنے ابا سے ضد کی وجہ سے اپنا نقصان کر رہے ہیں۔"

"ابا سے ضد......"

وہ جواب بور ہو کر فون بند کرنے لگا تھا، چونکا

"یہ لڑکی کیسے جانتی ہے یہ سب۔"

"آمنہ جیسی لڑکی تو کسی نصیب والے کا ہی مقدر بنتی ہے رومی بھائی اور آپ۔" اس کی خاموشی پر دوسری طرف سے بے اختیار کہا گیا تھا۔

رومی بھائی پر جہاں وہ چونکا تھا۔ بات کرنے والی نے بھی شاید زبان دانتوں تلے دبائی تھی اور اسے مخاطب کو پہچاننے میں چند لمحے لگے تھے صرف رومی کا مختصر نام اسے کس نے دیا تھا اور کہاں اکثر اسے رمیز کے بجائے رومی کہہ کر بلایا جاتا تھا۔ تب ہی تو اسے آواز مانوس سی لگی تھی۔

"یہ...... یہ تم ہو رافو کی بچی۔" اس نے دانت پیسے۔

"سوری رومی بھائی۔" وہ منمنائی۔

"تم ڈائریکٹ بھی تو بات کر سکتی تھیں۔ میں بھی حیران تھا کہ میرے گھر کی باتیں ایک انجان لڑکی کو کیسے معلوم ہوئیں۔ یہ سعد سے تو میں بعد میں بات کروں گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ پیٹ کا اتنا ہلکا ہے۔"

لہجے میں ناراضی در آئی تھی۔

"نہیں پلیز، آپ سعد بھائی سے کچھ مت کہیے گا ورنہ وہ خفا ہو جائیں گے مجھ سے اور انہوں نے خود سے کچھ بھی نہیں بتایا تھا مجھے۔"

"اب وہ وضاحت کر رہی تھی۔

"وہ تو میں نے ان سے پوچھا تھا آمنہ کے متعلق کہ انہیں کیسی لگتی ہے۔ وہ میری اتنی اچھی دوست ہے اور اتنی خوبیوں کی مالک کہ میں نے سوچا کہ اگر سعد بھائی کو اعتراض نہ ہو تو اماں سے بات کروں اس کے لیے لیکن سعد بھائی نے مجھے بتایا کہ بڑوں کی حد تک اس کا رشتہ طے پا چکا ہے لیکن فی الحال آپ اپنے ابا سے ضد کی وجہ سے مان نہیں رہے ہیں۔ لیکن مان جائیں گے بھلا ایسی لڑکی کے لیے کون انکار کر سکتا ہے۔"

"بڑا آیا نجومی کہیں کا۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔

"پھر میں نے آمنہ سے بات کی تو اس نے بتایا کہ ہاں ابو اور نواز انکل کے درمیان بات طے ہو چکی ہے۔ وہ بے حد خوش تھی لیکن کچھ اپ سیٹ بھی تھی کہ انکل نے جلدی آنے کا کہا تھا لیکن شاید ان کے گھر والے رضامند نہیں ہیں۔ تو میں نے سوچا کہ آپ سے بات کروں لیکن ڈرتی تھی کہ کہیں آپ میری بات ہی نہ سنیں تو اس لیے۔"

وہ روہانسی ہوئی۔

"احمق ہو تم۔" اس نے شفقت سے گھرکا۔

"جی رومی بھائی مانو اتنی پیاری، اتنی اچھی ہے کہ میری شدید خواہش تھی کہ اسے اپنی فیملی کا حصہ بناؤں۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ سعد بھائی نہ مانے تو آپ سے بات کروں گی کہ مجھے شک تھا کہ سعد بھائی کہیں انٹرسٹڈ ہیں۔"

"مانو۔" اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

"تمہارا مطلب ہے مانو وہ تمہاری دوست وہ ہے آمنہ۔"

"ہاں ہاں۔" وہ پرجوش ہوئی۔

"آپ نے بھی دیکھا تو تھا میری شادی میں اسے، کتنی پیاری ہے وہ۔ میرے سسرالی رشتہ داروں میں سے دو تین نے مجھ سے اس کے متعلق پوچھا بھی تھا۔ وہ صرف پیاری ہی نہیں بہت"

وہ پتا نہیں کیا کیا کہہ رہی تھی لیکن وہ نہیں سن رہا تھا۔ اسے لگا تھا جیسے اس کی سماعتیں مفلوج ہو

چکی ہیں۔ باہر کی کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ وہاں اندر شور مچا تھا۔ پھر یکدم اس کا دل خالی ہو گیا۔

یہ...... یعنی یہ بانو...... وہ آمنہ، ایک احساس زیاں نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔

کب اس نے فون بند کر کے بیڈ پر رکھا۔ اسے احساس نہیں ہوا وہ تو یوں لٹا پٹا بیٹھا تھا جیسے اس کا کوئی بڑا نقصان ہو گیا ہو۔ جیسے وہ کوئی قیمتی متاع ہار بیٹھا ہو۔ ابھی ابھی یہ کیا ادراک ہوا تھا۔ اور پہلے اسے خبر کیوں نہ ہو سکی۔

وہ تو پہلے روز سے ہی اس کے دل میں اتر آئی تھی۔ چپ کر بیٹھ گئی تھی اور وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ وہ پورے کا پورا دوسرے محاذ پر مصروف تھا اور اس کی محبت کی دھوپ پورے دل کے آنگن میں پھیلی تھی۔ تو کیا یہ محبت تھی۔ ہاں محبت وہ حیران ہوا۔ پہلی نظر کی محبت اور وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ ان سیاہ دلکش آنکھوں کی حیا ہے۔ وہ نرم دھیما لہجہ ہے۔ جس سے وہ متاثر ہوا ہے۔ بس محبت تو ابھی اس کے تصور میں کہیں بھی نہیں تھی۔ لیکن محبت ہاں محبت نے اس کے دل پر شب خون مارا تھا اور وہ آمنہ سعید احمد رافو کی بانو اس پر ایک نظر میں ہی حاکم ہو گئی تھی اور وہ بے خبر رہا۔ اسے تو بس ابا کو ہرانا تھا، انہیں شکست دینی تھی اور خود ہار گیا۔

"احمق...... بے وقوف۔"

اس نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں بالوں کو جکڑ کر کھینچا۔ پھر بے بسی سے بند مٹھیاں بیڈ کی پٹی پر ماریں۔ وہ پانے سے پہلے ہی کھو بیٹھا تھا۔ اس محبت کو جس نے اس کے دل کو روشن کیا اور وہ کور چشم اس روشنی کو دیکھ ہی نہ سکا۔ حالانکہ دل نے ہر بار اسے دیکھ کر ایک دھڑکن مس کی تھی لیکن وہ اسے اس آمنہ سعید احمد کو بتا ہی نہ سکا کہ......

تم رشتہ جاں سے بھی بڑھ کر ہو
دعا کی سرحدوں پر
جو ادھوری ہے میری ایسی تمنا ہو
میرے دل کا مقدر ہو

اور اب کیا کر بیٹھا تھا وہ اپنے ہی ہاتھوں اپنی منزل کھوٹی کر بیٹھا تھا۔ اور اگر ابا سے کہے بھی کہ اسے ان کا فیصلہ منظور ہے تو ابا...... وہ بھلا کب مانیں گے وہ تو بات پر جان دینے والے ہیں۔

اگر سعید انکل کو انہوں نے میرے انکار کا بتا دیا ہے تو پھر بھلے قیامت آ جائے وہ دوبارا بھی بات نہیں کریں گے۔ کتنی تکلیف کتنی اذیت ہوئی ہو گی انہوں نے۔ کس قدر شرمندہ ہوئے ہوں گے وہ سعید انکل سے۔

وہ بے حد دل گرفتہ اور دل شکستہ سا بیٹھا تھا یوں جیسے عمر کی ساری پونجی ہار گیا ہو۔ اور وہ ابا کو ہرانے چلا تھا لیکن ہار تو اس کے مقدر میں لکھی تھی۔ آنسو جیسے اس کے اندر گرے تھے اور تب ہی نزہت بیگم نے ادھ کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔

"رمزی بیٹا! غزنی سے کہا تھا میں نے۔ نیلی کو بھی ساتھ لیتا آئے بہت دن ہو گئے ہیں دو چار دن رہ لے گی آ کر تمہارے ابا نے تمہاری پھپھو سے بات کر لی تھی۔ تو گوشت وغیرہ جا کر لے آؤ۔ شفیق کا تو تمہیں پتا ہے، دیکھتا بھالتا کچھ نہیں ہے جو کوئی پکڑا دے، گلا سڑا لے آتا ہے۔"

"جی۔" اس نے نظریں اٹھائیں۔ خالی، ویران، آنکھیں جن میں دھول سی اڑ رہی تھی۔

"کیا ہوا رمزی؟" انہوں نے گھبرا کر اندر قدم رکھا۔ ماں تھیں جو اولاد کی ایک نظر سے دل تک دیکھ آتی ہیں۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

"جی۔" وہ اٹھا۔ "کیا کیا منگوانا ہے۔"

"مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔ میں تمہارے ابا سے کہتی ہوں، وہ سعید بھائی کی طرف جانے سے پہلے سودا لا دیں۔"

"ابا...... ابا سعید انکل کی طرف جا رہے ہیں کیوں۔ کس لیے میرا مطلب ہے ان کی طبیعت وہ کیا۔ وہ ابھی تک انہوں نے...... وہ مطلب بات

نہیں کی۔"

اس کے منہ سے بے ربط سے جملے نکلے تھے۔ نزہت بیگم نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہاں ہمت اکٹھی کر رہے تھے بات کرنے کی۔ بیٹی کے باپ سے اس کے رشتے سے انکار کرنا آسان نہیں ہوتا رمزی اور باپ بھی وہ جو بھائیوں سے بڑھ کر ہو۔ بے فکر رہو، آج کر آئیں گے بات۔" وہ ناراضی سے کہتے ہوئے واپس مڑ گئیں۔

"نہیں اماں جی پلیز، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" دل میں امید کی کرن سی پھوٹی تھی اور وہ تیزی سے نزہت بیگم کے پیچھے ہی کمرے سے باہر بھاگا۔

ابا کو منانا آسان تو نہیں تھا لیکن وہ منا لے گا جیسے بھی ممکن ہوا۔ پاؤں پکڑ لے گا ان کے۔ آخر پہلے بھی تو اس نے۔ بے شک وہ ایک بار جو بات کہہ دیتے تھے، اس سے پلٹے نہیں تھے لیکن وہ رمیز ملک تھا ان کا بیٹا۔

وہ بغیر دستک دیے ان کے کمرے میں داخل ہوا تھا وہ سامنے ہی بیڈ پر بیٹھے اپنا والٹ چیک کر رہے تھے۔

ناگواری سے اسے دیکھا۔ پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں لیکن وہ ان کی ناگواری کو نظر انداز کرتا ہوا زمین پر ان کے پاؤں کے پاس بیٹھ گیا اور ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھا۔

"آپ مجھ سے ناراض ہیں سوری ابا جی میں بہت شرمندہ ہوں۔ پلیز مجھے معاف کر دیں۔"

"نہیں ہوں ناراض، تمہیں حق ہے کہ تم اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ اپنی مرضی سے کرو۔ میں ہی غلط تھا۔"

انہوں نے اس کے ہاتھ اپنے گھٹنوں سے ہٹائے۔

"نہیں ابا! آپ کو حق تھا۔ حق ہے۔ میں بس...... میں یوں ہی ضد میں آ گیا تھا۔ غزنی بھائی اور نیلی کی حالت دیکھ کر۔ پلیز ابا! مجھے دل سے معاف کر دیں۔ مجھ سے ناراض مت ہوں۔ نہیں برداشت کر سکتا میں آپ کی ناراضی۔"

اب اس نے ان کے پاؤں پر ہاتھ رکھے تھے۔ آواز میں خود بخود ہی نمی گھل گئی تھی۔

"پاگل ہو۔" ملک نواز کا بھی دل پگھلا تھا۔

"والدین اولاد سے ناراض نہیں رہ سکتے ہاں انہیں ان پر غصہ ہو سکتا ہے۔ مجھے بھی غصہ تھا۔ دکھ تھا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ کیا مجھے غزنی اور نیلی کی زندگی کے اس المیہ کا دکھ نہیں ہے۔ کہ یہ بالکل غلط میچ تھا۔ لیکن غلطیاں انسان سے ہی ہوتی ہیں۔ مجھ سے بھی ہو گئی ہے۔ رو رو کر اللہ سے دعا کرتا ہوں ان کے لیے۔ اسی لیے تو میں نے تمہارے لیے...... خیر۔"

انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"اب ہاتھ اٹھاؤ میرے پاؤں سے احمق! مجھے جانا ہے، زیادہ تاخیر مناسب نہیں ہے۔ مجھے کسی نہ کسی طرح آج سعید سے بات کرنی ہے تا کہ وہ کوئی دوسرا فیصلہ کر سکے۔ اور بھی رشتے آ رہے ہیں اس کے۔"

"نہیں ابا جی! نہیں۔" اس نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

"آپ سعید انکل سے انکار نہیں کریں گے۔ مجھے آپ کا فیصلہ دل و جان سے قبول ہے۔ میں جانتا ہوں، آپ نے میرے لیے بہت اچھا سوچا ہو گا۔ بس میں ہی احمق تھا۔ خوامخواہ ضد میں آ گیا تھا۔"

انہوں نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب یہ ہی کہ آپ انکار مت کریں اگر آپ نے انکار کیا تو میں سمجھوں گا کہ آپ نے مجھے معاف نہیں کیا۔ مجھ سے ناراض ہیں اور میں جی نہیں پاؤں گا اس احساس کے ساتھ کہ آپ ناراض ہیں۔ اور میں کبھی خوش نہیں رہ سکوں گا۔

"آمنہ کو کھو کر" یہ بات اس نے دل میں کہی تھی۔

ایک مدھم سی مسکراہٹ نے ان کے لبوں کو چھوا۔

"بالکل ہی احمق ہو تم۔ اگر میں نے انکار کر

دیا ہوتا تو۔“

”تو رمیز ملک ایک لوزر ہوتا۔ ایک ہارا ہوا۔ اپنے ہی ہاتھوں ہارا ہوا شخص۔“ اس نے دل میں سوچا اور سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”اچھا اب ہاتھ تو ہٹاؤ میرے پاؤں سے اور وہ فون پکڑاؤ مجھے۔“

انہوں نے اسٹڈی ٹیبل کی طرف اشارا کیا۔

وہ کب انکار کرنا چاہتے تھے۔ وہ ان کا لاڈلا بیٹا تھا۔ اپنی طرف سے انہوں نے اس کے لیے بہترین انتخاب کیا تھا۔ اس نے فون اٹھا کر انہیں پکڑایا اور پر امید نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔ اب مزید کیا کہتا۔ کہنے کے لیے رہ ہی کیا گیا تھا۔ اب اس کی قسمت کا فیصلہ ابا کے ہاتھ میں تھا۔“

”ہاں ہیلو! سعید سناؤ کیسی طبیعت ہے اب۔“ وہ نمبر ملا کر بات کر رہے تھے۔

”آنے میں کچھ تاخیر ہوگئی کہ میری طبیعت کچھ خراب ہوگئی تھی تو میں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ آج شام ہم آرہے ہیں آمنہ بیٹی کو انگوٹھی پہنانے۔ بس یہی منگنی ہو جائے گی۔“ دوسری طرف کی بات سن کر وہ بے تکلفی سے بولے تھے۔

”ارے یار! اپنوں میں یہ رسمی باتیں نہیں ہوتیں۔ ہم سارے گھر والے ہی ہوں گے۔ غزنی گیا ہوا ہے نیلی کو لینے تو بس آج ہی تاریخ وغیرہ طے کرلیں گے۔ عزیز رشتہ دار شامل ہو جائیں گے شادی کے فنکشنوں میں۔“

اور اسے لگا جیسے مارے خوشی کے اس کا دل ہی بند ہو جائے گا۔ ابا کہہ رہے تھے۔

”اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ بڑے بھائی صاحب کو بھی ساتھ لے آؤں گا۔ چھوٹے دونوں توفی الحال یہاں نہیں ہیں۔“ بات کرتے کرتے انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔

”اب یہ بے وقوفوں کی طرح کھڑے میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ اپنی اماں کو بھیجو۔“ ذرا مشورہ کرلوں کہ کتنے لڈو وغیرہ لے کر جائیں اور میں ذرا بھائی صاحب اور نیلی کو فون کرلوں۔“

”جی جی۔“

وہ بوکھلا کر باہر لپکا۔ لیکن اس بوکھلاہٹ میں بھی اس نے نزہت بیگم کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ منگنی کا فنکشن ضرور ہو۔

”بھئی منگنی کا بھی اپنا ہی حسن ہے لڑکیوں کو تو شوق ہوتا ہے ناں اماں! بھلے مجھے نہ ہو۔“

اور انہیں حیران چھوڑ کر وہ اپنے کمرے کی طرف لپکا اور چند لمحوں بعد ہی وہ رافعہ سے آمنہ کا نمبر لے کر میسج کر رہا تھا۔

چلو تم کو بتاتے ہیں\
کہ ہم نے زندگی کے سب ورق لے کر\
سب ہی سطروں میں لکھ لی ہے تمنا تم کو پانے کی\
زمانے بھر میں شاید کاتب تقدیر کے ہاتھوں\
میرے دل نے لکھی ہے اب تمہاری چاہت کی خواہش\
چلو تم کو بتاتے ہیں کہ تم\
دعا کی سرحدوں پر جو\
ادھوری ہے میری ایسی تمنا ہو\
میرے دل کا مقدر ہو

”رمزی..... رمزی۔“ نزہت بیگم نے آواز دی تو وہ جلدی سے اپنا نام لکھ کر سینڈ کا بٹن دبا کر باہر نکلا۔

”اب دیکھو تمہارے ابا کو، یوں اچانک اس طرح اتنی جلدی بھلا کیسے..... اور تم خوش ہونا۔“ انہوں نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اور آپ پریشان نہ ہوں۔ ہو جائے گا سب۔“

اس نے ان کے گرد اپنے بازو حمائل کیے۔ خوشی اس کے پورے وجود سے پھوٹتی تھی۔ سنہری آنکھیں دمک رہی تھیں۔ اور وہ ان کے گرد بازو حمائل کیے ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا گنگنا رہا تھا۔“

چلو تم کو بتاتے ہیں کہ

☆☆

قانتہ رابعہ

گمان دلوں کے

صغریٰ بتول کو اللہ نے آگے پیچھے کی تین اولادیں دیں، یہ محض اوپر والے کا کرم ہی تھا کہ تینوں اولاد نرینہ تھیں۔

سرخ سپید رنگت، گھنگھریالے بالوں اور بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں والے تین شہزادے۔

ان تینوں کے نام محمد غفران، محمد ثوبان اور محمد فرحان تھے۔

شکل وصورت میں بڑا ننھیال پر پڑا تو چھوٹا ددھیال پر، ہاں منجھلا محمد ثوبان اپنی شکل آپ تھا نہ ماں پر نہ باپ پر!

یہ بھی اتفاق تھا کہ ان کی ایک بہن، ایک نند اور دو کزنز کی شادی، ان کی شادی کے دو ایک سال کے اندر اندر ہوئی لیکن کسی کو بھی اولاد نرینہ نصیب نہ ہوئی۔ کسی کی ایک بیٹی مریل مرکھنی سی تو کسی کی دو سوکھی سڑی چرخ جیسے ایتھوپیا کی قحط زدہ حبشی ڈق!

اللہ معاف کرے صغریٰ بتول کو تو بہتی ناک اور ریں ریں کرنے والے بچے ویسے ہی اچھے نہیں لگتے تھے، دو منٹ میں طبیعت اوبھ جاتی، جی متلانے لگتا، قدرت کی ستم ظریفی ساری کی ساری بیٹیوں کی ماؤں کے مقدر میں تھی۔ ساری بچیاں خواہ نند کی ہوں یا بہن کی یا چچازاد، ماموں زاد کی سب کی سب روندو! سانولی اور بہتی ناک والی ایک نظر ڈالیں تو دوسری ڈالنے سے توبہ کرلیں۔ یہ صغریٰ بتول پہ اللہ کا مزید کرم تھا کہ انہیں اس نے تین بیٹوں سے نوازا اور بیٹے بھی حسین وجمیل!

ہنس مکھ، قل قل کرکے قلقاریاں مارتے تو بڑے سے بڑا خشک مزاج بھی پیار کیے بغیر نہ رہ پائے۔ شیر خواری میں ہی خوش مزاجی سے مالا مال تھے کوئی غیر بھی اگر بیٹھتا تو ہمک ہمک کر مخاطب کرتے!

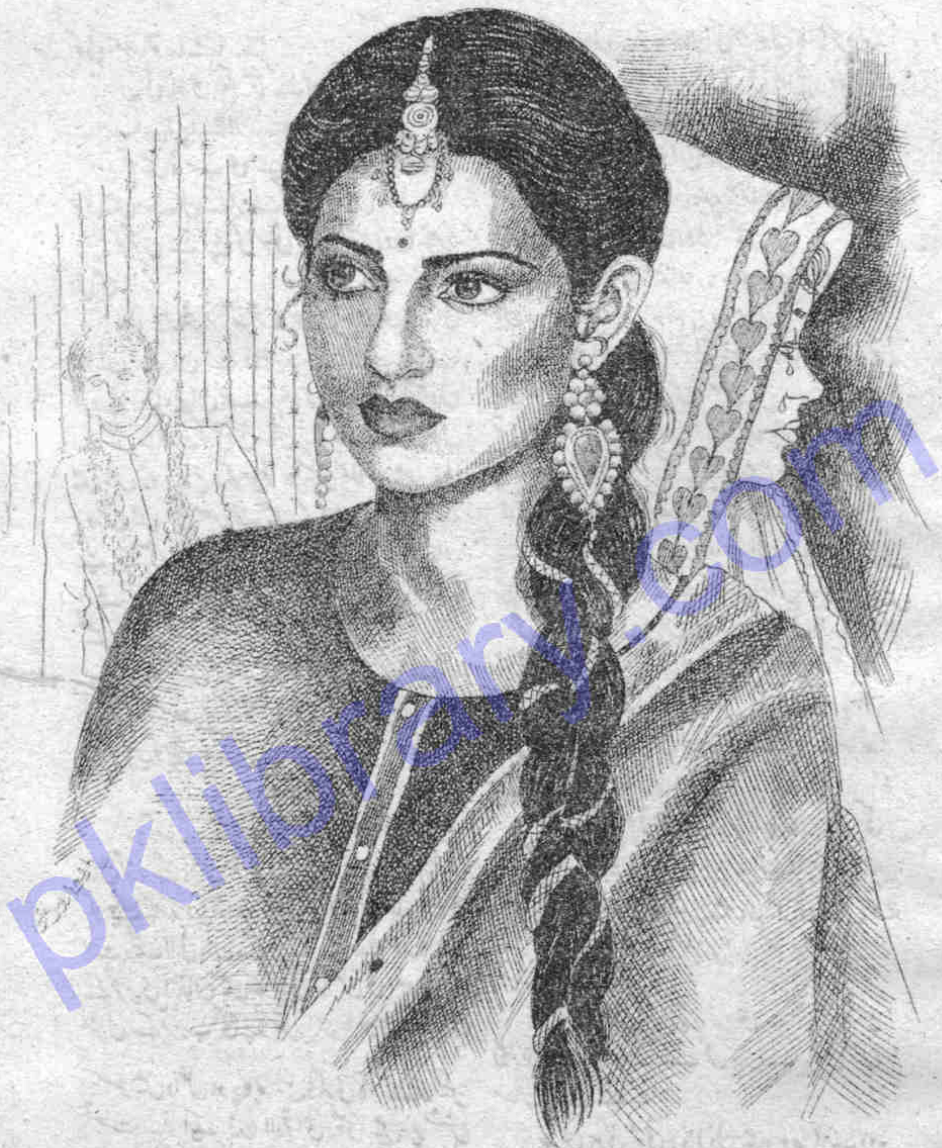
چوبیس میں سے بیس گھنٹے صغریٰ بتول کو یہی فکر لاحق رہتی کہ کہیں، اس کے جگر گوشوں کو نظر نہ لگ جائے۔

کبھی خود آیت الکرسی پڑھ پڑھ کر پھونک مارتیں۔ کبھی کسی کے بتانے پر سرخ مرچ جلاتیں۔ کبھی پیسے سے وار کر صدقہ اتارتیں پھر بھی ایک پل چین نہ آتا۔ ذرا سی طبیعت خراب ہوتی یا چھینکوں کی آواز سنائی دیتی بس بے دم ہو جاتیں۔

"ہائے فلاں کی نظر کھا گئی۔"

بچہ خود ہی پانی سے پھسل کر گرتا، بارش میں نہانے سے بیمار یا سست ہوتا تو نزلہ ان عزیز واقارب پر گرتا، جو ان کے خیال میں ان کے ہنستے کھیلتے بچوں سے جلتے تھے، کسی تقریب میں جاتیں فوراً وہاں موجود بچوں سے تقابلی جائزہ شروع ہو جاتا۔

حکمت عملی شروع سے یہی تھی کہ وہ بچوں کو شیر خوارگی کی عمر سے ہی گھر سے شکم پری کر کے لے کے جاتیں تاکہ لوگوں کے سامنے اتنے مہذب انداز میں فیڈر پینے سے نظر ہی نہ لگ جائے اور جب بچے بڑے ہوئے تو ان کو پیٹ بھر کے کھانا کھلا کر لے جاتیں کہ کھانوں کی طرف ندیدے پن سے نہ دیکھیں، ساری دنیا ان کے بچوں کی تعریفوں کے پل باندھے، ان کی یہ حکمت عملی اتنی کامیاب رہی کہ باقی خواتین شادی بیاہ کی تقریبات میں، کھانا دیر سے کھلنے



کی وجہ سے پریشان کم ہوتیں اور اپنے بچوں کے بھوک اور رونے پیٹنے کی وجہ سے زیادہ۔

تب ان کی نظریں فاتحانہ طور پر چاروں اور گھومتیں چہرے پر تمسخر ہوتا، دل اچھل اچھل کر کہہ رہا ہوتا کہ، دیکھو دیکھو یہ ہے فرق میری اور تمہاری اولادوں میں، ذرا دیکھو تو پچکے گال، بہتی رال، عدیدی نظریں اور یہاں دیکھو صاف ستھرے خاموش طبع بھری نیت کے بچے ہو نہہ ہے کوئی مقابلہ، اور اگر بے

کوئی ہم سا تو سامنے آئے!

ان کی باڈی لینگویج سے اور پھر تمسخرانہ گفتگو سے سب اپنے پرائے ان سے دور ہٹتے گئے۔

غم میں تو سب ہی اپنے اپنے دکھ یاد کرتیں اور خوشی میں سب ان کے قریب بھی نہ پھٹکتیں۔

لوگوں نے اپنی غمی خوشی کی خبر انہیں دینا چھوڑ دی تھی۔

ان کے طنز اور تفاخر کا جواب میکہ اور سسرالی خواتین نے ان سے اجنبیت برتتے ہوئے دینا شروع کر دیا، یہاں تک کہ انہیں سگی بھانجیوں، بھتیجیوں سے میل ملاقات کو کئی کئی سال گزر جاتے۔ انہیں دل میں اس رویے پر دکھ ہوتو ہو لیکن عملاً وہ بیٹوں کی پرورش میں اتنی مصروف تھیں کہ ایسے مسئلے ان کے لیے بے معنی تھے۔ وہ ارد گرد سے بے نیاز صرف اور صرف بچوں کے بہترین مستقبل کے لیے کوشاں تھیں۔

ایسا مستقبل کہ سب کی آنکھوں میں رشک اور دل میں حسرت ہو کہ کاش ہماری اولادیں بھی اس مقام مرتبہ کو پہنچی ہوتیں!

☆☆☆

ماہ وسال کے تانے بانے میں مزید دس گیارہ سال گزر گئے، جس مقصد کے لیے انہوں نے ہر شوق کو پیچھے چھوڑ دیا تھا وہ مقصد پورا ہو گیا تھا۔ ان کی محنت رنگ لائی، ان کے بڑے بیٹے نے سول سروس کے تحریری امتحان میں کامیابی حاصل کی، دوسرا بھی منزل کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کا سی اے آخری سمسٹر میں داخل ہو چکا تھا بس ڈگری کا انتظار تھا لیکن قسمت نے ایک بین الاقوامی کمپنی میں پرکشش معاوضہ پر نوکری پلیٹ میں رکھ کر دے دی تھی اب ان کی نئی مصروفیت شروع ہوئی۔

انہیں کائنات میں سب سے حسین، سب سے زیادہ تعلیم یافتہ سب سے منفرد بہو چاہیے تھی۔ سب سے پہلے انہوں نے خاندان کی لڑکیوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ عجیب بات ہے اپنی سگی بھانجی اور بھتیجی سے ان کی چار ساڑھے چار سال سے ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن ان کے ذہن میں وہی مریل مرمنی، سوکھی، چمرخ جھریوں والی بندریا نما بچیاں تھیں ناک بہتی ہوئی ریں ریں کرتی روتی شکلیں۔

ہونہہ! میرے شہزادوں کے لیے وہی رہ گئی ہیں۔

جیٹھانی اور نند کی اکلوتی بچیوں کا خیال آیا نند تو کئی سال سے آسٹریلیا میں مقیم تھی۔ ایک دو مرتبہ آئی تو بچی کو چھوڑ آئی تھی بقول اس کے وہاں کی پڑھائی پاکستانی اسکولوں جیسی نہیں ہے جب وہ رشتوں کی تلاش میں تھیں تو اچانک ان کے جیٹھ دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ میکہ اور سسرال سے سب ہی تعزیت اور پرسے کے لیے آئے، اتفاق تھا یا سوچی سمجھی اسکیم، سب کی بچیاں بھی تین دن فوتگی والے گھر میں موجود رہیں۔ دل میں تو انہوں نے سوچا ہونہ ہو یا ان کے بیٹوں کے رشتے کی تلاش کی سن گن پا چکی ہیں اور مائیں ان بچیوں کو زور زبردستی کر کے ساتھ لائی ہوں گی بچپن والی۔

وہ مریل مدقوق سی بھانجی یہ نہیں کہاں مر گئی اب تو ایک حسینہ نازنین، وہاں ان کی بہن کے گوڈے سے جڑی بیٹھی تھی۔

"یہ دوا لے لیں مما، یہ پین کلر لے لیں، مما طبیعت ٹھیک ہے۔"

ابھی اس کا بی پی چیک کر رہی ہے، کبھی انسولین لگا رہی ہے، کبھی سونے سے قبل اس کے پاؤں میں مساج کر رہی ہے۔

حد ہی ہو گئی شوخی سی! (دل میں سوچا) ایک دو مرتبہ وہ خالہ صغریٰ بتول کا بھی بی پی چیک کرنے کے لیے پر تول رہی تھی، صغریٰ بتول نے تو سوچا تھا چٹا انکار کر دیں لیکن سب کے کہنے پر انہوں نے بازو آگے کر دیا۔

بڑے طریقے سلیقے سے اس نے قمیص کا تنگ بازو اوپر کیا، ادھر ادھر کی گفتگو میں دھیان بٹا کر بلڈ پریشر بھی نوٹ کرلیا اور کھنکتے ہوئی ہنسی میں بولی۔

''خالہ! میں اس لیے اوٹ پٹانگ باتیں آپ سے کررہی تھی کہ بی پی چیک کرتے ہوئے، مریض کا دھیان غیر متعلقہ چیزوں کی طرف ہونا ضروری ہے ورنہ گڑبڑ ہوجاتی ہے۔''

صغریٰ بتول کے دل میں اس کی کھنکتی ہنسی جلترنگ کی طرح جگہ بنا گئی۔

انہوں نے غور سے دیکھا اس کی جلد بچوں جیسی صاف شفاف اور لہجہ بچوں کی طرح معصوم، انداز دل موہ لینے والا تھا۔ رنگت دمکتی، کالی سیاہ اُمڈتی گھٹاؤں جیسی زلفیں، آنکھیں جن میں ایک مرتبہ دیکھ لیں تو دل اُتھل پتھل ہونے لگے۔

ہزار دوریوں کے باوجود انہیں اس لڑکی زارا صفدر میں دلچسپی ہوچکی تھی۔

نند کی آسٹریلین بیٹی تو خیر مکسچر تھی، گوری چمڑی اور بنگالی حسن جیسے بہتا جھرنا نہیں آبشار!!

باتوں ہی باتوں میں نند نے بتادیا تھا کہ ہم تو وہیں رشتہ طے کرچکے ہیں، پاکستان سے جانے والے لڑکوں کے بہت جلد پر پرزے نکلنا شروع ہوجاتے ہیں، نہ دین کے رہتے ہیں نہ دنیا کے، ہم نے انڈین مسلم فیملی میں بات طے کردی ہے لڑکا وہاں کا رہنے والا اچھا پڑھا لکھا اور برسرروزگار ہے۔

(ہونہہ! پاکستان کی سول سروس کا تو مقابلہ نہیں ہوسکتا! انگور کھٹے ہیں۔)

☆☆☆

تین دن کے بعد سب واپس چلے گئے گھر کے افراد اور جیٹھانی کی والدہ بس ——————

وہاں سے واپس آنے کے کئی دن بعد تک صغریٰ بتول شش و پنج میں رہیں۔ آیا بھانجی کے لیے رشتہ کی بات کی جائے یا ابھی نہیں۔

محض اتفاق تھا کہ اسی وقت ان کی بہن جو صرف سال ایک چھوٹی تھی کا فون آگیا۔

بہت سالوں کے بعد ان کی بہت بے تکلف طنز و تشنیع اور تفاخر سے پاک گفتگو ہورہی تھی، پھر بھی دماغ میں کیڑا سا کلبلا رہا تھا، سو زبان پر سوال لے ہی آئیں۔

''نور فاطمہ، بڑی مدت کے بعد فون کیا ہے آج تم نے خیریت تو ہے؟''

''افوہ تین دن اکٹھے بھی تو اتنی مدت کے بعد رہے ہیں آپی۔ بس خون نے جوش مارا تو موبائل فون اٹھالیا۔'' وہ ہنس کر بولی۔

صغریٰ بتول کے دل میں کمینی سی سوچ آئی۔

''یہ کیوں نہیں کہتی کہ تمہارے بیٹے پر نظر ہے داماد بنانے کے لیے۔''

''چلیں دیکھتے ہیں اتنے بھی گرے پڑے نہیں جب تک رشتہ کی بات خود سے نہیں ڈالے گی۔ میں تو نہیں شروع کرنے والی۔'' انہوں نے شانے اچکائے۔

دو ایک دن کے بعد پھر اتفاق ہوا کہ بہن کے نمبر سے کسی فیملی فنکشن کی تصاویر، دھڑا دھڑ اپ لوڈ ہوئیں اور ابھی وہ دو چار تصویریں ہی دیکھ پائی تھیں کہ ڈیلیٹ فار ایوری ون نے ان تصاویر کا صفایا کردیا۔

''ہونہہ! گھائل اور قائل کرنے کے صدیوں پرانے حربے'' ایک اور فضول خیال ذہن میں آیا۔

مسئلہ یہ تھا کہ یہ سارے دکھڑے کس سے روتیں میاں سے بات کی تو وہ سدا کے بے نیاز، جس سے مرضی دل میں آئے وہ کرو، کہہ کر چینل سرچ کرنے لگے۔ وہ اسی شش و پنج میں تھیں کہ اس موضوع پر بچوں سے بات کی جائے یا نہیں؟ کہ انہیں ایک ہی وقت میں دو مختلف جگہوں سے کوریئر سروس سے دو پارسل موصول ہوئے۔

کچھ عجیب سی کیفیت میں انہوں نے پارسل وصول کیے کھول کر دیکھا تو ایک بہن کی طرف سے ملتانی سوہن حلوہ اور بہت ہی نفیس قسم۔ کاشیفون میں

کامدانی کا سوٹ تھا۔ دوسرا پیکٹ ان کی چچازاد بہن ماریہ کی طرف سے تھا دو کتب اور ایک دیدہ زیب رنگوں میں بیڈ شیٹ۔

بہت اچھی کوالٹی کا کپڑا اور پرنٹ تو خیر تھا ہی شاندار اچھی بیڈ شیٹ ان کی کمزوری بھی بہت دیر تک وہ ہاتھ پھیر کر اسے محسوس کرتی رہیں لیکن دماغ ان سوچوں میں مصروف کہ دونوں کی طرف سے اکٹھے پارسل بھیجے جانے کا مقصد کیا ہے؟

جیٹھ کی وفات پر ان کی بہن اور چچازاد بہن دونوں اپنی جوان جہاں بیٹیوں کے ساتھ ضرورت رشتہ کے اشتہار کے طور پر موجود تھیں۔ بھانجی تو خیر حسین تھی۔ ڈاکٹر بھی ناز و انداز بھی دل موہ لینے والے تھے لیکن چچازاد بہن کی بیٹی؟ وہ دل ہی دل میں طنزیہ انداز سے مسکرائیں۔

"تو جی کامیاب ہونہار لڑکوں کو دیکھ کر ایسے ہی بیٹیوں کی ماؤں کے دماغ منصوبے بناتے ہیں، آگے پیچھے بھی حال احوال پوچھنے کی زحمت نہیں کی اور اب قیمتی تحفے بھیجے جا رہے ہیں۔ بھئی سچی بات ہے، اتنے قابل ہونہار سپوت تو بس کسی کسی کے ہوتے ہیں۔"

گھنٹہ دو گھنٹے اسی شش و پنج میں گزارے کہ تحائف کا شکریہ ادا کریں یا نہ کریں، کبھی سوچتیں کہ شکریہ ادا کر دیا تو چپکو ہی نہ ہو جائیں۔ کل کلاں بریانی نہاری بنا کے بھجوانے کا سلسلہ شروع ہو جائے۔

پھر سوچا جب ثوبان کا کہیں رشتہ طے ہوا تو مبارک باد میں ہی وہ بھی کوئی سوٹ شوٹ بھیج دیں گی۔ چلو چھوڑو دفع مارو کوئی ضرورت نہیں تعلقات کو بڑھانے کی۔" خیال کے آتے ہی کچھ یکسوئی نصیب ہوئی تھی کہ موبائل فون کی تیز چیختی چنگھاڑتی آواز نے متوجہ کیا۔

انہوں نے خیالوں میں مگن بے دھیانی سے کال کا بٹن پریس کیا اور بولیں۔

"جی فرمایئے۔"

"صغریٰ آپی، آپ فارغ ہیں دو منٹ۔ مجھے آپ سے ضروری بات کرنا ہے۔" دوسری جانب سے ان کی کزن ماریہ کی چہکتی آواز سنائی دی۔

دل ہی دل میں صغریٰ بتول نے اپنے آپ کو ستر مرتبہ لعن طعن کی جو انہوں نے بے دھیانی میں فون کال لے لی۔

"ہونہہ اب بیٹی کی تعریف کے سلسلے شروع ہو جائیں گے۔" بددلی اور قدرے نخوت پر قابو پاتے ہوئے انہوں نے پھسپھسی آواز میں جواب دیا۔

"کیوں نہیں! بس آج کچھ مصروفیت تھی۔"

"نہیں آپی آج نہیں پرسوں، بہت اچھی خبر ہے، سن کر خوش ہو جائیں گی۔ بس ہمیں آپ کی تھوڑی سی مدد کی ضرورت ہے۔" کھنکھناتے لہجے میں ماریہ نے کہا اور بات جاری رکھی۔

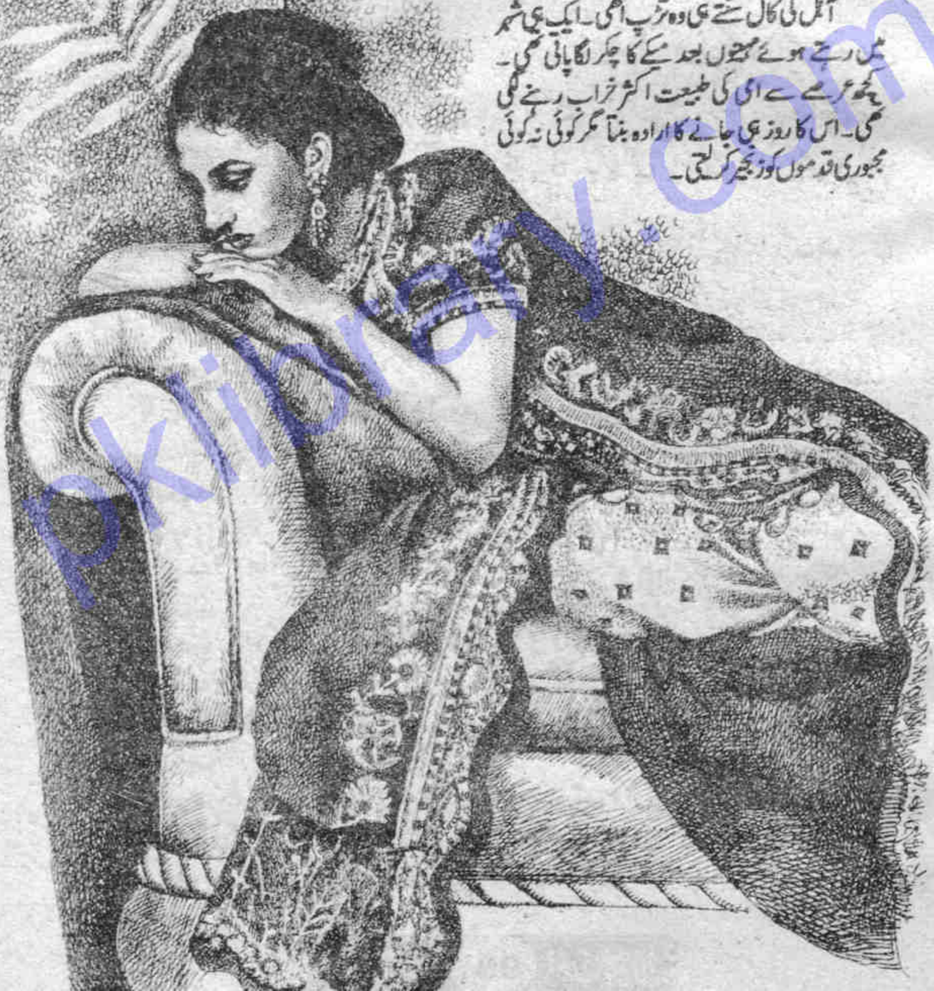
"آپی، میں اپنے بیٹے کا رشتہ نور فاطمہ کی بیٹی زارا سے کر رہی ہوں۔ آپ کو تو نور نے بتایا ہی ہوگا۔ پرسوں ہم دعائے خیر کر رہے ہیں۔ بس ہم دونوں میں سمدھن بننے سے پہلے ہی جھگڑا ہو گیا ہے نور کہتی ہے وہ آپ کی چھوٹی بہن ہے وہ اپنی طرف سے آپ کو مدعو کرے گی اور میں بندی حقیر پر تقصیر عاجزانہ درخواست کر رہی ہوں کہ سگی بہن نہ سہی کزن ہی سہی رشتہ تو میرا بھی آپ سے پکا پکا ہے۔ آپ میری طرف آئیں اور میرا مان بڑھائیں، میں خود آپ کو لینے آجاؤں گی اور میری طرف سے آپ لڑکے کی پھپھو بن کر جائیں۔ میری تو کوئی نند یا بہن بھی نہیں......"

ماریہ بولے جا رہی تھی۔ اور اڑا اڑ دھم ساتویں آسمان سے صغریٰ بتول نیچے گرتے گرتے زمین سے بھی نیچے پاتال میں گر رہی تھیں اپنی گھٹی سوچ اور ناقص ذہنیت پر ماتم کرتے ہوئے۔

☆☆

ملیا سمیعون

ظرفِ قدح



"ثمین آپی! امی کو کل سے بخار ہے۔ سارا گھر اوندھا پڑا ہے۔ ہم کھانا بھی بازار سے منگوا رہے ہیں۔ آپ پلیز کچھ دنوں کے لیے یہاں آجائیں۔"
آنچل کی کال سنتے ہی وہ تڑپ اٹھی۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے مہینوں بعد میکے کا چکر لگا پاتی تھی۔ کچھ عرصے سے امی کی طبیعت اکثر خراب رہنے لگی تھی۔ اس کا روز ہی جانے کا ارادہ بنتا مگر کوئی نہ کوئی مجبوری قدموں کو زنجیر کر لیتی۔

"آنٹی! میں کچھ دنوں کے لیے امی کے گھر چلی جاؤں۔"

"چلی جاؤ مگر زیادہ دن کے لیے نہیں......"

"وہ اصل میں امی کی طبیعت......"

وہ صوفے پر بیٹھی ٹی وی کے چینل بدل رہی تھیں، اس کا جملہ پورا ہونے سے قبل ہی انہوں نے ایک اچٹتی نگاہ اس پر ڈال کر اشارے سے ٹوک دیا۔

ثمین نے فوراً بیگ میں کپڑے رکھے اور بچوں کو ساتھ لے کر میکے آ گئی۔ امی میڈیسن لے کر سو رہی تھیں سنک میں گندے برتنوں کا انبار جمع تھا۔ باسکٹ میلے کپڑوں سے بھری پڑی تھی اور خزاں رسیدہ پتے سارے صحن میں ہوا کے دوش پہ محو رقص تھے۔

بچوں کو ان کے ماموں کے حوالے کر کے وہ مستعدی سے کام نمٹانے لگی۔ کپڑے واشنگ مشین میں ڈال کر خود برتن دھونے لگی۔

"آپی! اگر ہم حسن بھائی کی شادی کروا دیں تو ہمارے گھر کی فکروں سے آپ کی جان چھوٹ جائے گی۔"

آنچل پرسوچ انداز میں گویا ہوا۔

"آج حسن کی شادی کا خیال کیسے آ گیا؟" وہ مصروف سے انداز میں بولی۔

"بس یونہی......امی کی طبیعت جب بھی خراب ہوتی ہے آپ کو آنا پڑتا ہے۔ اگر بھائی کی شادی ہو جائے تو سارے کام بھابھی سنبھال لیں گی۔ آپ بےفکر رہیں گی۔"

"بڑے سیانے ہو گئے ہو......" وہ ہنس دی۔

حسن ایک سرکاری اسپتال میں میل نرس تھا۔ امی خود حسن کی شادی جلد کرنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے اس کے لیے ایک دو لڑکیاں بھی دیکھ رکھی تھیں مگر حسن اس معاملے کو بلاوجہ طول دے رہا تھا۔ اس بار تو ثمین دل میں ٹھان کر آئی تھی کہ حسن کو منا کر اور اس کی بات پکی کروا کر ہی جائے گی۔ آنچل اور عارفین تو ابھی بہت چھوٹے تھے۔ حسن کی تو شادی کی بھی عمر تھی۔

☆☆☆

شام کھانا کھانے کے بعد وہ ٹی وی دیکھنے بیٹھا تو سب ایک دم اس کے سر ہو گئے تھے۔ ثمین اور آنچل اسے منانے میں پیش پیش تھے۔ امی کی طبیعت پہلے سے کافی بہتر تھی۔ وہ صوفے پر لیٹی دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہی تھیں۔

"تمہاری شادی کی عمر نکلی جا رہی ہے۔ اب بھی نہیں کرو گے تو کیا بڑھاپے میں شادی کرو گے؟" ثمین زچ ہو کر بولی۔

"میری عمر نکل رہی ہے مگر وہ تو ابھی بہت چھوٹی ہے......"

اکتیس سالہ حسن نے کہہ کر زبان دانتوں تلے داب لی۔ یہ کیا نکل گیا منہ سے......وہ بھی ماں بہن کے سامنے۔

"کیا؟ کون ہے وہ؟ پہلے کیوں نہیں بتایا؟" چیخ سے مشابہ ملی جلی آوازیں ابھریں۔

"دریہ......!" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

دریہ، رخسانہ خالہ کی دیورانی کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بروکن فیملی کی بچی جو ننھیال میں ہی پلی بڑھی۔ سال میں ایک آدھ چکر رخسانہ خالہ کے گھر کا لگتا تھا جو دریہ کی تائی تھیں۔

اس دن امی نے حسن کے ہاتھ رخسانہ خالہ کے لیے مٹر قیمہ بھجوایا تھا۔ اتفاق سے دریہ اس دن رخسانہ خالہ کے گھر موجود تھی۔ سانولی سلونی سی دریہ کی بڑی بڑی خواب ناک آنکھیں اسے سحر طراز بنا دیتی تھیں۔ حسن پہلی ہی نظر میں اپنا دل دان کر آیا تھا۔

امی حسن کے لیے اپنی بھانجی یا بھتیجی لانا چاہتی تھیں مگر حسن نے، اپنی پسند بتا کر انہیں ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ بہرکیف وہ تھوڑی رد و کد کے بعد مان گئیں۔ پھر سارے معاملات خوش اسلوبی سے طے پا گئے۔ دو ماہ بعد حسن اور

دریہ کی شادی بھی ہوگئی۔
دلہن بنی دریہ پہ کیا خوب روپ چڑھا تھا۔ ثمین اور امی اس کی بلائیں لیتی نہ تھک رہی تھیں۔ حسن اور دریہ کی شادی پر سارے ارمان پورے کیے گئے۔
"دریہ میری امی کو ڈھیروں سکھ دکھائے گی ان شاء اللہ۔" ثمین کی سوئی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔
ولیمہ اٹینڈ کر کے ثمین اپنے گھر لوٹ گئی تھی۔ اب اسے ایک ہفتہ بعد کھیر پکوائی کی رسم پر آنا تھا۔ آج کل اس کی ہر سانس حسن اور دریہ کے لیے دعا گو تھی۔

☆☆☆

بے بی پنک کلر کے بے حد نفیس سوٹ اور ہلکے پھلکے میک اپ میں دریہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ حسن بھی سفید کاٹن کے سوٹ میں بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔
حسن کی امی یعنی منیزہ بیگم صبح سے کچن میں لگی ہوئی تھیں۔ ہر چیز تقریباً ریڈی تھی جب چھوٹا عارفین انہیں بلانے آیا۔
"امی! باہر ثمین آپی کے ساتھ کچھ مہمان خواتین آئی ہیں۔"
"دریہ! میں نے میٹھا بنا دیا ہے۔ مہمانوں کو اٹینڈ کر کے ابھی آتی ہوں۔ تم بس برابر چمچہ ہلاتی رہنا اور "میٹھی میٹھی آگ" جلائے رکھنا۔"
وہ دریہ کو محبت پاش نگاہوں سے دیکھتی، تاکید کرتی باہر نکل گئیں۔ وہ عادتاً دھیمی آنچ کو میٹھی آگ کہتی تھیں۔ دریہ تھوڑی دیر تا مجھی سے انہیں جاتا دیکھتی رہی، پھر جار سے مٹھی بھر چینی نکال کر چولہے میں جلتی آگ پر پھینک دی۔ لو جی آگ میٹھی ہوگئی۔
اس نے ہاتھ جھاڑے۔
ثمین چونکی۔ کوئی عجیب سی بو تھی جو نتھنوں میں گھسی چلی آرہی تھی۔ وہ مہمانوں سے معذرت کرتی اٹھی اور تیزی سے کچن میں چلی گئی۔
"دریہ! یہ کیا جل رہا ہے؟" سلام دعا کے بعد اس نے فوراً استفسار کیا، جواباً دریہ نے اپنا کارنامہ بیان کر دیا۔
"کیا......؟" ثمین حیرت زدہ ہوگئی۔
"وہ آنٹی نے کہا تھا کہ میٹھی آگ جلائے رکھنا......" اف یہ معصومیت۔
"وہ عادتاً ہلکی آنچ کو میٹھی آگ کہتی ہیں۔ میں یہ سب دیکھتی ہوں تم مہمانوں سے مل آؤ۔"
اسے بھیج کر ثمین سرعت سے کام نمٹانے لگی۔
منیزہ بیگم نے آج کچھ قریبی رشتہ داروں کو مدعو کیا تھا۔ گھر میں خوب رونق لگی تھی۔ کسی کی سراہتی نگاہیں دریہ کو ہواؤں میں اڑائی رہیں۔
کچھ دن دعوتوں کی نذر ہوئے پھر روٹین لائف شروع ہوگئی۔ حسن اسپتال چلا جاتا۔ دریہ منیزہ بیگم سے باتیں کرتی کبھی ٹی وی دیکھتی یا پھر موبائل سے چپٹی رہتی دل چاہتا تو نانو کے گھر چلی جاتی۔
"دریہ! آج کے بعد شام کا کھانا روز تم بنایا کرو۔ اب تک تمہیں اس گھر کے معمولات کا اندازہ تو ہو گیا ہوگا۔"
حسن کی بات پر وہ چکرا کر رہ گئی۔ اسے تو ڈھنگ سے چائے بھی بنانی نہیں آتی تھی کھانا کیسے بناتی؟
والدین کی علیحدگی کے بعد وہ نانو کے گھر رہی تھی نہ کسی نے اسے کام کا کہا، نہ اس نے خود سے سیکھنے کی کوشش کی۔ وہ سیکنڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی جب نانو پیرالائز ہو گئیں، ان ہی دنوں میں حسن کا رشتہ آیا اور ممانی نے اس کی مرضی جانے بنا، اس کی شادی تک طے کر دی۔ وہ گم صم سی اسے دیکھے جا رہی تھی۔
"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں...... میں بنا دوں گی۔"
"تھینکس......" وہ مسکرایا لیکن وہ مسکرا نہ سکی۔

☆☆☆

"آنٹی! مجھے کوکنگ نہیں آتی۔ لیکن میں اب سیکھنا چاہتی ہوں آج حسن نے یخنی پلاؤ کی فرمائش کی تھی۔ آپ مجھے گائیڈ کریں گی پلیز......!"

ڈھلے ڈھلائے چہرے کے ساتھ اگلی صبح وہ منیزہ بیگم کے سامنے کھڑی تھی۔

ایک ہمارا دور تھا۔ گندم کی کٹائی اور چکی پیسنے جیسے بامشقت کام سکھانے کے بعد ہی مائیں بیاہتی تھیں...... اور اب یہ زمانہ آگیا ہے کہ اونٹ جتنا قد لیے ساس کے سامنے کھڑی کہہ رہی ہے کہ مجھے کھانا پکانا سکھاؤ...... ان کے دل نے دہائی دی۔

"تم چاول صاف کرو۔ میں آتی ہوں۔" وہ مزید کیا کہتیں۔

چند دن مزید سر کے تو دریہ صاحبہ اپنے ہی ہاتھ کے بنے تجرباتی کھانے کھا کر معدہ خراب کر بیٹھیں۔ روایتی کھانے پکانا اس نے جلد سیکھ لیا تھا مگر جب چائنیز، اٹالین ڈشز بنانے کی کوشش کرتی تو حسن فرمائش کر کے پچھتاتا۔ اس بار تو الٹیاں کر کر کے دریہ کی حالت غیر ہو گئی۔ سب کو تشویش نے آن گھیرا۔ منیزہ بیگم نے کچن کا چارج پھر سے سنبھال لیا۔

ثمین کھیر پکوائی کی رسم پر کھانا کھا کر اپنے گھر گئی تو دو ماہ بعد ہی میکے کا رخ کیا تھا۔

☆☆☆

آج صبح ہونے والی موسلا دھار بارش کے سبب اب کافی ٹھنڈ ہو گئی تھی۔ وہ گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو گویا اسے سو والٹ کا کرنٹ لگا۔ سامنے ہینڈ پمپ کے پاس امی کپڑے دھو رہی تھیں۔

"امی! یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟ دریہ کدھر ہے؟" سلام دعا کے بعد اس نے استفسار کیا۔

"اس پر ابھی زیادہ ذمہ داریاں نہیں ڈالیں۔ ویسے بھی میں کون سا بوڑھی ہو گئی ہوں۔ ہٹی کٹی ہوں۔ ابھی تو یہ سارے کام کر ہی سکتی ہوں۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"امی! آپ کو نہیں لگتا کہ آپ اسے کچھ زیادہ ہی چھوٹ دے رہی ہیں؟"

"میں نے اسے کوئی چھوٹ نہیں دی۔ جہاں تک ممکن ہو وہ ہر کام میں میری مدد کرواتی ہے۔ میں اپنے سکون کے لیے اس کے یہ خوب صورت دن خراب نہیں کرنا چاہتی۔ اس کے سر پہ ماں باپ کا سایہ نہیں تھا کہ وہ اسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتے۔ جلد یا بدیر وہ سب کچھ سیکھ ہی جائے گی۔"

ان کی باتیں سن کر ثمین کافی حد تک قائل ہو چکی تھی۔

"یہ ضروری تو نہیں کہ سسرال میں جو زیادتیاں ہم ماں بیٹی کے ساتھ ہوئیں وہی زیادتیاں اس کے ساتھ بھی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ میری عدم موجودگی میں بھی وہ مجھے اچھے لفظوں میں یاد کرے۔ شروع میں تھوڑی دقت ہوئی لیکن مثبت رخ اپنانے سے دل بہت مطمئن ہوا۔"

دروازے کی اوٹ سے ان کی باتیں سنتی دریہ بھاگ کر منیزہ بیگم سے لپٹ گئی۔ اس کا دل ان کی عظمت پر ایمان لے آیا تھا۔ ثمین بھی ساس بہو کی محبت دیکھ کر مسکرا دی۔

☆☆

آسیہ رئیس خان

اسیرِ پیماں

"وعدہ کہ تمہیں ہر تکلیف سے بچانا ہے، وعدہ کہ تمہارے ہونٹوں سے مسکراہٹ کو جدا نہیں ہونے دینا ہے، وعدہ کہ خوشیوں کو تم سے دور نہیں جانے دینا۔ اور محبت وعدہ ہی تو ہے، خود سے کیا وعدہ۔ یہ محض ایک احساس ہو تو اس کی بقاء اور جلا متعلقہ شخص سے منسوب ہوگی وہ دور تو کم ہو جائے، وہ بے وفا تو فنا ہو جائے، اس سے رشتہ بدلا تو ختم ہو جائے، اس کے ختم ہونے کے سینکڑوں جواز ہو سکتے ہیں لیکن خود سے کیا وعدہ۔ وہ کیسے بدل سکتا ہے؟ اس کا کم، کم اور ختم ہونا ناممکن ہے۔ یہ کہیں نہیں جاتا، ہمیشہ ساتھ ہوتا ہے، دل میں رہتا ہے، اسے پورا کرنے کی فکر دل کی دھک دھک کی طرح ساتھ ہوتی ہے، اس کے وفا ہونے کی دعا ہر آتی جاتی سانس کا ورد بن جاتی کہ اسے نبھایا جاتا ہے ہر حال میں کہ یہ صرف ہمارا معاملہ ہوتا ہے پھر ایک شخص اور رشتہ کیا، دنیا بھی بدل جائے تو فرق نہیں پڑتا، یہ نہیں بدلتا، یہ نہیں ٹوٹتا۔"

متوسط طبقے کے معقول سے مکان کے ایک کمرے میں اس کے ہاتھ وہ بوسیدہ خط لگا تھا۔ اس قدرے طویل خط کو پڑھتے ہوئے وہ کھو سا گیا۔ وہ اسے مکمل پڑھتا اس سے پہلے ہی باہر سے اس کا نام پکارا گیا اور وہ جو چیز تلاش کرنے آیا تھا، اسے بھول کر اس نے خط وہیں رکھا جہاں سے وہ گرا تھا یعنی پرانے سامان اور کتابوں کے بیچ، جنہیں شاد ہی کوئی ہاتھ لگاتا تھا اور باہر چلا گیا۔ خط میں دو نام تھے لیکن نیچے لکھا نام اسے راز ہی رکھنے کی تلقین تھا۔

اس مکان سے دور ایک عالی شان بنگلے میں کتابوں کی الماری میں کتاب ڈھونڈتے ہوئے




مکمل ناول

ڈائری نیچے گر پڑی تھی۔ وہ جس انداز میں فرش پر پڑی تھی اس نے ویسے ہی اٹھا کر سیدھی کی۔ درمیان سے کھلے صفحات پر خوب صورت لکھائی نے اسے متوجہ کیا اور سطروں پر نظریں پھسلتی گئیں۔

"وعدہ کہ تمہیں ہر تکلیف سے بچانا ہے، وعدہ کہ تمہارے ہونٹوں سے مسکراہٹ کو جدا نہیں ہونے دینا ہے، وعدہ کہ خوشیوں کو تم سے دور نہیں جانے دینا۔ اور محبت وعدہ ہے، خود سے کیا وعدہ!"

طویل عبارت کا کچھ حصہ ہی پڑھا تھا کہ پیچھے چاپ ابھری۔ اس نے ڈائری بے اختیار بند کر کے رکھ دی۔ اس وقت اسے علم نہیں تھا کہ مستقبل قریب میں خط کی طرح لکھی تحریر میں، اوپر لکھا نام اس کے لیے اس راز سے پردہ اٹھانے کا محرک بن جائے گا۔ نیچے درج نام کو وہ جانتا تھا۔

☆☆☆

دور سے آتی بائیک دیکھتے ہی انتظار بھری آنکھوں میں جلی جوت کی تابانی دیکھنے لائق تھی۔ اس نے پہلے رفتار کم کی پھر گیٹ کے قریب آ کر ہارن بجایا۔ سارہ کو کام چور چوکیدار کی سستی بڑی بھلی لگتی تھی جو اپنی چوکی سے نکلنے اور گیٹ کھولنے میں رتی برابر عجلت یا پھرتی کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ اس ست الوجود کو پتا ہی نہیں تھا کہ اوپر کی کھڑکی سے کوئی اسے کتنی دعائیں دیتا ہے۔ نیلی جینز، سادہ خاکی شرٹ میں وہی روز والے سیاہ جوتے اور پشت سے لگا بیگ تھا۔ اس چہرے کا ایک ایک نقش اسے اسی لیے یاد تھا کہ وہ یہاں سے بنا کسی جھجک اور خوف کے اسے دیکھ لیتی تھی۔ کھلے گیٹ سے اندر آ کر بائیک اسٹینڈ پر لگا کر جب وہ پورچ میں غائب ہوا، تب اس نے آئینے کے سامنے آ کر اپنے سراپے پر نظر ڈالی۔

گہرے گلابی رنگ کا دوپٹا سر پر جمایا اور میز سے کتابیں اٹھا کر دروازہ کھول کر سیڑھیاں اترنے لگی۔

ان میں ایک دوسرے کی پسند ناپسند بتانے والی بے تکلفی تو دور، ضرورت سے زیادہ بات بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ سختی سے بطور استاد، اپنی ذمہ داری نبھانے پر کاربند تھا لیکن سارہ نے اس کے مزاج اور پسند کے اندازے لگا لگا کر، خود کو پورے کا پورا بدل ڈالا تھا۔ جینز، ٹاپ اور کرتیاں ترک کر کے اس نے باقاعدہ دوپٹے والے جوڑے، پہننا شروع کر دیے تھے، کیوں کہ متوسط طبقے کے پس منظر میں اس کی سنجیدگی، کم گوئی اور سلجھے دھیمے انداز نے اسے یہ اشارہ دیا تھا کہ اسے شوخ اور چیختا چنگھاڑتا کچھ نہیں پسند نہ انسان، نہ لباس نہ لہجہ نہ سنگھار۔

اس نے اپنے میک اپ کے شوق کو لائنر اور لپ اسٹک میں سمیٹ لیا تھا، بال کٹوائے، رنگوائے مہینوں ہونے آئے تھے۔ ایک بار اسے فون پر کہتے سنا کہ کڑھی چاول یا بگھارے بیگن بنا لیں، تو اس نے سارا باورچی خانہ سر پر اٹھا کے اور ملازموں کی شامت بلا کے کڑھی چاول اور بگھارے بیگن بنانا سیکھے تھے۔ ستم یہ تھا کہ جس کے لیے یہ سارے جتن تھے اسے خبر ہی نہیں تھی کہ دنیا میں کوئی اس کے لیے، کس قدر خوار ہو رہا ہے، کوئی خود کو سراپا بدل چکا ہے۔

اوپر رک کر اس نے نظر آئے بنا نیچے جھانکا۔

"السلام علیکم۔" ڈرائنگ روم میں اس کی مما کو دیکھ کر اس نے سلام کیا۔ عظمیٰ نے جواب دے کر اس کا حال پوچھا جواب میں اس نے معمول کی طرح 'اللہ کا کرم ہے' کہا تھا۔

"آپ بیٹھیں اسٹڈی میں، میں سارہ کو بھیجتی ہوں۔" وہ جی کہتا سعادت حسین کی اسٹڈی کی طرف بڑھ گیا جہاں وہ ہفتے میں تین دن زندگی کا سب سے قیمتی اور خوبصورت ایک گھنٹا گزارتی تھی۔

"کچھ دیر بعد اسٹڈی میں چائے پہنچا دینا۔" انہوں نے ملازمہ کو آواز دے کر ہدایت دی۔ اس سے پہلے کہ وہ اوپر کا رخ کرتیں یا ملازمہ کو بھیجتیں وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ کر نیچے آ گئی۔ شکر تھا اس سفر میں اس کا دوپٹا سر سے پھسل گیا ورنہ عظمیٰ بیٹی کے اس انداز پر ضرور ٹھٹھکتیں۔ اب تک اس کے دیسی لباس کے شوق کو وہ سعادت حسین کی پسند سے جوڑ رہی تھیں۔

"بیٹا مازن کے آنے سے قبل ہی اسٹڈی میں ویٹ کیا کرو۔" انہوں نے کہا۔

"کرتی ہوں، آج لیٹ ہوگئی۔" وہ جھوٹ کہتی آگے بڑھ گئی۔ اب اپنی کھڑکی سے اسے آتے دیکھنے کی وجہ تو انہیں نہیں بتائی جا سکتی تھی ناں!

اسٹڈی میں وہ کمرے کی دوسری دیوار سے لگے صوفے پر بیٹھتا تھا اور وہ اس کے سامنے رکھی میز کے دوسری جانب کرسی پر۔ وہ ہمیشہ طویل راہداری میں سست قدم اٹھاتی تھی اور اسٹڈی کے کھلے دروازے سے اسے لیپ ٹاپ یا کتاب کھولتے دیکھتی پھر دروازے سے ہی اسے سلام کرتے ہوئے اندر داخل ہوتی۔ وہ ہر بار سلام پر سر اٹھا کر اسے دیکھتا تھا۔ اس کی آواز پر نظر اٹھانے اور نظر جھکانے کا دورانیہ، یہ چند لمحے ہی اس کی نغمۂ امید تھے کہ ان لمحوں میں ہی کہیں ایک لمحہ آتا تھا جب اسے دیکھ کر مازن کا دل چاہت کے لیے پر دھڑک اٹھتا، اس کے اندر محبت کی چاپ ابھرتی، ایک خواہش درِ چشم سے اس کے اندر سرائیت کر جاتی، جو تڑپ اس کے اندر بھی وہ اس کے وجود کو اپنے پروں میں چھپا لیتی۔ اس ایک لمحے کا انتظار اور آس ان دنوں اس کا سب سے قیمتی سرمایہ تھا۔ وہ جیسے اس لمحے کے وجود پانے کی امید پر زندہ تھی۔

"السلام علیکم۔" کتابیں سینے سے لگائے اس نے اس آبِ حیات سے پل کو آنے کا موقعہ دیا۔ مازن نے سر اٹھایا اور سرگوشی سی آواز میں جواب دے کر حسب دستور سر جھکا لیا۔ آج بھی وہ لمحہ وقوع پذیر نہیں ہوا تھا۔ سارہ آرزو کے خالی بٹوے میں اگلے دن کی امید کا سکہ بند کرتی میز کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے کتاب اور بیاض میز پر رکھی اور مازن نے کتاب اٹھا کر مطلوبہ صفحہ کھولا۔ وہ ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرتا تھا۔ وہ بھی آگے جھک کر کتاب میں دیکھنے لگی۔

پہلے وہ توجہ نہیں دیتی تھی۔ ٹیوشنز کے بعد بھی اسے 'اکاؤنٹنسی اینڈ میتھمیٹکس' کا پرچہ چھوڑ دینے یا اس مضمون میں آرام سے فیل ہونے میں اسے کوئی ہچکچاہٹ نہیں تھی مگر اب وہ مازن کی محنت برباد نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس دیانت داری اور سنجیدگی سے پڑھاتا تھا کہ وہ اسے مایوس نہیں کر سکتی تھی۔ ٹیوشن کے بعد آخری سمسٹر میں اس نے بس پاسنگ نمبر حاصل کیے تھے لیکن اب وہ اس سے زیادہ کرنا چاہتی تھی۔ اس کے چہرے پر اپنی وجہ سے تاسف اور ملال دیکھنے کا خیال بھی اسے جان لیوا محسوس ہوتا تھا۔

یہ افسوس تو عمر بھر کا تھا کہ اس نے سعادت حسین سے ایک مضمون کی ٹیوشن کی بات کیوں کی تھی۔ اس نے سارے مضامین کا کہا ہوتا تو وہ ہفتے کے سات دن اسے دیکھ سکتی تھی۔ مازن نے اپنا لیپ ٹاپ آن کیا اور عادتاً آستینیں موڑ کر کلائی پر اوپر چڑھائی۔ یہ شاید لاشعوری طور پر سرزد ہونے والا عمل تھا جو وہ ہر بار سمجھانا شروع کرنے سے پہلے کرنے کا عادی تھا۔

سارہ کی زندگی اب یہی ہوگئی تھی۔ اس مختصر ملاقات میں اس پر غور کرنا اور پھر ان سے اس کے مزاج، عادت، پسند ناپسند اور معمول کا اندازہ لگانا۔ اور جب ان سے فرصت ملتی تو پڑھنے کی فکر بھی کر ہی لیتی تھی۔

☆☆☆

سگنل پر گاڑیوں کی ایک لمبی قطار تعداد میں چیونٹیوں کی قطار کو بھی مات دینے والی تھی لیکن اس قطار کی رفتار کچھوے سے بھی شکست کھانے والی تھی جو بہت دھیرے دھیرے آگے سرک رہی تھی۔ حارث بھی بڑے تحمل سے آگے رکی گاڑیوں کے آگے بڑھنے کا انتظار کر رہا تھا جو ذرا سا رینگ کر کے پھر رک جاتی تھیں۔ مطلوبہ پتے کے قریب پہنچ کر اس لمبے جام نے اسے کوفت زدہ کر دیا تھا۔

بے زاری سے یونہی دائیں بائیں دیکھتے ہوئے مخالف سمت جانے والی سڑک سے کنارے اس کی نظر ٹھہر گئی۔ فٹ پاتھ پر سامان لیے چل رہی ایک عمر رسیدہ خاتون لڑکھڑا کر گر گئی تھیں۔ ہاتھ سے

چھوٹی پلاسٹک کی تھیلی کے نیچے بکھر گئے تھے۔ خاتون کے سامنے سے آرہی سیاہ عبایا اور کتھئی اسکارف والی لڑکی نے آگے بڑھ کے انہیں اٹھایا پھر اطراف میں نظر ڈال کر انہیں کنارے پیڑ کے سائے میں لے گئی۔ وہاں انہیں سڑک کے کنارے بنی کیاری کی دیوار پر بٹھا کر وہ غالباً ان کی ہتھیلی اور پیروں پر زخم دیکھ رہی تھی۔ انہیں کچھ کہتے ہوئے اس نے شانے پر لٹکے پرس سے بوتل نکال کر تھمائی پھر واپس پرس کھنگال کر کچھ نکالا جب بزرگ کی ہتھیلی سامنے کی تو اس نے اندازہ لگایا وہ بینڈیج لگا رہی تھی۔ ان دونوں میں چند جملوں کا تبادلہ ہوا، اس نے بوتل واپس پرس میں رکھی اور پھر اٹھ کر دور دور پھیلا سامان اٹھانے لگی۔

تھیلی شاید پھٹ کر ناکارہ ہو چکی تھی اس لیے اس نے پھر عمرو عیار کی زنبیل جیسے پرس سے تہ شدہ تھیلی نکال کر کھولی جو ایک اور عمرو عیار کی زنبیل بن سکتی تھی۔ ساری چیزیں اکٹھا کر کے تھیلی میں بھرنے کے بعد اس نے بزرگ کا ہاتھ تھام کر انہیں اٹھایا، ان سے کچھ بات کی پھر انہیں لیے فٹ پاتھ کے کنارے تک آکر سامنے سے گزرتے خالی رکشا روکنے لگی۔

کچھ دیر بعد ایک رکشا رکا، اس میں انہیں بٹھایا، خاتون نے کچھ کہا جس کے بعد اس نے پھر اپنے پرس میں جھانکا اور پانی کی بوتل نکال کر تھما دی۔ وہ چند گھونٹ لے کر انہیں واپس کرنے لگیں لیکن اس نے نہیں لی۔ اس نے اندازہ لگایا کہ خاتون کو شاید دور جانا ہوگا۔ ڈرائیور کو بھی اس نے کچھ ہدایات دی تھیں اور رکشا آگے بڑھ گیا۔

وہ اپنا اسکارف اور پرس شانے پر درست کرتی سگنل کی سمت بڑھ گئی۔ حارث نے اتنی دیر میں اس وقت غور کیا کہ وہ اپنا بایاں پیر ہلکا سا کھینچ کر چل رہی تھی۔ اس کی چال عام لوگوں کی طرح متوازن نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا بائیں پیر میں کوئی چوٹ لگی ہو، جس کی وجہ سے وہ اس پر زور یا وزن نہیں ڈالنا چاہتی تھی یا پھر اس کے پیر میں کوئی نقص تھا۔ پیچھے سے بجے بے قرار اور غصیلے ہارن پر اس نے ادھر سے نظر اور بریک سے پیر ہٹا کر گیئر بدلا۔

پیدل دس منٹ کا راستہ تھا لیکن اس سگنل اور ٹریفک کو پار کرتے اسے بیس منٹ مزید لگ گئے تھے۔

یہ ایک مصروف علاقہ تھا۔ اس تین منزلہ اور بہت چوڑی عمارت میں مشہور انسٹی ٹیوٹ، کئی دکانیں اور دفاتر تھے۔ کار پارک کرنے کے بعد عمارت کے زمینی منزل پر موجود انسٹی ٹیوٹ اور دکانوں کے آگے سے گزر کر آخری سرے پر بنی لفٹ سے وہ اوپر گیا۔ یہاں دوسری منزل پر کام کے سلسلے میں اس کی ایک کاروباری ملاقات تھی جو زیادہ دیر نہیں چلی۔ واپسی میں لفٹ سے نکل کر اسے پھر اتنا ہی چل کر کار تک جانا تھا۔ وہ فون دیکھتے ہوئے چل رہا تھا کہ ہلکے سے دھماکے اور شور پر چونک گیا۔ سامنے کا منظر خوش گوار نہیں تھا۔ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ مزدور سر پر کارٹن رکھے تیزی سے جاتے ہوئے سامنے سے آرہی لڑکی سے ٹکرایا تھا اور اب لڑکی اور دونوں کارٹن زمین پر تھے۔

"اندھی تو نئی ہے، دھیان کدھر تھا؟ گارڈن سمجھ کے چلتے لوگ سب جگہ۔" یہ عالمی یا کم سے کم دیسی قانون تو ہے کہ ٹکر کے بعد 'دھیان کدھر تھا اور اندھے تو نہیں' جیسے جملے ہی منہ سے پھسلتے ہیں۔ اس ادھیڑ عمر، میلے سے کپڑوں میں ملبوس آدمی کا مزاج شدید بگڑا تھا۔ اس کی آواز اور چہرے سے افسوس اور خوف مترشح تھا لیکن غصہ سابقہ دو جذبوں پر حاوی محسوس ہو رہا تھا۔

"میرا نکصان پورا کرو ابھی کے ابھی۔ یہ دس ہزار کے برتن تھے، مالک میرا خون پی جائے گا۔" مالک کا ڈر، غصے میں ڈھلا اس لڑکی پر برس رہا تھا۔ وہ یقیناً گودام سے سامان اٹھا کر دکان تک لے جا رہا تھا۔

حارث تھوڑا آگے آیا تو زمین پر گری لڑکی اس کے دائرہ نگاہ میں آئی۔ وہ وہی تھی سیاہ عبایا اور کتھئی

اسکارف والی۔ چہرے پر تکلیف کے آثار لیے وہ پیچھے مڑے پیر پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔

"اٹھو میری ماں، دیر ہورہی ہے مجھے، پیسے دو۔" آدمی نے اب کے تحکم بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اس کے آگے ہاتھ پھیلایا۔ دو چار لوگ جو رک گئے تھے، آگے بڑھ گئے۔ انہیں علم تھا اب یہ 'سین' لمبا چلے گا اور کسی کے پاس اتنا فارغ وقت نہیں تھا کہ معاملہ کب اور کیسے نپٹا دیکھنے کے لیے رکتا۔

"میری کوئی غلطی نہیں ہے، آپ ہی بنا دیکھے تیزی سے دوڑ رہے تھے۔" عدیمہ نے پیر سے ہاتھ اور سر اوپر اٹھا کر کہا۔

"جھگڑا کر کے میرا ٹائم کھوٹی نہ کرو دس ہزار روپے دوالی کے الی۔" وہ اس کے پرس کی طرف جھپٹا۔ عدیمہ نے پھرتی سے پرس دبوچا اور اسے برہمی سے گھورا۔

"دور سے بات کریں۔"

"دس ہزار دوالی۔"

"یہ اتنے مہنگے تھے۔" اس نے ذرا فاصلے پر پڑے ڈبوں کو حیرت سے دیکھا۔

"امپورٹیڈ برتن ہے وہ۔" آدمی نے جتا کر کہا اور آگے جا کر ڈبے سیدھے کیے۔ اس عمل سے پیدا ہوئی جھنکار پر عدیمہ سے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔ اندر جو بھی تھا چکنا چور ہو گیا تھا۔ دونوں غریبوں کا نقصان ہوا تھا۔ وہ جیسے تیسے کھڑی ہوئی۔ عبایا سے دھول مٹی جھاڑی اور پرس سنبھالا۔

"دیکھیے۔" اس نے نرمی اور جھجک کے ساتھ مصالحت کی کوشش شروع کی۔

"غلطی سراسر میری نہیں ہے، یہ ایک حادثہ تھا، دیکھا آپ نے بھی نہیں تھا اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں نہ میں اس سارے نقصان کی تنہا ذمہ دار ہوں۔ میں آپ کے مالک سے بات کرتی ہوں چلیں۔" وہ ذرا سا آگے بڑھی تو ساتھ آہ بھی نکلی اور اس نے بائیں ٹانگ پر ہاتھ رکھا۔

"میڈم آپ مجھے پیسے دو بس۔" اب کے اس کی آواز تیز اور حتمی تھی۔

"پیسے نہیں ہے تو ادھر پیچھے دوا ے ٹی ایم ہے، چلو میں دکھاتا ہوں۔" اس نے ڈبے ایک طرف کھسکا کر راستے سے ہٹا دیے تھے۔ اب اس کے انداز میں بدتمیزی تھی۔

"میں اتنے پیسے نہیں دے سکتی۔" عدیمہ کی گھبراہٹ اور پریشانی اب عیاں ہو رہی تھی۔

"میں شرافت سے بس نکصان کا پیسہ مانگ رہا ہوں ورنہ۔۔"

"مجھے لے چلیں اے ٹی ایم۔" حارث نے آگے آ کر اس مزدور کو مخاطب کیا۔

وہ دونوں تعجب سے اپنی لڑائی میں کودے تیسرے کو دیکھنے لگے۔

"آپ کو دس ہزار چاہیے ناں۔" حارث نے کہا اور مزدور نے زور زور سے سر ہلایا۔

"تو آیئے۔" وہ اسے اشارہ کرتا آگے بڑھا۔ مزدور بھی پیچھے لپکا۔

عدیمہ حیران سی انہیں جاتے دیکھنے لگی۔

"یہ کون اور کیوں؟" وہ حیران نہ ہوتی تو عجیب تھا۔

وہ آگے غائب ہوئے تو پہلے سوچا ان کے پیچھے بھاگے لیکن ایک تو گری تھی دوسرے ان کے پیچھے بھاگنا عام صورت میں بھی اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ کچھ سوچ کر وہ ایک طرف رکھے ڈبوں کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

"لگتا ہے اس رحم دل اجنبی نے سارا ماجرا دیکھا ہے۔" مدد کے لیے آنے کا جواز یہ ہی ہو سکتا تھا۔ اجنبی کے لیے اس کا احساس اور سوچ ممنونیت سے بھری تھی۔ مزدور جس ضدی اور بدتمیز سے انداز میں اپنی بات پر اڑا تھا اس وجہ سے اس کے وہاں سے ٹل جانے پر اسے اطمینان ہوا۔ اس نے ذرا جھک کر ڈبوں پر برینڈ کا نام دیکھا جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

"پتا نہیں سچ بھی کہہ رہا ہے یا نہیں۔" وہ نیچے

جھک کر ڈبوں پر درج ایم آر پی تلاش کرنے لگی۔ جب نظر آئی تو وہاں قیمت دس ہزار لکھی تھی۔ وہ جھٹ سیدھی ہوگئی۔

"اسے تو بیس مانگنے چاہیے تھے۔" دس ہزار کی کمی نے اس مزدور کا قد اس کی نظر میں بڑھا دیا۔

"اچھا۔ شاید وہ دکان دار دس میں فروخت کرتا ہوگا پانچ کا ڈسکاؤنٹ بتا کر اس لیے وہ اتنا اماؤنٹ ڈیمانڈ کر رہا ہے، ایم آر پی تو کچھ بھی لکھ دیتے ہیں۔" اچانک دماغ نیند سے جاگا۔

"پھر تو یہ دس ہزار کے بھی نہیں ہوں گے اور میں تو دس ہزار دینا بھی نہیں چاہتی تھی نہ دے سکتی ہوں۔ اس مزدور کو نہ اس مدد کرنے والے کو۔" وہ جیسے ہوش میں آئی اور مزدور کے ٹلنے کا اطمینان ہوا ہوگیا۔ اسے اپنی غلطی اور غائب دماغی کا احساس ہوا۔ یقیناً یہ وقتی مدد تھی وہ اجنبی اس سے پیسے تو وصول کرے گا ہی، کہاں سے دے گی وہ۔

"حد کر دی آج میں نے بے وقوفی کی!" اس نے بے چینی سے جدھر وہ غائب ہوئے تھے ادھر دیکھا اور اسی طرح تکلیف کے احساس کے ساتھ آگے بڑھی۔ وہ اب بھی اس اجنبی کو روک سکتی تھی۔ اسے پیر کی تکلیف چھپانے کی اس قدر عادت تھی کہ گھر سے دور اس جگہ بھی وہ چھپا رہی تھی جہاں کسی نے غور بھی نہیں کرنا تھا۔

وہ چھوٹے قدم اٹھاتی، گھوم گھوم کر اطراف کی چھوٹی بڑی ہر ایک دکان غور سے دیکھ رہی تھی لیکن اسے اے ٹی ایم کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ جب درد نے مجبور کیا تو اسے رک جانا پڑا۔ اب فکر کے ساتھ اس پر گھبراہٹ بھی طاری ہو رہی تھی۔

"عجیب ہے وہ آدمی اور میں بے وقوف!" ہر سمت سے ناکام لوٹی نظر زمین پر ٹکا کر وہ بڑبڑائی۔ تبھی سامنے والی تنگ سی گلی سے وہ دونوں برآمد ہوئے۔ مزدور نوٹ جیب میں ٹھونستے ہوئے پیچھے ٹکر والی جگہ سے ٹوٹا سامان اٹھانے چل پڑا۔ حارث بھی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے لاتعلق سا جانے لگا تھا۔ عدیمہ کو ایک دم غصہ آ گیا۔ وہ دونوں یوں تھے جیسے سارے معاملے سے اس کا کوئی لینا دینا ہی نہیں۔

"کیوں دیے آپ نے اسے پیسے؟" اسے شکریے کی چاہ نہیں تھی مگر یہ برہمی بھی غیر متوقع تھی۔ عدیمہ کو امارت اور اختیار کا یہ مغرور مظاہرہ بہت برا لگا تھا اور آواز و لہجہ اسی کے غماز تھے۔

حارث نے غصے پر قابو رکھنے کی کوشش میں ناک پھلائی اور سختی سے ہونٹ بھینچتی لڑکی کو دیکھا اور دو قدم چل کر کچھ اور اس کے پاس آیا۔

"اتفاق سے میں چشم دید گواہ ہوں کچھ دیر پہلے سڑک کے کنارے ایک اولڈ لیڈی کے ساتھ کی گئی نیکی کا۔" عدیمہ کے تاثرات بدل گئے۔

"اس نیکی کی انسپریشن مجھے اس منظر سے ہی ملی تھی۔" اتنی وضاحت کافی تھی۔ وہ حادثے والے مقام کی سمت آگے بڑھ گیا۔

"سنیں۔ رکیں۔ آہ!" کچھ پل کے بعد سکتہ ٹوٹا تو وہ بھی اسے روکنے کی غرض سے آگے بڑھی اور اس کوشش میں خود کو نظر انداز کیے جانے پر پیر نے اس قدر احتجاج بلند کیا کہ اس کی چیخ نکل گئی۔ حارث نہ صرف رکا بلکہ پلٹ کر پھر اس کے پاس آیا جس کے چہرے پر اب تکلیف کے آثار تھے۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" اس نے اپنی کار سے نیکی کے مظاہرے کے دوران بھی اس کی چال نوٹ کی تھی۔ اس کے پیر پر کوئی پٹی یا بینڈیج مطلب تازہ یا زیر علاج چوٹ کوئی علامت نہیں تھی۔

"آپ مجھے اپنا ایڈریس، فون نمبر یا آئی ڈی کچھ بھی دیں تاکہ میں رقم لوٹا سکوں۔" اس کا ارادہ بدل گیا تھا۔ اس کا جواز اور اس وقت خود اس کی حالت بحث کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔

ان دونوں نے نہیں دیکھا کہ اسی وقت ان کے قریب سے وہ مزدور دونوں کارٹن سر پر رکھے گزر گیا ہے۔

"شاید گرنے کی وجہ سے چوٹ لگی ہے، آپ کو

ہاسپٹل جانا چاہیے۔" وہ جو فون ہاتھ میں لیے اس کا بتایا ایڈریس یا فون نمبر لکھنے کے لیے تیار تھی، اسے دیکھنے لگی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ مجھے ایڈریس یا نمبر دیں پلیز۔" حارث نے اس کے جوتے میں چھپے پیر کو دیکھا اور پھر اسے۔ اس کی تکلیف چھپانے کی کوشش صاف نظر آرہی تھی۔

"آپ کیا خود کو دنیا میں یکتا سمجھتی ہیں؟" عدیمہ اس حملہ نما جملے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"جی۔؟" اس کی بھنویں آپس میں جڑ گئیں۔

"مدد کا جذبہ دنیا کے اور لوگوں میں بھی ہوتا ہے، یہ صرف آپ کا خاصہ نہیں۔"

"میں نے ایسا کب کہا؟ میں ایسا نہیں سمجھتی ہوں، آپ۔" خجالت اور غیظ کا ملا جلا احساس اسے پہلی بار ہوا تھا۔

"مجھے مدد کرنے دیں۔ آپ یہیں رکیں۔" اس کا جملہ اچک کر وہ اٹل انداز میں حکم دے کر چلا گیا۔

"عجیب ترین آدمی ہے۔ جانے حاتم طائی اور رابن ہڈ کی یہ کون سی قسم ہے۔" اس نے فون بند کر کے پرس میں ڈالا اور پیر کی طرف متوجہ ہوئی۔

"اسے بھی آج ہی نخرے دکھانے تھے۔" نیکی ایسے بھی گلے پڑ سکتی ہے، اس نے کبھی سوچا نہ تھا۔

"مگر میں دس ہزار کہاں سے دوں گی؟" اس کی فکر کی سوئی گھوم کر وہیں پہنچ گئی تھی۔

اس نے کچھ دیر پہلے ہی ثوبیہ کی فیس جمع کروائی تھی اور اس کے پرس میں فیس کی اگلی قسطوں کی ادائیگی کی تاریخوں کا شیڈول تھا۔ ہفتہ بھر میں آنے والی ان تاریخوں کے دستخط شدہ چیک بھی جمع کروانے تھے۔ امی کو ملنے والے پیسے اور مازن کی معقول تنخواہ ان سب کے اخراجات اور ضروریات میں کسی تنگی کا احساس نہیں ہونے دیتی تھی۔ لیکن سمیر کا آئی ٹی اور ثوبیہ کا ایم بی بی ایس کا شوق بڑا مہنگا تھا۔ وہ آرام دہ زندگی گزار رہے تھے لیکن فضول خرچیوں کے متحمل ہرگز نہ تھے۔

اگر مازن چاہتا تو ان سب سے الگ ہو کر اپنی تنخواہ میں ایک آرام دہ زندگی گزار سکتا تھا لیکن پھر وہ مازن کیسے ہوتا۔ اضافی آمدنی کی خاطر وہ کسی کوچنگ سینٹر میں بھی جاتا تھا۔ وہ اسے اپنا شوق کہتا تھا لیکن وہ جانتی تھی وہ اپنی خالہ کا بوجھ کم کرنے کے لیے یہ سب کرتا ہے۔ وہ اس سے یا امی سے چالیس ہزار کا مطالبہ نہیں کر سکتی تھی اور اس کی اپنی ٹیوشن سے اتنے پیسے اسے سال بھر میں بھی نہ ملتے تھے۔

مسلسل ہارن کی آواز پر وہ خیالوں سے باہر آئی۔ سڑک کے کنارے کار کھڑی تھی۔ اندر وہی ضدی شخص تھا۔ وہ کار سے نکل کر اس کے پاس آیا۔

"آئیں پلیز، قریب ہی ہاسپٹل ہے۔" عجب کشمکش تھی کہ اسے اپنے یکتا ہونے کا گھمنڈ نہیں یہ ثابت کرنے کے لیے اس کی بات ماننا ضروری ہو گیا تھا اور اس کے مزید احسان اٹھانے پر دل بھی راضی نہیں تھا۔ اس سے بحث کرنا بے سود تھا کہ اس چہرے پر اپنی بات منوا کر رہنے والی ضد صاف لکھی نظر آتی تھی۔ اس کے انداز کی بے نیازی میں بھی اسے اس زعم کی جھلک دکھائی دے رہی تھی کہ وہ جو چاہے وہ کر سکتا ہے، کروا سکتا ہے۔ وہ پیر گھسیٹتی، درد سہتی کار تک آئی اور خود ہی پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

پانچ چھ منٹ بعد کار جہاں رکی وہ ایک نامور اسپتال کی ایمرجنسی تھی۔ اسے اپنا مسئلہ بتانا تھا لیکن اس وقت وہ خاموشی سے ڈاکٹر کی سنتی گئی اور جو کہا کیا کرتی رہی۔ اسی نے یہ نیکی کا جذبہ اس اجنبی کے اندر جگایا تھا تو یہ سزا بھی لازم تھی۔ نیکی گلے پڑنے کا اس کا پہلا ہی تجربہ بڑا برا تھا۔

پورٹیبل ایکس رے کے بعد وہ ڈاکٹر کی بات سن رہا تھا اور عدیمہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ جسے عارضی چوٹ سمجھ رہا تھا وہ پرانا مسئلہ تھا جس کا علاج سرجری تھا۔ ڈاکٹر کی باتوں سے لگا کہ وہ اسے حارث کی کار سے ہوئے ایکسیڈنٹ کا شکار سمجھ رہا ہے۔ تبھی اسے تسلی دے رہا تھا کہ اسے گلٹی فیل کرنے کی

ضرورت نہیں یہ اس کی کار سے نہیں ہوا ہے۔ یہ سارا وقت اس کا ذہن دس ہزار کی جوڑ توڑ میں لگا تھا۔

"اب خوامخواہ ایمرجنسی کا بل بھی۔" وہ جانتی تھی درد کش دوا اس کے مرض کا علاج نہیں ہے۔ اس وقتی بہلاوے سے گھر میں ڈبہ بھرا تھا۔ اب بھی ڈاکٹر نے اینا سِڈ کے ساتھ اینالجیسک، کیلشیم اور وٹامن ڈی ہی دیا ہوگا۔ ایک ہی مرض بلکہ مسئلے کے لیے مسلسل اسپتالوں کے چکروں نے اسے اتنا 'طبیب' تو کر دیا تھا۔

"چلیں۔" اس کے سر پر کھڑا وہ اسے اب چلنے کو کہہ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ پھر وہیل چیئر آتی وہ اٹھ کر ناراض سے باہر نکل گئی۔ نرس نے پیر پر جو درد کش اسپرے کی بوچھار کی تھی اس سے بڑا افاقہ ہوا تھا۔ کار کے پاس آ کر وہ رک گئی۔ پیچھے سے ست خرام حارث بھی پہنچ گیا۔

"آپ کی ہیلپ کا بے حد شکریہ۔ اب آپ پلیز مجھے وہ تفصیل دے دیں جو آپ کی رقم لوٹانے کے لیے درکار ہوگی۔" وہ ایک بار پھر فون میں نوٹس کھولے تیار تھی۔

حارث چند لمحے اسے دیکھتا رہا جو کسی بھی طرح اس سے تفصیل لینے پر مصر تھی۔ دفعتاً اس نے فون اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اس غیر متوقع اور غیر اخلاقی عمل پر اس کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی لیکن وہ ہونٹ بھینچ کر چپ رہی۔ اس نے اپنا نمبر لکھ کر خود کو کال لگائی اور رنگ جاتے ہی منقطع کر کے فون اسے واپس دے دیا۔

"میرا نمبر لینے کی کیا ضرورت تھی؟" اسے غصہ آیا مگر وہ بحث نہیں کرنا چاہتی تھی سو اس کا نمبر محفوظ کر لیا۔ پیسے دے دینے کے بعد بلاک کرنا اس کے اختیار میں تھا تو ابھی تکرار وقت اور توانائی کا ضیاع تھی۔

اب اسے کچھ کہے بنا کار میں بیٹھ کر چلے جانا چاہیے تھا لیکن 'نیکی' ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔

"آپ راستہ بتائیں یا ایڈریس میں آپ کو گھر ڈراپ کر دیتا ہوں۔"

"میں ان آنٹی کو گھر تک چھوڑنے نہیں گئی تھی سو آپ کی انسپریشن بھی یہیں ختم ہو جانی چاہیے۔" اولین تاثر والی ممنونیت اب مفقود تھی۔

"آپ کے پاس گھر تک چھوڑنے کی سہولت نہیں تھی، میرے پاس ہے۔ اگر آپ کے پاس ہوتی تو آپ بھی یقیناً گھر تک پہنچا آتیں۔" وہ کچھ زیادہ ہی متاثر تھا۔

"نہیں، میں گھر تک چھوڑنے نہیں جاتی کہ میرے وقت کی اہمیت ہے، میرے ٹیوشن کے بچوں کی آمد سے پہلے مجھے گھر پہنچنا ہے۔" وہ یہ کہنا چاہتی تھی لیکن اس نے ایک لفظ نہیں کہا۔

"آیئے۔" وہ اسے کہتا کار کے پاس جانے لگا۔ وہی حتمی انداز کہ وہ جو کہہ رہا ہے وہ ہوگا ہی۔ اس کا دل کیا کوئی رکشا روکے اور اسے ہکا بکا چھوڑ کر رکشا میں سوار ہو کر چلی جائے۔ اس کے ضدی، حتمی، یقینی۔ جیسا بھی تھا، انداز پر اسے بھی ضد سی چڑھ گئی تھی لیکن اس کے پیلے کہے جملے اسے روک رہے تھے۔ وہ لا محالہ خاموشی سے کار میں بیٹھ گئی جب دوسری طرف سے وہ آ کر بیٹھا تو اس نے غائبانہ اپنا سر پیٹ لیا۔ وہ بے خیالی اور غصے میں اگلی نشست پر بیٹھ گئی تھی۔ تقدیر بھی یہ ہی چاہتی تھی کہ اس پل کو ان کی زندگی کا 'ٹرنگ پوائنٹ' جو بننا تھا۔

"سگنل سے لیفٹ لیجیے گا۔" اس نے پرس گود میں رکھا اور اسے بیلٹ لگاتے دیکھ خود بھی بیلٹ کھینچ کر دائیں طرف پھنسا دیا۔ انداز غصے کا اظہار تھا۔

وہ اسے راستہ بتاتی رہی اور وہ اس کے مطابق اسٹیرنگ گھماتا رہا۔ پہلے اس نے سوچا اپنی گلی سے پہلے بڑی سڑک پر ہی اتر جائے لیکن اس طرح کوئی محلے دار دیکھ لیتا تو زیادہ مصیبت ہوتی۔ گھر کے سامنے اترنے پر پڑوسیوں کی بھنویں ضرور اچکیں لیکن شک و شبے میں وہ چسکہ اور شدت نہیں ہو سکتی تھی جو گھر سے ذرا فاصلے پر دیکھ لیے جانے پر ہو سکتی تھی۔

الجھا سا حارث بریک لگاتے ہی اپنے فون

میں کچھ دیکھنے لگا تھا۔ اس نے بیلٹ نکال کر پرس شانے پر ڈالا تب تک وہ اپنے 'کرنٹ لوکیشن' کا پتا دیکھ کر بری طرح دنگ تھا۔ اس نے سامنے مکان کے سیاہ دروازے کو دیکھا اور پھر ساتھ بیٹھی لڑکی کو۔ اس بار اس کی نگاہوں میں عدیمہ کا ایک ایک نقش رقم ہو گیا تھا کہ نظر میں وہ تیزی اور آر پار والی کاٹ تھی۔

اس کے چھوٹے سے ماتھے پر اسکارف گولائی میں جھکا تھا، سانولی رنگت پر چھوٹی سی ناک، ذہین اور شفاف سیاہ آنکھیں، بھرے سے ہونٹ جو اس وقت کسی قدر خشک سے تھے اور اس کی تھوڑی کے درمیان ننھا گڑھا، وہ ان سب کو اب کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

وہ عام سی تھی اس میں یاد رہ جانے لائق کچھ نہ تھا لیکن اب وہ اس کے لیے خاص تھی اتنی کہ وہ اسے کبھی بھول نہیں سکتا تھا۔ اسے نیکی کی ترغیب دینے والی ہستی نے اس وقت اس کے اندر انتقام اور منفیت کو جگا دیا تھا۔ وہ کئی دن سے اس پتے کو جانتے ہوئے بھی یہاں آنے سے خود کو روک رہا تھا کہ اسے اندازہ تھا اس کے بعد وہ بدل جائے گا، اس مقام کے آگے کچھ اچھا نہیں ہوگا۔ اسے خود علم نہیں تھا کہ وہ کیسا شدید رد عمل دے گا بس اتنا یقین تھا کہ وہ جو کرے گا، جو ہوگا اسے اچھا نہیں کہا جا سکے گا۔ اپنا متوقع بدلا روپ اس کے لیے بھی خوش آئند نہیں تھا۔ اور یہاں آنے میں مانع جھجک کی وجہ یہ ہی تھی جو اس وقت انجانے میں ختم ہوئی تھی عین توقع کے مطابق۔

''میں فوراً اور بیک وقت پورے پیسے نہیں لوٹا سکتی۔'' اس کی سمت دیکھے بنا عدیمہ نے کہا۔

''امید ہے آپ مجھے وقت دیں گے۔'' وہ شکریہ ادا نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اس ساری مشقت نے اسے کوفت میں مبتلا کیا تھا لیکن وہ بداخلاق نہیں تھی۔

''تھینک یو۔'' وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

حارث نے اسے سیاہ دروازہ کھول کر اندر جاتے دیکھا۔

''اس دروازے کے اندر وہ ہے۔ کیا مجھے ابھی اندر جا کر وہ صورت دیکھنی چاہیے؟'' کچھ دیر دروازے کو گھورنے کے بعد اس نے کار واپسی کے لیے بڑھا کر لی۔ وہ اتنا شانت ہرگز نہیں تھا جیسا بظاہر نظر آ رہا تھا۔ اس کے اندر شعلے بھڑک اٹھے تھے۔

راستے پر ایک اجنبی کی مدد کرنے والی لڑکی کے لیے اس کے اچھے خیالات اور نیکی کی ترغیب چند گھنٹوں کی بھی نہیں تھی۔

☆☆☆

اس نے گھر میں کسی سے اس واقعے کا تذکرہ نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد ہی ٹیوشن پڑھنے والے بچے آ گئے اور وہ ان میں مصروف ہو گئی تھی۔ مغرب کے بعد مازن آیا تو نور افروز کے کہنے پر وہ اس کے لیے چائے بنانے اٹھی تھی۔

''ثوبیہ کا ایڈمیشن ہو گیا ہے۔'' اس نے چائے کا کپ مازن کو تھماتے ہوئے اطلاع دی۔

''تمہاری ٹیبل پر پے منٹ شیڈول رکھا ہے، یاد سے دیکھ لینا۔ اگلے ہفتے امی کے سائن شدہ چیک جمع کروانے ہیں۔'' وہ رکی نہیں ورنہ تو ایسے وقت میں اسے اتنی باتیں یاد آتی تھی کہ مازن کو کہنا پڑتا بس کرو مجھے جانا ہے۔

جب سے نور افروز نے ان دونوں کی شادی کا ذکر کیا تھا وہ عجیب سی روکھی، ناراض اور اداس ہوئی تھی۔ ان میں اتنی دوستی اور آہنگ تھا کہ وہ سارے مسائل، ساری باتیں ایک دوسرے سے بانٹتے تھے تو زمانے بھر کی فضول گوئی بھی وہ اس سے سامنے کرتی تھی۔ سمیر اور ثوبیہ ان سے کافی سال چھوٹے تھے جب کہ ان دونوں میں تین سال کا فرق تھا لیکن اب ایک بہت قریبی رشتے کا ذکر انہیں دور کر گیا تھا۔ ان کی دوستی نور افروز کی خواہش کی نذر ہو رہی تھی۔

خالہ کو بھی کیا ضرورت تھی اتنی جلدی وہ سب کہنے کی! اس نے تھک کے سوچا۔

وہ جانتا تھا عدیمہ کیا سوچ رہی ہے اور یہ

جانتے ہوئے بھی کہ خالہ کے بارے میں اس کا خیال درست ہے، وہ کبھی اسے زبان پر نہیں لاسکتا تھا تائید کرنا تو دور۔ اسے خالہ کے بے وقت اس ذکر کا مقصد بھی پتہ تھا۔ وہ جانتا تھا ان کی احتیاط اور دور اندیشی نے ان سے وہ بات بلوائی تھی۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے انہیں بھی اندازہ تھا کہ بے تکلفی، انسیت اور پروا کے باوجود ان دونوں کے احساسات ایک دوسرے کے لیے رومانی ہرگز نہیں اسی لیے انہوں نے مناسب سمجھا کہ مازن کسی اور کو پسند کر لے اس سے پہلے ہی اسے آگاہ کردیا جائے کہ وہ ان دونوں کی شادی کا ارادہ کرچکی ہیں اور ان کا یہ خیال صدفی صد درست تھا کہ ان کی زبانی سن لینے کے بعد مازن انکار نہیں کرے گا۔ عدیمہ کے لیے رومانی جذبات کی عدم موجودگی سے بڑھ کر اس کے لیے خالہ کی بات تھی۔

"لیکن خالہ نے دیر تو پھر بھی کردی۔" سرگوشی سی ابھری اور اس کی چائے کی خواہش ایک دم مرگئی لیکن ابھی اسے کوچنگ سینٹر جانا تھا۔ نیند کو آنکھوں سے دور رکھنا تھا۔ اس نے بے دلی سے چائے پی اور کھڑا ہوگیا۔ نور افروز باورچی خانے میں رات کا کھانا بنارہی تھیں۔

"میں نکل رہا ہوں خالہ۔" اس نے دروازے پر رک کر ان سے کہا۔

"کل کی طرح لیٹ مت ہونا۔" گرم تیل میں پیاز کے چھلکے گرنے سے اٹھے شور کے بیچ انہوں نے اونچی آواز میں کہا۔

"ان شاء اللہ آج دیر نہیں ہوگی۔"

"اللہ حافظ۔" انہوں نے چمچہ چلاتے ہوئے گردن موڑ کر کہا۔ وہ سر ہلاتا پلٹ گیا۔

خالہ اور اس کی امی نور افشاں کی شادی ایک ساتھ ایک ہی گھر میں ہوئی تھی اور دونوں نے آگے پیچھے بیوگی کی چادر اوڑھ لی تھی۔ پہلے اس کے ابا کا انتقال ہوا تھا۔ چوں کہ وہ ان کی بہن اور دیورانی تھی اور مشترکہ خاندان میں رہتے تھے اس لیے خالہ اور تایا نے انہیں نانا کے گھر نہیں جانے دیا۔ انہیں ساتھ رکھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تایا کے یہاں اولاد دیر سے ہوئی تھی اور تایا اور خالہ اسے اپنی اولاد کی طرح ہی چاہتے تھے۔ عدیمہ کے آنے کے بعد بھی اس کا مقام اور اہمیت بدلی نہیں تھی۔ اس بات سے دادا، دادای، چاچا اور غیر شادی شدہ پھوپھو خوش نہیں تھے۔ بیٹے کے جاتے ہی ان کی محبت اس کی بیوی اور بچے سے ختم ہوگئی تھی۔ خاص طور پر چاچا اور ان کے بچے اسے بے انتہا زچ کرتے تھے۔ اس کی امی کا مزاج سادہ اور نرم تھا ایسے میں خالہ ہی اس کی ڈھال بنی تھیں۔ اس کی وجہ سے انہوں نے دادی پھپھو اور چاچی سے لڑائیاں بھی بہت کی تھیں۔ وہ ذہین اور محنتی تھا اور خود ہی بھاگ دوڑ کر کے مختلف وظائف حاصل کرلیتا تھا۔ جیسے تیسے کر کے گزارا ہورہا تھا کہ جن دنوں وہ کالج میں تھا تایا بھی دار فانی سے کوچ کر گئے۔

اس کے بعد گھر میں آئے دن بحث اور لڑائیاں ہونے لگیں۔ خالہ کا سب سے بڑا سہارا یعنی شوہر جانے کے بعد اب ان کی حیثیت بھی وہ نہیں رہی تھی کہ وہ من مانی کرتیں۔ خون سفید ہونا کسے کہتے انہیں اس وقت سمجھ آیا جب سب کو ایک بار پھر نانا کے یہاں آنا پڑا۔

چھوٹے ماموں نوکری کرتے تھے لیکن بڑے ماموں کو تجارت کا شوق تھا۔ نانا جان کے اثاثے اور جمع پونجی اسی شوق، ان کے وعدوں اور یقین دہانیوں کی نذر ہوگئی تھی۔ اس بات پر چھوٹے ماموں بھی نالاں ہو کر الگ ہوگئے تھے کہ سب کچھ ایک بیٹے پر لٹادیا۔ اب دونوں ماموں الگ رہتے تھے۔ نانا کی پینشن میں ان چار بچوں کے اخراجات کے لیے خالہ اور امی اپنی سی کوشش کرتی تھیں۔

نانا بیٹیوں کے گھر سے نکل کر نوکری کرنے کے خلاف تھے۔ ڈیڑھ سال کے وقفے میں نانا جان کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس کے کالج کا ایک سال ابھی باقی تھا۔ ساتھ ہی وہ سی اے کا فاؤنڈیشن ایگزام کلیئر کرنے کے بعد اب انٹر کی تیاری کررہا تھا۔ ان ہی

دنوں میں اس کی امی بیمار رہنے لگی تھیں اور پھر ایک دن وہ حادثہ ہو گیا۔

جانے ان کی زندگیاں کون سا موڑ لیتیں، کتنی بدشکل ہو جاتیں کہ تایا جان کی نیکی پھر ان سب کے کام آئی۔ تایا جان کے دوست ان سے قرض لے کر بیرون ملک گئے تھے اور وہاں پردیس میں اپنا مقام بنا چکے تھے۔ بتداء کے مشکل حالات اور پریشانیوں میں تایا جان سے ان کا رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ کچھ کوششوں کے بعد تایا جان نے بھی صبر کر لیا تھا لیکن انہوں نے اپنے حالات بہتر ہونے کے بعد وہ رقم کہیں انویسٹ کر دی تھی اور اس کا منافع جمع کر کے رکھا تھا۔ ان کی نیت تایا کو ہر حال میں وہ رقم مع منافع لوٹانا تھی۔ جب انہوں نے یک مشت اچھی خاصی رقم دی تو ان سب کی زندگی کی ڈوبتی کشتی کو نئے مضبوط چپوار مل گئے۔ اس انویسٹمنٹ سے اب بھی ماہانہ ایک اچھی خاصی رقم خالہ کو ملتی تھی۔

''اللہ کی مصلحتیں ہم کبھی نہیں سمجھ سکتے۔'' پہلی بار رقم بینک اکاؤنٹ میں آنے کے بعد خالہ نے آنسوؤں کے درمیان کہا تھا۔

''اتنے سال انہوں نے پلٹ کر پوچھا نہ یاد کیا ہم تو ان پیسوں پر کب کی فاتحہ پڑھ چکے تھے اور اب دیکھو انہیں علم ہوتے ہی کیسی بروقت مدد ہوئی ہے ہماری، ان کی سمجھ داری نے ہمیں لمبے وقت کے لیے کس قدر بےفکر کر دیا ہے۔ جس دن وہ پیسے لوٹانے کے قابل ہوئے تھے اسی دن انہوں نے وہ رقم انویسٹ کر دی تھی اور منافع بھی جمع کرتے رہے تھے ورنہ وہ اصل قرض تو آج ہمارے کسی کام کی نہ تھا۔''

''لیکن اتنے سال وہ کہاں تھے؟''

''وہ کہہ رہے تھے انہوں نے کئی لوگوں سے تمہارے تایا سے رابطے کا کہا تھا، نمبر اور پتہ مانگا تھا لیکن کسی نے دیا نہ انہیں بتایا کیونکہ قرض کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا، اب کسی طرح ان کی وفات کا پتہ چلا تو وہ خود ملنے آ گئے بلکہ اللہ نے ہم تک پہنچا دیا انہیں۔''

نانا کے جاتے ہی دونوں ماموؤں کو گھر میں اپنا حصہ چاہیے تھا۔ وہ مکان فروخت کرنا چاہتے تھے لیکن خاندان کے چند با اثر افراد نے مداخلت کی اور انہیں بہنوں کو ان کا حصہ دینا پڑا۔ ان کی بدولت وہ سب سر پر چھت کی فکر سے آزاد تھے۔ یک مشت ملی رقم سے انہوں نے گھر کی مرمت کی تھی، کچھ اضافی کام کروایا تھا۔ سمیر کی فیس اور کتنے ہی کام ہو گئے تھے۔ سب سے بڑھ کر اس کی امی کو وہ آرام دہ اور بہترین جگہ رکھ پایا تھا۔

☆☆☆

وہ کھڑکی میں کھڑی تھی کہ اس کی سہیلی کا فون آ گیا جسے مازن کے آنے کے بعد اس نے جلدی جلدی نپٹایا تو بھی دس بارہ منٹ ہو گئے تھے۔ وہ کتابیں اٹھا کر نیچے آئی اور دروازے میں ہی رک گئی۔

مازن صوفے کی پشت پر سر گرائے سو گیا تھا۔ آہٹ پر اس کی نیند نہ ٹوٹے اس خیال سے اس نے سانس بھی روک لی تھی پھر دبے پیر چلتی صوفے کے پیچھے گئی۔ اس کا سرخ چہرہ تھکا تھکا سا تھا۔ اسے دیکھ کر احساس ہو رہا تھا کہ اسے بخار تھا۔ بے اختیار اس کے ماتھے کی طرف جاتا ہاتھ درمیان سے ہی اس نے واپس کھینچ لیا۔ وہ اس کے چھونے پر جاگ جاتا تو۔

''کیا کروں؟'' وہ کتنی ہی دیر اسے دیکھتی اور سوچتی رہی پھر کیا کروں کا جواب ملنے پر باہر چلی گئی۔ شکر تھا کہ عظمٰی اس وقت اپنی دوستوں کے ساتھ لان میں تھیں۔

بے آرامی کے احساس سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے سر اٹھایا تو درد کی لہر نے گردن پر ہاتھ رکھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ گردن سہلاتا سیدھا ہوا ہی تھا کہ ایک دم تھم گیا۔ وہ شال اوڑھے ہوئے تھا۔ اس نے آہستگی سے شانے سے شال اتاری اور گھڑی میں وقت دیکھا۔ اسے یہاں آئے تیس منٹ سے زیادہ ہو گئے تھے۔

''اور ان تیس منٹوں میں کیا ہوا ہے؟'' اس نے

شال صوفے پر رکھتے ہوئے سوچا۔

تبھی دروازے میں سارہ نمودار ہوئی۔ وہ اسے جاگتا دیکھ کر رک گئی پھر ساری ہمت مجتمع کر کے آگے بڑھی۔ قریب آ کر اس نے ٹرے میز پر رکھ دی جس میں چائے کا مگ، بسکٹ، پانی کا گلاس اور کروسین کا پتا تھا۔

"سوری۔" مازن سیدھا ہوا اور میز پر رکھی کتاب کھولنے لگا۔ کبھی کبھی مزاج اور آرزو کے برعکس کرنا جتنا ضروری ہوتا ہے اتنا ہی مشکل بھی۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے آپ ٹیبلیٹ لے لیں۔" سارہ نے چائے کا کپ اٹھا کر اس کی سمت بڑھایا۔

"لیکن پہلے کچھ کھالیں۔" مازن نے اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لے لیا اور سارہ کو یقین نہیں آیا۔ اس کا دل اس چھوٹی سی پہل پر ہی خوشی سے معمور ہو گیا تھا۔

"میں ایویں ہی ڈرتی رہتی ہوں۔" اس نے ایک دبی سی مسکراہٹ کے ساتھ سوچا۔

مازن نے کپ واپس ٹرے میں رکھا اور ایک گولی نکال کر پانی سے نگل لی۔ سارہ کو لگا وہ رونے لگے گی۔ ایسا بھی کوئی کرتا ہے۔ لمحے میں ساری دنیا مٹھی میں تھما دے اور اگلے پل وہی مٹھی کھول کے ہتھیلی پلٹ دے۔

"تھینک یو۔" اس نے گلاس رکھ کر ٹرے میز کے کنارے سرکائی اور لیپ ٹاپ آن کیا، قلم ہاتھ میں لے کر بیاض کھول کر اس کے سامنے رکھی۔

"ظالم!" اس نے آنسوؤں کا رخ اندر کی طرف موڑ دیا۔

"شروع کریں؟" نصابی کتاب کے اوراق الٹ پلٹ کر کے آخر میں وہ صفحہ کھول کر غور سے دیکھنے لگا جو آج اسے پڑھانا تھا۔

"آج چھٹی کر لیں؟" اس نے عاجزی سے سوال کیا۔ وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔

وہ کم ہی اس کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی کبھی اسے یہ عادت اچھی لگتی کہ اس طرح وہ جی بھر کے اسے دیکھ پاتی تھی۔ اس کے پاس اس جی بھر کے دیکھنے کے علاوہ اور کچھ تھا بھی تو نہیں۔

"نہیں۔" اس نے نرمی سے کہا۔

آپ نے جس ترغیب سے بچنے کے لیے احتیاط کا دامن تھاما ہو اور وہی تحریص مجسم مقابل آجائے۔ یہ بھی ایک قیامت ہوتی ہے۔ مازن اسی سے گزر رہا تھا۔

چالیس منٹ بعد جب وہ دونوں اپنی چیزیں سمیٹ رہے تھے تبھی سعادت حسین چلے آئے۔

"کیسی چل رہی ہے پڑھائی؟" انہوں نے کسی ایک کو مخاطب کیے بنا سوال کیا۔

"اتنی اچھی کہ پاس ہو جاؤں گی پاپا!" وہ چہک کر آگے بڑھی اور ان کا بازو تھاما۔ اس کے انداز میں اتراہٹ تھی۔

مازن نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ اس کے سامنے سنجیدہ، کم گو اور دروں شغف محسوس ہوئی تھی۔ اس کی سعادت حسین سے کئی بار ملاقات ہوئی تھی لیکن وہ تینوں بیک وقت ایک ساتھ پہلی بار ملے تھے۔

"ماشاءاللہ۔" وہ مسکرائے۔

"تھینک یو بیٹا۔" ان کے لہجے میں وہی دائمی شفقت اور ملائمت تھی۔

وہ اس کے دوست ظفر کے ابا کے دوست تھے۔ اسی نے مازن کو بتایا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے لیے ٹیوٹر ڈھونڈ رہے ہیں۔ جتنی اور جہاں سے اضافی آمدنی مل سکتی تھی وہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس نے خود سے اس کا اظہار نہیں کیا تھا نہ کبھی نور افروز نے ذکر چھیڑا تھا پھر بھی اس کی کوشش ہوتی تھی کہ اپنی تنخواہ کے علاوہ اتنی رقم مزید گھر پر خرچ کرے جو ہر ماہ اس کی امی کی دیکھ بھال کے لیے نرسنگ ہوم میں لگتی تھی۔

"سارہ کے بنا کسی سیلی کے پاس ہونے کا کریڈیٹ آپ کے نام ہوگا۔" ان کی بات پر وہ بس

مسکرا دیا۔

''اگر آپ کے پاس وقت ہے تو میرے ایک دوست بھی اپنے بیٹے کے لیے ہوم ٹیوشن چاہتے ہیں۔''

''ابھی وقت فی الحال تو نہیں ہے سر لیکن مس سارہ کے ایگزامز کے بعد ہوگا۔''

''میں اسے آپ کا نمبر دے دیتا ہوں، آپ دونوں فون پر بات کر لیں تو بہتر ہوگا۔''

''جی بہتر۔''

''آیئے آج ڈنر ہمارے ساتھ کریں آپ بھی۔'' انہوں نے دعوت دی۔

''بہت شکریہ سر لیکن میں اب جاؤں گا۔''

''چلیں کوئی بات نہیں لیکن کسی دن وقت نکالیے ہمارے لیے بھی۔'' انہوں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور سارہ کو اپنے پاپا پر بڑا پیار آیا۔

☆☆☆

اس کا گھر جانے کا ارادہ نہیں تھا تبھی وہ اپنے کزن اور جگری دوست اور کزن یامین کی طرف جانا چاہتا تھا لیکن جب یامین کے والد عدیل انکل کا فون آیا کہ امریکہ سے ان کی بھتیجی آئی ہے اور اسے رات کا کھانا ان کی طرف کھانا ہے تو وہ حسب دستور انکار نہیں کر سکا۔ کچھ عرصے سے وہ اپنے گھر سے زیادہ آرام وہ اس گھر میں اور اس گھر کے مکینوں کی صحبت میں ہوتا تھا۔ خاص طور پر انکل عدیل کی صحبت میں۔

اس نے سارہ کے فون پر پیغام بھجوا دیا کہ وہ کھانے پر اس کا انتظار نہ کرے۔

''آج مما پاپا بھی کہیں انوائٹ ہیں، میں اکیلی تھی۔'' اس نے بسورتی ایموجی کے ساتھ جواب دیا اور اسے افسوس ہوا۔ وہ اب سب کے ساتھ میز پر بیٹھ چکا تھا ورنہ کسی طرح معذرت کر کے اٹھ جاتا۔

''سوری یار! کل تمہاری فیورٹ جگہ ڈنر پکا۔''

''او کے۔'' وہ خوش ہوگئی۔

کھاتے ہوئے باتوں کے دوران صبور نے کہا کہ اپنے قیام کے دوران وہ اردو سیکھنا چاہتی ہے۔

والدین کی مادری زبان تھی سو وہ سمجھ اور بول لیتی تھی لیکن لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھی۔

''تم اپنے سرکل میں پوچھنا کوئی اردو پڑھانے والا جان پہچان کا مل جائے تو اچھا ہوگا۔'' انکل عدیل نے کہا تب اسے یاد نہیں آیا تھا لیکن گھر لوٹتے وقت ایک موڑ کاٹتے ہوئے یکا یک اس کے تصور میں وہ ذہین آنکھیں جھلملانے لگیں اور اس نے اسی وقت دشمن کو قریب تر رکھنے والے مقولے پر عمل کا فیصلہ کر لیا۔

وہ پہنچا تو گھر کی بقیہ کاریں کھڑی تھیں جس کا مطلب تھا کہ عظمیٰ اور سعادت حسین واپس آ گئے تھے۔ وہ دبے قدموں سے ڈرائینگ روم میں آیا اور اپنے کمرے میں جانے کے لیے راہ داری میں قدم رکھا ہی تھا کہ اوپر دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور کوفت پر قابو پانے کی کوشش کی۔

''کہاں تھے اتنی دیر تک؟'' ریلنگ کے پاس آ کر عظمیٰ نے پوچھا۔ ساری احتیاط اور جھنجھلاہٹ فضا میں تحلیل ہوگئی کہ سوال ماں کی طرف سے آیا تھا۔

''بوڑھی ماں کا خیال کر کے ہی جلد اٹھ جایا کرو۔'' وہ ان کے انداز پر مسکرا دیا۔

''کم سے کم ایسے ہی کچھ دو چار بنے ہوں آپ کے دشمن۔''

''آپ کے دشمن ہی کیوں ہونے لگا!''

''ایسے ہینڈسم جوان بیٹے کی ماں کے دشمن تو لگی پیدا ہو جاتے ہیں بیٹا!''

''یعنی اب میں ہینڈسم بھی نہ لگوں؟'' وہ اسے اپنی جون میں لے ہی آئی تھیں۔

''اس کے لیے تمہیں ایفرٹس کی ضرورت ہی کہاں ہے۔''

''اُفف!'' یہ لفظ اس کی زبان سے ان کی باتوں پر ہی نکلتا تھا۔

''دوستوں کے ساتھ تھا۔''

''کھانا کھایا یا بس کولڈ ڈرنکس پر گزارا کر کے

سونے جارہے ہو؟"

"پراپر ڈنر کیا ہے آج۔"

"اب سو جاؤ، ٹی وی لگا کر مت بیٹھ جانا، الیفرٹس کی نہ سہی لیکن بیوٹی سلیپ کی ضرورت سب کو ہوتی ہے۔"

"یس مما۔ آپ بھی سو جائیں۔" وہ ہنس پڑا تو وہ بھی ہنستی ہوئی چلی گئیں۔

"شریف بیٹا ہے تمہارا، اس کے لیے جاگا نہ کرو۔" ان کے کمرے میں آتے ہی سعادت حسین نے عینک نکالی اور کتاب بند کر کے رکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹا نہیں جگاتا ممتا جگاتی ہے۔" وہ سلیپر پیروں سے نکال کر بستر پر لیٹتے ہوئے گویا ہوئیں۔

"اور ہمیں بیگم کی محبت۔" سعادت حسین نے ٹیبل لیمپ بند کیا اور خود بھی لیٹ گئے۔

"مجھے کئی دن سے حارث الجھا ہوا اور دور لگ رہا ہے۔" انہوں نے شوہر کی سمت کروٹ لی۔

"نیا کام ہے وہ بھی اپنے بل بوتے پر، تھوڑا بہت اسٹریس تو ہوگا۔"

"مجھے نہیں لگتا اس کی وجہ کام ہے۔" وہ سنجیدہ تھیں۔

"کیوں؟"

"میں شاید وضاحت نہ کر سکوں مگر بعض اوقات وہ جب ہم سب کے ساتھ ہوتا ہے تو لگتا کے کچھ ہولڈ بیک کر رہا ہے، خود پر کنٹرول کرتا محسوس ہوتا ہے۔"

"تم اسے لے کر زیادہ ہی حساس ہو رہی ہو۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اب اس کی فکر اور ذمہ داری کسی کو سونپ دو۔" انہوں نے عظمیٰ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"شاید ایسا ہی ہے۔" یہ مانتے ہوئے وہ خود کو یقین دلانا چاہتی تھیں۔

حارث بستر پر لیٹا تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اسے یاد نہیں اس کی عمر کیا تھی جب بڑے پیار اور سلیقے سے عظمیٰ نے اسے بتایا تھا کہ سعادت حسین اس کے سگے والد نہیں ہے، ساتھ ہی انہوں نے سعادت حسین کی اس کے لیے محبت اور خود حارث کی ان کے لیے انسیت کو بھی بڑے سبھاؤ سے باور کرایا تھا۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ باپ کے خانے میں دوسرے نام کا احساس ہونے پر خود کو تنہا کر کے وہ کسی محرومی کو گلے نہ لگا لے۔ ان کی احتیاط مثبت نتائج کے ساتھ کامیاب رہی تھی۔ ایک دنیا سعادت حسین کی سلجھی، شائستہ، نرم خو اور مخلص طبیعت کی دلدادہ تھی اور اسے تو اپنے باپ سے عشق تھا۔

سب کچھ اس وقت بدلا جب کچھ وقت پہلے عدیل انکل کے ذریعے اسے علم ہوا کہ وہ کئی برسوں سے ایک گھر کی کفالت کر رہے ہیں جہاں دو بیوہ بہنیں اپنے بچوں کے ساتھ رہتی ہیں۔ عدیل انکل نے پزل کے چند ٹکڑے دے کر تصویر اس کے مکمل کرنے کے لیے چھوڑ دی تھی۔

اس کے لیے پہلی چونکانے والی بات یہ تھی کہ سعادت نے یہ سب سے مخفی رکھا تھا۔ ان کا کوئی رشتے دار نہیں تھا یہ سب جانتے تھے اور وہ خاندان دور پرے سے بھی ان کا جاننے والا نہ تھا۔ کئی دن عجیب سی بے یقینی میں گزر رہے تھے۔ عظمیٰ اور سعادت حسین کے بیچ وہ ہم آہنگی اور محبت تھی کہ وہاں کسی راز کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا اور یہی بات سعادت حسین کے خلاف سب سے بڑا گواہ بن گئی کہ وہ کچھ غلط کرتے رہے تھے۔ اب بھی کر رہے تھے، ایسا کچھ جو وہ دنیا اور خاندان کو بتا نہیں سکتے نہ عظمیٰ کو۔ شرافت خلوص اور محبت سے بنا بت کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ وہ رویا، چیخا، ٹوٹا بکھرا اور کسی کو خبر نہیں ہوئی۔ اس کے لیے اپنے فریب کھانے سے بڑا صدمہ عظمیٰ اور سارہ کی بے خبری تھی۔ ان دونوں کا خیال ہی اسے کسی بھی انتہائی قدم سے روکے تھا۔

سعادت حسین کے لیے، اس کے جذبات بدلے تھے تو ماں اور سارہ کے لیے حساسیت اور پروا کئی گناہ بڑھ گئی تھی۔ وہ ان کے چہرے پر پڑا نقاب

اور ان کا فریب عیاں کر کے انہیں دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس کی زندگی کی سب سے اہم اور عزیز دونوں عورتیں اس آدمی سے بے پناہ محبت ہی نہیں کرتی تھیں بلکہ اس پر انہیں اندھا اعتماد بھی تھا۔ جس سے اب اسے دنیا میں سب سے زیادہ نفرت تھی، جو بڑی کمال اداکاری اور اپنی نرم خو اور ہر دل عزیز شخصیت کے پیچھے ایک دوغلی اور مکار شکل چھپائے تھا۔

اسے عدیل انکل نے بتایا تھا کہ امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے گئی عظمیٰ کو وہاں حمید رحمانی سے محبت ہوگئی تھی اور وہیں ان دونوں نے شادی کرلی۔ اس بات پر نانا ان سے ناراض تھے۔ کچھ وقت بعد بیٹی کی ازدواجی زندگی میں مسائل سر اٹھانے لگے تو محبت کرنے والے نانا، تڑپ کر بیٹی کی مدد کو دوڑے۔ ان کے ساتھ سعادت حسین بھی امریکہ گئے تھے جو ان کے یتیم و لیسر بھتیجے تھے۔ کئی ماہ بعد جب وہ واپس آئے تو پتا چلا کہ عظمیٰ کی پہلی طلاق کے بعد، ان کی سعادت حسین سے شادی ہوئی ہے۔ کچھ وقت بعد سعادت حسین اور عظمیٰ بھی واپس آگئے اور تب پہلے بھی ملازم رہے سعادت حسین، نانا کے کاروبار کے تنہا مالک ہو گئے تھے۔

وہ جانتا تھا اس گھر میں دو بیوہ بہنیں، ان کے بچے رہتے ہیں جن میں ایک بیمار بہن اسپتال میں ہے۔ اسی گھر کی ایک خاتون کے اکاؤنٹ میں ہر ماہ ایک خطیر رقم جمع ہوتی تھی۔ سوچیں کڑی سے کڑی جڑ کر زنجیر بنا رہی تھی وہ اس کے گلے میں تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا لیکن اب خیال اور قیاس بے لگام ہو گئے تھے۔

☆☆☆

آواز پر اس نے فون سیدھا کیا۔ اور وہاں "گلے پڑی نیکی" لکھا دیکھ کر ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"کال کس لیے جب کہہ دیا ہے فوراً نہیں لوٹا سکتی۔" اس نے فون ہاتھ میں لیا۔

"فلرٹ کے لیے لوگ کس حد تک چلے جاتے ہیں۔" اس نے دوسری طرف والے بندے کی طبیعت صاف کرنے کی نیت سے ہرے دائرے پر انگلی پھیر کر فون کان سے لگایا۔

"آپ نے کہا تھا رقم فوراً اور یک وقت نہیں لوٹا سکتیں۔" ادھر سے کسی دعا سلام کی بجائے سیدھے بات شروع ہوئی تھی۔

"آپ کے لیے میرے پاس ایک پرپوزل ہے جس کے بعد، آپ کو پیسے ریٹرن نہیں کرنے پڑے گے۔" عدیمہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ اس کے سرد سے لہجے پر توجہ دیتی تو شاید سوچ اس نہج پر نہ جاتی۔

"آپ کو دو ماہ کے دقفے میں اردو سکھانی ہوگی، پڑھنا اور لکھنا بھی۔" شکر تھا کہ وہ اسے موقع دیے بنا اور رکے بنا اپنی کہے جا رہا تھا۔

"کسے؟" طیش کا پارہ نیچے اترا تھا لیکن صفر کو چھونا باقی تھا۔

"ایک مہمان ہے جو امریکہ سے آئی ہیں، انہیں اردو سیکھنے کا شوق ہے، اس اماونٹ کو آپ ایڈوانس فیس سمجھ لیں۔" یہ اس کے لیے خوش خبری تھی لیکن وہ الجھ گئی۔ راہ چلتوں کے اچھے اعمال یوں دوسرے کو نیک بنانے لگے تو دنیا مثالی نہ ہو جائے! آخر اسے نیکی میں وہ بھی اس سے نیکی میں کیوں اتنی دلچسپی تھی؟

"ویسے دو ماہ لکھنا پڑھنا سکھانے کے لیے کم ہے۔" بہر حال اسے یہ قرض اتارنا تھا اور پس پردہ وجہ جو بھی ہو یہ پیشکش اس کے لیے غیبی مدد ہی تھی۔

"مجھے گھر سے کتنا دور جانا ہوگا اور وہاں کتنا وقت دینا ہوگا؟ میری گھر پر بھی ٹیوشنز ہوتی ہیں۔ اس نئے کام کے لیے میں اپنے پرانے کمٹمنٹس نہیں توڑ سکتی۔" اس کا پیشہ ورانہ انداز حارث کا حلق کڑوا کر گیا۔ اس کی جگہ نقصان کی تلافی کرتے ہوئے اسے عدیمہ سے احسان مندی یا تشکر کی خواہش نہیں تھی لیکن اب جانے کیوں وہ اسے رہینِ منت، مقروض اور مغلوب دیکھنا چاہتا تھا۔

"آپ کو پک اینڈ ڈراپ کی سہولت حاصل

ہوگی، ٹائم کتنا دینا ہے وہ آپ خود ڈیسائڈ کریں۔"
اس کا انداز بھی عدیمہ سا ہو گیا۔
"میں ٹائمنگ شام تک میسج کرتی ہوں۔" کچھ پل سوچنے کے بعد وہ مان گئی۔
اسے کسی طرح ان پیسوں کا حساب برابر کرنا تھا۔ زیادہ گہرائی تک سوچنے کا فائدہ کچھ نہ تھا۔ دو مہینے یعنی ساٹھ دن کی ہی تو بات تھی۔
"اوکے۔" حارث نے فون رکھ دیا۔ وہ اٹھ کر باہر آ گئی۔
"امی! میری ایک سہیلی کے جاننے والے ہیں ان کے یہاں ایک خاتون کو اردو سیکھنا ہے جو دو مہینے کے لیے امریکہ سے آئی ہیں۔ میں نے اسے ہاں کہہ دیا ہے۔"
"فیس کتنی دیں گے؟" سوال ثوبیہ کی جانب سے آیا جو میڈیکل انٹرنس میں ایم بی بی ایس میں داخلے کے لیے ضروری نمبر حاصل کرنے میں ناکام ہونے کے بعد دوبارہ انٹرنس کی تیاری کر رہی تھی۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ فیس کے متعلق گھر والے تو پوچھیں گے۔
"میں نے ابھی کچھ کہا نہیں ہے، پہلے مل کر دیکھ لوں انہیں تھوڑی بہت اردو آتی بھی ہے یا بالکل کوری ہیں، پھر ٹائمنگ اور فیس طے کروں گی۔"
"آنے جانے کی سہولت دے رہے ہیں، یہ اچھا ہے۔" نورافروز نے کہا۔
انہیں اطمینان ہوتا تھا جب وہ مصروف رہتی۔ اسے خالی سوچوں میں گم دیکھ کر انہیں بے چینی گھیر لیتی تھی۔ ان کی لاپروائی اب عمر بھر کا احساسِ جرم بن گئی تھی۔ بچپن میں تیز رفتار رکشا نے اسے اس زور سے ٹکر ماری تھی کہ وہ دور جا گری تھی۔ اسے کافی چوٹیں آئی تھیں۔ خراشوں، زخموں اور جگہ جگہ درد کے ساتھ اس کا بایاں پیر شدید متاثر ہوا تھا۔ وہ اسے مقامی ڈاکٹر کے پاس لے گئیں جس نے مرہم پٹی کے بعد درد کے لیے دوائیں اور زخموں کے لیے مرہم دیا تھا۔

اس کے بعد جب اسے پیر میں تکلیف ہوتی وہ اسے وہیں لے جاتی رہیں۔ ہر بار درد کی گولیوں سے افاقہ ہو جاتا تھا۔ ثوبیہ اور کبیر چھوٹے تھے، ان کا زیادہ وقت ان دونوں پر اور اپنی سلائی پر خرچ ہوتا تھا۔ بے شمار فکریں تھیں اور ان کا ذہن اور زندگی اہم ضروریات پوری کرنے کی تگ ودو میں مصروف رہتے تھے۔ ایسے میں جب وہ بار بار پیر کے درد کی شکایت کرتی تو انہیں غصہ آ جاتا تھا۔
"تم بچی نہیں ہو عدیمہ، ذرا سہنے کی عادت ڈالو، دیکھتی نہیں ہو میں پہلے ہی کتنے جھمیلوں میں الجھی رہتی ہوں۔ اس پر توجہ نہیں دو گی تو محسوس بھی نہیں ہوگا۔ سارا وقت پیر پیر کی رٹ لگائے رکھتی ہو، میرے پاس وقت نہیں ہوتا کہ ہر دوسرے دن تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں۔ درد ہوتا ہے تو گولی لے لیا کرو۔ اتنا تو تم سے چھوٹے بہن بھائی نہیں ستاتے جتنا تم نے تنگ کر رکھا ہے۔" اپنے حالات کا سارا غصہ وہ اس پر نکال دیتی تھیں۔
"بچی کو تکلیف ہوتی ہے تب ہی کہتی ہے آپا، یوں ڈانٹا نہ کریں۔" نورافشاں اسے گلے لگاتیں۔ پیر کو گرم پانی سے سینکتیں تو کبھی نیم گرم تیل کی مالش کرتیں۔ وہ اس کی امی سے مختلف مزاج رکھتی تھیں۔
عدیمہ نے بھی گولیاں پھانکنے کی عادت ڈال لی۔ جب ایک دن اس سے برداشت نہ ہوا اور وہ رو رو کر ہلکان ہو گئی تو نورافشاں، اسے بڑے اسپتال لے گئیں۔ وہاں تفتیش کے بعد علم ہوا کہ اس حادثے میں ٹوٹی ہڈی اس درد کی وجہ ہے اور اب اتنا وقت گزرنے اور پیچیدگیوں کی وجہ سے وہ جراحت سے ہی ٹھیک ہوگی۔ انہوں نے جو علاج بتایا وہ اس کے اخراجات اٹھانے کے قابل نہیں تھے۔ وہ دونوں بڑے اسپتال سے دوائیاں اور ہدایات لے کر لوٹ آئیں۔
کچھ دن کی خاموشی کے بعد عدیمہ نے مان لیا یہ اس کی زندگی کا حصہ ہے اور اسے عمر بھر اس ٹوٹی ہڈی کے ساتھ ہی جینا ہوگا، جو بے توجہی سے نالاں

ہو کر غلط جگہ اڑ گئی تھی اور اب بضد تھی کہ آپریشن تھیٹر میں اس کی ناز برداریاں اٹھا کر، اسے مال سمان سے درست جگہ بٹھایا جائے۔ ان مدارات کا کسی کے پاس وقت تھا نہ وسائل۔ وہ قصداً اس انداز سے پیر زمین پر رکھتی اور اٹھاتی تھی کہ درد اور تکلیف نہ ہو اور اس احتیاط اور تبدیلی نے آہستہ آہستہ اس کی چال ہی بدل دی۔ کالج میں آنے تک وہ باقاعدہ 'لنگڑی' کا خطاب حاصل کر چکی تھی۔ حالات بہتر ہوئے، سوچنے کی فرصت میسر آئی تو نور افروز کے اندر بھی جرم اور اپنی کوتاہی کا احساس، باغی ہو کر ان پر تازیانے برسانے لگا۔ مازن کی نوکری کے بعد جب انہوں نے اس کے علاج اور جراحت کا ذکر کیا تو عدیمہ نے منع کر دیا کہ اب میں بالکل ٹھیک ہوں، مجھے عادت ہو گئی ہے۔ جس نروٹھے انداز میں اس نے کہا تھا نور افروز کے دل پر لگا۔ انہیں لگا اب ان کی بچی ایسے ہی رہ کر انہیں سزا دینا چاہتی ہے۔ اب بھی سب اسے علاج کے لیے راضی کرنے کے لیے کوشاں تھے اور اس کی وہی ضد کہ مجھے عادت ہو گئی ہے۔

شام میں اس نے بتا نور افروز اس ٹیوشن کے بارے میں مازن کو بتا رہی تھیں۔

''کون سی دوست؟ کہاں رہتی ہیں؟'' مازن کے سوال پر اسے گھبراہٹ نے گھیرا۔

''میں نے وہ نہیں پوچھا۔ کالج کی کوئی سہیلی ہو گی، شاید ارم ہو اسی کے رشتے دار امریکہ میں ہو سکتے ہیں۔'' ارم اس کے حلقہ احباب میں سب سے امیر تھی۔

''اچھا۔''

چند ماہ پہلے کا سے ہوتا تو مازن لازمی اس سے مکمل تفصیل حاصل کرتا لیکن نور افروز کی خواہش کے بعد ان دیکھی دیوار تھی، زندگی میں پہلی دفعہ ان کے مابین جھجک تھی۔ پہلی بار اس صورت حال پر اس کے اندر اطمینان سا ابھرا۔

اس کے پاس ٹیوشن کے بچے دو پہر میں آتے تھے۔ اگر وہ اس سے پہلے کا وقت منتخب کرتی تو وقت پر گھر واپس لوٹنے کی فکر سوار رہتی اور اسے گھڑی کی سوئی دیکھ کر کام کرنا پڑتا کہ دیر کی صورت میں بچے نہ ثوبیہ کے قابو میں آتے تھے، نہ نور افروز کے لہٰذا اس نے مغرب کے بعد جانے کا ارادہ کیا اور حارث کو اطلاعی پیغام بھیج دیا۔ ادھر سے اوکے لکھ کر بھیجا گیا۔

☆☆☆

''کہیں وہ ہی پک کرنے نہ آ جائے۔'' عدیمہ نے آئینے میں آخری جائزہ لیتے ہوئے سوچا۔

''آ بھی جائے تو کیا اونہہ!'' اپنا خدشہ اسے ہی برا لگ گیا۔

اس نے پرس میں اردو کا ابتدائی قاعدہ اور پہلی جماعت کی کتاب رکھی، جو ٹیوشن والے بچے سے ادھار لی تھی۔

''آج پہلا دن ہے تو پتا نہیں کب تک آؤں گی۔ فون کروں گی وہاں سے نکلوں گی تب۔'' باہر آ کر وہ نور افروز سے بات کر رہی تھی کہ باہر سے کار کا ہارن سنائی دیا۔ اس سے پہلے ثوبیہ دروازے کی طرف دوڑی۔

''آپ کی ہی کار آئی ہے۔'' دروازے سے جھانکنے کے بعد اس نے وہیں سے پیچھے منہ کر کے اطلاع دی۔ وہ آگے آئی اور دروازے کے باہر سفید کیٔ نہ دیکھ کر راحت کا سانس لیا۔

پورے پچیس منٹ بعد وہ مطلوبہ مکان تک پہنچی۔ باوردی ڈرائیور نے اس سے ایک لفظ نہیں کہا تھا سوائے گڈ ایوننگ کے۔ اب بھی کار گیٹ کے اندر روک کر وہ اس کی سمت کا دروازہ کھولنے اترا اس سے پہلے ہی وہ یہ کام کر چکی تھی۔ اسے شکریہ کہتے وہ لاؤنج کی سمت بڑھ گئی۔ دور سے ہی اسے شیشے کے اس پار اجنبی چہروں کے درمیان ایک شناسا صورت دکھائی دے گئی تھی۔

حارث نے سب سے اس کا تعارف کروایا۔ نکہت آنٹی، یامین، اس کی بیوی اور صبور جسے اسے اردو سکھانی تھی۔

"یہ مس عدیمہ ہیں، صبور کی اردو ٹیوٹر۔" اس کا تعارف اس نے محتاط سا کروایا تھا۔

صبور اور اسے اوپر صبور کے کمرے میں بھیج دیا گیا تھا۔ جہاں درمیان میں اس کے لیے چائے اور بسکٹ بھی آئے۔ صبور نے کسی ایپ سے سیکھنے کی کوشش کی تھی۔ اسے حروف تہجی کی پہچان تھی، لکھ بھی لیتی تھی لیکن اس کے آگے اسے کچھ نہیں آتا تھا۔ ایک گھنٹہ بعد وہ دونوں باہر نکلیں تو ایک دوسرے سے مطمئن تھیں۔ عدیمہ کوڈر تھا وہ نک چڑھی اور دوسروں کوخود سے کمتر سمجھنے والی، امریکہ پلٹ مخلوق نہ ہو اور وہ ایسی نہیں تھی۔

وہ باہر آئی تو ڈرائیور اس کا انتظار کررہا تھا۔ وہ کار میں سوار ہوتی اس سے پہلے، پیچھے سے حارث نے اسے پکارا۔

"مس عدیمہ!" وہ رک گئی اور پلٹ کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا اس کے پاس آیا۔

"آپ روز اسی وقت آئیں گی؟"

"جی۔" وہ یہ بات صبور سے کر چکی تھی اس لیے دوبارہ اسے بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

"میں نے مس صبور کو ٹائمنگ بتادی ہے۔"

"او کے۔ کیا آپ کو لگتا ہے وہ دو مہینے میں سیکھ جائیں گی؟" حارث کو بھی علم تھا وہ فضول بات کررہا ہے۔ اسے اٹھ کر باہر ہی نہیں آنا چاہیے تھا۔

"جی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"گڈ۔ ڈیلی ساجد آپ کو پک اینڈ ڈراپ کے لیے موجود ہوگا۔ آپ چاہیں تو اس کا نمبر محفوظ کر لیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"او کے جیسی آپ کی مرضی۔" اس نے بڑے تحمل سے انگلش میں کہا اور ہاتھ اٹھا کر اسے آگے جانے کا اشارہ کرتا وہ خود کو کوس رہا تھا۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کی مدد کی تھی، ایک دوسرے میں اچھے احساس جگائے تھے لیکن اب بڑے روکھے اور کھردرے سے انداز میں بات کر رہے تھے۔ کار گیٹ سے نکلنے کے بعد بھی وہ وہیں کھڑا تھا۔ اس کی بے لگام سوچیں بہت دور نکل گئی تھیں۔ اس کی شخصیت کا تاریک پہلو اجاگر ہو گیا تھا۔

"اکیلے کھڑے کیا کررہے ہو یہاں؟" عقب سے یامین کی آواز آئی تو چونکا۔

"تیری کار کا ڈینٹ دیکھ رہا ہوں۔" حارث نے سکون سے کہا اور یامین بھاگتا ہوا اپنی کار کے پاس پہنچا۔ اب کے پیچھے سے حارث کا قہقہہ گونجا تھا۔

☆☆☆

"آئی ہوپ اب کوئی کنفیوژن نہیں ہوگا۔" اس نے لیپ ٹاپ بند کیا۔ قلم جیب میں رکھا پھر بیاض بند کی۔

سارہ کا بس نہیں چل رہا تھا کسی طرح وقت کو روک دیتی، جیسا سائنس فکشن اور فینٹسی فلموں میں ہوتا ہے کہ ہر چیز جہاں کی تہاں رہ جاتی ہے اور دو لوگ متحرک اور متکلم ہوتے ہیں۔ ساری خلقت کی بے خبری میں وہ بھی دل کی باتیں کہہ سن لے تو کیا بگڑ جائے گا!

"اور کچھ پوچھنا تھا؟" اس کی تنکھکی پر نازن لیپ ٹاپ بیگ میں رکھتے ہوئے رک گیا۔ سارہ نے نفی میں سر ہلایا۔ آج اس کی ٹیوشن کا آخری دن تھا۔

"ایگزامز کے لیے آل دا بیسٹ، ایک بار جن پر میں نے مارک کیا ہے وہ ٹاپکس دیکھ لیجیے گا اور پریکٹس مسٹ ہے۔" اس نے کتاب بند کر کے اس کے سامنے کھسکائی۔

"آپ پاپا سے مل کر جاتے وہ آنے ہی والے ہوں گے۔" اس نے اسے کچھ دیر مزید روکنے کا جتن کیا۔ حالاں کہ سعادت حسین اس وقت گھر پر موجود نہیں تھے اور نہ ان کا دفتر سے واپسی کا متعین وقت تھا۔

"میں ان سے فون پر بات کرلوں گا۔" اس نے لیپ ٹاپ رکھ کر بیگ بند کیا اور کھڑا ہو گیا۔ اس

وقت اگر سارہ کو علم ہوتا کہ وہ کس جنگ سے نبرد آزما ہے تو وہ سائنس فکشن اور فینٹسی کی طرح اس متحرک کائنات میں تنہا ساکت و جامد ہستی ہوتی اور ساری خلقت خوشی سے بت بنی سارہ کو دیکھ رہی ہوتی۔

وہ صوفے اور میز کے درمیان سے نکل کر سامنے آیا۔

''اللہ حافظ۔۔'' چہرے کے گرد کھلے بالوں پر جسے سرخ دوپٹے میں اس کے صبیح سے گلابی چہرے کو اس نے اس بیش قیمت منظر کی طرح، ذہن و دل میں قید کیا جسے ہم اپنے بدترین وقت میں حوصلے اور سکون کے لیے آنکھ بند کر کے تصور کرتے ہیں۔

''میری فرینڈ کو بھی اپنے بھائی کے لیے ٹیوٹر چاہیے۔'' وہ آگے بڑھا تو اسے بروقت بہانا سوجھا اور وہ تیزی سے اس کے سامنے آئی۔

''آپ اپنا کانٹیکٹ نمبر دے دیں تو۔'' وہ پس و پیش سے انداز میں یوں گویا ہوئی تھی مانو اپنی خطا کا احساس ہو۔ مازن نے کچھ کہے بنا جیب سے چھولا سا بٹوہ نکالا اور کئی کارڈز کے درمیان سے ایک کارڈ کھینچ کر اس کی طرف بڑھایا۔

''تھینک یو۔'' اس نے کارڈ لیتے ہوئے سوچا اب اور کیسے روکوں؟

مازن دروازے سے باہر نکل گیا تب تک وہ اسی وضع میں، آگے بڑھے ہاتھ میں کارڈ پکڑے تھی جیسے وہ اب بھی سامنے ہو۔ اسے رونا آرہا تھا۔ وہ دھپ سے صوفے پر بیٹھ گئی تب ہی اس کی نظر فرش پر پڑی۔ اس نے جھک کر وہاں نظر آرہی شے اٹھائی۔ وہ شناختی کارڈ تھا۔ وہ مسکرائی کہ وہ جلد ہی مازن سے ملنے والی تھی۔

☆☆☆

وہ اتوار کی چھٹی کرتی تھی باقی دن ڈرائیور وقت پر دروازے کے باہر موجود ہوتا۔ تقریباً روز ہی واپسی میں پورچ میں یامین کے ساتھ حارث بیٹھا ہوتا۔ وہ دونوں شاید دفتر سے سیدھا یہیں آکر دوسرا دفتر لگاتے تھے۔ اسے ان کے پاس سے ہی گزر کر جانا پڑتا تھا کبھی یامین دیکھ لیتا تو وہ سلام کر لیتی۔

حارث کو مانو اس کے باہر نکلتے ہی خبر ہو جاتی تھی۔ اس کی کرسی ایسی جگہ مخصوص تھی کہ وہ شیشے کے پار کمرے سے نکلتے ہی اسے دیکھ لیتا تھا۔ وہ ریلنگ پر ہاتھ رکھ کر دھیرے دھیرے سیڑھیاں اترتی پھر لاؤنج سے گزر کر پورچ تک آتی، کبھی تنہا کبھی صبور کے ہمراہ اور اس سفر میں دو آنکھیں اس کی ہم سفر ہوتیں۔ وہ چند پل جو وہ اس کی نگاہوں کے حصار میں ہوتی، اس کی زندگی کے سارے چھوٹے بڑے حادثوں پر بھاری تھے۔ ان میں اس کے بعد کوئی گفتگو نہیں ہوتی تھی لیکن اسے لگنے لگا تھا ان میں بہت باتیں ہونے لگی ہیں۔

امریکہ سے آئی مہمان سے ملاقاتیوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا لیکن صبور، ایک ڈیڑھ گھنٹا اپنے شوق کے لیے نکال ہی لیتی تھی۔ اس نے کبھی ناغہ نہیں کیا تھا۔ اسے بسا اوقات ان ملاقاتیوں کی ترحم آمیز اور تاسف بھری نگاہوں کو جھیلنا پڑتا تھا۔

آج اسے دیر ہو گئی تھی۔ وہ نورافروز کو فون کرنا بھول گئی تھی۔ ان کی کال آئی تو اسے اٹھنا پڑا۔ زینہ اترتے ہوئے اس نے چور نظر سے سامنے دیکھا وہاں کرسیاں خالی تھیں۔ گھر میں آج مہمانوں کے بچے ادھم مچا رہے تھے۔ نیچے اتر کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ نشست والے حصے میں کافی نئے اور وہی روز والے شناسا چہرے تھے مگر ایک چہرہ کم تھا۔ وہ خود کو سرزنش کرتی باہر آگئی۔ لان میں دائیں طرف بھی کچھ لوگ بیٹھے تھے۔

تنبیہ کے باوجود اس کی آنکھیں ہر چہرے پر ٹھہرتی ناکام لوٹ آئیں۔ اس نے کار کے قریب جانے سے پہلے ایک بار مڑ کے پیچھے بھی دیکھا اور جیسے ہی رخ سامنے کیا ٹھٹک گئی۔ ہوڈی کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کار سے ٹک کر کھڑا وہ اس کی نگاہوں کی تمام کارروائیاں دیکھ چکا تھا۔

وہ رک گئی تھی کہ دروازہ اس کے پیچھے تھا۔

''ایسا کچھ نہیں ہوا جس کے لیے مجھے شرمندہ

ہونا پڑے۔" اس نے گردن سیدھی رکھنے کی سعی کرتے ہوئے خود سے کہا لیکن معمول سے زیادہ جھکتی اٹھتی پلکوں نے سنا نہیں۔ حارث دروازہ چھوڑ کر ہٹ گیا۔

وہ بیٹھی اور کار چل پڑی۔

"مجھے کیا ہو گیا تھا؟" اس نے سرد ہاتھ گالوں پر رکھتے ہوئے سوچا۔

"مجھے کیا ہو گیا تھا؟" وہ بند ہوتے گیٹ کو دیکھ کر سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

آج چھوٹی ممانی ملنے آئی تھیں۔ آخری بچے کو بھی گھر روانہ کرنے کے بعد، وہ ان کے پاس کچھ دیر بیٹھنے کے ارادے سے نور افروز کے کمرے میں جا رہی تھی کہ ان کی بات نے اسے باہر ہی روک دیا۔

"سنبل کی بھابھی اپنے بھائی کے لیے رشتہ دیکھ رہی تھی تو مجھے عدیمہ کا خیال آیا۔"

"سنبل کی بھابھی کون۔ وہ جو مٹ نگر میں رہتی ہیں؟"

"ہاں وہی، دیکھو تمہیں بھی یاد ہے۔" ممانی جانے کس بات پر خوش ہوئی تھیں۔

"بھابھی۔" نور افروز کی آواز میں ہلکی جھلاہٹ اور غصہ تھا۔ وہ آگے کچھ کہتیں اس سے پہلے ہی ممانی گویا ہوئیں۔

"ایک جیسے لوگ ایک دوسرے کو جلد قبول کر لیتے ہیں، وہ سلجھا اور سمجھ دار لڑکا ہے، ملی ہوں کئی بار اس سے میں۔"

"میں آپ کو بتانے ہی والی تھی۔" اور اس کا دل کیا اندر جا کے ماں کے منہ پر ہاتھ رکھ دے لیکن یہ حرکت اسے اور بڑا تماشہ بنا دیتی۔

"عدیمہ کا رشتہ مازن سے پکا ہو گیا ہے، ان شاء اللہ جلد تاریخ بھی رکھ لیں گے۔"

"ہا۔" یہ حیرت جتنی حقیقی تھی اتنی ہی گہری چوٹ عدیمہ کو لگی تھی۔

"مازن مان گیا؟"

"دونوں بچے راضی ہیں۔" نور افروز اپنے مفروضے بھی بڑے یقین سے کہتی تھیں۔

"واہ بھئی ماشاء اللہ ورنہ آج کل کے لڑکوں کا دماغ ساتویں آسمان پر ہوتا ہے انہیں اپنا جوڑا اسی وقت جچتا ہے جب بیوی ان سے زیادہ حسین اور خوبصورت ہو، ہر عیب سے پاک۔" انہیں احساس ہوا تو فوراً بات بدلی۔

"اس میں تمہاری محبت کا بھی بڑا ہاتھ ہے، یا زن اتنی عزت اور مان ایسے ہی تو نہیں دیتا ہے تمہیں، افشاں کے ایکسیڈنٹ اور بیماری کے بعد سے تو بالکل اپنی سگی اولاد کی طرح رکھا ہے تم نے اسے۔"

دل زیادہ بھاری تھا یا اس کے قدم، وہ کسی طرح واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ شکر تھا اس وقت ثوبیہ گھر پر موجود نہیں تھی۔

اس کی ماں نے سارے احسانوں کا خراج لیا تھا مازن سے۔ اس کی شرمندگی اسے اس بارے میں مازن سے بات کرنے سے روکتی تھی۔ کیا کہے گی وہ اس سے کہ مجھے پتا ہے امی نے تمہیں کیسے گھیرا ہے، مجھے پتا ہے تم صرف ان کی وجہ سے چپ ہو، تمہارا اور میرا کوئی جوڑ نہیں، نہ ظاہری طور پر کہ وہ عام سی عیب زدہ لڑکی تھی اور مازن ہر لحاظ سے خوبرو اور دلکش، اور نہ ذہنی و دلی طور پر کہ ان کے احساسات اس رشتے کا سن کر اترائے تھے نہ جذبات ہی چونک کھنک کر اٹھلائے تھے۔ کئی سالوں سے ساتھ رہتے ہوئے وہ چاروں ہی بہن بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے قریب تھے۔

"باہر آپ کی کار ویٹ کر رہی ہے۔" سمیر نے دروازے سے جھانک کر کہا۔ وہ ابھی کالج سے لوٹا تھا۔

"جلدی آ گئی آج۔" وہ جو مغرب کی نماز کے بعد مصلے پر ہی بیٹھی تھی، اٹھ کر تیزی سے تیار ہونے لگی۔ جاتے ہوئے اس نے نور افروز کے کمرے میں جھانک کر ممانی سے دعا سلام کر لی تھی۔

دروازے سے نکلتے ہی سامنے کھڑی 'سفید کیہ' دیکھ کر وہ رک گئی۔ اس نے سوچا تھا بقیہ آنسو آج کار میں پیچھے بیٹھ کر بہالے گی۔ پچیس منٹ کا وقت ضائع کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ جز بز سی وہ پیچھے کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ اس کے سلام کا جواب دے کر حارث نے کار اسٹارٹ کی۔

"ساجد نے کسی میڈیکل ایمرجنسی کی وجہ سے چھٹی لی ہے۔" اس نے اپنی موجودگی کی وجہ بتائی۔

وہ جتانا چاہ رہی تھی کہ کون اسے لینے آیا ہے کون نہیں اس سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے خاموش رہی مگر یہ خاموشی ہی تو "فرق پڑتا ہے" کا اعلان تھی۔

"صبور کی پروگریس کیسی ہے؟" اسے اوراک تھا وہ بیک ویو مرر میں اسے دیکھ رہا ہے۔

"وہ ذہین اسٹوڈنٹ ہیں اور ان میں سیکھنے کی لگن بھی ہے۔" اس نے ایمان داری سے جواب دیا۔ اسے بھولنا نہیں تھا کہ قرض دار وہ اسی کی ہے۔

"کیا آپ اردو سکھانے کا کام آگے بھی جاری رکھنا چاہتی ہیں؟"

"نہیں۔" وہ گردن موڑ کر شیشے کے پار دیکھنے لگی جو اشارہ تھا کہ اس سے مزید بات نہ کی جائے۔

جن آنسوؤں کو 'ذرا ٹھہرو، کچھ دیر بعد بہنے کی پوری آزادی دوں گی' کہہ کر روکا تھا وہ اب مچل رہے تھے۔ ضبط کی وجہ سے وہ بار بار ناک پونچھ رہی تھی اور سوں سوں کی آواز کار میں گونج رہی تھی۔ اس کی سلونی سی ناک اور رخسار پر سرخیوں نے عجیب سی چمک پیدا کردی تھی۔ اچانک سڑک کنارے کار رک گئی۔

"آپ رولیں۔" اس نے چھوٹے سے شیشے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ عدیمہ چپ رہی۔ ذرا دیر بعد سوں سوں کے درمیان عدیمہ کی آواز ابھری۔

"تو آپ باہر جائیں۔"

حارث دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور اس نے سارے بند کھول دیے۔

کچھ دیر بعد اس نے دروازہ کھولا اور کنارے کھڑے حارث کو دیکھا۔

"چلیں۔" وہ اس سے نظر نہیں ملا رہی تھی۔ بقیہ سفر میں وہ وہاں پہنچ کر کہنے کے لیے بھیگے متورم چہرے کا جواز سوچنے کی کوشش ہی کرتی رہی لیکن خیال ہاتھ چھڑا چھڑا کر اسے بیک ویو مرر کی طرف کھینچ رہے تھے جدھر دیکھنے سے اس نے خود کو روکے رکھا تھا۔

وہ جو اس سے کچھ بے تکلف ہونے کا ارادے سے آیا تھا، اب ایک نئے مخمصے میں گھر اتھا۔

☆☆☆

اس نے اتوار کا دن چنا تھا کہ وہ ضرور گھر پر ہوگا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے دروازے پر دستک دی۔ اس کے اندر بار بار ایک تنبیہی آواز اسے خبردار کررہی تھی کہ وہ شاید اب تک اس کے ساتھ جو لحاظ برت رہا تھا آج وہ چھوڑ دے اور اس کے ساتھ بامروت نہ رہے کہ اب ان کے درمیان وہ رشتہ نہیں رہا جو اسے ایک معتبر مقام پر مخصوص انداز میں برتاؤ کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ ہوسکتا تھا وہ آج صاف صاف کہہ دے کہ میں نا سمجھ نہیں، تمہاری بے تکی حرکتیں سمجھتا ہوں اور اب مزید برداشت نہیں کرسکتا۔ اندر باہر ساری آوازیں اور اشارے اسے پلٹنے کو کہہ رہے تھے وہ ان کے آگے ہار جاتی یا انہیں ڈانٹ کر چپ کراتی اس سے پہلے دروازہ کھل گیا۔

"جی؟" سامنے کھڑی سولہ سترہ سال کی ثوبیہ نے فیروزی لباس میں ملبوس، سر پر دوپٹا جمائے کھڑی اس اجنبی اور پیاری لڑکی کو کچھ حیرت اور زیادہ تجسس سے دیکھ کر پوچھا۔

"مازن سیف الدین کا گھر یہ ہی ہے ناں؟" اس نے سوچ رکھا تھا کہ دروازے پر کیا کہے گی، کیسے کہے گی مگر اس وقت اسے وہ سب یاد نہ آیا۔

"جی، مازن بھائی یہیں رہتے ہیں۔" اب کے ثوبیہ کی آواز میں دلچسپی تھی۔

"میں ان سے۔" وہ جھجکتی سی آگے کا مناسب

جملہ سوچنے لگی۔
"آپ ان سے ملنے آئی ہیں۔" ثوبیہ نے چھک کر اس کی ادھوری بات مکمل کی۔
"آیئے ناں۔" پٹ پورا کھول کر اس نے استقبال کا عندیہ دیا۔ وہ پرس کا اسٹرپ مضبوطی سے پکڑے اندر آ گئی۔ اس کا دوپٹا سر سے ڈھلک گیا تھا۔
"مازن بھائی ابھی آئے نہیں ہیں لیکن ان کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ آیئے۔" وہ اسے ساتھ چلنے کا اشارہ کرتی ہال کی طرف بڑھی۔ سارہ نے ایک نظر میں سارا صحن یاد کر لیا۔ پکے فرش کا چھوٹا سا حصہ تھا جہاں چند گملے تھے اور دیوار سے لگ کر الگنی پر اس وقت گہری آسمانی اور سرمگی دو چادریں اور تکیوں کے غلاف پھیلے تھے۔ چھوٹے سے رقبے میں چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔
"کون ہے؟" وہ ہال کے دروازے میں ہی تھیں کہ اندر سے نور افروز کی آواز آئی اور چند پل بعد وہ خود اندر والے کمرے سے نکل کر ہال میں موجود تھیں۔
"یہ مازن بھائی سے ملنے آئی ہیں۔" ثوبیہ نے ماں کو جواب دیا اور فوراً اس کی طرف مڑی۔
"آپ کا نام کیا ہے؟"
"سارہ۔" اس نے مازن کے گھر میں اور بھی افراد موجود ہوں گے، اس نکتے پر توجہ نہیں دی تھی۔ اس کے سوچے سارے منظر اور مکالمے مازن کے ساتھ تھے۔ وہ دستک دے گی، مازن دروازہ کھولے گا اور ان کے درمیان گفتگو ہو گی۔
نور افروز غور سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ سارہ نے انہیں سلام کیا۔ جواب دیتے ہوئے ان کی آواز ہی نہیں چہرہ بھی پر سوچ سا تھا۔
"وہ مجھے ٹیوشن پڑھاتے تھے۔ لاسٹ دن اپنا آئی کارڈ بھول گئے تھے، آج ہی لاسٹ پیپر ہوا ہے تو سوچا ان تک پہنچا دوں۔" ان کی نگاہوں سے گھبرا کر اس نے فوراً آنے کی وجہ بیان کی۔ وہ ساری بات اعتماد سے کہنا چاہتی تھی لیکن اس بودے سے بہانے کی شرمندگی چھپانے میں ناکام تھی۔
"اچھا۔ بیٹھو، مازن تو ابھی آیا نہیں ہے۔ کارڈ دے دو اس کو مل جائے گا۔" وہ جیسے فیصلہ نہیں کر پائی تھیں کہ اسے مازن سے ملنے دیں یا بے مراد ہی لوٹا دیں، ان کا فقرہ اسی گومگوں کی کیفیت کا عکاس تھا۔
"امی! پہلی بار تو مازن بھائی کا کوئی گیسٹ آیا ہے، خاطر مدارت تو کرنے دیں۔ آپ بیٹھیں پلیز۔ میں بھائی سے پوچھتی ہوں وہ کتنی دیر میں پہنچنے والے ہیں۔" ان تینوں میں ثوبیہ کو ہی واضح علم تھا اسے کیا کرنا ہے۔
وہ اسی جھجکے انداز میں صوفے پر ٹک گئی جو دروازہ کھلتے ہی اس پر سوار تھا۔ ثوبیہ صحن سے باورچی خانے میں آئی اور وہاں سے نور افروز کو آواز لگائی۔
"امی!" انہیں لامحالہ باہر جانا پڑا۔ کمرے میں تنہا ہوتے ہی سارہ کا چہرہ اندرونی اضطراب کا آئینہ بن گیا۔ وہ اس سے زیادہ اداکاری نہیں کر سکتی تھی۔
"بھائی فون نہیں اٹھا رہے، بائیک پر ہوں گے۔ آپ پلیز چائے بنا دیں مجھ سے کتنی سڑی بنتی ہے آپ کو تو پتا ہے۔" وہ نمکین اور بسکٹ وغیرہ کا ڈبہ کھول رہی تھی۔
"لیں ثمیر نے کچھ چھوڑا ہی نہیں۔" اس نے باری باری خالی لفافے اٹھا کر دیکھے۔
"چائے بنے گی تب تک میں لے آتی ہوں دو منٹ میں۔" وہ ماں کا جواب سنے بنا ہی دوپٹا سلیقے سے اوڑھتی باہر نکل گئی۔ محلے کی دکان زیادہ دور نہیں تھی۔
نور افروز گہری سوچ میں غرق تھیں۔ اتنے برسوں میں پہلی بار کوئی صنفِ مخالف مازن کے حوالے سے اس گھر میں آئی تھی وہ بھی اتنی حسین جس کا حلیہ اور انداز اس کے طبقے کی نشاندہی بھی کر رہا تھا۔
عجلت میں ثوبیہ نے دروازہ بند نہیں کیا تھا اور مازن کو کچھ دیر بعد پھر جانا ہوتا تھا اس لیے وہ بائیک

باہر ہی کھڑی کرتا تھا۔

وہ پرس گود میں رکھے متذبذب سی پیر کی انگلیاں اور انگوٹھا بھینچ کر کھول رہی تھی۔ دروازے کے قریب صحن میں شو کیبنٹ دیکھ کر اس نے وہیں سینڈل اتار دیے تھے۔ مازن پہلے اجنبی سینڈل دیکھ کر ٹھٹکا تھا لیکن اصل جھٹکا اسے صوفے پر بیٹھی سارہ کو دیکھ کر لگا۔ سارہ اسے دیکھتے ہی بے اختیار کھڑی ہو گئی تھی۔

''کوئی ڈیفیکلٹی تھی تو۔ لیکن پیپر تو ہو گیا ہے۔'' جو پہلا خیال آیا وہی زبان سے ادا ہوا اور سارہ کا دل بجھ گیا۔ وہ اس کے لیے اس کے پاس پڑھنے والی لڑکی سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ وہ اس کے آگے اسے دیکھتا ہی نہیں تھا۔ اسے لگا وہ رونے لگے گی۔

وہ آگے آیا اور شانے پر لٹکا بیگ صوفے کے ساتھ والی کرسی پر رکھ کر اس کے سامنے رک گیا۔ جانے کسی اور نے کبھی اسے شام کے وقت گھر میں دیکھ کر یہ محسوس کیا تھا یا نہیں لیکن اس وقت سارہ نے محسوس کیا کہ دن بھر کی محنت کی گرد سے اٹا، وہ تھکا سا تھا لیکن اس کے انداز سے یہ بھی واضح تھا کہ وہ آرام کے لیے گھر نہیں آیا ہے۔ اس کے انداز میں مشقت کے دوران چھوٹے سے وقفے والی تسلی تھی جس میں کچھ دیر بعد دوبارہ رجوع ہونے کا ادراک بھی شامل ہوتا ہے۔

پڑھاتے ہوئے وہ اسے دیکھنے سے گریز کرتا تھا لیکن اس وقت اسے دیکھنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں سارہ نے پرس کھول کر آئی کارڈ نکالا۔

''یہ صفائی والی ماسی کو ملا تھا۔'' اس نے صفائی سے جھوٹ بولا۔

پہلے دو جھٹکوں سے بڑا جھٹکا مازن کو اب لگا۔ وہ کاغذ کا پرزہ دونوں ہاتھوں سے پکڑے اسے پیش کر رہی تھی۔

''یہ اہم چیز آپ ڈھونڈ رہے ہوں گے یہ سوچ کر میں دینے آ گئی۔'' کبھی کبھی غیر ضروری، غیر اہم، صفائیاں کسی اہم راز کو نہاں رکھنے کے لیے بیان کی جاتی ہیں لیکن اس کی یہ کوشش اب بے کار تھی۔

''آپ مجھے میسج کر دیتیں تو یہاں آنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑتی۔'' مازن نے اس سے آنکھیں ہٹائے بغیر آئی کارڈ اس کے ہاتھ سے لیا اور شرٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

''زحمت تو کوئی نہیں ہوئی مجھے۔'' سارہ نے اسے دیکھا۔

''بیٹھیے۔'' مازن نے کہا اسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کھڑی ہوئی ہے۔

''پیپرز کیسے ہوئے سب؟'' مازن نے پوچھا۔

داخلی دروازہ آواز سے بند ہوا اور پیچھے سے ثوبیہ کی آواز آئی جو صحن سے اسے سلام کرتی باورچی خانے میں چلی گئی۔

''اچھے۔'' اس نے سر ہلایا۔

''آپ کو گھر کا ایڈریس کہاں سے ملا؟''

''آپ نے جو کارڈ دیا تھا اس پر آفس کا ایڈریس تھا۔ میں نے وہاں سے۔'' وہ چپ ہو گئی۔ یہ راز تو تا عمر اس کے اور اللہ کے بیچ ہی رہنا تھا کہ اس نے کیا کیا جھوٹ بول کر اس کا پتا حاصل کیا تھا۔ وہ نہ بھی کہتی تو مازن جانتا تھا دفتر والے آسانی سے اسٹاف کا پتا نہیں دیتے ہیں۔

ثوبیہ ٹرے میں دو کپ چائے بسکٹ اور کپ کیکس رکھ کر لے آئی۔ اس کے پیچھے نور افروز تھیں۔ ثوبیہ انہیں اس کی آمد کا بتا چکی تھی۔ مازن جواب تک کھڑا تھا پیچھے ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ثوبیہ نے پہلے سارہ کو اور پھر مازن کو کپ تھمائے۔

''بہت شکریہ بیٹا جو تم فکر سے کارڈ دینے گھر تک آئیں۔'' نور افروز نے کہا۔

''تم نے بتایا نہیں نہ گھر میں ڈھونڈا کارڈ۔'' انہوں نے رخ مازن کی طرف کیا۔

''مجھے ابھی تک معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ کہیں گر گیا ہے۔''

"پھر تو آپی کا ڈبل شکریہ ادا کریں آپ۔"
ثوبیہ نے مازن کی کرسی کے دستے پر بیٹھتے ہوئے سارہ کو دیکھ کر کہا۔ سارہ سر جھکا کر دھیرے سے مسکرائی، مازن نے اسے دیکھا اور نورافروز نے پہلو بدلا۔

"پیپرز کیسے ہوئے تمہارے بیٹا؟"
"سب اچھے ہوئے ہیں۔"
"آگے بھی پڑھنا ہے؟"
"نہیں آنٹی، اتنا ہی بہت ہو گیا میرے لیے۔" اس نے یوں کہا جیسے کسی گناہ کا اعتراف کر رہی ہو۔
"مطلب بھائی کی ایک ٹیوشن پر مستقل بند۔" ثوبیہ نے چہرے پر مصنوعی تاسف طاری کیا۔
"ویسے بھی شادی کے بعد مازن کے پاس ٹیوشنز کا وقت کہاں ہوگا۔" نورافروز کی بات پر سب کے تاثرات مختلف تھے۔ ثوبیہ جوش میں کھڑی ہو گئی تھی۔ زمان کی نظر بے ساختہ سارہ پر ٹھہر گئی اور سارہ ہونق سی نورافروز کو دیکھ رہی تھی۔
"مازن بھائی کی شادی؟" ثوبیہ کی آواز جوش سے اونچی تھی۔ اسے تو مازن کے حوالے سے ایک پیاری سی لڑکی کی آمد نے ہی بے انتہا خوش کر دیا تھا۔
"ہاں ان شاء اللہ آنے والی چھٹیوں میں مازن اور عدیمہ کی شادی کا ارادہ ہے۔" سارہ کے لیے ہی نہیں اس اطلاع کے لیے ثوبیہ کا دل بھی ہیروشیما ثابت ہوا تھا۔ مازن نے سر جھکا لیا اور ثوبیہ حیرت سے منہ کھولے اس ہٹے کٹے مرد کو دیکھ رہی تھی جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ عدیمہ سے شادی جیسا تعلق کبھی استوار نہیں کرنا چاہے گا۔
"نور آپا!" باہر سے اونچی صدا ابھری۔ انہوں نے اپنا کام کر دیا تھا اس لیے اطمینان سے اٹھ کر باہر چلی گئیں۔
"یہ کب۔؟ اور آپ۔" ثوبیہ مازن سے مخاطب ہوئی پھر سارہ کی موجودگی کے خیال نے اسے روک لیا۔

"یعنی میں اور پیپر ہی بے خبر ہیں۔" وہ پیر پٹختی اندر کمرے میں چلی گئی۔ مازن سے ملنے آئی پہلی لڑکی کو دیکھ کر اس کے اندر جاگی شرارت اور خوشی کی جگہ غصے نے لے لی تھی۔
سارہ کپ میز پر رکھ چکی تھی۔ اس نے ہمت اکٹھا کی اور کھڑی ہو گئی۔
"میں چلتی ہوں۔" وہ اتنی بہادر نہیں تھی کہ آواز کی لرزش پر قابو پاتی۔ مازن بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک بے غیرت آنسو چھلک آیا اور سارہ نے تیزی سے اسے گال پر رگڑ کر فنا کر دیا۔ وہ اس طرح باہر جاتی تو جس داستان کا وجود ہی نہیں تھا اس کا عنوان نورافروز پڑھ لیتیں اور یہ مازن کو گوارہ نہیں تھا۔
"آپ رو کیوں رہی ہیں؟" اسے احساس ہوا کہ نہیں پوچھنا چاہیے تھا لیکن تب تک الفاظ ماضی کا حصہ بن چکے تھے اور سارہ سر اونچا کیے شکوہ بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
"پتا نہیں۔" اس نے اپنی سوگواری چھپائی نہیں تھی۔ زمان کے اندر کوئی کہہ رہا تھا۔
"جانتے تو ہو اس کے آنسو کا سرا تمہاری شرٹ کی جیب میں ہے۔"
اس کی فرشِ چشم پر جمع ہوا نمکین پانی چمک رہا تھا اور مازن کے اندر بے آواز ماتم برپا تھا۔ اس نے اس خوب صورت اور معصوم چہرے سے کئی بار نظریں چرائی تھیں کہ وہ جانتا تھا یہ راستہ اس کے لیے نہیں ہے لیکن خود کو حدود و قیود میں رکھنے کی سعی میں اس نے یہ بھی نظر انداز کر دیا تھا کہ سارہ ان سب سے آزاد ہے۔ وہ اپنے قدم روکنے پر قادر تھا اس کے نہیں۔ اسے تو اب تک یہ اجتناب اپنا مسئلہ لگتا تھا اسے دیر سے پتا چلا تھا کہ اس کمرے میں فعال کوشش یک طرفہ نہیں۔
"آپ اس کا پتا لگانے کی کوشش بھی نہ کریں بس اتنا کریں کہ جس مقام، راستے، انسان اور جذبے سے آنکھوں کے آگے کا منظر جھلملا رہا ہے اس سے کوسوں دور ہو جائیں۔"

"بعض اوقات انسان 'پتا نہیں' اس وقت کہتا ہے جب اسے ایگزیکٹ ریزن معلوم ہوتا ہے، کیا آپ کو یہ بات نہیں پتا؟"

"پتا نہیں۔" مازن کی آواز مازن نے ہی بمشکل سنی تھی اور یہ دھیما سا بے ساختہ صوتی اظہار اسے بھی متحیر کر گیا۔ سارہ کا ڈوبتا دل چونک کر ابھرا۔

"آئی کارڈ پہنچانے کے لیے تھینک یو۔" اس نے سنبھل کر الوداعی کلمات کی طرف پیش قدمی کی۔

"اور رزلٹ کے لیے آل دا بیسٹ۔"

"وہ مجھے مہذب طریقے سے 'گیٹ آؤٹ' کہہ رہے ہیں لیکن ابھی جو..." سارہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور مازن نے نظر چرا لی۔

وہ خاموشی سے دروازے کی سمت بڑھ گئی۔

پڑوسن کو مہمانوں کے لیے نور افروز کا گلاس اور پیالیوں کا سیٹ چاہیے تھا وہ اس کے ساتھ باورچی خانے میں تھیں۔ اسی وقت نیند سے جاگی عدیمہ آنکھیں ملتے ہوئے اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ اس نے ہال سے نکلتی لڑکی کو حیرت سے دیکھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے آ کر رک گئی تھیں۔

"یہ سارہ ہیں جنہیں میں پڑھانے جاتا تھا اور یہ عدیمہ ہے۔" ہال کے دروازے میں کھڑے مازن نے عدیمہ کی سوالیہ نظر کا جواب دیا۔ دونوں نے سر کو خفیف سی جنبش دی کہا کچھ نہیں۔ عدیمہ ایک طرف ہوئی تو سارہ تیز قدموں سے چلتی دروازے سے باہر آ گئی۔

"عدیمہ محض نام نہیں ایک وجود ہے۔" اس کے آنسو گرنے لگے تھے۔

اس کے پیچھے ہال کے دروازے میں کھڑا مازن بھی اس کے پیچھے جانا چاہتا تھا لیکن اس کے قدم حقیقتاً اس گھر کی دہلیز نے پکڑ رکھے تھے۔ عدیمہ باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔ سارہ کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی وہ واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

نور افروز کمرے میں آئیں تو وہ چائے کا آخری گھونٹ لے رہا تھا۔

"چلی گئی؟"

"جی۔ آپ نرسنگ ہوم چلنے کا کہہ رہی تھیں ناں، آج چلیں یا کل؟" اس نے مزید موضوع گفتگو 'اس لڑکی' کو ختم کر دیا۔

"اب تو دیر ہو گئی ہے۔" انہوں نے دیوار پر لگی گھڑی میں وقت دیکھا۔

"کل تم دفتر سے اُدھر ہی چلے جانا میں آ جاؤں گی وہاں واپس ساتھ میں آئیں گے۔"

"جی۔"

"جاؤ، فریش ہو جاؤ، جانے سے پہلے تھوڑا آرام کر لو۔"

وہ اٹھ کر کمرے میں چلا آیا اور شرٹ کی جیب سے کارڈ نکالا۔ اس آئی ڈی کارڈ پر درج معینہ مدت ایک ماہ پہلے ختم ہو گئی تھی۔ کوچنگ سینٹر نے اسے نیا کارڈ دے دیا تھا۔ اسے اس دن بھی لگا تھا کہ کارڈ گرا ہے اور چوں کہ وہ بے کار تھا اس لیے اس نے اسے اٹھانے یا تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس پر تاریخوں کے ساتھ محض اس کا نام اور مرکز کا نام درج تھا اور اس کی تصویر پرنٹ تھی۔ کوئی بھی بندہ جان سکتا تھا کہ وہ کتنا معمولی اور غیر اہم کارڈ ہے۔ اس کا گم ہونا کوئی بڑی بات نہیں تھی اور اس کارڈ کو مالک تک پہنچانے کا تردد تو انتہائی غیر ضروری درد سر لیکن یہ کسی کے لیے نعمت سے کم نہ تھا۔ یہ اس کے لیے ایک آس تھی کہ اس معمولی کارڈ سے کچھ غیر معمولی اخذ کر لیا جائے گا، یہ اگلی ملاقات تک دید کی زادِ راہ باندھ لینے کی سبیل تھی۔

"یہ چند ماہ کی ٹیوشن نہ ہوتی تو بھی کائنات کا نظام چل ہی رہا تھا!" کارڈ پر نظر جمائے وہ جو درہم برہم تھا اس سے نگاہ چرائے کسی اور نظام کو سوچ رہا تھا۔ وہ جو سمجھ رہا تھا کہ خود کو آغاز میں ہی روک لیا ہے اب اس مقام پر کھڑا حیران تھا جہاں اس کی نم آنکھوں پر ضمیر اسے لعنت ملامت کر رہا تھا۔

☆☆☆

ایسی بے قراری اور بے چینی سے پہلی

بار واسطہ پڑا تھا۔ اب تک سب کچھ یک طرفہ ہونے کے باوجود وہ پر امید تھی، آنے والے وقت کو سوچ کر خوش ہوتی تھی، وہ تصور ہی اس کی زندگی کی امنگ بن گیا تھا جب مازن نے اس سے اظہار محبت کرنا تھا اور اس نے اقرار لیکن اب وہ سارے تصور اور خیال جل رہے تھے۔ سب دھواں دھواں تھا۔ وہ تو کسی کا بنا دیا گیا تھا، اس کے مستقبل کے در پر پہلے سے ہی ایک نام کندہ تھا پھر وہ کیوں کہیں اور دیکھتا۔ رائیگانی کا احساس پہلا پہلا تھا، دل لٹا لٹا تھا اور درد حد سے سوا تھا۔

اس کا رونا راز نہیں رہ سکتا تھا اس لیے اس نے آنسوؤں کا رخ، اندر موڑ دیا لیکن رت جگے کی بھی اپنی زبان ہوتی ہے تب ہی ناشتے کی میز پر سعادت حسین نے پوچھ لیا۔

''اب تو ایگزامز کا بوجھ بھی نہیں رہا پھر کیوں میری بیٹی کا چہرہ لٹکا ہوا ہے؟''

''میں ابھی سے بور ہو رہی ہوں پاپا، اس لیے۔'' اس نے منہ بسور کر انہیں یقین دلانے کی کوشش کی۔

''تمہیں مزید اسٹڈیز نہیں کرنی ناں، اپنے پاپا اور حارث کی بزنس میں ہیلپ کرنی ہے اور ایک دن میں بور بھی ہو گئی، آگے کا کچھ تو سوچا ہوگا؟ کارپوریٹ جاب کرنی ہے، اپنا بزنس سیٹ کرنا ہے؟''

''یہ سب بھی نہیں کرنا ہے مما!'' وہ ست سی تھی۔

''تو بس پھر کرنے کو شادی ہی بچتی ہے۔'' عظمٰی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''پہلے بھائی کی تو کریں۔'' اس نے ماں کی بات کو اہمیت نہیں دی۔

''ساتھ ہی کر دیتے ہیں دونوں کی۔'' سعادت حسین نے آسان حل پیش کیا۔

''بالکل نہیں، بھائی کی پہلے کریں مجھے خوب انجوائے کرنی ہے ان کی شادی۔''

''ویسے اٹس ہائی ٹائم کہ اب حارث کی شادی کر دی جائے۔'' سعادت حسین نے بیوی کو دیکھا۔

''وہ مانے تب ناں! فورس فلی تو نہیں کروا سکتے۔''

''حارث سے اس معاملے میں سنجیدگی سے بات کرنے کا وقت آگیا ہے۔ اب اس کی منشاء اور پلان پوچھتے ہیں اور اپنی منشا اور پلان سناتے ہیں کیا خیال ہے؟''

''جی نیک خیال ہے اور ہم بھی آپ کے ہم خیال ہیں۔'' وہ مسکرائیں۔

اسی وقت اس کا فون شور مچانے لگا۔ اس کی سہیلیاں تھیں جو موو ی اور لنچ کے لیے اسے ساتھ لے جانا چاہتی تھیں۔ اس کے مسلسل انکار پر عظمٰی نے مداخلت کی اور اس کی طرف سے انہوں نے ہامی بھر لی۔

''ایک شرط پر۔'' فون رکھ کر اس نے ماں کو دیکھا۔

''میں کار لے کر جاؤں گی، وِدھ آؤٹ ڈرائیور!''

اجازت ہے۔'' انہوں نے نے لب بھینچے اور سعادت حسین نے جواب دیا۔

''تھینک یو پاپا۔''

اس کا من نہیں تھا لیکن اب کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ وہ بے دلی سے تیار ہو کر باہر آئی تو کار کو دیکھ کر آہ بھری۔

''یہ آرزو بھی کس وقت پوری ہوئی ہے!''

وہ ٹھیک ٹھاک ڈرائیو کرتی تھی، لائسنس بھی حاصل کر لیا تھا مگر عظمٰی اسے کار چلانے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ آج کے دن کی یہ ہی اچھی بات تھی کہ اسے ڈرائیونگ کرنے کا موقعہ ملا تھا لیکن اس کے اندر جوش تھا نہ خوشی۔

اس نے ڈرائیونگ نشست سنبھالتے ہی، سیلفی کے ساتھ حارث کو پیغام بھیجا کہ حارث نے ہی اسے ڈرائیونگ میں طاق کیا تھا۔

''فائنلی!''

''کانگریٹس، ٹیک کیئر۔'' ادھر سے ایموجیز کے ساتھ جواب آیا۔

سہیلیوں کے بے فکری سے ہنستے مسکراتے چہرے دیکھ کر اسے، اپنے خالی پن کا زیادہ ہی احساس ہو رہا تھا۔ فلم کے پہلے ہی مغموم منظر پر اس کے آنسو بہنا شروع ہوئے تو پھر آخر تک گرتے رہے۔

''یار ہیپی اینڈ ہوئی ہے اب تو بس کرو۔'' نادیہ نے ٹوکا۔

''مجھے نہیں پتا تھا تم اس قدر سینسیٹو ہو۔'' شرمین کو بھی حیرت تھی۔

''آگے پیچھے کی رو والے بھی تمہاری سوں سوں پر مڑ کر دیکھ رہے تھے۔'' دریہ کے پاس نئی اطلاع تھی۔

''میرے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے اس لیے تو نہیں جاتی مووی دیکھنے۔'' اور کچھ کا پتا نہیں لیکن ایک بات کا اسے یقین ہو گیا تھا کہ محبت نے اسے ماہر جھوٹی بنا دیا تھا۔

سب کو باری باری گھر ڈراپ کرنے کے بعد گھر جاتے ہوئے، جانے کس خیال میں اس نے گاڑی اس راستے پر ڈال لی تھی جس پر مازن کا دفتر تھا۔ وہ علاقہ 'کارپوریٹ ہب' کہلاتا تھا جہاں کثیر منزلہ لمبی چوڑی عمارتیں تھیں۔ جن میں مختلف کمپنیوں کے دفاتر تھے تو کچھ عمارتیں ایک ہی ادارے یا کمپنی کی تھی۔ خود کو سرزنش کرتے ہوئے اس نے گھر کے راستے کے لیے یوٹرن کا سگنل دیا ہی تھا کہ نزدیک سے گزر کر جاتی پہچانی بائیک آگے گئی۔ اس نے سگنل بند کیا اور کار موڑنے کی بجائے آگے بڑھالی۔

''میں یہ کیا کر رہی ہوں؟ یہ پاگل پن ہے، مجھے اس طرح خود پر کنٹرول نہیں کھونا چاہیے۔'' ساری درست باتوں کا ادراک ہوتے ہوئے بھی اس نے کار روکی تھی نہ موڑی تھی۔

شہر سے دور، قدرے سنسان سے علاقے میں ایک جگہ اس نے بائیک ذیلی سڑک کی طرف موڑ دی۔ اس نے بھی تقلید کی۔ کچھ فاصلے پر بڑی سی عمارت تھی جس کے نمایاں الفاظ میں 'نرسنگ ہوم' لکھا تھا۔ اس نے کار روک دی۔ وہ جسمانی طور پر شدید معذور مریضوں کے لیے مختص نرسنگ ہوم تھا، جو خود اپنی دیکھ بھال نہیں کر سکتے یا جن کی دیکھ بھال گھر پر مشکل اور ناممکن ہوتی ہے۔

''یہاں مازن کا کون ہے؟'' اس کی بائیک کچھ دیر گیٹ کے باہر رکی رہی پھر گیٹ کھلتے ہی اندر غائب ہو گئی۔

''اس دن گھر میں کون کون تھا؟ ان کی امی بہن۔ کیا ان کے فادر ہیں یہاں؟'' اس نے اندر کی انسانی جبلت بے دار ہوئی تھی۔ اس لمحے وہ اپنا ورد بھولے اندر کون ہے، اسے کیا ہوا ہے اس کا مازن سے کیا رشتہ ہے میں الجھی تھی کہ فون کی آواز پر وہ چونکی۔ عظمٰی کا فون تھا۔

وہ اس سے واپسی کا ہی پوچھ رہی تھیں۔ پہلی بار اس پر گھبراہٹ سوار ہوئی۔ وہ تنہا بہت دور نکل آئی تھی اور اس کی وجہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتی تھی۔

''ابھی شرمین کو ڈراپ کیا ہے، ایک اور دوست مل گئی تھی راستے میں بس گھر ہی آ رہی ہوں۔'' اس نے انہیں مطمئن کیا۔

اب جلد سے جلد گھر پہنچنا ضروری تھا۔ ویسے بھی وہ نہ اندر جا سکتی تھی نہ وہاں رک کر مازن کا انتظار کر سکتی تھی۔ اس نے بے شمار سوالوں اور الجھنوں کے ساتھ کار موڑ لی۔

نرس نے اس سے رٹی سی بات کی۔ نور افشاں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی بلکہ کچھ پیرامیٹرز تشویش ناک تھے۔ موت جب ایک جھٹکے میں سب کچھ نہ چھین کر آہستہ آہستہ رس چوستی ہے تو پتا نہیں اسے اس کی سفاکی کہنا چاہیے یا رحم دلی۔ عزیزوں کے لیے یہ وقت عذاب بھی ہو سکتا ہے اور انعام بھی۔ یہاں ان سب کو اطمینان تھا کہ ان کی دیکھ بھال بہترین ہو رہی تھی۔ اگر یہی ساکت جامد نور افشاں، گھر میں ہوتیں

تو ان کی زندگیاں درہم برہم اور منتشر ہوتیں۔ لاکھ محبت کے باوجود بھی ایسے مریض کی دیکھ بھال ایک مدت کے بعد بوجھ بن جاتی ہے۔ اگر اتنے سال انہیں گھر میں ان کی نگہداشت کرنا پڑتی تو جانے ان کے رشتے آج کس مقام پر ہوتے۔ اسی لیے وہ اس سہولت کو بہت بڑا احسان اور نعمت مانتا تھا۔

وہ سب ذہنی طور پر کسی بھی انہونی کے لیے تیار تھے پھر بھی نرس کی بات نے اسے اداس کر دیا۔ انسان کتنی بھی کوشش کرلے، کتنا بھی حقیقت شناس بن جائے، وہ اپنوں کی موت کے لیے کبھی تیار نہیں ہو سکتا۔

وہ ان کے کمرے میں آیا اور کھڑکی سے پردے ہٹائے۔ وہ انہیں دیکھ کر مسکرایا۔ خوشی ان کے چہرے پر بھی دکھائی دی۔ یہ اس کی آنکھوں کا بھرم تھا یا واقعی نور افشاں کی سوئی ممتا اسے دیکھ کر جاگ جاتی تھی۔ وہ خود سے حرکت نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ اسٹول پر بیٹھا اور اسٹول کھسکا کر قریب کیا۔

"کیسی ہیں امی آپ؟ گھر میں سب ٹھیک ہیں۔ خالہ آج آنے والی تھیں لیکن عین وقت پر کوئی مہمان آ گیا اس لیے نہیں آ سکیں۔ بمیر کا رزلٹ اس بار بھی اچھا ہے۔ ثوبیہ بھی بہت محنت کر رہی ہے۔ موک ٹیسٹ میں ہر بار اس کے مارکس امپروو ہوتے ہیں۔ ان شاء اللہ اس بار اسے ایم بی بی ایس میں ایڈمیشن مل جائے گا۔ میں نے بتایا تھا نا، عدیمہ بھی ایک جگہ اردو سکھانے جا رہی ہے، وہ ٹیوشن شاید کچھ دن میں ختم ہو جائے۔" ہفتہ بھر کی اہم باتیں سناتے ہوئے وہ رک گیا پھر کہنے لگا۔

"آپ جانتی ہیں ناں، میں بھی ایک جگہ ٹیوشن کے لیے جاتا تھا اب نہیں جاتا، وہاں میں کچھ بھول گیا تھا۔" وہ سوچ کر مسکرایا۔

"اور وہ اسے لوٹانے آئی تھی۔ امی! آپ صحت مند ہوتیں تو میں آپ سے پوچھتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے یا شاید مجھے پوچھنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔" اس نے مغموم دل سے ان کا نحیف اور بے دم سا نخ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

"آپ فکر نہ کریں، میں جانتا ہوں مجھے کیا کرنا ہے لیکن۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔

"یہ پہلے سے بھی مشکل ہے۔ پھر بھی میں سب سنبھال لوں گا۔" یہ خود کو دیا گیا دلاسہ تھا۔ اس نے جھک کر ہڈیوں پر چڑھی جھریوں زدہ سرد جلد پر بوسہ دیا۔

اس نے وہیں مغرب کی نماز ادا کی اور کچھ دیر نور افشاں کے سرہانے بیٹھ کر، اونچی آواز میں تلاوت کرتا رہا۔ وہ جب بھی یہاں آتا یہ اس کا معمول تھا۔

واپسی میں کچھ فاصلے کے بعد سڑک کے کنارے کھڑی کار کے پاس سے وہ زن سے گزر گیا، پھر کسی خیال کے تحت چونکا اور بریک لگائے۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ وہی کار تھی جو اسے سائیڈ ویو مرر میں اپنے پیچھے نظر آ رہی تھی اور جو نرسنگ ہوم کی سڑک پر اس کے پیچھے مڑی تھی۔ چھٹی حس کے اشارے پر وہ یوٹرن لے کر واپس آیا۔

وہ جو اسٹیئرنگ پر سر رکھے آنسو بہا رہی تھی شیشے پر ہوئی دستک پر بری طرح ہڑبڑا گئی۔ سر اٹھایا تو حیرت اور مسرت ایک ساتھ وارد ہوئیں۔ اس نے آنکھیں صاف کر کے شیشہ نیچے کرایا۔

"آپ اکیلی ہیں؟" پہلا سوال آسان تھا۔

"جی۔"

"اس طرف تنہا کہاں آئی تھیں آپ؟" دوسرا سوال کڑا تھا۔ جواب اس نے سر جھکا کر چپ میں لپیٹ کر دیا۔

"کار بند ہو گئی ہے؟" تیسرا سوال دو ٹوک تھا۔

"جی۔"

"آپ نے کسی کو فون کیا؟" چوتھا سوال معقول تھا۔

"نہیں۔" البتہ جواب نامعقول تھا۔

وہ جیب سے فون نکال کر کچھ دیکھنے لگا۔ اسے

احساس ہوا اس نے اب تک دروازہ نہیں کھولا ہے۔
وہ دروازہ کھول کر باہر آئی۔
"میں مما پاپا کو کال نہیں کر سکتی، پہلی بار مجھے ڈرائیو کرنے کی اجازت ملی تھی، میں تب سے بھائی کو کال کرنے کی ہمت جمع کر رہی تھی۔" اس نے منمناتے ہوئے سارے اعتراف کر لیے۔
"وہ آپ کے اب تک گھر نہ پہنچنے پر فکر مند ہو رہے ہوں گے، آپ کو انہیں انفارم کر دینا چاہیے۔"
وہ انگلیاں مروڑنے لگی۔ اچھا خاصا اندھیرا ہو گیا تھا۔
"میں کیا کہوں گی؟"
"آپ کیا نہیں کہنا چاہتیں؟" آج اس کا دوپٹا نما اسٹول گلے میں لٹک رہا تھا، سفید جینز پر گھٹنوں کو چھوتی شیفون کی سرخ اور سیاہ کرتی میں وہ مختلف لگ رہی تھی۔
"جیسی ٹیوشن کے ابتدائی دنوں میں ہوتی تھی۔" اسے خیال آیا۔ اس نے سر اٹھایا تو بغور اسے دیکھتا مازن سنبھل گیا۔
"کہ میں یہاں کیا کر رہی تھی۔"
"آپ یہاں کیا کر رہی تھیں؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ سارہ ذرا دیر ہی ڈٹی رہ سکی پھر آنکھیں بھر آئیں۔ اسے خوار کرنے والا ہی اس سے خواری کی تفصیل کا خواہاں تھا۔
"میں آپ کے پیچھے پیچھے یہاں تک آئی تھی۔" اسے کچھ ایسے ہی جواب کا اندیشہ تھا لیکن جس طرح ضدی سے انداز میں اس نے کہا وہ اسے اچھا لگا۔
کچھ کہے بنا اس نے کال ملا کر فون کان سے لگایا۔ گوگل پر قریبی ورکشاپ دیکھ کر اس نے وہاں دیے نمبر پر فون کیا تھا۔ بات کرنے کے بعد انہیں اپنی کرنٹ لوکیشن بھیج کر اس نے فون جیب میں رکھا۔
"آپ گھر فون کریں اور کہہ دیں کہ لانگ ڈرائیو پر ادھر نکل آئی تھی چاہے تو بتا دیں اس وقت میں آپ کے ساتھ ہوں۔" مازن کی بات پر وہ جواب دیے بنا اسے دیکھے گئی۔
"محبت نے تنہا اسے ہی جھوٹا نہیں بنایا تھا۔"
اس نے پھر سہارے کے لیے تنکے کو تھاما۔
"وہ فکر مند ہوں گے۔" اس کی طویل چپ پر مازن نے پھر کہا تو اس نے سعادت حسین کو فون لگایا۔ اس سے بات کرنے کے بعد انہوں نے مازن سے بھی بات کی۔
"آپ اندر بیٹھیں یہاں کافی مچھر ہیں۔"
فون اسے واپس کرتے ہوئے مازن نے کہا۔
"آپ بھی اندر آ جائیں۔"
"میں یہاں ٹھیک ہوں۔"
"کیا آپ مچھر پروف ہیں؟" وہ بے اختیار مسکرا دیا۔
کچھ دیر بعد وہ دونوں اگلی نشستوں پر بیٹھے سامنے سڑک کو دیکھ رہے تھے۔
"آپ کا وقت ویسٹ ہو رہا ہے، آپ کو کام ہوگا۔"
"اٹس او کے۔" یہ رسمی لفظ سارہ کو اچھے نہیں لگے۔ کچھ وقفے کی خاموشی کے بعد اس نے جھجکتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔
"یہاں کون ایڈمٹ ہے؟"
"امی۔" اس نے فوراً جواب نہیں دیا تھا۔
"کیا ہوا ہے انہیں؟" اس کا لہجہ اور آواز خود بخود پہلے سے زیادہ ملائم اور مہربان ہو گئے تھے۔
مازن نے ایک لمبی سانس اندر کھینچی۔ وہ ونڈ اسکرین کے پار سڑک کو دیکھ رہا تھا۔
"ایک حادثے کے بعد وہ حرکت کرنے اور بولنے سے معذور ہو گئی تھیں، وہ پوری طرح بیڈ ریڈن (صاحب فراش) ہیں۔"
"کیا حادثہ ہوا تھا؟" اس کا سوال بے ساختہ تھا۔ مازن نے جس زخمی نگاہ سے اسے دیکھا وہ شرمندہ ہو گئی۔
"سوری۔" اس نے تیزی سے کہا۔
"میں نے سوچا ہی نہیں وہ یاد اور بات آپ

کے لیے تکلیف دہ ہوگی، رئیلی سوری۔" اس کے چہرے پر ایسا شدید ملال پھیلا کہ مازن کو اپنی ذرا دیر پہلے والی نگاہ پر افسوس ہونے لگا۔

اس وقت وہ دونوں گزشتہ کل نور افروز کی بیان کردہ حقیقت بھول گئے تھے۔ ان لمحوں میں ایک دوسرے کے لیے ان کے احساسات احتیاط اور حدود سے ماورا ہو گئے تھے۔

"وہ چھت پر کپڑے ڈالتے ہوئے نیچے گر گئی تھیں۔" مازن نے آہستہ سے کہا۔ سارہ سے کچھ بولا نہیں گیا۔

"ان کی دو سرجریز ہوئیں، کچھ کامپلیکیشنز ہوئے جن کی وجہ سے وہ کئی ماہ ہاسپٹل میں رہیں ان سب میں ایک سال گزر گیا پھر ہم انہیں گھر لے آئے، ہمیں لگا تھا وہ دھیرے دھیرے بہتر ہونے لگیں گی لیکن۔ وہ 'پی وی ایس' میں چلی گئیں یعنی پرمننٹ ویجیٹیٹو اسٹیٹ۔ اب بس ان سانسیں جاری ہیں اور کچھ نہیں۔"

"اوہ!" اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔ ماں کو اس حالت میں دیکھنا وہ بھی لیے عرصے تک کتنی تکلیف دہ اور مایوس کرنے والی بات تھی۔ اسے خود پر بھی افسوس ہوا جو اس کی زندگی سے باخبر ہونے کی سعی کی جگہ بس اس کی پذیرائی کی منتظر تھیں۔

کئی لمحے کار میں سکوت رہا۔ اچانک اسے یاد آیا اور پھر اس نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

"تو آپ کے گھر وہ لیڈی کون تھیں؟"

"وہ میری خالہ ہیں۔ میں خالہ کی فیملی کے ساتھ رہتا ہوں۔" عدیمہ سے اس کا متوقع رشتہ اور تعارف کے بعد اس نے یہیں اخذ کیا تھا کہ وہ کزن ہوگی لیکن وہ نور افروز کو اس کی ماں اور ثوبیہ کو بہن سمجھتی رہی تھی۔

"صرف آپ۔ میرا مطلب ہیں آپ کے بھائی بہن اور۔ سوری۔ مجھے یہ۔"

"میں اور امی ہی کل فیملی ہیں، ابو کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہو گیا تھا۔" اس نے اب کی بار ایک ساتھ سب بتا دیا۔

اس نے چپ ہو کر گردن جھکا لی۔ اس کے چہرے پر سوچ کے سائے تھے۔ مازن نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ سوچ رہا تھا اس سے بات کرے یا اس اَن کہی داستان کا انجام بھی حرف و صوت کے بنا ہو جانے دے لیکن کچھ کہنے کا خیال پل بھر کا تھا، اگلے ہی لمحے آئے دوسرے خیال نے اسے رد کر دیا کہ وہ اس کی زندگی میں عدیمہ کے وجود سے واقف ہو چکی تھی۔ اس کی خاموشی اس قدر محسوس ہوئی کہ سارہ اسے دیکھنے لگی۔ ان کی نظریں ملیں اور ٹھہر گئیں۔ شاید یہ وہی پل تھا کہ کوئی تو ضبط کھو کر لفظ تک پہنچتا مگر برا ہوا کہ اسی وقت، ورکشاپ سے آئے میکینک نے بائیک قریب لا کر زور سے ہارن بجایا۔

کار کی خرابی اتنی جلدی ٹھیک ہونے والی نہ تھی۔ مازن کے کہنے پر سارہ نے پھر سعادت حسین سے بات کی۔ انہوں نے اسے مازن کے ساتھ واپس آنے کو کہا کار کے لیے وہ کسی کو بھیج رہے تھے۔ وہ کبھی بائیک کی پچھلی نشست پر بیٹھی نہیں تھی حالاں کہ وہ سنبھل کر چلا رہا تھا لیکن دونوں پیر، ایک طرف کر کے بیٹھی سارہ مضبوطی سے پچھلا کریئر تھامے عافیت کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ اللہ اللہ کر کے گھر پہنچنے تک وہ بائیک پر دوبارہ بیٹھنے سے توبہ کر چکی تھی۔

عظمیٰ لان میں ہی ان کی منتظر تھیں۔ سعادت حسین دفتر سے لوٹے نہیں تھے۔

"اب سمجھ آیا تمہیں کیوں تنہا ڈرائیو کرنے سے منع کرتی ہوں؟" انہوں نے اس کے پاس آتے ہی جھاڑا۔

"جی۔" مازن کی موجودگی میں وہ بس اتنا ہی کہہ سکی ویسے بھی وہ کہاں انہیں بتا سکتی تھی کہ اس مصیبت نے اسے کس مسرت سے ہمکنار کروایا ہے۔

"بے حد شکریہ بیٹا۔ آپ وہاں نہ ملتے تو

جانے کیا ہوتا۔" وہ بس مسکرا دیا۔

"کیا آپ بھی لانگ ڈرائیو پر نکلے تھے؟" ان کے سوال پر سارہ ٹھٹک گئی۔

"نہیں، میں 'نرسنگ ہوم' سے وزٹ کے بعد واپس آرہا تھا۔" وہ شہر میں اپنی طرز کا واحد نرسنگ ہوم تھا اس لیے اکثریت جانتی تھی۔

"اوہ اچھا۔" انہیں جیسے افسوس ہوا۔

"میں چلتا ہوں اب۔" مازن نے اجازت چاہی۔

"کھانا کھا کر جائیں، سعدی بھی آتے ہوں گے۔" انہوں نے اسے روکا۔

"بہت شکریہ لیکن مجھے کہیں پہنچنا ہے۔"

"جی جی، ایک بار پھر ہم سب بے حد ممنون ہیں آپ کے۔"

وہ چلا گیا اور عظمیٰ اس کی سمت مڑی۔

"پہلی بار ڈرائیو پر نکلی تھیں پھر اکیلے لانگ ڈرائیو پر جانے کی کیا سوجھی؟"

"مما میں نے سوچا دن وے اور خالی سڑک پر ہاتھ صاف کرلوں گی۔" اب اسے انہیں مطمئن کرنا تھا۔

☆☆☆

ماں کی ڈانٹ اور ہدایت کے بعد وہ آج رات کھانے کی میز پر موجود تھا۔

"کیسا چل رہا ہے تمہارا پلانٹ؟" سعادت حسین نے پوچھا۔ سعادت حسین سے الگ ہو کر کام کرنے کی سعی میں اس نے یامین کے ساتھ مل کر پلاسٹک ری سائیکلنگ 'پلانٹ' شروع کیا تھا۔

"الحمدللہ سب اسموتھلی چل رہا ہے۔" ماں کی موجودگی اسے ہمیشہ دائرے میں کھینچ لاتی تھی۔

"اب آپ دونوں یہاں آفس اور ورک کنورسیشن نہ شروع کریں پلیز۔" عظمیٰ نے کھانا روک کر ہاتھ اٹھایا۔

"ہاں وہ ڈسکس کریں جس کے لیے آج بھائی کو بلایا ہے۔" کل والی پژمردگی کی جگہ آج ایک متبسم سا خوش گماں بادل اس پر سایہ کیے تھا جس کے زیر سایہ اس کی طبیعت بھی ہلکی سی تھی۔

"کون سی بات؟" جانے کیوں وہ ٹھٹکا پھر سنبھلا اور اس کے ذہن میں وہ گھر چلا آیا۔

"تم نے کوئی دوست بنائی ہے جسے اس گھر کا ممبر بنانے کا ارادہ ہو؟" سعادت حسین نے پوچھا اور اس کے کھنچے اعصاب کی اکڑن دم توڑ گئی۔

"جواب دینے سے پہلے سوچ لینا کہ تمہارے جواب کے بعد انتخاب کا آپشن تم سے چھین کر یہ ذمہ داری ہم خود کو تفویض کر سکتے ہیں۔" عظمیٰ نے بظاہر اسے قبل از وقت آگاہ کیا تھا لیکن یہ خیر خواہی دراصل اس کے منہ سے اپنی مرضی کی بات سننے کی سازش تھی۔

"آپ ہر کچھ دن بعد اس بات کو ایشو بنا کر ایک لمبی بحث کرتے تھکتیں نہیں؟" اس نے ڈھیلے انداز میں کہا۔

"بہت تھکتی ہوں لیکن تم سمجھتے کہاں ہو!" وہ بھی اس کی ماں تھیں۔

"اس لیے اب ہمیں الٹی میٹم دے دینا چاہیے۔" سعادت حسین مسکرائے۔

"جی ہاں۔ تمہارے پاس چند ہفتوں کا وقت ہے ورنہ پھر ہم تلاش کریں گے اور سب کی متفقہ پسند ملتے ہی شادی ہو گی۔" انہوں نے گردن تان کر اعلانیہ انداز میں کہا۔ حارث نے مدد طلب نگاہ بہن کی طرف کی۔

"سوری۔" اس نے شانے اچکائے۔

"اس معاملے میں، میں مما پاپا کے ساتھ ہوں۔" اس نے انگریزی میں کہا۔

"ویسے میں نے سنا ہے نکہت کی نیس (بھتیجی) آئی ہے اور تمہاری ہر شام وہاں گزر رہی ہے۔" وہ جانتے ہوئے بھی بعض اوقات اپنی ماں کی صلاحیتوں کو فراموش کر بیٹھتا تھا۔

"میں نے دیکھا ہے، پیاری بچی ہے اگر۔"

"وہاں میں ایک پیارے بچے کی وجہ سے جاتا

ہوں۔" اس نے جس تیزی سے چلبلا کر کہا، سارہ کو بڑی ہنسی آئی۔ اس کا اشارہ یامین کی جانب تھا۔

"تو آپ نے اس لیے آج یہ ذکر چھیڑا کہ میں۔" وہ ناراض سا چپ ہو گیا۔

"ہر اچھی لڑکی کو دیکھ کر کنوارے بیٹے کی ماں کو پہلا خیال یہی آتا ہے۔" سعادت حسین نے اس کی ناراضی رفع کرنی چاہی۔

"اور اس کی نیکسٹ اسٹیپ بیٹے کی منشاء جاننا ہوتی ہے، تمہیں انٹرسٹ نہیں تو یہ بات یہیں ختم، کیوں بیگم؟"

"صبور کا قصہ ختم لیکن شادی کا الٹی میٹم اب بھی وہی ہے۔ مجھے اب اس گھر میں بہو چاہیے اور تم کیا اپنی ماں کی اتنی سی خواہش پوری نہیں کر سکتے ؟" انہوں نے مسکین سا منہ بنایا۔

"اُفف!" اس نے جیسے ہار مان لی۔

" آپ سے بڑی ڈرامہ کوئین میں نہیں دیکھی۔"

"مجھ پر بھروسہ کرو تو دکھا دوں گی" ان کی بات پر آخر وہ مسکرا دیا۔

☆☆☆

صبور تنہا آئی تھی اور اب دس پندرہ دن کے لیے اس کے والدین آئے تھے جن کے ساتھ اسے واپس جانا تھا۔ مہمانوں سے ملاقات کے لیے قریبی رشتے دار عشائیہ پر مدعو تھے۔

وہ آئی تو اس نے لان اور گھر میں غیر معمولی چہل پہل محسوس کی تھی۔ صبور نے اسے خود ہی اس کی وجہ بتا دی۔ اس موقعے پر بھی چھٹی نہ کرنے پر اس نے صبور کو سراہا تھا۔

وہ اسے پڑھا کر نکلی تو ساتھ صبور بھی تھی۔ وہ بڑی سلجھی ہوئی اور ملنسار لڑکی تھی۔ عدیمہ نے خود پر جبر کر کے مجبوری میں یہ کام قبول کیا تھا مگر اب اسے صبور کو پڑھانا اچھا لگ رہا تھا۔ امریکہ میں رہتے ہوئے اسے اپنے ملک کی تہذیب اور اپنے والدین کی مادری زبان سے بڑی رغبت تھی۔ صبور کی وجہ سے اسے اپنے فیصلے کا ملال نہیں تھا۔

"جی آپ ماما اور ڈیڈ سے مل لیں۔" باہر آ کر صبور نے مشورہ دیا

" آپ ان تک میرا اسلام پہنچا دیجیے گا۔" اس نے دور بیٹھی بھیڑ کو دیکھا۔ وہ اجنبی لوگوں کے درمیان جانے سے ہمیشہ کتراتی تھی۔

" ضرور۔ شاید آج کار باہر ویٹ کر رہی ہے۔" وہ کہتے ہوئے اس کے ساتھ گیٹ کے سمت چلنے لگی۔ تب ہی ایک کار گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔ وہ دونوں ذرا ٹھہر گئیں۔ جب کار اپنی جگہ جا کر رکی تو وہ بھی چھوٹے قدم اٹھاتی آگے بڑھیں۔

"میں چلی جاؤں گی، ادھر سب آپ کے منتظر ہوں گے۔" اس نے صبور کو مہمانوں کے ساتھ شامل ہونے کہا۔ وہ کار کے قریب ہوئی تب ہی کار سے اتری سارہ اور اس کی نظریں ٹکرائیں۔

" آپ یہاں ؟" یہ حیرت بڑی بے ساختہ تھی۔

" آپ انہیں جانتی ہیں؟" صبور نے بھی اسی حیرت سے پوچھا اور سارہ کو غلطی کا احساس ہوا۔ اس کے پیچھے کار سے باہر آئے عظمیٰ اور سعادت حسین بھی رک گئے تھے۔ سب سے آخر میں حارث باہر نکلا تھا۔ عدیمہ کو دیکھتے ہی اس نے سعادت حسین کو دیکھا۔ جن کے چہرے کا دائمی نرم اور پرسکون تاثر اس وقت ندارد تھا۔ اس وقت وہ سپاٹ صورت لیے عدیمہ اور پھر سارہ کو دیکھ رہے تھے۔

" یہ مازن سر کی کزن ہیں۔" اسے ماں کی سوالیہ نظروں کا جواب دینا پڑا۔ یہ عجیب اور مشکل صورت حال اس کی بے اختیاری نے ہی پیدا کی تھی۔

" تمہیں کیسے پتہ یہ بات ؟" انہوں نے سادگی سے پوچھا لیکن سارہ جان گئی تھی کہ اب ماں راز پا لے گی۔

" لاسٹ ڈے سر کا آئی ڈی کارڈ رہ گیا تھا، وہ لوٹانے گھر گئی تب دیکھا تھا۔"

"اوہ اچھا۔ مس عدیمہ سے میں اردو سیکھ رہی ہوں۔" صبور نے اس کی یہاں موجودگی کی وجہ بتائی۔

"یہاں سے آگے چلیں۔" حارث نے کہا اور عدیمہ نے جھٹکے سے آواز کی سمت دیکھا۔ وہ تنا چہرہ لیے سارہ کی پشت پر ہاتھ رکھے اسے آگے بڑھنے کہہ رہا تھا۔

"سوری بھائی۔" اس نے ایک طرف ہو کر جگہ دی اور سعادت حسین اور حارث آگے بڑھ گئے۔

وہ ان سب کے سپرد ایک مسکراہٹ کرتی باہر آگئی۔ سارہ اور عظمیٰ نے اس کی چال محسوس کی تھی۔

"کہاں رہ گئی تھیں؟" نکہت نے پوچھا۔

"سارہ، مس عدیمہ کو جانتی ہیں۔ وہی بات ہو رہی تھی۔" صبور نے کرسی سنبھالی۔

"کیسے؟" اور اسے پھر وہی بات دہرانا پڑی جو وہ اسے نہیں کہنا تھی۔

"ایک تو عام سی شکل اور پھر یہ نقص اور عیب جیسا! غریبوں کو تو اللہ مسائل بھی زیادہ دیتا ہے۔" یامین کی ساس کا افسوس تھا یا اللہ سے شکوہ، اسے اچھا نہیں لگا۔

"وہ غریب نہیں ہیں آنٹی۔ مڈل کلاس فیملی ہے۔" اسے ان کا تبصرہ برا لگا تھا پھر بھی اس نے اپنا انداز سرسری رکھنے کی سعی کی تھی۔

"شادی تو پھر بھی مسئلہ ہو گئی نا، عمر بھی زیادہ لگتی ہے۔"

"وہ سر یازن سے انگیجڈ ہیں۔" جانے وہ کس کا دفاع کر رہی تھی۔

اور مردوں کی بھیڑ میں ادھر کان لگائے بیٹھے، سعادت حسین کا بغور معائنہ کرتے حارث نے سنا اور اس کا غصہ ایک دم بڑھ گیا۔ اسے مازن کے بارے میں اپنی لاعلمی پر افسوس ہوا۔ وہ کیسے بے خبر تھا کہ اس مکان کا کوئی فرد اس کے گھر آتا جاتا رہا ہے اور وہ بھی۔

☆☆☆

سارہ گھر پہنچنے کے بعد، ماں کے سامنے متوقع پیشی اور ان کے استفسار کے قابل قبول سے جواب سوچنے لگی تھی۔ حیرت انگیز طور پر انہوں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا، مگر اس کا ڈر غلط نہیں تھا کہ عظمیٰ اس کے دل کا چور پکڑ چکی تھیں۔

"سعدی!" انہوں نے نائٹ کریم کی بوتل جگہ پر رکھتے ہوئے پکارا۔

"ہمم۔" وہ میز پر رکھی کتابوں میں سے اس وقت مطالعے کی غرض سے کتاب منتخب کر رہے تھے۔

"مجھے لگتا ہے ہماری سارہ مازن میں انٹرسٹیڈ ہیں۔" انہوں نے آئینے میں پیچھے کھڑے شوہر کے عکس کو دیکھا جو یہ خبر سن کر ساکت ہو گئے تھے۔

"تمہیں سارہ نے کہا؟" کچھ دیر بعد بنا پلٹے ہی انہوں نے پوچھا۔

"ڈائریکٹلی نہیں، لیکن میں سچ کہہ رہی ہوں۔ پریشانی کی بات دوسری ہے۔"

"وہ کیا؟" وہ اب بھی جوں کے توں کھڑے تھے۔

"مازن انگیجڈ ہے صبور کی ٹیوٹر اور اپنی کزن عدیمہ سے۔" وہ جھٹکے سے پلٹے یہ بے اختیاری ردعمل تھا۔

"مزید ایک بات۔ عدیمہ کو بطور ٹیوٹر حارث نے سجیسٹ کیا تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ اسے کیسے جانتا ہے۔"

"تم فکر نہ کرو میں پہلے سارہ سے بات کرتا ہوں پھر مازن سے۔" وہ عظمیٰ کے پیچھے آ کھڑے ہوئے اور ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"اور حارث؟" عظمیٰ نے ان کی طرف رخ کر کے سر اونچا کیا۔

"حارث سے بھی۔" انہوں نے ایک لمبا گہرا سانس فضا کے سپرد کیا۔

☆☆☆

لیکن وقت کوئی اور چال چل رہا تھا۔ سعادت حسین سے پہلے، سارہ سے سچ اگلوانے کا موقع حارث کو مل گیا۔

وہ جانے کتنی دیر سے فون ہاتھ میں لیے دانتوں سے ناخن کتر رہی تھی۔ دل کہہ رہا تھا اس سے بات کی جائے۔ اسے نرسنگ ہوم کے راستے والے وقوعے سے حوصلہ ملا تھا۔ وہ اسے ناپسند نہیں کرتا اور دل کہہ رہا تھا وہ اس کے جذبات سے بھی واقف ہے لیکن خودداری اور عزت نفس اسے روک رہے تھے کہ اگر وہ جانتے ہوئے بھی، چپ ہے تو تمہیں مر جانا چاہیے لیکن اس سے مزید کوئی بات کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ مختلف خیالات، آوارہ بادلوں کی ٹکڑیاں بنے دماغ پر چھائے تھے۔ تھک ہار کے اس نے فون ہی بند کر دیا اور بستر پر گر گئی۔ دبے پاؤں آنکھوں میں جمع ہو رہے آنسو کچھ دیر بعد بے دھڑک تواتر سے گرنے لگے یہاں تک کہ وہ سسکیاں لینے لگی۔

مسلسل اسے فون کرتا حارث فکر مند سا اس کے کمرے میں آیا تو باہر تک سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے بے چینی سے دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سارہ کو ہوش آیا۔

"دروازہ کھولو سارہ۔" اس کی آواز اور دستک کے انداز سے بے قراری اور پریشانی ظاہر تھی۔ وہ تو گھر میں تنہا ہے سوچ کر بے فکری سے غم منا رہی تھی۔ اس نے چہرہ صاف کر کے دروازہ کھول دیا۔

اور اب پلنگ کے کنارے بیٹھی، حارث کی جواب طلب نظروں کو جھیلتی ہونٹ دانتوں سے کچلتے ہوئے گویا حیا اور لحاظ ختم کر رہی تھی تا کہ بھائی سے کہہ سکے۔

"تم جانتی ہو میں ناراض نہیں ہوں گا، تم ہر بات، ہر مسئلہ مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔" اس نے انگریزی میں کہا۔ وہ سر جھکا کر اضطراری انداز میں انگلیاں الجھانے لگی۔

"سارہ!" حارث نے نرمی سے کہتے ہوئے اس کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"بھائی۔" اس نے ہمت تو کی اور پھر رونے لگی۔

"صاف صاف کہو سارہ۔" حارث کا صبر ختم ہو رہا تھا۔

"اب کوئی فائدہ نہیں بھائی۔ شاید میری فیلنگز ون سائیڈڈ نہیں تھیں۔ لیکن ان کی جلد شادی ہے۔" حارث کو جھٹکا لگا۔ وہ سوچ رہا تھا رزلٹ خراب آنے کا اندیشہ اسے رلا رہا ہے۔

"کون؟" اندر سے کہیں وہ بھی اندیشوں سے الجھ رہا تھا۔

"وہ جان کر آپ کیا کریں گے، بس میرے لیے دعا کریں۔"

"میں تمہارے لیے بہت کچھ بلکہ سب کچھ کر سکتا ہوں۔" حارث نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے وہ ڈھارس ملی کہ زبان پر اس کا نام آگیا۔ حارث جو ایک اجنبی نام سننے کا منتظر تھا، جو اس کا کالج یا کلاس فیلو ہوتا یا کوئی اجنبی، مازن سن کر سکتے میں آگیا۔ اس گھر سے اس مکان کی ڈور ٹوٹنے کے بجائے اس میں مزید گرہیں لگتی جا رہی تھیں۔ سارہ رونے لگی تھی۔ اس نے اسے سینے سے لگا کر سر پر ہاتھ رکھا۔

"فکر نہ کرو سارہ، میں تمہیں دکھ اور آنسوؤں کے سپرد نہیں کروں گا۔"

اس کے پاس اب بھی انہیں وہی دکھ اور اذیت دینے کے کئی طریقے تھے، کیا ہوا جو اس عمل میں ہارنے والی، کھونے والی ذات اس کی تھی۔ کسی کو اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لیے فیصلہ کرنا تھا۔

☆☆☆

'سفید کیب' دیکھتے ہی اسے الجھن نے گھیرا تھا۔

"مجھے صبور سے کہہ دینا چاہیے کہ ساجد نہ ہو تو میسج کر دیا کریں میں رکشا سے آجاؤں گی، کسی اور کو زحمت نہ دیا کریں مگر اب دن ہی کتنے بچے ہیں۔" جیسے وہ سر جھکا کر کار کے اندر بیٹھی ویسے ہی چپکے سے افسردگی سر نہوڑائے اندر آگئی۔ کمال یہ تھا چند لمحے پہلے والی کوفت بھی اسی وجہ سے سوار ہوئی تھی جو افسردگی کی آمد کی وجہ بنی تھی۔

اس نے خود ہی اپنی ذات کے گرد، اونچی فصلیں تعمیر کی تھیں اور پھر اس فصیل کے اندر جھانکنے کے تمنائی اسے ملے بھی نہیں لیکن اب اس کا دل ہی اچھل اچھل کے اس اونچائی کے باہر جھانکنے کا متمنی ہو رہا تھا۔ اکثر اس کے اندر خود ترسی باغی ہوتی تو ایک زہرخندی ہنسی وجود میں گونج اٹھتی کہ واہ بی بی خود کو ناقابل تسخیر بنانے کے لیے تمہیں کسی جتن کی حاجت ہی کہاں تھی! اب اس خود ترسی کے رنگ ڈھنگ بدل گئے تھے، اب وہ چپ رہتی تھی مگر ہمہ وقت ایک طنزیہ تبسم اس کے لبوں سے چپکا رہتا تھا۔

وہ اپنی سوچوں کے دائرے میں اس تیزی سے چکر کاٹ رہی تھی کہ کار رکنے پر، چونکی اور ادھر ادھر دیکھے بنا ہی دروازہ کھول دیا باہر نظر پڑتے ہی وہ جیسے ہوش میں آئی اور حارث کو دیکھا۔

''مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔'' اس نے سیٹ بیلٹ ہٹاتے ہوئے کہا اور دروازہ کھول کر اتر گیا۔ وہ اسے اپنی پسند کے طور پر متعارف کروا کے سعادت حسین کو ہلانا چاہتا تھا۔ وہ ایک تیر سے کئی شکار کرنے جا رہا تھا۔

وہ بھی باہر آئی۔ یہ شہر کا جانے کون سا علاقہ تھا جہاں گرد و پیش کے ساتھ ساتھ سڑک بھی سنسان تھی۔

''کار میں بھی بات ہو سکتی تھی۔ لیکن ہمارے بیچ ایسی ضروری بات کی گنجائش ہی کہاں ہے کہ یوں۔'' دل جو بھی کہتا اسے یہ پیش قدمی اچھا نہیں لگی تھی۔

''نہیں ہو سکتی تھی اور گنجائش ہے۔'' اس نے اپنے سیاہ بابر جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور اس کے بالکل سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ خود کو سفاک ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جانے اسے ڈرانا چاہتا تھا یا خود کو باور کرانا مقصود تھا کہ اس معاملے میں وہ سنگ دل ہے، اسے سنگ دل ہی رہنا ہے۔

''کہیں۔'' اس نے بھی بے کار گفتگو کو طول دینے سے گریز کیا اور منتظر انداز میں ہاتھ باندھ لیے۔

''میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' انگریزی میں ادا ہوئے اس جملے کے معنی تو بڑے نازک نفیس اور خوش رنگ تھے، البتہ لہجہ اور چہرے کے تاثرات ان سب کے متضاد تھے۔

عدیمہ کے سانولے چہرے پر بھی دوران خون کی تیزی جھلکی تھی۔ اس کے اندر یکایک جذبات کا بھونچال سا آیا تھا۔ سارا کچھ ایک ساتھ بے قابو ہوا تھا۔

''یہ جھوٹ، مذاق، کھیل۔ جو بھی ہے نہایت گھٹیا اور بے ہودہ ہے۔'' اس کے بندھے ہاتھ نیچے گر گئے تھے۔ لہجہ مضبوط سہی لیکن آواز جذبات کی یلغار سے کانپ گئی تھی۔

''یہ جینوئن پروپوزل ہے۔'' وہ سنجیدہ تھا اور آنکھیں اسی پر مرکوز تھیں۔

''میں نہیں مانتی اور''

''کیوں نہیں مانتیں؟'' حارث نے اس کا فقرہ مکمل نہیں ہونے دیا اور ایک قدم آگے آیا۔

''کیا میں آپ کو پسند نہیں کر سکتا؟'' وہ ایک قدم اور اس کی طرف بڑھا۔

''مجھے آپ سے محبت نہیں ہو سکتی؟''

''نہیں۔'' اس کی آواز بے لچک تھی لیکن آنکھوں میں نمی اکٹھا ہو گئی۔

''آپ کا اندازہ غلط ہے۔'' حارث نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''آپ کا اندازہ غلط ہے۔'' عدیمہ نے اسی کے انداز میں بات دہرائی۔

''آپ جو بھی سمجھیں مجھے آپ کی ہاں کی ضرورت ہے۔'' اس ضدی حتمی انداز پر عدیمہ بری طرح چونکی، جو اول دن ہی اسے اس کی شخصیت کا خاصہ لگا تھا۔

''آپ اس پروپوزل کا جینوئن ریزن بتا دیں تو میں جواب دوں۔'' دوسروں کی 'ضرورت' ہی تو اس کی زندگی کا دکھ تھی۔

حارث کچھ دیر چپ رہا۔
"سارہ، میری سسٹر مازن سے محبت کرتی ہے۔"
اگر وہ کہتا 'میں تمہیں زیر کرنا چاہتا ہو، تمہارا رویہ مجھے چیلنج کرتا ہے اس لیے تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں، تم پر حکم چلانا ہے، تمہیں غلام بنانا ہے، تمہیں مغلوب محصور دیکھنا ہے، تو اسے ایسا شدید دکھ نہ ہوتا نہ اس کا طیش غضب ناک حد تک جاتا اور اس کی خودترسی یوں پاگل نہ ہوتی۔
"کیا نیک صفت لوگ میری زندگی میں ہیں واہ۔" اس نے تعریفی انداز میں تالی بجائی۔
"ایک بہن کی محبت اسے سونپنے کے لیے قربانی دے رہا ہے، دوسرا خالہ کے احسانوں کا بدلہ اتارنے کے لیے قربان ہو رہا ہے۔ میں ہی ناشکری ہوں جسے سمجھ میں نہیں آتا ایسے نایاب گوہروں کی قدر کیسے کی جائے۔" جتنا برہم اس کا لہجہ ہو رہا تھا آنسو بھی اسی رفتار سے گر رہے تھے۔
"آپ سب نیک لوگوں کے نزدیک اپنوں کی اہمیت اتنی ہے کہ خود کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ آپ کو سارہ سے محبت ثابت کرنی ہے، مازن کو خالہ سے اور خالہ کو کسی ملال کا بوجھ ہٹانا ہے۔ سب کو اپنی محبت، سعادت، مساحت، ثابت کرنے کی ضرورت میں کسی کی ذات کا بے مول ہونا دکھائی ہی نہیں دیتا لیکن میں ہمدردی اور ظرف کے اس اونچے مقام پر نہیں ہوں، میں وہ کم ظرف اور گناہ گار ہوں جس کے لیے سب سے زیادہ اہم اپنی ذات ہے، میں خود غرض ہوں صرف اپنے بارے میں سوچنے والی اس لیے مجھے ایسے ثوابوں سے دور رکھیں، دوسروں کو خوشیاں دینے، خود کو مطمئن کرنے کے لیے مجھے کھلونا نہ بنائیں۔" اس نے ہاتھ جوڑے اور خود کو گھسیٹتی سڑک کی طرف بڑھی۔ اس شدید ردعمل پر ششدر حارث اس کے پیچھے لپکا۔
"کہاں جا رہی ہیں، آپ شانت ہو جائیں پلیز رکیں۔" وہ اور تیزی سے اس سے دور جانے لگی۔ وہ اب کسی کا ایک لفظ سننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ غیظ و غضب کی انتہا پر تھی۔
"عدیمہ!" حارث کی چیخ دل دہلانے والی تھی۔
سیکنڈز میں ہی سب ہو گیا تھا۔ کیسے یہ وہ دونوں شاید بتانے کے قابل نہیں تھے۔ حواس لوٹے تو تیز دھڑکتے دل کے ساتھ وہ تھرتھرا رہی تھی اور پاس کھڑے حارث کا تنفس تیز ترین تھا۔
"آپ کار میں بیٹھیں۔" حارث نے جتنے دھیمے سر میں کہا اس سے زیادہ آہستگی سے اس کا بازو آزاد کیا۔
اگر اس نے بروقت اسے پیچھے نہ کھینچا ہوتا تو سڑک سے گزرتا تیز رفتار ٹرک۔ وہ آگے سوچ نہیں پایا۔ وہ کسی طرح کار تک آئی۔ ہمیشہ غیر متوازن رہنے والی چال اس وقت مزید لڑکھڑا رہی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ ٹرک کی شوں کی آواز اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ موت کو اس قدر قریب سے چھونے کی بے یقینی اور ہیبت اس پر سوار تھی۔ دل جیسے اس کے انگ انگ میں دھڑک رہا تھا، پورے جسم پر سرد پسینہ پھیلا تھا۔ اس نے تنفس بحال کرتے ہوئے ہتھیلیاں عبایا پر رگڑ کر خشک کیں۔
حارث باہر ہی سڑک کی سمت چہرہ کیے کھڑا تھا۔ اس نے ابھی اس درخواست کی ایک اور وجہ تو بتائی نہیں تھی۔ اس کے ارادے تو دونوں بتا کر اذیت اور سزا دینے کے تھے لیکن اس وقت سب کچھ اس کے ذہن سے محو ہو گیا تھا اور وہ خوف ناک پل اپنے ممکنہ نتائج کے ساتھ اس کی سوچ پر حاوی تھا۔ اس کی شخصیت اور زندگی کا رخ بدلنے والے سارے ہی پل بھر کے انکشافات تھے۔ سعادت حسین اور اس کا سوتیلا رشتہ، ان کے دل کا اس گھر تک پہنچتا رستہ، عدیمہ کا اس گھر سے واسطہ اور ذرا دیر پہلے اس کی ہستی ہلا دینے والا لمحہ۔
خود پر قابو پا کر بڑی دیر بعد وہ پلٹا اور پیچھے بیٹھی

عدیمہ پر ایک نظر ڈال کر خود بھی اندر آ گیا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" اس نے اب کی بار بیک ویو مرر کی بجائے پلٹ کر پوچھا۔ عدیمہ نے جواباً سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"آپ گھر جانا چاہتی ہیں تو میں صبور کو کال کر دیتا ہوں۔"

"نہیں۔" اس نے سر اوپر کیا مگر اسے دیکھا نہیں۔

"لاسٹ کے چار دن ہی بچے ہیں، وہیں چلیں۔" وہ جانے اسے جتا رہی تھی یا سادہ سی بات کی تھی حارث کو اس سلونے چہرے کے ایک ایک خلیے میں رچی ہی، تھکن اور اداسی محسوس ہوئی تھی۔

گھر پہنچنے تک کار کی فضا میں خاموشی بکل مارے بیٹھی رہی۔ وہ اپنے پرس کے اسٹرپ اور ہاتھوں سے ابھی ایک ہی وضع میں بیٹھی تھی۔

"آئندہ پک اینڈ ڈراپ کے لیے آپ زحمت مت کیجیے گا۔" گھر پہنچ کر باہر نکلنے سے پہلے اس نے کہا تھا۔

کچھ ارادے سارہ کے انکشاف نے کمزور کیے اور باقی آج کے انکشاف سے ٹوٹ کے بکھر گئے تھے۔

☆☆☆

"سمیر، تمہارے اگلے سمسٹر امتحان کب ہوں گے؟" نور افروز نے پوچھا۔

"ڈھائی مہینے بعد۔" اس نے ٹی وی اسکرین سے نظر ہٹائے بنا جواب دیا۔

"ثوبیہ بھی فارغ ہے اس سال تو میں سوچ رہی ہوں اگلے مہینے شادی کی تاریخ رکھ لی جائے۔"

"اتنے کم وقت میں؟" ثوبیہ کو اعتراض تھا۔

"ہمیں کون سی بارات لے جانی ہے یا ڈھیر مہمان بلانے ہیں، سادا سا نکاح اور ولیمہ کریں گے۔"

"کس کی شادی کی بات ہو رہی تھی۔" وہ اپنے کمرے سے اٹھ کر ہال میں آئی۔

"مازن اور تمہاری اور کس کی؟"

"تو تاریخ رکھنے سے پہلے مجھ سے بھی پوچھ لیں۔" تینوں اس کے یہ تیور پہلی بار دیکھ رہے تھے۔

"کیوں تمہیں اگلے مہینے کچھ کرنا ہے؟ مطلب کہیں۔"

"میں نے کب اس شادی کے لیے رضامندی دی ہے جو تاریخ کی باتیں ہو رہی ہیں؟" اس نے بات کاٹی تھی۔

"عدیمہ!" اس کے ضدی اور بدتمیز رویے پر نور افروز نے تنبیہی انداز میں اس کا نام لیا۔ سمیر نے ٹی وی کی آواز بند کر دی۔

"مجھے یہ شادی نہیں کرنی اس لیے آگے کی پلاننگ نہ کریں۔" وہ واپس اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔

"مازن سے اس بات کا ذکر کوئی نہیں کرے گا خاص طور سے تم ثوبیہ۔" انہوں نے کڑی نظر اور سخت لہجے میں دونوں کو خبردار کیا جب کہ ان کے اندر کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ ان سے ساری عمر میں کوئی ایک فیصلہ بھی درست نہیں ہو پایا تھا۔

وہ دونوں سر ہلا کر رہ گئے۔ انہیں تو دونوں کی شادی ہی ہضم نہیں ہوئی تھی اب تک اس پر تم عدیمہ کا غصہ تھا۔

وہ پلنگ پر بیٹھی خود کو پرسکون کرنا چاہتی تھی لیکن دماغ اب بھی سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اس کی کوئی وقعت ہی نہیں تھی۔ وہ سارے فیصلے جن میں وہ فریق خاص تھی، اس سے پوچھے بنا لے لیے گئے تھے۔ کیا اجنبی اور کیا اپنے سب ہی اپنی تسکین اور تسلی کے لیے اسے استعمال کر رہے تھے۔ وہ شاید یوں سمیر ثوبیہ کے سامنے ماں کو انکار نہ کرتی، بلکہ کسی دن مازن کو منع کر دیتی لیکن ایک دن پہلے رونما ہوئے واقعے نے اسے اس وقت یوں مشتعل کیا تھا۔

"اچھا ہی ہوا کہہ دیا۔" اس نے خود سے کہا اور پیچھے بستر پر گر کر آنکھ بند کر لی۔

''آپ کا اندازہ غلط ہے۔'' بند آنکھوں کے پیچھے کوئی کھڑا کہہ رہا تھا۔ اس نے سختی سے آنکھیں میچ کر وہ منظر مسخ کرنا چاہا۔

☆☆☆

مازن ماں کے کمرے سے باہر نکلا تو نرس نے اسے روکا۔

''اس بار آپ کا آنٹی آیا نئی۔'' ہر مہینے کے آخری سنیچر کو خالہ لازمی آتی تھیں اور ماہانہ بل کی رسید بھی وہی لیتی تھیں۔

''آج کل ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' اس نے مسکرا کے کہا۔

''آپ اکاؤنٹس میں جاؤ، کلرک ریسیپٹ دے گا۔'' نرس کے کہنے پر وہ چھوٹے سے کمرے میں آیا۔

اسے دیکھ کر کلرک نے چپراسی سے کہا میز پر دھری رسیدوں میں سے روم نمبر گیارہ کی رسید دے دو۔

''ان میں روم نمبر گیارہ نہیں ہے۔'' چپراسی نے ساری رسیدیں دیکھنے کے بعد کہا۔

''ارے وہ سب انٹرنیشنل ٹرانسیکشنز والی ہیں، ان میں دیکھو۔'' اس نے دوسری پیپر کلپ میں قید رسیدوں کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ ان میں سے مطلوبہ رسید لے کر وہ باہر نکل گیا۔ بائیک کے پاس پہنچ کر اچانک اس کے ذہن میں جھماکا ہوا اور وہ واپس کلرک کے پاس آیا۔ وہاں چشم کشاں انکشاف کے بعد اب وہ پارکنگ میں ٹوٹی دیوار پر بیٹھا تھا۔

اتنے سالوں سے خالہ جھوٹ کیوں کہہ رہی تھیں کہ ہر ماہ دبئی سے اس کی امی کی نرسنگ ہوم کی فیس ادا کی جاتی ہے۔ انہوں نے کبھی بینک کے کام ان سے نہیں کروائے تھے۔ ان سب کی مصروفیت اور پڑھائی کی وجہ سے وہ خود ہی یہ کام کیا کرتی تھیں۔ آج پہلی دفعہ وہ سوچ رہا تھا کیا اس کے پیچھے کوئی اور وجہ تھی، ایسی وجہ جو انہیں سب سے چھپانا پڑی۔ جانے کیوں وہ اتفاق سے ہاتھ لگا زرد سا کاغذ اسے بار بار یاد آرہا تھا جو کسی نور کو مخاطب کر کے لکھا تھا۔

اگلے دن وہ اس وقت گھر پہنچا جب عدیمہ جا چکی تھی، سمیرا ابھی لوٹا نہیں تھا اور ثوبیہ کمرہ بند کیے پڑھ رہی تھی۔ زکام کی وجہ سے وہ صوفے پر لیٹی تھیں۔

''کل میں رسید دینا بھول گیا تھا۔'' اس نے کاغذی پرزہ ان کی طرف بڑھایا جو انہوں نے اٹھ کر لے لیا۔

''طبیعت ذرا بہتر ہو تو تم لے چلنا۔'' مازن چپ رہا۔

''کیا بات ہے؟'' اس کے غیر معمولی انداز نے انہیں پوچھنے پر مجبور کیا۔

وہ ساتھ والی کرسی پر ٹک گیا۔

''خالہ! امی کی فیس کبھی دبئی سے ٹرانسفر نہیں ہوئی۔'' نور افروز کے اندر وہ سرد لہر دوڑی جو انہیں محشر کھلنے کی اطلاع دے گئی۔ یہ دن بھی تو آنا تھا۔ وہ اس سے گزرے بنا اس دنیا سے رخصت بھی نہیں ہو سکتی تھیں۔ وہ تھک گئی تھیں۔ بڑی طویل اور تنہا مسافت تھی ان کی۔ وہ بھی شاید انتظار میں تھی کہ کوئی آکر پوچھے۔

''مازن!''

☆☆☆

''مجھے بتانا تھا کہ آپ بہو پسند کرنے کی ذمہ داری خود کو تفویض نہیں کر پائیں گی۔'' بڑے دنوں بعد وہ رات کے کھانے کے بعد ان کے درمیان ڈرائنگ روم میں آیا تھا۔ اس گھر کے لیے مازن کی متوقع حیثیت کا تعین ہو جانے کے بعد اُس مکان کا راز بہر حال کھلنا ہی تھا۔

''ارے واہ!'' عظمیٰ کی آنکھیں خوشی سے روشن ہو گئی تھیں اس نے ماں سے نظر ہٹالی۔ وہ بہت برا بیٹا ثابت ہونے والا تھا۔

''مطلب تم ہماری بہو کا انتخاب کر چکے، بہت خوب!'' سعادت حسین نے چائے کا مگ واپس رکھا۔ اس وقت وہ دونوں بہانے سے سارہ کو گھیرے تھے مقصد اس سے مازن کے تعلق سے بات کرنا تھا

مگر اس سے پہلے ہی حارث چلا آیا۔

"کون ہیں؟ کیا میں جانتی ہوں انہیں؟" سارہ سراپا اشتیاق تھی۔

"ہمم۔" اس نے سر جھکایا پھر ایک گہری سانس لے کر اوپر دیکھا۔

"کون؟"

"عدیمہ۔" کمرے میں یوں سکوت چھایا جیسے وہاں کوئی موجود نہ ہو، ہوا بھی نہیں۔

"عدیمہ۔ جبور کی اردو ٹیوٹر؟" سب سے پہلے عظمیٰ سنبھلیں۔

"جی۔" وہ سعادت حسین کی طرف دیکھنا چاہتا تھا لیکن جانے کیوں آنکھیں اس طرف نہیں اٹھ رہی تھیں۔

"وہ انگیجڈ ہے حارث۔" کسی خیال نے انہیں چونکا کر روک دیا۔

انہوں نے بت بنی سارہ کو دیکھا پھر سعادت حسین کو ان کے چہرے پر نا سمجھ میں آنے والے تاثرات تھے۔ وہ اپنی جگہ چھوڑ کر بے قراری ان کے برابر میں بیٹھ کر ان کی پشت سہلانے لگیں۔

"آپ ٹھیک ہیں سعدی؟" ان کے لہجے کی محبت اور تشویش حارث کا وہی احساس جگا گئی، جو کہیں دبک گیا تھا۔

"پاپا!" روہانسی سی سارہ اٹھ کر ان کے دوسری طرف آئی اور ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے۔

"میں ٹھیک ہوں۔" انہوں نے جیسے کسی بوجھ کے ساتھ سر اٹھا کر دونوں کو باری باری دیکھا۔ سارہ کا ہاتھ تھپتھپایا اور عظمیٰ کو دیکھ کر مسکرائے۔

"ہم اس پر پھر بھی بات کریں گے۔" انہوں نے حارث کو دیکھ کر کہا۔

"نہیں۔ ساری باتیں اسی وقت ہو جائیں پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔" اس کے کاٹ دار اور تلخی لہجے پر ان کے دل نے غوطہ کھایا۔

"یہ تم کس ٹون میں بات کر رہے ہو؟" عظمیٰ نے برہم ہو کر بیٹے کو ٹوکا۔

"یہ خود ہی آپ کو اس کی وجہ بتا دیں گے۔"

"حارث کہاں سے سیکھی تم نے یہ بدتمیزی؟" وہ ایسی شدید مشتعل کم ہی ہوتی تھیں۔

"پہلے ان سے پوچھیں عدیمہ کا نام سن کر ان کا یہ حال کیوں ہوا ہے۔" وہ اپنا آپ کھو چکا تھا۔ سارہ حیران پریشان سی سب کی شکلیں دیکھنے لگی۔ سعادت حسین اب بھی صوفے پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"چپ ہو جاؤ حارث! خدا کے واسطے چپ ہو جاؤ۔"

"میں اب تک چپ ہی تھا مما! اب نہیں رہوں گا اس انسان کی اصلیت۔"

"تم جاؤ یہاں سے میں اپنے گھر میں یہ جاہلانہ بیہودہ بکواس قطعی برداشت نہیں کر سکتی۔" اس کی ماں اسے ہی گھر بدر کر رہی تھی۔ سارہ اونچی آواز میں رونے لگی تھی۔

"آپ نے اس آدمی کا اصلی چہرہ نہیں دیکھا ہے مما، یہ سب کو دھوکا دیتے رہے ہیں اب بھی دے رہے ہیں، یہ محبت اور شرافت سب ڈھونگ ہے ان کا۔" اسے ڈائری میں لکھے وہ الفاظ یاد آ گئے جو اس حقیقت کے بعد اسے زہر میں بجھے تیر کی طرح لگے تھے، جو اس کی ماں کے لیے نہیں کسی غیر عورت کے لیے لکھے گئے تھے۔

"اوہ حارث! میں بھول گئی تھی تمہاری رگوں میں ایک فریبی کا خون دوڑ رہا ہے۔" عظمیٰ کے الفاظ جس گہرے دکھ سے ابھرے تھے ویسی ہی اجنبیت کی گہری کھائی میں اسے گرا گئے۔ اس نے سینے میں ایسی اذیت ایسی آگ کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

"آپ ہوش میں آئیں مما، اور ان سے پوچھیں عدیمہ سے کیا رشتہ ہے ان کا، زبان نہیں ہے اب ان کے منہ میں، اپنی میٹھی باتوں سے یہ ہم سب کو مزید بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

اس کی بات کے درمیان وہ مسلسل اسے پکارتے ہوئے رکنے کو کہہ رہی تھیں لیکن آج وہ رکنے والا نہیں تھا۔

"سارہ، مازن کو پسند کرتی ہے اور عدیمہ اس کی فیانسے ہے، اب انہیں فیصلہ کرنے دیں کہ دونوں بیٹیوں میں کون زیادہ عزیز۔"

چٹاخ کی آواز گونجی اور پھر کمرے میں اس طوفان سے لمحوں پہلے والا سکوت طاری ہوگیا۔ سارہ نے اپنی آواز روکنے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھا ہوا تھا اور پھٹی آنکھیں حارث پر جمی تھیں۔ عظمیٰ نے دوسرا طمانچہ مارا پھر تیسرا۔ وہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔

"عظمیٰ!" سعادت حسین کی کمزور سی آواز ابھری اور انہوں نے فضا میں اٹھا ہاتھ دوسرے ہاتھ کے ساتھ چہرے پر رکھا اور رونے لگیں۔ وہ کسی طرح کھڑے ہوئے اور ان کے پاس آکر ان کے پیچھے بازو پھیلایا۔

"سارہ اور تمہارے علاوہ میری کوئی اولاد نہیں ہے۔" انہوں نے پہلے سارہ کو پھر حارث کو دیکھا۔

"پاپا۔" سارہ دوڑ کر ان کے پاس آئی جو اتنی دیر میں ہی برسوں کے بیمار اور لاغر لگ رہے تھے۔

"بچے اب بڑے ہوگئے ہیں۔" پھر انہوں نے بیوی کو دیکھا۔

"آؤ انہیں سب سنائیں!"

☆☆☆

عظمیٰ والدین کی اکلوتی اولاد تھیں اور اس حساب سے ضد اور من مانی کی عادی بھی۔ ماں اور خاندان والوں کی مخالفت کے باوجود وہ پڑھائی کے لیے امریکہ گئی تھیں۔ وہیں ان کی ملاقات حمید رحمانی سے ہوئی اور ایسا طوفانی عشق ہوا کہ انہوں نے شادی کر لی۔ انہیں ماں باپ کی ناراضی کی بھی پروا نہیں تھی۔ ہوش اس وقت ٹھکانے لگے جب شادی کے چار ماہ بعد وہ امید سے ہوئیں اور حمید نے اپنا پلہ جھاڑ لیا۔ عظمیٰ کی حد بندیاں ختم کرنے کی خاطر اس نے نکاح کیا تھا ورنہ وہ ڈال ڈال کے مزے لوٹنے والا آزاد پنچھی تھا۔

عظمیٰ ایک دم آسمان سے زمین پر آئی تھیں۔ باپ کو علم ہوا تو وہ دوڑے دوڑے ٹوٹی بکھری بیٹی کے پاس پہنچے۔ جو شدید ذہنی دباؤ اور مایوسی سے گزر رہی تھی۔ وہ حارث کی ولادت تک بیٹی کے پاس رکے رہے۔ اس قیام میں ان کے ساتھ ان کے معتمد خاص سعادت حسین بھی تھے۔ خاندان کا یہ یتیم و یسیر بچہ بچپن سے ان کے ساتھ تھا۔ اس کی ایمان داری، ذہانت اور شوق دیکھ کر انہوں نے اسے پڑھایا لکھایا اور پھر اپنے کام میں بھی شامل کر لیا تھا۔ سعادت حسین نے انہیں کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔ یہاں بھی انہوں نے عظمیٰ کو دوبارہ زندگی اور جینے سے رغبت دلائی۔

وہ زچگی کے بعد بھی شدید ڈپریشن میں تھیں۔ وہ اس حال میں بیٹی کو واپس ملک نہیں لے جانا چاہتے تھے اس لیے خود ملک لوٹنے سے پہلے بیوی کو امریکہ بلایا اور سعادت حسین کو ان دونوں کے پاس چھوڑ دیا۔ پیدا ہوتے ہی حارث آیا کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ اسے جو پہلی محبت بھری گود اور اپنائیت بھرا لمس ملا وہ سعادت حسین کا تھا۔ عظمیٰ بچے کو دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھیں لیکن آہستہ آہستہ وہ ننھی جان جو ان کے وجود کا حصہ تھی ان کی ممتا کو بے دار کرنے میں ثمر یاب رہی۔

کچھ وقت بعد جب نانا واپس آئے تو وہ پھر سے مسکرانے لگی تھیں۔ انہیں بیٹی کی خوشیاں دنیا میں سب سے بڑھ کر عزیز تھیں۔ یہ مسکراہٹ وہ ہمیشہ اس کے چہرے پر دیکھنا چاہتے تھے تو اس خواہش میں انہوں نے سعادت حسین سے اپنے احسانوں کی قیمت مانگ لی۔ وہ جو اپنے پہلے ہی محسن کے حکم پر عظمیٰ کے ساتھ تھے، اس بار بھی سر تسلیم خم کر دیا لیکن اس کی قیمت ان کے ساتھ کسی اور نے بھی ادا کی تھی۔

جسے وہ اپنی محبت کا یقین دلا کر پیچھے انتظار سونپ آئے تھے اور پھر یہیں کسی کے ہو گئے۔ انہوں نے اپنے حالات، مجبوری اپنے دل کا حال اسے لکھ بھیجا۔

"نور! اللہ نے انسان کے بس میں وہ جذبے رکھے ہیں جن پر اس کا اختیار نہیں ہوتا جیسے میں خود کو تم سے محبت کرنے سے روک نہ سکا اور اب خود کو

بڑے ابا کا حکم ماننے سے نہیں روک پا رہا ہوں۔ یہ وہی بڑے ابا ہیں جنھوں مجھے کالج بھیجا اور وہاں مجھے تم ملیں، میری زندگی کی سب سے خوب صورت یاد، بات، سوغات۔ تم ہو نور! اور اب مجھے سب کچھ دینے والا جس میں تم بھی شامل ہو، میرے آگے ہاتھ جوڑ کر کچھ مانگ رہا ہے تو کیا میں اسے مایوس کر سکتا ہوں؟

تم ہمیشہ ناراض ہوتی تھیں ناں کہ میں نے آج تک تم سے کوئی وعدہ نہیں کیا، تو سنو! میں نے تمہارے ذات سے منسلک سارے وعدے خود سے کیے تھے۔ اگر میں بڑے ابا کو انکار کر دوں اور تمہیں اپنا لوں تو کیا ایک احسان فراموش خود سے کیے وعدے پورے کر پائے گا؟ تم مجھے جانتی ہو اور میں تمہیں، مجھے میرے لیے تمہارا فیصلہ پتا ہے اور تمہیں تمہارے لیے میرا۔ میں جانتا ہوں تم مجھے میرے وعدوں سے وفا نبھاتے دیکھنا چاہو گی سو نور خوش رہنا، مسکراتی رہنا کہ محبت سفر بھی تو ہے مسلسل سفر آخری سانس تک جاری رہنے والا سفر!''

شادی کرتے ہوئے نہ عظمیٰ نے سوچا تھا نہ سعادت حسین نے کہ اپنے حصے کی محبت گر چکنے والے دنیا کے خوب صورت ترین رفاقت کے گواہ اور شریک ہوں گے۔

عظمیٰ کی ساری ضد، ہٹ دھرمی اور تنفنا حمید کے دھوکے کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔ انہیں والدین کو پہنچائے زک کا احساس تھا۔ سعادت حسین سے شادی انہوں نے اسی وجہ سے کی تھی کہ وہ مطمئن اور خوش رہیں۔

ان کے مابین پہلا رشتہ سامع اور متکلم کا تھا۔ سعادت حسین کہتے تھے وہ سنتی رہتیں۔ ان کی باتوں نے ہی انہیں صدمے اور دکھ کی کیفیت سے نکالا تھا۔ پھر حارث کے لیے ان کی بے غرض پدرانہ شفقت دیکھ کر ان کے اندر کی ممتا جاگی۔ انہوں نے حارث کو حمید کی نہیں اپنی اولاد، اپنے جگر کا ٹکڑا قبول کیا۔ پھر وہ حارث کے والدین بنے اور حارث کی پرورش تربیت کے ہدف، عزم کے گرد گھومتے گھومتے وہ ٹکرائے، ساتھ مسکرائے، قہقہے لگائے پھر وہ ہاتھ تھام کر چہل قدمی کرنے والے دوست بنے جو ساتھ ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے دکھ سکھ اور سب کچھ بانٹتے ہیں۔ عظمیٰ نے بتایا وہ کیسے حمید سے ملیں اور دھوکا کھایا اور سعادت نے سنایا وہ کیسے اپنی زندگی کی سب سے انمول ہستی نور سے ملے، کیسے محبت نے انہیں سرشار کیا کہ اب وہ قسمت کی ستم ظریفی پر بھی شکوہ کناں نہ تھے پھر ایک چھت کے نیچے رہنے والے، ایک دوسرے کے لیے کھلی کتاب سے دوستوں کے لیے اگلا قدم اپنے رشتے کو ساری جزئیات سے ساتھ قبول کرنا ہی تھا۔

عظمیٰ کا اعتماد لوٹ آیا تھا۔ جب وہ خود کو دنیا کا سامنا کرنے کے قابل سمجھنے لگیں تو وہ، اپنے دیس لوٹ آئے۔

نانا نانی کی وفات کے بعد کاروبار اب سعادت حسین سنبھالتے تھے۔ کئی افواہیں اڑیں اور چہ مہ گوئیاں ہوئیں لیکن انہوں نے اسے اہمیت نہ دی۔ وقت کے ساتھ سب دم توڑ گئیں۔

زندگی رواں دواں تھی کہ ایک دن انہیں نور مل گئیں جس نے انہیں دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ وہ بے چین ہوا تھا۔ انہیں تو تسلی تھی کہ انہوں نے اپنی محبت کی کہانی کو صحیح وقت پر خوبصورت موڑ دے کر چھوڑا تھا۔ کسی ان کہی کا بوجھ رکھا تھا نہ کوئی راز۔ انہیں یہ بے قراری نور کے گھر تک لے گئی اور وہاں جو انکشاف ہوئے وہ ان کی ہستی تہس نہس کر گئے۔

''میں چاہتی تھی وہ آپ سے غصہ ہو، نفرت کرے اسی طرح وہ شادی کے لیے راضی ہو سکتی تھی۔ لیٹر کے بعد آپ کی مجبوری اور محبت اسے بھی کہیں اور دیکھنے نہ دیتی، نہ وہ شادی کے لیے مانتی نہ آگے بڑھتی۔''

''آپ غلط تھیں، وہ میرے ان وعدوں کی خاطر پوری آمادگی کے ساتھ خوش رہ سکتی تھی، آپ نے اپنی بہن کو سمجھا نہ محبت کو۔'' ایسا دکھ تو انہوں نے

نور سے بچھڑ کے بھی محسوس نہ کیا تھا۔ جو ہجر محبوب کی آسودگی کے یقین کے سبب آسودہ تھا، اب آبدیدہ اور رنجیدہ تھا۔

عظمیٰ کے لیے شوہر کا دکھ اپنا دکھ تھا سو وہ نور سے ملیں۔

"زندگی کچھ لوگوں کو تمام عمر تنگ رسی پر چلاتی ہے اور اس پر سعادت جیسی ثابت قدمی سب کے بس کی بات نہیں۔ ان کے سامنے دونوں آپشن اپنے خسارے والے تھے اور انہوں نے دو دلوں کے مقابلے میں کئی زندگیوں کو چنا۔ احساس جرم کے بوجھ سے دبا، ایک ادھورا بٹا ہوا انسان کسی کو خوش نہیں رکھ سکتا یہ سچ انہوں نے قبول کیا اور آپ کو بھی سمجھایا تاکہ آپ خود کو دوش دیے بنا، کسی سے نفرت کیے بنا آگے بڑھیں۔ انہوں نے مجھے اور حارث کو بچایا، بوڑھے والدین کی واحد امید کو زندہ رکھا، وہ دنیا سے مطمئن رخصت ہوئے وقت، قسمت، حالات، لوگ جنھوں نے بھی انہیں بہتر مقام پر پہنچایا تھا سب نے مل کر اس کا خراج بھی وصول کیا۔ انہیں یقین تھا کہ آپ بھی جانتی ہیں کہ ان جیسا حساس انسان احسان فراموشی کے بعد اپنے وعدوں کا پاس نہیں رکھ سکتا، وہ اپنے ساتھ جڑنے والے شخص کو بھی اپنے دکھ اور ملال سے رنجیدہ ہی کرے گا۔ اپنا یہی سچ انہوں نے آپ کو لکھا تھا اس یقین کے ساتھ کہ آپ اس سچ کے بعد جہاں رہیں گی آسودہ اور پرسکون ہوں گی۔ یہ ان کی خود سے کیے وعدے پورے کرنے کی سعی تھی۔"

نور جو وقت کے تھپیڑوں کو قسمت کا لکھا مان لینے کے بعد بھی ایک کسک اور چبھن سے پیچھا نہیں چھڑا پائی تھی، عظمیٰ کے گلے لگ کر ٹوٹ کر رو پڑیں۔ یہی بے یقینی تو ان کی زندگی کا روگ تھی کہ وہ شخص ایسا تو نہیں تھا، پھر کیوں خاموشی سے چلا گیا کہ اپنے جذبات کی رائیگانی کا دکھ جدائی سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ وہ ویسا ہی تھا جیسا ان کا یقین تھا یہ سچ انہیں جیسے دوبارہ زندگی دے گیا تھا۔ اس نے انہیں تنہا تو نہیں چھوڑا تھا بلکہ آگے کی راہ کے لیے وعدوں کے مان کا زاد راہ ساتھ کیا تھا۔ وہ برسوں بعد پرسکون ہوئی تھیں۔ ان کے دل سے پھانس نکل گئی تھی۔ جنہیں محبت نبھانی ہو وہ ہر حال میں نبھاتے ہیں سو انہوں نے بھی خوش اور متبسم رہنے کا فیصلہ کرلیا۔

وہ بہن سے ناراض رہیں، کئی دن ان میں بات چیت بند رہی لیکن پھر بہنوں کی محبت جیت گئی۔ انہوں نے اسے معاف کر دیا۔ دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ کر خوب روئیں۔

"یہ نور کو تکالیف اور آفتوں سے دور رکھنے کا وعدہ ہی تھا جو سعدی تب سے اس گھر کی فائنانشل مدد کر رہے ہیں، وہ اس کٹھن وقت میں انہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتے تھے، جو ان کے اختیار میں تھا انہوں نے کیا جسے تم نہ جانے کیا کچھ بیٹھے۔" نڈھال سی عظمیٰ نے صوفے سے پیٹھ لگائی۔ سارہ دم بخود تھی اور حارث سر جھکائے تھا اور اسے لگا اب بھی وہ یہ جھکا سر ان کے سامنے اٹھا نہیں سکے گا۔

☆☆☆

"سچ کہوں تو حادثے کے بعد جب سعادت حسین نے مجھ سے نور کے علاج اور تمہاری تعلیم کے اخراجات اٹھانے کی بات کی تو میرے اندر اطمینان اترا تھا۔ میں اس وقت تک پائی پائی جوڑنے کی مشقت سے تنگ آگئی تھی۔ تم ذہین اور قابل تھے۔ اسکول سے ہی اسکالرشپ پر پڑھ رہے تھے۔ کالج میں بھی تم نے پیسوں کے لیے کبھی اپنی ماں سے تقاضہ نہیں کیا تھا لیکن میرے تینوں بچوں کو پیسہ چاہیے تھا، ایک اچھی زندگی کے لیے معقول تعلیم لازمی تھی، دو بیٹیوں کا بوجھ تھا۔ میں نے اس بار بھی خود غرضی سے سوچا۔

سعادت حسین کو علم تھا ہم بہنیں ایک ہی فون استعمال کرتی ہیں اور انہیں جو اور جتنا کہنا تھا وہ میسج اور کال پر نہیں ہو سکتا تھا اسی لیے انہوں نے خط کا سوچا اور وہیں ان سے غلطی ہوئی۔ جن دنوں اتفاق سے وہ خط ڈاکیے سے میں نے لیا تھا ان ہی دنوں

میرے لیے تمہارے تایا اور خالو کا پیام زیر غور تھا۔ ان لوگوں کی شرط تھی کہ ہم دونوں بہنوں کی شادیاں ان کے بیٹوں سے ہو۔ نورافشاں کے لیے رشتوں کی کمی نہ تھی لیکن میری گہری رنگت اور کم صورت کے لیے یہ ہی واحد رشتہ تھا۔ ساری عمر اماں ابا کے سینے پر بوجھ بنے رہنے سے اچھا تھا میں انہیں بیک وقت دونوں بیٹیوں کے بوجھ سے آزاد کر دیتی۔ ویسے بھی سعادت حسین والا قصہ ختم ہو چکا تھا وہ خط اسے نئے زخم دینے کے سوا اور کس کام کا تھا۔ مجھے پیار محبت میں دلچسپی تھی نہ اس کے فلسفے کو کبھی سمجھا تھا۔ تب بھی میں نے اپنے مقصد کے لیے نورافشاں کو استعمال کیا تھا اور پھر سعادت حسین کو۔ مجھے یہ تم سے چھپانا تھا، اول تو تم بلا کے خوددار ہو اور ماں کی جوانی اور محبت کی یہ داستان کسی بیٹے کو پسند نہیں آسکتی جب کہ ماں بیوہ اور بیمار بھی ہو اس لیے میں نے وہ کہانی گھڑی اور تم نے ہمیشہ کی طرح اپنی خالہ کا یقین کر لیا۔" وہ رو رہی تھیں۔

"میں جانتی تھی میں سب کے ساتھ دھوکا کر رہی ہوں۔ سعادت حسین، اپنی بہن، تم، اپنے بچے سب لیکن مجھے بچوں کی خاطر خود کو اپنی نظروں میں گرانا منظور تھا۔ میں نے ساری عمر غلط فیصلے کیے اور پچھتاتی رہی، احساس جرم کی مار سہتی رہی او پھر انہیں درست کرنے کے لیے بھی غلط فیصلے کر بیٹھی۔ میں نے تمہارے ابو کی وفات کے بعد اسی لیے نورافشاں کو ساتھ رکھا کہ اس کی بیوگی مجھے اپنا قصور لگتی تھی، یہ سب کرتے ہوئے میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی کہ ددھیال والوں کے طنز اور لاتعلق رویے نے تمہیں حساس اور رنجیدہ کیا۔

میں تم دونوں کو ابا کے پاس جانے دیتی تو شاید اس کی دوسری شادی ہو جاتی۔ میں نے ایسے ہی عدیمہ کو نظر انداز کر کے عیب دار بنا دیا پھر اس کی تلافی کے لیے اب میں پھر زبردستی تم دونوں کی شادی کرنے جا رہی ہوں، تمہارے خلوص اور فرماں برادی کو استعمال کر رہی ہوں۔ زندگی نے مجھے جن امتحانوں سے گزارا ان امتحانوں سے نپٹنے کی عقل نہیں دی۔ مجھے اپنی ساری غلطیوں اور برائیوں کا احساس ہے، میں سب کا اعتراف کرتی ہوں اور ان سب کے لیے تم سے معافی چاہتی ہوں۔"

انہوں ہاتھ جوڑے۔ وہ اٹھ کر ان کے پاس آیا اور ان بندھے ہاتھ پکڑ کر نیچے کیے۔

"نہیں خالہ۔ آپ نے راز چھپائے تھے یا راز سنبھال کے زندگیاں بچائی تھیں، آپ خود غرض تھیں یا آپ نے جذباتیت اور اخلاقی اصول طاق پر رکھ کے سب کے لیے سہولت کو چنا تھا، جو بھی تھا مجھے کسی بھی طرح آپ کو جج کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آپ نے سامنے موجود آپشنز میں سے اپنی سمجھ کے مطابق جو مناسب اور موزوں راستہ تھا ہمیشہ وہ منتخب کیا۔ زندگی نے جو آپ کے آگے رکھا اس پر شکوے شکایت یا صحیح غلط کے بجائے، ضروریات کو دیکھا تھا جو سب سے بڑی حقیقت ہے۔ آپ پر گزرے حالات آپ کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی میں نہیں جانتا لیکن ابھی آپ کی باتوں سے مجھے ادراک ہوا کہ آپ نے اتنا سب اکیلے جھیلا ہے، آپ ساری عمر تنہا رہی ہیں۔" کیسے دل پر لگی تھی یہ بات! ایک عمر کی مسافت اور ریاضت کے بعد کوئی چھاؤں آئی تھی۔ وہ جو ذرا سنبھلیں تھیں ایک دم ان کے رونے کی آواز تیز ہو گئی۔ مازن نے انہیں اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کی آنکھیں بھی نم ہو رہی تھیں۔

انہوں نے بالکل سچ کہا تھا یہ کہانی اسے پہلے معلوم ہوتی تو وہ سعادت حسین کی مدد لازمی ٹھکرا دیتا تھا۔ اتنا ہی نہیں ان کے گھر میں گھس کر ان کا گریبان بھی ضرور پکڑتا مگر اب وہ دنیا کے سب سے حسین طلسم سے واقف تھا اس لیے اس سحر کی زد میں آئے کسی بھی انسان کو سمجھنا اس کے لیے سہل تھا۔

صحن میں کھڑی عدیمہ سمجھ نہیں پا رہی تھی اندر جائے یا اپنے کمرے میں۔

"مجھ سے اچھا بیٹا تو مازن ہے۔" اس نے دکھ سے سوچا۔

"میری ماں کو مجھ سے بہتر سمجھتا ہے۔" اسے پہلی بار احساس ہوا تھا وہ اپنے خول میں بند جی رہی تھی۔ دوسروں سے شکوے رکھنے والی نے خود اپنی ذات سے آگے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا اپنی ماں کو بھی نہیں۔

مازن کے فون کی رنگ پر وہ تینوں اپنی جگہ چونکے۔

"ہیلو۔" نرسنگ ہوم سے فون تھا اور اطلاع اچھی نہیں تھی۔ جب عدیمہ اور نور افروز نکلنے کی تیاری کر رہی تھیں، اس نے باہر سمیر اور ثوبیہ کے بعد سعادت حسین کو فون لگایا۔

'سیوا نرسنگ ہوم' میں نور افشاں نے جب آخری سانس لی تو ان کی زندگی کے سارے اہم رشتے ان کے گرد موجود تھے۔ بس حارث کا کچھ پتا نہیں تھا۔

ایک کردار کی کہانی آج مکمل ہوئی تھی۔

☆☆☆

پانچ سالوں سے ان کی زندگی میں نور افشاں کا وجود نام اور ذکر کی حد تک تھا، پھر بھی ایک خلا سب محسوس کر رہے تھے۔ ان کی روح جیسے اسی انتظار میں تھی کہ ان کی داستان نے جو الجھنیں پیدا کی ہیں وہ سلجھ جائیں تو وہ بھی پرواز کرے۔

سعادت حسین ڈائری میں، رقم لفظوں پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ پیچھے سے کسی نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"تم نے یہ لکھ رکھا تھا۔" وہ پلٹے بنا گویا ہوئے۔

"جیسے آپ کو لفظ بہ لفظ یاد تھا ویسے ہی مجھے بھی یاد کرنا تھا، میں نے محبت کو اس سے بڑھ کر حسن اور حزن سے بیان ہوتے کبھی نہیں سنا تھا۔"

وہ نور افشاں کو لکھے ان کے خط کا متن تھا۔ انہوں نے ڈائری بند کی اور پیچھے مڑے۔

"حارث آیا؟"

"نہیں۔" وہ اس دن کے بعد سے گھر نہیں آیا تھا۔ سارہ نے اسے نور افشاں کی وفات کا پیغام بھیجا تھا لیکن اتنے دن بعد بھی، اس نے اب تک کسی سے رابطہ نہیں کیا تھا۔

"یامین کو ضرور پتا ہوگا کہ وہ کہاں ہے، آپ پوچھیں اس سے۔"

"یامین کے گھر سے ہی تو ان سب کی ابتدا ہوئی تھی میں نہیں چاہتا کہ انہیں ان سب کا بھی علم ہو۔"

حارث نے عظمیٰ کے پوچھنے پر بتایا تھا کہ سعادت حسین ان سب کی مدد کرتے ہیں، اس کی اطلاع عدیل انکل نے بطور ثبوت بینک اسٹیٹمنٹ کے ساتھ دی تھی۔ انہیں سعادت حسین جیسے کم تر کا یوں اعلیٰ وارفع مقام حاصل کر لینا برداشت نہیں ہوتا تھا وہ ساری عمر موقعے کی تاک میں تھے جو انہیں بڑی دیر سے ملا تھا۔

"ہم نے بنیاد مضبوط نہیں رکھی تھی عظیم، ورنہ کوئی ہمارے فیملی کو یوں توڑنے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا۔"

"ایسا نہیں ہے سعدی۔ اگر بنیاد کمزور ہوتی تو سب سننے کے بعد حارث شرمندہ نہیں بلکہ شیر ہو جاتا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہے اور یہ ہماری کامیابی ہے، خود سے یہ کریڈٹ نہ چھینیں۔" وہ کچھ رکیں۔

"غلطی تو مجھ سے ہوئی ہے میں نے اسے خون کا طعنہ دیا تھا۔" تب سے وہ پچھتا رہی تھیں۔

"مما پاپا۔!" سارہ دوڑتی پکارتی آئی تھی۔

"بھائی کی کار۔ ابھی اندر آئی ہے۔"

وہ تینوں ڈرائینگ روم میں پہنچے اسی وقت وہ بھی اندر داخل ہوا۔ وہ اس فوری سامنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جھجک اور شرمندگی سے وہ اب بھی زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ اس کے قدم وہیں تھم گئے تھے۔

''حارث!'' سعادت حسین نے آگے بڑھتے ہوئے بانہیں پھیلائیں۔
''پاپا!'' وہ پیروں میں گرنا چاہتا لیکن انہوں نے اسے بھینچ کر گلے لگایا۔
''اس دنیا میں مجھے پاپا کہنے والی تم میری پہلی اولاد ہو حارث۔'' ان کی آواز بھیگی تھی۔
گلے میں پھنسے آنسو اسے کچھ بھی کہنے سے روکے تھے۔ ویسے بھی وہ سب آنسوؤں سے کہہ تو رہا تھا۔

☆☆☆

''مجھے نہیں پتہ تھا تم اتنے بزدل ہو۔'' وہ چائے کا کپ میز پر رکھ کر دور کھڑی ہوگئی۔
''بزدل۔ اور میں؟'' اس کی حیرت بجا تھی۔
''پڑھاتے پڑھاتے محبت کی کتاب پڑھ لی پڑھادی تو اسی کی بات پر منہ کیوں نہیں کھولا؟'' وہ ڈپٹ رہی تھی۔ مازن نے چائے کا کپ اٹھالیا۔
''کیوں کہ تب تک مجھے علم نہیں تھا کہ وہ کتاب ادھر بھی پڑھی جارہی ہے۔''
''تو اب اپنے منہ سے کہہ دو۔'' وہ واپس جانے لگی۔
''ایک شرط پر۔'' وہ مڑی۔
''پہلے تمہاری سرجری ہوگی پھر شادی۔''
''ٹھیک ہے۔'' کچھ دیر بعد اس نے کہا۔
اس کا پیر ماں کے لیے اذیت تھا، ان کی کوتاہی کا جیتا جاگتا چلتا پھرتا احساس جرم اور وہ انہیں مزید سزا دینے کی گناہ گار نہیں ہونا چاہتی تھی۔
''ایک بات کلیئر کردوں، میں تمہاری شادی کی بات کررہا تھا۔'' مازن نے پیچھے سے ہانک لگائی۔ وہ دروازہ بند کرکے باہر آگئی۔
اس دن کے بعد سے اس نے حارث کو دیکھا نہیں تھا۔ سعادت حسین کا کردار واضح ہونے کے بعد اس نے اس دن والے حارث میں، بہت کچھ نیا اخذ کیا تھا۔ بے خیالی میں ہی وہ کانٹیکٹس میں 'گلے پڑے' ہی نکال بیٹھی تھی۔ اس کا فون کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس نے چیٹ کھول کر دیکھی، آخری اس نے ٹیوشن کے اوقات کے جواب میں 'اوکے' لکھا تھا۔ وہ ایسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی کہ رنگ کی آواز پر فون ہاتھ سے چھوٹ گیا۔
صبور جانے سے پہلے اس سے ایک بار ملنا چاہتی تھی۔ کچھ دیر بعد ساجد اسے لینے آگیا۔ اس نے اسے کچھ اردو کتابیں اور ایک ڈیزائنر جوڑا تحفے میں دیا اور اپنے والدین سے بھی ملوایا۔ جب وہ واپسی کے لیے باہر آئی تو کار نہیں تھی۔
''ساجد کہاں چلا گیا؟'' صبور نے پورچ میں بیٹھے یامین سے پوچھا۔
''میں نے اسے کام سے بھیجا ہے۔ باہر دوسری کار ہے، انہیں گھر ڈراپ کردے گی۔'' وہ وہیں اس سے وداع لے کر گیٹ کے باہر آئی۔ سامنے کھڑی 'سفید کیہ' دیکھ کر آج وہ نہ دنگ ہوئی نہ کوفت زدہ۔ اسے علم تھا باہر کون منتظر ہوگا۔
پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے اس نے نہ ادھر ادھر دیکھا نہ کچھ کہا۔ خلاف امید حارث خاموش تھا۔ اس نے شیشے کے پار دیکھنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ یہ اتفاق نہیں تھا تو آگے بھی کچھ معمول کے مطابق نہیں ہونا تھا۔ پچھلا ریکارڈ یہ ہی کہہ رہا تھا کار نہیں رکے گی اور کچھ دیر بعد، حارث نے بریک لگا ہی دیے لیکن وہ اس کی سمت مڑا تھا نہ باہر نکلا تھا۔
''اس دن کے اپنے رویے کے لیے آئی ایم ریئلی سوری۔'' وہ اب بھی دونوں ہاتھ سے اسٹیئرنگ تھامے تھا۔ عدیمہ نے دیکھا۔ اس کے چہرے کا ایک ہی رخ نظر آرہا تھا۔
''مجھے بہت بڑی غلط فہمی تھی اور میرے انٹینشنز بھی نیک نہیں تھے۔'' عدیمہ کا دل سہم گیا۔
''آپ نے وہ سارہ کے لیے کیا تھا۔'' عدیمہ نے جھجکتے رکتے ہوئے اس غلط بیانی کی تصحیح کی کہ یہ تو اس کے نزدیک نیک نیتی تھی۔

"صرف وہ ہی ایک ریزن نہیں تھا۔" اس نے سر اٹھا کر چھوٹے سے شیشے میں اسے دیکھا جو اسے دیکھ رہی تھی۔ حارث کے چہرے کی تشویش اور الجھن اسے بھلی لگی تھی۔

"جو بھی بات تھی، اب سارہ اور مازن کے لیے کوئی مسئلہ نہیں مازن امی سے بات کرے گا اور میں نے بھی انہیں منع کر دیا تھا۔" اس نے پھر سر جھکا لیا۔

"ان کے لیے نہیں مسئلہ میرے لیے ہے۔" اب کے اس نے بھی سامنے شیشے میں دیکھا۔ ان کی نگاہیں ملیں اور وہ رکا نہیں۔

"آپ کی طرف بڑھنے کے میرے سارے انٹینشنز غلط تھے۔ ابتدا میں، کیا یہ جاننے کے بعد بھی اب آپ میری نیت اور خلوص پر یقین کریں گی؟" اسے اتنا علم تھا کہ حارث کو سعادت حسین اور اس کے گھر کو لے کر غلط فہمی تھی لیکن وہ اس سے آگے کی بات کر رہا تھا۔

"میں نے آپ کی نیت پر کبھی شک نہیں کیا تھا لیکن۔" وہ خود کو اگلی بات کہنے کے لیے تیار کرنے کو ذرا رکی تھی۔

"عدیمہ!" وہ پورا پیچھے گھوم گیا۔

"سچ کہوں تو میں آپ سے کوئی اگر مگر نہیں سننا چاہتا، میں چاہتا ہوں، میں کہوں آپ مجھے پسند ہیں، میری فیلنگز آپ کے لیے پسند سے بڑھ کر ہے تو آپ مان لیں، یقین کر لیں لیکن اس سے پہلے مجھے کچھ سچ آپ سے کہنے ہیں، حالاں کہ وہ سنانے کے بعد بھی مجھ میں آپ کی اگر مگر کا حوصلہ اور صبر نہیں ہے۔" وہ دم سادھے سن رہی تھی۔ وہ اتنی اہم بات اتنی آسانی سے کہہ کر آگے بڑھ گیا تھا، اب اس سے اہم کیا تھا؟

"اس دن آپ کو گھر ڈراپ کرنے کی پیشکش کے پیچھے کوئی ال انٹینشن نہیں تھا لیکن گھر دیکھنے کے بعد میں اپنے آدھے سچ کی روشنی میں انتقام لینا چاہتا تھا، میرے مطابق جو دھوکا پاپا مما اور سارہ کو دے رہے تھے، حقیقت جاننے کے بعد کا دکھ جو مما اور سارہ نے جھیلنا تھا، وہی سب میں آپ کو دینا چاہتا تھا۔" وہ کہہ رہا تھا اور عدیمہ پلکیں جھپکانا بھول گئی۔

اپنی غلط فہمیوں اور ارادوں سے اسے روشناس کراتے ہوئے، وہ حد درجہ نادم تھا لیکن یہ شرمندگی وہ سزا تھی جو کاٹنی لازم تھی۔ اس نے غلطی کی تھی اور وہ اعتراف کر کے ہلکا ہونا چاہتا تھا۔ یہ نسبت اس کے لیے ایسی اہم اور ضروری تھی کہ وہ اسے شفاف رکھنے کے لیے دشوار مرحلے سے بخوشی گزرنا چاہتا تھا۔

"۔آپ جو سلوک کرنا چاہتی ہیں مجھے قبول ہے لیکن اس پر شک نہ کریں کہ اب میری زندگی میں آپ کے بنا کوئی رنگ نہیں۔"

عدیمہ کے بہت تحفظات تھے۔ اپنے احساسات کے باوجود اسے یہ تعلق بے جوڑ لگتا تھا۔ جس طرح حارث کے جذبات ایک ساتھ، ایک ہی وقت میں غلط ملط ہوئے تھے کہ وہ اس سے نفرت بھی کرنا چاہتا تھا اور اس کا دل اس کی طرف کھنچا بھی جا رہا تھا، دل میں اس کی طلب جاگ رہی تھی اور دماغ میں اسے اذیت دینے کا منصوبہ بھی، ویسے ہی اس کے ساتھ بھی تھا۔ وہ یقین کرنا چاہتی تھی مگر دل سہما سا تھا، اس کی طرف قدم خود ہی اٹھ جاتے تھے لیکن اپنی سچائی پیچھے کھینچتی تھی۔

اس کی منتظر نگاہیں عدیمہ پر ٹکی تھیں، جو عجیب کشمکش میں مبتلا کھوئی کھوئی تھی۔

"کچھ تو کہیں عدیمہ۔"

"غلط فہمی دور ہو جائے تو پھر بات ختم ہو جاتی ہے لیکن۔" اس نے دھیمی سی آواز میں کہا۔

"میرے وجود سے کہیں رنگ نہیں بھرتے بلکہ یہ۔"

"جس نے ان رنگوں کو دیکھا ہو وہ آپ سے متفق نہیں ہو سکتا۔" اس نے تیزی سے کہا اور وہ

چپ ہوگئی۔

"دنیا میں آپ واحد ہے جس کی مجھے اتنی خواہش ہے کہ میں اپنی ساری صبری کے ساتھ کچھ انتظار کرسکتا ہوں۔"

"وہ یوں کہتے ہیں کہ میں ساری عمر انتظار کر سکتا ہوں۔" اس نے زیرِ لب تبسم کے ساتھ تصحیح کی۔

"وہ میں نہیں کرسکتا اور یہ کچھ بھی اب ختم ہونے کو ہے۔"

"آپ کی من مانی کی عادت پرانی ہے۔" جھکا سر تاثرات دیکھنے میں رکاوٹ تھا لیکن آواز کی خفگی رضا با آسانی اس تک پہنچ گئی تھی۔

☆☆☆

سرخ اور سنہری عروسی لباس میں ملبوس سجی سنوری سارہ نے دائیں طرف جھک کر عدیمہ کو متوجہ کیا جو اس وقت کریم اور میرون لہنگے میں بڑی پیاری لگ رہی تھی۔

"بھائی سے رونمائی کیا ملی؟" اسے فرصت ہی اب ملی تھی۔

"بڑی ہی انوکھی جو اس سے پہلے کسی کو نہ ملی ہوگی۔" وہ دھیمے سے مسکرا کے گویا ہوئی۔

"ہیں! کیا ہے؟ مجھے بھی انوکھی چیز ملی ہے۔"

"بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہے، گھر آئیں گی تب دیکھ لینا۔" سارہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"میری والی بھی میز پر رکھنے یا دیوار پر ٹانگنے والی ہے۔" وہ بائیں طرف مازن کی اور جھکی۔

"آپ اور بھائی نے پلاننگ کی تھی؟"

"کس چیز کی؟"

"رونمائی۔"

"اتنی پرسنل چیز کی پلاننگ بندہ اکیلے کرتا ہے۔" وہ پھر دائیں طرف جھکی اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"وعدہ کہ تمہیں ہر تکلیف سے۔" عدیمہ نے مارے حیرت سے منہ پر ہاتھ رکھا اور سارہ مازن کی طرف۔

"جھوٹ تو نہ کہیں اگر پلاننگ کی بھی تھی تو ہم برا نہیں منائیں گی۔"

"یہ تو سوچو کہ اتنا یونیک آئیڈیا میں کسی اور سے کیسے شیئر کرسکتا ہوں؟" مازن نے سمجھایا۔

تب ہی کسی مہمان کو نیچے تک چھوڑنے گیا حارث واپس اسٹیج پر آیا۔

"بھائی! آپ ہی سچ قبول کرلیں۔"

"کون سا سچ؟" اس نے عدیمہ کو دیکھا جس کے چہرے پر شرمیلا سا تبسم تھا۔

"ہم دونوں کو ایک سے تحفے ملے ہیں اور یہ اتفاق نہیں۔" مازن اور حارث نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ یہ راز تو انہوں نے خود تک رکھا تھا اور یہ ہی سمجھ رہے تھے کہ ان کے علاوہ کوئی اور جانتا ہی نہیں۔ مازن نے راز داری میں سعادت حسین سے عبارت کی چند سطریں لینے کی اجازت مانگی تھی۔ یہ ہی حارث نے بھی کیا تھا اور انہوں نے حسب وعدہ اسے راز رکھا تھا۔

"اب اتنا کرنا کہ یہ کسی پانچویں کو نہ بتانا۔" حارث نے مسکرا کے سارہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر عدیمہ کو دیکھا۔ انہیں تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔

تب ہی عظمیٰ، سعادت حسین، خالہ، سمیر، ثوبیہ سب کو لے کر فوٹو گرافر کے ساتھ اوپر آئیں۔

"اب کچھ تصویریں بنالو ساتھ ورنہ یہ کام رہ ہی جائے گا۔"

"آپ سب ایک ساتھ کھڑے ہوجائیں۔" فوٹو گرافر نے پیشہ ورانہ انداز میں حکم دیا۔

حارث نے عدیمہ کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کیا۔ سارہ نے خود ہی اپنا ہاتھ آگے بڑھایا جسے مازن نے مسکرا کے تھاما۔ خوشیوں کے اس جشن پر وعدوں کے مان اور ارمان سے سجی ردا سایہ فگن تھی۔

☆☆

صوفیہ بٹ

احد

مکمل ناول

رامو جیسے جیسے بڑا ہو رہا تھا، اس کو باپ کی نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ اپنی عمر کے حساب سے ماں سے سوال کرتا پر اسے جواب نہ ملتا۔ وہ اپنی سمجھ کے حساب سے باپ کی نظر میں اچھا بننے کی کوشش بھی کرتا۔ اس کا کام بھاگ بھاگ کر کرتا۔ مگر باپ کی طرف سے اسے پیار کی ایک نظر نہ ملی۔ ہمیشہ دھتکار ملی ہمیشہ گالی ملی۔ وہ عمر بھر "مارو ڈیکرو" سننے کے لیے ترستا رہا اور وہ اسے "حرامی۔ مسلمانوں کا گند" کہہ کر بلاتا رہا۔ پہلے تو اسے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ باپ اسے مسلمانوں کی اولاد، مسلمانوں کا گند کیوں کہتا ہے اور جب شعور کی منازل طے کرتا گیا اور ہر بات سمجھ میں آتی گئی تو ایک بات لالو اور رامو کی مشترک ہوگئی۔ مسلمانوں سے نفرت۔

رامو کو لگتا تھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی وجہ وہ مسلمان ہیں جو لال پتھروں سے بنی حویلی اور اس کے پہلو میں نئی کھڑی ہونے والی سفید کوٹھی میں رہتے ہیں۔ اس نے باپ کے ساتھ ہی نہیں عمر بھر اپنے چاچے، ماموں، پھوپھی، چاچیوں کے ساتھ بھی ان کا ظلم دیکھا اور اس کی نفرت میں مزید اضافہ ہوا۔ پھر جو مہیشوری خاندان میں دیوی کی "حالت" کا ذمہ دار بھی ہمیشہ مسلمانوں کو پایا تو نفرت کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔

رام مہیشوری کے گھر اسے گنگا کا بھائی بھرت لے کر آیا تھا جو بہن سے ملنے آیا تھا اور لالو نے کسی چھوٹی سی بات پر رامو کو دھنک کر رکھ دیا تھا۔ اور اسے باہر کھیت میں پھینک آیا تھا۔ اور گنگا کو دھمکی دی تھی کہ اگر وہ اس کے پیچھے کھیت میں گئی تو رات اسے بھی گھر سے باہر ہی گزارنی پڑے گی۔ بھرت جانتا تھا کہ لالو نے کبھی بھی رامو کو اپنی اولاد نہیں سمجھا اور اس کے ساتھ ٹھیک سلوک نہیں کرتا۔ مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنی نفرت میں اس قدر شقی القلب ہو گیا ہے۔ وہ حیران ہوا دکھی بھی ہوا اور مشتعل بھی۔

"اتنی پرواہ ہے تو خود لے جا۔" لالو نے چلّاتے ہوئے کہا تھا۔

اور بھرت اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ گنگا کے لیے یہ قیامت تھی۔ وہ لالو کی منتیں کرتی رہی مگر اس نے رامو کو روکا نہیں۔ وہ بھرت کی منتیں بھی کرتی رہی مگر وہ رکا نہیں۔ اس نے بہن کو سمجھایا کہ رامو کے لیے یہی صحیح ہے کہ فی الحال وہ لالو کی نظروں کے سامنے سے ہٹ جائے۔ وہ رامو کو اپنے ساتھ اپنے گوٹھ لے آیا۔ یہاں رامو اس کی گھر والی کو قبول نہ تھا۔ اپنے سات بچے اوپر سے یہ مفت کا بوجھ۔ اس نے بھی رامو کو کسی اچھے حال میں نہیں رکھا تھا۔ ایک دفعہ گھر آیا تو گھر والی کے ساتھ جھگڑا ہوا۔ غصے میں رامو کو ساتھ رام مہیشوری کے گھر لے آیا جہاں وہ کل وقتی ملازم تھا۔

یہاں سے رامو کی نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ رامو سے امر بنا۔ گھر کی مالکن گائتری دیوی اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتی تھیں۔ اور بھرت کی زبانی اس کے باپ کے ظلم و ستم کی کہانی سن کر ان کا دل مزید پسیج گیا۔ اپنی بیٹی کے مل جانے کی آس میں وہ نیکی کے کاموں کی طرف مائل رہتی تھیں۔ انہوں نے رامو کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ پھر اسے واپس جانے نہ دیا۔ اس کا اسکول میں داخلہ کروالیا۔ اس کی کتابوں، کاپیوں، کپڑوں، جوتوں اور ضرورت کی دیگر چیزوں کا خیال رکھتیں۔ بھرت کو اس کے لیے ماہانہ خرچ دیتیں

۔بھرت اس کے لیے خود کو اتنا مصروف پاتا کہ شام میں چھوٹے موٹے کاموں میں اسے اپنے ساتھ لگا لیتا۔مہینوں بعد اسے گنگا سے ملوانے لے جاتا اور اسی دن واپس بھی لے آتا۔لالو کے لیے اب بھی وہ دشمن کی اولاد ہی تھا۔اس دن گھر میں قدم ہی نہ رکھتا جس دن اسے بھرت اور رامو کے آنے کی خبر ملتی۔

وقت گزرتا رہا۔گرمیاں سردیاں گزریں کئی بہاریں گزریں۔ رامو اور گنگا کی زندگی میں خزاں ٹھہری رہی۔گنگا نے کام میں اور دیوروں کے بچوں میں دل لگانے کی کوشش کی اور رامو نے گائتری دیوی میں ماتا ڈھونڈنے کی کوشش کی جو بیٹی کی جدائی کے غم میں بے حال رہتی تھیں۔اسے گائتری دیوی اور گنگا کا چہرہ ایک جیسا لگتا۔دونوں اولاد کی جدائی کا درد سہہ رہی تھیں۔پھر ایسا ہوا کہ گائتری دیوی کو ان کی بیٹی مل

تیرہویں قسط



گئی مگران کا چہرہ غم کی تصویر ہی بنا رہا۔ ان کی بیٹی مل کر بھی ان کے پاس نہ تھی۔ جب وہ دونوں اولادوں کی طرف سے تکلیف سہتیں تو رامو کو حال سناتیں۔ اور جب رامو باپ کی نفرت سے گھائل ہوتا تو گائتری دیوی اس کے زخموں پہ ماتا بھرا مرہم رکھتیں۔

بھرت کے گزر جانے کے بعد وہ اکیلا گوٹھ آنے جانے لگا تو دو چار دن رہ کر ہی آتا تھا۔ لالو کے رویے میں اتنی تبدیلی آئی تھی کہ اب وہ اسے مارتا نہیں تھا۔ خوراک، لباس کے لیے تو رامو ویسے بھی اب اس کا محتاج نہیں رہا تھا۔ غصے میں آ کر گالیاں وہ اب بھی اسے دیتا تھا۔ اور نفرت۔ نفرت کا گراف اتنا ہی بلند جا رہا تھا۔ عجیب بات ہے کہ اتنی نفرت سہہ کر رامو کے دل میں اس کی محبت کا گراف بھی اتنا ہی بلند جا رہا تھا۔ اسے لگتا تھا کبھی تو۔۔ کبھی تو۔

وہ کبھی اب بھی نہیں آتا تھا۔ اس کا باپ اسے "مارو ڈیکرو" کہے بغیر سینے سے لگائے بنا دنیا سے چلا گیا تھا۔ اور اس کی وجہ کون تھے۔ لال پتھروں سے بنی حویلی اور سفید ماربل سے بنی کوٹھی میں رہنے والے مسلمان۔

اسے مسلمانوں سے اتنی نفرت محسوس ہوئی کہ وہ محبت پہ غالب آ گئی۔

سب کچھ دیکھ کر بھگت کر سہہ کر بھی وہ آج دیوی کو تراش واپس نہ بھیجتا اگر جو لالو نے ایک بار "مارو ڈیکرو" کہہ دیا ہوتا۔ اس کی یہ حسرت دل پہ ایسی انمٹ روشنائی سے لکھی گئی کہ محبت بھی پنسل سے لکھی تحریر ہو گئی۔

☆☆☆

"مجھے نہیں پتا تھا کہ ابو ایسی کوئی بات کریں گے۔" ہمایوں نظریں چراتے ہوئے شرمندہ سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

اسود نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر امرود کے پیڑ پہ بیٹھے پرندوں کو۔

موسم خوش گوار تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی وہی ہوا جس کے لیے بدین مشہور تھا۔ مگر چوہدری اسود حیدر کا دم گھٹ رہا تھا جانے کیوں۔

"تم ناراض ہو مجھ سے؟" مسلسل اس کی خاموشی سے گھبرا کر ہمایوں نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"یار۔ سب کے سامنے میں ابو کو انکار نہیں کر پایا۔ لیکن میں۔"

"تمہارا قصور نہیں ہے۔ ابو بھی تو امی کو منا نہیں پائے۔" اسود نے ہمایوں کے دل کی خلش کو کم کرنا چاہا۔

چوہدری نگر کے اس بڑے سے سرمئی گیٹ والے گھر میں رشتے بے ترتیب ہونے لگے تھے۔ مومنہ اور عامر کے رشتے کو ہمایوں نے قبول کر لیا تھا۔ اپنے دل کو سمجھا لیا تھا۔ اور کوئی اس کو دیکھ کر جان بھی نہیں پاتا تھا کہ کیا غم ساتھ لیے پھرتا ہے۔ ویسے ہی مستی مذاق کرتا۔ بہن بھائیوں کو تنگ کرتا۔ رونق لگائے رکھتا۔ مگر اب ستم یہ کہ اپنے دوست جیسے کزن کو جس نام سے چھیڑتا تھا، وہ اس کے اپنے نام کے ساتھ منسوب ہونے جا رہا تھا۔ اگر اسود کے جذبات کا اسے علم نہ ہوتا تو شاید وہ ابو کی بات مان لیتا۔ لیکن اب وہ کیسے اپنے بھائی جیسے کزن اور دوست کے ساتھ یہ سب کر سکتا تھا۔ اس نے سب کے سامنے نہیں لیکن بعد میں ابو کو انکار کیا جس پہ ابو غصہ میں آ گئے تھے۔

"میرے مرے ہوئے بھائی کی نشانی ہے وہ۔ تکلیف میں ہے۔ اسے اس تکلیف سے نکالنا ہے ہم نے۔"

"ابو اسے اس تکلیف سے نکالنے کے اور بھی طریقے ہیں۔"

"مثلاً؟"

"ہم تائی کو منا سکتے ہیں۔" اور "مثلاً" میں اس کے پاس بھی ایک ہی حل تھا۔ دوسرا حل تو باقی رہا نہ تھا۔ اس کی بات ہوئی تھی اسی حل سے۔

دوہرے امتحان سے گزر رہی تھی وہ نازک سی لڑکی۔ جس کو من کا مکیں بنا لیا تھا، وہ بت پرست تھا۔ آنکھوں سے محبت بولتا تھا اور زبان سے نفرت۔ اور نفرت بھی کس سے۔ مسلمانوں سے۔

احد کو چاہنے والی اس حل احد کے ماننے والوں سے نفرت کرنے والے کے ساتھ زندگی کا سفر کیونکر طے کر سکتی تھی۔ وہ دل کو سمجھا رہی تھی کہ سب ایک ساتھ کسی کو نہیں ملتا۔ احد ملے گا یا رام۔ اس نے احد کو چن لیا تھا۔

"وہ نہیں مان رہیں تب ہی تو میں نے تمہارا نام

لیا۔" ابو نے جھنجلا کر کہا تھا۔

"تو امی مان رہی ہیں؟" ہمایوں نے جتاتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ وہ جانتا تھا کہ امی کے بھی کچھ تحفظات ہیں۔

"جو میں نے کہہ دیا، اس کا دل چاہے نہ چاہے اسے قبول کرنا ہوگا۔" ابو نے "خالص شوہروں" والا لہجہ اپنایا۔ وہی لہجہ۔ جس نے ان کو محبوب رہنے نہیں دیا تھا، صرف شوہر بنا ڈالا تھا۔

"آپ سے اچھے تو تابو ہیں۔ وہ تامی کے ساتھ زبردستی تو نہیں کر رہے۔"

"ہونہہ۔ عورتوں کو دیکھتے رہے، تو ہو گئے فیصلے۔" چوہدری سلیمان یعقوب نے سر جھٹکا۔

"ابو۔ تامی مان جائیں گی۔ تھوڑا وقت دیں انہیں۔" "ہاں۔ وقت دینے کے چکر میں بیٹھے رہیں اور ادھر وہ بنیا کروا دے میری بھتیجی کی شادی کسی ہندو کے ساتھ زبردستی۔" ابو نے نفی میں سر ہلایا اور پھر اس کی طرف دیکھا۔ "اور تمہیں کیا تکلیف ہے اجل سے شادی کرنے میں؟"

"مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔" وہ گڑبڑایا۔ پھر ڈرتے ڈرتے ان کے پاس بیٹھ کر ان کے پاؤں دبانے لگا۔ "ابو۔ اسود پسند کرتا ہے اجل کو۔"

چوہدری سلیمان یعقوب اس کی بات سن کر ایک دم چپ سے ہوئے۔

"پسند کرتا ہے تو اپنی ماں سے بات کیوں نہیں کرتا؟" کافی دیر بعد وہ گویا ہوئے۔

"وہ کر لیتا بات۔ مگر آپ نے رات سب کے سامنے جو میرا نام لے دیا تو کیسے بات کرے اب وہ تامی سے۔" جتنی شدومد سے وہ ان کے پاؤں آج دبا رہا تھا، پہلے کبھی نہ دبائے تھے۔

"ہوں۔ ٹھیک ہے وہ پاپی کو منا لے تو مجھے اعتراض نہیں۔ مگر اس کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ سوچو۔ بچی کتنی تکلیف میں ہے۔ اور جو اسود کے اپنی ماں کو منانے منانے میں اُدھر اس کی زبردستی شادی کروا دی گئی تو۔"

"نہیں۔ اسود جلد ہی کرے گا تامی سے بات۔" اس نے جلدی سے کہا تھا۔

"تو تم کرو ناں تامی سے بات۔" اب وہ آم کے باغ میں بیٹھا اسے یہی سمجھا رہا تھا۔

"میں ایک دفعہ اجل سے بات کرنا چاہتا تھا۔ چاچو نے تمہارا نام لے دیا تو پھر میں کیسے بات کرتا ان سے۔"

"ابو نے میرا نام واپس لے لیا ہے لیکن شرط یہ لگائی ہے کہ تم تامی کو جلدی منا لو۔"

امرود کے درخت پہ بیٹھے طوطے کو دیکھتے ہوئے اسود پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

☆☆☆

"جگدیش۔ دروازہ کھولو جگدیش۔"

گائتری دیوی دروازے کو دھڑ دھڑا رہی تھیں، چلا رہی تھیں مگر جگدیش مہیشوری نے دروازہ نہیں کھولا۔ گائتری دیوی کھڑکی کی طرف جاتیں، بیٹی کو بیٹے کے ہاتھوں پٹتے ہوئے دیکھتیں، پلٹ کر دروازے پہ آتیں۔ اور پھر سے اسے دھڑ دھڑانے لگتیں۔

"بس کرو جگدیش۔ بس کر دو۔" وہ بے بس ہو کر التجاؤں پہ آ گئی تھیں۔

برسوں تک گائتری دیوی کو لگتا تھا کہ جگدیش کو بہن پہ کچھ سختی کرنی چاہیے۔ اس کے اٹھے قدم وہیں روک دینے چاہئیں۔ آج ان سے برداشت نہیں ہو رہا تھا جبکہ اندر کمرے میں بھائی کے ہاتھوں پٹتی ہوئی امت الاحد برداشت کر رہی تھی۔ جو کام اس نے کر ڈالا تھا اس کے اثرات سامنے آنے میں دیر نہ لگی۔ اگلے دن ہی جگدیش مہیشوری طوفان کی طرح بھرا گھر پہنچا تھا۔ اور سیدھا اس کے کمرے میں آیا۔ دروازہ اندر سے لاک کیا اور اس کی طرف بڑھا۔ وہ جو بھاؤ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر بے اختیار بیڈ سے اٹھی تھی، اس کی آنکھیں میں اترا خون دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"راجیو کو تم نے فون کیا تھا؟"

"ہاں۔"

پہلا تھپڑ۔

"تم نے کہا کہ تم اس سے شادی نہیں کرو گی؟"

"ہاں۔"

دوسرا تھپڑ۔

"تم نے کہا کہ تم مسلمان ہو چکی ہو۔"

"ہاں۔"

تیسرا تھپڑ۔ اور پھر تھپڑوں کی گنتی ختم ہوئی۔ ٹھڈے مکے لاتیں گھونسے۔ کوئی گنتی نہ رہی۔ جگدیش مہیشوری نے اسے اتنا مارا کہ اس کا جسم لہولہان ہو گیا۔

"بولو کہ تم مسلمان نہیں ہو۔" جگدیش مہیشوری نے بالوں سے کھینچ کر اس کا چہرہ اپنے سامنے کیا۔

"کہو کہ تم مسلمان نہیں ہو۔" جگدیش مہیشوری نے بالوں کو ایسا جھٹکا دیا کہ اس کے سامنے سب کچھ گھوم گیا۔

"لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔" اس کے منہ سے نکلا۔

اتنے زور کا تھپڑ اس کے منہ پہ پڑا کہ وہ دوسری طرف جھکی۔ سر ڈریسنگ ٹیبل کے کونے سے جا ٹکرایا۔ اور سنبھل نہ پائی، نیچے جا گری۔

"کہہ دو کہ تم مسلمان نہیں ہو۔" جگدیش مہیشوری نے اس کے پیٹ میں لات ماری تھی۔ وہ بلبلا اٹھی تھی۔

"لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔" پھر بھی اس کے منہ سے یہی کلمہ نکلا۔

جگدیش مہیشوری گالیوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے اسے مارتا چلا گیا۔

"لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" اس کے علاوہ احل کو ہر لفظ بھول گیا تھا۔

باہر ممی دروازہ دھڑ دھڑا رہی تھیں۔ رو رہی تھیں۔ چلا رہی تھیں۔ جگدیش مہیشوری کو واسطے قسمیں دے رہی تھیں۔ ہوش کھونے سے پہلے اس نے ایک آواز سنی تھی۔ ہاں۔ اس آواز کو پہچانتی تھی وہ۔

☆☆☆

"ٹھیک ہے لے چلتے ہیں اس کے گھر رشتہ۔ اس کا بھائی کرتا ہے ہاں تو کر لینا اس سے شادی۔"

"امی۔ اس کا بھائی کبھی نہیں مانے گا۔ ماں نے کی تھی احل سے بات مگر اس نے منع کیا تھا۔"

"پھر۔ بھگا کر شادی کرو گے؟" رفعت جہاں اس کی طرف مڑیں۔

"امی۔ وہ اسلام قبول کر چکی ہے۔ ایک مسلمان کے ساتھ اپنی مرضی سے شادی کر سکتی ہے۔ قانون اسے تحفظ دے گا، معاشرہ اسے قبول کرے گا۔"

"اور تمہیں کیا لگتا ہے۔ اس کا بھائی اس کے خاندان والے، اس کی کمیونٹی چپ بیٹھیں گے سب۔ ۔ اور قانون ۔ ۔ کس قانون کی بات کرتے ہو اسود۔ کیا تم اس ملک میں نہیں رہتے جس میں مجرم محفوظ اور بے گناہ غیر محفوظ ہے؟"

کچھ پل امی کو مطمئن کرنے کے لیے کوئی جواب نہ ملا اسے۔

"دیکھو اسود! میں اپنے بیٹے کے دشمن نہیں بنانا چاہتی۔" رفعت جہاں اسی ایک بات سے ڈرتی تھیں۔ انہیں احل سے کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر اس کے اثر و رسوخ والے بھائی کے ردعمل کا سوچ کر انہیں ڈر لگتا تھا۔ وہ اسود کو کوئی بھی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اور ماں اولاد کو پالتی اس لیے تھوڑی ہے کہ جوان ہو کر کسی لڑکی کے پیچھے نقصان اٹھائے۔

"امی اور اس کے لیے ایک لڑکی کو دشمنوں میں چھوڑ دیں گی۔"

"وہ اس کے گھر والے ہیں۔"

"اس وقت یہ ایک ماں، ایک بیٹی اور ایک بھائی ایک بہن کے بیچ کا مسئلہ نہیں ہے امی۔ اس وقت مذہب کا مسئلہ ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ اس انکشاف کے بعد کہ احل مسلمان ہو چکی ہے، اس کے گھر والے اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہوں گے۔"

"یہ اس لڑکی کا مسئلہ ہے ہمارا نہیں۔" جس قمیص کی تہہ لگا چکی تھیں، جھنجلا کر اسے کھولا اور دوبارہ تہہ لگانے لگیں۔

"امی کسی انصاری نے کسی مہاجر سے یہ نہیں کہا تھا کہ یہ تمہارا مسئلہ ہے میرا نہیں۔" اسود نے امی کا ہاتھ پکڑا۔

"ہاں تو لے آؤ اسے۔ اس گھر کے دروازے اس کے لیے کھلے ہیں۔ جو مومنہ کھائے گی، وہی اس

کو کھانے کو دوں گی۔ جو مومنہ پہنے گی وہی اس کو پہننے کو دوں گی۔ اپنی بیٹی کی ہر شے آدھی بانٹ دوں گی اس سے۔ مگر اپنا بیٹا نہیں دوں گی اپنا بیٹا نہیں بانٹوں گی۔" امی نے چند لمحے چپ رہنے کے بعد اپنی طرف سے فیصلہ سنا دیا تھا۔

"امی یہ ماں کی خواہش ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "رحیمہ پابی کا اپنا بیٹا ہوتا، تو دیکھتی کیسے حوصلہ کرتیں وہ اسے قربان کرنے کا۔" امی نے اس سے اپنا ہاتھ چھڑوا لیا۔ ان کو سارا قصور رحیمہ پابی کا نظر آتا تھا جنہوں نے کچی عمر سے اسود کے ذہن میں احتل کو اس کی دلہن کے روپ میں بٹھا دیا تھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر جانے کون سے وعدے لیتی رہتی تھیں ان کے بیٹے سے۔ کیا خواب دکھاتی رہتی تھیں اسے۔ پری کی راج کماری کون سی کہانیاں سناتی رہتی تھیں اسے۔

"امی آپ غلط۔"

"بس بس اسود۔ اپنی ماں کی نہیں مانی تو جا جو مرضی ہے کر۔" انہوں نے دوپٹا تہہ کے لیے اٹھاتے ہوئے سر جھٹکا۔

"امی یہ میری خواہش بھی ہے۔" اس نے آواز کو مزید آہستہ کیا۔

رفعت جہاں نے اس کی طرف دیکھا پھر دوپٹہ ہاتھ سے رکھتی ہوئی اس کے قریب آئیں۔

"اسود۔ تجھے لڑکیوں کی کمی ہے کیا؟"

"لڑکیوں کی کمی شاید نہ ہو مگر احتل میری زندگی میں نہ آئی تو زندگی میں بہت بڑی کمی رہ جائے گی امی۔"

"اس کا بھائی چین سے جینے نہیں دے گا تجھے۔"

"احتل نہ ہوئی تو بھی چین سے جی نہ سکوں گا میں۔" "اسود۔ مجھ سے وہ فیصلہ نہ کرواؤ جس کے لیے میرا دل نہ مانے۔"

"ٹھیک ہے امی۔" اسود نے سعادت مندی سے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "امید ہے کبھی آپ مجھ سے بھی وہ فیصلہ نہیں کروائیں گی جس کے لیے میرا دل نہ مانے۔"

رفعت جہاں کا دل ڈوبا۔ اس کے کہنے کا کیا مطلب تھا، وہ سمجھ گئی تھیں۔

"ماں باپ اولاد کا بھلا ہی چاہتے ہیں۔"

"جی امی۔" اس نے سر جھکا کر کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس سعادت مندی پہ رفعت جہاں کا دل باغ باغ ہو جاتا مگر ہوا یہ کہ دل کو عجب سی پریشانی لاحق ہو گئی۔ اُدھر چوہدری صاب تھے کہ اپنا غصہ دکھانے کے بعد چپ چپ سے تھے۔ وہ زبردستی اپنی بات منوانے والے مرد نہ تھے۔ مگر انہوں نے واضح طور پر یہ اظہار کر دیا تھا کہ وہ رحیمہ پابی کی خواہش کو رد کرنا نہیں چاہتے۔ مومنہ بھی باپ والے خیال رکھتی تھی اور اب اسود۔ وہ تو صاف لفظوں میں کہہ گیا تھا کہ احتل اسے پسند ہے۔

انہوں نے ایک دفعہ پھر یہ فرض کرنے کی کوشش کی کہ اگر وہ اس رشتے کو منظور کر لیتی ہیں تو۔ اس صورت میں سامنے نتائج کی جو قطار لگتی، اس میں کہیں بھی کوئی بھی تسلی بخش نتیجہ نہ نکلتا تھا۔

وہ پریشان ہو کر آپا فردوس کی طرف چلی آئیں۔

"میں تے پہلے ای کیندی ساں۔ اے کڑی بائے گی مصیبت سب نوں (میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ یہ کڑی سب کو مصیبت ڈالے گی)" آپا فردوس نے گھٹنے پہ زیتون کے تیل کی مالش کرتے ہوئے کہا۔

"کی کراں آپا؟ (کیا کروں آپا؟)"

"صاف منع کر دے۔ کہہ دے۔ میرا پتر ای کیوں قربانی دا بکرا بنے (صاف منع کر دو۔ کہہ دو کہ میرا بیٹا ہی کیوں قربانی کا بکرا بنے)" آپا فردوس نے تیل کی بوتل کو ڈھکن لگاتے ہوئے مشورہ دیا۔

"اور پتر جو خود چھری تلے گردن رکھنے کو تیار ہو تو پھر۔" رفعت جہاں نے سوچا۔

☆☆☆

"نہ کرو ایسا ظلم جگدیش۔ مر جائے گی وہ۔" گائتری دیوی سسک اٹھیں۔

ان کی بیٹی زخمی تھی۔ بھوکی تھی پیاسی تھی۔ وہ اسے ایک نظر دیکھ لینا چاہتی تھیں۔ اسے اپنی بانہوں

میں بھر کر چومنا چاہتی تھیں۔ اس کے زخموں پہ مرہم لگانا چاہتی تھیں۔ اس کے منہ میں نوالے ڈالنا چاہتی تھیں مگر جگدیش مہیشوری نے کمرہ لاک کر رکھا تھا۔ چابی اس کے پاس تھی اور کسی اور کو اس کے کمرے کے قریب بھٹکنے کی اجازت بھی نہ تھی۔

"ممی اگر آپ چاہتی ہیں کہ وہ زندہ رہے تو اپنی ممتا سنبھال کر اپنے کمرے میں جا کر بیٹھ جائیں۔"

"میں کمرے میں کیسے بیٹھ سکتی ہوں جب کہ میری بیٹی کل سے۔"

"آپ کمرے میں بیٹھ نہیں سکتیں تو آپ کو بھی کمرے میں بند کر سکتا ہوں میں۔" جگدیش نے ان کی بات کاٹتے ہوئے درشتی کے ساتھ کہا۔ گائتری دیوی سکتے میں آئیں۔ یہ ان کی کوکھ کا بچہ تھا؟

بے بسی کے عالم میں وہ لاؤنج سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگیں۔ نگاہ پھر بیٹی کے کمرے پہ پڑی جواب اس کے لیے کمرا نہیں تھا قید خانہ تھا۔ کچھ دیر اس کے دروازے کو تکتی رہیں۔ پھر پلٹیں اور سیڑھیاں چڑھ کر جگدیش کے بیڈروم میں آئیں۔ لاجونتی جو کان سے موبائل لگائے کھڑی تھی، انہیں دیکھ کر گھبرائی۔

"بعد میں بات کرتی ہوں۔" کہہ کر موبائل کان سے ہٹایا اور گائتری دیوی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"بہت مارا ہے اسے جگدیش نے۔ اس کو چوٹیں آئی ہوں گی۔ اس کو دیکھ لو۔"

"جب وہ مجھے مارتا ہے۔ تب میری چوٹ تو دیکھنے نہیں آتیں آپ ممی!"

"یہ وقت ایسے شکووں کا نہیں لاجونتی۔ جاؤ اسے دیکھو پلیز۔ اس کی مرہم پٹی کر دو۔"

"وہ آپ کو اس کے کمرے میں جانے نہیں دے رہا۔ مجھے کیسے جانے دے گا۔"

"تم بیوی ہو۔ پیار محبت سے بات منوا سکتی ہو۔"

"پیار محبت۔ ہاہا۔ ممی آپ بھی ناں۔ بیٹی مرنے والی ہو رہی ہے آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔" لاجونتی ہنسی۔

"لاجونتی پلیز۔" گائتری دیوی کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں چھلک اٹھیں۔

"میں کوشش کرتی ہوں۔"

یہ آنسو بیٹے کے سامنے بے مول رہے تھے، بہو کو پھر بھی لاج آ گئی۔ انہوں نے ممنون نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنا چہرہ صاف کیا۔

لاجونتی نے لاؤنج میں آ کر جگدیش سے چابی مانگی۔ جواب میں اس نے اسے بری طرح گھورا تھا۔

"مر جائے گی وہ۔"

"مر جانے دو۔"

"آپ جان چکے ہیں کہ وجہ کچھ اور ہے۔"

"بکواس کرتا ہے وہ۔ مجھے یقین نہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ بکواس کر رہا ہے وہ۔ اور وجہ وہی ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں تو یاد رکھیں کہ آپ ایک مسلمان ملک میں رہتے ہیں۔ کلمہ پڑھنے کے جرم میں آپ نے اس کے ساتھ کیا، کیا۔ بات ذرا بھی باہر نکلی تو فساد ہو جائے گا۔ ساری عوام باہر نکل آئے گی۔ مہیشوری پیلس کے سامنے مجمع اکٹھا ہو جائے گا۔" لاجونتی نے چند جملوں میں نقشہ ایسا کھینچا کہ پہلی بار جگدیش کے چہرے کے تاثرات میں تبدیلی آئی۔

"ابھی تو آپ نے پارلیمنٹ تک جانا ہے۔ آپ کا سیاسی کیریئر شروع ہونے سے پہلے ختم ہو جائے گا۔"

جو بات جگدیش مہیشوری کے خیال میں اس کے گھر تک کی تھی، لاجونتی عوام اور آگے پارلیمنٹ تک لے گئی۔ اس نے شوہر کو سوچ میں ڈال دیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ دیکھو اسے۔ کھانا وانا بھی دو۔ اور زخم بھی دیکھو اس کے۔ لیکن ممی کے یا اس کے سامنے یہ ساری باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ شیر ہو جائیں گی دونوں۔" کچھ دیر بعد جگدیش نے چابی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

لاجونتی چابی پکڑ کر مڑی اور مسکرائی۔

پیار محبت۔ ہونہہ۔ پیار محبت جائے بھاڑ میں۔ کام نکلوانے کے بات منوانے کے اور بھی بہت سے

طریقے ہیں۔

☆☆☆

''نامی۔ آپ کو پتا ہے وہ جو آئی تھیں ناں احتل باجی۔ وہ ہمایوں بھائی کی دلہن بنیں گی۔''

رفعت جہاں کے ہاتھ سے عینک فرش پہ جا گری اور اس کے ایک شیشے میں دو دراڑیں آ گئیں۔ انہوں نے عروہ کی طرف دیکھا اور جھک کر عینک اٹھائی۔ ان کی نظر اتنی تو کمزور نہ تھی مگر اس وقت سب کچھ دھندلا سا گیا تھا۔

ٹھیک ہے وہ نہیں کرنا چاہتی تھیں ایک ایسی لڑکی سے شادی جس کو گھر سے بھاگ کر قانونی پناہ لے کر جینا پڑے۔ جس کا بھائی اور خاندان ہر دم ان کے بیٹے کو دھمکیاں دیتا رہے۔ اسے کسی بھی طرح کا نقصان پہنچانے سے دریغ نہ کرے۔ مگر عروہ کے منہ سے یہ جملہ سن کر اچھا تو نہیں لگا تھا۔

''امی یہ میری خواہش بھی ہے۔'' اس نے کہا تھا۔

اس نے تو ماں کی رضا نہ پا کر سعادت مندی کے ساتھ سر جھکا دیا مگر کیا نکال پائے گا احتل کو دل سے۔ دیکھ پائے گا اسے ہمایوں کے ساتھ۔

''نامی۔ میں لہنگا پہنوں گی ہمایوں بھائی اور احتل آپی کی شادی پہ۔ ہیل والی سینڈل بھی پہنوں گی۔'' عروہ بچی تھی۔ شادی کا نام سن کر اس کے ذہن میں جو کچھ آتا تھا، وہی بیان کر رہی تھی۔

''لڑکیوں کی کمی شاید نہ ہو مگر احتل میری زندگی میں نہ آئی تو زندگی میں بہت بڑی کمی رہ جائے گی امی۔''

نظر کے سامنے اتنی دھندلاہٹ آئی کہ انہوں نے اس عینک کو پہن لیا جس کے ایک شیشے میں دراڑیں آ گئی تھیں۔ نظر ابھی بھی صاف نہ آیا تھا کچھ۔

''کس نے کہا ہے تم سے یہ سب؟''

مومنہ جو فریج میں سالن کا ڈونگا رکھ رہی تھی، اس کا دل بھی ڈوبا۔ اس نے پلٹ کر ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔

''ممانے۔''

مومنہ کو ارم پہ غصہ آیا۔

ارم اور آسیہ کو بچوں کے سامنے ہر بات کرنے کی عادت تھی۔ جس کی وجہ سے جو باتیں ان کے علم میں نہیں آنی چاہئیں، جن باتوں پہ بڑے بھی ابھی کھل کر ایک دوسرے سے بات نہ کر پا رہے تھے، وہ ان کے لبوں پہ تھیں۔ لیکن اس وقت اسے اصل میں کیا برا لگا تھا۔

احتل کے نام کے ساتھ اسود کے نام کے علاوہ کسی اور کا نام ہوتا یا پھر احتل کا نام ہمایوں کے نام کے ساتھ؟

''کوئی نہیں ہو رہی یہ شادی۔ لہنگے اور ہیل والی جوتی کا اتنا ہی شوق ہو رہا ہے تو اپنی خالہ کی شادی میں پورے کر و یہ ارمان۔''

''ان کی شادی تو ابھی دور ہے۔'' عروہ نے معصومیت سے کہا تو مومنہ تلملاتی ہوئی ماں کے کمرے کی طرف چلی آئی جو آج کل زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہتی تھیں۔

''آپ سمجھاتی کیوں نہیں ہیں امی کو؟'' وہ کمرے میں آتے ہی بولی۔

رحیمہ احمد نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر تلاوت میں مصروف ہو گئیں۔

''اسود بھائی کتنے پریشان ہیں، امی کو نظر ہی نہیں آ رہا۔ بس اپنے مفروضوں پہ فیصلے کیے بیٹھی ہیں۔''

رحیمہ احمد نے قرآن بند کیا۔ عینک اتاری اور قرآن کو الماری میں رکھتے ہوئے اس کی طرف مڑی۔

''جو وہم رفعت کو ہیں۔ وہ محض مفروضے نہیں ہیں۔ حقیقت ہے۔ امت الاحد سے شادی مشکلات تو لے کر آئے گی۔ شاید رفعت جو سوچ رہی ہے، اس سے بھی بڑھ کر۔''

''ہمایوں بھی تو ان مشکلات کو فیس کرے گا۔''

''ہمایوں کی ماں کی رضا نہیں ہو گی تو اس کے لیے بھی ہاں نہیں کروں گی۔''

''آپ بھی تو ماں ہیں۔ آپ کا بھی حق ہے ہم پہ۔ آپ اپنی بات منوا سکتی ہیں۔ کیوں نہیں اسود بھائی کے لیے امی کو مناتیں۔''

''حق تو میرا تم پر بھی تھا۔''

''ہاں تو جتا لیتیں اپنا حق۔'' مومنہ ان کی بات کا سیاق و سباق سمجھ گئی تھی، اس لیے نظر جھکا کر کہا۔

''کبھی کبھی چپ رہنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ عزت بنی رہتی ہے۔ مان بنا رہتا ہے۔ اور بھرم بھی قائم رہتا ہے۔''

مومنہ کو سمجھ میں نہیں آیا کہ مزید کیا کہنا باقی رہ گیا۔

''اور ایک بات جو کئی دن سے کہنا چاہ رہی تھی۔'' رحیمہ احمد نے اس کا ہاتھ تھاما۔ ''خوش رہا کرو۔ جو فیصلہ لے چکی ہے اب اسے خوشی سے نبھاؤ۔ ورنہ زندگی مشکل ہو جائے گی۔''

شہد رنگ آنکھوں والی بوجھل دل کے ساتھ وہاں سے اٹھ آئی۔

☆☆☆

پریشانی اسود کے چہرے سے مترشح تھی۔ کل سے وہ اجل کا موبائل نمبر ڈائل کر رہا تھا مگر وہ کال اٹینڈ نہیں کر رہی تھی۔ لینڈ لائن پہ وہ ٹرائے کر نہیں سکتا تھا۔ اس کی آواز اجل کے لیے بڑی مصیبت بن سکتی تھی۔ اس نے تھک کر فاطمہ کو فون کیا۔ اور اسے اجل سے ان کے لینڈ لائن پہ رابطہ کرنے کے لیے کہا۔

''ٹھیک ہے میں کرتی ہوں بات۔ امی مانیں؟''

''ابھی تک تو نہیں۔''

''تم دوبارہ کرو بات ان سے۔ بتاؤ ناں انہیں کہ تمہیں اسکالرشپ ملا تو اجل کو لے کر باہر چلے جاؤ گے۔ کیا کر لے اس کا بھائی؟ میں بھی کل پھوپھو یاسمین کے گھر بلوا کر بات کرتی ہوں ان سے۔''

''فاطمہ یہ معاملے بعد میں بھی طے ہو سکتے ہیں۔ فی الحال تو مجھے اجل کی فکر ہے۔ اس سے بات کرو پلیز۔''

''ٹھیک ہے میں کرتی ہوں بات۔''

فاطمہ نے اسے ''اللہ حافظ'' کہہ کر کال ختم کی۔ وہ بے چینی سے چھت پہ چکر لگانے لگا۔ پھر کچھ خیال آنے پہ اس نے موبائل پہ ایک اور نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی مگر کال ریسیو نہیں کی گئی۔ اس کی پریشانی میں اضافہ ہوا۔ دس منٹ بعد فاطمہ کی کال پھر آئی۔

''شاید اجل کی ممی تھیں وہ جنہوں نے فون اٹھایا تھا۔ وہ کہہ رہی ہیں کہ اجل اس کی موسی کے گھر گئی ہوئی ہے۔ بات نہیں ہو سکتی۔''

''تو موبائل پہ کال ریسیو کیوں نہیں کر رہی؟''

''ان کا کہنا ہے کہ موبائل وہ غلطی سے گھر چھوڑ گئی ہے۔''

''وہ جھوٹ بول رہی ہیں۔'' اسود کو اس بات پہ یقین نہیں آیا تھا۔

''ہاں۔ مگر میں ان کو یہ کہہ نہیں سکتی تھی۔''

''فاطمہ وہ مشکل میں ہے۔'' اس کے لہجے کا اضطراب فاطمہ سے چھپا نہ رہا تھا۔ اسے سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اسود کو تسلی کے لیے کیا کہے۔

''میں کل عمر کوٹ جاؤں گا۔''

''پاگل مت بنو اسود۔''

''وہ زبردستی اس کی شادی کر دیں گے یا اس کے ساتھ کچھ کر دیں گے۔''

''ہاں تو تم کس حیثیت سے وہاں جاؤ گے۔''

''فاطمہ وہ عاقل بالغ ہے۔ اسلام قبول کر چکی ہے۔ جس سے چاہے۔ قانونی، مذہبی پناہ لے سکتی ہے۔ میں پولیس کو لے کر جاؤں گا وہاں۔''

''کچھ صبر کرو اسود۔''

''اور اس دوران اگر اسے کوئی نقصان پہنچ گیا یا زبردستی اس کی شادی کر دی گئی تو؟''

''زبردستی شادی کر دی گئی تو بھی اس شادی کی کوئی حیثیت نہیں ہو گی۔ اور رہی بات نقصان کی تو اس کی ممی اور بھائی اسے نقصان کیسے پہنچا سکتے ہیں اسود۔''

''مجھے نہیں پتا۔ لیکن میرا دل کہتا ہے کہ وہ مصیبت میں ہے۔''

''اچھا کل تک دیکھو۔ پھر سوچتے ہیں۔ اور فکر مت کرو۔ اللہ اس کے ساتھ ہے۔''

اسود نے سر ہلا کر ''خدا حافظ'' کہتے ہوئے کال ختم کی اور چھت سے نیچے آنے کے لیے پوڑھی کی طرف آیا۔ تیسرے پائیدان پہ تھا جب نیچے سے

گزرتی ہوئی بلی بوڑھی سے ٹکرائی اور وہ ذرا سی ہلی۔

اسے بے اختیار چاندنی رات کا ایک منظر یاد آیا۔ اس نے اس رات امل کا ہاتھ تھامتے ہوئے اسے احساس دلایا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہے۔ وہ بے فکر ہو جائے۔ آج بھی وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے یہی احساس دلانا چاہتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہے۔ وہ بے فکر ہو جائے۔ مگر کیسے کر لے یہ عہد و پیمان امی کی رضا کے بغیر۔

☆☆☆

"درگا کے سر سے جن اترا نہیں ہے۔ آپ کو چٹ گیا ہے ممی!" گائتری دیوی کے منہ سے بہکی بہکی سی باتیں سن کر جگدیش بھیشوری کا دماغ گھوما۔

"ٹھنڈے دماغ سے سوچو جگدیش۔"

"کیسا دماغ۔ اس گھر میں رہتی تین پاگل عورتوں کے بیچ دماغ بچا ہی کب ہے میرا۔"

جانے کیوں جگدیش بھیشوری کی جھنجلاہٹ دیکھ کر لاجونتی کا ہنسنے کو دل چاہا تھا اس سے۔

"فرض کر لیا جائے کہ امر سچ کہہ رہا۔"

"ممی۔ اندھی مت بنیں۔ آپ نے درگا کا جنون نہیں دیکھا۔ اگر امر سچ کہہ رہا ہوتا تو کہیں سے تو لگتا کہ راجیو کو شادی کے لیے منع کرنے کے پیچھے وجہ کچھ اور ہے۔ جس طرح وہ کلمہ پڑھتی ہے، اس کے پیچھے وجہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتی۔"

گائتری دیوی کا وجدان بھی کہتا تھا کہ جگدیش ٹھیک کہہ رہا ہے۔ درگا کے تیور کچھ اور کہانی سناتے تھے جبکہ امر کے الفاظ کچھ اور۔

"لاجونتی تمہیں کیا لگتا ہے؟" ممی نے بہو کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ دل میں کہیں کوئی خواہش تھی کہ امر نے جو کہا وہی سچ ہو۔ اس صورت میں کم سے کم اتنا تو ہوتا کہ نتائج اتنے بھیانک نہ ہوتے جو دوسری صورت میں نکل سکتے تھے۔

"ہونہہ۔ اسے کیا لگے گا۔ ٹی وی ڈرامے دیکھ دیکھ کر اسے تو ایک لو اسٹوری بنانے میں زیادہ انٹرسٹ ہو گا۔" جگدیش نے سر جھٹکتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں کہا جیسے اس کے نزدیک لاجونتی کی رائے کی اہمیت خاک برابر بھی نہ ہو۔

دیکھا جائے تو ہوئی تو لاجونتی کی بے عزتی تھی مگر پھر بھی اس کا ایک بار پھر ہنسنے کو دل چاہا تھا۔ آج کل وہ شوہر کا منہ دیکھ کر خاصا لطف حاصل کر رہی تھی۔

"مجھے لگتا ہے کہ جگدیش صحیح کہہ رہے ہیں اور مجھے یہ بھی لگتا ہے کہ غلط امر بھی نہیں کہہ رہا۔"

جگدیش نے چونک کر اس کی صورت دیکھی اور ماتھے پہ پڑے بلوں میں اضافہ ہوا جبکہ گائتری دیوی نے خاصا اطمینان محسوس کیا۔

"جان سے نہ مار ڈالوں میں اس کولہی کی اولاد کو۔ اس کمینے نمک حرام کی زبان میں نے اس وقت نہیں کھینچی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اس کی بکواس کو سچ مان لوں۔"

"اس وقت بہتری اسی میں ہے کہ اُس بکواس کو سچ مان لیا جائے۔"

"تم تو چپ رہو۔ جا کر اسٹار پلس کے ڈرامے دیکھو۔" جگدیش نے جھنجلا کو لاجونتی کو ٹوکا۔ وہ عورتوں کی باتیں سننے والا مرد نہیں تھا مگر صورت حال ایسی ہو گئی تھی کہ اپنے اہم کام چھوڑ کر وہ ان کے بیچ بیٹھا تھا۔

"یہ ایک ہی طریقہ ہے عزت بچانے کا۔" گائتری دیوی نے ماتھے کو مسلتے ہوئے کہا۔

"طریقہ۔ ہونہہ۔ ایک کولہی۔ ایک کولہی بنے گا اب بھیشوریوں کا داماد اور یوں بچے گی ہماری عزت۔ ایسی بھی قیامت نہیں آئی۔" اس کے لہجے سے حقارت مترشح تھی۔

"قیامت آ چکی ہے جگدیش! اور ایک کولہی ہی بچائے گا اس وقت بھیشوریوں کی عزت۔" گائتری دیوی بولیں۔

"ممی۔ وہ بدذات ہماری کمزوری کا فائدہ اٹھانے کے لیے یہ کہانی بنا رہا ہے۔ اور ہم اس کے ہاتھوں استعمال ہوں۔ ناممکن۔" جگدیش نے نفی میں سر ہلایا۔

"آپ ایسا کیوں سوچ رہے ہیں کہ ہم اس کے ہاتھ استعمال ہوں گے۔ ہم اسے استعمال کریں گے۔ مہیشوریوں کا داماد ایک کوہلی۔ ذات پات، اونچ نیچ کا تصور ختم کرنے میں جگدیش مہیشوری کا اہم کردار۔ درگا کے مسئلے کا حل بھی مل جائے گا اور جگدیش مہیشوری کو ایک ہیرو ایک آئیڈیل بننے کا موقع بھی۔ ہر جاتی کے ہندو آپ کو دیوتا مانیں گے۔ مسلمان بھی مہان تصور کریں گے۔ سیاسی کیریئر شروع ہوتے ہی عروج پہ۔"

لاجونتی نے وہ چیدہ چیدہ شہ سرخیاں سنائی تھیں جو آنے والے دنوں میں اخبارات اور ٹی وی کی زینت بن سکتی تھیں۔

جگدیش مہیشوری کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑیں۔ ماتھے پہ سوچ کے بل پڑے۔

مہیشوری گو کہ برہمن نہ تھے ویش تھے۔ تجارت پیشہ اور کاروباری لوگ۔ اندرون سندھ میں ان کا بڑا نام اور ساکھ تھی۔ مہیشوری اپنی بیٹی کبھی کسی کوہلی کو نہ دیں مگر وقت کا تقاضا کچھ اور تھا۔

گو کہ راجیو نے اس بات کا اشتہار نہیں لگایا تھا کہ درگا مسلمان ہو گئی ہے، پھر بھی جگدیش کو لگ رہا تھا کہ اس کی عزت کا تیا پانچہ ہونے والا ہے۔ مورتیوں کو ڈھانے والے واقعہ کے بعد ملازمین کا منہ اس نے پیسے سے اور دھمکا کر بند کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر سات لوگ۔ کیسے ممکن تھا کہ ساتوں واقعی اپنا منہ بند رکھتے۔ اور بات جو نکلتی تو پھیلنے سے کون روک پاتا۔ ملازمین کے بارے میں سوچنا چھوڑ بھی دیا جائے تو درگا خود تو تھی ناں سب سے بڑا مسئلہ۔ وہ بالغ تھی۔ اپنی مرضی سے کوئی بھی مذہب اپنا سکتی تھی۔ قانونی مذہبی پناہ لے سکتی تھی۔ ساری عمر اس کمرے میں تو قید کر کے نہیں رکھا جا سکتا تھا ناں اسے۔ حقیقت واضح تھی کہ گھر سے باہر بات نکلتے ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کی طرف سے بالکل مختلف ردعمل آتا۔ وہ ان کا سامنا کیسے کرتا۔ جبکہ ممی کی بات مان لینے میں کم سے کم بھی وہ فائدے تھے جو لاجونتی گنوا رہی تھی۔

"وہ مان جائے گی؟" بالآخر اس کے منہ سے نکلا۔ لاجونتی نے فاتحانہ انداز میں ساس کی طرف دیکھا جن کے چہرے اتنے دنوں بعد پہلی بار کچھ اطمینان جھلکا تھا۔

"وہ مان جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ واقعی پسند کرتی ہے امر کو۔" لاجونتی نے جواب دیا۔

"جہاں تک میں جانتا ہوں۔ وہ کسی ہندو کے ساتھ شادی نہیں کرے گی۔" جگدیش بولا۔ لاجونتی چاہے اس واقعے کو محض ایک لو اسٹوری بنا دے مگر وہ ماں جایا تھا۔

"وہ کرے گی یہ شادی اگر۔"

لاجونتی کی پوری بات سنتے ہوئے جگدیش نے پہلی بار بیوی کو ستائشی نظروں سے دیکھا۔

"وہ کوہلی کی اولاد مانے گا ایسا کرنے کو؟"

"ہاں۔ میں راضی کر لوں گی اسے۔" گائتری دیوی جلدی سے بولیں۔

"راضی آپ نے اسے نہیں کرنا۔ راضی اس نے آپ کو کیا ہے ممی۔ بڑا گیم کھیلا ہے اس کمینے نے۔ درگا کو اپنے پیچھے لگایا اور پھر آپ کو۔ آپ نے بھی اس کا ہاتھ پکڑا تھا آج اسے نوکر سے مالک بنا رہی ہیں۔" جگدیش نے تنفر سے کہا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس کمینے، نمک حرام دو ٹکے کے غلام کو جان سے مار ڈالتا۔ بڑے حساب نکلتے تھے اس کی طرف۔ درگا کیا کرتی رہی، کبھی منہ سے بھاپ نہ نکالی۔ الٹا اس کا ہمدرد بن کر اس کے ساتھ محبت کا ناٹک کیا۔ اور اب ان کی کمزوریوں کو کیش کروا رہا تھا۔ اور ممی کو لگ رہا تھا کہ وہ ان پہ احسان کر رہا ہے۔ بس یہ وقت ٹل جائے ذرا پھر سکھائے گا اس کوہلی کو سبق۔

☆☆☆

چوہدری اسود حیدر دیوانہ نہیں تھا مگر آج کل اپنی حالت اسے دیوانوں والی ہی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ صبح فجر ویلے اٹھا۔ نماز ادا کی اور گھر سے نکل گیا۔ اس وقت کوئی نہ جانتا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے، شاید وہ خود بھی نہیں۔ اور چار گھنٹے بعد اس نے خود کو عمر کوٹ میں

مہیشوری پیلس کے سامنے پایا تھا۔
"مجھے امر کولی سے ملنا ہے۔" یہاں پہنچ کر عقل نے کچھ کام کیا تھا۔
رام اسے دیکھ کر جتنا حیران ہو سکتا تھا، اتنا ہوا تھا۔ جتنا پریشان ہو سکتا تھا، اس سے زیادہ ہوا تھا۔
"احتل کہاں ہے؟" اسود بغیر کسی تمہید کے اس سوال پہ آیا۔
"وہ اپنی موسی کے گھر گئی ہیں۔" ایک رٹا رٹایا سا جواب رام کے منہ سے نکلا۔
"ماسی کا پتا دو۔"
"میں ایسا نہیں کر سکتا۔"
"پلیز امر۔ میں بہت پریشان ہوں۔"
"آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ ٹھیک ہیں۔"
"ٹھیک نہیں ہے وہ۔" اسود کی آواز کچھ بلند ہوئی۔ رام ٹھٹکا۔
"وہ رو رہی تھی۔ اس کا بھائی اس کی شادی کر رہا ہے راجیو کے ساتھ۔ زبردستی۔"
"اب یہ شادی نہیں ہو رہی۔"
"کیا۔ کیسے۔ آئی مین۔"
"دیوی نے راجیو رائے سے شادی کے لیے منع کر دیا ہے۔" ایسی تفصیلات وہ کسی کو نہیں دیتا تھا مگر چوہدری اسود حیدر کو مطمئن کر کے یہاں سے واپس بھیجنے کے لیے یہ ضروری تھا۔
"اس کے بھائی نے یہ فیصلہ قبول کر لیا؟"
"انکار راجیو رائے کی طرف سے آیا تھا، اس لیے قبول کرنا پڑا۔"
"کیا؟" اسود نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ کیا واقعی یہ سب کچھ اتنی آسانی کے ساتھ ہو گیا تھا۔
"میں احتل سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"
"میں اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"
"پلیز امر۔ ہم سب کو اس کی فکر ہے۔"
"وہ واپس آئیں گی تو آپ سے بات کر لیں گی۔"
"وہ اپنی ماسی کی طرف کیوں گئی ہے؟"
"میں نہیں جانتا۔"
"امر پلیز مجھے سچ بتاؤ۔ وہ کسی تکلیف میں ہے ناں۔"
"اگر ایسا ہے بھی تو یہ تکلیف آپ لوگوں کی لائی ہوئی ہی ہے۔" رام اپنے لہجے کو تلخ ہونے سے روک نہیں پایا۔
"اوہ۔ تو واقعی وہ مشکل میں ہے۔ جگدیش مہیشوری نے اسے قید کر رکھا ہے ناں۔ اور۔ اور مارتا بھی ہوگا اس کو۔"
رام کے لیے جواب مشکل ہوا۔ یہ سامنے کھڑا شخص اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ عجب بات ہے کہ برا بھی نہیں لگتا تھا۔ وہ اس کی طرح دیوی کے ساتھ مخلص تھا، اس کے لیے پریشان تھا۔ شاید اس لیے۔
"اگر میں کہوں کہ ہاں وہ مشکل میں ہیں، قید میں بھی ہیں، مار بھی کھا رہی ہیں، بھوک پیاس بھی سہہ رہی ہیں تو کیا کر لیں گے آپ؟"
رام کے منہ سے نکلے یہ جملے اسود کو ساکت کر گئے۔ اس کا مطلب وہ صحیح سمجھ رہا تھا۔ احتل مشکل اور تکلیف میں تھی اور اس کی سوچ سے زیادہ سہہ رہی تھی۔
"اگر ایسا ہے تو میں ابھی اندر جاؤں گا۔" وہ ابتدائی شاک سے نکل کر ایک دم گیٹ کی طرف بڑھا۔ رام اس کے سامنے آیا۔
"آپ دیوی کی مشکلوں میں مزید اضافہ مت کریں۔"
"تم مجھے روک نہیں سکتے۔"
"جگدیش مہیشوری تو روک سکتا ہے ناں۔ گائتری دیوی تو روک سکتی ہیں ناں۔"
اسود نے جیسے اس کی بات سنی نہیں تھی۔ اس کو پرے ہٹا کر ہٹا گیٹ کی طرف بڑھا۔ آگے چوکیدار تھا۔
"مجھے گائتری دیوی سے ملنا ہے۔"
چوکیدار نے سر سے پیر تک اسے دیکھا اور شش و پنج میں پڑا۔

"کچھ دیر پہلے اسے امر کولہی سے ملنا تھا۔ اب گائتری دیوی سے ملنا ہے۔"

پھر اس نے رام کی طرف دیکھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اسے گائتری دیوی کو اطلاع دینی ہے اس مہمان کی یا نہیں۔ رام نے اسے ٹھہرنے کا اشارہ کر کے اسود کے قریب آکر اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

"آؤ اندر۔ بات کرتے ہیں۔"

اسود چپ چاپ اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ عمر کوٹ کے اس محل میں پہلی بار داخل ہوا جہاں اس کی ماروی کو عمر سومرو نے نہیں بلکہ اس کے اپنے بھائی نے قید کر رکھا تھا۔

"آؤ۔" رام اسے پچھلی طرف کسی کمرے میں لے گیا تھا۔ اس کمرے میں نظر ڈال کر اسے سمجھ میں آیا کہ وہ رام کا اپنا کمرہ تھا۔

"بیٹھو۔" رام نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"مجھے گائتری دیوی سے ملنا ہے۔" وہ کھڑا رہا تھا۔

"وہ تم سے ملنا نہیں چاہیں گی۔ خاص طور پر ان حالات میں۔"

"کن حالات میں۔" وہ انجان بنا۔ رام تلخی سے مسکرایا۔

"وہ حالات۔ جو آپ نے پیدا کر دیے ہیں۔"

"ان حالات کو پھر سدھارنا بھی ہم نے ہی ہے۔ آپ گائتری دیوی سے میری ملاقات کروائیں۔"

"ٹھیک ہے میں اطلاع دیتا ہوں انہیں۔" رام یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکلا۔

گائتری دیوی کے کمرے میں آکر اس نے انہیں اسود کے بارے میں اطلاع دی۔ انہیں لگا کہ چھت ان کے سر پہ آگری ہے۔

☆☆☆

"ٹھیک ہے وہ۔"

لاجونتی نے کچھ دیر اس کی بے چینی کا مظاہرہ کیا۔ پھر چینل چینج کرتے ہوئے مطلع کیا۔ وہ اپنی جگہ چور سا بنا۔

"لیکن دماغ ٹھیک نہیں ہے اس کا۔"

لاجونتی نے ریموٹ صوفے پہ پھینکتے ہوئے کہا۔ اس نے ہونٹ بھینچے۔ اسے وہ رات یاد آئی جب وہ اس کے پاس سوالی بن کر آئی تھی۔ اس وقت بھی اسے لگ رہا تھا کہ اب طوفان آنے ہی والا ہے۔

"راجیو کی تو خیر چھوڑو۔ بس نام کی انگوٹھی پہن کر رکھی تھی وہ۔ مگر تمہارے لیے۔" وہ کچھ کہتے کہتے رکی۔ رام نے بے چینی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ چاہتا تھا کہ لاجونتی اپنا جملہ پورا کرے اور لاجونتی کو جملے ادھورے چھوڑنے میں مزا آتا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اس کی بے چینی میں کسی طور کمی نہ ہوئی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ جگدیش مہیشوری کا خون نہ کرے تو کم سے کم ایسا حشر ضرور کرے جو اس نے دیوی کے ساتھ کیا تھا۔

"لیکن تم ایسا کیوں کرو گے؟ کیا حق رکھتے ہو تم دیوی پر؟ وہ تو حق دینے آئی تھی تمہیں مگر تم نے ہی نفرت کے مقابل محبت کو پچھاڑ دیا۔"

اس کے اپنے احتساب تھے جو ختم ہونے کو نہ آتے تھے۔ کچھ دیر یونہی ہاتھوں میں سر دیے بیٹھا رہا پھر اٹھا اور دوبارہ لاجونتی کے پاس چلا آیا۔

"میں اس سے مل سکتا ہوں؟"

"ایک رات وہ بھی اسی طرح بے چین تھی مضطرب تھی تمہارے لیے۔ تمہارے کمرے میں جانا چاہتی تھی۔ تمہارے جلے پیر پہ مرہم لگانا چاہتی تھی۔" لاجونتی نے اس کے پیروں کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

رام کو وہ رات یاد آئی جب جگدیش مہیشوری نے گرم استری اس کے پاؤں پہ پھینک دی تھی۔

"کاش! میں نے اس رات ہی جگدیش مہیشوری کو سب کچھ بتا دیا ہوتا۔ بات اتنی آگے تو نہ بڑھتی۔" بہت سے پچھتاووں میں ایک اور آشامل ہوا۔

"آج تم اس کے لیے بے چین ہو، پریشان ہو

۔مرہم لگانا چاہتے ہو اس کے زخموں پہ؟" اس نے رام کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر براہ راست سوال پوچھا۔

وہ یوں خاموش ہوا جیسے گونگا ہو۔ مسیحائی جیسا وصف نہ تھا اس کے پاس۔ لالو، حوراں، دیوی۔ وہ کب کسی کے لیے مسیحا بنا تھا۔ سب کو اس کے وجود سے تکلیف ملی، زخم ملے۔ وہ گھاؤ دینے والوں میں سے تھا۔

"آپ کو بڑی بی بی بلا رہی ہیں۔" پارو نے اسے گائتری دیوی کا پیغام دیا تو وہ چونکا اور پھر لاجونتی سے نگاہ چراتا ہوا گائتری دیوی کے بیڈروم میں دستک دے کر داخل ہوا۔

بیمار، نحیف، پژمردہ سی گائتری دیوی جو بیڈ پر لیٹی ہوئی تھیں، اٹھ کر بیٹھیں اور اسے ایک طرف پڑی کرسی پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تمہیں پتا تھا کہ درگا مسلمان ہو گئی ہے؟"

"وہ شروع سے خود کو مسلمان کہتی ہیں۔" اس نے ہلکی آواز میں جواب دیا۔

"ہاں۔ لیکن سال ڈیڑھ سال پہلے جب وہ چوہدری نذر گئی تھی، اس نے باقاعدہ اسلام قبول کر لیا تھا۔ تمہیں اس بارے میں معلوم تھا۔"

"نہیں۔" اس نے سر جھکا کر مجرمانہ لہجے میں جواب دیا۔

"تمہیں اس کے ساتھ کیوں بھیجا گیا تھا امر؟"

اس کا سر مزید جھکا۔ اسے اپنی غلطی کا اعتراف تھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ یہ "گڑبڑ" کب ہوئی۔ ابھی تو جگدیش مہیشوری نے بھی اس سے حساب لینے تھے۔ نہ صرف اس بات کے بلکہ ان لفظوں کے بھی جو اس کے منہ سے نکلے تھے۔

"امر۔ ادھر آؤ میرے پاس۔" گائتری دیوی نے نرمی کے ساتھ اسے پکارتے ہوئے اپنے پاس بلایا۔

اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ جگدیش مہیشوری سے تو خیر کسی بھی طرح کے سلوک کی امید رکھتا تھا وہ مگر اس وقت گائتری دیوی کی طرف سے بھی نرمی کی توقع نہیں تھی اسے۔

"ادھر آؤ۔"

ان کے دوبارہ بلانے پہ وہ کرسی سے اٹھا اور ان کے بیڈ پہ ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

"امر۔" گائتری دیوی نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔ "درگا چاہتی ہے تمہیں؟"

اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا اور ان کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

"جو اس دن تم نے کہا۔ وہ سچ تھا؟" انہوں نے دوسرے لفظوں میں اپنا سوال دہرایا۔

رام نے ہلکا سا سر ہلایا۔ اس کے سوا چارہ جو کوئی نہ بچا تھا۔ گائتری دیوی نے گہرا سانس خارج کیا۔ وہ اب تک مبتلائے حیرت تھیں۔ وہ کیوں نہ جان پائیں بیٹی کے دل کا حال۔ انہیں تو اس لڑکے اسود اور اس کی بہن کی طرف سے ہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں ورغلا نہ دیں وہ ان کی بیٹی کو۔

"ٹھیک ہے پھر تمہیں ایک کام کرنا ہوگا۔" اور جو کام گائتری دیوی نے کہا، اس کا سر بے اختیار نفی میں ہلا۔

"میں دیوی کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔"

"یہ دھوکا نہیں ہے۔ درگا کے سر سے اسلام کا بھوت اتارنے کے لیے ایک کوشش ہے۔"

"سوری مگر میں ایسا نہیں کر پاؤں گا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا تم درگا کو نہیں چاہتے؟" گائتری دیوی نے اب دوسرے طریقے سے اسے گھیرنا چاہا۔ سیدھی سادھی عورت کو اولاد اور وقت نے پتا نہیں کیا کیا سکھا پڑھا دیا تھا۔

رام کے پیروں میں زنجیر پڑی۔ وہ گائتری دیوی کو کیا بتاتا کہ چاہنا بڑا چھوٹا لفظ ہے کیا بتاتا کہ دنیا کی کسی لغت کسی زبان میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو اس کے جذبات کی صحیح طور ترجمانی کرتا ہو۔

"کیا تم اسے پانا نہیں چاہتے؟"

"میں دیوی کو چاہتا بھی ہوں اور پانا بھی چاہتا ہوں۔ مگر اسے دھوکا دے کر نہیں۔" اس کا لہجہ مضبوط تھا۔

"یہ دھوکہ نہیں امر۔ دُرگا کو غلط رستے پہ چلنے سے روکنے کی ایک کوشش ہے۔ وہ لڑکا یہاں تک پہنچ گیا۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کو اور اس عورت کو۔ کیا نام اس کا۔ وہ جسے درگا۔ درگا 'ماں' کہتی ہے۔" وہ اٹکنے لگیں۔ اس عورت کا ذکر محال ہوا جو سوکن نہیں تھی، شوہر کا رشتہ نہیں بانٹا تھا مگر بیٹی کو بانٹ دیا تھا۔ ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

"اس نے کہا کہ اگر میں کہوں تو وہ ان کو باقاعدہ رشتہ کے لیے بھیج سکتا ہے۔ میں نے اسے منع کر دیا تھا۔ مگر ایسا ہوا۔ اگر ایسا ہوا تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ اس بار ہم چوہدری نگر سے آئے ہوئے کسی سوالی کو دروازے سے لوٹا سکیں گے نہ ہی شہر بدل سکیں گے۔ اس بار بڑا دنگا ہوگا۔ تم دھوکہ نہیں دے رہے امر! تم درگا کو تباہی سے بچاؤ گے۔ آنے والے فتنے کو ختم کرنے کی کوشش کرو گے۔"

"میں پھر بھی اسے دھوکہ ہی کہوں گا۔ اگر جھوٹ، دھوکے، بے ایمانی سے اسے پانا ہوتا تو اس رات اسے نراش واپس کیوں بھیجتا۔ اس کا ہاتھ تھام نہ لیتا۔

"یہ دیکھو امر!"

اور وہ ششدر رہ گیا۔ سانس نہ لے پایا۔ گائتری دیوی اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھیں۔

☆☆☆

انجمن نے ڈسٹنگ کرتے ہوئے ہر چہرے کو باری باری اور خوب غور سے دیکھا۔ بچوں کے علاوہ ہر بندہ ہی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آیا۔ صرف ارم تھی جو حبہ پہ چلا رہی تھی۔ ورنہ تو مومنہ تک چپ تھی جو چھ یار فرش پہ اس سے پوچا لگواتی تھی اور مطمئن نہ ہوتی تھی۔ چلاتی رہتی تھی کبھی اس پہ کبھی بچوں پہ۔

"خیر مومنہ تو منگنی کے بعد سے ہی کچھ چپ چپ سی ہو گئی ہے۔ حالانکہ پسند کی منگنی ہے اتنے بڑے فوجی افسر کے ساتھ۔ آسیہ باجی اور ارم باجی کی آپس کی پھس پھس سے پتا چلتا ہے کہ بہن بڑھتی تھی مومنہ کے ساتھ۔ وہیں کہیں لڑکا ملا اسے اور چکر چلا۔ چلو یہ تو پرانی بات ہے

۔اب کیا بات ہو گئی کہ رحیمہ باجی اور یہ رفعت باجی بھی چپ چپ سی ہیں۔ کہیں کوئی لڑائی تو نہیں ہو گئی آپس میں۔ لیکن بڈھے وارے (بڑھاپے میں) کیا لڑنا پہلے تو کبھی لڑی نہیں۔"

انجمن چاہ کر بھی اسباب دریافت نہ کر پا رہی تھی۔ سر جھٹکتے ہوئے اس نے اپنی توجہ ٹی وی کی جانب مبذول کی جس پہ پڑی گرد وہ جھاڑ رہی تھی۔ مگر توجہ کو بنائے رکھنا مشکل ثابت ہوا کیونکہ سامنے اسود آ بیٹھا تھا اور مومنہ نے اس کے لیے میز پہ ناشتا لگایا تھا۔

"اب ان کو کیا ہوا ہے۔ بُرقیاں (نوالے) بھی یوں سوچ سوچ کر منہ میں ڈال رہے جیسے ان پہ کسی نے پڑھ وڑھ (جادو ٹونہ) نہ دیا ہو۔" اس نے اسود کو دیکھتے ہوئے سوچا جو نوالہ ہاتھ میں لیے کسی گہری سوچ میں تھا اور جو نوالہ منہ میں تھا وہ جیسے چبانا اور نگلنا بھول بیٹھا تھا۔

"کام پہ دھیان تم دیتی نہیں ہو۔ پھر تمہاری ماں کہتی ہے کہ انجمن سارا دن آپ کے گھر لگا دیتی ہے۔ گھر آ کر کوئی کام کاج نہیں کرتی کہ تھک گئی ہوں۔ پتا نہیں کون سا ہل ہم تم سے چلواتے ہیں۔" ننھی عائزہ کو گل چہرہ کی گود میں دیتے ہوئے ارم نے اس کی کلاس لی تو وہ ہڑبڑا کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوئی۔

اسود بھی ارم کی آواز سے چونکا اور منہ میں رکھا نوالہ چبانے لگا۔ انجمن چہرے پڑھنا نہ جانتی تھی اس لیے جان نہ سکی کہ سوچ کے علاوہ بھی تھا کچھ اس کے چہرے پہ۔ تکلیف، تکلیف، بے حد تکلیف۔

"اگر میں کہوں کہ ہاں وہ مشکل میں ہیں، قید

میں بھی ہیں، مار بھی کھا رہی ہیں، بھوک پیاس بھی سہہ رہی ہیں تو کیا کریں گے آپ؟"

گھونٹ نگلنا نوالہ چبانا بھی اس کے لیے دو بھر تھا۔ وہ پیاسی تھی وہ بھوکی تھی، یہ احساس اس کی بھوک پیاس مار دیتا۔ وہ قید میں تھی اور اس کا بھائی اسے مارتا بھی تھا، یہ تصور بھی سوہان روح تھا۔ اور دل کا درد یہ سوچ کر بڑھ جاتا کہ وہ اسے اسی حالت میں چھوڑ کر واپس آ گیا تھا۔

"ابھی تک تو جگدیش غصے میں ہے بپھرا ہوا ہے کہ اس کی بہن مسلمان ہو گئی ہے۔ تم جگدیش کو نظر آ گئے تو اس کو دوسری وجہ مل جائے گی میری بیٹی پر ستم ڈھانے کی۔

چلے جاؤ یہاں سے اسود! میں تم سے پہلے کبھی نہیں ملی مگر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ تم ایک ماں کو عزت دینے والے ہو، اس کا مان رکھنے والے ہو۔ اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کی لاج رکھنے والے ہو۔"

گائتری دیوی نے بہت لاچار ہو کر کہا تھا اسے۔ وہ واقعی ایک ماں کو عزت دینے والا تھا، اس کا مان رکھنے والا تھا، اس کے جڑے ہاتھوں کی لاج رکھنے والا تھا۔ وہ وہاں سے چلا آیا تھا۔ اس نے بس ایک مطالبہ کیا تھا۔

"میں احتل سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"میرا وعدہ ہے کہ وہ بات کرے گی تم سے۔ بس ابھی تم چلے جاؤ۔ امر کے مہمان بن کر آئے ہو، امر کے مہمان بن کر لوٹ جاؤ۔"

وہ لوٹ آیا تھا وہاں سے مگر اپنا چین سکھ قرار نیندیں وہیں چھوڑ آیا تھا۔ اسے انتظار تھا گائتری دیوی کی کال کا۔ وہ ان سے پہلی بار ملا تھا لیکن اتنا تو وہ بھی جان گیا تھا کہ وہ وعدہ نبھانے والی عورت ہیں۔

"آؤ مہر! کیسی ہو؟" مومنہ نے چائے کا کپ اسود کے سامنے رکھتے ہوئے برآمدے میں داخل ہوتی مہرتاب کو دیکھا تو پوچھا۔ اسود بھی کپ اٹھاتے ہوئے بے دھیانی میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ٹھیک ہوں۔ مامی کہاں ہیں؟ ان سے کہنے آئی تھی کہ اطہر کراچی جا رہا ہے۔ حاشر کے لیے وہ کہہ رہی تھیں ناں کہ کچھ بھجوانا ہے۔"

"ہاں۔ امی نے حاشر کے لیے کچھ سامان بھیجنا ہے اور رباب کے لیے بھی ایک سوٹ لیا ہوا ہے۔ ماں نے حلوا بھی بنا رکھا ہے جو یاسر بھائی کو پسند ہے۔"

"دے دو لیکن اطہر کہہ رہا تھا کہ سامان زیادہ نہ ہو۔ بس یہ جانا ہے اس نے اور امی نے بھی پتا نہیں کیا کچھ اکٹھا کیا ہوا ہے۔ جیسے سبزیاں، آٹا، چاول، مکھن تو کراچی سے ملتے ہی نہیں۔" مہرتاب باتیں کرتے ہوئے گاہے بگاہے اسود کی طرف دیکھتی۔ پریشان لگ رہا تھا وہ اور کیوں پریشان تھا۔ یہ بھی خبر تھی۔

"سبزیاں، آٹا، چاول پھل بھی خریدنے پڑیں تو بھلا زمینداری کس کام کی۔" رفعت جہاں نے دو تین شاپر مہرتاب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اف مامی! اتنا کچھ۔ اطہر نے دیکھ کر ہی بے ہوش ہو جانا ہے۔" مہرتاب نے شاپرز بمشکل پکڑے۔ اتنے میں کچن میں سے رحیمہ احمد ایک ڈبہ لیے چلی آئیں حلوے کا۔

"ہائے اب یہ کیسے اٹھاؤں۔"

"لاؤ۔ مجھے دو۔ میں چھوڑ آتا ہوں۔" اسود کپ رکھ کر اٹھا اور شاپر اس کے ہاتھ سے لے لیے اور ساتھ ہی ماں کے ہاتھ سے حلوے والا ڈبہ۔

مہرتاب، مومنہ کے روکنے کے باجود "کام ہے گھر" کہہ کر اسود کے پیچھے ہی چلی آئی۔ برآمدے سے لے کر صحن، صحن سے لے کر گیٹ اور گیٹ سے لے کر ان کے گھر کے گیٹ تک کا فاصلہ وہ چاہتی تھی کہ کئی میل کا ہو جائے اور وہ اسود کے ساتھ ساتھ چلتی رہے، چلتی رہے۔ لیکن آدھا صحن پار کر کے ہی اس نے دیکھا کہ اسود تو اس سے بہت آگے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

کل تک زندگی خوابوں بھری تھی۔ اسکالرشپ مل جائے تو احتل کو لے کر باہر چلا جائے گا۔ وہاں جہاں کوئی جگدیش مہیشوری نہیں ہوگا۔ کوئی وسوسہ نہیں

ہو گا۔ زندگی پھولوں کی سیج ہو گی۔ ماسٹرز ہوتے ہی اچھی سی نوکری ڈھونڈے گا۔ نوکری ملتے ہی سب سے پہلے ماں اور امی ابو کو حج کروائے گا۔ مومنہ کی شادی بہت اچھے پیانے پہ اس کی خواہش کے عین مطابق کرے گا۔ اور پھر اجل کا ہاتھ تھام کر دنیا کی سیر کرے گا۔ اور۔ اور بھی بہت سے خواب تھے اس کے۔ انسان تھا۔ اور انسان کے خوابوں کا بھلا انت ہونا تھا کوئی؟

ہاں انت تو اب بھی کوئی نہ تھا مگر اس کے اور خوابوں کے بیچ حقیقت آکھڑی ہوئی تھی۔ وہ حقیقت جس کا سامنا بھی نہ بھی تو کرنا ہی تھا مگر اس طرح سے اور اتنی جلدی اسے خبر نہ تھی اور وہ ذہنی طور تیار بھی نہ تھا۔

''امت الاحد کے پاس گئے تھے؟'' اسے پتا ہی نہ چلا کب ماں آکر اس کے پاس پائنتی کی طرف بیٹھ گئیں۔ وہ ایک دم سیدھا ہوا۔

''ماں! ادھر بیٹھیں۔'' اس نے چارپائی سے اٹھ کر سرہانے کی طرف انہیں بٹھانا چاہا مگر ماں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے روکا۔

''بیٹھو اسود! مجھے کچھ بات کرنی ہے۔''

''جی ماں۔ آپ پہلے اٹھیں یہاں سے۔'' اس نے نرمی سے ان کا ہاتھ تھاما اور انہیں پائنتی کی طرف سے اٹھا کر سرہانے کی طرف بٹھایا۔

''جی اب کریں بات۔'' وہ ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا اور ان کا ہاتھ تھام کر بولا۔

''تم گئے تھے امت الاحد کے پاس؟''

مدھم روشنی میں وہ ان کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔ یہ سچ تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ وجہ وہی امت الاحد۔ ان دونوں سے زیادہ کسی اور نے چاہا ہوگا امت الاحد کو بھلا۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔

''کس حال میں ہے وہ؟''

اسود نے ہاں ناں میں جواب نہیں دیا تھا مگر ان کا اگلا سوال آگیا تھا۔

''اچھے حال میں نہیں ہے ماں۔''

''آزمائش ہے اس کے ایمان کی۔ ان شاء اللہ کامیاب ہو کر نکلے گی اس سے۔''

''ماں کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کاش وہ ہم سے نہ ملی ہوتی۔ اس کی زندگی کتنی آسان گزر رہی ہوتی۔''

''پھر وہ امت الاحد نہ بنتی، دُرگا دیوی رہتی۔ کیا اگلی زندگی آسان ہوتی جو ابدی ہوگی۔ نہیں اسود ایسا نہ سوچا کرو۔ میں تو کہتی ہوں اللہ کا بہت شکر ہے کہ وہ ہم سے ملی۔''

''وہ قید میں ہے ماں! اس کا بھائی اسے مارتا پیٹتا ہے۔ بھوکا پیاسا بھی رکھتا ہے۔ اور میں۔ میں اسے وہیں اسی حالت میں چھوڑ آیا۔'' وہ مرد تھا رو نہیں سکتا تھا اور نہ دل اس کا رونے کو ہی چاہ رہا تھا۔

''فی الحال مصلحت یہی تھی اسود۔

اچھا کیا تم لوٹ آئے اور جذبات میں آکر کوئی قدم اٹھا لیتے تو نتائج بہت برے ہو سکتے تھے اسود۔ تمہیں بڑا نقصان پہنچ سکتا تھا۔''

رحیمہ احمد نے نرمی اور محبت کے ساتھ اس کے دل پہ پڑا بوجھ ہلکا کرنا چاہا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی اتری پر وہ چپ ہو رہا۔

☆☆☆

جب بھی بادل گھر گھر آتے، بوند بوند برساتے یا جھڑی لگا دیتے۔ سماں نکھر سا جاتا اور قطروں سے بوجھل پھولوں کی مہک ہر سو پھیل سی جاتی، چڑیا چہچہاتی، کوئل کوکتی تو اسے ایک ہی منظر یاد آتا۔ ایک خوبصورت سا منظر۔ جیون کا حاصل وہ منظر۔

''تم کیا جانو اے مہران کے حسن۔ یہ بارش کیا کہتی ہے۔'' ایک کھلکھلاتا ہوا سا جملہ اس کے کان میں سرگوشی کرتا۔

رام کولی مسکرا اٹھتا۔ گنگنا اٹھتا۔

اور آج جو شام سے جھڑی لگی تو رات کے اس پہر بھی دھرتی سیراب ہو رہی تھی۔ وہ گھنٹے بھر سے کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ نظر بارش میں بھیگتے منظر پہ تھی اور خیال کہیں اور۔ آج اسے وہ منظر یاد نہیں آیا تھا۔ پانچ دن ہوئے، ایک ہی کربناک منظر اس کے

ذہن پہ ثبت ہو گیا تھا۔ کچھ اور یاد ہی نہیں آ رہا تھا۔
اسے زمین پہ گری بے ہوشی کے عالم میں بھی بھائی کے ہاتھوں پٹتی ہوئی دیوی یاد آتی تھی بس۔ اور کچھ نہیں۔
اور اس دن اس وقت جو وہ کر بیٹھا تھا، کہہ چکا تھا، بلا سوچے سمجھے ہوا تھا سب۔ اور اب اس کے نتائج یوں آئیں گے، اس کے گماں میں بھی نہ تھا۔
اس دن جب جگدیش مہیشوری وحشی بنا دیوی کو پیٹ رہا تھا۔ باہر گائتری دیوی بے بسی کے ساتھ روتے ہوئے چلاتے ہوئے دروازہ پیٹ رہی تھیں، کسی اور ملازم میں تو پاس جانے کی ہمت نہ تھی مگر وہ یہ آوازیں سن کر رہ نہ پایا اور بھاگ کر دیوی کے کمرے کی طرف گیا تھا۔
گائتری دیوی بیٹے کی منتیں کر رہی تھیں، اسے واسطے دے رہی تھیں مگر اندر جگدیش مہیشوری بہرا ہو چکا تھا، اسے کوئی آواز سنائی نہ دے رہی تھی اسے صرف دیوی دکھائی دے رہی تھی۔ ان کے دھرم کو غلط کہنے والی، ان کے بھگوانوں کو نہ ماننے والی۔
جگدیش مہیشوری اس کی ہڈی ہڈی توڑ ڈالتا جو کسی نہ کسی طرح دروازہ توڑ کر وہ دیوی کے کمرے میں داخل نہ ہو جاتا۔
دیوی زمین پہ گٹھری سی بنی پڑی تھی اور جگدیش مہیشوری کے نوک دار جوتے اس کے جسم پہ پڑ رہے تھے۔ یہ منظر نا قابل برداشت تھا۔ جس دیوی کو وہ سنگھاسن پہ بٹھا کر پوجتا تھا، وہ قدموں میں پڑی تھی۔
"اللہ ایک ہے۔ مجھے بتاتی ہے۔ ہمارے بھگوان محض پتھر ہیں۔ یہ کہتی ہے۔" جگدیش مہیشوری چلا رہا تھا اسے مار رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔
"مسلمان ہو گئی ہوں، اعلان کرتی پھرتی ہے۔ تمہاری موت کا اعلان نہ کروا دوں میں۔" وہ جھکا اور اس کی گردن دونوں ہاتھوں میں دبوچ لی۔
"دیوی نے راجیو سے شادی سے انکار میری وجہ سے کیا۔ وہ مجھ۔ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔" اس وقت اس کے دماغ میں جو آیا، وہ بول گیا۔ اس وقت وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ جگدیش مہیشوری کی توجہ دیوی پر سے ہٹ کر اس کی طرف ہو جائے۔ جو تشدد وہ دیوی پر کر رہا تھا وہ اس پر کر لے۔ جو گالیاں وہ دیوی کو دے رہا تھا، وہ اسے دے لے۔ اگر جو وہ دیوی کو جان سے مارنا چاہتا تھا تو اس کی جان لے، لے۔
جگدیش کو جھٹکا لگا۔ پھر وہ مڑ کر اس کی طرف آیا تھا۔
"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"
"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ دیوی نے صرف مسلمان ہونے کا بہانہ کر کے راجیو کو منگنی توڑنے پہ مجبور کیا۔ اصل وجہ میں ہوں۔"
"بکواس بند کرو نمک حرام۔ تم سے تو میں بعد میں نپٹوں گا۔ ابھی دفع ہو جاؤ ادھر سے۔"
جگدیش نے دروازے کی طرف اسے دھکا دیا۔ وہ پھر مڑا اور دیوی کی طرف دیکھا جس کا سر اب گائتری دیوی کی گود میں تھا اور وہ بے ہوش تھی۔
"دفع ہو جاؤ میں کہہ رہا ہوں۔ ورنہ جان لے لوں گا تمہاری۔" جگدیش نے اسے گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔
"امر! چلے جاؤ یہاں سے۔" گائتری دیوی بھی چلائیں۔
وہ کمرے سے باہر نکل گیا کیوں کہ گائتری دیوی کی وہ حکم عدولی نہیں کر سکتا تھا۔ حکم عدولی وہ تب بھی نہ کر پایا جب گائتری دیوی نے ہاتھ جوڑ کر منت کی تھی۔ وہ ان کے جڑے ہوئے ہاتھ دیکھ نہیں پایا اور بے اختیار انہیں تھام کر ماتھے سے لگایا۔ اس نے گائتری دیوی سے اس دن کوئی وعدہ نہیں کیا تھا مگر ان کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو تھام لیا تھا۔ اور اس کا مطلب ان کے نزدیک ایک وعدہ ہی تھا۔ اور اب اسے اس وعدے کو نبھانا تھا۔
زندگی میں اس سے بڑی مشکل اس پہ کبھی نہ آئی تھی۔ دھوکہ دینا۔ وہ بھی دیوی کو دھوکا دینا دنیا کا مشکل ترین امر تھا۔ اس کے نزدیک جرم تھا۔

دروازہ تو کئی دن پہلے کھل چکا تھا مگر اس کا ہی دل نہیں چاہتا تھا باہر نکلنے کو۔ ممی آتیں اس کے پاس۔ کبھی باتیں کرتیں تو کبھی روتیں۔ کبھی پیار کرتیں تو کبھی غصہ۔ وہ کوئی بھی ردعمل دیے بنا گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی رہتی۔ لاجونتی آتی۔ ہاتھ سے اس کے زخموں پہ مرہم لگاتی، زبان سے زخم ہرے کرتی۔ وہ چپ چاپ دیکھتی اور سنتی۔

"کوئی ہے جو بڑا بے چین سا پھرتا ہے تمہارے لیے۔ تمہارے دروازے تک آتا ہے پھر لوٹ جاتا ہے۔" وہ ہنس کر آدھی ادھوری سی باتیں کرتی۔ اس کے من میں کوئی ہلچل نہ ہوتی ہاں اک ٹیس سی ضرور اٹھتی۔

جگدیش مہیشوری بھی آتا۔ دھمکیاں دیتا۔ وہ سپاٹ چہرہ لیے سنتی رہتی۔ اپنے گھاؤ اور نیل دیکھتی رہتی۔ بہت دن بعد پہلی بار چونکی تھی جب بھاؤ کہہ رہے تھے۔

"کوئی کمی نہیں چھوڑی تمہارے لیے بھی۔ پیسہ زیور گاڑی گھر کیا نہیں دیا تمہیں۔ کپڑے جوتے موبائل ہر شے بہترین سے بہترین خریدی تمہارے لیے۔ رشتہ بھی کتنوں میں سے چن کر بہترین جگہ کیا تمہارا۔ مگر تم...... تمہیں ایک کولی ہی پسند آیا۔ تمہاری اوقات یہی رہی۔ شاید تم ڈیزرو ہی ایک کولی کرتی ہو۔"

وہ سر اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔

اتنے دن سے جو کمرے میں آرہا تھا تو اسلام کے خلاف مسلمانوں کے خلاف اور وہاں سے ہوتا ہوا چوہدری نگر کے باسیوں کے خلاف بولتا رہتا۔ زہر اگلتا رہتا۔ آج ایک کولی اس کی گفتگو میں کہاں سے آ گیا تھا۔

پھر لاجونتی کی آدھی ادھوری ذو معنی باتوں اور بھاؤ کے طعنوں کی طرح ممی کی باتوں میں بھی رام کا ذکر آنے لگا۔ موضوع بدلنے لگے۔ مگر اب یہ باتیں اسے بے معنی لگتیں۔ وہ دونوں الگ رستوں کے مسافر تھے۔ پھر ہاتھ تھام کر ساتھ چلنے کا سوال کیسا۔

اس شام بہت دنوں بعد وہ اپنے کمرے سے نکلی۔ پچھلے لان میں وہ جہاں موتیا کے پودے تھے، آ کر بیٹھ گئی۔ پھول پودے درخت ہر شے پہ اداسی کی تہہ سی نظر آئی۔ اپنے دل کا موسم ہر سو چھایا ہوا محسوس ہوا۔

اندر کمرے میں الماری کی طرف بڑھتے ہوئے رام کی نگاہ جو کھڑکی سے باہر پڑی تو اسے دیکھ کر اس کے قدم وہیں رکے۔

کتنے دن بعد نظر آئی تھی وہ۔ اس کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب تھا اور اب جو نظر آئی تھی تو دوسری فکر دامن گیر ہو گئی تھی۔ وہ دو قدم آگے آیا، کھڑکی کے آگے پردہ برابر کیا اور پلٹ کر اپنے بیڈ پر آ بیٹھا۔

وہ پریشان تھا۔ جس شخص سے آپ نے بے انتہا محبت کی ہو۔ دن اور رات کا ہر لمحہ اسے سوچا ہو۔ اس کے ساتھ کی تمنا کی ہو۔ وہ ناممکن سی خواہش ایک دم ممکن ہو جائے تو خوش ہوا جاتا ہے۔ اور وہ پریشان تھا کیونکہ اس کے لیے اسے اس لڑکی سے جھوٹ بولنا تھا جس کے ساتھ وہ سب سے زیادہ سچا تھا۔ یہ ایک بڑا امتحان تھا اور گائتری دیوی چاہتی تھیں کہ وہ اس امتحان میں پاس ہو۔

"نہیں...... میں ایسا نہیں کر سکتا۔" وہ جب بھی اس دھوکے کے بارے میں سوچتا اس کا سر نفی میں ہلتا۔

وہ اپنے دل کی شدید خواہش کے باوجود بھی اسے دیکھنے نہیں گیا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ یہاں سے بھاگ جائے۔ اتنی دور چلا جائے کہ گائتری دیوی کی آس بھری نگاہیں بھی اسے دیکھ نہ پائیں۔ اور ویسے بھی یہاں بچا ہی کیا تھا۔ اس لڑکی کی آنکھوں کی جلتی جوت تو اس نے بجھا دی تھی۔

اس نے اس گھر سے ہمیشہ کے لیے چلے جانے کی تیاری پکڑ لی اور پھر جا نہ سکا۔ یوں ہی چلا جاتا۔ اسے اس حال میں چھوڑ کر۔

اور اس دن اتنے دنوں بعد اس کی جھلک جو نظر آئی تو پھر کیا کرے کیا نہ کرے کے بیچ الجھتا ہوا پھر سے کھڑکی کے پاس گیا۔ پردہ ہٹایا اور کتنی ہی دیر اسے سوچتا رہا۔

"دیوی کا جنون اس کا عشق اس کی جان لے لے گا۔ تمہیں دیوی اور اس کے احد کے بیچ آنا ہے اس کا ہاتھ تھام کر اسے بھٹکنے سے بچانا ہے۔ اگر اس اچھے کام کے لیے جھوٹ بولنا پڑے تو بولنا ہے۔ یہ دھوکہ نہیں یہ تدبیر ہے۔" اس نے خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

پتا نہیں وہ ایک احتل کو دھوکہ دیئے جارہا تھا یا خود کو دھوکہ دے رہا تھا۔ لیکن یہ ہوا تھا کہ وہ اپنے کمرے سے نکل کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے نزدیک جا کھڑا ہوا تھا۔

دیوی کے سر پہ شاید کوئی چوٹ آئی تھی۔ وہاں بینڈیج تھا۔ پیچھے اس کے کندھے پر بھی دو تین انچ کا کوئی گھاؤ تھا جس نے اس حصے سے اس کی نیلی قمیص میں سرخ رنگ گھول رکھا تھا۔

وہ مہذب بندہ تھا مگر اس وقت بے اختیار اس کے دل سے جگدیش مہیشوری کے لیے گالی نکلی تھی۔

"ان کو لگتا ہے کہ میں نے راجیو کو شادی سے منع اس لیے کیا کہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔"

وہ ٹھٹکا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ لڑکی اس کو اس کی خوشبو سے پہچانتی ہے۔

"کیا واقعی ان کو یہ لگتا ہے کہ میرے انکار کے پیچھے وجہ یہی ہے؟" اس نے ذرا سا رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ تڑپ اٹھا۔

اس کے چہرے پہ نیل تھے، گھاؤ تھے، سوجن تھی۔ بہت بے دردی سے مارا تھا جگدیش نے اسے

۔

"جگدیش مہیشوری مجھ سے جو کبھی کسی کا قتل ہوا تو وہ تم ہو گے۔" اس کے ہونٹ اور اس کی مٹھیاں ایک ساتھ بھنچیں۔

"میرے سوال کا جواب دو رام۔"

"ہاں ...... انہیں یہی لگتا ہے۔" وہ نگاہ چرا کر بولا۔

"حیرت ہے۔" وہ ہنسی۔ "تمہارے لیے میری پسندیدگی انہیں نظر آ گئی۔ احد کے لیے میرا عشق انہیں نظر نہیں آیا۔"

"کیونکہ تمہارے احد کا کوئی وجود نہیں۔" رام کے منہ سے نکلنے لگا اور پھر ٹھٹکا۔ وہ تو یہاں کچھ اور کہنے آیا تھا۔

"انہیں نظر نہیں آتا مجھے نظر آتا ہے۔" ہاں یہ جملہ صحیح تھا، ٹھیک تھا۔ اور کچھ جھوٹ بھی نہ تھا۔ احد کے لیے اس لڑکی کی محبت کا اندازہ رام کوہلی سے زیادہ بھلا کس کو ہو سکتا تھا۔ اس محبت پہ اس نے رام کوہلی کی محبت وار دی تھی۔ ہاں یہ جملہ صحیح تھا، ٹھیک تھا۔ اور کچھ جھوٹ بھی نہ تھا۔ رام کوہلی نے یہ جملہ ادا کر ڈالا۔

پہلا لیول کمپلیٹ ہوا۔ تین ستارے مل گئے۔

وہ کھڑی ہو کر اس کی مڑی۔ اس کے نینوں کی جھیلوں میں حیرت تیر رہی تھی۔ وہ اس کے نزدیک آئی۔

"تم سچ کہتے ہو رام؟"

اور اس وقت جھوٹ کہنا رام کوہلی کے لیے زندگی کا سب سے بڑا مشکل امر ہوا۔

"ہاں۔" اس نے سامنے کھڑی لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ کہا جو وہ سننا چاہتی تھی اور وہ کہا جو اس وقت ضروری تھا۔

مشکل تھا مگر اگلا لیول بھی کمپلیٹ ہوا۔ اس جدوجہد پہ پھر سے تین ستارے ملے اور بونس میں دیوی کی آنکھوں کی چمک۔

احتل ہلکا سا مسکرائی۔ سوجے ہوئے ہونٹ کے ساتھ مسکراتے ہوئے وہ عجیب لگ رہی تھی۔

"تم جانتے ہو ناں میں احد کی محبت میں کچھ بھی کر سکتی ہوں؟"

"رام کوہلی جانتا ہے کہ وہ آپ کی محبت میں کچھ بھی کر سکتا ہے۔" ہاں یہاں اسے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رکھنے کے لیے تردد نہ کرنا پڑا، محنت نہ کرنی پڑی۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا سچ تھا۔

بہت کم وقت میں ایک اور لیول مکمل ہوا۔ تین ستارے ملے۔ اگلے ہارڈ اور سپر ہارڈ لیولز کو کھیلنے کے

لیے کچھ حوصلہ بھی ملا۔

"مسلمان ہو سکتے ہو میری محبت میں؟" وہ جانتا تھا، اس کھیل میں اتنا مشکل لیول آئے گا۔ اسے پار کر جاتا تو ونر ہو جاتا۔

"ہاں۔"

لیول سپر ہارڈ تھا، کھیلنے میں وقت لگا تھا لیکن وہ کمپلیٹ کر گیا تھا۔ اب وہ منتظر تھا کہ اسے ستارے ملیں۔ پٹاخے پھوٹیں، پھلجڑیاں چھوڑی جائیں اور اسے جیت کی خوشخبری دی جائے۔

"تم میرے ساتھ گیم کھیلو گے رام۔۔۔ یہ کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا میں نے۔" سوجے ہونٹ سے مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔ آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے اور چہرے پہ تکلیف تھی، دکھ تھا۔

آہ!

رام کوہلی ہار گیا۔ وہ یہ سپر ہارڈ لیول نہ کھیل سکا۔ واحد لائف چلی گئی۔ موبائل یا کمپیوٹر ہوتا تو پھر سے کھیل شروع کر دیتا۔ لائف کے لیے انتظار بھی کر لیتا اور جو انتظار نہ ہوتا تو پلے اسٹور سے خرید بھی لیتا، مزید موقع بھی پا لیتا۔ مگر یہ زندگی تھی، اس میں اور "لائف" نہ مل سکتی تھی۔

رام کوہلی چند لیولز تک کھیل کر ہار گیا تھا۔

☆☆☆

ان کے رات اور دن ہی اندھیر ہو گئے تھے۔ صبح کے آنے کا پتا چلتا نہ جانے کا۔ سورج کہاں سے نکلتا ہے کس طرف کو ڈھلتا ہے، کچھ خبر نہ پڑتی۔ بولائی ہوئی سی رہتیں۔ سامنے پڑی شے نظر آتی نہ ہی پاس ہوتی بات سمجھ آتی۔ اس لیے اس رات جب غنودگی کے عالم میں جھٹکا کھا کر بیٹھیں تو بہت دیر تک سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ ان کے پیروں پہ گرتا گرم مائع کیا شے تھا، ان کے قدموں سے لپٹی وہ کالی سی چیز کیا تھی۔

کئی بے ترتیب سانسیں لینے کے بعد سمجھ میں آئی کہ بیڈ کے کنارے پہ بیٹھی ان کے پیروں کو تھامے ان کی انگلیوں پہ سر رکھے وہ لڑکی ان کی بیٹی ہے۔ ان کی بیٹی۔ ان کی زندگی۔ ان کی جنت۔ وہ کالی سی "چیز" اس کے گھنے سیاہ بال تھے، وہ مائع سی "شے" اس کی آنکھ سے گرتے آنسو تھے۔ وہ تڑپ اٹھیں۔

"دُرگا۔" انہوں نے اپنے پیر پیچھے کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ ان کو تھامے ان پہ سر رکھے سسک رہی تھی۔

"درگا اٹھو...... کیا کرتی ہو۔ اٹھو...... ماں کو مارنے آئی ہو کیا؟" ان کی آواز میں بھی ان کے ہاتھوں کی طرح کپکپاہٹ تھی۔

"مرنے آئی ہوں ممی۔"

گائتری دیوی کا دل رکنے لگا۔

"اٹھو درگا۔" انہوں نے ایک دفعہ پھر اپنے پاؤں کھینچنے کی اور اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی۔

"یہ گھر مجھے قبر لگتا ہے میرے دل کی میری روح کی قبر، میرے عقیدوں کی میرے جذبات کی قبر۔ اور اب آپ مجھے اس قبر سے نکال کر دوسری قبر میں منتقل کر رہی ہیں۔ جہاں میرے جسم کی قبر بنے گی۔" وہ سسک رہی تھی۔ اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔

"چپ ہو جاؤ درگا۔ بھگوان کے لیے چپ ہو جاؤ۔" گائتری دیوی اپنے پاؤں ہٹا سکیں نہ اسے سیدھا کر سکیں نہ اس کے منہ سے نکلے لفظ سہ سکیں تو بے بسی کے ساتھ لرزتی آواز میں التجا کی۔

"ممی کوئی ہندو کوئی مشرک وہ راجیو ہو رام ہو یا کوئی اور...... جس کے ساتھ بھی آپ میرے پھیرے لگوا دیں گے۔ وہ میرے قریب آئے گا تو مجھے جہنم کی آنچ محسوس ہو گی۔ وہ مجھے چھوئے گا تو میرا جسم جلے گا۔"

"درگا......"

"ممی مرنے آئی ہوں میں۔ اپنے ہاتھ سے مار ڈالیں۔ آپ میری ماں ہیں میرے جسم پہ آپ کا حق ہے۔ آپ مجھے مار ڈالیں۔ کسی اور کے حوالے نہ کریں اس کام کے لیے۔"

"چپ ہو جاؤ دُرگا۔ بتاؤ کیا چاہتی ہو؟"

یہ سوال بھی انہوں نے بیٹی سے نہ کیا تھا کہ وہ

کیا چاہتی ہے۔ جانتی تھیں کہ اس سوال کا جواب ان کی جان لے کر رہے گا۔ مگر ابھی اس وقت ان کے قدموں میں پڑی سسکتی ہوئی بلکتی ہوئی بیٹی بھی تو جان لے رہی تھی۔ ان کا دل یوں اچھل پچھل ہو رہا تھا کہ لگتا تھا ابھی باہر آجائے گا یا پھٹ جائے گا۔

ایسا نہ تھا کہ انہیں پیشگی خبر نہ تھی کہ قیامت آکر رہے گی، سب کچھ ڈھا کر رہے گی۔ پھر بھی کسی چمتکار کا انتظار تھا انہیں۔ چمتکار نہ ہوا تھا اور قیامت آکر رہی تھی۔ شو جی نے وشنو نے دُرگا ماں نے بھگوان کرشن نے ان کی نہیں سنی۔ الزام امر کے سر ڈال کر اسے احساس جرم میں مبتلا کر کے پتا نہیں کس کو مطمئن کرنا چاہا تھا انہوں نے دوسروں کو یا اپنے آپ کو۔ وہ نہیں جان پایا تھا یا اس نے انہیں مطلع نہ کیا تھا کہ درگا مسلمان ہو گئی ہے تو کیا ہوا، کیا وہ خود نہ جانتی تھیں۔

بیٹی کو ایک بار نہیں کئی بار سجدوں میں پڑے دیکھا تھا۔ انہیں تو وہ نیلی چادر بھی معلوم تھی جسے تھصلی بنا کر وہ نماز پڑھتی تھی۔ کئی بار انہوں نے اسے روزے سے محسوس کیا تھا۔ وہ صبح جو اٹھتی تو مغرب تک کچھ نہ کھاتی۔ چاہے وہ اسے کتنی ہی بار کھانے پہ کیوں نہ بلاتیں۔ کئی بار وہ کھانا یا کوئی مشروب خود اس کے کمرے میں لے جاتیں مگر وہ نوالہ یا گھونٹ تک منہ میں ڈالتی۔

”کھانا ناں ...... دل نہیں چاہ رہا۔“ اس کا ایک ہی جواب ہوتا۔ جواب تو اس کے بس جگدیش کے سامنے ختم ہوتے تھے۔

وہ بچی نہیں تھیں کہ کچھ سمجھ نہ پاتیں مگر مشکل یہ تھی کہ سمجھ کر کچھ کرنے سے قاصر تھیں۔ انہوں نے لفظوں میں اشاروں میں سمجھانے کی کوشش بھی کی مگر کبھی کھل کر بات نہ کی۔ انہیں خوف تھا کہ اس کی آنکھ اور زبان کا لحاظ چلا گیا تو پھر قابو نہ آئے گی۔ اور اب لگتا تھا کہ وقت اور اختیار ان کے ہاتھ سے چلا گیا۔ اب وہ جگدیش مہیشوری کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر ڈنکے کی چوٹ پر اقرار کرنے لگی تھی کہ ہاں ہوگئی ہے وہ امت الاحد۔ پڑھ لیا ہے اس نے کلمہ۔ اب ان

کے پاس اپنی بیٹی کو راہ راست پہ لانے کا ایک ہی ذریعہ تھا۔ امر۔

انہوں نے اسی کے آگے ہاتھ جوڑے، اسی کی منت کی، اپنے احسانوں کا بدلہ مانگا۔ انہیں لگتا تھا کہ بھی وہ بیڑی ہے جو ان کی بیٹی کو پابجولاں کر دے گی، اس کو نرکھ کی طرف جانے سے روک دے گی۔ وہ بری عورت نہیں تھیں مگر گھٹیا طریقے استعمال کر کے بیٹی اور امر جو بیٹے جیسا تھا، کے دل سے کھیل کر جذبات کو ہتھیار بنا کر ایک اور چمتکار کی منتظر تھیں۔

”میں نہیں جانتا کہ مجھے دکھ ہے یا اطمینان ہے۔ مگر میں اس کھیل میں ہار گیا۔“ امر انہیں بتا گیا تھا شام میں۔

ایک بار پھر چمتکار نہیں ہوا۔ ایک بار پھر امتحاں۔ اور ہر امتحاں پہلے سے سخت امتحاں درپیش تھا۔

ہاں...... وہ روتی بھی تھی چلاتی بھی تھی۔ جھنجلاتی تھی ان پہ غصہ بھی کرتی تھی۔ دھمکیاں دیتی تھی اور بہت کچھ کر بھی جاتی تھی۔ مگر اس طرح ....۔ اس طرح بھی ان کے قدموں سے لپٹ کر روئی نہ تھی۔ وہ ان کی جنت تھی۔ اس کی پیدائش کے بعد رام مہیشوری جیسے بنئے بندے میں بھی انسانی صفات جھلکنے لگی تھیں اور سب سے بڑی بات انہوں نے بیوی کو بھی اہمیت دینی شروع کر دی تھی۔ گائتری دیوی کو لگتا تھا جنت ان کے قدموں میں ہے یا نہیں مگر ان کی بیٹی ان کے لیے جنت ضرور ہے۔ اور آج یہ جنت ان کے قدموں میں پڑی سسک رہی تھی تڑپ رہی تھی التجا کر رہی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ ماں تھیں اس لیے کہ وہ ماں نہیں تھیں۔ دھرم کے معاملے میں وہ بھول جاتی تھیں کہ وہ ماں ہیں انہیں یہ یاد رہتا تھا کہ وہ ہندو ہیں اور ان کی بیٹی کو بھی ہندو ہی ہونا ہے ہندو ہی رہنا ہے۔

کیا ملے گا انہیں اسے زبردستی ہندو بنا کر۔ اپنے ہاتھوں سے اس کے جسم کو قبر میں اتار کر آگ لگا کر۔ کیا ملے گا۔ اس کا مردہ دل اس کے مردہ جذبات اس کی مردہ روح اور۔ اور اس کا مردہ جسم۔

”کیا چاہتی ہو دُرگا؟“ انہوں نے اپنا سوال

دہرایا۔ انہیں اپنی آواز دور کہیں کسی کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔

ممی کے سوال پہ اس کے جسم نے جھٹکا کھایا تھا ۔سوال دہرانے پہ اس نے ان کے پیروں پہ سے اپنا سر اٹھایا۔ اور ممی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اس کے چہرے پہ کچھ ایسا تاثر تھا کہ گائتری دیوی کو جھٹکا سا لگا۔ غلط سوال پوچھ لیا تھا اور دوبار پوچھ لیا تھا۔

☆☆☆

اس رات وہ فاطمہ سے بات کرنے کے بعد چھت پہ پڑی چارپائی پہ لیٹا چاند میں اس لڑکی کا چہرہ ڈھونڈ رہا تھا جو پابند سلاسل تھی۔ وہ جن کے قلعے سے ہو آیا مگر راجکماری کو آزاد نہ کروا پایا۔ وہ کیسا شہزادہ تھا۔ بے بس لاچار...... بچپن کی پڑھی کہانیاں بس کہانیاں ہی ہوتی ہیں کیا؟

اندھیرے میں سرہانے پڑے موبائل کی اسکرین روشن ہوئی تو وہ اپنے سوالوں سے نکلا۔ اس نے یونہی موبائل اٹھا کر سامنے کیا اور پھر ایک دم اٹھ بیٹھا۔

گائتری دیوی نے اپنا وعدہ نبھایا تھا۔

''احل۔'' وہ موبائل کان سے لگا کر فقط اتنا کہہ سکا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

''تم ٹھیک ہو ناں؟'' بہت دیر بعد یہ سوال کر پایا۔

''ہاں۔'' بہت دیر بعد ہی دوسری طرف سے جواب آیا تھا۔

''تم نے کچھ کھایا ہے؟'' اس کی بھوک پیاس نے اتنا تڑپایا تھا کہ منہ سے یہی سوال نکلا اور جانے وہ کیوں ہنس دی تھی۔

''ہاں بہت کچھ کھایا ہے۔ چاول، کڑی، گالیاں، تھپڑ، جوتے، ٹھڈے، مکے بہت کچھ۔'' اس نے سوچا تھا۔

''احل میں آیا تھا عمر کوٹ۔'' دوسری طرف اس کی خاموشی محسوس کر کے وہ بولا۔

''ہاں۔۔۔ جانتی ہوں۔ آئندہ یہ غلطی نہیں کرنا،

اسود۔ تم بھاؤ کو جانتے نہیں ہو۔''

''بہت اچھی طرح سے جان گیا ہوں۔'' وہ بڑبڑایا۔

''ماں کیسی ہیں؟''

''پریشان ہیں تمہارے لیے۔ ساتھ ساتھ انہیں یقین بھی ہے کہ تم اس امتحان سے کامیاب ہو کر نکلو گی احل۔''

دوسری جانب احل نے محض سر ہلایا۔

''جگدیش مہیشوری تمہیں اب مارتا تو نہیں احل؟''

''نہیں۔''

''احل...... میں تمہیں لینے آرہا ہوں۔ وہ محل تمہارے لیے عقوبت خانہ ہے۔ تم نکل آؤ وہاں سے ۔اللہ تمہیں اکیلا نہیں چھوڑے گا۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ قانون بھی تمہاری حفاظت کرے گا۔''

احل چپ رہی۔

''تمہیں جگدیش مہیشوری کا ٹارچر سہنے کی ضرورت نہیں ۔۔۔ تم بول کیوں نہیں رہیں احل؟''

اسود کو ایک دم اس کی خاموشی محسوس ہوئی۔

''تم زیادہ پریشان ہو رہے ہو اسود۔ میں ٹھیک ہوں۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''کتنی ٹھیک ہو میں جانتا ہوں۔ امر نے بتایا تھا مجھے۔''

''بھاؤ غصے میں ہیں اسود۔ ان کا ری ایکشن ایسا ہی ہونا تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ مجھے ڈانٹیں گے۔ ماریں گے۔ ہاں دو دن بھوکا پیاسا رکھیں گے یہ نہیں جانتی تھی۔ مگر یہ اتنی بڑی بات نہیں کہ میں اپنا گھر چھوڑ دوں۔''

''اپنا گھر......'' اسود کو وہ بدلی ہوئی سی لگی۔ یہ وہ لڑکی نہیں لگ رہی تھی جس کا گھر چوہدری نگر کا سرمئی گیٹ والا تھا۔ جو اس گھر میں قدم رکھنے کے لیے تڑپتی تھی اس کے آنگن کے درخت پہ لگی پینگ پہ بیٹھنے کے لیے مچلتی تھی۔ اس کی اینٹ اینٹ کو چھونے کے لیے بلکتی تھی۔

"تم وہاں محفوظ نہیں ہو احتل ـ" اسے وہی خواب یاد آیا جس کی تعبیر تو بہت اچھی تھی مگر اسے ڈرائی تھی۔

"فکر مت کرو جان سے نہیں ماریں گے یہ مجھے" احتل ہنسی۔ اس کی ہنسی سے بھی نقاہت جھلکتی تھی۔ اسود کو اچھے نہیں لگے تھے اس کے الفاظ۔ ہاں وہ جانتا تھا کہ اس کی اس بات پہ کیوں اس کا دل لرزا ہے۔ "تو پھر تم عمر کوٹ کے اس زندان سے نکلنا نہیں چاہتیں؟"

"اپنی ماں کو چھوڑ کر کیسے نکل آؤں اسود۔"

"اپنی ماں ......" اسود کو پھر جھٹکا لگا۔ یہ وہ لڑکی نہیں لگ رہی تھی جس کے لیے "ماں" لفظ کے معنی مطلب مفہوم صرف "رحیمہ احمد" تھے۔

"مجھ سے شادی کرو گی احتل۔" اس نے کبھی بھی احتل کو اس طرح پروپوز کرنے کا نہیں سوچا تھا۔ اس نے کبھی بھی اپنی امی کے فیصلے کے خلاف جانے کا بھی نہیں سوچا تھا۔ اس نے کبھی بھی ماں کے سوال کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔ اس سب کے باوجود وہ پوچھ بیٹھا تھا۔ اور احتل کی چپ بتاتی تھی کہ سوال بے موقع تھا۔ "مجھ سے شادی کرو گی احتل؟" ٹھیک ہے بے موقع سہی مگر اب پوچھ لیا تھا تو جواب تو لینا تھا ناں اس لیے سوال دہرایا۔

"ہاں ...... کروں گی۔" اس نے گہرا سانس بھر کر جواب دیا۔

چوہدری اسود حیدر کو چاند ایک دم مزید روشن لگنے لگا۔ ہوا کے نوحے گنگناہٹوں میں بدلتے محسوس ہوئے۔ اس رات اس نے رحیمہ احمد کا ہاتھ تھام کر ان سے وہ سوال کیا تھا جو وہ ہمیشہ اس سے کیا کرتی تھیں۔

☆☆☆

اس کا لاکر سونے اور ہیرے کے زیورات سے بھرا پڑا تھا، اس کی الماری میں قیمتی ملبوسات تھے، اس کے کمرے میں ہر شے بیش قیمت تھی۔

مگر اس نے کچھ نہ اٹھایا تھا۔ اس نے صرف ایک چیز اٹھائی تھی۔

گائتری دیوی اپنے کمرے کی کھڑکی سے اپنی بیٹی کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

"کیا چاہتی ہو دُرگا؟" اس رات انہوں نے پوچھا تھا۔

ان کے سوال پہ اس کے جسم نے جھٹکا کھایا تھا۔ سوال دہرانے پہ اس نے ان کے پیروں سے اپنا سر اٹھایا تھا اور ان کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس کے چہرے پہ کچھ ایسا تاثر تھا کہ ان کو جھٹکا سا لگا۔ غلط سوال پوچھ لیا تھا اور دوبارہ پوچھ لیا تھا۔

"امت الاحد بننا چاہتی ہوں۔" اس نے رونا بلکنا چھوڑ دیا تھا مگر جسم میں اور آواز میں لرزش ابھی بھی تھی۔

"وہ تو تم بہت پہلے کی بن چکیں دُرگا۔" مدتوں بعد آخر تسلیم کر لیا گیا۔ ایک ماں کو تسلیم کرنا ہی پڑا۔

"مجھے دُرگا نہ کہیں۔ امت الاحد کہیں۔"

"اس گھر میں تم ہمیشہ درگا رہو گی۔" دوسری خواہش رد ہوئی۔

"پھر مجھے اس گھر سے نکال دیں۔"

"یہ تمہاری تیسری خواہش ہے؟" ان کی آواز میں سرسراہٹ تھی۔

"نہیں تیسری خواہش یہ ہے کہ میری شادی ایک مسلمان شخص کے ساتھ کریں۔"

"اسود کے ساتھ؟"

"ایک مسلمان مرد کے ساتھ۔ پھر بھلے وہ اسود ہو۔"

گائتری دیوی اپنی بیٹی کو جاتا دیکھتی رہی۔

"ممی ...... کیسے چلی جاؤں آپ کو چھوڑ کر۔" پچھلی رات وہ سسکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"چھوڑ تو بہت پہلے چکی ہو۔" ان کی آواز دور کہیں بہت دور سے آئی تھی۔

"ممی ...... اسود رشتہ لے کر آئے گا۔ بھاؤ مان۔"

❀ ❀

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نمرہ احمد



چھبیسویں قسط

"میں ایک اسکول ٹیچر ہوں۔ چھوٹے بچوں کو پڑھاتی ہوں۔ ہم اسکول ٹرپ کے ساتھ استنبول آئے تھے۔ میں تم سے ملنا چاہتی تھی۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے اس ای میل سے مجھے پہچان لیا۔" وہ بھیگی آنکھوں سے مسکرائی۔ وہ ویسی ہی تھی۔ تروتازہ، شفاف، سادہ۔

"تم یہاں آجاؤ۔ میرے پاس کام کرو۔"

"نہیں ماہر۔ جب تک کین کلر نہیں پکڑا جاتا، میں غیر محفوظ رہوں گی۔ گمنام۔ اسی شناخت کے ساتھ۔" اس نے سر جھٹکا۔ "تم سے ملنے کا خطرہ بھی میں نے اپنے لیے مول نہیں لیا۔"

اس نے درمیانی میز پر رکھا کینوس بیگ کھولا اور اندر سے کچھ نکالا۔ وہ جو مالک فرید کی شان میں بہت کچھ کہنے والا تھا، رک گیا۔

"مجھے یہ تمہیں بہت پہلے دینا تھا لیکن میں نہیں دے سکی۔" وہ ایک البم اس کی طرف بڑھائے ہوئے تھی۔

ماہر نے الجھ کے البم تھاما۔ پھر اسے گھٹنوں پر رکھ کے کھولا۔

پہلے صفحے پر اس کی ماں کی تصویر تھی۔

"یہ کیا ہے؟" چونک کر چہرہ اٹھایا۔

"یہ شمس کو اس جادوگر سے ملا تھا جس نے تمہارے اوپر جادو کیا تھا۔ اور میں نے اسے شمس کے لاکر سے چرایا تھا۔ اس میں مختلف عورتوں کی تصاویر ہیں۔ تمہاری ماں۔ اور دوسری چار عورتیں۔"

وہ صفحے پلٹتا رہا تھا۔ ہر صفحے پر دو تصاویر ہوتیں۔ ایک خوب صورت عورت کا چہرہ۔ اور نیچے اس کا مردہ یا زخمی چہرہ۔

"اس البم میں صرف ان عورتوں کی اصل تصاویر تھیں۔ یہ مردہ، زخمی چہرے والی تصاویر میں نے لگائی ہیں۔"

"تم ان عورتوں کو ٹریک ڈاؤن کر رہی تھیں۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"یہ وہ عورتیں نہیں ہیں جن کو مارنے کے بعد کین کلر نے اپنا نشان بنایا تھا۔ یہ عورتیں اس نے اپنے اوبیشن (جنون) کے پیچھے نہیں ماری تھیں۔ یہ وہ عورتیں ہیں جو اس نے اس جادوگر کے لیے ماری ہیں۔ میں نے انٹرنیٹ کی مدد سے ہر عورت کو ڈھونڈ لیا ہے۔ ان سب کی شادی، تمہاری ماں سمیت، کسی ایسے مرد سے ہوئی جو ان کے قابل نہ تھا۔"

"سحرِ عشق۔" وہ بڑبڑایا۔ اب وہ تیسرا صفحہ پلٹ رہا تھا۔

"تمہاری ماں کے علاوہ باقی سب کو ان کے شوہروں نے مارا ہے۔"

"فیمی سائڈ" وہ بڑبڑایا۔

(فیمی سائڈ عورتوں کے ایسے قتل کو کہتے ہیں جو ان کے عورت ہونے کی بنا پہ کیا جاتا ہے۔ اس میں غیرت کے نام پہ کیے جانے والے قتل بھی شامل ہیں اور محبت کے نام پہ کیے جانے والے بھی۔)

"ان تمام عورتوں کی تصاویر پبلک ریکارڈ کا حصہ ہیں۔ اور ان سب کے بچے پراسرار طریقے سے غائب ہو گئے تھے۔"

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ دل دھڑکنا بھول گیا۔

"ہلال کے علاوہ دوسرے بچے بھی..." حلق رندھنے لگا۔ چوتھے صفحے پر اس نے البم بند کردی۔
"تم یہ مجھے کیوں دے رہی ہو، سرینہ؟"
"کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ..." وہ کھنکھاری۔
"ان میں سے ایک لڑکی ابھی زندہ ہے۔"
وہ چونکا۔ پھر سے البم کھولا۔ صفحے پلٹائے۔
آخری تصویر پہ وہ ٹھہرا۔ وہ ایک ہی تصویر تھی۔ نیچے جگہ خالی تھی۔
"یہ وہ واحد لڑکی ہے جس کی تصویر مجھے نہیں مل سکی۔ کیونکہ یہ انٹرنیٹ پہ اپنی تصویر شیئر نہیں کرتی۔ نہ مجھے اس لڑکی کے نام سے کوئی فیس سائڈ کا کیس ملا ہے۔ اس کا ایک ہی مطلب ہے۔"
"کہ یہ زندہ ہے اور سرکار کا اگلا ٹارگٹ ہے۔"
"یقیناً سرکار اس پہ جادو کررہا ہے۔ اور اس کے ساتھ بھی وہی ہوگا جو دوسری لڑکیوں کے ساتھ ہوا ہے... اگر تم نے کچھ نہ کیا۔"
وہ اس چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ سبز آنکھیں۔ مسکراہٹ۔ اعتماد۔
"میں کچھ نہیں کرسکتی۔ سوائے اس کے کہ مرنے سے ڈرنا چھوڑ دوں۔ لیکن تم کرسکتے ہو، ماہر۔"

مکمل ناول



اس نے تصویر البم سے نکالی اور اسے اوپر لے گیا۔ اب وہ مکمل روشنی میں تھی۔ اس کے پیچھے کچھ ہاتھ سے لکھا تھا۔

"تم اس لڑکی کو بچا سکتے ہو۔ اس کو ڈھونڈ کے اس کے پاس جا سکتے ہو۔ اس کو ساری حقیقت بتا سکتے ہو۔"

ماہر نے تصویر پلٹی۔

"وہ میرا یقین نہیں کرے گی۔ ماہر فرید کا کوئی یقین نہیں کرتا۔"

تصویر کی پشت پر چند الفاظ درج تھے ۔حور جہاں کی بیٹی کشمالہ۔

اس کی ساری دنیا ایک دم تھم سی گئی۔ ذہن میں جھماکہ سا ہوا۔

"آصف ... آصف نے مجھے بتایا تھا کہ حور جہاں کی بیٹی سرکار کو جانتی ہے۔"

"آصف کون؟"

"کوئی نہیں۔" وہ سر جھکائے تصویر کو واپس البم میں لگانے لگا۔

"اگر سحر عشق سے پیدا ہونے والے بچے غائب ہو رہے ہیں تو سرکار ان بچوں کو قتل نہیں کر رہا۔ وہ ان کو کسی مقصد میں استعمال کر رہا ہے ۔یعنی... ہلال زندہ ہے۔" اس نے البم بند کر کے ایک طرف رکھا۔

"اور اگر میں سرکار کو ڈھونڈ لوں تو میں ہلال کو ڈھونڈ سکتا ہوں۔"

"اور سرکار تمہیں اسی لڑکی کے آس پاس ملے گا۔ وہ اس پہ جادو کر رہا ہے۔ اور میرا دل کہتا ہے کہ یہ لڑکی ابھی زندہ ہے۔ تم اس کو بچا سکتے ہو۔ میں تمہیں یہی بتانے آئی تھی۔"

اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ اس البم کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ میرا یقین نہیں کرے گی۔ کوئی کسی اجنبی کا یقین نہیں کرتا۔" اس کی آنکھوں میں بہت سا کرب اتر آیا۔

"ماہر..." وہ اسی نرمی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ "اگر تم اسے یہ البم دکھاؤ گے تو وہ تمہارا یقین کرے گی۔ سچ اپنے آپ کو خود منواتا ہے۔ تم اس کو بچا لو گے۔"

اس نے آنکھیں اٹھا کے سر بینہ کو دیکھا۔ وہ امید سے مسکرا رہی تھی۔ اسے اس ظالم دنیا کے بارے میں ہمیشہ اچھی امیدیں ہوتی تھیں۔

"تم اس لڑکی کے ساتھ وہ سب نہیں ہونے دو گے جو البم میں موجود دوسری لڑکیوں کے ساتھ ہوا۔ اور ایک دن تم یہیں اسی کرسی پر بیٹھ کے اسے یہ سب بتاؤ گے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اس چہرے کو انسانوں کے سمندر میں کہاں ڈھونڈے گا؟

☆☆☆

تین ماہ بعد۔

اسلام آباد۔

وہ ایک شاہانہ طرز کا ہوٹل سوئیٹ تھا۔ اس میں لیونڈر اور موتیے کی خوشبو پھیلی تھی۔

عبدالمالک فرید ایک بڑے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھے تھے۔ ایک بازو صوفے کی پشت پر تھا۔

ان کے سامنے کرسی پر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ فربہی مائل۔ سر سے آدھا گنجا۔ عینک لگائے۔ اور ایسا سرمئی کوٹ پہنے جو اس پر ذرا تنگ تھا۔

"ماہر آنے والا ہے؟" وہ غور سے مالک کو دیکھ رہا تھا۔

"ہاں۔ وہ اسی ہوٹل میں ہے۔"

"وہ یہاں کیوں ہے؟"

"وہ اپنی بہن کو تلاش کر رہا ہے۔"

"چچ۔" عینک والے آدمی نے افسوس سے سر جھٹکا۔ "اسے کھوئے دو برس ہو گئے ہیں۔ اغوا

ہوئے بچے دو دن سے زیادہ زندہ نہیں رہتے۔"

جواباً انہوں نے بے زاری سے کندھے اچکا دیے۔

"اس کی عادت ہے ہر شے کو اوبسیشن بنالینا۔" وہ جیسے اس موضوع سے تھک چکے تھے۔

"پھر؟" اس کی سوالیہ نظر پہ مالک فرید نے گہری سانس لی۔

"پھر یہ کہ مجھے ماہر کو واپس لندن آنے کے لیے راضی کرنا ہے۔"

"اور سچ؟ وہ تم اسے کب بتاؤ گے؟"

مالک فرید کے چہرے پہ سایہ سا گزرا۔ انہوں نے جواب نہیں دیا۔ گردن موڑ کے باہر دیکھنے لگے وہاں ایک روشن دن طلوع ہو رہا تھا۔

"مالک... تمہیں سچ بولنا ہوگا۔"

"وہ لندن واپس آئے گا تو خود ہی جان لے گا۔" انہوں نے سر جھٹکا۔

"سچ جاننا اس کا حق ہے۔ بہتر ہے وہ ابھی جان لے بجائے اس کے کہ..." اس نے افسوس سے سرنفی میں ہلایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہ؟"

"کہ فرید ہولڈنگ ایک دم سے زمین بوس ہو جائے گی۔ اور ماہر، ہیربل، تمہاری بیٹیاں، ان کے سروں کی چھت تک چلی جائے گی۔ بہتر ہے کہ اسے سچ بتا دو۔ اسے ہولڈنگ میں واپس آجانا چاہیے۔"

عینک والا شخص جھکا اور میز پر رکھے کاغذات بریف کیس میں ڈالے۔

"اسے ان پیپرز کے بارے میں علم ہونا چاہیے۔" جتا کے کہتے ہوئے بریف کیس کو لاک کیا۔ انہوں نے جواب نہیں دیا۔

وہ کمرے سے نکل رہا تھا جب ماہر راہ داری میں ایک دروازے سے باہر آتا دکھائی دیا۔ عینک والا شخص جلدی سے سر جھکا کے آگے بڑھ گیا۔

ماہر نے گردن موڑ کے اسے جاتے دیکھا، پھر اندر داخل ہوا۔ پھر سامنے والے صوفے پر آکے بیٹھا۔

"یہ کون تھا؟"

"میرا سی ایف او۔"

"کیا کہہ رہا تھا؟" اس نے غور سے مالک کے چہرے کو دیکھا۔ اسے وہم سا ہوا تھا کہ وہاں ایک سایہ گزرا ہے۔

"ایک... مسئلہ تھا۔ فرید ہولڈنگ کا آڈٹ ہوا تھا اور..." انہوں نے سر جھٹک دیا۔ کچھ غیر آرام دہ سا تھا ان کے انداز میں۔

"کیسا مسئلہ؟"

وہ ہلکا سا مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ میں اداسی تھی۔

"کیا فرید ہولڈنگ کے مالی مسئلے سن کے تم واپس آنے کے لیے تیار ہو جاؤ گے؟"

"میں اس وقت خود مسئلوں میں گھرا ہوں۔" وہ تلخی سے کہتا سامنے بیٹھا۔ بریف کیس میز پر رکھا۔ وہ چونک کر دیکھنے لگے۔ وہ اندر سے کچھ نکال رہا تھا۔

"میں کسی کو ڈھونڈ رہا ہوں۔" اس نے بالآخر تین ماہ بعد مالک فرید سے مدد مانگنے کا ارادہ کرلیا تھا۔

انہوں نے ٹانگ سے ٹانگ ہٹائی اور آگے ہو کے بیٹھے۔

"تمہارا کولیکشن ہے پندرہ جولائی کو۔ تمہیں ڈیزائن جمع کروانا ہے۔ تم کیف کے بجائے کس پہ فوکس کر رہے ہو؟"

"یہ البم مجھے کہیں سے ملا ہے۔ یہ مت پوچھنا کہاں سے۔" وہ انہیں نے بغیر اسی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ "اس میں اس جادوگر کی ٹارگٹ کردہ عورتوں کی تصاویر ہیں۔"

"آہ... تم اور تمہارا اوبسیشن۔" مالک فرید کے چہرے پہ کڑواہٹ بکھر گئی۔ ناگواری سے اسے کھولا۔ پہلے صفحے پر رابیل کی تصویر تھی۔ ان کے

چہرے پر کوئی تاثر نہیں آیا۔ایک ایک کر کے صفحے پلٹاتے گئے۔

"مجھے اس آخری لڑکی کو ڈھونڈنا ہے۔" وہ اٹھ کے کنسول ٹیبل تک چلا آیا۔لیونڈر اور موتیے کی خوشبو سے بنی موم بتیوں کے جار کھلے رکھے تھے۔ماہر نے لائٹر نکالا۔

"میرا اندازہ ہے کہ یہ لڑکی اسی شہر میں ہے۔"

پانچویں صفحے پہ وہ ٹھہر گئے۔نگاہیں ساکت ہو گئیں۔چونک کر چہرہ اٹھا کے ماہر کو دیکھا۔

وہ اپنی رو میں کہتا، موم بتی کے دھاگے کو شعلہ دکھا رہا تھا۔

"ہلال اسی شہر میں کھوئی تھی۔اگر میں اس لڑکی کو ڈھونڈ لوں تو مجھے سرکار اس کے پاس ہی کہیں مل جائے گا۔یہ لڑکی کچھ نہ کچھ جانتی ہے۔"

مالک نے دھیرے سے البم بند کیا۔ان کا چہرہ اب سپاٹ ہو چکا تھا۔

"مجھے دو دن دو۔میں اس کو ڈھونڈ لوں گا۔"

وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔اس کے عقب میں رکھی موم بتیاں جل اٹھی تھیں۔

کمرے میں پہلے سے پھیلی ٹھنڈی موم کی مہک میں جلتی موم نے شدت پیدا کر دی تھی۔

"تم اس کو جانتے ہو۔" ماہر نے آنکھوں کی پتلیاں سکوڑ کے انہیں دیکھا۔

"دو دن۔" انہوں نے انگلیوں کی وی بنا کے دکھائی۔

"اور بدلے میں تمہیں مجھ سے کچھ چاہیے ہوگا؟" ماہر کی آواز میں طنز ابھرا۔"مالک فرید بغیر پوشیدہ ایجنڈے کے کچھ نہیں کرتا۔"

مالک نے جواب نہیں دیا۔وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔لمبے ڈگ بھرتے وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ان کے چہرے پہ اب اطمینان تھا۔

ہوٹل لابی میں وہی عینک اور اڑے اڑے بالوں والا شخص ان کا منتظر تھا۔انہیں دیکھتے ہی صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم نے ماہر کو بتا دیا؟" عینک کے پیچھے سے بغور ان کا چہرہ دیکھا۔

وہ خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھے۔قیمتی پتھر جڑی سلور انگوٹھیوں والے ہاتھ باہم پھنسا لیے۔

"کیا تم نے ماہر کو یہ پیپرز دکھانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟" اس نے اپنی بات دہرائی۔

مالک فرید نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔

"وہ مجھے معاف نہیں کرے گا۔"

"مگر..."

"وہ پہلے ہی بہت سی باتوں کے لیے مجھے معاف کرنے پہ تیار نہیں۔میں اس کی فہرست طویل نہیں کرنا چاہتا۔"

"اگر اسے کسی اور سے معلوم ہوا تو وہ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔اسے خود بتا دو۔"

مالک فرید نے پتھر جیسا چہرہ اس کی طرف موڑا اور بولے تو آواز میں اطمینان تھا۔

"اس کو سچ بتانا ضروری نہیں ہے۔مجھے اس کو واپس لانے کا ایک اور طریقہ مل گیا ہے۔"

"مگر..."

"وہ کسی کو ڈھونڈ رہا ہے۔میں اس کی تلاش میں اس کی مدد کروں گا۔اور بدلے میں اس سے اس کی واپسی مانگوں گا۔پھر اس کو چند دن یا چند ہفتے یہ کھیل کھیلنے دوں گا۔جب وہ تھک جائے گا تو خود ہی واپس آ جائے گا۔"

"سچ بولنا زیادہ آسان تھا، مالک۔" اس آدمی نے ایک افسوس بھری نظر بریف کیس پہ ڈالی جس میں چند کاغذ مقید تھے۔

"ہر شے تمہارے ہاتھ سے نکل رہی ہے۔تمہیں اس کو یہ کاغذات دکھا دینے چاہیے تھے۔"

"یہ کاغذ کوئی نہیں دیکھے گا۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مالک فرید نے انگلی اٹھا کے تنبیہ کی۔"ورنہ میں اپنے ہاتھوں سے تمہاری جان لے لوں گا۔"

عینک والے آدمی نے دھیرے سے سر

ہلا دیا۔ مالک فرید نے انگوٹھیوں والے ہاتھ سے ٹائی کی ناٹ مزید ڈھیلی کی۔ ایک دم سے ان کا دم گھٹنے لگا تھا۔

"یہ کاغذ کوئی نہیں دیکھے گا۔" انہوں نے دل ہی دل میں دہرایا۔

☆☆☆

کشمالہ مبین، جو اسلام آباد میں اپنے ماموں کے گھر بطور پے انگ گیسٹ رہتی تھی، اس وقت لونگ روم میں کھڑکی کے ساتھ رکھی ورک ٹیبل پہ براجمان تھی۔ سامنے ایک اسکیچ بک پھیلائے، وہ پنسل کاغذ پر پھیر رہی تھی۔

ایک گلابی پھولوں سے سجی بکری کا اسکیچ۔

اسی پل بکری کے وسط میں... خون کے چند دھبے آگرے۔

ایک جھٹکے سے وہ پیچھے کو ہٹی۔ بے یقینی سے چہرہ اٹھایا۔

کھڑکی کھلی تھی۔ اور باہر سے کسی نے خون اندر پھینکا تھا۔

مگر کس نے؟

وہاں کوئی بھی نہ تھا۔

وہ تیزی سے باہر کی طرف بھاگی۔ ٹیرس ویران تھا۔ دور دور تک کوئی نہ تھا۔

البتہ کھڑکی کے باہر کی طرف دیوار پر وہی چھینٹے نقش تھے۔

وہ ابھی تک گیلے تھے۔

اس نے بے اختیار تھوک نگلا۔ عجیب سا خوف دل کو جکڑنے لگا۔

(نہیں۔ یہ کوئی جادو جنات نہیں ہیں جیسے ماہی کہتی ہے۔ یہ کوئی انسان ہے جو میرا تعاقب کر رہا ہے۔)

اسے معلوم تھا اسے کیا کرنا ہے۔

"صفورا..." چند لمحوں بعد وہ کمرے میں دائیں بائیں ٹہلتی پریشانی سے فون پہ کہہ رہی تھی۔ "وہ پچھلا باڈی گارڈ میں نے نکال دیا تھا نا۔ کیونکہ وہ سگریٹ بہت پیتا تھا۔ پلیز کسی اور کو بھیج دو۔ مجھے پھر سے ایک گارڈ کی ضرورت ہے۔"

بکری کے اسکیچ پر گرا خون دھیرے دھیرے خشک ہو رہا تھا۔

☆☆☆

ایک سال بعد

موجودہ دن

وین کوور۔

کشمالہ مبین میٹرس پر بیٹھی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ ماہر سے مل کے آئی تھی۔

اس کے سامنے آج بھی آئی پیڈ پہ ایک اسکیچ کھلا دکھائی دے رہا تھا۔ البتہ اس دفعہ بکری کے پھول ہلکے گلابی سے جامنی ہو گئے تھے۔ وہ یک ٹک اس اسکیچ کو دیکھ رہی تھی۔

بالکل شل۔ خاموش۔ پلکیں جھکائے بنا۔ چہرہ ایک برس پہلے کی طرح شفاف نہ تھا بلکہ اس پر چند دانے تھے۔ آنکھیں لائنر سے خالی اور لباس سرمئی سا تھا۔ اس کی زندگی کی طرح بے رنگ۔

اس ایک برس میں بہت کچھ بدلا تھا۔ ماں بیمار ہوئیں۔ پھر ان کی موت ہوئی۔ اس کی شادی ہوئی، وہ جدہ چلی گئی، پھر وہ وہاں سے وین کوور آئی، اور اس ایک برس میں ہونے والے ہر بڑے واقعے کی کوئی نہ کوئی نشانی اس کے سامنے اس وقت میٹرس پر بکھری تھی۔

زیاد کی دی گئی انگوٹھی۔

وہ کینڈل جو ماہی نے شادی کے تحفے کے طور پہ دی تھی۔

اس بوڑھے جادوگر کا اسکیچ جسے وہ خواب میں دیکھتی تھی۔ جو اسکول کے پرانے ملازم شکور کے جیسا تھا۔

فاختہ والا نیکلیس۔

سب کچھ واضح تھا۔

سیاہ اور سفید میں جلی حروف سے لکھا ہوا۔

لیکن یہ سب کیسے ہوا؟

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔
سوال یہ تھا کہ...
یہ سب کہاں سے شروع ہوا تھا؟
اسے عمرے پہ آصف ملا تھا۔ اس روز شاید اس پہ جادو شروع ہوا تھا کیونکہ اس کو سینے میں تکلیف اٹھی تھی۔
پھر کیا ہوا؟
سحر عشق اور ایسے موذی جادو کو میچور کرنے میں ایک عرصہ لگتا ہے۔
دو برس بعد... جب جادو مکمل طور پہ میچور ہو گیا اور وہ ایک کے بعد ایک گارڈ بدلنے لگی... تب وہ براؤنیز آئیں۔
نگینہ آنٹی اسلام آباد آئی تھیں۔ زیاد سلطان کے ساتھ وہ براؤنیز لائی تھیں۔ وہ میٹھا نہیں کھاتی تھی۔ لیکن اس نے وہ کھائی تھیں۔ ان میں کچھ تھا جادو جو اس کے اندر اترتا گیا۔
پھر کیا ہوا؟
اس نے آئی پیڈ اٹھایا اور ایک نوٹ کھولا۔ پھر پنسل سے اس پر لکھتی گئی۔ ہر شے جواب تک پیش آئی تھی۔

سب سے پہلے ماں بیمار پڑیں۔ ماں نگینہ آنٹی کو پسند نہیں کرتی تھیں۔ وہ اس رشتے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھیں۔ ان ہی دنوں وہ بچہ ماہی کو خواب میں دکھائی دینے لگا۔
ظہیر نے اس کا کیریئر ختم کر دیا۔ اس کو مالی نقصان ہوا تھا۔ اس کو ریستوران بیچنا تھا۔ اس کا مالی نقصان سرکار کے جادو کی وجہ سے ہوا یا قسمت کی وجہ سے، اب یہ اہم نہیں تھا۔
پنسل تیزی سے اسکرین پر چلتی تمام واقعات تاریخوں کے ساتھ رقم کر رہی تھی۔ نمبرز جھوٹ نہیں بولتے۔
اس کی جاب چلی گئی اور وہ لاہور چلی آئی۔ وہ خاندان کی سب سے کامیاب لڑکی ناکام ہو کے گھر بیٹھ گئی۔ اس نے کئی جگہوں پہ کام کرنے کی کوشش کی

لیکن کچھ بھی زیادہ عرصہ چل نہ سکا۔ زیاد نے اسے پروپوز کیا۔ اس نے انکار کیا تو اس نے پینترا بدلا۔ اس نے کہا کہ وہ کسی اور سے شادی کر رہا ہے۔
لیکن وہ سب ایک جال تھا۔ زیاد اور اس بوڑھی عورت کا جال وہ سادہ سی بوڑھی عورت جس پہ کوئی شک نہیں کرتا تھا۔
وہ سب اس میں شامل تھے۔
بلال، اس کا نیکلیس، ہیپی برتھ ڈے، ہر شے واضح ہو گئی تھی۔
اسے معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔
اسے اپنے زمانے کی سب سے بڑی جادوگرنی سے ملنے جانا تھا۔

☆☆☆

مال میں بنی کافی شاپ اس صبح پر رونق دکھائی دے رہی تھی۔
سامنے بنی ایک دوسری شاپ کی کرسیوں پر کیف جمال اپنا لیپ ٹاپ کھولے بیٹھا تھا۔ گاہے بگاہے وہ مالا کی شاپ کو بھی دیکھ لیتا۔ وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔
دفعتاً کسی نے اس کے ساتھ والی کرسی کھینچی۔
کیف نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے چہرہ اٹھایا۔ نو وارد کو دیکھتے ہی کپ گرتے گرتے بچا۔
"ماہر بھائی۔" وہ گڑبڑا کے اٹھ کھڑا ہوا۔
"کیسے ہو، کیف جمال؟" وہ اس کو سنجیدگی سے دیکھتا سامنے بیٹھا۔ ٹانگ پر ٹانگ جمائی۔
کیف نے دائیں بائیں دیکھا۔ چہرہ سفید پڑا۔
"بے فکر رہو۔ میں نے مالا کو تمہاری فون کال کے بارے میں نہیں بتایا۔"
وہ اس کے سامنے بہت اعتماد سے بیٹھا تھا۔ جینز پہ ہوڈی پہنے، ہلکی بڑھی شیو اور سفید جوگرز۔ کیف جمال کو بہت کچھ یاد آیا۔ ہوٹل سوئیٹ اور لیونڈر اور موتیے کی مہک۔ اس نے تھوک نگلا۔
"مجھے نہیں معلوم آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ

نے مجھے کال کی تھی اور میں نے آپ کے لیے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔" وہ کھنکھار کے کہتا واپس بیٹھا۔ کیا معلوم ماہر یہ ریکارڈ کر رہا ہو۔

"کہا نا... بے فکر رہو۔ میں تمہارے راستے میں نہیں آؤں گا۔ اور تم میرے راستے میں نہیں آؤ گے۔ تمام؟" اسی بے تاثر انداز میں کہتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا رخ مالا کی شاپ کی جانب تھا۔

کیف نے فوراً سے موبائل نکالا اور انگلیاں تیزی سے ٹائپ کرنے لگیں۔

"ماہر فرید کشمالہ! کی شاپ پہ موجود ہے۔" میسج لکھ کے زیاد کو بھیجنے لگا۔ پھر رک گیا۔ اگر زیاد یہاں آگیا اور اسے معلوم ہو گیا کہ اس نے ماہر کے ساتھ بھی ڈیل کرنے کی کوشش کی ہے تو؟ لیکن اگر اس نے زیاد کو نہ بتایا اور زیاد کو کسی دوسرے طریقے سے معلوم ہو گیا تو؟

اس نے میسج مٹا دیا۔ ابھی وہ اس بارے میں سوچے گا۔ پھر لیپ ٹاپ واپس کھول لیا البتہ نگاہیں اب صرف ماہر فرید پہ جمی تھیں۔

وہ کاؤنٹر تک گیا۔ وہاں دو افراد پہلے سے کھڑے تھے۔ وہ قطار میں لگ گیا۔ سینے پر بازو لپیٹے خاموشی سے دائیں بائیں دیکھے گیا۔

دفعتاً نگاہ کونے والی میز تک اٹھی۔ اس کے پیچھے ایک شیلف بنا تھا جس میں سیل کے لیے اس کافی برانڈ کے کچھ مگ رکھے تھے۔ ان کے وسط میں ایک پودا رکھا تھا۔

سفید گملے میں سجا کیکٹس۔

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

"شیلڈن۔"

ذہن میں ایک خیال سا پنپنے لگا۔

☆☆☆

کشمالہ نے بنا دستک کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ ہسپتال کے سفید بیڈ پر لیٹی نگینہ بیگم نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔

وہ تنہا نہیں تھیں۔ اندرانی ان کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ نگینہ بیگم بھی مسکرائیں۔ ان کا آدھا چہرہ پٹیوں میں بندھا تھا۔

"آؤ بیٹے۔"

وہ کچھ دیر چوکھٹ میں کھڑی رہی۔ بال پونی میں بندھے تھے اور دھلا دھلایا چہرہ مسکراہٹ سے عاری تھا۔ لمبے کھلے فراک پر ہسپتال کا نیلا حفاظتی گاؤن اور ماسک پہنے، وہ کندھے سے پرس لٹکائے ہوئے تھی۔

"تم باہر جاؤ۔" اس نے ایک سخت نگاہ اندرانی پہ ڈالی۔ وہ اسے خاموشی سے گھورتی ہوئی باہر نکل گئی۔

مالا نے دروازہ بند کیا۔ پھر کپکپاتے ہاتھوں سے اسے لاک کیا۔

نگینہ بیگم چونکیں۔ مسکراہٹ غائب ہوئی۔ دروازہ بند کر کے... وہ پلٹی تو اس کا چہرہ... ایسا چہرہ انہوں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

"کیسی ہیں آپ... سرکار؟" وہ دروازے سے پشت لگائے گلابی پڑتی آنکھوں سے ان کو دیکھ رہی تھی۔

نگینہ سلطان ایک لمحے کے لیے سانس نہ لے سکیں۔

لیکن وہ لمحہ آیا اور گزر گیا۔

انہوں نے دھیرے سے سانس خارج کیا۔ چہرہ اسی طرح پر سکون تھا۔

"ہاں۔ میں ہوں سرکار۔"

ان کا آدھا چہرہ اور آنکھیں واضح تھیں۔ ان میں رعونت تھی فخر تھا۔

"یہ سب براؤنیز سے شروع ہوا تھا۔" وہ ماسک نیچے دھکیلتی آگے آئی۔ پھر ان کی پائنتی کے قریب ٹھہر گئی۔

"آپ نے جادو میرے اندر براؤنیز سے اتارا تھا۔"

"محبت ویسے بھی ایک جادو ہے، کشمالہ! الوژن، نظر کا دھوکہ۔" وہ مسکرا رہی تھیں۔

"اور میری ماں؟" اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ "ان پہ بھی جادو کیا تھا نا آپ نے؟"

"جادو خود سے کسی جسم میں داخل نہیں ہوتا جب تک کہ اس جسم کا مالک اس کو اجازت نہ دے، میری بیٹی۔" وہ ایسے ہی مسکرا رہی تھیں۔

"تمہاری ماں کی ایک بیمار بہن تھی جو برسوں اس کے ساتھ رہی تھی۔ اس کی خدمت نے تمہاری ماں کو حفاظتی حصار میں باندھا ہوا تھا۔ لیکن جب وہ مری... تو تمہاری ماں ڈپریشن کا شکار ہو گئی۔ اور ڈپریشن کسی بھی جادوگر کا سب سے بڑا ہتھیار ہوتا ہے۔"

وہ وقفے وقفے سے بول رہی تھیں۔ جیسے جسم میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی ہوں لیکن وہ ان کو دبا رہی ہوں۔

"ڈپریشن ایک سوراخ ہے۔ جس انسان کو لگ جائے، اس کے جسم میں دو چیزیں آسانی سے داخل ہو جاتی ہیں۔ موذی مرض اور جادو۔ تمہاری ماں کو ڈپریشن ہم نے نہیں دیا تھا۔ تم نے دیا تھا۔"

"میں نے؟" آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

"کیا تم بھول گئیں کہ تم اس کو چھوڑ کے چلی گئی تھیں؟" ان کی آنکھوں میں ملامتی سی مسکراہٹ تھی۔

"تم پانچ سال اس سے دور رہیں۔ تمہاری خالہ مر گئی اور وہ ڈپریشن میں چلی گئیں۔ تم وہاں ہوتیں تو شاید ان کی زندگی میں جینے کی امید ہوتی۔ مگر تمہیں اپنا کیریئر بنانا تھا۔"

اس نے بے اختیار ضبط سے مٹھیاں بھینچ لیں۔

"ہم نے تو تمہارے ساتھ احسان کیا تھا، کشمالہ! تمہارا کیریئر ختم کر کے تمہیں تمہاری ماں سے ملوا دیا۔ یوں اس کے آخری چند ماہ میں تم اس کے ساتھ تھیں۔"

"اپنے گناہ میرے سر مت ڈالیں۔" وہ دبا دبا سا چلائی۔

"آئینہ برا لگتا ہے ہر انسان کو، کشمالہ! لیکن کیا تم اپنی ماں کو چھوڑ کے نہیں گئی تھیں؟"

آنسو اس کے چہرے پر گرتے ٹھوڑی سے چپکے ماسک میں جذب ہو رہے تھے۔

"آپ کے جادو نے اوشن کو برباد کیا۔ میری ماں کو بیمار کیا۔"

"لیکن میرے جادو نے اسے نہیں مارا۔" وہ مسکرائیں۔ "اس کی موت اسی طرح لکھی تھی۔"

"اور میرے دل میں زیادی کی محبت؟ وہ کس نے ڈالی؟" مالا کی بھیگی آنکھوں میں سارے زمانے کی نفرت تھی۔ دکھ تھا۔ اس نے مسلسل اپنی مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں۔ وہ اس عورت کا منہ نہیں نوچ سکتی تھی جس کا چہرا پہلے سے گل سڑ چکا تھا۔

"کہا نا۔ جادو ایسے اثر نہیں کرتا جب تک اس کو کسی دل میں چور دروازہ نہ مل جائے۔ محبت تو ایک الوژن ہے اور تم خود ایک وہم پرست ہو، مالا۔ تم دیواروں پر الوژن بناتی ہو۔ ہم دلوں میں بناتے ہیں۔"

"آپ الوژن ز کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔"

لیکن وہ نہیں سن رہی تھیں۔ یہ اعتراف کا مرحلہ تھا۔ اسٹیج پر کرتب دکھاتے جادوگر اس مرحلے کا انتظار کیا کرتے تھے۔ جب پردہ گرنے سے چند لمحے پہلے، وہ حاضرین کے سامنے سر جھکا کے داد وصول کریں۔

"تمہارے دل میں یہ الوژن تمہارے خوف نے داخل کیا۔ عمر گزر جانے کا خوف۔ اپنی دوستوں کی شادیاں اور بچے دیکھنے کے بعد تنہا رہ جانے کا خوف۔ یہ خوف سحر عشق کو پختہ کرتا ہے۔"

"میں سرکار کو ڈھونڈنا چاہتی تھی۔" اس نے اپنی گردن پر ہاتھ رکھا۔ "تو آپ نے مجھے مارنے کی کوشش کی۔"

اسے نگینے کی چبھن یاد آئی۔

"وہ تو بس ایک ڈراوا تھا۔ ورنہ ہم تمہیں کیوں مارنا چاہیں گے، پیاری بیٹی؟"

"بیٹی۔ ہونہہ۔" اس نے ملامتی نظروں سے انہیں دیکھا۔ "کیسے کر لیتی ہیں آپ؟ ساری دنیا کو دھوکہ کیسے دے لیتی ہیں؟"

"تم اس دھوکے سے بچ سکتی تھیں۔ تمہارے خواب تمہیں تمام اشارے دے رہے تھے۔ تم تب بھی نہیں سمجھ سکیں۔"

مالا نے اثبات میں سر ہلایا۔

"شکور۔ میرے اسکول کا چوکیدار شکور ایک ہنٹ تھا۔ جان گئی ہوں۔" اب جب کہ سب واضح ہو گیا تھا، سو کوئی پہیلی پہیلی نہ رہی تھی۔

"وہ ایک ایسا آدمی تھا جس کی سیاہ رنگت پہ اس کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ اور وہ لوگوں کی باتوں سے تنگ آ کے دبئی چلا گیا۔ خوابوں میں اصلی جادوگروں کے چہرے نہیں دکھائے جاتے ورنہ انسانوں میں فساد ہونے لگیں۔ صرف علامتیں دکھائی دیتی ہیں۔ مجھے شکور دکھائی دیا لیکن مجھے شکور کو نہیں ڈھونڈنا تھا۔ مجھے اپنے اردگرد کسی ایسے انسان کو ڈھونڈنا تھا جس کا اس کی رنگت پہ مذاق اڑایا جاتا تھا۔ اور وہ دبئی چلا گیا تھا۔" اس نے آنکھیں بند کیں۔ گرم گرم آنسو گال پر گر رہے تھے۔ وہ کیوں نہ سمجھ سکی؟

"میں نے تمہارے ساتھ کوئی ظلم نہیں کیا۔ کسی کو تم سے نفرت نہیں کروائی۔ صرف محبت کروائی۔ تمہیں وہ دیا جو تمہارے پاس نہ تھا، میری بیٹی۔ میں نے تمہیں گھر دیا۔ شوہر دیا۔"

اس نے آنکھیں کھولیں۔ اب کے اس کی آنکھوں میں صرف نفرت نہیں تھی۔ افسوس بھی تھا۔

"تمہارا کام تھا اپنے شوہر کو خوش رکھنا۔ اپنا گھر بسانا۔ اور تم وہ نہ کر سکیں۔ قصور کس کا ہے؟"

وہ بوڑھی عورت ٹوٹے سانسوں کے درمیان اطمینان سے بتا رہی تھی۔

"مجھے ترس آ رہا ہے آپ کے اوپر۔" وہ سر نفی میں دائیں بائیں ہلا رہی تھی۔ "اتنے گناہوں کی آگ لے کر کیسے جائیں گی اللہ کے پاس؟"

"آگ تو میرے لیے اس دنیا نے بنائی تھی، کشمالہ۔" وہ زخمی سا مسکرائیں۔ "مجھے میری شکل کی وجہ سے دھتکار دیا تھا۔ سو میں نے ایک الوژن بنا لیا۔ جیسے تم بناتی ہو۔"

"مجھے خود سے مت ملائیں۔" اس کی آواز بلند ہوئی۔

البتہ وہ ویسے ہی لیٹی رہیں۔ ان کے جسم سے لگی نالیاں اور تاریں مختلف مانیٹرز میں پیوست تھیں۔ جو ان کے وائٹلز بتا رہے تھے۔ ان کے دل کی رفتار، بی پی، سب نارمل تھا۔

"مجھے کس آگ سے ڈرا رہی ہو؟ آگ تو یہ دنیا تھی میرے لیے۔ آگے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ جنت نہ جہنم۔ سب ایک الوژن ہے۔ میں نے اس دنیا سے اپنا حق کشید کیا ہے۔ جیسے سب کرتے ہیں۔"

وہ چند قدم مزید آگے آئی۔ سر جھکا کے ترحم سے انہیں دیکھا۔

"اور ہلال؟ وہ کہاں ہے؟"

تمکینہ کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"ہلال کو نہ تم ڈھونڈ سکو گی، اور نہ تمہارا ماہر فرید۔" ان کی آنکھوں میں کچھ ابھرا جسے وہ پڑھ سکتی تھی۔

"اتنی نفرت ہے اس سے، سرکار؟" وہ بھیگی آنکھوں سے پہلی دفعہ مسکرائی۔ "اس پہ جادو نہیں چلتا آپ کا؟"

تمکینہ بیگم مسکراتی رہیں۔ ان کے اطمینان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"آپ نے زیاد اور میری شادی صرف زیاد کے لیے نہیں کروائی۔ آپ کو کچھ اور بھی چاہیے تھا۔"

وہ آنکھوں میں بہت سی نفرت اور افسوس لیے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"میری بیٹی.... ہے نا؟"

اس لفظ میں کچھ تھا جو ان کی آنکھوں میں چمکنے لگا۔

"میں زندہ رہوں یا نہ رہوں، تم میری پوتی کو مجھ سے چھین نہیں سکتیں، کشمالہ۔"

وہ ایسی شیطانی چمک تھی کہ کشمالہ مبین کو لگا کوئی اس کی گردن کے گرد آگ کا طوق پہنا رہا ہے۔

"ہاں... میں نے یہ سب اس بچی کے لیے کیا ہے۔" وہ چمکتی آنکھوں سے چبا چبا کے کہہ رہی تھیں۔

"وہ جب اس دنیا میں آئے گی تو وہ میری سب سے بڑی طاقت بنے گی۔ اور تم..." انہوں نے تحقیر سے اسے دیکھا۔ پہلی دفعہ کشمالہ کو ان کی نظروں میں اپنے لیے حقارت دکھائی دی۔

"اور تم ساری عمر زیاد سے بندھی رہوگی۔ تمہارے پاس اب کوئی جائے فرار نہیں ہے۔"

وہ چند لمحے لب بھینچے ان کو دیکھتی رہی۔ پھر ان کے کان کے قریب جھکتی گئی یہاں تک کہ اس کے ہونٹ ان کے بالوں کے قریب آٹھہرے۔

"کس نے کہا کہ وہ دنیا میں آئے گی؟"

نگینہ بیگم ایک دم جہاں تھیں، وہیں ساکت رہ گئیں۔

"وہ میرے سویر کی زنجیر نہیں بنے گی۔"

وہ سرگوشی میں کہہ رہی تھی۔

"میں آج اس کو ختم کرنے جارہی ہوں۔ کوئی بھی چیز مجھے آپ سے اور آپ کے بیٹے سے نہیں جوڑے رکھے گی۔ میں اس بچے کو قتل کرنے جارہی ہوں۔" وہ سیدھی ہوئی اور فاتحانہ مسکراہٹ اور بھیگی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

"نن نہیں... مالا نہیں۔"

ٹوں ٹوں... ان کے مانیٹر پر ایک دم نمبرز بڑھنے لگے۔ دل کی دھڑکن۔ بی پی۔ انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن نہیں اٹھ سکیں۔

"مالا پلیز مت کرو۔ اس کو مت مارنا۔" آنسو آنکھوں سے ٹپکتے چہرے کی پٹیوں میں جذب ہونے لگے۔

"مجھے معلوم ہے یہ گناہ ہے، لیکن میں ایک بڑے گناہ کا راستہ روک رہی ہوں۔ میں سحرِ عشق سے جنم لینے والی بچی کو اس دنیا میں نہیں لاؤں گی۔ کیونکہ میں دنیا کے جس کونے میں بھی چلی جاؤں، زیاد اس بچی کی تلاش میں آجائے گا۔ سو میں آج اس وجہ کو ہی ختم کررہی ہوں۔"

"نہیں پلیز... خدا کا واسطہ..." انہوں نے کپکپاتے، نحیف ہاتھ جوڑے جن سے بہت سی تاریں پیوستہ تھیں۔

"خدا کہاں سے آگیا؟ جنات کو بلایئے، سرکار۔ اپنے جنات کو۔" وہ دبا دبا سا غرائی۔ "اور اپنے قاتل بیٹے کو بھی بلایئے۔ آج کوئی انسان یا جن مجھے یہ کرنے سے نہیں روک سکے گا۔ اب یہ فیصلہ میں کروں گی۔ میں۔"

سینے پر انگلی سے دستک دی۔ آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔

"نہیں پلیز نہیں۔" وہ چلانے لگیں۔ مالا نے بیل پر انگلی رکھ دی۔

دروازہ دھاڑ سے کھلا اور اسکربز میں موجود اسٹاف بھاگتا ہوا اندر آیا۔

"میں ان کی بہو ہوں۔ یہ بہت تکلیف میں ہیں۔" وہ آنکھیں صاف کرتے ہوئے سنجیدگی سے انگریزی میں کہنے لگی۔

"کیا ان کو مزید پین کلر دیے جاسکتے ہیں؟ میں چاہتی ہوں کہ یہ چند گھنٹے تک سوتی رہیں۔"

نگینہ بیگم چلاتے ہوئے سر تکیے پر مار رہی تھیں۔ ان کا جسم بھی جھٹکے کھا رہا تھا۔ دونوں اسٹاف ممبرز میڈکو لینگویج میں چلاتے ہوئے کچھ کہہ رہے تھے۔ غالباً ان کو کوئی انجیکشن دیا جانے لگا تھا۔

"نہیں پلیز۔ مالا یہ مت کرو۔"

وہ آنسو رگڑ کے صاف کرچکی تھی۔ اب جذبات سے عاری چہرے کے ساتھ ان کے بیڈ کی پائنتی کے ساتھ کھڑی رہی۔ بنا پلکیں جھپکائیں وہ انہیں دیکھ رہی تھی۔

"بلائیں ان کو۔ اپنے موکلوں کو۔ بلائیں نا۔"

وہ دبا دبا سا اردو میں بولی۔ ایک نرس اب ان کی آئی

وی میں کوئی انجیکشن لگا رہی تھی۔

نگینہ بیگم نے آنکھیں بند کیں۔ ہونٹ ہلانے کی کوشش کی۔ کچھ پڑھنا چاہا۔ لیکن جسم کی طاقت اب ختم ہو چکی تھی۔ اوپر سے دوا کا اثر بھی شدید تھا۔ ان کا ذہن اندھیروں میں ڈوبنے لگا۔

"نہیں۔ پلیز نہیں۔ وہ بچی بہت قیمتی ہے۔"

وہ بند آنکھوں سے غنودگی میں جاتی بڑبڑا رہی تھیں۔ جسم اب ڈھیلا پڑتا جا رہا تھا۔

کشمالہ مبین نے افسوس سے سر جھٹکا اور باہر کی طرف بڑھ گئی۔ اس کو اب کسی انسان یا جن کا خوف نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

ہسپتال کے اس کمرے کا منظر اب قدرے بدلا ہوا تھا۔ نیم تاریک خاموشی، فضا کا بوجھل پن، اور نگینہ سلطان کا پر سکون جسم جو دواؤں کے زیرِ اثر غنودہ تھا۔

زیاد سلطان کاؤچ پر بیٹھا تھا۔ ٹانگ پر ٹانگ جمائے۔ دونوں ہاتھوں میں موبائل پکڑے اس پر انگلیاں چلاتا ہوا۔ دفعتاً اسکرین پہ میسج ابھرا۔

"کچھ عجیب سا ہے، زیاد بھائی۔ صبح کشمالہ کام پہ نہیں آئی۔ پھر اس نے مجھے کال کر کے کہا کہ آج میں آف کرلوں۔ وہ آپ کی والدہ سے ملنے ہسپتال جا رہی ہے۔ وہاں سے وہ گھر جائے گی۔ جب تک میں یہاں پہنچا وہ ہسپتال سے نکل رہی تھی۔ میں کافی فاصلے سے اس کا تعاقب کرتا رہا۔ وہ گھر نہیں گئی۔ وہ کیب لے کر ایک کلینک آئی ہے۔ کافی دیر سے اندر ہے۔ میں معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ وہ یہاں کیوں آئی ہے۔"

زیاد ایک دم سیدھا ہو کے بیٹھا۔ کانوں میں ایک گھنٹی سی بجنے لگی۔ جیسے قدیم زمانوں میں جنگ سے پہلے شہر والوں کے لیے بجتی تھی۔ اس کا رواں رواں کھڑا ہونے لگا۔

"وہ صبح ہسپتال آئی تھی؟"

"جی۔ میں نے خود اسے یہاں سے نکلتے دیکھا تھا۔"

زیاد نے چونک کر چہرہ اٹھایا۔ نگینہ بیگم کے غنودہ جسم میں حرکت ہوئی تھی۔

"زیاد؟" وہ بدقت پلکیں جھپکا کے اسے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"کشمالہ یہاں آئی تھی؟"

وہ اٹھ کے ان کے سرہانے تک آیا۔ چہرہ سپاٹ تھا۔ اور آواز میں تفتیش۔

"کون؟" ان کے آدھے چہرے سے پٹی جیسے کھلتی گئی تھی۔ کسی کوڑھ کے مریض کی مانند چہرے کا جلا ہوا حصہ بڑھ کے گردن تک پہنچ چکا تھا۔

"وہ کیوں آئی تھی؟ اور آپ کی طبیعت کیوں خراب ہوئی تھی؟"

"زیاد..." نگینہ بیگم نے ایک دم چونک کر گھڑی کو دیکھا۔ جیسے دماغ جاگ گیا ہو۔ بے اختیار زیاد کا ہاتھ تھاما۔

"اس کو روکو..."

"کس چیز سے؟" اس کا سانس تھم گیا۔ سارے جواب واضح تھے۔

"وہ آپ کی نفرت میں اس کو مار دے گی۔"

زیاد سلطان ہل نہ سکا۔ ایسے جیسے نمک کا مجسمہ ہو۔

"کس کو؟"

"آپ کی بیٹی..." ان کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"اس کو بچا لو۔ وہ اس کو ختم کر دے گی۔"

"بیٹی؟" اسے اپنی آواز کنویں سے آتی سنائی دی۔

"وہ بہت قیمتی ہے۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔" انہوں نے اس کا ہاتھ بدقت دونوں ہاتھوں میں پکڑا۔

"آپ کب سے یہ بات جانتی تھیں؟" وہ زخمی نظروں سے ان کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ اس بچی کو مار دے گی۔"

"میری کوئی بیٹی نہیں ہے۔" ایک دم اس نے

زور سے ہاتھ چھڑایا۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"آپ نے ہمیشہ کی طرح اپنا کھیل کھیلا۔ اور مجھے اندھیرے میں رکھا۔" وہ ان پہ جھک کے دبادبا سا غرایا۔

"آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اپنا بچہ مجھے دو گے۔"

"آپ جانتی تھیں اور مجھے نہیں بتایا۔" وہ ان کی بات نہیں سن رہا تھا۔

"زیاد..." انہوں نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ لیکن وہ نفی میں سر ہلاتا پیچھے ہٹ رہا تھا۔

"اس بچے کو مت ختم ہونے دینا۔"

وہ رک کے انہی نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

"وہ بچہ۔ آپ کی بیٹی۔ وہ کشمالہ کو کبھی آپ سے آزادی نہیں لینے دے گی۔ وہ اس کو زنجیر کی طرح آپ سے باندھے رکھے گی۔ کوئی دوسرا مرد اس سے شادی نہیں کرے گا۔" وہ رک رک کے بول رہی تھیں۔ آنسو پھسل پھسل کے مسخ شدہ چہرے میں جذب ہو رہے تھے۔

"اس کو روکو ورنہ وہ اس کو مار دے گی۔"

"مارنے دو۔" اس کا لہجہ برف تھا۔ سپاٹ، سرد، نگینہ بیگم کچھ بول نہ سکیں۔ وہ ان کو اسی حالت میں چھوڑ کے باہر نکل گیا۔

کیف جمال کی کال آرہی تھی۔ چند لمحے وہ گہرے سانس لیتے ہوئے خود کو نارمل کرنے لگا۔ پھر فون کان سے لگایا۔

"سنو کیف..."

"ابارشن۔ یہ ابارشن کلینک ہے۔" اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ پارکنگ میں کار کے ساتھ کھڑا تھا اور ساتھ ایک اسکرب والی لڑکی تھی۔ وہ جیب میں چند رول کیے نوٹ ڈالتے ہوئے دائیں بائیں احتیاط سے دیکھ رہی تھی۔

"آپ کی بیوی یہاں ابارشن کے لیے آئی ہے۔ اور وہ پروسیجر روم میں ہے۔" کیف نے اسے اشارہ کیا۔ وہ سر کو خم دے کر آگے بڑھ گئی۔ "میں نے ایک اسٹاف کو پیسے دیے ہیں۔ اسی نے بتایا ہے کہ..."

"کیف... مزید مداخلت مت کرو۔"

کیف جمال رک گیا۔ بے یقینی سے فون کان سے ہٹا کے دیکھا۔

"کیا آپ..."

"کہا نا۔ تم کوئی مداخلت نہیں کرو گے۔ اس کے باہر آتے ہی تم مجھے کلینک سے کنفرم کر کے دو گے کہ اس نے پروسیجر کروایا ہے یا نہیں۔ وہ جو کرنے آئی ہے، اسے کرنے دو گے۔"

کیف جمال نے ناسمجھی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ان کا تو طلاق کا کیس چل رہا تھا۔ اس کی صورت میں تو طلاق رک جاتی۔ پھر زیاد سلطان کیوں ایسے کہہ رہا تھا؟ خیر۔ اسے کیا۔

وہ کافی دیر پارکنگ میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا، اس کلینک کی عمارت کو دیکھے گیا۔ دفعتاً فون پہ میسج ریسیو ہوا۔ یہ اسی اسٹاف کا تھا جس کو اس نے پیسے دیے تھے۔

"اس کا پروسیجر مکمل ہو گیا ہے۔ وہ اس کو کچھ دیر میں ڈسچارج کر دیں گے۔"

اس نے وہ میسج زیاد کو بھیج دیا۔ خود کلینک کی لابی کو دیکھنے لگا جو شیشے کی دیواروں کے باعث اندر دکھائی دے رہی تھی۔

بہت انتظار کے بعد وہ اس کو راہ داری میں چلتی دکھائی دی۔ وہ یہاں سے بھی دیکھ سکتا تھا کہ اس کا چہرہ زرد تھا۔ آنکھوں تلے حلقے واضح تھے۔ اور وہ گم صم سی قدم اٹھا رہی تھی۔ ساتھ ایک لڑکی تھی جو اسکربز پہنے ہوئے تھی اور ایک نسخہ ہاتھ میں لیے اسے کچھ سمجھا رہی تھی۔ دوائیں۔ پوسٹ ابارشن کیئر۔ وہ اسی بے خیالی میں سر ہلا رہی تھی۔

وہ کار وہاں سے دور لے گیا۔ وہ اس کو نہیں دیکھ سکتی تھی نہ وہ اس ذہنی حالت میں تھی کہ اس کی توجہ اس طرف جاتی۔

وہ کافی دیر کلینک کے باہر ایک بنچ پر بیٹھی رہی۔ نسخہ ہاتھ میں پکڑے۔ چپ چاپ۔ سر نیچے گرائے۔ شاید وہ رو رہی تھی۔ پھر یک دم وہ اٹھی۔ موبائل کے بٹن دبائے۔ اب وہ کیب بلا رہی تھی۔

کیف جمال نے زیاد کی ہدایت کے برعکس اس کا تعاقب نہیں چھوڑا۔ وہ یہاں سے فارمیسی گئی۔ اپنی دوائیں خریدیں اور پھر وہاں سے گھر چلی گئی۔ جس لمحے وہ اپارٹمنٹ بلڈنگ کے اندر داخل ہوئی، وہ دور سے دیکھ سکتا تھا کہ اس کو شاید چکر آ رہے تھے اور وہ دیوار پکڑ پکڑ کے چل رہی تھی۔

کام مکمل ہو چکا تھا۔ اس نے زیاد کو میسج پہ اطلاع دے دی۔

''گڈ۔'' جوابی میسج فوری موصول ہو گیا۔

کیف جمال کافی دیر اس میسج کو تکتا رہا۔

پھر اس نے فون گیلری کھولی۔ وہاں موجود ماہر کی تصویر نکالی جو اس نے صبح کھینچی تھی جب وہ مالا کی کافی شاپ کی قطار میں کھڑا تھا۔ یہ تصویر اسے زیاد کو بھیجنی تھی۔ وہ زیاد کی آنکھیں تھا۔ اسے ماہر فرید کی آمد کے بارے میں بتانا چاہیے تھا۔

''گڈ۔'' اس نے پھر سے زیاد کا میسج پڑھا۔

انگلیوں نے حرکت کی۔ انگوٹھے نے ڈیلیٹ کا بٹن دبایا۔ تصویر مٹ گئی۔

''گڈ۔'' وہ تلخی سے بڑبڑاتے ہوئے کار اسٹارٹ کرنے لگا۔ اپنے بچے کے مر جانے پہ گڈ کون کہتا ہے؟

وہ زیاد سلطان کو ماہر فرید کی آمد کے بارے میں نہیں بتائے گا۔ اس دنیا میں سب سے قیمتی شے انفارمیشن ہوتی ہے اور ہر انفارمیشن ایسی نہیں ہوتی کہ وہ اپنے باس کو فراہم کی جائے۔

کیف جمال نے کار سڑک پر ڈال دی۔

ہسپتال کے کاریڈور میں ٹہلتے ہوئے زیاد سلطان نے رک کے کیف کا میسج پڑھا۔ گڈ لکھ کے بھیجا۔ اور تیزی سے کمرے کی طرف آیا۔

نگینہ بیگم اسی طرح بے چین سی لیٹی تھیں۔ وہ جیسے بہت تکلیف میں تھیں۔ اسے دیکھ کے چونکیں۔

''تم نے اسے روکا؟'' بھیگی آنکھوں میں امید بھرے پوچھا۔

''وہ بچہ ختم ہو گیا ہے، سرکار! اور آپ کا کھیل بھی۔''

اس کے چہرے پر بہت کچھ تھا۔ زخمی پن۔ نفرت۔ طیش۔ اور ڈھیروں ملال۔

''اب میں بھی اس تکلیف سے نہیں گزروں گا جس سے آپ نے ہلال کے بھائیوں کو گزارا ہے۔''

وہ چبا چبا کے کہتا گیا۔ پھر وہ وہاں رکا نہیں۔ اگلے ہی لمحے دھاڑ سے دروازہ بند کر کے وہاں سے چلا گیا۔

نگینہ سلطان نے شکستگی سے سر تکیے پر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

ان کی ساری دنیا جل کے راکھ ہو گئی تھی۔

☆☆☆

اپنے تہنا ٹاور سے ریپنزل باہر دیکھتی تھی
اپنی سچی محبت کی منتظر
اس جرم کی سزا کاٹتے ہوئے
جو اس نے کیا ہی نہیں تھا۔
وہ نغمے گنگناتے ہوئے
جو کوئی سن نہیں پائے گا۔
بھولے ہوئے پھولوں کی طرح
وہ مرجھا رہی تھی۔
جیسے جیسے سرما اس کے دل میں داخل ہو رہا تھا۔
اور جو دیواریں اس نے خوف سے کھڑی کی تھیں،
وہ گرنے کو تھیں۔
بس کاش کہ وہ تیار ہو ایک نئے آغاز کے لیے۔
صحرا کی ہوا جیسے جیسے
اس کے دروازے کے باہر پھیلی ریت پہ
تصویریں بنا رہی تھی،
وہ قدرت کو اپنا کھیل کھیلتے دیکھ رہی تھی۔
اور جان گئی تھی کہ

اس کی دیواریں کچھ بھی نہیں ہیں
سوائے دیواروں کے۔
اسے امید تھی کہ ایک دن
کوئی آئے گا اس کی طرف
اس کے تکلیف میں گھرے اکیلے ذہن کو نجات
دلانے
اسے امید ہے کہ
کبھی کہیں کوئی آئے گا
اس کو یہ بتانے کہ
محبت نہیں ہے صرف
اندھوں کے لیے۔
(ڈینی ایرو)

☆☆☆

کئی برس پہلے
ایک دفعہ کا ذکر ہے...

وہ لکڑی کا کاٹیج جنگل کے درمیان میں خاموشی سے کھڑا تھا۔ اطراف میں روئی کے گالوں جیسی برف گر رہی تھی۔ چمنی سے دھواں اوپر اٹھ رہا تھا اور کاٹیج کی کھڑکیوں سے سنہری روشنی دکھائی دیتی تھی۔

اندر جھانکو تو اس روشنی کا منبع آتش دان میں سلگتی لکڑیاں تھیں۔ وقفے وقفے سے ان کے چٹخنے کی آواز بھی سنائی دیتی۔ وہاں کچھ اور بھی سلگ رہا تھا۔ کچن کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے بیریل فرید کی آنکھیں۔

پیالے میں کچھ پھینٹتے ہوئے اس نے سلگتی نگاہیں اٹھا کے اپنے بھائی کو دیکھا۔ پھر ہاتھ کی پشت سے پیشانی پر آئی گھنگریالی لٹ پیچھے کی۔ ذرا سی چاکلیٹ کنپٹی پر اپنا داغ چھوڑ گئی۔ بیریل کو معلوم نہیں ہو سکا۔ بس افسوس سے پونی والا سر ہلایا اور پیالے پہ جھک گیا۔

"ایک بچے کو گرم برادرز کا ورژن کون سناتا ہے؟" وہ خفگی سے گویا ہوا۔ رلپنزل کی کہانی کا اتنا تلخ رخ وہ مزید نہیں سن سکتا تھا۔

وہ آتش دان کے سامنے ونگ چیئر پر نیم دراز تھا۔ ایسے کہ پیر اوٹومن پر رکھے تھے اور ایک بازو پر ہلال سر رکھے لیٹی تھی۔ دونوں کے اوپر کمبل تھا۔ وہ ایک گھنگریالی لٹ کو انگلی پر لپیٹتی چھت کو دیکھ رہی تھی اور ماہر کتاب کو۔

"ماہر؟" بیریل نے ناپسندیدگی سے ٹوکنا چاہا لیکن وہ اسے سنے بغیر کتاب سے پڑھتا جا رہا تھا۔ کہانی میں موجود رلپنزل اب بڑی ہو چکی تھی اور اس کے بال اس ٹاور سے بھی لمبے ہو چکے تھے جس میں وہ قید تھی۔

"جب جادوگرنی کو ٹاور میں داخل ہونا ہوتا، تو وہ پکارتی۔ رلپنزل رلپنزل۔ اپنے بال نیچے گراؤ۔" وہ کتاب سے حرف بہ حرف پڑھ رہا تھا۔

"رلپنزل کے بال لمبے اور خوبصورت تھے۔ سنہرے ریشمی دھاگوں جیسے۔ جب وہ جادوگرنی کی آواز سنتی تو اپنی چوٹی کھول دیتی۔ پھر بالوں کو کھڑکی کے ہک کے ساتھ ایک گرہ دے کر نیچے گرا دیتی۔ یوں جادوگرنی اوپر چڑھ آتی۔ پھر کچھ سال یونہی گزر گئے۔"

کھڑکی کے باہر برف کے ننھے ننھے گالے گر رہے تھے۔ چند ٹکڑے شیشوں سے چپک جاتے۔ پھر پگھل کے ____ نیچے جا گرتے۔

"ایک دن ایک شہزادہ گھوڑے پر سوار اس جنگل میں سفر کرتا ہوا اس طرف آن نکلا۔"

ہلال نے ایک دم چہرہ اونچا کر کے اسے دیکھا۔

"شہزادہ اس کو بچانے آیا تھا؟" اس کی آنکھوں میں چمک اتری۔

ماہر نے کہانی روکی اور گہری سانس لی۔

"ہاں۔ کہانیوں میں شہزادے بچانے آ جاتے ہیں۔"

"اور اصل میں؟"

"اصل میں؟" اس نے رک کے سوچا۔ "ہر ایک کے لیے نہیں آتے۔"

"مگر میرے لیے آئے گا۔" ہلال نے مسکرا کے پلکیں جھپکائیں۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ اور واپس

پڑھنے لگا۔

"شہزادے نے وہ نغمہ سنا جو وہ گنگنا رہی تھی۔ وہ بہت خوبصورت تھا۔ وہ ٹاور کے نیچے کھڑا اسے سنے گیا۔ وہ اس ٹاور پہ اوپر چڑھنا چاہتا تھا لیکن کوئی دروازہ نہیں تھا۔"

"اسے دروازہ مل جائے گا۔" وہ بڑبڑائی۔ کچھ تھا عجیب سا جو ماہر نے پہلو بدلا۔ توجہ کہانی پہ مبذول رکھنا چاہی۔

"شہزادہ اس وقت واپس چلا گیا لیکن وہ نغمہ اس کو اتنا پسند آیا کہ وہ ہر روز جنگل میں جا کے اس کو سنتا۔ ایک دفعہ وہ جنگل میں ایک درخت کے پیچھے کھڑا نغمہ سن رہا تھا جب اس نے جادوگرنی کو دیکھا۔ وہ راپنزل کو بال نیچے گرانے کا کہہ رہی تھی۔ اور پھر شہزادے کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اوپر چڑھتی گئی۔ شہزادے نے سوچا کہ اگر ٹاور میں جانے کی یہ سیڑھی ہے تو کسی دن وہ بھی اپنی قسمت آزمائے گا۔"

وہ جواباً کچھ بڑبڑائی۔ وہ سن نہیں پایا۔ کتاب سے پڑھتا گیا۔

بیریل کی بڑبڑاہٹ ہنوز جاری تھی۔ وہ گرم برادرز کے آباؤ اجداد تک پہنچ چکا تھا۔

"اگلے روز اندھیرا ہونے سے پہلے شہزادہ ٹاور تک گیا اور پکارا۔ راپنزل راپنزل اپنے بال نیچے گراؤ۔ بال نیچے آئے اور وہ اوپر چڑھ گیا۔ راپنزل پہلے تو اس کو دیکھ کے ڈری لیکن وہ اتنا مہربان تھا کہ اس کا ڈر جاتا رہا۔ اس نے طے کیا کہ وہ اس کے ساتھ اس کے ملک چلی جائے گی لیکن اسے ٹاور سے جانے کا راستہ معلوم نہ تھا۔ سو اس نے شہزادے سے کہا کہ وہ اس کو ہر روز ذرا سی ریشم لا دیا کرے تاکہ وہ اس سے ایک سیڑھی گوندھ سکے۔"

آتش دان سے سلگتی لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز ہنوز سنائی دے رہی تھی۔ ہلال گھنگریالی لٹ کے ساتھ کھیلتی دور خلا میں کسی غیر مرئی نقطے کو دیکھ رہی تھی۔

"جادوگرنی کو کئی روز تک معلوم نہ ہو سکا کہ کیا چل رہا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن جب وہ راپنزل کے بالوں پہ چڑھ کے اوپر آئی تو غصے میں راپنزل نے اسے کہہ دیا کہ تم اتنی بھاری کیوں ہو؟ شہزادہ تو میرے بالوں سے اوپر چڑھنے میں اتنا وقت نہیں لیتا۔"

بیریل فرید نے بے اختیار ماتھے کو چھوا۔

"وہ اتنی اسٹوپڈ کیوں تھی کہ اپنا راز خود ہی بتا دیا؟"

ماہر نے ملکے سے شانے اچکائے۔

"کیونکہ جس دور میں یہ لکھی گئی تھی، کہانیوں میں عورتیں سادہ ہوا کرتی تھیں۔ یا شاید..."

"شاید وہ اب ڈرتی نہیں تھی۔"

ہلال کی آواز بہت ہلکی تھی۔ دونوں نے بے اختیار اسے دیکھا۔ وہ ابھی تک چھت کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ تھا اس کے انداز میں کہ ماہر نے پہلو بدلا۔

"یہ بس ایک کہانی ہے، ہلال۔" اس نے کتاب بند کی۔ بیریل پینٹری سے کچھ اٹھانے گیا تھا۔

"صرف ایک کہانی۔" اس نے ہلال کو دیکھتے ہوئے زور دیا۔ ہلال نے دھیرے سے دو تین دفعہ پلکیں جھپکائیں۔

"وہ مجھے بچانے آئے گا۔ لیکن پھر میرے ساتھ قید ہو جائے گا۔ ہم دونوں ایک ساتھ بڑے ہوں گے۔"

"کیا؟" اس کی آنکھیں اچنبھے سے چھوٹی ہوئیں۔ ہلال نے اپنا چہرہ اس کے کان کے قریب کیا۔

"وہ مجھے بچانے آئے گا۔" آواز سرگوشی میں بدل گئی۔

"کون؟"

"اس کا نام بدر ہے۔"

"کون بدر؟" ماہر نے چونک کر اسے دیکھا۔

"دی ول گرو اپ ٹوگیدر۔" وہ ہلکا سا مسکرائی۔ ماہر مسکرا نہیں سکا۔

شاید وہ ہر دوسرے انسان کی طرح خود کو کہانی کا مرکزی کردار تصور کرنے لگی تھی۔ یہ انسانی رویہ ہے۔ اس کو جو کہانی اچھی لگتی ہے وہ خود کو اس میں لے جاتا ہے۔ خیالی دنیا۔ اس نے سر جھکا اور کتاب واپس کھولی۔

"جادوگرنی نے غصے میں ریپنزل کے بال کاٹ دیے اور اسے کسی جنگل میں چھوڑ آئی۔ پھر..."
وہ اب کے قدرے غیر آرام دہ سا کہانی سنا رہا تھا۔ باہر برف بنا چاپ کے گر رہی تھی۔ ساری دنیا سفید ہو چکی تھی مگر لکڑی کے کاٹیج کی کھڑکیاں ہنوز سنہری تھیں۔

"ماہر بھائی..." اس کی سرگوشی پھر سے بلند ہوئی۔ وہ صفحہ پلٹتے ہوئے رکا۔

"کیا میں آپ سے ایک سوال پوچھ سکتی ہوں؟"

ہم اس برسوں پرانے قصے کو یہیں روک کے واپس اپنی کہانی کی طرف جاتے ہیں۔

☆☆☆

موجودہ دن

تمینہ اور زیاد سلطان کے وین کوور والے گھر کی بیسمنٹ اتنی ہی طویل تھی جتنا کہ سارا گھر۔

بیسمنٹ خالی نہیں تھی۔ کاٹھ کباڑ سے بھری تھی۔ ایک طرف کچھ حصہ صاف کیا گیا تھا۔ وہیں ایک لکڑی کے ستون سے زنجیر بندھی تھی جس کا دوسرا سرا ہلال کے پیر میں تھا۔

وہ اسی ستون کے ساتھ کھڑی تھی۔ ہاتھ میں ایک نوکیلا سا لکڑی کا ٹکڑا تھا جس سے وہ ستون پر لکیریں کھینچ رہی تھی۔ نیم اندھیرے کمرے میں اس کی لکیروں کی بدصورت آواز گونجتی تھی۔

زیاد سلطان زینے اترتا نیچے آیا تو اسے ستون کے ساتھ کھڑے دیکھا۔ اس کی زیاد کی طرف پشت تھی اور وہ یہاں سے اس کے گھنگریالے بال کمر پر بکھرے دیکھ سکتا تھا۔ وہ کافی الجھے الجھے سے تھے لیکن اس وقت اس کی زندگی میں ہلال سے بڑے مسائل تھے۔ اس کا لباس گزشتہ روز والا اور ملگجا سا تھا۔ اور چہرہ ویران۔

اس نے ہلال کے قدموں کے قریب ایک کھانے کی ٹرے رکھی۔ پھر ناپسندیدگی سے اسے دیکھا۔ اس کی ماں کا پیدا کیا مسئلہ جس کو وہ نہ اگل سکتا تھا نہ نگل سکتا تھا۔

"کھانا کھالو، ہلال۔"

وہ اس کی طرف نہیں مڑی۔ وہیں کھڑی ستون پر لکیریں کھینچتی رہی جیسے اس کے سامنے اسٹینڈ پر رکھا کینوس ہو جس کے آگے کھڑی وہ کوئی پورٹریٹ بنا رہی ہو۔

وہ دھیرے سے پنجوں کے بل زمین پر بیٹھا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ صرف نوکیلی چیز کے رگڑنے کی ناگوار آواز سنائی دیتی رہی۔

"تمہیں اسی دن مر جانا چاہیے تھا ہلال۔ جب میں نے تمہیں چھت سے نیچے پھینکا تھا۔ تم میرے لیے ایک بہت بڑا بوجھ ہو۔"

"وہ اسی شہر میں ہے۔" وہ ہلکا سا بولی۔ اس کے جھکے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ شاید وہ مسکرا رہی تھی۔ زیاد دیکھ نہیں سکا۔

"کون؟"

"بدر۔" وہ بڑبڑائی۔ وہ چونکا۔ ابرو مشکوک انداز میں اکٹھے کیے۔ وہ اس کی جانب پشت کیے کھڑی ستون پر کچھ بنا رہی تھی۔

زیاد نے غور سے اس کی پشت کو دیکھا۔ وہ عجیب سی تھی لیکن اس کی باتیں بے معنی نہیں ہوتی تھیں۔ یہ وہ جانتا تھا۔

"بدر کون ہے؟"

"میری ریشم کی سیڑھی۔"

وہ ستون پر ابھرتی لکیریں دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک ٹاور بنا رہی تھی جس سے کچھ لٹک رہا تھا۔

"کیا کہنا چاہ رہی ہو، ہلال؟"

"وہ مجھے بچانے آئے گا۔"

زیاد سلطان کے چہرے پہ ناگواری اور بے

زاری ایک ساتھ اُتری۔

"کوئی تمہیں بچانے نہیں آئے گا۔ اگر تم اس بیسمنٹ میں مر جاؤ، تب بھی کسی کو اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکے گا جب تک ہماری چھ ماہ کی لیز ختم نہ ہو جائے۔"

"وہ مجھے بچانے آئے گا۔" وہ بڑبڑا رہی تھی۔

"اپنے بھاگنے کا پلان مجھے کیوں بتا رہی ہو؟" وہ اکتا کے کھڑا ہوا۔ یہ اچھی مصیبت تھی۔

"کیونکہ ہلال ڈرتی نہیں ہے۔"

زیاد نے سر جھٹکا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

"وہ تمہیں سب نہیں بتاتی۔" وہ بڑبڑائی۔

زیاد پہلے زینے پر ٹھہرا۔ پلٹ کے اسے دیکھا۔ وہ گردن ترچھی کیے نوکیلے ٹکڑے کو ستون سے رگڑ رہی تھی۔

"کون؟"

"سرکار، کچھ ہے جو وہ تمہیں نہیں بتا رہی۔"

زیاد سلطان کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اس کا سانس ایک دم اس نیم تاریک بیسمنٹ میں تنگ ہونے لگا۔

"اپنی فکر کرو۔ میری نہیں۔" اکھڑے انداز میں کہتا وہ اوپر چڑھتا گیا۔ اسے اس بلا سے دور جانا تھا۔

☆☆☆

اس صبح جب وہ اپنی شفٹ پہ مال میں داخل ہوئی تو اینٹرنس پہ بہت سی خوشبوؤں نے اس کا استقبال کیا۔ مال کا سگنیچر ایئر فریشنر۔ پرفیومز۔ کافی بینز کے روسٹ ہونے کی مہک۔ لیکن اسے آج کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ دل بھاری تھا۔ چہرہ بھی دل کا آئینہ بنا ہوا تھا۔ وہ اپنے کافی بار تک آئی تو سنک پہ ایک اسپرے بوتل دھوتی پیٹریشیا نے غور سے اسے دیکھا۔ مالا سر جھکائے سیاہ ایپرن باندھ رہی تھی۔ الجھے الجھے بال۔ چہرے [illegible] پہ [illegible] واچ دانے۔ اور زرد رنگت۔

"دو کین دن آف کر لیتیں۔" پیٹریشیا کی آواز میں افسوس تھا۔ مالا نے آنکھیں اٹھائیں تو اس نے دیکھا۔ سبز آنکھوں تلے گہرے حلقے تھے۔

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ سنجیدگی سے کہتی ایپرن کی گرہ باندھنے لگی۔ پھر احساس ہوا کہ پیٹ اسے ہی دیکھ رہی ہے۔ سوالیہ انداز میں اسے دیکھا تو اس نے ابرو سے شیلف کی طرف اشارہ کیا۔

مالا نے چونک کر اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔

وہاں ایک ننھا سفید گملا رکھا تھا۔ وہ یہاں سے بھی دیکھ سکتی تھی کہ اس کے نیچے ایک زرد نوٹ رکھا دکھائی دے رہا ہے۔

"یہ کس نے رکھا ہے؟"

"تمہارے فرینڈ نے۔ جو سارے اسٹاف کو بھاری ٹپس دے کر گیا تھا۔" اس نے آنکھیں گھمائیں۔

"ماہر۔" مالا نے گہری سانس لے کر افسوس سے سر ہلایا۔ پھر گملے تک آئی۔ اور نیچے رکھا نوٹ نکالا۔

"تم لیٹ ہو۔ دوبارہ ہوئیں تو جے پی کسی اور کو ہائر کر لے گی۔ وہ جو اس کی بات مانتی ہو گی۔"

وہ نا چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی۔

(ماں بیمار تھیں۔ وہ انہیں دوا دے کے سلا آئی اور باہر لان میں کیف کا انتظار کرنے لگی۔ اسے کام کرتے ہوئے تھوڑا عرصہ ہی ہوا تھا۔ اور وہ آج اپنی شفٹ پہ نہیں پہنچا تھا۔ اسے اس پہ غصہ آ رہا تھا۔ اس روز اس نے اسٹڈی میں کچھ کہا تھا۔ کچھ مبہم سا۔ کاش ہم مختلف حالات میں ملے ہوتے۔ اسے مبہم باتوں پہ غصہ آتا تھا۔

پھر گیٹ آہستہ سے کھلا۔ اور وہ اندر آتا دکھائی دیا۔

"تم لیٹ ہو۔" وہ وسط لان میں [illegible] بیٹھی [illegible] پر [illegible] تھی خفا لگ رہی تھی [illegible] رہی تھی۔

"آپ مہمانوں میں بزی تھیں۔ وہ گئے تو میں آ گیا۔"

"اس بات کا لیٹ ہونے سے کیا تعلق؟"

"مجھے کام تھا۔ اسی لیے لیٹ ہو گیا۔"

"دوبارہ مت ہونا۔"

"ورنہ؟" کیف نے بغور اسے دیکھ کے پوچھا تھا۔

"ورنہ میں کسی اور کو ہائر کرلوں گی۔ وہ جو میری بات مانتا ہوگا۔")

لاہور اور مین منزل کی اس چاندنی رات کا فسوں دھیرے سے فضا میں تحلیل ہو گیا۔ وہ اداسی سے مسکرادی۔ پھر سر جھٹکا اور قلم سے چند الفاظ نوٹ کی پشت پر گھسیٹے — اور اسے واپس گملے تلے رکھ دیا۔

"ہیلو۔" آواز پہ وہ چونکی۔ کافی شاپ کے چوکھٹے کے کونے میں رکھی کرسی میز پہ وہ بیٹھا تھا۔ سبز بھوری آنکھوں والا لڑکا۔ کانوں میں ائیر پوڈز لگائے، لیپ ٹاپ سامنے رکھے، وہ کافی کا گھونٹ بھرتے اسے مسکرا کے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا یا ائیر پوڈز کے ذریعے کسی کال پہ تھا؟ وہ فیصلہ نہ کر سکی۔

"ہیلو کشمالہ!" اس نے ہاتھ ہلایا۔ ساتھ ہی نگاہ کشمالہ کے ایپرن پر لگے نام پہ ڈالی۔ اس کے گلے میں کچھ پھنس سا گیا۔ آنکھوں میں نمی آگئی۔ بدقت مسکرا کے سر ہلایا۔ پھر سر فوراً ہی جھکا دیا۔ وہ خود کو کسی غیر ضروری کام میں مصروف کرنا چاہتی تھی لیکن وہ لڑکا... بدر... وہ اپنی میز سے اٹھ کے اس طرف آرہا تھا۔ اس کے دل پہ کسی نے پیر رکھ دیا۔

"آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں، کشمالہ؟"

مالا نے نگاہیں اٹھائیں۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

"سوری؟"

"مجھے ہمیشہ یہ لگتا ہے کہ آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔"

اس نے بدقت آنکھوں کو گیلا ہونے سے روکا۔ مسکرا کے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں تو۔" اسے خود بھی معلوم تھا کہ وہ جھوٹ تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن نہیں۔ ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا۔

"آپ مجھے جانتی ہیں؟" وہ اسے آنکھیں چھوٹی کر کے دیکھنے لگا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

آنسو پلکوں پہ اکٹھے ہونے لگے لیکن اس نے سختی سے گردن دائیں بائیں ہلائی۔

"نہیں۔ بالکل نہیں۔"

"او کے۔ تھینکس۔" وہ مسکرا کے واپس اپنی کرسی تک چلا گیا۔ ایک آنسو آنکھ سے لڑھکا لیکن اس نے بے دردی سے ہتھیلی کی پشت سے اسے صاف کیا۔

"مالا..." خفا آواز پہ وہ چونکی۔ جیسے ڈر گئی ہو۔ اونچی آوازیں اسے اسی طرح ڈرا دیتی تھیں۔

"امید ہے تم پیسوں کا انتظام کر رہی ہو گی۔" جے پی (شاپ کی سکھ سپر وائزر) ماتھے پر بل ڈالے اس کی طرف آرہی تھی۔ اس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں دو ہفتے میں انتظام کرلوں گی۔ اور پھر یہ جاب چھوڑ دوں گی۔"

"ہوں۔" وہ اسے گھورتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ اب وہ ریک میں رکھی چیزوں کو الٹ پلٹ کر رہی تھی۔

وہ جانتی تھی اسے اس مصیبت میں کس نے پھنسایا تھا۔ نگاہ اٹھا کے مال کے دوسرے سرے پہ ڈالی۔ وہاں ایک دوسری شاپ میں کیف جمال اپنی مخصوص جگہ پر براجمان تھا۔ وہ یہاں بیٹھ کے اس پہ نظر رکھتا تھا۔ لیکن آج وہ اس طرف متوجہ نہ تھا۔

وہ ایک لڑکی کے ساتھ کھڑا تھا۔ دیسی خدوخال کی قدرے فربہ سی لڑکی۔ وہ اسے کچھ کہہ رہی تھی اور وہ سر ہلا کے سن رہا تھا۔ دفعتاً مالا کو اپنی طرف متوجہ پا کے مسکرایا اور اس لڑکی سے کچھ کہا۔ وہ [illegible] لڑکی نے بھی پلٹ کر [illegible] دیکھا اور سر کو اثبات میں جنبش دی۔ جیسے سلام کہہ رہی ہو۔

وہ رسماً مسکرائی اور سر کو خم دیا۔ والسلام۔

"یہ کون تھی؟"

کچھ دیر بعد کیف اس کے پاس آیا تو وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"روبی۔ میری کلائنٹ تھی۔ اگلے ہفتے میں اس کی شادی کا فنکشن شوٹ کر رہا ہوں۔"

"میرے بارے میں کیا بتا رہے تھے؟"

"یہی کہ اگر آپ میرے ساتھ شادی پہ آئیں تو وہ برا تو نہیں مانے گی؟"

"میں تمہارے ساتھ کیوں جاؤں گی؟"

"شادی ویک اینڈ پہ ہے۔ آپ فری ہوں گی اور میرا نہیں خیال کہ آپ کو تنہا گھومنا چاہیے۔"

کچھ تھا جو اس کے انداز میں بدلا ہوا تھا۔ کچھ نرم سا۔

"سوچوں گی۔" وہ سر جھکا کے کام کرنے لگی۔ پھر احساس ہوا کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے۔

چونک کر سر اٹھایا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟" وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہاں۔ مجھے کیا ہونا ہے۔" وہ تلخی سے کہہ کے پلٹ گئی۔ کاؤنٹر پہ ایک گاہک آ کھڑا ہوا تھا۔ اسے اس کا آرڈر لینا تھا۔

کیف جمال نے افسوس سے اسے جاتے دیکھا۔ پھر موبائل اسکرین پہ نگاہ ڈالی۔ زیاد کا میسج آیا ہوا تھا۔ وہ معمول کے مطابق مالا کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ کیف کے ماتھے پر بل پڑے۔

(اب اسے اپنی بیوی کا خیال آ گیا؟ جب وہ کل کلینک میں اکیلی تھی تب وہ کہاں تھا؟) جواب دیے بنا وہ واپس اپنی نشست کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

"معید؟"

دوپہر میں اسے جیسے ہی لنچ بریک ملی، وہ موبائل پہ معید کو کال ملاتے ہوئے مال کی راہداری میں آگے چلتی آئی۔ جے پی اور کیف جمال سے دور جہاں وہ اس کی کال نہ سن سکیں۔

"مالا؟" معید نے جمائی لیتے ہوئے جواب دیا۔ "وقت تو دیکھ لیا کرو۔"

"اہم بات ہے۔"

"تمہارا کیس چل رہا ہے مالا۔ دو تین ہفتوں میں فیصلہ آ جائے گا۔ نکاح منسخ ہو جائے گا۔ ڈونٹ وری۔" وہ نیند میں تھا۔

"معید مجھے باغ میں سے اپنا حصہ چاہیے۔"

دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔

"تم نے باغ بیچا تھا۔" وہ اسے یاد دلا رہی تھی۔ "ان پیسوں میں میرا حصہ تھا، معید۔" وہ راہداری کے سرے پر کھڑی فون کان سے لگائے ہوئے تھی۔

"تم مجھے آدھی رات کو پیسوں کے لیے فون کر رہی ہو؟"

"مجھے پیسے چاہئیں، معید۔" اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ گال سرخ ہونے لگے۔

"یار میں پیسے لے کر بھاگ تو نہیں رہا۔ اتنا تو سوچا کرو کہ میں تمہارا کام بھی ساتھ کر رہا ہوں۔ وکیل کی فیس دے رہا ہوں۔"

"مجھے کسی کے پیسے دینے ہیں ورنہ میں مسئلے میں پھنس سکتی ہوں۔ پلیز میری بات سمجھو۔"

"تم عباد سے مانگ سکتی ہو۔"

"عباد میرا بھائی نہیں ہے۔ تم ہو۔"

"مالا یار میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ میں کیا کروں؟ خود کو بیچ دوں؟"

"اور تمہاری بیوی جو ہر روز انسٹا پہ اپنا نیا فرنیچر پوسٹ کرتی ہے۔"

"وہ اپنا کماتی ہے یار۔ اس کے پیچھے کیوں پڑی رہتی ہو تم دونوں؟"

اس کے سر میں درد اٹھنے لگا۔ ایسا شدید کہ لگتا تھا دماغ کی رگ پھٹ جائے گی۔ ایک ہاتھ سے کنپٹی سہلاتے ہوئے اس نے بہت ضبط سے خود کو پرسکون کیا۔

"معید..." وہ بولی تو آواز نیچی تھی۔ "مجھے پیسے چاہئیں۔"

"تمہارے ڈائمنڈز کہاں گئے؟"

حلق میں بہت سے آنسو اکٹھے ہونے لگے لیکن نہیں۔ اسے روئے بغیر اپنی بات مکمل کرنی تھی۔

"میرے زیادہ تر ڈائمنڈز زیاد کے پاس رہ گئے۔ جو میرے پاس تھے، وہ میں نے کم قیمت پہ یہاں بیچ دیے۔ مجھے ایک میڈیکل پروسیجر کے لیے رقم چاہیے تھی۔" وہ ایک شاپ کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کی شیشے کی دیوار میں اسے اپنا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ زرد چہرہ۔ ہتھیلی کی پشت پر آئی وی لائن کے بعد پڑنے والا نیل۔

"یار باغ کے پیسے اتنے نہیں تھے کہ تمہارے کام آسکیں۔ جب ہوں گے تو دے دوں گا۔ ابھی نہیں ہیں۔ پھر تم وہاں رہ کیوں رہی ہو۔ واپس آجاؤ۔ پاکستان کے خرچ کینیڈا سے کم ہوں گے۔ ویسے بھی خاندان بھر میں باتیں..."

"معید تم مجھے دو ہفتے کے اندر پے منٹ کر سکتے ہو یا نہیں؟" اس کی آواز بلند ہونے لگی۔

ایک لمحے کے لیے لائن خاموش ہوگئی۔

"نہیں۔"

معید کا انداز قطعی تھا۔ پھر وہ کچھ اور بھی کہنے لگا۔ لیکن اس نے زور سے سرخ بٹن دبا دیا۔ لائن دم توڑ گئی اور اس کی امید بھی۔

وہ تیزی سے راہداری کے اندر مڑ گئی۔ اس کے اختتام پر لیڈیز ریسٹ روم تھے۔ وہ آگے تک نہیں گئی۔ اس میں ہمت نہیں تھی۔ وہیں ایک جگہ دیوار کا سہارا لے کر ٹھہری۔ دل کا وزن اب بڑھتا جا رہا تھا۔ اتنا کہ قدم چلنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

کل سے روکے ہوئے آنسو بے اختیار ابل پڑے تھے۔ وہ وہیں راہداری کے کونے میں دیوار کے ساتھ نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ بے بسی۔ پریشانی۔ خوف۔ سب کچھ ایک ساتھ جمع ہوگیا تھا۔ ذہن میں ڈھیر ساری آوازوں کا شور جمع تھا۔ اس نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا اور ایک دم بچوں کی طرح رونے لگی۔

ماں ہوتیں تو معید کبھی وہ باغ نہ بیچتا۔ ماں ہوتیں تو وہ آج اکیلی نہ ہوتی۔

لیکن ماں ہوتیں تو زندگی بہت مختلف ہوتی۔

ماں ہوتیں تو وہ نگینہ بیگم کے خاندان میں کبھی بیاہی نہ جاتی۔ ماں ہوتیں تو اس کی ڈھال بن جاتیں۔ اسے اپنے پروں میں چھپالیتیں۔

چھوٹا بچہ نیند سے جاگتے ہی ایک دم سے خود کو حقیقی زندگی کی تختی کے لیے تیار نہیں کر سکتا۔ وہ بے اختیار روتے ہوئے اپنی ماں کو ڈھونڈتا ہے۔ ماں اسے سنبھال لیتی ہے۔ اسے چپ کروا دیتی ہے۔ لیکن جن کی مائیں چلی جاتی ہیں، ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ان کے سارے راستے مسدود ہوجائیں، تو وہ کس کو ڈھونڈیں۔

کس کے پاس جا کے روئیں۔

کیونکہ کوئی ایسا نہیں ہوتا جو ان کو ماں کی طرح سنبھال سکے۔

☆☆☆

ماہر کافی بار تک آیا اور متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا۔ مالا وہاں نہیں تھی۔ اس کی نگاہ فوراً سے شیلف کی طرف اٹھی۔ گملے کے نیچے رکھا نوٹ جھلک رہا تھا۔ وہ ہلکا سا مسکرایا اور شیلف تک آیا۔ گملا اٹھایا۔ نوٹ نکالا۔

"جے پی مجھے فائر کرے یا نہ کرے، کم از کم وہ تمہیں ہائر نہیں کرے گی۔ چاہے اس کی جتنی خوشامد کرلو۔"

وہ ایک دم ہنس دیا۔ وہ اس کی دی ہوئی ٹپس کی خبر سن چکی تھی۔



(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



جب ترا حکم ملا ترکِ محبت کر دی

دل مگر اس پہ وہ دھڑکا کہ قیامت کر دی

تجھ سے کس طرح میں اظہارِ تمنا کرتا

لفظ سوجھے تو معانی نے بغاوت کر دی

میں تو سمجھا تھا کہ لوٹ آتے ہیں جانے والے

تُو نے جا کر تو جدائی مری قسمت کر دی

مجھ کو دشمن کے ارادوں پہ بھی پیار آتا ہے

تری اُلفت نے محبت مری عادت کر دی

پوچھ بیٹھا ہوں میں تجھ سے ترے کوچے کا پتا

تیرے حالات نے کیسی تری صورت کر دی

کیا ترا جسم ترے حسن کی حدت میں جلا

راکھ کس نے تری سونے کی سی رنگت کر دی

احمد ندیم قاسمی

ڈپریشن

چاند سے گفتگو بھی کر لی ہے

میں نے تاروں کو کر لیا ہمراز

جگنوؤں کو بھر لیا آنچل میں

اور پُروا سے دوستی کر لی

رات جیسے رُکی ہوئی ہے کہیں

وقت بھی سر جھکا کے ہے خاموش

سارے کیسٹ سُن لیے میں نے

ختم کر دی ہے ڈسک سی ڈی

سب کتابیں نصاب کی پڑھ لیں

شعر افسانے سب لیے ہیں کھنگال

جانے کیا ہو رہا ہے میرا حال

منتظر تو نہیں کسی کی میں

پھر یہ کیوں اضطراب دل میں ہے

بے لبی کا عذاب دل میں ہے

فاطمہ احمد



رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"آپس میں گالی دینے والے دو شخص جو کچھ ایک دوسرے کو کہیں گے اس کا گناہ ابتدا کرنے والے کو ہوگا۔ یہاں تک کہ مظلوم زیادتی کا ارتکاب کرے۔" (مسلم)

حضرت عمرؓ کی فراست

ایک نوجوان کو چوری کے جرم میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کیا گیا جب تفتیش کرنے پر اس نوجوان کا جرم ثابت ہوگیا تو آپ نے شرع کے مطابق چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر فرمایا، وہ نوجوان فریاد کرنے لگا۔ معافی کا طلب گار ہوا کہ یہ میری پہلی چوری ہے۔ میں آئندہ کبھی بھی چوری نہیں کروں گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ "غلط کہتے ہو۔ تم نے اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ چوریاں کی ہیں۔"

آخر اس نوجوان کو اقرار کرنا پڑا کہ اس نے پہلے بھی چوری کی وارداتیں کی ہیں پھر اس نے حیرانی کے عالم میں پوچھا۔

"اے امیر المومنین! میری گزشتہ کی ہوئی چوریوں کا علم میرے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو نہیں ہے آپ کو اس بات کی اطلاع کس طرح ہوگئی ہے؟"

حضرت عمر نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کسی کو بھی اس وقت تک ذلیل و خوار نہیں کرتا جب تک وہ برائی کی حد سے آگے نہ بڑھ جائے۔"

خاموش رہنا سیکھو

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

"جیسے تم بات کرنا سیکھتے ہو، ایسے ہی خاموش رہنا سیکھو کیونکہ خاموش رہنا بہت بڑی بردباری ہے اور تمہیں بولنے سے زیادہ سننے کا شوق ہونا چاہیے اور کبھی لایعنی بول نہ بولو۔ ہنسی کی بات کے بغیر خواہ مخواہ مت ہنسو اور بلاضرورت کسی جگہ مت جاؤ۔"

(ابن عساکر)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا

☆ "جو اللہ کے فیصلے پر راضی ہوگا تو اللہ نے جو فیصلہ کیا ہے، وہ تو ہو کر رہے گا لیکن اسے (اس پر راضی ہونے کی وجہ سے) اجر ملے گا اور جو اس پر راضی نہ ہوگا تو بھی اللہ کا فیصلہ ہو کر رہے گا لیکن اس کے نیک عمل ضائع ہو جائیں گے۔"

☆ نعمت ملنے پر فوراً اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے شکر ادا کرنے سے نعمت بڑھتی ہے۔ شکر اور نعمت کا ملنا ایک ہی رسی میں بندھے ہوئے ہیں جب بندہ شکر ادا کرنا چھوڑے گا تب اللہ کی طرف سے نعمت کا بڑھنا بند ہوگا۔

ساگ

رضوان صاحب کو ساگ بہت پسند تھا۔ وہ روزانہ اپنے گھر میں ساگ پکواتے تو اپنے بیٹے سے کہتے۔

"کھانا بسم اللہ سے شروع کیا کرو ورنہ شیطان کھانے میں شامل ہو جاتا ہے۔" لیکن بیٹا ہر بار بسم اللہ پڑھنا بھول جاتا۔

ایک دن وہ بسم اللہ پڑھے بغیر کھانا کھانے والا تھا کہ شیطان خود آگیا اور روتے ہوئے بولا۔

"مریں کدی تے بسم اللہ کہہ لیا کر، ساگ کھا کھا کر میں مرن والا ہوگیا واں۔"

نمک پارے

☆ رشتہ داروں میں اگر کوئی گھر آکر بیٹھ جائے تو امی کے اشارے ہی ختم نہیں ہوتے موبائل چھوڑنے کے۔

☆ یہ بھی پاکستانی لڑکیوں کا ہی ٹیلنٹ ہے کہ گلی سے گزرتی موٹر سائیکلوں کی آواز سے ہی اپنے

والے کو پہچان لیتی ہیں۔

نفسیات کہتی ہے

☆ "اگر آپ بہت ہنستے ہیں، وہ بھی فضول باتوں پر تو آپ اندر سے خالی ہیں۔"

☆ اگر آپ بہت زیادہ سوتے ہیں تو اداس ہیں۔

☆ اگر آپ کم بولتے ہیں لیکن تیز رفتاری سے بولتے ہیں تو آپ بہت گہرے ہیں۔

☆ اگر آپ کو رونا نہیں آتا تو آپ کمزور ہیں۔

☆ اگر آپ بے تحاشا کھاتے ہیں تو آپ پریشان ہیں۔

☆ اگر آپ بات بات پر رو پڑتے ہیں تو آپ نرم دل اور معصوم ہیں۔

☆ اگر آپ چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ کر جاتے ہیں تو آپ توجہ چاہتے ہیں۔

مستقل مزاجی

ایک دن جلال الدین رومی اپنے شاگردوں کو لے کر ایک کھیت میں پہنچے۔ یہ ان کے پڑھانے اور علم سکھانے کا انداز تھا۔

اس کھیت میں ایک کسان بالکل کسی پاگل آدمی کی طرح زمین کھودنے میں مصروف تھا۔ دراصل وہ اپنے کھیت کے لیے کنواں کھودنا چاہتا تھا۔ جب تھوڑی گہرائی تک پانی نہ ملتا تو وہ اس جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ زمین کھودنے میں لگ جاتا اور اس طرح کسان نے آٹھ جگہوں سے زمین کھود ڈالی تھی مگر حاصل اسے کچھ بھی نہ ہوا۔

مولانا جلال الدین رومی نے اپنے شاگردوں سے پوچھا۔

"کیا تم سمجھ سکتے ہو اس کی ناکامی کی کیا وجہ ہے؟"

شاگرد خاموش رہے تو قدرے توقف کے بعد مولانا نے کہا۔

"اگر یہ آدمی اپنی پوری قوت اور طاقت صرف ایک کنواں کھودنے میں صرف کرتا تو ابھی تک کافی گہرائی میں جا کر اسے اپنی محنت کا پھل مل چکا ہوتا ایک ہی جگہ کھودتا تو پانی نکل آتا۔"

مولانا جلال الدین رومی نے اس چھوٹے سے واقعہ سے بڑا سبق دیا ہے۔

اگر آپ واقعی کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنا ذہن اور توجہ صرف اپنے مقصد پر مرکوز کرنا چاہیے۔

آپ پر واجب نہیں

شیخ محمد راوی سے ایک عورت نے سوال پوچھا کہ ان کے شوہر کی والدہ بیمار رہتی ہے شوہر تقاضا کرتا ہے کہ۔

"میں اس کی ماں کی خدمت کروں مجھ سے یہ سب نہیں ہوتا، کیا مجھ پر شوہر کے ماں کی خدمت واجب ہے؟"

شیخ نے جواب دیا، "نہیں تجھ پر شوہر کی ماں کی خدمت ہرگز واجب نہیں ہے ہاں البتہ تمہارے شوہر پر واجب ہے کہ وہ اپنی ماں کی خدمت کرے۔" شیخ نے تین حل پیش کیے۔

"پہلا حل والدہ کو گھر لے کر آئیں اور دن رات آپ کے شوہر اور اس کے بچے اپنی ماں اور دادی کی خدمت کریں ان پر یہ واجب ہے یاد رکھیں آپ پر واجب نہیں ہے۔

دوسرا حل والدہ کو الگ گھر میں رکھیں اور ان کی دیکھ بھال خدمت و خبر گیری کے لیے وہاں جاتا رہے اگر والدہ یہ تقاضا کرے کہ رات ان کے سرہانے گزارے تو ماں کے پاس رات رکنا ان پر واجب ہے، یاد رکھیں آپ پر واجب نہیں ہے۔

تیسرا حل والدہ کی دیکھ بھال کے لیے ایک نرس رکھ لیں اگر نرس کے لیے تنخواہ دینے میں حرج ہو تو گھر کے اخراجات کم کر کے نرس کی تنخواہ دے، نرس کی موجودگی میں والدہ کے پاس آتے جاتے فتنے میں پڑنے کا خطرہ ہو تو نرس سے شادی کرنا واجب ہوگا۔ اس طرح وہ تین نیکیوں کو جمع کرے گا دوسری شادی کا اجر، ماں کی خدمت کا اجر اور فتنے سے بچنے کا اجر۔

البتہ آپ پر شوہر کی ماں کی خدمت واجب نہیں ہے لہٰذا آپ عزت کے ساتھ اپنے گھر رکی رہیں۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد عورت بولی۔ "شیخ صاحب شوہر کی ماں بھی میری ماں جیسی ہے واجب نہیں تو مستحب سہی میں خود اس کی خدمت کروں گی۔"

امت الصبور

خواتین کی ڈائری

مدینہ لغاری

کی ڈائری سے

میری ڈائری میں محفوظ یہ غزل آپ کو ضرور پسند آئے گی۔ شاعر کا نام معلوم نہیں۔ کسی کو معلوم ہو تو بتا دیں۔

وقت کے سمندر میں زندگی کو وارا تھا، حکم جو تمہارا تھا
تیری جیت کی خاطر ہم نے خود کو ہارا تھا، حکم جو تمہارا تھا

...

غم بیاباں میں جب پڑاؤ ڈالے تھے جگ سے ہم نکلے تھے
تشنگی مقدر تھی ابر استعارہ تھا، حکم جو تمہارا تھا

آخر محبت میں مات ہو گئی اپنی، رات ہو گئی اپنی
چھوڑ کر چلے آئے ایک جو سہارا تھا، حکم جو تمہارا تھا

مصلحت پسندی تھی کہ بزدلی میری رک گئے قدم میرے
جیت گو یقینی تھی پھر بھی تم کو ہارا تھا، حکم جو تمہارا تھا

کیا مجال تھی میری لب کشائی کرنے کی دل رہائی کرنے کی
میری ذات پر بس اک تیرا اجالا تھا، حکم جو تمہارا تھا

ریحانہ چوہدری

کی ڈائری سے

اگر یہ کہہ دو بغیر میرے نہیں گزارا تو میں تمہارا
یا اس پر مبنی کوئی تاثر کوئی اشارا تو میں تمہارا

تم اپنی شرطوں پہ کھیل کھیلو میں جیسے چاہوں لگاؤں بازی
اگر میں جیتا تو تم ہو میرے اگر میں ہارا تو میں تمہارا

تمہارا ہونے کے فیصلے کو میں اپنی قسمت پہ چھوڑتا ہوں
اگر مقدر کا کوئی ٹوٹا کبھی ستارہ تو میں تمہارا

تمہارا عاشق تمہارا مخلص تمہارا ساتھی تمہارا اپنا
رہا نہ ان میں سے کوئی دنیا میں جب تمہارا تو میں تمہارا

یہ کس پہ تعویذ کر رہے ہو یہ کس کو پانے کے ہیں وظیفے
تمام چھوڑو جو ایک کر لو تم استخارہ تو میں تمہارا

سحر احمد

کی ڈائری سے

چھوٹی بحر کی غزل کہنے میں جون ایلیا کا جواب نہیں۔ وہ اپنی غزلوں میں روزمرہ محاوروں کا استعمال بڑی خوبی سے کرتے ہیں۔ ان کی یہ غزل پڑھیے۔ آپ کو پسند آئے گی۔

زخم امید بھر گیا کب کا
قیس تو اپنے گھر گیا کب کا

اب تو منہ اپنا مت دکھاؤ مجھے
ناصحو! میں سدھر گیا کب کا

آپ اب پوچھنے کو آئے ہیں
دل مری جان مر گیا کب کا

آپ اک اور نیند لے لیجے
قافلہ کوچ کر گیا کب کا

میرا فہرست سے نکال دو نام
میں تو خود سے مکر گیا کب کا

ردبینہ کی ڈائری سے

جگر مراد آبادی کی یہ غزل سوز اور والہانہ پن لیے دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ آپ سب قارئین بھی پڑھیں اور لطف اندوز ہوں۔

آدمی آدمی سے ملتا ہے
دل مگر کم کسی سے ملتا ہے

بھول جاتا ہوں میں ستم اس کے
وہ کچھ اس سادگی سے ملتا ہے

آج کیا بات ہے کہ پھولوں کا
رنگ تیری ہنسی سے ملتا ہے

سلسلہ فتنۂ قیامت کا
تیری خوش قامتی سے ملتا ہے

مل کے بھی جو کبھی نہیں ملتا
ٹوٹ کر دل اسی سے ملتا ہے

کاروبارِ جہاں سنورتے ہیں
ہوش جب بے خودی سے ملتا ہے

روح کو بھی مزا محبت کا
دل کی ہمسائیگی سے ملتا ہے

زینب ظفر کی ڈائری سے

زندگی بجائے خود ایک رمز ہے۔ اسے گزارنے کے باوجود اس کی حقیقت نہیں کھلتی۔ اسی حقیقت کو جمیل یوسف نے اس غزل میں بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے۔

تمناؤں کی دُنیا میں قدم دھرنے نہیں دیتی
جو کرنا چاہتا ہوں، زندگی کرنے نہیں دیتی

کوئی صورت نہیں ہے زندگی سے بچ نکلنے کی
غم و آلام کے ماروں کو بھی مرنے نہیں دیتی

اندھیرا لاکھ ہو مجھ کو سحر کی آس رہتی ہے
یہی وہ روشنی ہے جو مجھے ڈرنے نہیں دیتی

مجھے معلوم ہے وعدہ نبھانا سخت مشکل ہے
مری کم ہمتی انکار بھی کرنے نہیں دیتی

گزرتی رو بدلتی جا رہی ہے ایک ایک شے کو
کسی شے سے مجھے الفت کا دم بھرنے نہیں دیتی

روحیلہ خان کی ڈائری سے

کائنات میں پھیلا جا بجا حسن جب ایک شاعر کو متاثر کرتا ہے تو پھر لفظوں سے جو تصویر بنتی ہے وہ ہمیں کس جہاں میں لے جاتی ہے۔ سلیم کوثر کی یہ غزل پڑھیں اور محسوس کریں۔

رم جھم رم جھم شاخیں برسیں ساون رت لہرائے
خوشبو پیچ پتنگ باندھیں اور ڈور الجھتی جائے

یاد رو پہلی کرنیں، سورج رتھ سے اتریں
میں آگے بڑھ جاؤں، سایا رستے میں رہ جائے

دھوپ نہایا ریوڑ، سوکھی گھاس میں ٹھہرا پانی
کس کی راہ تکے ہے گڈریا بنسی ہونٹ لگائے

وہ چہرہ، وہ گلی، وہ رستہ اور وہ بھول بھلیاں
یاد کا پاگل پنچھی دھیان کے پنجرے سے ٹکرائے

گم صم آنگن، چپ دروازے، آنگن عکس سے خالی
اب کے برس تہوار پہ بھی کچھ لوگ تو گھر نہیں آئے

روزانہ سوتی رہا ہوں پر آس کا جال بچھا کر
کوئلے سے کچی دیوار پر ایک لکیر بڑھائے



نوریہ خانم لغاری ______ مظفر گڑھ

ہر کنکر ان کا شنکر ہے، ہر پتھر ان کی دیوی ہے!
اپنا تو خدا ئے واحد ہے، لاکھوں کی عبادت کون کرے

ارم کمال ______ فیصل آباد

دستک میں کوئی درد کی خوشبو ضرور تھی
دروازہ کھولنے کے لیے گھر کا گھر اُٹھا

ثمرہ عاقب ______ گرین سٹی

گلاب لمحوں کے مخملی پہ کھیلے بچپن
پلٹ کے آکر میں تجھ سے قراریں مانگوں

فاکہہ سہیل ______ کراچی

تم سے ملے بھی تو جدائی کے موڑ پہ
کشتی ہوئی نصیب تو دریا نہیں رہا
کہتے تھے ایک پل نہ جئیں گے تیرے بغیر
ہم دونوں رہ گئے ہیں وہ وعدہ نہیں رہا

طوبیٰ اظہر ______ لاہور

تو مسیحا نہ سہی، پھر بھی تسلی کے لیے
تیری قربت تیرے بیمار بہت مانگتے ہیں

ندا طارق ______ حیدر آباد

عقل کھو کر بھی کئی لوگ خرد مند ہوئے
ترے وحشی دل خود دار لیے پھرتے ہیں
یہی زنجیر محبت ہے ہماری پہچان
کو بکو ایک ہی جھنکار لیے پھرتے ہیں

عائشہ ______ گوجرہ

کہیں خون دل سے لکھا تو تھا ترے سال ہجر کا سانحہ
وہ ادھوری ڈائری کھو گئی، وہ نجانے کون سا سال تھا
کبھی موسموں کے سراب میں، کبھی بام و در کے عذاب میں
وہاں عمر ہم نے گزار دی جہاں سانس لینا محال تھا

حبیبہ خان ______ کراچی

دُنیا کے اس شور نے امجد کیا کیا ہم سے چھین لیا
خود سے بات کیے بھی اب تو زمانے ہو جاتے ہیں

اقرا انس ______ گوجرہ

تیرے انداز جدائی میں سلیقہ ہے بہت
مجھ سے پہلے بھی کسی اور سے بچھڑا ہو گا

سحر خان ______ خانیوال

بچھڑ جاتا تو ڈھونڈ لیتا میں
بات یہ ہے! بدل گیا تھا وہ

صبا سلیم ______ کراچی

اپنی گلی میں اپنا ہی گھر ڈھونڈتے ہیں لوگ
امجد یہ کون شہر کا نقشہ بدل گیا

صدف عمران ______ کے ٹو سٹی الے

ہمیں یہ خوف تھا اک دن ہمیں سے ٹوٹیں گے
ہمارے خواب تمہاری ہنسی سے ٹوٹیں گے
جو دے رہے ہیں محبت میں مشورے مجھ کو
یہ سب ذہین کسی ماہ جبیں سے ٹوٹیں گے

سعدیہ ______ پشاور

ہم نے تا عمر سے سیکھے ہیں محبت کے اصول
ہم پہ لازم ہے ترا عشق دوبارہ کر لیں

صبا ریاض ______ کراچی

کچھ اس طرح سے وفا کی مثال دیتا ہوں
سوال کرتا ہے کوئی تو ٹال دیتا ہوں
اسی سے کھاتا ہوں اکثر فریب منزل کا
میں جس کے پاؤں کا کانٹا نکال دیتا ہوں

آسیہ جاوید ______ علی پور چٹھہ

تیرے بعد بچا ہی کیا ہے جیون میں
میں ہوں بھیگی شام ہے اور تنہائی ہے

نایاب سندھو ______ کراچی

خود سے ملنے کو دل کرتا ہے
بہت بُرا ہوں لوگوں سے سنا ہے

بقیہ ہمارے نام

کردیں۔ "انگنا پھول کھلیں گے" اب وسیم یا عفان کون بنے گا ارم کا ہمسفر؟ لبنیٰ آصف کی غلطی میں ماؤں کے لیے ایک بہترین نصیحت تھی بہت اچھا لکھا آپ نے۔

"نوشین صاحبہ نے بہت عمدہ تحریر لکھی۔ کچھ مردوں کو چالیس پینتالیس سال کی عمر میں دوبارہ رومانس کے چاہ چڑھتے ہیں۔ گھر والی اس وقت اسے سنبھال لے اور اس کی خواہشیں پوری کرنے کی کوشش کرے۔ ایسا کرنے سے دوسری شادی کے مرد کے ممکنہ خیالات ٹل بھی سکتے ہیں۔ میری دوست کے میاں کو بھی شادی کے پندرہ سال بعد دوبارہ رومانس کے دورے پڑنا شروع ہوگئے تھے اور اکثر بیوی سے شکایت کرتے کہ تم مجھے ٹھیک سے ڈیل...... نہیں کرتیں۔ جب بیوی نے ممکنہ حد تک سمجھانے کی کوشش کی، بجائے سمجھنے کے الٹا دوسری شادی کرلی جا کر بیوی بچوں سے بے اعتنائی برتنے لگے۔ پہلی بیوی اب شدید ڈپریشن میں ہے۔ بیچاری)

فلک تنویر کی اسٹوری میں بی بی گل کی رقابت اور انتقامی جذبے نے دو خاندانوں کو دشمنی کی آگ میں جھونک دیا۔

ج۔ پیاری نصرت! آپ نے ہماری محفل میں شرکت کی۔ اتنی اچھی لکھائی میں تفصیلی تبصرہ کیا، اس کے لیے ہم تہہ دل سے ممنون ہیں۔ کسی حد تک آپ کی بات بھی ٹھیک ہے کہ لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ بیوی شوہر کو بھرپور توجہ دے تو شوہر دوسری شادی نہیں کرے گا مرد کے دل پر کوئی عورت چڑھ جائے اور دوسری طرف سے بھی بھرپور پذیرائی ملے تو وہ بیوی کی تمام تر خدمت، توجہ اور محبت کو بھلا کر دوسری شادی کر لیتے ہیں۔ ہماری نظر میں تو سب سے اچھا حکمران وہ ہے جو ہمیں اس جان لیوا مہنگائی سے نجات دے اور بجلی، گیس اور پانی کے مسائل حل کرے نہ ہمیں کسی سے دشمنی ہے نہ کسی کی اندھی محبت میں گرفتار ہیں۔

گوشی جمال...... منڈی یزمان

عجیب کوفت کا عالم ہے آج بھی جب بھی خط لکھنے کا ارادہ کیا۔ کاغذ قلم اٹھایا کوئی نہ کوئی گاہک ٹپک پڑتا۔ اتوار کا دن بہت مصروف ہوتا ہے۔

ایک تو اس بار شمارہ بہت لیٹ ملا۔ اخبار فروش کی کال نہیں آئی۔ 8 دسمبر کو تو خوب لتے لیے امداد بھائی کے۔ میں نے اپنی سروس بروئے کار لاتے ہوئے بہاولپور نیوز ایجنسی فون کھڑکا دیا۔ معلوم ہوا کل شمارہ آچکا ہے پھر کیا تھا میرا پارہ ساتویں آسمان پر اور امداد بھائی کی کلاس شروع۔ "تمہارا رسالوں کا بنڈل بہاولپور سے کھوتا گاڑی پہ آرہا ہے جو ابھی تک منڈی یزمان نہیں پہنچا؟؟؟"

"میں پتا کرتا ہوں ابھی دو منٹ میں۔" امداد بھائی منمنائے۔

حد ہے بھئی 9 دسمبر آ گیا کب شمارہ لے گا اور پڑھ کر خط لکھوں۔

"جی آ گیا شمارہ! میں نے آج دکان لیٹ اوپن کی، وہ بنڈل ساتھ والے سموسے پکوڑے والے کی دکان پہ کل رات کا پڑا ہے۔" امداد بھائی اپنے تئیں صفائی پیش فرمانے لگے۔

"شکر کریں خیریت سے مل گیا بنڈل، کہیں انہوں نے ورق پھاڑ کر سموسے پکوڑے نہیں ڈال لیے۔ خیر 9 دسمبر بروز ہفتہ خواتین ڈائجسٹ اپنی تمام تر خوب صورتیاں سمیٹے میرے ہاتھوں میں۔ شکر ہے ٹائٹل اداس دسمبر کی طرح نہیں بلکہ خوب صورت مسکراہٹ اور عمدہ کلر اسکیم پہ مبنی ہے۔ کہنی سخنی میں دسمبر میں ہوئے دو المناک حادثات کا ذکر آبدیدہ کر گیا۔ فہرست پہ نظر ثانی نے میری چیخیں نکلوا دیں۔ مستقل تین ناولوں کے ساتھ دو اور مکمل ناول۔ لو شاباش اے۔ ٹائم کی قلت، خط کی آخری تاریخ صبح سات بجے سے رات دس بجے تک مصروفیت، کوشش تو ہے کبھی ہم بھی کہانیوں والے صفحے پر براجمان ہوں گے۔ ایک دن میں جلدی سے دونوں ناول پڑھے۔ "اس کی آنکھوں کے راز" میں "دگمہ" بڑا یونیک نام معنی جان سکتے ہیں کیا؟ "فراق موسم ٹھہر گئے ہیں" ہر لحاظ سے بہتر لگا۔ انگنا پھول کھلیں گے میں ثانیہ کی خود غرضی بہت ہرٹ کر رہی ہے، میں بہت ہی حساس ہوں اسی وجہ

سے ناول پڑھتے اکتاہٹ سی ان دنوں ہو رہی معذرت، اور کوئی بات نہیں راحت جی تو ویسے ہی راحت کا احساس ہیں۔ ''مالا'' میں میرے فیورٹ کردار ماہر کے دشمنوں میں اضافہ، دلچسپی اور بڑھ گئی۔ ''سمیرا احمید'' کہاں چلی گئی ہیں، بہت کمی محسوس ہوتی ہے ان کی۔ ابھی دسمبر کی آخری شاموں کے حساب کتاب جاری ہیں۔ دوسروں کی طرف سے ملے دکھوں کا واویلا جاری اور اپنا پتا نہیں کہ ہم نے اپنے رویوں سے کتنوں کو ہرٹ کیا ہوگا......؟ سوچوں میں غرق گوشی۔

''ایہہ گوشی ایک کلو میدہ اور بیسن دینا'' باجی کشور کی پاٹ دار آواز نے مجھے دکان میں لا پٹخا۔

''بیٹا! ایک قلفی دینا، دوائیاں کھا کھا کر سینے میں آگ لگی ہوئی ہے کچھ منہ ٹھنڈا ہو جائے۔'' 78 سالہ چاچا عبدالحق اپنے دکھڑے بیان کرتا ہوا۔

''چاچا ادھر کرسی پہ بیٹھ جائیں۔'' اور میں نے قلفی کا ریپر کھول کر تھمادی۔ بےچارہ اپنے دکھ درد بیان کرنے کبھی کبھار آجاتا ہے اور قلفی کھا کر دعائیں دیتا لاٹھی ہاتھ میں پکڑے دکان کی سیڑھیوں پہ اترنے اور چڑھنے میں میرا بازو تھامے چلا جاتا۔ شمارہ کاؤنٹر پہ رکھ کر وہی روٹین آج بھی اپنائی اور پھر سے خط کی لائنیں لکھنے میں مصروف۔

ٹھنڈی خنک ہوا سے شمارے کے ورق خود بخود اڑتے رہے اور موسم کے پکوان والا صفحہ سامنے آگیا۔ ان دنوں فش اور سوپ کا طوطی بول رہا ہے۔ ہم پنڈاں اے لوگ دیسی میٹھیاں ان دنوں خوب تیار رکھتے ہیں السی کی پنیاں، کچے چاولوں کی پنیاں، سوہن حلوہ، گری، چھوہارے سب فرداً فرداً ہر گھر کی زینت بنے ہوئے گھروں سے لکڑی کے چولہوں کے دھوئیں اڑتے کہیں ساگ کے دیگچے چڑھے ساتھ مکئی، باجرہ کی روٹیاں۔

گڈی آپا نے دو دن پہلے ساگ کا بڑا پتیلا بنالیا ہے۔ السی کی پنیوں کی ترکیب پچھلے سال میں نے شیئر کی تھی۔ میرا سوہنا پنڈ 61 ڈی بی، جدت اختیار کیے ہوئے ضلع میں ہے۔ روہی بھی ساتھ ہے۔ اس بار ہمارے علاقے کی مشہور و معروف مصنفہ ''شازیہ الطاف ہاشمی'' شمارے کی زینت بنیں۔ سادہ سی دلچسپ باتیں بہت اپنائیت لیے۔ مجھے میرے ہی علاقے کی سیر کرواتے ہوئے۔

ج:۔ گوشی جی! شکر ہے کہ آپ کو کہانیاں لکھنے کا خیال آیا۔ آپ کے تو گھر میں ہی کئی کہانیاں ہیں۔ بڑی آپا اور چھوٹی آپا کی زندگی پر لکھیں، آپ کا انداز بیان ان کہانیوں کو بڑا خوب صورت رنگ دے گا۔

لدا دو بھائی پر ہاتھ ہولا رکھیں۔ ناراض ہو گئے تو پرچے لانا ہی بند نہ کر دیں۔ اور گاہکوں کی آمد پر کوفت نہ محسوس کیا کریں، یہ تو اللہ کی رحمت ہے آپ پر کہ آپ کی دکان پر گاہک آتے ہیں ورنہ کچھ دکان دار تو سارا دن مکھیاں مارتے رہتے ہیں۔

لگتا ہے نصیحتیں کچھ زیادہ ہی ہو گئیں۔ اب آپ کے خط کی تعریف (تبصرہ تو اس بار بہت کم ہے) بہت بے ساختہ لکھا ہے لگتا ہے جیسے سامنے بیٹھی باتیں کر رہی ہوں۔

عارفہ فضل شاہ...... گاؤں حمید

اتنے سالوں میں بہت کچھ بدلا مگر خواتین اور شعاع ڈائجسٹ کا ساتھ نہ چھوٹا۔ میری بڑی بہن عذرا خواتین ڈائجسٹ پڑھتی تھیں۔ جواب ہانگ کانگ میں مقیم ہیں۔ ان سے ہی مجھ میں بھی یہ شوق آیا۔ پرائمری میں تھی جب پڑھتی تھی اب ماشاء اللہ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو اور ایم اے اسلامیات کر لیا مگر خواتین اور شعاع کو تھامے ہوئے ہوں۔ گھر میں پڑھنے پہ پابندی نہیں تھی ابو پرنسپل ہیں تو ہر قسم کی کتابیں گھر میں موجود ہوتی تھیں۔ مڈل کرنے سے پہلے ہی میں اور میری بہن فاخرہ نسیم حجازی تک کو بھی پڑھ چکے تھے۔ مطالعے کا شوق پختہ ہوا اور ذخیرہ الفاظ بڑھا تو میں اپنے گاؤں کی واحد لڑکی بن گئی جس نے ایم اے اردو بغیر کسی سپلی کے کلیئر کر لیا۔ جب کہ اب تک کوئی لڑکا بھی یہ کام نہ کر سکا تھا۔ جون میں میرا افسانہ شائع ہوا تو گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ عذرا باجی کو نہیں پتا تھا

کہ میں نے افسانہ بھیجا ہوا ہے لہذا ان کے لیے تو سرپرائز تھا۔ بہت بہت خوش ہوئیں کیونکہ وہ تو مجھ سے بھی زیادہ خواتین ڈائجسٹ کی دلدادہ ہیں۔ خوب حوصلہ افزائی کی دعائیں دیں اور ساتھ ہی فرمائش بھی داغ دی کہ رائٹر بن گئی تو شاہین رشید انٹرویو لیں گی میرا بھی ذکر ضرور کرنا۔ ابو کے علاوہ میں نے سب کو افسانے کا بتایا ابو سے جھجک تھی لیکن امی نے ابو کو بتا دیا ابو بھی بہت بہت خوش ہوئے حوصلہ افزائی کی۔

ج: عارفہ! آپ کا افسانہ کھرا سکہ شامل اشاعت ہے۔ محبت کا سکہ آنچل فروری میں شامل ہو گا۔ بقیہ افسانے ابھی پڑھے نہیں۔

عارفہ، یہ درست ہے کہ لڑکیوں کو سسرال کی باتیں میکے میں نہیں کرنا چاہئیں لیکن لڑکیاں چھوٹی عمر میں بیاہ کر جاتی ہیں۔ انہیں اتنی سمجھ بوجھ نہیں ہوتی بہت سی باتوں میں انہیں رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ کس کو بتائیں ماں کو چاہیے کہ وہ سمجھ بوجھ سے کام لے اور بچیوں کو سمجھائے۔ اس کہانی میں لڑکیوں سے زیادہ ماں کے لیے بھی سبق ہے۔ بیٹیوں نے ذرا سی کوئی بات کی اور ماں انہیں سمجھانے کے بجائے پریشان ہو گئیں یا بچیوں کو مزید بھڑکا دیا تو یہ چیز نقصان دہ ہے صبر و تحمل کی بچیوں کو ہی نہیں ماں کو بھی ضرورت ہے۔

ساجدہ ظفر...... کمالیہ

عرصہ دراز سے خواتین پڑھ رہی ہوں لیکن اس کی خاموش قاری ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں شمارہ ایک دو دن میں ختم نہیں کرتی۔ بہنوں کے خطوط بہت پیارے بلکہ دلچسپ بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً گوشی جمال اور رضوانہ وقاص وغیرہ کے خطوط پڑھنے میں مزہ آتا ہے۔ ڈیرہ غازی کی ایک ڈاکٹر فریال صاحبہ تھیں ان کے خط بھی دلچسپ ہوتے تھے۔ مگر اب شمارے میں کہیں نظر نہیں آ رہیں کچھ عرصے سے، اسی طرح جڑانوالہ (فیصل آباد) کی کوثر خالد بھی تقریباً ایک سال سے غائب ہیں ان کا ضرور معلوم کریں۔ کوثر خالد صاحبہ کی نعتوں کی کتاب میرے پاس ان کی یادگار ہے۔ جو میں نے ان سے خط لکھ کر منگوائی تھی۔ اور گوشی جمال کے بارے میں کچھ کہوں...... کہیں ان کو برا نہ لگے۔ میرا اندازہ ہے، ممکن ہے وہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔

ج: پیاری ساجدہ! بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے اپنی خاموشی کو توڑا اور ہمیں خط لکھا، کوثر خالد کے بارے میں ہمیں علم نہیں انہوں نے خط لکھنا کیوں چھوڑ دیا۔ دعا ہے کہ جہاں ہوں خیریت سے ہوں۔

گوشی جمال کے بارے میں ہم نہیں جانتے کون ہیں۔ ہمارے لیے یہ بات کافی ہے کہ ان کے خط بہت دلچسپ ہوتے ہیں اور وہ ہمارے پرچے کی باقاعدہ قاری ہیں۔ آپ نے تو خود لکھا ہے کہ ان کے خط پڑھنے میں مزہ آتا ہے۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ریحانہ چوہدری...... مدو کے رندھیر باگڑیاں

سرورق دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ میری نور کو دونوں سرورق بہت پسند آئے۔

دیرینہ خواہش تھی کہ میری ڈائری سے۔ سلسلہ میں میری بھی کوئی نظم شامل ہو۔ سر بریدہ نظم دیکھ کر جو دل پہ گزری وہ کسی بھی لفظوں سے محبت کرنے والے پہ نہ گزرے۔ آپ سے محبت کی اتنی بڑی سزا۔ بہت ظلم ہے۔

آج ساری رات آپ کے ڈائجسٹ کی نذر ہوئی ہے۔ تو اب آتی ہوں تبصرے کی طرف۔ سادہ مزاج شازیہ الطاف ہاشمی سے ملاقات کر کے تو بہت ہی اچھا لگا اور ان کی اسپیڈ کہ آدھ گھنٹے میں افسانہ لکھ لیتی ہیں۔ کمال ہے۔

نسرون یہ مالا کے موتیوں کے حسن نے ہماری توجہ اپنی طرف کھینچی اور پیا ٹائز کیا۔ اس کے بعد احد، صوفیہ بٹ نے تو نظم کی حرمت کا حق ادا کر دیا ہے۔

''انگنا پھول کھلیں گے'' راحت جبیں انتہائی مہارت سے ہر کردار کو اپنے خصوصی انداز میں پیش کر رہی ہیں۔ عنبرین ابدال کے ''خوش رنگ تتلی'' نے تو رلا ہی دیا۔

شاعری میں ممتاز راشد لاہوری کی نظم کا ہر شعر متاثر کن تھا اور واصفہ جی کیا کہنے، زبردست مگر ایک

بات ہے کہ جانے والے پھر کچھ نہیں بتایا کرتے۔ سود و زیاں کے سب گوشوارے خود ہی ترتیب دینے پڑتے ہیں۔

شگفتہ جاہ آپ کی پیش کردہ حدیث مبارکہ نے تو آنکھیں ہی کھول دیں۔ ہمارے ہاں ساگ پکانے کا طریقہ بالکل مختلف ہے۔ صدف عمران نے لاہور سے جو شعر بھیجا۔ ان کی حساس طبیعت کا آئینہ دار ہے۔

شمائل حیا آپ گجرات کی ہیں تو بھئی میکے والی سائیڈ کے لوگ تو ویسے ہی پیارے لگتے ہیں۔ آپ کے مشورے بہت اچھے ہیں مگر میں تو ہمیشہ سردیوں میں عرق گلاب، گلیسرین اور لیموں کا رس، تینوں ہم وزن لے کر یعنی برابر برابر لے کر مکس کر کے استعمال کرتی ہوں۔ ان کا رزلٹ بہت ہی اچھا ہوتا ہے۔

ج: ریحانہ! جتنی برق رفتاری کے ساتھ پورا پرچا پڑھ کر آپ نے خط لکھا خواتین ڈائجسٹ سے آپ کی محبت پہ ہی نہیں آپ کی ذہانت و قابلیت پہ بھی ایمان لے آئے۔ اتنی جلد پورا پرچا پڑھ کر تبصرہ لکھنا آسان تو نہیں۔

آپ کی نظم کا ہمیں افسوس ہے۔ ہم نے اسے شعبہ شاعری کے حوالے کیا تھا۔ شاعری کی تصحیح ان ہی کا کام ہے۔

آمنہ مجاہد...... جڑانوالہ

اس لحاظ سے 2023ء سال میرے لیے یادگار رہے گا۔ جنوری میں بس یونہی بیٹھے بیٹھے بچوں کے سرما کی چھٹیوں کے کاغذات ترتیب دیتے ہوئے خیال آیا کہ خط لکھ کر رکھتی ہوں جب بھی واربرٹن جاؤں گی تو چانس ملا تو پوسٹ کر دوں گی۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ واقعی ایسا ہو بھی جائے گا۔

میں عید کے دوسرے دن واربرٹن گئی پورے چھ ماہ بعد۔ مجھے بھابھی نے جولائی کے تمام ڈائجسٹ دے دیے تھے لیکن میں 10 جولائی کو گھر واپس آنے کے لیے صبح چھ بجے بیگ سیٹ رہی تھی جب ڈائجسٹ رکھے تو نظر پڑی آخری صفحات پھٹے ہوئے تھے الفاظ کچھ دیکھے سے لگے تو غور کیا یہ تو میرا خط ہے مگر یہ کیا یہ صفحہ تو پھٹا ہوا ہے جب اگلا صفحہ دیکھا جہاں جواب تھا وہ غائب اب میرا امتحان تھا میں کتنا صبر کروں گی کیونکہ صبح صبح دکانیں بند تھیں اور میں نے گیارہ بجے والی بس پر بیٹھنا تھا سو صبر ہی کیا لیکن اس دفعہ میرا چکر کوئی دو ماہ بعد لگ گیا اور میں امی کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے دو گھنٹے کے لیے اپنے میاں کے ساتھ گئی تو جب وہ ذرا باہر نکلے میں فوراً بازار گئی جا کر مارچ کا شمارہ دو، تین دکانوں سے پتا کر کے مل ہی گیا جڑانوالہ واپس آ کر چھپ چھپ کر پہلے اپنا خط پھر جواب پڑھا بہت اچھا لگا۔ جڑانوالہ سے واربرٹن پورے ایک گھنٹے کا راستہ ہے چاہے بائیک پر جاؤ چاہے گاڑی پر یہ ننکانہ سے پندرہ منٹ کی مسافت پر ایک قصبہ ہے جہاں سہولیات زندگی کے تمام رنگ موجود ہیں۔ مجھے اپنا واربرٹن بہت عزیز ہے۔

ج: آمنہ آپ کو سالگرہ مبارک ہو اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے آمین۔

آمنہ! بہت اچھا کیا آپ نے ہمیں اپنے شہر سے متعارف کرایا۔ ہمیں اپنے پیارے پاکستان کے شہروں، قصبوں اور گاؤں کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ خصوصاً یہ جان کر کہ ہمارے گاؤں میں بھی زندگی کی تمام سہولتیں مہیا ہیں۔

خواتین اور شعاع سے آپ کی محبت ہماری محنتوں کا حاصل ہے۔ بہت شکریہ۔

اقراء کنول...... چھانگا مانگا

میں پنجم جماعت کی طالبہ تھی جب سے میں نے شعاع اور آنچل کو پڑھنا شروع کیا۔ گھر والوں کی طرف سے کافی ڈانٹ کھانے کو ملتی مگر ہم بھی چھپ چھپ کر پڑھ لیتے تھے، گریجویشن کر لیا ہے اب پڑھائی کو خدا حافظ کہہ دیا ہے۔ پڑھنے کا شوق تو شروع سے تھا مگر اب لکھنے کا بھی ہو گیا۔

ج: پیاری اقراء! آپ میں لکھنے کی صلاحیت تو ہے لیکن ابھی بہت محنت کی ضرورت ہے۔ تحریر میں ناپختگی ہے۔ فی الحال صرف مطالعہ کریں۔

عینا عمر خان...... کراچی

ہنستی ہوئی ماڈل نے مزاج پر اچھا اثر ڈالا۔ مگر کہنی سنی میں دسمبر کے مہینے کے دو ناقابل فراموش واقعات ایک بار پھر دل اداس کر گئے۔ ”کرن کرن روشنی“ سے دل منور کیا اور بھاگے ”احد“ کی طرف اور دیکھا میں نے کہا تھا نا رام لالو کولہی کا بیٹا نہیں ہے، اب گھر میں نہ کوئی کہانی پڑھنے والا اور نہ سننے والا سوائے اندازے کی درستی پر خود ہی اپنی کمر پر تھپکی دی۔ نوشین فیاض نے اچھا لکھا مگر مجھے ایسا لگا کہ یہ کہانی میں پہلے بھی پڑھ چکی ہوں یا شاید اس سے ملتی جلتی کوئی کہانی ہو گی، رابعہ پر حیرت ہوئی جو رائٹر ہو کر بھی محبت کو نہ سمجھ سکی ہم تو بغیر دیکھے شادی کر کے بھی گوڈے گوڈے محبت میں ڈوب چکے ہیں نکاح کے بولوں میں ایسی ہی طاقت ہوتی ہے اور اب فلک تنویر لے کر آئی ہیں پٹھانوں کی کہانی دل خوش ہو گیا بھئی (ہم خود جو پٹھان ہیں) جو الفاظ پشتو میں لکھے ہوتے ہیں ہمیں وہ بھی سمجھ میں آتے ہیں۔ مگر سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ وہ کیسا ڈاکو تھا جو لڑکی اغوا کرنے آیا تھا اور اس کے پاس نہ پستول تھا نہ چاقو نہ کوئی چھرا۔ گھوڑے سے گرا اور بھاگ کر جھنڈ میں چھپ گیا۔ اگر وہ اکیلا تھا تو دوران بھی اکیلا تھا تھوڑی بہت لڑائی تو کرنی چاہیے تھی مگر خیر کہانی اچھی تھی بلکہ بہت اچھی تھی۔ شازیہ جی سے ملاقات کر کے اچھا لگا بہت سادہ اور اپنی سی لگی اور تصویروں میں بالکل میری چھوٹی مامی جیسی لگ رہی تھی۔

عذیر جب ڈائجسٹ لے کر آیا میں اوپر کھڑکی سے دیکھ رہی تھی اس نے دور سے سر نفی میں ہلا دیا یعنی میری کہانی نہیں ہے ابھی ڈائجسٹ لے کر کھولا ہی تھا کہ چینا کا فون آ گیا۔ کیا کر رہی ہیں؟ اس نے پوچھا۔

کچھ نہیں ڈائجسٹ پڑھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ تو وہ بولی کہ، آپ کی دوبارہ کوئی کہانی لگی ڈائجسٹ میں۔

”نہیں دو تین کہانیاں لکھ کر بھیجی ہیں ابھی تک تو نہیں لگی بس صبر کر رہی ہوں، صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے نا۔“

”خیال کرنا باجی ہمارے صبر کے پھل میں تو کیڑے پڑ جاتے ہیں اکثر۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

(اب بتائیں بھلا ایسی بہن کے ساتھ کوئی کیا کرے)

ج: پیاری عینا! اپنی بہن کو سمجھا دیں کہانیاں اتنی جلد شائع نہیں ہو پاتیں۔ اس لیے تاخیر پر آپ کو پریشان نہ کریں۔ آپ کا خط بہت اچھا لگا۔ بہت دلچسپ ہے تعریف و تنقید سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت توجہ اور باریک بینی سے پڑھتی ہیں آپ۔

محفل میں شرکت کے لیے شکریہ۔

عروج عباس......کراچی

پلیز سرورق بھی کسی قدرتی منظر سے بھی سجائیں میری رائے تو یہ ہے کہ یہ تبدیلی بھی بڑی اٹریکٹو ہو گی۔ مدیر صاحب کی کہنی بڑے غور سے سنی اور ہمیشہ کی طرح ان کی رائے سے متفق تھے کہ واقعی کچھ زخم مدتوں بعد بھی تازہ رہتے ہیں۔ ”کرن کرن روشنی“ سے فیض اٹھایا۔

شازیہ الطاف ہاشمی صاحبہ سے ملاقات کافی دلچسپ رہی لیکن یہ کیا بات ہوئی نثر کی طرف آئیں تو شاعری چھوڑ دی، آپ شاعری بھی کرتی رہتیں اس کا ایک اپنا ہی حسن ہے۔ رمشا خان سے ملنا بھی بھایا ویسے اہم سوال اگنور کر دیا گیا۔ اور بہنوں کی محفل تو ڈائجسٹ کی جان ہے۔

”احد“ تمام تر تلخ حقیقتوں کے ساتھ بڑا ہی زبردست چل رہا ہے۔ صوفیہ بٹ کے بھائی کی رحلت کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ پاک ان کے بھائی کی مغفرت فرمائے۔ آمین

”انگنا پھول کھلیں گے“ بہت سلو چل رہا ہے اور میرے خیال میں ارم کی شادی وسیم سے نہیں ہو گی۔

”فراق موسم ٹھہر گئے“ اور ”اس کی آنکھوں کے راز“ دونوں مکمل ناول منفرد سے لگے اور نیا پن بھی محسوس ہوا۔ نوشین فیاض نے محبت کو بڑی خوب صورتی سے بیان کیا۔

ج: پیاری عروج! خواتین کی محفل میں شرکت اور تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف اور تنقید پہنچا رہے ہیں۔ آپ کی نظم شعاع میں شامل ہے۔

☆☆

موسم کے پکوان

واصفہ سہیل

میکرونی ویجی ٹیبل سوپ

ضروری اشیاء:

میکرونی	ایک کپ
بند گوبھی	ایک کپ
گاجر	ایک عدد
شملہ مرچ	ایک عدد
یخنی	چار کپ
سویا ساس	ایک کھانے کا چمچہ
ہری پیاز	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ
سفید مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
چینی	ایک چائے کا چمچہ
سرکہ	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب:

ایک دیگچی میں یخنی ڈالیں ابال آجائے تو بند گوبھی، گاجر، شملہ مرچ، ہری پیاز، نمک، سفید مرچ، چینی ڈال کر پانچ منٹ پکائیں۔ سویا ساس، سرکہ، میکرونی سوپ میں ڈالیں۔ سرونگ ڈش میں میکرونی ویجی ٹیبل سوپ نکال کر پیش کریں۔

مکھانے کا حلوہ

اجزاء:

مکھانے	ڈھائی کپ
بیسن	آدھا کپ
بادام	حسب پسند
پستہ	حسب پسند
کاجو	حسب پسند
کھویا	ایک پاؤ
گھی	ایک کپ
الائچی	سات عدد
چینی	ایک کپ
دودھ	ایک کپ

ترکیب:

ایک فرائی پان میں دھیمی آنچ پر دو سے تین منٹ کے لیے مکھانوں کو بھون لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر گرائنڈ کرلیں۔ بیسن کو بھی دھیمی آنچ پر ہلکا سا سرخ بھون لیں۔ ایک چمچہ گھی میں میوے بھون لیں۔ سب چیزوں کو تیار کرکے الگ الگ رکھ لیں۔ ایک چمچہ گھی میں کھوئے کو دو منٹ بھون کر نکال لیں آدھا کپ گھی میں پسے ہوئے مکھانے اور بیسن ڈال کر چند منٹ کے لیے بھون لیں۔ الائچی ڈالیں چینی شامل کریں چند منٹ بھونیں دودھ شامل کریں پکا ہوا کھویا میوا ڈالیں چند منٹ اور بھونیں گھی الگ ہونے لگے تو پیالے میں نکال کر میوا چھڑکیں اور چاندی کے ورق لگا کر پیش کریں۔

سونف کا پراٹھا

ضروری اشیاء

سفید آٹا	آدھا کلو
گڑ	آدھا پاؤ
انڈے	دو عدد
سونف	دو کھانے کے چمچے
گھی	حسب ضرورت
دودھ	آدھا کپ
پانی	حسب ضرورت

ترکیب:

گڑ کا شیرہ تیار کرلیں۔ آٹے میں دو کھانے کے چمچے گھی، گڑ کا شیرہ، انڈے، سونف کٹی ہوئی ملا کر اچھی طرح گوندھ لیں پھر روٹی بیل کر پراٹھا بنالیں حسب پسند گھی ڈال کر تل لیں۔

آپ کا باورچی خانہ

ام حمنہ

کچن کے حوالے سے نیا سلسلہ شروع ہوا تو ہم نے سوچا ہم بھی اس میں شرکت کریں۔

1۔ کھانا بناتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟

ج: صحت کا سب سے پہلے خیال رکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد پسند اور غذائیت بھی شامل ہو جاتی ہے۔

2۔ گھر میں اچانک مہمان آ گئے ہیں، کھانے کا وقت ہے ایسی ڈش جو جلدی تیار ہو جائے؟

ج: گھر میں اگر اچانک مہمان آ جائیں تو میں گھبراتی نہیں ہوں اور مہمانوں کو لاؤنج میں بٹھا کر باتوں کے ساتھ ساتھ کھانے کی تیاری کر لی ہوں اور جلدی سے چکن نکال کر چکن کڑھائی بنا لیتی ہوں، ساتھ ساتھ دہی بڑے بھی بنا لیتی ہوں۔

چکن کڑھائی کی ترکیب یہ ہے:

اجزاء:

چکن ایک کلو، دہی ایک پاؤ، لہسن ادرک کا پیسٹ، دو چمچہ، ٹماٹر، سات سے آٹھ عدد، کٹی مرچ دو چمچہ، ہلدی آدھا چمچہ، نمک حسب ذائقہ، ثابت دھنیا بھون کر کوٹ لیں، ایک چمچہ زیرہ سفید بھون کر کوٹ لیں، ایک چمچہ پیاز، ایک عدد میتھی، دو چمچہ۔

ترکیب: سب سے پہلے پیاز کاٹ کر لال کر لیں، پھر اس میں لہسن ادرک ڈالیں، بھون لیں۔ پھر اس میں نمک، مرچ، ہلدی، ڈال کر بھونیں اور پھر ٹماٹر ڈال کر اتنا بھونیں کہ ٹماٹر گھل جائیں۔ پھر اس میں چکن ڈال کر خوب بھونیں پھر اس میں دہی ڈال دیں، دہی کا پانی خشک ہو جائے تو اس میں کٹا دھنیا اور زیرہ ڈال دیں۔ اور خشک میتھی ڈال کر دم پر رکھ دیں مزے دار کڑھائی تیار ہے۔

3۔ کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے آپ کچن کی صفائی کے لیے خاص اہتمام کیا کرتی ہیں؟

ج: کچن کی صفائی تو روزانہ ہی ہو جاتی ہے البتہ ہفتہ میں ایک دفعہ تفصیلی صفائی بھی ہوتی ہے کیبنٹ وغیرہ کی صفائی ٹائلوں کی صفائی۔

4۔ صبح کا ناشتا بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے آپ صبح ناشتے میں کیا بناتی ہیں؟

ج: ناشتا تو ہمارے ہاں روزانہ بڑی ہڑبونگ میں ہوتا ہے بچوں کو اسکول سے دیر ہو رہی ہوتی ہے تو وہ تو ڈبل روٹی، مکھن انڈے کا ہی ناشتا کرتے ہیں ہاں میاں صاحب ہمارے ضرور ہی پراٹھا کھاتے ہیں ان کے لیے پراٹھا بچوں کا لنچ تو جناب ناشتہ تو ہمارا اتوار کو ہی اچھا بنتا ہے۔ مزے دار خستہ پراٹھے کی ترکیب حاضر ہے۔

ورقی پراٹھا

اجزاء و ترکیب:

میدہ دو کپ لے کر اس میں چمچہ گھی ڈالا اور نمک ڈال کر گوندھ کر بیس منٹ کے لیے رکھ دیا۔ پھر اس کی فلنگ کے لیے ایک انڈے کی سفیدی میں دو چمچہ گھی اور چار چمچہ میدہ ڈال کر مکس کیا۔ آٹے کے پیڑے بنا کر دس منٹ کے لیے رکھ دیے۔ پھر پیڑے کو بیل کر فلنگ ایک چمچہ لے کر روٹی پر پھیلائی اور اس کو اچھی طرح رول کر کے دس منٹ کے لیے رکھ دیا۔ پھر اس کو کڑاہی میں ڈال کر تل لیا مزے دار خستہ اور عمدہ پراٹھے تیار ہیں۔

5۔ س: گھر سے باہر کھانا فیشن بنتا جا رہا ہے آپ مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھانے جاتی ہیں؟

ج: باہر جا کر کھانا کس کو اچھا نہیں لگتا لیکن جناب جیب اجازت نہیں دیتی کہ ہر مہینے جا کر باہر کھا لیں تو جناب کبھی کبھار ہی باہر جا کر کھاتے ہیں۔

6۔ س: کھانا پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کو مد نظر رکھتی ہیں؟

ج: ضرور جی ضرور تو موسم کو دیکھ کر بھی پکاتے ہیں اور بغیر موسم کے بھی پکا لیتے ہیں۔

میں تو کہتی ہوں ہر کھانا ہی اچھا اور محنت کر کے پکایا جائے تو وہ ضرور اچھا بنے گا۔ کسی بھی کام میں اگر ہم محنت کریں گے تو اللہ ہمیں محنت کا صلہ ضرور دیں گے۔

کچن کی کوئی ٹپ؟

چینی میں چیونٹیاں آ رہی ہوں تو اس میں گرم مصالحہ کی لونگیں دس سے بارہ عدد ڈال دیں اس کی خوشبو سے چیونٹیاں نہیں آئیں گی۔

☆☆



عرشی سید...... کراچی

س: میں دس سال کی تھی تب ابو نے دوسری شادی کی تھی کیونکہ میری امی کا انتقال ہوگیا تھا۔ ابو امی میں بہت محبت تھی اور ابو نے صرف میری وجہ سے دوسری شادی کی تھی۔

میری سوتیلی امی بہت اچھی ہیں۔ مجھ سے پیار کرتی ہیں لیکن میں نے نوٹ کیا ہے کہ اب ان کا پیار کم ہوتا جارہا ہے۔ ان دس گزرے سالوں میں ان میں تبدیلی آ گئی ہے، وہ ابو سے بھی لڑتی جھگڑتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ کسی اور میں انوالو ہیں، یہ میری بیسٹ فرینڈ کا کہنا ہے اکثر سوتیلی مائیں ظالم ہوتی ہیں لیکن انہوں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا لیکن اگر وہ ابو کو چھوڑ کر کسی اور سے شادی کر لیں تو میں اور ابو تو بالکل اکیلے رہ جائیں گے۔

میں کیا کروں، ان کی چیکنگ کروں، میری فرینڈ کہتی ہے کہ تمہیں جلد ہی ان کا سچ پتا چل جائے گا، مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ میرا کوئی بہن بھائی نہیں ہے، میں اپنی امی کو دوسری بار کھونا نہیں چاہتی۔

ج: پیاری بہن! ابھی آپ کی عمر بہت چھوٹی ہے۔ آپ اتنی بڑی بڑی باتیں نہ سوچیں۔ اس طرح کے الزام کسی پر لگانا گناہ عظیم ہے۔ آپ نے وضاحت نہیں کی کہ آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے کہ وہ کسی اور میں انوالو ہیں۔ کیا آپ نے انہیں کسی کے ساتھ دیکھا ہے یا کسی کو گھر میں آتے جاتے دیکھا ہے؟ صرف ابو سے لڑائی کی بنا پر یہ اندازہ لگالینا کہ وہ کسی اور میں انوالو ہیں، ٹھیک نہیں ہے۔

لڑائی جھگڑے کی سینکڑوں وجوہات ہوسکتی ہیں۔ میاں بیوی میں جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ لڑتی جھگڑتی ہیں تو آپ کے ابو کو چھوڑ ہی جائیں گی۔

گل رخ...... ٹنڈو آدم

س: عدنان بھائی میں بہت ٹینشن میں ہوں۔ زندگی میں کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ آپ سے اس طرح سوال کروں گی۔

میں ٹیچنگ کے معزز پیشے سے منسلک ہوں سرکاری نوکری ہے۔ میری چار بہنیں مجھ سے چھوٹی ہیں۔ بڑا بھائی ڈاکٹر ہے اور وہ شادی کر کے الگ ہوگیا، دوسرا بھائی بھی ضد کر کے غیر خاندان میں اپنی منگنی کر چکا ہے۔ میری عمر اب شادی کی ہے لیکن بابا ہر رشتے کو مسترد کررہے ہیں کیونکہ ان کے دو بیٹے تو ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ میری اپنی کولیگز نے کئی رشتے ہماری برادری کے بتائے لیکن وہ کوئی نہ کوئی بات نکال کر انکار کردیتے ہیں۔

میری کولیگز کا کہنا ہے کہ تمہارے بابا تمہاری تنخواہ کی وجہ سے تمہاری شادی نہیں کرنا چاہتے۔ میری ایک بہت عزیز ساتھی نے ایک جگہ بات ڈالی ہے۔ لڑکا ہماری ذات کا ہے اور مجھے پسند بھی ہے۔ اس کی بھی سرکاری نوکری ہے لیکن گریڈ مجھ سے کم ہے۔ میری ساتھی کا کہنا ہے کہ بس تم ڈٹ جاؤ، باقی میں سب سنبھال لوں گی۔

لڑکے کو بھی ساری صورت حال کا علم ہے۔ میں جانتی ہوں کہ بابا پچھلے رشتوں کی طرح اسے بھی کوئی نہ کوئی بہانا بنا کر انکار کردیں گے، میں کیا کروں، سب کچھ اپنی کو لیگ پر چھوڑ دوں مجھے ان کے خلوص پر بھی کوئی شک نہیں میری بہنیں میرے ساتھ ہیں، چھوٹا بھائی بھی نیم رضا مند ہے پر بڑا بھائی ساری بات بابا کی مرضی پر ڈال کر الگ ہو گیا۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ بھی نہیں چاہتا کہ میں شادی کروں۔

ج: اچھی بہن! یہ آپ کے مستقبل کا مسئلہ ہے۔ عمر نکل جائے تو اچھے رشتے ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آپ اپنی دوست سے کہیں کہ وہ رشتہ لے کر آئے۔ جب رشتہ آئے تب اپنی بہنوں اور چھوٹے بھائی سے بات کریں۔ اگر وہ رشتہ سے مطمئن ہوں تو ان سے کہیں کہ وہ آپ کے والد اور بڑے بھائی سے بات کریں، انہیں سمجھائیں کہ شادی کے بعد بھی آپ اپنے والد کا خیال رکھیں گی۔ تنخواہ کا کچھ حصہ ان کو دیں گی۔ آپ کے والد ضرور مان جائیں گے۔ اور جب آپ شادی کے بعد ان کا خیال رکھیں گی تو وہ آپ سے خوش بھی ہو جائیں گے۔

شبانہ عظیم لاہور

میری شادی کو گیارہ سال ہو چکے ہیں، تین بچے ہیں سب اسکول جاتے ہیں، میری زندگی بہت مصروف ہے۔ نہ کہیں جانا نہ آنا، بس چکر بنی رہتی ہوں۔ میری ساس میرے جیٹھ کے ساتھ رہتی ہیں۔ پچھلے مہینے باتھ روم میں پھسل جانے کے باعث ان کے گھٹنے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ پلاسٹر وغیرہ ہوا اتر بھی گیا لیکن اب وہ بغیر سپورٹ کے چل پھر نہیں سکتیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ جیٹھانی صاحبہ بیمار پڑ گئیں، اب یہ بہانا ہے یا سچ، بہر حال ساس صاحبہ میری ذمہ داری بن گئی ہیں۔ سو کام ہوتے ہیں ان کے، اوپر سے میرے بچوں کی ذمہ داری الگ، اس قدر کی چڑ آئی ہے کہ میں دن میں کئی بار جل کر رو پڑتی ہوں۔ میاں جی سے کہوں تو ان کی نصیحتیں، آخر میں کیا کروں، جی چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر کہیں ویرانے میں جا کر بیٹھ جاؤں۔

ج: عزیز بہن! یہ ہر اس گھر کا مسئلہ ہے جہاں بزرگ خواتین یا مرد رہتے ہیں۔ بڑھاپے میں اس طرح آزار عام بات ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کی دیکھ بھال آسان کام نہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنے والدین یا بہن بھائیوں کو نکال کر نہیں پھینکا جا سکتا۔ یہ مجبوری ہے لیکن اگر آپ اس کو اللہ کی خوشنودی کی نیت سے خوش دلی کے ساتھ کریں گی تو دین و دنیا میں اس کا اجر ملے گا ورنہ کرنا تو ویسے بھی پڑے گا لیکن ناگواری سے کرنے کی صورت میں نہ تو اجر ملے گا اور نہ ہی آپ کی ساس خوش ہوں گی اور شوہر کو بھی برا لگے گا۔

ایک صورت یہ ہے کہ آپ ان کو وہیل چیئر لے دیں۔ وہ وہیل چیئر پر واش روم خود جا سکتی ہیں۔ آپ کی ذمہ داری آدھی رہ جائے گی کیونکہ پانچ ٹائم وضو کرانا اور واش روم لے جانے کا کام آپ کو نہیں کرنا پڑے گا۔ آپ کی ذمہ داری صرف کھانا دینے کی ہو گی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر آپ کی استطاعت ہو تو ملازمہ رکھ لیں۔

تیسری صورت یہ ہے کہ یہ آپ کی اور آپ کی جیٹھانی کی مشترکہ ذمہ داری ہے، آپ ان سے طے کر لیں کہ ساس تین ماہ آپ کے ہاں رہیں گی اور تین ماہ وہ رکھیں گی۔

لیکن ایک بات ذہن میں ضرور رکھیں کہ کوئی نہیں جانتا کل کیا ہونا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل یہ صورت آپ کو پیش آجائے تو آپ کیا کریں گی؟

☆☆

امت الصبور

بیوٹی بکس

نورین فصیح ...... جہانگیر روڈ

س: باجی میرے ہاتھ اور کہنیوں کا رنگ بہت کالا ہے کوئی گھریلو نسخہ بتا دیں؟

ج: کھیرے کے اندر بلیچنگ خصوصیات ہوتی ہیں۔ یہ ہاتھوں اور کہنیوں کی رنگت کو صاف کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے لیے کھیرے کے سلائس کاٹ لیں ان کو ہاتھوں اور کہنیوں پر پندرہ منٹ تک رگڑیں اور اس کے بعد سادہ۔ پانی سے دھولیں۔ اس کے علاوہ کھیرے کے رس میں لیموں ملا لیں۔ اور ہاتھوں، کہنیوں پر مل لیں اس سے بھی سیاہی دور ہو جاتی ہے۔

ایک لیموں لیں، اس کو درمیان سے کاٹ لیں اس کے اوپر تھوڑا سا کھانے کا سوڈا چھڑک لیں۔ اب اس کو ہاتھوں اور کہنیوں کے سیاہ حصوں پر رگڑیں۔ یہ عمل آپ ہفتے میں دو بار کر سکتی ہیں۔

آپ رات کو ایلو ویرا جیل اور دودھ ہم وزن ملا کر لگا لیں اور صبح اٹھ کر دھولیں۔ یہ جلد کو نکھارتا ہے نرم اور ہموار بھی بناتا ہے۔ یہ ہربل طریقہ آپ کی عمر کے لحاظ سے بہترین حل ہے۔

شانزہ گل - پشاور

س: میری عمر بیس سال ہے۔ سردیوں میں میری جلد کا رنگ سنولا جاتا ہے میری جلد نارمل ہے۔ گرمیوں میں یا عام موسم میں میری رنگت اچھی خاصی صاف نظر آتی ہے میں بہت پریشان ہوں؟

ج: پیاری بہن سردیوں کے موسم میں بہت سے لوگ بد احتیاطی کرتے ہیں اور نہانے اور منہ دھونے کے لیے بہت تیز گرم پانی کا استعمال کرتے ہیں، صرف یہ ہی نہیں بلکہ گرم پانی سے نہانے کا دورانیہ بھی بڑھا دیتے ہیں۔ ایک عام انسان کی جلد کے لیے تیز گرم پانی کا استعمال جلد کے مسائل کا باعث بن سکتا ہے آپ کی رنگت اسی لیے سنولا جاتی ہے۔

بہت سی خواتین باہر جاتے ہوئے سن بلاک کے بجائے کولڈ کریمز کا خوب استعمال کرتی ہیں۔ اس سے بھی رنگت پر اثر پڑتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ نیم گرم پانی کا استعمال کریں۔ خاص طور پر گھر سے باہر نکلتے ہوئے کولڈ کریم، پٹرولیم جیلی، ویسلین یا گلیسرین وغیرہ کا استعمال نہ کریں بلکہ سن بلاک یا قدرتی اجزاء مثلاً ایلو ویرا، عرق گلاب یا دودھ کی بالائی کا استعمال کریں۔

نہانے کا دورانیہ دس منٹ سے زیادہ نہ کریں۔

رنگت کو بہتر کرنے کے لیے دن میں دہی میں چٹکی بھر ہلدی اور دو قطرے بادام کا تیل اچھی طرح مکس کر کے چہرے پر لگائیں پندرہ منٹ بعد نیم گرم پانی سے چہرہ دھولیں۔

نوشابہ سلیم ...... راولپنڈی

س: میرے سر میں بہت زیادہ خشکی ہو رہی ہے میں نے بہت علاج کروایا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا پلیز مجھے آپ کوئی مشورہ دیں؟

ج: میتھی دانہ بالوں کے لیے بہترین ہے اس کے بیج سر کی خشکی کو کم کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس میں اینٹی بیکٹیریل اور اینٹی انفیکشن خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔ میتھی دانہ بالوں کو مضبوط کرتا ہے اور لمبائی میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ دو کھانے کے چمچے میتھی دانہ رات کو ایک کپ پانی میں بھگو کر رکھ دیں۔ صبح اس کو پیس لیں، اس پیسٹ میں ایک کپ سیب کا سرکہ شامل کر کے سارے بالوں اور سر کی جلد پر لگائیں آدھے گھنٹے بعد شیمپو سے دھولیں۔

اسپرین بھی خشکی بھگانے کے لیے بہترین ہے اور بہت تیزی سے اثر کرتی ہے، اسپرین کی دو گولیاں لے کر پیس لیں۔ اور نارمل شیمپو میں مکس کر کے بالوں کو گیلا کر کے پانچ منٹ تک بالوں میں لگائیں اس کے بعد پانی سے دھولیں۔

☆☆



خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
فروری 2024
www.pklibrary.com
www.pklibrary.com

خواتین ڈائجسٹ

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

واٹس ایپ 03172266944

بانی ——— محمود ریاض

مدیرِ اعلیٰ ——— آذر ریاض

مدیرہ ——— نادرہ خاتون

نائب مدیرہ ——— رضیہ جمیل

مدیر خصوصی ——— امت الصبور
بلقیس بھٹی

نفسیات ——— عدنان

قانونی مشیر ——— نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

فروری 2024
جلد 51 شمارہ 10
قیمت 150 روپے

خط و کتابت کا پتہ
خواتین ڈائجسٹ
37- اردو بازار کراچی

افسانے

نظمیں غزلیں

پکوان

رنگا رنگ پھول

میری بیاض سے

نفسیات

بیوٹی بکس



خواتین ڈائجسٹ فروری کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

لاکھوں سال پرانی دنیا ایک عجوبہ ہے۔ ایک طلسم کدہ ہے۔ جسے دیکھنے کا، ہر انسان کا زاویہ نگاہ اور سوچ مختلف ہے۔ انسان نے اس دنیا میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔ حیرت کی حدوں کو چھوتی ترقی کی ہے۔ لیکن بلند وبالا پہاڑوں کی چوٹیوں کو سر کرنے والا چاند ستاروں پر کمندیں ڈالنے والا انسان اس دنیا میں رہنے کا سلیقہ نہ سیکھ سکا۔ روز ازل سے آج تک وہ اپنی بشری کمزوریوں پر قابو نہ پاسکا۔ آج بھی اسے اختیار اور اقتدار مل جائے تو وہ اپنے جیسے کمزور انسانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے پر تل جاتا ہے۔ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ اسے جو کچھ ملا ہے۔ اس کی مدت بہت مختصر ہے۔ دنیا میں اس کا قیام عارضی ہے۔ دنیا میں وہ ایک خاص مقصد کے لیے بھیجا گیا ہے۔

وطن عزیز ایک بار پھر فیصلہ کن موڑ پر ہے۔ ایک بہت اہم مرحلہ سر ہونے جا رہا ہے۔ فیصلہ کیا ہونا ہے یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ ہار جیت، کمال اور زوال اسی کی عطا ہیں۔ بات بس اتنی ہے کہ کمال ہو یا زوال ہمارا سر عجز سے جھکا رہے کہ ہار، جیت زندگی نہیں، زندگی کا حصہ ہے نہ جیت بھی حتمی ہوتی ہے نہ ہار دائمی، جیت ہار میں بدل سکتی ہے۔ اور ہارنے والا جیت بھی سکتا ہے۔

ایک خوش حال اور باوقار زندگی ہم سب کا حق ہے۔ ایک خوش حال معاشرے کی تعمیر میں آپ کا کردار بہت اہم ہے۔ پوری ذمہ داری سے اپنا کردار ادا کریں۔ زندگی سے آپ کی توقعات پوری نہ ہوں تو دل برداشتہ نہ ہوں۔ ہمت اور حوصلہ کے ساتھ امید کا دامن تھامے رکھیں اور دعا کرتی رہیں کہ آنے والا وقت ہمارے لیے بہتری لے کر آئے۔

سالگرہ نمبر

خواتین ڈائجسٹ کا ایک اور سال مکمل ہونے والا ہے۔ اپریل کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ مصنفین سے درخواست ہے کہ اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تا کہ سالگرہ نمبر میں شامل ہو سکیں۔

اس شمارے میں

☆ نمرہ احمد کا مکمل ناول......مالا
☆ صوفیہ بٹ کا مکمل ناول......احد
☆ آسیہ رئیس خان کا مکمل ناول......رفاقتیں
☆ دل کا آنگن سونا ہے......حمیرا شفیع کا ناولٹ
☆ انگنا پھول کھلیں گے......راحت جبیں کا ناول
☆ راشدہ رفعت، صائمہ نور، عمارہ امداد، عنبرین ابدال اور جویریہ مریم کے افسانے
☆ آپ کی پسندیدہ مصنفہ نگہت سیما سے ملاقات
☆ باتیں احمد رفیق سے
☆ کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔
قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابو داؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

نماز سے گناہوں کی معافی

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث سنتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے جو فائدہ دینا ہوتا، دے دیتا اور جب مجھے کوئی اور آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سناتا تو میں اس سے قسم لیتا۔ اگر وہ قسم کھاتا تو میں اس پر اعتبار کر لیتا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھے حدیث سنائی اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سچ فرمایا۔ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو بھی شخص کوئی گناہ کر لیتا ہے، پھر اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھتا ہے اور اللہ سے بخشش مانگتا ہے تو اللہ اسے ضرور بخش دیتا ہے۔" (ابو داؤد)

فوائد و مسائل: 1۔ حدیث نبوی قبول کرنے میں احتیاط اور صحیح غلط میں امتیاز کا عمل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے شروع ہوا ہے۔

2۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس لیے قسم نہیں لیتے تھے کہ انہیں صحابہ کی روایت پر یقین نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے لوگ حدیث کی اہمیت کو محسوس کریں، اور وہی حدیث بیان کریں جو انہیں خوب اچھی طرح یاد ہو، اس کے علاوہ یہ فائدہ بھی پیش نظر تھا کہ اگر وہ حدیث کسی کو سنائیں تو پورے اعتماد سے سنائیں کہ حدیث صحیح ہے۔

3۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صداقت پر اتنا یقین تھا کہ ان کی سنائی ہوئی حدیث بے چوں و چرا تسلیم کر لیتے تھے۔

4۔ وضو اور نماز گناہوں کی معافی کا ذریعہ ہیں۔

5۔ نماز کے باوجود دل میں نادم ہوتے ہوئے اللہ سے مغفرت کی دعا کرنا ضروری ہے، البتہ بعض چھوٹے گناہ صرف وضو سے یا صرف نماز سے بھی معاف ہو جاتے ہیں۔

نماز پڑھنا

حضرت عاصم بن سفیان ثقفی رحمتہ اللہ سے روایت ہے کہ مسلمانوں نے ذات سلاسل کی جنگ کی لیکن یہ لوگ (عاصم اور ان کے کچھ ساتھی) جنگ میں شریک نہ ہو سکے۔ (بعد میں پہنچے، چنانچہ) وہ لوگ (کچھ عرصہ) محاذ پر مورچہ زن رہے (لیکن دوبارہ جنگ کی نوبت نہیں آئی تو) پھر وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس واپس آ گئے۔ اس وقت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں حضرت ابو ایوب اور حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ عاصم رحمتہ اللہ نے کہا۔

''ابو ایوب! ہم تو اس سال جہاد سے محروم رہ گئے۔ ہمیں بتایا گیا کہ جو شخص چار مسجدوں میں نماز پڑھے، اس کا گناہ بخش دیا جاتا ہے۔''

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ''بھتیجے! میں تجھے اس سے آسان عمل بتاتا ہوں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرما رہے تھے، جو شخص وضو کرے جس طرح حکم دیا گیا ہے اور نماز اس طرح پڑھے جس طرح حکم دیا گیا ہے تو اس کے گزشتہ عمل معاف ہو جائیں گے۔'' عقبہ! کیا یہ حدیث اسی طرح ہے؟ انہوں نے کہا ہاں (اسی طرح ہے۔)'' (مسند احمد)

فوائد و مسائل: 1۔ ایک غزوہ ذات سلاسل ۸ھ میں فتح مکہ سے پہلے ہوا تھا۔ یہ اور جنگ ہے جو ذات سلاسل کے نام سے مشہور ہے۔ یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں واقع ہوئی۔

2۔ ''سلاسل'' کا مطلب ریت کے ٹیلوں کا سلسلہ ہے۔ یہ دونوں جنگیں صحرائی علاقے میں واقع ہونے کی وجہ سے ذات سلاسل کے نام سے معروف ہوئیں۔

3۔ حضرت عاصم رحمتہ اللہ کا جنگ میں شریک نہ ہونا گناہ نہیں تھا کیونکہ ہر جہاد میں کچھ مجاہد شریک ہوتے ہیں، کچھ ہنگامی حالات کے لیے یا کسی اور جنگ میں شریک ہونے کے لیے یا دوسرے فرائض انجام دینے کے لیے پیچھے رہتے ہیں۔ اس جنگ میں حضرت عاصم رحمتہ اللہ کا پیچھے رہ جانا شاید ان کی کسی کوتاہی کی وجہ سے پیش آیا ہوگا کہ وہ ارادہ رکھنے کے باوجود شریک نہ ہو سکے ہوں گے، اس لیے انہوں نے اپنا ایک گناہ شمار کیا۔

4۔ چار مساجد سے مراد مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد اقصیٰ اور مسجد قبا ہیں جن کی زیارت کے لیے جانے کی ترغیب احادیث میں مروی ہے۔

5۔ حکم کے مطابق وضو اور نماز سے مراد اچھی طرح آداب و سنن کو ملحوظ رکھتے ہوئے وضو کرنا اور نماز پڑھنا اور نماز میں توجہ اور خشوع و خضوع کا اہتمام کرنا ہے، یعنی بہترین انداز سے وضو کر کے بہترین انداز سے نماز ادا کی جائے۔

6۔ سنت کے مطابق وضو اور نماز اتنا بڑا عمل ہے کہ اس سے بعض بڑے گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔

گناہوں سے معافی

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''بھلا بتاؤ! اگر کسی کے گھر کے سامنے (صاف پانی کا) ایک دریا بہتا ہوا، وہ اس میں روزانہ پانچ بار غسل کرے تو اس (کے جسم) پر کتنی میل باقی رہ جائے گی؟''

حاضرین نے کہا ''بالکل نہیں رہے گی۔'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''نماز گناہوں کو اسی طرح ختم کر دیتی ہے، جس طرح پانی سے میل کچیل ختم ہو جاتی ہے۔''

فوائد و مسائل: 1۔ مسنون وضو اور نماز سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

2۔ شرعی مسئلہ مثالیں دے کر بیان کرنے سے

زیادہ سمجھ میں آتا ہے اور زیادہ یاد رہتا ہے۔ دوسرے علمی مسائل کی بھی یہی کیفیت ہے۔

نماز قائم کرنا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کسی عورت سے زنا سے کم تر ناجائز حرکت کی۔ یہ تو معلوم نہیں کہ اس نے کس حد تک غلطی کی، تاہم زنا نہیں کیا، پھر وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ بات عرض کی۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کردی۔

"دن کے کناروں میں بھی نماز قائم کیجیے اور رات کی گھڑیوں میں بھی، یقیناً نیکیاں برائیوں کو دور کردیتی ہیں۔ یہ نصیحت ہے نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے۔" (سورہ ہود: 114)

صحابی نے کہا "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا یہ (رعایت) صرف میرے لیے ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو بھی اس پر عمل کرے، اس کے لیے ہے۔"

فوائد و مسائل: 1۔ مرد کا کسی عورت کو اور عورت کا کسی مرد کو گناہ آلود نظر سے دیکھنا، چھونا اور بوس و کنار وغیرہ کرنا یہ سب گناہ کے کام ہیں اور حدیث میں انہیں بھی "زنا" قرار دیا گیا ہے، تاہم یہ بدفعلی سے کم درجے کے گناہ ہیں، اس لیے جب کوئی شخص ایسی حرکت کا ارتکاب کر کے دل میں نادم ہو، توبہ کرے اور وضو کر کے نماز پڑھ لے تو اس کا گناہ معاف ہو جائے گا، البتہ ناجائز جنسی عمل کے ارتکاب پر حد کا نفاذ ضروری ہے، حد لگ جانے سے وہ بھی معاف ہو جاتا ہے۔

2۔ مومن کے دل میں اللہ کا خوف ہونا چاہیے۔ اگر نفس امارہ اور شیطان کے غلبے سے غلطی ہو جائے تو فوراً اس کے ازالہ اور معافی کی فکر ہونی چاہیے۔

3۔ دن کے کناروں کی نمازیں فجر اور عصر کی ہیں جن کے درمیان ظہر کی نماز آجاتی ہے اور رات کی نمازیں مغرب اور عشاء ہیں، یعنی نماز پنجگانہ کی ادائیگی گناہوں کی معافی کا باعث ہے۔

پانچ نمازوں کی فرضیت اور محافظ کا بیان

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ نے میری امت پر پچاس نمازیں فرض کیں۔ میں یہ حکم لے کر واپس آیا حتیٰ کہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچا۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

1۔ آپ کے رب نے آپ کی امت پر کیا فرض کیا ہے؟ میں نے کہا: "اس نے مجھ پر پچاس نمازیں فرض کی ہیں۔" انہوں نے فرمایا: "اپنے رب کے پاس واپس جائیے کیونکہ آپ کی امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔" میں دوبارہ اپنے رب کی طرف گیا تو اس نے نصف نمازیں معاف فرمادیں۔ میں پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور انہیں بتایا۔ انہوں نے فرمایا "اپنے رب کے پاس واپس جائیے کیونکہ آپ کی امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔" میں پھر اپنے رب کی طرف گیا تو اس نے فرمایا "یہ (ادا کرنے میں) پانچ ہیں اور یہی (ثواب میں) پچاس ہیں۔ میرا فرمان تبدیل نہیں ہوتا۔" میں پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا۔ انہوں نے فرمایا: "اپنے رب کے پاس واپس جائیے۔" میں نے کہا "مجھے اپنے رب سے شرم محسوس ہوتی ہے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل: 1۔ یہ حدیث واقعہ معراج کا ایک حصہ بیان کرتی ہے۔

2۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو فرمایا کہ آپ کی امت زیادہ نمازیں پڑھنے کی طاقت نہیں رکھتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں بنی اسرائیل سے اس قسم کا تجربہ ہوا تھا کہ بنی اسرائیل نے اللہ کے حکم کے مطابق نمازیں ادا کرنے میں کوتاہی کی تھی۔ (صحیح مسلم، حدیث: 162)

3۔ پچاس نمازوں کا حکم تبدیل کر کے پانچ

کر دینا اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت ہے اور مسلمانوں پر اللہ کا احسان عظیم ہے۔ اس احسان کا شکر صرف اسی طرح ادا کیا جاسکتا ہے کہ پانچوں نمازیں پابندی سے اور پورے آداب کا لحاظ رکھ کر بروقت ادا کی جائیں۔

4۔ پانچ نمازوں کو پچاس قرار دے کر فرمایا کہ میرا فرمان تبدیل نہیں ہوتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ خود اسی کا قانون ہے کہ صحیح انداز سے خلوص کے ساتھ ادا کی ہوئی نیکی کا ثواب کم از کم دس گنا لکھا جاتا ہے۔ ارشاد باری ہے۔

"جو نیکی لے کر حاضر ہوا، اس کا دس گنا (بدلہ) ملے گا۔" (الانعام، ۱۶۰)

5۔ آخری بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید تخفیف کی درخواست کرنے سے اجتناب فرمایا، کیونکہ پانچ پر پچاس کے ثواب کی خوشخبری میں یہ ارشاد تھا کہ اب مزید تخفیف نہیں کی جائے گی۔

عہد

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ نے فرمایا۔

"پانچ نمازیں ہیں جو اللہ نے اپنے بندوں پر فرض کی ہیں تو جو شخص انہیں اس طرح لے کر حاضر ہوا کہ ان کے حق کو غیر اہم سمجھ کر ان میں کمی نہ کی ہو تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس سے وعدہ فرمائے گا کہ اسے جنت میں داخل کردے گا اور جو انہیں اس طرح لے کر آیا کہ ان کے حق کو اہمیت نہ دیتے ہوئے ان میں کمی کی (پوری نمازیں ادا نہ کیں) تو اسے اللہ کے ہاں کوئی عہد حاصل نہیں ہوگا، (اللہ کی مرضی ہے) چاہے اسے عذاب دے، چاہے بخش دے۔" (ابوداؤد)

فوائد ومسائل: 1۔ صرف پانچ نمازیں فرض ہیں۔ باقی سب نفل ہیں لیکن بعض نمازوں کی تاکید زیادہ ہے بعض کی کم، تاہم ان کی ادائیگی میں بھی کوتاہی کرنا جائز نہیں کیونکہ فرضوں کی کمی نوافل سے پوری ہوگی۔

2۔ کمی کرنے سے مراد بعض نمازیں ترک کردینا نماز کی ادائیگی کے دوران میں خشوع وخضوع وغیرہ کا خیال نہ رکھنا ہے۔

3۔ دین کے فرائض کو کما حقہ اہمیت نہ دینا اللہ کی رضا سے محرومی کا باعث ہے۔

4۔ نماز صحیح طریقے اور پابندی سے ادا کرنے والا یقیناً جنت میں جائے گا اگرچہ بعض گناہوں کی وجہ سے کچھ وقت کے لیے جہنم میں بھی بھیج دیا جائے گا۔

5۔ نماز کو اہمیت نہ دینا مغفرت سے محرومی کا باعث بن سکتا ہے، اس لیے ترک نماز کو کفر قرار دیا گیا ہے کہ جس طرح کافر جنت میں نہیں جاسکتا، اسی طرح بے نمازی بھی عذاب کا مستحق ہوگا۔

اسلام

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہ انہوں نے فرمایا: ہم مسجد میں بیٹھے تھے کہ اسی اثناء میں ایک آدمی اونٹ پر سوار ہوکر مسجد میں داخل ہوا۔ اس نے مسجد میں اونٹ بٹھایا، اس کا گھٹنا باندھا، پھر کہا۔ "آپ لوگوں میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی مجلس میں ٹیک لگائے تشریف فرما تھے۔ انہوں نے کہا۔ "یہ سفید فام جو ٹیک لگا کر تشریف فرما ہیں۔"

اس آدمی نے کہا "عبدالمطلب کے بیٹے!" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "(بات کرو) جواب دے رہا ہوں۔"

اس آدمی نے کہا: "اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں آپ سے کچھ دریافت کروں گا اور سوال میں سختی ہوگی، آپ دل میں (ناراضی) محسوس نہ کیجیے گا۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو چاہو پوچھ لو۔" آدمی نے کہا "آپ کو آپ کے رب کی اور آپ سے پہلے لوگوں کے رب کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا آپ کو اللہ نے سب لوگوں کی طرف بھیجا ہے؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اللہ گواہ ہے، ہاں (یہی بات ہے۔)“

اس نے کہا ”میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، کیا اللہ نے آپ کو رات دن میں پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم دیا ہے؟“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اللہ گواہ ہے، ہاں (ایسا ہی ہے)“

اس نے کہا ”میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا آپ کو اللہ نے سال میں اس مہینے (رمضان) کے روزے رکھنے کا حکم دیا ہے؟“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اللہ گواہ ہے، ہاں۔“

اس نے کہا ”میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے دولت مندوں سے یہ صدقہ (زکاۃ) لے کر ہمارے غریبوں میں تقسیم فرمائیں؟“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اللہ گواہ ہے، ہاں“

اس شخص نے کہا:

”میں آپ کی لائی ہوئی (شریعت) پر ایمان لے آیا ہوں اور میں اسے پیچھے اپنی قوم کے افراد کی طرف سے پیغام رساں بن کر آیا ہوں۔ میں بنوسعد بن بکر (قبیلہ) کا ایک فرد ضمام بن ثعلبہ ہوں۔“ (صحیح بخاری)

فوائد ومسائل: 1۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسجد سادہ اور کچی تھی، اس لیے اونٹ وغیرہ کے آنے سے منع نہیں کیا گیا۔ ممکن ہے اونٹوں کے بٹھانے کے لیے جگہ مخصوص ہو۔ اس بنا پر آج کل مسجد کے ساتھ سائیکلوں، اسکوٹروں اور گاڑیوں وغیرہ کے لیے جگہ خاص کی جاسکتی ہے۔

2۔ مجلس میں معزز شخصیت کے لیے نمایاں نشست مخصوص کی جاسکتی ہے تاکہ آنے والے اجنبیوں کو پہچاننے میں مشکل نہ ہو۔

3۔ اگر سائل سوال کرتے ہوئے ادب واحترام کا مناسب خیال نہ رکھ سکے تو عالم کو چاہیے کہ ناراضی محسوس نہ کرے۔

4۔ ایک راوی کی روایت (خبر واحد) قابل قبول ہے جب کہ وہ راوی قابل اعتماد (ثقہ) ہو۔

5۔ عالم کے پاس سفر کر کے جانا اور اس سے مسائل کی تحقیق کرنا مستحسن ہے۔

6۔ نازل سند کے ساتھ حدیث معلوم ہو تو عالی سند حاصل کرنے کی کوشش کرنا اچھی بات ہے۔

7 قرات علی الشیخ بھی حصول علم کا ایک درست طریقہ ہے۔

8۔ جب قوم کسی فرد کو اپنا نمائندہ منتخب کرلے تو پھر اس کی کارروائی پر اعتماد کرنا چاہیے، الا یہ کہ اس سے واضح غلطی سرزد ہو جائے۔

افضل

”میری اس مسجد میں ایک نماز مسجد حرام کے سوا، دوسری مسجدوں میں پڑھی جانے والی ہزاروں نمازوں سے افضل ہے۔“ (مسلم)

فائدہ: 1۔ ”میری اس مسجد“ سے مراد مسجد نبوی کا صرف وہ حصہ نہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مسجد میں شامل تھا بلکہ اس میں ہونے والے بعد کے تمام اضافے بھی شامل ہیں کیونکہ ان اضافوں کی حیثیت الگ مسجد کی نہیں، اس لیے مسجد نبوی کے پرانے یا نئے جس حصے میں بھی نماز ادا کی جائے، یہ ثواب حاصل ہو جائے گا، البتہ اگلی صفوں کی افضلیت جس طرح دوسری مساجد میں ہے، وہاں بھی ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

2۔ مسجد نبوی کی ایک نماز ہزار نمازوں کے برابر نہیں، بلکہ ہزار نمازوں سے بہتر ہے، اسی طرح مسجد حرام کی ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر نہیں بلکہ ان سے بھی افضل ہے، تاہم خشوع وخضوع، آداب وارکان کے لحاظ اور توجہ وانابت وغیرہ کی کمی بیشی کی بنا پر اس ثواب میں بھی کمی بیشی ہوسکتی ہے۔

☆☆

آپ خیریت سے ہیں

انشا جی

ایک شخص کے پاؤں کے انگوٹھے پر ایک گومڑ نکل آیا تھا۔ کسی نے کہا اسپتال جا کر اسے کٹوا دو۔ معمولی سا آپریشن ہوگا۔ پس وہ اسپتال چلا گیا۔ آپریشن کے لیے اس کو بے ہوش کرنے کی دوا دی گئی۔ جس سے اس کو دل کا دورہ پڑ گیا۔ اسے آکسیجن ٹینٹ میں رکھا گیا۔ جس میں ہڈیوں کی سوزش کے جراثیم پہلے سے موجود تھے۔ چنانچہ اسے وہ بیماری لگ گئی۔ اسے اسٹریچر پر لے جا رہے تھے کہ اسٹریچر الٹ گیا۔ جس سے اس کی ٹانگ اور ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی اور اس ضرب سے اس کو دل کا ایک اور دورہ پڑ گیا۔ دم تحریر وہ اس عالم میں ہے کہ اس کے ایک نلکی سانس لینے کے لیے لگی ہے، ایک نلکی پیشاب خارج کرنے کے لیے۔ ٹانگ پلاسٹر میں جکڑی ہے۔ اور بازو پٹی میں بندھا گلے کا ہار ہو رہا ہے۔ اب رہا وہ گومڑ۔ اسے سب بھول گئے ہیں۔ وہ جہاں تھا، وہیں ہے۔

یہ خبر ارجنٹائن کی ہے اور کسی کے بارے میں ہے۔ لیکن یہ یہاں کی بھی ہو سکتی تھی اور ہم خوش قسمت نہ ہوتے تو ہمارے بارے میں بھی ہو سکتی تھی کیونکہ اپنی ٹانگ کو لیے ہم ایک مقامی اسپتال میں بھی ہو آئے ہیں۔ جہاں ہر کوئی ہر کسی سے شاکی تھا۔ زیادہ تفصیل میں اس لیے نہیں جاتے کہ ہمیں تجربے نے بتا دیا ہے کہ کبھی اسپتالوں کے بارے میں نہیں لکھنا چاہیے۔ کبھی پولیس اور تھانے کے بارے میں نہیں لکھنا چاہیے۔ کسی حاکم وقت کے بارے میں نہیں لکھنا چاہیے بلکہ جیسا کہ قدرت اللہ شہاب کے مشہور افسانے ”رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔“ میں ہے، کسی پٹواری کے بارے میں بھی لکھنے کی حماقت نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ ہر پھر کر واسطہ ان ہی لوگوں سے پڑتا ہوتا ہے۔ شہاب صاحب کے سائل نے جس کی زمین پٹواری نے کسی اور کے کھاتے میں ڈال دی تھی۔ شکایت تو گورنر کے نام بھیجی تھی، انہوں نے اپنے سیکریٹری کو برائے ضروری کارروائی بھیج دی۔ سیکریٹری نے کمشنر کو، کمشنر نے ڈپٹی کمشنر کو، ڈپٹی کمشنر نے تحصیل دار کو اور تحصیل دار نے اسی پٹواری کو منتقل کر دی کہ اس پر ”ضروری کارروائی کی جائے۔“

پٹواری نے درخواست دہندہ کو بلایا۔ ایک جوتا لگاتا تھا اور درخواست دکھاتا تھا کہ اور دے درخواست گورنر کو۔ بڑا آیا ہماری شکایتیں کرنے والا۔ اس ضروری کارروائی کے بعد درخواست یہ لکھ کر گورنر صاحب کو لوٹا دی کہ مناسب تحقیق کی گئی۔ مدعی جھوٹا ہے۔ جھوٹی درخواستیں دینے کا عادی ہے۔ شکایت داخل دفتر کی جائے۔

☆☆☆

ہم کوئی دس دن سے اپنی ٹانگ سمیت بستر پر پڑے ہیں۔ ہمارے دوست ڈاکٹر منیر الحق ہمیں دیکھ جاتے ہیں اور دلاسا دیتے ہیں کہ چند روز اور میری جان، فقط چند ہی روز۔ انہوں نے نصیحت بھی کی کہ پرائے پھٹے میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے۔ ہم نے کہا ڈاکٹر صاحب ہم نے نہیں اڑائی۔ لیکن اگر پرایا پھڈا خود آ کر ہماری ٹانگ میں اڑ جائے تو کیا کر سکتے ہیں۔

ایک اور دوست نے فرمایا کہ یہ جو تم دعوے کرتے پھرتے ہو کہ تم کو دولت مل رہی تھی، تم نے اس پر لات مار دی، کوئی بڑا عہدہ مل رہا تھا، اس پر لات مار دی۔ تو ایسے کاموں کا تو یہی نتیجہ ہوتا ہے۔

ہم نے کہا، نہیں صاحب یہ بات نہیں، زبان سے کہنے کی بات اور ہے۔ ہم عزت، شہرت یا عہدے پر لات مارنے والے آدمی نہیں ہیں۔ بات فقط اتنی ہے کہ 31 جنوری کو ریڈیو پاکستان کے سامنے ٹیکسی لینے کے لیے ہم سڑک پار کر رہے تھے کہ غلط سائڈ سے آ کر ٹیلی فون کے محکمے کی ایک جیپ

نے ہمیں ٹکر ماردی اور دور اچھال دیا۔ رپورٹ ہم نے اس لیے نہیں کی کہ اس مقام پر جہاں پانچ طرف سے ٹریفک آتا ہے اور سڑک عبور کرنے میں پندرہ منٹ لگتے ہیں۔ نہ کوئی زیبرا کراسنگ ہے، نہ کوئی ٹریفک کا آدمی ہوتا ہے۔ ہوتا بھی تو رپورٹ کا کچھ مقام نہ تھا۔ قصور ہمارا تھا۔ ہم کیوں گھر سے باہر نکلتے ہیں۔ الٹا ہم نے جیپ والے کا شکریہ ادا کیا کہ ہمیں زندہ رہنے دیا۔ خبر اس واردات کی اس لیے کسی کو نہ ہوئی کہ ہمارے شہر میں اگر کوئی گاڑی کسی کو ٹکر مار دے تو یہ خبر نہیں ہے۔ ہاں کوئی آدمی کسی گاڑی کو ٹکر مارے تو خبر بنتی ہے۔

☆☆☆

عباسی شہید اسپتال بہت بڑا عالی شان اسپتال ہے۔ وہاں کے ڈاکٹروں نے ہمیں پہچان کر ہماری طرف خاطر خواہ توجہ دی۔ لیکن اسپتال صرف سنگ و خشت نہیں ہوتا۔ ایکسرے کرنے والا آدمی پون گھنٹے کی تلاش کے بعد ملا اور ملا تو ہم سے ایمرجنسی کی فیس چارج کی۔ لیبارٹری کا نظام جیسا اس اسپتال میں ہونا چاہیے ویسا نہیں ہے۔ ماہر ڈاکٹروں کی کمی بھی ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ اتنے بڑے علاقے کے لیے اتنا بڑا اسپتال بنا ہے تو کچھ ماہرین جناح اسپتال اور سول اسپتال سے یہاں منتقل کر دیے جائیں گے۔ لیکن معلوم ہوا کہ جناح اسپتال مرکزی حکومت کا ہے۔ سول اسپتال صوبائی حکومت کا اور عباسی اسپتال میونسپل کارپوریشن کا۔ یہاں اکثر ڈاکٹر نئے ہیں۔ بعض تو شاید اسی سال فارغ التحصیل ہوئے ہیں۔ تجربہ کم رکھتے ہیں، لیکن ایک صاحب نے کہا کہ چند سال چیر پھاڑ کرتے رہیں گے اور دوائیں آزماتے رہیں گے تو ان کو بھی تجربہ ہو جائے گا۔ انسان گاتے گاتے ہی کلاونت ہوتا ہے، ویسے ان طالب علم نما ڈاکٹروں کو دیکھ کر ہمیں وہ مریض یاد آتا جو آپریشن ٹیبل پر لیٹا تو کہنے لگا، ڈاکٹر صاحب مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے، کیونکہ یہ میرا پہلا آپریشن ہے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میرا بھی تو یہ پہلا آپریشن ہے۔ میں کوئی گھبرا رہا ہوں؟

☆☆☆

ویسے تو ہم خیریت سے ہیں، لیکن اس تقریب سے بستر پر پڑے سارا سارا دن یہ سوچتے رہتے ہیں کہ ہم اپنے اہل وطن کی کس طرح خدمت کر سکتے ہیں۔ اور ہمارے اہل وطن ہماری کیا خدمت کر سکتے ہیں۔ چونکہ ہم مشرقی تہذیب کے آدمی ہیں۔ "پہلے آپ" کے قائل ہیں۔ لہٰذا اس معاملے میں بھی پہل کرنے کا موقع اہل وطن ہی کو دینا چاہتے ہیں۔ قومی خدمت کا جذبہ ہم میں ایک تو فراغت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ کچھ یار عزیز الحاج جمیل الدین عالی کی صحبت سے جو ہمیں برابر دیکھ رہے ہیں۔ حج کرنے کے بعد سے ہم ان میں نمایاں فرق دیکھ رہے ہیں۔ لہو ولعب کی طرف ان کو رغبت مطلق نہیں رہی۔ خیالات فاسدہ ان میں پہلے بھی نہیں تھے، اب تو اور بھی نہیں رہے۔ غزلوں، دوہوں کو لاحاصل قرار دے کر انہوں نے عزم کیا ہے کہ آئندہ صرف قوالوں کی فرمائش گراموفون کمپنیوں کے لیے لکھا کریں گے۔ ایک ایسی کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں جس سے دنیا بالکل ٹھیک ہو جائے۔ ہر طرف عربی ہی عربی رائج ہو جائے اور مسلمانوں میں کسی قسم کی کوئی خرابی باقی نہ رہے۔ تبلیغی تقریریں اس جذبے سے کرتے ہیں کہ بے اختیار جی چاہتا ہے۔ ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیں۔ پھر خیال آتا ہے کہ ہم تو پہلے سے مسلمان ہیں۔ اگر آپ کو کوئی شخص عربی لباس میں رجز پڑھتا ہوا ننگی شمشیر ہاتھ میں لیے گھوڑے پر سوار بحر ظلمات کا راستہ پوچھتا نظر آئے تو نام پوچھنے کی ضرورت نہیں اور کون ہوسکتا ہے۔

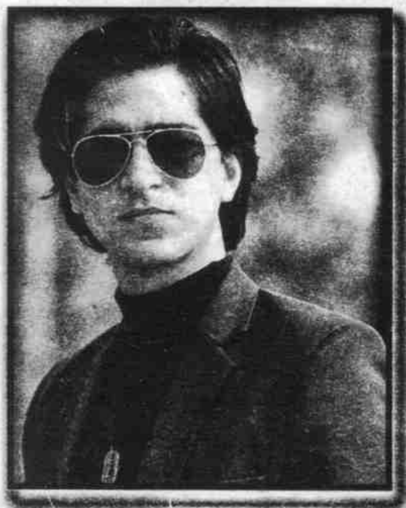
☆☆

معروف اداکار

باتیں احمد رفیق سے

شاہین رشید

1 ''اصلی نام؟''
''احمد رفیق۔''
2 ''پیار کا نام؟''
''احمد ہی بلاتے ہیں۔''
3 ''تاریخ پیدائش/سال؟''
''9 نومبر/1997ء۔''
4 ''قد/ستارہ؟''
''چھ فٹ ایک انچ/عقرب۔''
5 ''مادری زبان؟''
''پنجابی اور اردو۔''
6 ''بہن بھائی/آپ کا نمبر؟''
''ہم دو بھائی ہیں میں بڑا ہوں۔''
7 ''فیلڈ میں آمد/گھر والوں کا ردعمل؟''
''بچپن سے ہی پرفارمنگ آرٹ کا شوق تھا اور گھر والے بھی ہمیشہ سے سپورٹ کرتے تھے۔ اس لیے اتنی کامیابی ملی۔''
8 ''تعلیم؟''
''بی اے، سوشل سائنس اینڈ فلم میکنگ۔''
9 ''شہرت کس نے دی؟''
''پہلا ڈرامہ ''وفا کر چلے'' اور شہرت ڈرامہ سیریل ''بدنصیب'' نے دی۔''
10 ''بچپن میں کس سے ڈر لگتا تھا؟''
''اندھیرے سے۔''
11 ''پہلی کمائی کتنی تھی اور کس کے ہاتھ میں رکھی تھی؟''
''100 درہم کمائے تھے اور اپنے والدین کے ہاتھ میں رکھے تھے۔''
12 ''بچپن کا پہلا پیار؟''
''کارٹون۔''
13 ''آپ کا سورج کب نکلتا ہے؟''
''تقریباً 11 بجے۔''
14 ''کس چیز کے بغیر صبح ادھوری لگتی ہے؟''
''کافی کے بغیر۔''
15 ''کیا برداشت نہیں بھوک یا غصہ؟''
''غصہ۔''
16 ''پاکستان کے لیے کیا سوچتے ہیں؟''
''امن اور بس امن۔''
17 ''کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟''
''ایمان داری کی بات ہے ابھی تک تو کسی کی بھی نہیں۔''
18 ''2023ء میں کیا کھویا کیا پایا؟''
''چند دوست کھوئے اور بھرپور نعمت پائی۔''
19 ''شوبز میں کیا اچھا ہے کیا برا ہے؟''
''سب اچھا ہے بس پیسے تھوڑے لیٹ ملتے ہیں۔''
20 ''کھیلوں سے آپ کا لگاؤ/کون سا کھیل پسند ہے؟''
''اسپورٹس سے تو شدید لگاؤ ہے۔ کرکٹ، فٹ بال دونوں ہی بہت پسند ہیں۔''
21 ''زندگی سے کیا سیکھا؟''
''زندگی ہر موڑ پر کچھ نہ کچھ سکھاتی ہی ہے۔''
22 ''تین چیزیں جنہیں خریدنا آپ کا خواب ہے؟''
''میٹر یلسٹک (مادی) چیزوں سے خواب نہیں جوڑنے چاہیں۔''
23 ''کس کی خاطر شوبز کو چھوڑ سکتے ہیں؟''
''ایسی آزمائش کبھی آئی نہیں اور نہ ہی کبھی آئے گی۔ ان شاء اللہ۔''



24 ''گھر میں کس کی نیند گہری ہے؟''
''چھوٹے بھائی کی نیند گہری ہے باقی سب کی کچی ہے۔''
25 ''پہلی بار کیمرے کا سامنا کیا تو کیا کیفیت تھی؟''
''چار سال کا تھا تو اسٹیج پہ پرفارمنس دی تھی۔ کیفیت تو یاد نہیں۔ بس یہ یاد ہے کہ مزہ بہت آیا تھا۔''
26 ''گھر میں کوئی چیز خراب ہو جائے تو ٹھیک کرانے کی ذمہ داری کس کی ہوتی ہے؟''
''چھوٹے بھائی کی۔''
27 ''زندگی میں کچھ واپس ملنے کا موقع ملے تو؟''
''بیتے ہوئے بچپن کے کچھ پل۔''
28 ''گھر میں آپ کے فیصلے پہ مداخلت کون کرتا ہے؟''
''الحمد للہ کوئی بھی نہیں سب ایک دوسرے کی رائے کا احترام کرتے ہیں۔''
29 ''بیمار ہونے پر بیماری کو سیریس لیتے ہیں؟''
''بالکل صحت ہے تو سب کچھ ہے۔''
30 ''آپ کے اب تک کے ڈراموں، کمرشلز اور فلمز کی تعداد؟''
''15 سے زیادہ ڈرامے کیے ہیں۔ اور ورلڈ کپ کے وقت ایک کمرشل کیا تھا۔''
31 ''کردار کون سے اچھے لگتے ہیں، نیگیٹو یا پوزیٹو؟''
''جس میں پرفارمنس کا مارجن زیادہ ہو۔''
32 ''ادب سے آپ کا لگاؤ/کس کو زیادہ پڑھا؟''
''زیادہ تر انگلش لٹریچر پڑھا ہے۔ فکشن ناولز پڑھے ہیں۔ البتہ شاعری سے کچھ خاص لگاؤ نہیں ہے۔''
33 ''کوئی فیصلہ جو غلط ثابت ہوا ہو؟''
''ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر کچھ عرصے کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔''
34 ''کچن سے لگاؤ؟ کبھی شیف بننے کا خیال آیا؟''
''صرف کھانا کھانے کا شوق ہے بھی شیف بننے کا شوق پیدا ہی نہیں ہوا۔''
35 ''کبھی سوچا کہ اگر سوشل میڈیا نہ ہوتا تو؟''
''ہیومن کنورسیشن زیادہ ہوتی اور اچھا لگتا۔''
36 ''کس شخصیت پہ چاہتے ہوئے بھی غصہ نہیں نکال سکتے؟''
''انسان ہوں غصہ آ ہی جاتا ہے۔ چاہے جو بھی ہو۔''
37 ''میٹھے اور نمکین کھانوں میں کیا پسند ہے؟''
''میٹھے میں چاکلیٹ ویفرز اور نمکین میں گوشت پسند ہے۔''
38 ''ایک نصیحت جو سب کو کرتے ہیں؟''
''جان ہے تو جہاں ہے صحت سے بڑھ کر کچھ نہیں۔''
39 ''کبھی غربت میں دن گزارے؟''
''الحمد للہ، اللہ نے کبھی سر پر چھت اور پیٹ بھر کھانے سے محروم نہیں کیا۔''
40 ''اسٹوڈنٹ لائف میں کس مضمون سے نفرت تھی؟''
''کمپیوٹر اسٹیڈیز۔''

41 ''ڈاکٹر حکیم اور ہومیو پیتھک کس پر اعتبار ہے؟''
''سب ایک ہی فیلڈ کے لوگ ہیں۔ لیکن میں ڈاکٹرز پر زیادہ یقین رکھتا ہوں۔''
42 ''پاکستان میں کیا چیز فری ملنی چاہیے؟''
''دو وقت کا کھانا (وہ تو سیلانی والے بھی دے دیتے ہیں)''
43 ''کیا دل سے اترا ہوا شخص دوبارہ اپنی جگہ بنا سکتا ہے؟''
''لوگوں میں بولنے اور سیکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ موقعہ ہمیشہ دینا چاہیے۔''
44 ''اپنے ہر کام کے لیے کس سے مشورہ لیتے ہیں؟''
''چند قریبی دوستوں سے۔''
45 ''مستقبل میں باہر رہنے کا موقع ملے تو آپ کی ایکٹیویٹی کیا ہوگی؟''
''میڈیا سے متعلق کچھ بھی کرلوں گا۔''
46 ''غصے میں آپ کا ردعمل؟''
''منحصر ہے اس بات پر کہ غصہ آ کس پر رہا ہے۔''
47 ''ٹی وی ٹاک شو کے بہترین اینکر؟''
''عمران اشرف بہترین اینکر ہیں۔''
48 ''آپ کا راز دار کون ہے؟''
''چند دوست۔''
49 ''فیملی پر آپ کا کتنا رعب ہے؟''
''رعب تو نہیں ہے البتہ پیار اور احترام کا رشتہ ہے۔''
50 ''کون سی تاریخیں یاد رکھتے ہیں؟''
''میں اس معاملے میں بہت برا ہوں۔ چند دوستوں یا لوگوں کی برتھ ڈے یاد رہتی ہے۔''
51 ''ایک کھانا جو ہر وقت کھا سکتے ہیں؟''
''دال، روٹی رائتہ کے ساتھ۔''

52 ''اپنی پرفارمنس میں کیا کمی نظر آتی ہے؟''
''ہر بار لگتا ہے کہ اگلی بار بہتر ہو جائے گا۔''
53 ''اپنا ڈرامہ دیکھ کر کیا سوچتے ہیں؟''
''شکر کرتا ہوں۔''
54 ''کس چینل پر ریموٹ رک جاتا ہے؟''
''کسی بھی اسپورٹس چینل پر خاص طور پر جہاں کرکٹ میچ دکھایا جا رہا ہو۔''
55 ''پہلی فلم جو سینما میں دیکھی؟''
''کبھی خوشی کبھی غم۔''
56 ''کوکنگ میں کیا اچھا پکا لیتے ہیں؟ کھانے میں کیا پسند ہے؟''
''صرف انڈے بنانے آتے ہیں اور چکن کو بوائل کرنا آتا ہے۔''
57 ''کون سا کردار کرنے کی خواہش ہے؟''
''کوئی تاریخی رول کرنا چاہتا ہوں۔''
58 ''آپ کا ناقابل فراموش کردار؟''
''عاجو اور بھولا'' میں آجو کا کردار۔''
59 ''کس کردار کو کرنے سے انکار کیا؟''
''تھے کچھ ناپسندیدہ کردار جن کو انکار کر دیا میں نے۔''
60 ''کس سیاست دان کا رول کرنا چاہتے ہیں؟''
''عمران۔''
61 ''چاند پر پہنچ کر دنیا میں پہلا پتھر کس کو ماریں گے؟''
''وہاں گریویٹی کم ہے پتھر وہیں گھومتا رہے گا۔''
62 ''کس کام کو کرتے وقت بہت سوچتے ہیں؟''
''کھانا ڈیسائڈ کرتے وقت بہت ٹائم لگ جاتا ہے۔''
63 ''فلاحی کاموں سے آپ کا لگاؤ؟''
''لگاؤ ہونا بہت ضروری ہے جو لوگ کرتے ہیں

ان کی میرے دل میں بہت قدرومنزلت ہے۔ خود بھی کوشش کرتا ہوں کرنے کی، جتنا مجھ سے ہوسکتا ہے۔"

64 "آئینے کو کتنا وقت دیتے ہیں؟"
"زیادہ نہیں صرف شیو کرتے وقت آئینہ دیکھتا ہوں۔"

65 "کیا شادی کرنا ضروری ہے؟"
"بالکل نہیں، اصل میں نئی نسل کی ابتدا ہوتی ہے اور زندگی ایک نئے موڑ پر لے آتی ہے۔"

66 "اپنا فیوچر کیسا دیکھتے ہیں؟"
"اچھی صحت اور پرسکون زندگی کی دعا کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔ صحت ہے تو سب کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔"

67 "سگنل پر کھڑے ہو کر کس چیز کا جائزہ لیتے ہیں؟"
"سڑکوں کا اور مانگنے والوں کا۔"

68 "بچپن میں فلم ٹی وی کے کون سے فنکار پسند تھے؟"
"شاہ رخ خان، رتھک روشن۔"

69 "خواتین رائٹرز میں کون پسند ہیں؟"
"عمیرہ احمد اور فرحت اشتاق۔"

70 "بچپن میں کون کون سے کھیل کھیلتے تھے؟"
"پلے اسٹیشن 2 کی گیمز وغیرہ فیفا وغیرہ۔"

71 "شاپنگ کے لیے نکلتے ہیں تو کس کا خیال پہلے آتا ہے؟"
"منحصر ہے اس بات پر کہ کون سا تہوار چل رہا ہے۔ میں زیادہ شاپنگ کرتا ہی نہیں۔"

72 "کبھی چھپ چھپ کر دوسروں کی باتیں سنیں؟"
"کئی بار لیکن جان بوجھ کر نہیں...... ہاہاہا۔"

73 "کب ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرتے ہیں؟"
"جب ایک کام کے دوران دوسرے کام کی



آفر کنفرم انداز میں آجائے تو۔"

74 "اپنی کمائی کس چیز پر خرچ کرتے ہیں؟"
"کھانے پر۔"

75 "ڈ-تھ سین آسانی سے کر لیتے ہیں؟"
"جی ...... صرف آنکھوں میں آنسو لانے ہوتے ہیں۔"

76 "نیند کتنی پیاری ہے؟"
"شدید پیاری ہے اور اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔"

77 "آپ کے گھر میں کون کون اس فیلڈ سے وابستہ ہے اور کون آنا چاہتا ہے؟"
"کوئی بھی فیلڈ سے تعلق نہیں رکھتا اور نہ ہی کوئی آنا چاہتا ہے۔"

78 "بچت کس شکل میں کرتے ہیں؟"
"ابھی تک تو کسی شکل میں نہیں کی۔ بچت نہیں ہورہی صرف پیسے اڑا رہے ہیں۔ ہاہاہا۔"

79 "شادی میں کن رسموں کے خلاف ہیں؟"
"میں کسی بھی رسم کو پسند نہیں کرتا۔ بس سادہ طریقے سے نکاح ہوجانا چاہیے۔"

80 "اگر آپ کا اپنا ریسٹورینٹ ہو تو کھانے

کی کون سی ڈش نہیں رہیں گے؟"
"Sushi (سوشی)۔"
81 "صبح اٹھتے ہی کیا بات لبوں سے نکلتی ہے؟"
"الحمدللہ۔"
82 "آج کی فکر زیادہ ہوتی ہے یا کل؟"
"کل کی۔"
83 "فیملی میں کون مزاج کا گرم ہے؟"
"میں" اور میری "مما۔"
84 "کچن سے لگاؤ؟"
"کھانا کی پلیٹ میں ڈال کے لانے کی حد تک کا تعلق ہے میرا کچن سے......بس۔"
85 "بچپن کا کون سا خواب پورا نہیں ہوا؟"
"ایسا کوئی خواب نہیں ہے۔"
86 "پسندیدہ تہوار؟"
"جب بھی اپنے والدین سے ملتا ہوں وہ دن میرے لیے کسی تہوار سے کم نہیں ہوتا۔"
87 "پسندیدہ جانور؟"
"جانور بالکل بھی پسند نہیں ہیں مجھے۔"
88 "اپنے تجربے سے سیکھتے ہیں یا دوسروں کے؟"
"دونوں سے۔"
89 "کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟"
"کافی۔"
90 "مہینے میں کتنی بار گھر سے باہر کھانا کھاتے ہیں؟"
"ایک دن چھوڑ کر یعنی ایک دن گھر پر ایک دن باہر۔"
91 "کیا چیز لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟"
"موبائل۔"
92 "کہاں کھانا پسند کرتے ہیں؟ بیڈ، چٹائی یا ڈائننگ ٹیبل؟"
"بیڈ۔"
93 "گھر میں کس کی خاطر اپنا شیڈول بدل سکتے ہیں؟"
"کسی کے لیے نہیں ہاہاہا۔"
95 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آ جائے تو؟"
"تو کوئی بات نہیں، سب کچھ صرف دو دن کا ہے اور یہ بات ایکسیپٹ کر چکا ہوں میں۔"

☆☆

مقبول مصنفہ

نگہت سیما سے ملاقات

شاہین رشید

سورج کو چراغ دکھانے والا محاورہ آپ سب نے سنا ہے۔ یہ محاورہ نگہت سیما پر صادق آتا ہے۔ ان کا تعارف کرانا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، ان کا کام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انہوں نے بہت لکھا اور بہت اچھا لکھا، وہ لکی رائٹر ہیں۔ اپنی تحریروں میں ہمیشہ مذہبی اور اخلاقی اقدار کو پیش نظر رکھا۔ انہوں نے تقریباً ہر موضوع پر لکھا ہے۔ اب تک ان کی متعدد کتابیں اور افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

اس بار ہم نے آپ کے لیے نگہت سیما سے کچھ باتیں کی ہیں۔ تو آئیے نگہت سیما سے ملاقات کرتے ہیں۔

"کیسے مزاج ہیں؟"

"الحمدللہ......"

"روزمرہ اور آج کل کی مصروفیات کے بارے میں بتائیں؟"

"آج کل کوئی الگ سے مصروفیات نہیں ہیں۔ وہی روزمرہ کے کام، دن چھوٹے ہیں تو وقت گزرنے کا پتا نہیں چلتا۔ ہم بہت صبح اٹھتے ہیں اس لیے آٹھ بجے تک ناشتے سے فارغ بھی ہو جاتے ہیں۔ (ہم سے مراد میں اور شاہدہ) پھر مختلف کام جیسے کھانا تیار کرنا، گھر کے مختلف کام کرنا، کام والی سے صفائی ستھرائی کروانا۔ بھتیجے کی بیٹیاں جو تین چار سال کی ہیں آجاتی ہیں تو ان کے ساتھ انجوائے کرنا اور یوں فارغ ہوتے ہوتے تین چار بج جاتے ہیں۔

اس پر جب کوئی ملنے والا کہتا ہے کہ برتن، صفائی اور کپڑے استری کرنا وغیرہ کوئی اور کرتا ہے تو آپ کیا کرتی ہیں سارا دن، ایک ہانڈی ہی تو بنانی ہوتی ہے۔ تو غصہ بھی آتا ہے اور ہم ان کا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں کہ اب ان کو کیا بتائیں سوائے یہ کہنے کہ "مصروف یوں رہے کہ سدا کچھ نہیں کیا۔"

تین بجے کے بعد ہمارا ریسٹ ٹائم شروع ہو جاتا ہے۔ اس ٹائم میں ڈائجسٹ اور دیگر کتابیں پڑھنا، موبائل پہ فیس بک اور یوٹیوب دیکھنا، اس دوران، عصر، مغرب اور عشاء سے بھی فارغ ہو جاتے ہیں۔ عشاء کے بعد کچھ لکھ لیتی ہوں۔ جو تقریباً گیارہ بارہ بجے تک کبھی کبھار جاری رہتا ہے ورنہ عموماً میں دس گیارہ بجے تک سو جاتی ہوں۔

فیملی بیک گراؤنڈ؟

میرے والد صاحب پاکستان بننے سے پہلے انڈیا (کلکتہ) میں تھے پاکستان آکر مختلف کام کیے اور کراچی میں اپنا کاروبار سیٹ کیا، والدہ ہاؤس وائف تھیں۔ بہت نرم مزاج، کم گو تھیں اور کبھی اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کرتی تھیں۔ بہت ذہین اور ہر فن مولا تھیں۔ سلائی کڑھائی، کوکنگ، سب میں بہت ماہر تھی اماں جی اور ابا جی پر تو الگ سے ایک مضمون لکھا جا سکتا ہے۔

میں 25 اگست کو چکوال میں پیدا ہوئی اور اس شہر میں پلی بڑھی۔ میں نے بی اے بی ایڈ اور اردو ادب میں ماسٹرز کیا ہے۔ میرا تعلق متوسط طبقے سے ہے۔ کسی حویلی کے مالک نہیں ہیں ہم لوگ، اندرون شہر ایک چھوٹا سا گھر ہے۔ اسی نے دیکھ رکھا ہے۔

ہم آٹھ بہن بھائی ہیں ماشاء اللہ سے۔ اور میرا نمبر ساتواں ہے دو بڑے بھائی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ابا جی 2001ء میں اور اماں جی 2002 میں انتقال فرما گئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ اور درجات بلند فرمائے (آمین) میری شادی نہیں ہوئی۔

بچپن کیسا گزرا؟

بچپن بہت مزیدار گزرا، کاش وہ بے فکری کے دن لوٹ کر آسکتے، چھوٹی چھوٹی خوشیاں چھوٹے چھوٹے دکھ، بچپن میں اس دور کے سب ہی کھیل کھیلے، گھر میں

کیرم بورڈ، ڈرافٹ، شطرنج، کروڑ پتی اور کارڈز وغیرہ کھیلے۔ اباجی ہرنئی گیم ہمارے لیے لے کر آتے تھے جیسے واٹر گیم اور ایسے ہی کئی گیمز، ایک بار اردو انگریزی کے الفاظ والے تعلیمی تاش لے آئے۔ پھر ہر وقت چھوٹی چھوٹی ڈکشنریاں ہاتھوں میں لیے رٹا لگایا جارہا ہوتا تھا۔

بڑے بھائی اپنی پڑھائی میں مصروف رہتے تھے اور ہم چھوٹے کھیل کود، خصوصاً گرمیوں کی چھٹیوں میں جو کہ کچھ زیادہ ہی طویل لگتی تھیں اس زمانے میں۔ کبھی امی فارغ ہوتیں تو ان کے ساتھ ان کو پارٹنر بنا کر لڈو بھی کھیل لیا کرتے تھے اور مزید فراغت میں کچھ نہ کچھ میگزین ہاتھ میں لے کر مزیدار کہانیاں پڑھ لیا کرتے تھے۔

اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ اس دور کے بہت کھیل کھیلے جیسے آنکھ مچولی، اسٹاپو، پٹھو گرم، گوائرہ چھپا کی، رسی کودنا، ہم تم کو لینے آئے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ...... گڑیا بازار سے لائی ہوئی اور ہاتھ سے بنائی ہوئی بے شمار تھیں۔ گڑیوں کی شادیاں بھی کیں اور ان کو جہیز میں ہر چیز دی جیسے ڈنر سیٹ، واٹر سیٹ، بیڈ، بیڈ شیٹس، ان کے کپڑے سلائی کرنا اور موتی ٹانکنا، جیولری لینا، آج کی نسل تو ان گیمز اور ان کے نام سے بھی ناواقف ہے۔

ہمارے بچپن میں ہمارے گرمیوں کے اور سردیوں کے کپڑے اباجی کراچی سے اپنے دوست ٹیلر سے سلوا کر لاتے تھے۔ اور جو کپڑا بچ جاتا اس کے گڑیوں کے کپڑے بھی سلوا کے لاتے تھے اور ہمارے لیے ہر طرح کی جیولری بھی لے کر آتے تھے۔

بہن بھائیوں کے ساتھ لڑائی جھگڑا کبھی نہیں ہوا۔ بھائی بڑے تھے اور وہ نہ صرف خیال رکھتے تھے بلکہ بہت محبت بھی کرتے تھے البتہ چھوٹے بھائی طارق سے میری کبھی کبھار لڑائی ہو جاتی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ مجھے مرغی سے بہت ڈر لگتا تھا اور وہ مرغی میرے اوپر پھینکتا تھا۔ میں آگے آگے بھاگتی اور وہ میرے پیچھے پیچھے۔

اس وجہ سے اباجی سے ڈانٹ پڑ جایا کرتی تھی۔ اباجی سے ہمیں کبھی ڈانٹ یا مار نہیں پڑی۔ بھائیوں کے لیے اباجی کی ہدایت تھی کہ مغرب سے پہلے گھر آجائیں۔ کوتاہی ہونے پر انہیں ڈانٹ ضرور پڑتی تھی جبکہ وہ گراؤنڈ میں ہاکی یا فٹ بال کھیل رہے ہوتے تھے۔

میں بچپن میں نہ لڑاکا تھی نہ ہی جھگڑالو اور نہ ہی ضدی۔ میرے پاس جو چیزیں ہوتی تھیں وہ کسی کے پاس نہیں ہوتی تھیں۔ پنسلیں، شاپنرز، ٹافیاں، چاکلیٹ، چیونگم اباجی کراچی سے لاتے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک بار وہ کھلاڑیوں کی تصاویر والی پنسلیں لے کر آئے تھے۔ فضل محمود کے دور کے کھلاڑیوں والی درجنوں کے حساب سے لاتے تھے۔ جو سالوں تک پڑی رہتی تھیں۔ کچھ عرصہ پہلے بھی کھلاڑیوں کی تصویر والی پنسل ابو کی الماری سے نکلی ہے۔

میں پڑھا کو نہیں تھی البتہ دیگر غیر نصابی سرگرمیوں سے زیادہ دلچسپی تھی، تقریریں، ڈرامے، کھیل، کلاس میں چوتھی یا پانچویں پوزیشن لیتی تھی۔ ہینڈ رائٹنگ اچھی نہیں تھی اس لیے نمبر کٹ جاتے تھے۔ لیکن جب پانچویں کلاس میں اسکالرشپ ملی۔ اس وقت اسکالرشپ کا امتحان لینے جہلم یا راولپنڈی سے ٹیچرز آتی تھیں۔ اسکالرشپ ملی تو خود سے وعدہ کیا کہ اب فرسٹ آنا ہے۔ لیکن کہاں کا وعدہ کیسی وفا۔

ہائی اسکول میں غیر نصابی سرگرمیوں کے لیے میدان وسیع تھا۔ تقاریر، مباحثے، ڈرامے، اسپورٹس ہر چیز میں حصہ لیا۔ کلاس سکس میں ہی اسکول کی نیٹ بال کی جونیئر ٹیم میں شامل ہو گئی تھی۔ سالانہ اسپورٹس میں لانگ جمپ، ہائی جمپ، ڈسکو تھرو سائیکلنگ میں بھی حصہ لیتی تھی۔ تو پھر پڑھائی میں نویں دسویں پوزیشن میں آ گئی تھی۔ میٹرک تک یہی حال رہا۔

گھر والوں کو یہ کہہ کر بہلا دیا کہ آتا سب ہے بس رائٹنگ کی وجہ سے نمبر کٹ جاتے ہیں۔ اور کلاس میں بہت پڑھا کو لڑکیاں ہیں بورڈ ٹاپ کرنے والی تو ہماری دال بھلا کیسے گلے گی۔ دراصل میری بہن شاہدہ ٹاپرز میں تھی تو میں تو نالائق ہی سمجھی جاتی تھی میٹرک میں مجھ سمیت سب کا خیال یہ تھا کہ مکمل فیل نہ ہوئی تو ایک دو مضامین میں لازمی آ جائے گی کہ سارا سال تو نصاب کو ہاتھ نہیں لگایا تو ایک دن پڑھ کر کون سا کارنامہ انجام دے پائے گی۔

تب میرے بھائی جان جمیل نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ میرے بہن بھائی آنکھیں بند کر کے الٹے ہاتھ سے بھی لکھیں گے تو بھی فیل نہیں ہوں گے۔ تو ان کا یہ یقین سچ ثابت ہوا۔ اور کالج جا کر کچھ پڑھا تو ایف اے میں اپنی کلاس میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ سب حیران رہ گئے۔ اچھا یہ بتاؤں کہ امی کی لکھائی بہت خوب صورت تھی۔ اباجی کی اچھی نہیں تھی تو میری لکھائی ابوجی پر گئی۔ میں کسی بھی دور میں نہ سنجیدہ تھی نہ شرارتی بس نارمل تھی۔"

"گھر کا ماحول کیسا تھا ادبی، تعلیمی یا نارمل؟"

"گھر کا ماحول تعلیمی بھی تھا اور ادبی بھی۔ ہوش سنبھالتے ہی سب کے ہاتھ میں کتابیں دیکھیں۔ امی سمیت سب ہی کتابیں پڑھنے کے شوقین تھے۔ اباجی کے پاس ان کے زمانے میں چھپنے والی ساری ہی کتابیں موجود تھیں۔ ان میں مذہبی، تاریخی، ادبی، ہر طرح کے موضوع پر کتابیں ان کے پاس تھیں۔ افسانوں کے مجموعے بھی اور شاعری کی کتابیں بھی۔

اباجی کے پاس اپنے دور کے سب رسالے، ہفتہ روزہ اخبار، اور وہ ان سب کی جلد کروا کے اپنے پاس رکھتے تھے۔ شاہدہ اور طارق بھائی بہت دلچسپی سے ان کو پڑھتے تھے مگر مجھے دلچسپی نہیں تھی۔ سب کچھ بہت مشکل لگتا تھا۔ میں تاریخی اور جاسوسی ناول پڑھتی تھی۔ پانچویں جماعت تک میں نے نسیم حجازی اور رشید اختر ندوی کے وہ سب تاریخی ناول پڑھ لیے تھے جو گھر میں تھے۔ بلکہ خاک وخون اور یلغار تو کئی کئی بار پڑھ لیے تھے۔

پانچویں جماعت سے ہی ابن صفی کے ناول پڑھنے کا چسکا پڑ گیا۔ طارق بھائی لے کر آتے اور جہاں کہیں چھپا کر رکھتے میں ڈھونڈ لیتی تھی۔ "ابن صفی" کے ناول بڑے ہونے کے بعد دوبارہ پڑھے۔

ہم سب بہن بھائیوں کو اباجی اور ماں جی سے ہی مطالعہ کا شوق ملا۔ بڑے بھائیوں کا تو مجھے نہیں پتا لیکن جب میں کلاس تھری میں تھی، اباجی نے میرے نام تعلیم وتربیت لگوادیا تھا۔ اباجی ہر سال ایک ایک رسالہ سب کے نام جاری کروادیتے تھے۔ طارق ون میں تھا تو اس کے نام بچوں کی دنیا لگوادیا اور شاہدہ پانچویں میں تھی تو اس کے نام "حور" اور زیب النساء لگوادیا۔ اصل میں یہ میگزین امی کے پسندیدہ تھے۔

کبھی کبھی ہم اپنے جیب خرچ سے بھی میگزین خرید لیا کرتے تھے۔ پڑھنے کے بعد اپنے اپنے میگزین کو کور چڑھا کر الماری میں بہت سنبھال کر رکھ دیتے تھے۔ جب بھی "دادی" ہمارے گھر آتیں تو ان کی فرمائش پر طارق بھائی لائبریری سے "اے آر خاتون" اور زبیدہ خاتون کے ناول کرایے پر لے آتے تھے اور رات کو شاہدہ پڑھ کر سناتی تھی اور ہم اپنے بستر میں لیٹے لیٹے سنا کرتے تھے۔ اور شاہدہ کو انگریزی ناول پڑھنے کا بھی شوق تھا تو وہ پھر ہمیں اور دادی جان کو ترجمے کے ساتھ سناتی تھی۔

گرمیوں کی راتوں میں ہم تینوں بہن بھائی چھت پر سوتے تھے تو "بیت بازی" کا مقابلہ کرواتے اور جب کوئی شعر یاد نہیں آتا تو خود سے بنا کر سنا دیتے تھے ردیف قافیہ کا تو پتا نہیں تھا بس شعر کہہ دیا کرتے تھے۔ تو بس اس طرح کا ماحول تھا ہمارا۔ اور اسی ماحول میں پل بڑھ کر جوان ہوئے۔

بچپن کی ایک اور یاد...... ریڈیو سننے کا بہت شوق تھا۔ ٹی وی کمپیوٹر، انٹرنیٹ ہمارے ہی سامنے کی ایجادات ہیں۔ ہماری نسل نے بے شمار ایجادات اور تبدیلیاں دیکھی ہیں۔ چھوٹی سی ٹیپ، ریڈیو میرے ذاتی اثاثے میں شامل تھے اور ابھی تک ہیں۔ لتا، رفیع، طلعت محمود، سے لے کر عابدہ پروین، ٹینا ثانی تک کے کیسٹ پڑے ہیں ابھی تک، ہر ماہ ایک دو خرید لیتی تھی۔ پھر سی ڈیز آگئیں ڈی وی ڈی آگئے اب سب بیکار ہو گئے ہیں۔

"پہلی تحریر کیا تھی اور کب لکھنے کا ادراک ہوا؟"

پہلی تحریر جب لکھی تو چھپنے کی خوشی ہی لکھنے کا سبب اور محرک بنی۔ اسکول سے آتے ہوئے مہاجر بک ڈپو پر سجے ہوئے بچوں کے رسالے دیکھ کر جی للچاتا تھا کہ ہمارے گھر میں صرف تعلیم وتربیت اور

بچوں کی دنیا ہی آتا تھا اور یہاں کھلونا، غنچہ اور جانے کی کون کون سے میگزین رکھے تھے۔ تو بس ایک دن ''غنچہ'' خرید لیا۔ اس میں ہر ماہ کہانیوں کا مقابلہ ہوتا تھا۔ دیے ہوئے عنوان پر کہانی لکھنا ہوتی تھی اور اول، دوم اور سوم آنے والوں کو کہانیوں کی کتابیں تحفے میں دی جاتی تھیں۔ تو میں نے ان کتابوں کے لالچ میں کہانی لکھی۔

اور پہلی کہانی پر ہی اول انعام مل گیا۔ گھر والے سب بہت خوش ہوئے۔ اباجی نے زور قلم اور زیادہ کی دعا دی۔ بس پھر ہر ماہ کہانی لکھنی شروع کر دی اور ہر ماہ ہی کوئی نہ کوئی انعام مل جاتا تھا تو اس طرح لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اگر میں یہ کہوں کہ مجھے لکھاری بنانے میں ''غنچہ'' کا بڑا ہاتھ ہے تو غلط نہ ہوگا۔ مجھے شہزادوں اور شہزادیوں والی کہانیاں پسند نہیں تھیں اس لیے غنچہ میرا پسندیدہ رسالہ بن گیا۔

اباجی کراچی میں کراچی جنگ لیا کرتے تھے اور بچوں کا صفحہ سنبھال کر رکھ لیا کرتے تھے۔ اور جب گھر آتے تھے تو وہ صفحات بھی لے آتے تھے۔ کیا زبردست ادبی کہانیاں ہوا کرتی تھیں۔ تو یوں میں نے جنگ راولپنڈی بچوں کے صفحہ پر کہانیاں لکھنا شروع کر دیں۔ پھر اگلے قدم پر خواتین کے اور ادبی صفحے پر لکھنا شروع کر دیا۔ خواتین کے صفحے پر مضامین بھی لکھے۔ چند ایک نظمیں غزلیں بھی شائع کروائیں جو کہ بس بھرتی کی ہوتی تھیں۔ مضامین معاشرتی مسائل پر ہوتے تھے۔

ڈائجسٹ کی دنیا میں کیسے اور کب آئیں؟

ڈائجسٹ کی دنیا میں اس طرح آئی کہ ہمارے گھر میں ''سیارہ ڈائجسٹ'' اور ''اردو ڈائجسٹ'' آتے تھے تو میں نے ایک کہانی سیارہ ڈائجسٹ میں لکھ کر بھیجی۔ سید قاسم محمود اور ستار طاہر (مرحوم) ایڈیٹر تھے، انہوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ کہانی کا نام ''غریب سپاہی'' تھا ان کی حوصلہ افزائی سے میں نے مزید کہانیاں بھی بھیجیں جو کہ باقاعدگی سے چھپنے لگیں ''بھرم'' اور ''اولڈ ایج ہاؤس'' میری ایسی کہانیاں تھیں کہ اگر میں آج بھی اس موضوع پر لکھوں تو اس سے بہتر نہیں لکھ سکتی۔ ''بھرم'' میں ایک جملہ لکھا تھا لکھا تھا جو آج بھی میرے دل پر اثر کرتا ہے ''اس کا وجود تو بی بی کے خالی ڈبوں سے زیادہ حقیر ہو گیا تھا جنہیں بھابھی بیگم نے گیلے کپڑے سے چمکا کر رکھ لیا تھا۔'' اباجی کراچی سے ہمارے لیے BP کی ٹافیاں لاتے تھے۔ بہت خوب صورت چوکور گولڈن کے امتزاج کے ساتھ گرین اور بلو ڈبے ہوتے تھے دو دو پونڈ والے یا کچھ خالی ہونے پر اماں جی ان میں دالیں وغیرہ رکھ لیتی تھی۔

اس طرح شوکت بھائی یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے گئے۔ ماسٹرز اور ایم فل کیا۔ وہاں سے واپس آ کر انہوں نے ''اولڈ ایج ہاؤس'' اور وہاں رہنے والے بوڑھے بوڑھیوں کے متعلق بتایا جو کہ ہمارے لیے بالکل نئی بات تھی۔ تو پھر میں نے ''اولڈ ایج ہاؤس'' کی کہانی لکھی۔ جس کے متعلق جمیل بھائی جان نے اباجی سے کہا تھا کہ آپ اسے ضرور پڑھیں۔ اٹ از اے گریٹ اسٹوری سید قاسم (سیارہ ڈائجسٹ کے ایڈیٹر) ہمارے گھر آتے تو انہوں نے اس کے متعلق ایک جملہ کہا تھا۔ ''اس عمر میں اولڈ ایج ہاؤس'' جیسے موضوع کا چناؤ حیران کن ہے۔'' اس طرح کی حوصلہ افزائی لکھنے کے عمل کو آگے بڑھاتی ہے۔

اب میں نے دوشیزہ اور ''اوراق'' میں بھی لکھنا شروع کر دیا کہ میں ان دنوں بہت کہانیاں لکھتی تھی۔ ''اوراق'' ادبی پرچا تھا تین چار ماہ بعد آتا تھا تو دوشیزہ نظر آ گیا اس میں بھی مختصر کہانیاں چھپتی تھی۔ ''وزیر آغا'' صاحب نے بہت حوصلہ افزائی کی۔ ہر کہانی ملنے پر ان کا جوابی خط ضرور آتا تھا جس میں ایک مختصر سا جملہ کہانی کے بارے میں ہوتا تھا اور وہ جملہ میرے لیے بہت قیمتی ہوتا تھا۔

پھر ایک دوست نے ''آنچل'' کے متعلق بتایا تو اس میں بھی لکھنا شروع کر دیا۔ ''آنچل'' میں اقبال بانو بھی لکھتی تھیں۔ تو انہوں نے آنچل والوں سے میرا

ایڈریس لے کر مجھے خط لکھا اور "خواتین ڈائجسٹ" سے مجھے متعارف کرایا۔ یہ مئی 83 19ء کی بات ہے۔ خواتین سے پھر شعاع اور پھر پاکیزہ، کرن میری ایک کولیگ خریدتیں تھی۔ انہوں نے کہا کہ اس میں بھی لکھو کہ یہ میں لیتی ہوں۔ تقریباً 40 سال ہوگئے ہیں خواتین کے ادارے سے وابستہ ہوئے۔ "حنا" آنگن، بیسویں صدی وغیرہ میں چند ایک کہانیاں لکھیں اور دوسرے پرچوں میں بھی۔

سیارہ ڈائجسٹ میں چھپنے والی پہلی کہانی کا "اعزازیہ" 50 روپے ملا تھا۔ خوش گوار سی حیرت اور خوشی ہوئی جب منی آرڈر ملا۔ تب سوچا کہ اچھا اچھی کہانی لکھنے پر پیسے بھی ملتے ہیں۔ سیارہ ڈائجسٹ میں جو آخری کہانی لکھی چھپی اس کا اعزازیہ "500" روپے ملا تھا۔ "آنچل سیارہ ڈائجسٹ کے بعد دوسرا پرچا تھا جس نے اعزازیہ پہلی کہانی سے ہی دینا شروع کردیا۔ خواتین اور شعاع نے بھی پہلی کہانی سے ہی اعزازیہ دینا شروع کردیا تھا۔

"لکھنے کے کیا اوقات ہیں پسندیدہ موضوعات کیا ہیں اور پلاٹ کب ذہن میں آتے ہیں؟"

"لکھنے کے لیے کوئی خاص وقت مقرر نہیں تھا اور نہ ہی ہے جب وقت ملا لکھ لیا۔ زیادہ تر رات کے وقت ہی لکھتی ہوں اس کے لیے مجھے تنہائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کچن میں بھی بیٹھ کر لکھ لیتی۔ مگر اب دل چاہتا ہے کہ لکھتے وقت خاموشی ہو اور آس پاس شور نہ ہو۔

"میں نے ہر موضوع پر لکھا۔ معاشرتی، رومانی، نفسیاتی، کرنٹ افیرز، وغیرہ، میں بنیادی طور پر شارٹ اسٹوری رائٹر تھی لیکن جب خواتین کے پرچوں میں لکھنا شروع کیا تو پھر طویل افسانے، ناولٹ اور ناول لکھے اور لکھنے کے لیے پلاٹ خود بخود ذہن میں آجاتے ہیں، کبھی کسی کی مسکراہٹ، کسی کا کہا ہوا جملہ کوئی خوب صورت شعر کہانی لکھنے کا محرک ہوجاتا ہے۔ پاکستان اور دنیا میں ہونے والے واقعات بھی پلاٹ کی بنیاد بن جاتے ہیں۔ میں نے کشمیر، عراق، فلسطین، ویت نام سب پر لکھا۔ کارگل اور وزیرستان بھی میری کہانی کا موضوع بنے۔ سقوط ڈھاکہ اور بوسنیا بھی۔

ایسا خوش قسمت دن میری زندگی میں کبھی نہیں آیا کہ پلاٹ ذہن میں آتے ہی لکھ بھی لوں۔ کئی بار چلتے پھرتے کام کرتے پوری کہانی کا تانا بانا ذہن میں تھا لیکن لکھ نہیں پائی۔ ایک نشست میں تو اب کوئی کہانی مکمل نہیں کرپاتی کئی دن لگ جاتے ہیں۔ (ہاں کبھی مختصر کہانیاں ایک ہی نشست میں لکھ لیتی تھی اور بچوں والی کہانیاں ایک سے دو تین دن میں بھی لکھ لیا کرتی تھی) اسی لیے سات آٹھ فائلوں میں آدھی ادھوری کہانیاں لکھی ہوئی پڑی ہیں۔ آج کل "اہل" کے کہنے پر کچھ کام مکمل کررہی ہوں۔ کچھ بیکار لگتی ہیں تو انہیں پھینک دیتی ہوں۔

دلچسپ بات بتاؤں کہ میں نے زیادہ تر کہانیوں کے عنوان پہلے سے سوچے اور کہانیاں بعد میں لکھیں وجہ یہ کہ لکھنے کا آغاز عنوان سے کیا تھا۔ بہت کم کہانیاں ہیں جن کا عنوان بعد میں رکھا۔ اور عنوان بھی کسی شعر سے ذہن میں آتا ہے کبھی کسی ایک لفظ سے جیسے "لکی گرل"، "ڈیکوریشن پیس"، "الیکٹریکل ڈسٹ بن وغیرہ یہ سب میری کہانیوں کے عنوان ہیں۔"

"ہمیشہ لکھتا ہی رہا، یا کبھی تعلیم کا فائدہ بھی اٹھایا؟"

"میں کافی ٹائم تک بلکہ میں نے چالیس سال جاب کی وہ بھی ایک پرائیوٹ اسکول میں۔ ٹیچنگ کی جاب انتہائی تھکا دینے والی تھی۔ بی ایڈ کا رزلٹ بعد میں آیا پہلے میں نے جاب کی۔ میری بڑی بھابی کے رشتے دار تھے ان کا اسکول تھا۔ سوچا فارغ ہوں تو جاب ہی کرلوں۔ پڑھانا کبھی میرا پیشہ نہیں رہا۔ بہت مشکل لگتا تھا میں تو صحافی بننا چاہتی تھی یا ڈرامہ ڈائریکٹر مصور یا فوٹو گرافر، کچھ بھی مگر ٹیچر نہیں۔ بی ایڈ میں بھی اس لیے ایڈمیشن لیا تھا کہ میری فرینڈز جارہی تھیں۔ میں نے تو پنجاب یونی ورسٹی میں

ایڈمیشن کے لیے کاغذات جمع کرائے تھے۔ خالہ جان نے بھی کہا کہ کرلو۔ ایک دن رہتا تھا بی ایڈ کے کاغذات جمع کرانے میں، یہ کیسے جمع ہوئے یہ الگ کہانی ہے۔

میرٹ لسٹ لگی تو میرا نام دوسرے نمبر پر تھا اور جس دوست کے کہنے پر میں بی ایڈ کرنے کے لیے تیار ہوئی تھی اس کا ایڈمیشن ہی نہیں ہوا تو ہم نے کالج فون کر کے کہا کہ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ میری جگہ اس کا ایڈمیشن ہو جائے کیونکہ جاب اس کی ضرورت ہے اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے تو جواب میں پرنسپل صاحب نے، خوب باتیں سنائی کہ کس کے لیے کیا بہتر ہے یہ اللہ جانتا ہے۔ اس کی تو چھ ماہ بعد شادی ہوگئی اور میں نے چالیس سال جاب کی اور جاب سے یہ نقصان ہوا کہ بہت کچھ جو میں کرنا چاہتی تھی وہ کر نہیں پائی۔ اماں جی اور ابا جی کو زیادہ وقت نہ دے پائی۔ بہر حال اللہ کا شکر ہے اچھا وقت گزر گیا۔

سوچا تھا کہ جاب سے فارغ ہو کر بہت کچھ لکھوں گی، ادھوری کہانیاں مکمل کروں گی۔ لیکن جاب سے فارغ ہوئی تو لکھنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ معروفیت جیسے زیادہ ہوگئی تھی اور لوگوں کے رویے۔ خیر اب پھر سے لکھنا شروع کیا ہے۔ ابھی تو ادھوری کہانیاں مکمل کی ہیں اور کر رہی ہوں پھر کچھ نیا بھی لکھ ہی لوں گی۔"

"ٹی وی کی دنیا سے کیوں دور ہیں؟ کیا آپ ڈرامے لکھتی ہیں؟"

"میں نے بچپن میں غنچہ کے لیے چھوٹے چھوٹے تین چار مزاحیہ ڈرامے لکھے تھے۔ بس پچیس سال پہلے۔ بچوں کے پرابلم پر لکھی جانے والی میری کہانیوں پر پشاور سے کسی نے ڈرامائی تشکیل کے لیے کہا یہ پہلی بار تھا۔ اس کے بعد کئی بار مختلف پروڈکشنز ہاؤس سے آفر ہوئی لیکن بات آگے نہیں بڑھی۔ پھر سیونتھ اسکائی کے لیے "باروفا" لکھا۔ سب اقساط کی پے منٹ بھی ہوگئی لیکن شوٹ پر نہ جاسکا۔ کیوں؟ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ اسکول میں ہونے والے فنکشنز کے لیے ڈرامہ لکھے اور بچوں کو تیار کروایا بس ٹی وی کے سوال پر میری یہی کہانی ہے۔ تو بس جو ملا ہے اللہ کا شکر ہے اور جو نہیں ملا اس کے لیے کبھی تمنا نہیں کی۔

اور پی ٹی وی کے ڈرامے دیکھے تھے سب، نیلام گھر، کسوٹی، بچوں کے پروگرام وغیرہ...... پھر پرائیویٹ چینلز آگئے تو ٹاک شوز دیکھے، کچھ ڈرامے بھی دیکھے۔ ایک دو تر کی ڈرامے بھی دیکھے۔ لیکن پھر یک دم ٹی وی سے دل اچاٹ ہو گیا۔ اب تو کچھ عرصے سے ٹی وی کیبل نہیں ہے۔ تو گرین چینل کے ایک دو ڈراموں کی تعریف سنی تو انہیں یوٹیوب پر دیکھا۔"

"امور خانہ داری سے کتنا شغف رہا۔ کھٹر ہیں؟"

"ہر کام سیکھنے کا شوق تھا اور سیکھا۔ سلائی، کڑھائی، پینٹنگ گلاس ورک فلاور میکنگ سب کچھ کیا۔

کوکنگ بی اے کے بعد باقاعدہ کی ورنہ پہلے تو اماں بی اور شاہدہ ہی کرتی تھیں۔ میں نے بس تھوڑا بہت ہاتھ ہی بٹایا۔ اب تو ہر طرح کے کھانے بنا لیتی ہوں۔ جیسے دیسی، چائنیز، بیکنگ سب کچھ۔

چھبیس، ستائیس سال پہلے ابھی پیزا پاکستان میں آیا ہی تھا لیکن اس سے پہلے شیریں ہالینڈ گئی تھی تو وہاں کسی لبنان کی لڑکی سے سیکھا تھا تو ہم گھر میں بناتے تھے۔

سیاست سے دلچسپی تھی۔ مگر اب نہیں ہے سیاحت کا بہت شوق تھا۔ دنیا گھومنے کے علاوہ پاکستان کا ہر شہر ہر گاؤں دیکھنے کا شوق ہے۔ موٹر وے پر سفر کرتے ہوئے جی چاہتا ہے کہ گاڑی روک کر ہر گاؤں میں جا کر دیکھوں شام کے وقت سفر کرتے ہوئے دور کسی گھر سے اٹھتا ہوا دھواں اور پرانے گھر، پرانی عمارتیں، مجھے بہت فیسی نیٹ کرتی ہیں۔ ابا جی ہماری چھٹیوں میں ہمیں لاہور شہر سیر کرانے کے لیے لائے تھے۔ اپنے ہوش میں چکوال کے بعد یہ پہلا شہر دیکھا تھا۔ ہوٹل میں قیام تھا تو چار پانچ دن میں انہوں نے سب تاریخی عمارتیں دکھا دیں

تھیں واپسی میں پہلی بار ٹرین کا سفر کیا تھا اپنی زندگی میں وہ بھی لاہور سے راولپنڈی تک۔ خوشی اور مسرت کا یہ عالم تھا کہ اندھیرے میں کھڑکی سے چپٹے باہر ہی دیکھتے رہے تھے۔"

"ہم عصر رائٹرز میں کس سے متاثر ہو کر لکھنا شروع کیا؟"

"میں نے کسی ہم عصر رائٹرز سے متاثر ہو کر لکھنا شروع نہیں کیا بلکہ میں نے پہلے آپ کو بتایا کہ میں نے انعام ملنے کے لالچ میں لکھنا شروع کیا تھا۔ ویسے میں اپنی تقریباً سب ہی ہم عصر رائٹرز سے متاثر ہوں، پسند کرتی ہوں اور ینگ رائٹرز میں بھی کئی کی تحریریں مجھے پسند ہیں۔"

"گھر میں آپ کے علاوہ کس کو لکھنے کا اور ادب پڑھنے کا شوق ہے؟"

"گھر میں سب کو ہی ادبی ذوق ورثے میں ملا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ شیرین نے ایک مضمون خواتین ڈائجسٹ میں لکھا تھا مزاحیہ سا، تو اس پر نوٹ لکھا تھا (احتل نے یا شاید ریاض صاحب نے مجھے ٹھیک سے یاد نہیں) "کہ ایں ہمہ خانہ آفتاب است"

میرے سب بھائیوں نے اپنے کالج کے زمانے میں شاعری کی اور کالج کے میگزین کے لیے لکھا۔ جاوید بھائی نے دس سال کی عمر میں ایک واقعے پر نظم لکھی تھی جو اباجی کے پاس محفوظ تھی جسے بعد میں انہوں نے مکمل کیا تھا۔ "رقاصہ" کے نام سے اور مجھے ٹھیک سے یاد نہیں لیکن یہ یاد ہے کہ فیض، یا عدم ان میں سے ایک ان کے اسکول میں آئے تھے مشاعرے میں تو بہت تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ آپ اچھے شاعر بن سکتے ہیں۔ مگر پھر انہوں نے توجہ ہی نہیں دی اپنی جاب اور مصروفیات کے چکر میں وہ "جیالوجسٹ" تھے جاب ٹف تھی۔ لیکن جب "تربیلا" میں ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ بن کے گئے تو کچھ فرصت ملی اور ان کی شاعری غازی میگزین میں چھپنے لگی۔

جمیل بھائی نے بھی خوب صورت نظمیں لکھیں لیکن چھپوائی نہیں۔ طارق بھائی نے تو اپنی شاعری کی کتاب پریم پنگھٹ کی گوری اور شب فرقت چھپوائی۔ ان میں صلاحیت بہت تھی اچھے شاعر اور ادیب بن سکتے تھے۔ اور اب ذکر کروں گی اپنی بڑی بہن شاہدہ طلعت کا ان کی تحریریں بہت خوب صورت ہوتی تھیں۔ شعاع، خواتین، پاکیزہ، آنچل اور دوشیزہ میں لکھا۔ مگر پھر یکدم ہی چھوڑ دیا۔ اس کی تحریر کی خوب صورتی پر ہمیشہ ہی مجھے رشک آیا۔ اس کے پاس بھی ڈھیروں آدھی ادھوری کہانیاں پڑی ہیں۔ میں نے احتل نے بھی کہا کہ ان کو مکمل کر دو۔ لیکن اس کا موڈ ہی نہیں بنا۔ وہ ایک اچھی شاعرہ بھی ہے نظمیں، غزلیں بلکہ ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ مگر اس نے سب کچھ چھوڑ کر اپنے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اس کی ایک ہائیکو یاد آ رہی ہے آپ کو بھی سناتی ہوں بلکہ لکھتی ہوں۔

جب دیکھا کہ ان لکیروں میں
نام تیرا کہیں رقم ہی نہیں
اپنے ہاتھوں کو میں نے کاٹ لیا
اور غزل کا ایک شعر
فقط نوید نہ دیتا وہ موسم گل کی
وہ میرے خواب کی تعبیر ہو گیا ہوتا"

"اپنی کتابوں کے بارے میں بتائیں کیا کیا منظر عام پر آچکا؟"

میری اب تک اکتالیس کتابیں چھپ چکی ہیں۔ تین افسانوی مجموعے ہیں باقی ناول، ناولٹ ...... پہلی کتاب 2000 میں چھپی تھی۔ "مراجعت" اس سے پہلے سید قاسم محمود، ستار طاہر اور امراؤ طارق صاحب نے میری کتاب چھپوانے کے لیے منتخب کیں اور چونکہ ہر چیز کا وقت مقرر ہوتا ہے سوا سے 2002 میں ہی چھپنا تھا۔"

"میرے ایک چھوٹی سی کتاب ہے جو کہ بچوں کے لیے لکھی ہے۔ "حدیث کہانیاں" یہ پہلا حصہ تھا۔ دوسرا حصہ چھپنے کا کئی سالوں سے انتظار کر رہی ہوں۔ میری خواہش اپنی مختصر کہانیوں کا مجموعہ

چھپوانے کی ہے لیکن پبلشرز کی ڈیمانڈ ناول ہے۔"

"اپنی ہی تحریر میں کیا خامی کیا خوبی دیکھتی ہیں؟ یا تنقید ہوتی ہے؟"

اللہ کا کرم ہے تنقید کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ البتہ مجھے اپنی تحریر میں ایک خامی ضرور نظر آتی ہے اور یہ خامی میں ہی جانتی ہوں اور وہ یہ کہ ہمیشہ سے ہی میری یہ عادت رہی ہے کہ جب میں لکھنے لگتی ہوں تو ڈائریکٹ ہی لکھ لیتی ہوں۔ اس کی وجہ شاید وقت کی کمی ہے یا میری مصروفیات ہیں یا پھر میری سستی ہے۔ کچھ بھی سمجھ لیں۔ اس سے نقصان یہ ہوا کہ میری کئی کہانیاں ڈاک میں گم ہو گئیں اور انہیں دوبارہ نہ لکھ سکی۔ ایک پبلشرز میری ایک اسٹوری کئی سالوں سے دبا کر بیٹھے ہیں اور چونکہ میرے پاس اس کی نقل نہیں ہے اور وہ نہیں چھپی بھی نہیں تو بس وہ بے کار ہو گئی۔ اب تو واپس مانگنا بھی چھوڑ دیا ہے۔

کئی بار احساس ہوا کہ اسے دوبارہ لکھ لیتی تو زیادہ اچھا لکھ لیتی گھر میں بھائی بھی کہتے تھے کہ دوبارہ لکھا کرو۔ نقل رکھا کرو، مگر میں نے ایسا بھی نہیں کیا۔ اور یہ میری کوتاہی تھی۔

انور عنایت اللہ صاحب نے میری دو کہانیوں انگریزی میں ترجمہ کیا تھا ایک "ہیرالڈ" میں چھپوائی۔ ورلڈ شارٹ اسٹوریز رائٹرز کے نام سے یا کچھ اس طرح کا نام تھا، امریکہ سے چھپی تھیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نے نیا نیا بی ایڈ کیا تھا اور اس وقت بہت خوشی ہوئی تھی۔ امراؤ طارق صاحب نے بھی میری ایک کہانی "قلعی گر" کا ترجمہ کیا تھا۔ اور بھی کئی کہانیاں منتخب کی تھیں۔ لیکن پھر میرا ان سے رابطہ ٹوٹ گیا۔

مجھے بھی اپنے بہن بھائیوں کی طرح، شاعری کا بہت شوق تھا۔ پہلی نظم "غنچہ" میں لکھی تھی عنوان تھا۔ "عید آئی ہے" قافیہ ردیف کا اس وقت کچھ پتا نہیں تھا لیکن چھپ گئی۔ البتہ تنقید بہت ہوئی تھی۔ اسکول میں مضامین میں شعر لکھنے کے بجائے خود شعر بنا کر لکھا کرتی تھی۔ کالج کے مشاعروں میں ہمیشہ اول یا دوم انعام لیا کرتی تھی۔ آزاد نظمیں لکھا کرتی تھی۔ چونکہ کہانی نویس تھی اس لیے نظمیں بھی طویل ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا تھا کہ تمہاری نظم میں آزاد نظم کے سب لوازمات ہیں ذرا مختصر لکھا کرو۔ نثری نظم جسے میں "نثر لطیف" کہتی ہوں اس سے بھی ایک ڈائری بھری پڑی ہے۔ کبھی کبھار کسی رسالے میں کوئی ایک آدھ نظم چھپوا دیتی ہوں۔

مجھے فوٹو گرافی کا بھی بہت شوق رہا ہے۔ ایک چھوٹے کیمرے کے علاوہ میرے پاس "یوشیکا" تھا جو میں نے سعودی عرب سے منگوایا تھا۔ قدرتی مناظر اور بچوں کی تصاویر لینا پسند تھا۔ شیریں کی شاعری کی تصاویر میں نے اور اشفاق بھائی نے ہی بنائی تھیں اپنے اپنے کیمرے سے اور زبردست رزلٹ آیا تھا۔"

"آپ نے کہا کہ میں ڈائریکٹ ہی لکھ لیتی ہوں کاپی بھی نہیں ہوتی تو اب تو زمانہ فوٹو اسٹیٹ کا ہے۔ اس سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا آپ نے؟"

"یہی تو خامی ہے مجھ میں شاید ہمیشہ وقت کی کمی رہی ہے گھر میں سب ہی کہتے تھے کہ ایک بار لکھنے کے بعد دوبارہ لکھ لیا کرو مگر نہیں۔ جب کہانیاں گم ہوئیں تو فوٹو اسٹیٹ کروا لیتی تھی۔"

"گھر میں کس کس نے آپ کی حوصلہ افزائی کی کہ آج آپ اس مقام پر ہیں؟"

"امی ابو کے علاوہ بھائی جان جاوید اور بھائی جان جمیل میری تحریروں کو بہت سراہتے تھے۔ حالانکہ جاوید بھائی کی زندگی میں تو میں اور شاہدہ صرف بچوں کے رسالوں اور اخبارات میں ہی لکھا کرتی تھیں لیکن جاوید بھائی بہت فخر سے اپنے دوستوں کو بتاتے تھے کہ یہ میری چھوٹی بہنوں نے لکھا ہے۔ ہماری تحریر کے حوالے سے جو تعریفی خطوط چھپتے تھے ان کی کٹنگ بھی ان کے بریف کیس سے ملیں ان کی وفات کے بعد۔

اسی طرح جمیل بھائی زیادہ تر انگریزی ادب اور کتابیں پڑھتے تھے۔ لیکن میری اور شاہدہ کی کہانیوں کے لیے خواتین کے رسالے لیتے تھے مثبت

تنقید کرتے تھے اور مشورے بھی دیتے تھے۔ سقوط ڈھاکہ کے لیے لکھنا چاہا تو مجھے کتابیں لا کر دیں۔ ایئر فورس کے میس سے اپنے ایک دوست جو کہ آرمی میں کرنل تھے اور جنگی قیدی بھی رہ چکے تھے۔ انہیں گھر پر دعوت دی کہ تم نے جو کچھ پوچھنا ہو پوچھ لینا، انہوں نے بہت کچھ بتایا تھا۔ کچھ باتیں میں نے نوٹ کرلیں۔ چھٹیوں میں ان کے پاس راولپنڈی گئی ہوئی تھی۔ بھائی کہتے تھے کہ جب بھی لکھو حقائق کے ساتھ لکھو، لیکن ابھی میں نے لکھنا شروع ہی کیا تھا کہ ان کی ڈیتھ ہوگئی۔ پھر تقریباً دو سال تک میں نے کچھ نہیں لکھا۔

کافی عرصے بعد میں نے "شکستہ آب گینے لکھا جو شعاع میں لکھا۔ جو پوائنٹ نوٹ کیے تھے وہ گم ہوچکے تھے اور بہت کچھ بھول گئی تھی۔

میری ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ میں کچھ ایسا ضرور لکھوں، جس سے معاشرے میں کچھ اصلاح کرسکوں، 1982ء میں، میں بی ایڈ کی طالبہ تھی تو ان دنوں اخبارات میں پورے پورے صفحات کے اشتہار شائع ہوئے تھے۔ بنگالی جادو گر، کالے جادو کے ماہر، مجھے ایسے اشتہارات دیکھ کر بہت حیرت ہوتی تھی اور میری سوچ یہ تھی کہ ہمارا ملک ایک اسلامی ملک ہے تو اس طرح کھلے عام اس طرح کے اشتہارات نہیں ہونے چاہئیں۔

وہ دور جنرل ضیاء الحق کا تھا۔ ہم نے ہوسٹل کے کمرے میں بیٹھ کر ایک خط لکھا اور ان کے مقرر کردہ شکایت آفس میں بھجوادیا۔ ان دنوں ہمارے خط پر فوراً ایکشن لیا گیا اور اشتہارات آنے بند ہوگئے اور آرمی نے جگہ جگہ ان جادوگروں کے ٹھکانوں پر چھاپے مارے۔ اب پتا نہیں یہ خط کا اثر تھا یا ویسے ہی حکومت نے ایکشن لیا تھا مگر ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ خط کا اثر تھا۔ بعد میں پھر میں نے اس موضوع پر کہانی بھی لکھی تھی "سرطان" کے نام سے اور اب دیکھیں آج کل پھر وہی حال ہے کاش کوئی اس طرف پھر توجہ دے۔"

"مزید کچھ اپنے بارے میں بتانا چاہیں گی؟"

"میرا پورا اور اصلی نام زاہدہ نگہت ہے۔ نگہت سیما قلمی نام ہے۔ رسالے "غنچہ" میں ہر ماہ ناقابل اشاعت والوں کی بھی ایک فہرست ہوتی تھی تو اس ڈر سے نام تبدیل کیا کہ طارق مذاق نہ اڑائے ناقابل اشاعت میں نام دیکھ کر، کیونکہ کہانی تو اسی نے پوسٹ کرنی ہوتی تھی۔ شاہدہ نے بھی میری تحریر کے فوراً بعد غنچہ میں لکھنا شروع کیا "طلعت سیما" کے نام سے اسے بھی ہر ماہ انعام ملتا تھا۔ لیکن پھر وہ تو فوراً ہی اپنے اصلی نام سے لکھنے لگی۔ اور اس وقت مجھے "سیما" کے نام کا مطلب بھی نہیں معلوم تھا۔ یونہی کسی کا سن کر رکھ لیا تھا۔"

مجھے پاکستان سے عشق ہے قائداعظم اور علامہ اقبال کے خلاف کچھ نہیں سن سکتی۔ مجھے ان لوگوں پر افسوس ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ ہماری ہجرت بے معنی اور بے مقصد تھی۔ جو سکھوں اور ہندوؤں کی تعریف میں مرے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری تہذیب وثقافت ایک ہے۔ میرے نزدیک پاکستان ناگزیر تھا۔ میں نے ہجرت کے دکھ نہیں دیکھے لیکن میں نے سنا اور پڑھا ضرور ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں ایک آزاد ملک میں پیدا ہوئی۔

"اور آخر میں مجھے اپنے قارئین کا شکریہ ادا کرنا ہے جو مجھے پڑھتے ہیں۔ چاہے پسند کریں یا نہ کریں لیکن ہم ان کی وجہ سے ہی یہاں ہیں اور ان کی وجہ سے ہی لکھتے ہیں اور خواتین ڈائجسٹ سمیت سب پرچوں کا بھی شکریہ جو ہماری تحریروں کو چھاپتے ہیں اور ہم لکھ رہے ہیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی نگہت سیما صاحبہ سے ہم نے اجازت چاہی، اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں وقت دیا۔

☆☆

عارفہ فضل شاہ......گاؤں حمید

جنوری کا شمارہ آج صبح ملا اور اب رات کے نو بج کر اڑتیس منٹ پہ تبصرہ لیے حاضر ہوں۔ سردی کی شدت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ آفتاب میاں کو دیکھے آج چھ دن ہو گئے ہیں۔ ارے بھئی سورج کی بات کر رہی ہوں۔ ہم ابھی چھوٹے ہیں۔ میاں والے نہیں ہوئے۔

کل محمد زوار شاہ کی برتھ ڈے کی تصویریں عذرا باجی کو بھیجی ہیں تو وہ حیران کہ ”پاکستان میں جس کو کال کرتی ہوں یہی کہتا ہے، بہت سردی ہے، تم خود صبح شام سردی سردی کی گردان کرتی رہتی ہو اب تو سب ایسے تیار ہو کے بیٹھے ہیں گویا اپریل کا موسم ہے۔

(بھئی سردی اپنی جگہ، فیشن اپنی جگہ اور کوئی بھی کیا تھا ویلوٹ کا ڈریس پہنا کوٹ کے ساتھ اسٹرال لیا اور ہائی ہیل شوز پہن کر ہم تو تیار)

خیر سردی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ زیادہ تر وقت بستر میں گزرتا ہے۔ کہیں آنا جانا ہو نہیں رہا سو میرے جیسی کتابی تتلی (بھئی کیڑا کہنا مجھے نہیں پسند) تو بہت خوش ہے۔ پڑھنے لکھنے کو وقت ہی وقت میسر ہے الحمدللہ۔

اب آتے ہیں جنوری کے شمارے کی طرف۔

آنٹی پرابلم پسند آیا۔ ترس...... بہتر تھا۔ تحفہ...... اچھا افسانہ تھا۔ انگلش شارٹ اسٹوری یاد آ گئی۔ لیکن شکر ہے ”تحفہ“ میں اس کی طرح ٹریجڈی نہیں تھی۔ کہر میں ڈوبی شام...... رائٹر نے ہیروئن کو اپنا نام ہی دیا۔ یونیک ماء الملوک۔ کیا کہنے۔ رسالے کی جان۔ کمال کی تحریر ہے۔ بھلائے نہیں بھولے گی۔ یہ واحد قسط وار ناول ہے جو میں پڑھ رہی ہوں ورنہ میں ہمیشہ مکمل ہو جانے کے بعد پڑھتی ہوں۔

ج:۔ پیاری عارفہ! آپ کے افسانے شائع ہو رہے ہیں۔ آپ اچھا لکھ رہی ہیں۔ خواتین پسند آیا، بہت شکریہ۔

مہرن پھپھو اور راہ کے ستارے ان شاء اللہ مارچ کے شمارے میں شامل ہوگا۔



نادیہ خاکوانی



خط بھجوانے کے لیے پتا۔
خواتین ڈائجسٹ۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:Info@khawateendigest.com

صفیہ مہد فرحان......کوٹلی مراں خان پور

جنوری کا رسالا پندرہ کو ملا۔ اسی رات سالا خود بھی پڑھی۔ شوہر کو بھی زبردستی سناتی ہوں، وہ ساتھ ساتھ کھلی گرافی کرتے جاتے ہیں، ہنستے بھی جاتے ہیں میں پوچھو اب سناؤ۔ کیا سنایا تو کہتے ہیں اس ساری قسط میں محمینہ اور اسپتال ہی ہے۔ ان کا شکریہ کہ یہ میری خوشی میں خوش ہنستے جاتے ہیں، پھر اس کے بعد پڑھے سلسلے ”نیا سال“ میں نے دھڑکتے دل سے اپنا نام ڈھونڈا مل گیا۔ بہت شکریہ۔ بہن صدف ناصر کا پڑھا، مزہ تو آیا، لیکن مختصر تھا پھر مہوش چدھر کا پڑھا سوال نمبر دو نے لرزا دیا اتنی ظالم ماں بھی ہو سکتی ہے۔

پھر اپنی پسندیدہ زرینہ خانم کو دل سے پڑھا، زرینہ جی آپ ایسے کیوں سوچ رہی ہیں کہ بدعادی ہو گی تائی نے یہ اللہ کے کام ہیں۔

باقی ساری بہنوں کے بہترین لگے، رائٹر نازیہ

جمال سادہ سی اچھی محفل جما گئی، ہمارے نام، خوشی سے دل باغ باغ ہو گیا، صدف ناصر، اور گوشی جمال کا خط میں محتاط ہو کر پڑھتی ہوں اور غور سے کہ مجھے اچھے لگتے ہیں ان کے خط، اس بار تو صائمہ گل بھی ہمارے نام کے باغ میں کھل رہی تھیں۔

سلسلے وار ناول، انگنا پھول کھلیں گے، وسیم سے زیادہ بہتر ارم کے لیے عفان رہے گا، باقی راحت جائیں، افسانہ کھرا سکہ، عارفہ فضل شاہ واہ ہمیں لگا کہانیاں، رسالے پڑھ کر صرف لڑکیاں خواب سجاتی ہیں۔ حمیرا شفیع ہماری طرح خط لکھتی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے رائٹروں کے افق پر چمکیں (تحسین نما فقرہ) قسمت نے ساتھ دے دیا تو ہم بھی آ جائیں گے (ہاہا) حمیرا جی ہر سال پہلی نیو ایئر نام کا افسانہ لکھتی ہیں۔ اللہ قلم میں اور برکت دے۔

نگہت سیما، سینئر رائٹر۔ سادہ قلم، سادہ تحریر کہانی دلچسپ تھی، بس آخر میں آمنہ کے رول میں جھول آ گیا، فاختہ رابعہ، گمان دل کے، سبق آموز افسانہ رہا۔ ظرف قدح، ملیا سمون دلچسپ یہ تو ہمارے گھر کی اسٹوری لگی ہم بہنیں بھی ساری شادی شدہ ہیں، اور بھائی دو کنوارے تو بہت پریشانی ہوتی ہے ہمیں ان کی طرف سے اللہ ہمیں بھی خوب سیرت بھابھی دے، آسیہ رئیس کا نام اچھی اسٹوری کی ضمانت۔ بہت پیاری کہانی لکھی دل سے اور دلوں کو چھو گئی پر عدیمہ اور سارہ کا (رونمائی) ویڈنگ گفٹ یونیک لگا۔

ناول (احد) لمبا تو ہو گیا ہے مگر دلچسپی ہنوز ہے، خاتون کی ڈائری، ریحانہ چوہدری بازی لے گئیں۔ باقی سلسلے بھی بہترین ہیں۔

پیاری صفیہ......! آپ کے شوہر کی ہمت کی داد دیتے ہیں کہ آپ کی خاطر ناول خاموشی سے سنتے ہیں اور ہنستے رہتے ہیں۔ یقیناً یہ آپ کے لیے ان کی محبت ہی ہے ورنہ عموماً تو شوہر حضرات بیویوں کے رسالوں، کتابوں پر تنقید ہی کرتے نظر آتے ہیں۔۔

مفصل اور جامع تبصرے کے لیے شکریہ۔

رمشا رزاق...... فتح پور لیہ

میرے خوابوں میں سے ایک خواب پورا ہو رہا ہے وہ ہے خط لکھنے کا۔ مجھے لگتا ہے کہ لکھنے سے لفظ دل سے ادا ہوتے ہیں یعنی دل کی آواز ہوتے ہیں اور میرا یہ خواب صرف اور صرف آپ کی وجہ سے پورا ہوا ہے۔

خواتین اور شعاع دونوں پڑھتی ہوں جب میں چھوٹی تھی تو میری بہنیں پڑھتی تھیں اس سے مجھے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا مگر میں نے آج تک اس کے بارے میں رائے نہیں دی۔

ج: پیاری رمشا! خواتین کی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں اللہ تعالیٰ آپ کے سارے خواب پورے کرے۔

عروج عباس......کراچی

سب سے پہلے سروے چیک کیا تو معلوم ہوا ہمارا نام بھی شامل ہے پھر دل کو تسلی ہوئی اور دل سے آپ کے ادارے کے لیے تھینک یو نکلا اور اک شعر بھی زباں پہ مچلا۔

پہلے لفظ پڑھتا تھا اس کو
پھر میں نے اسے یاد کر لیا

کرن کرن روشنی احادیث کا اعادہ کرنے کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں۔ اے حمید صاحب کی یادوں کی باتیں اداس کر گئیں۔

صدف ناصر اور صائمہ گل بہن نے سروے کا پہلا سوال اسکپ کیا لیکن صدف ناصر کے سفر کا احوال خوب دلچسپ رہا۔ شازیہ جمال طارق کی طرح نازیہ جمال صاحبہ کا بھی انٹرویو بہتے پانی کی روانی لیے تھا اور ذرا بھی بوجھل نہ لگا اور ان کے والدین نے جو علم دوست ماحول اولاد کو مہیا کیا، واقعی قابل تحسین۔ کاش میری بھی کوئی بہن ہوتی بھائیوں کے اپنے مشاغل اور دلچسپیاں ہیں میں اکیلے ہی اپنی کتابوں سے دل لگائے رکھتی کہ فی زمانہ ان ہی سے دل لگانا بہترین ہے۔

"انگنا پھول کھلیں گے" ارم نے واقعی اچھا فیصلہ کیا اور مالا میں اس بار معید نے بھی وہی روایتی بھائیوں والا سلوک کر کے اچھا نہیں کیا۔

اسی لیے تو ورثے میں ملی جاگیروں سے ڈر لگتا

ہے۔ احد میں اجلی کے حوصلے اور استقامت کو داد دیے بنا نہ رہ سکے اور راہ حق میں اس طرح کے امتحان تو قدم قدم پر ہوتے ہیں۔ میری ایک جاننے والی وہ کرسچن سے مسلم ہوئیں تو انہیں بھی ان کے سسرال والوں نے نہیں اپنایا لیکن ہمارے ان بھائی نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ماں اور بیوی میں انصاف کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اس توازن کے رکھنے میں انہیں بھی بڑی استقامت دکھانی پڑی۔ مکمل ناول واقعی مکمل تھے تعریف کے لحاظ سے "چلو تم کو بتاتے ہیں" میں غزنی اور نیلی کا کردار اچھا لگا۔ "اسیر جاں" آسیہ رئیس کے مکمل ناول نے آخر تک اسیر کیے رکھا عدیمہ کا کردار اچھا لگا، تانگ میں تکلیف ہونے کے باوجود وہ صرف گھر کی ہو کے نہیں رہ گئی۔ افسانوں میں قانتہ رابعہ کا نام دیکھا تو پہلے انہیں ہی پڑھا لاجواب رہا۔ حمیرا شفیع بھی نیو ایئر مناتی نظر آئیں۔ فاطمہ احمد کی نظم دل کو لگی، واقعی ڈپریشن میں کچھ ایسا ہی حال ہوتا ہے خاتون کی ڈائری سے ریحانہ چوہدری کا انتخاب پسند آیا۔

ج: پیاری عروج! تفصیلی تبصرے کے لیے تہ دل سے ممنون ہیں۔ بہت شکریہ۔

تسمینہ اسامہ بخاری ...... کراچی

معذرت کے ساتھ میں آج یہ میل شکوہ کرنے کے لیے کر رہی ہوں۔ میں آپ کو اپنا ایک افسانہ جس کا نام "آئیڈیل" تھا اور ایک قسط وار ناول جس کا نام "خوب صورت" تھا ڈیڑھ مہینے پہلے بھیج چکی ہوں ،آپ نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔

ج: پیاری تسمینہ! قسط وار ناول آپ مکمل کر کے بھجوائیں۔ پورا ناول پڑھے بغیر ہم کیسے کوئی رائے دے سکتے ہیں۔ افسانہ کے لیے معذرت۔

مسز خالد ...... شاہدرہ لاہور

نمرہ جی کی میں فین ہوں۔ گوشی بہن کے خط شوق سے پڑھتی ہوں۔ "انگنا پھول کھلیں گے" پسند نہیں [illegible] کیونکہ [illegible] زیادہ سازشیں مجھے پسند نہیں۔ میں اپنے دیور کے لیے رشتہ ڈھونڈ رہی ہوں ان کی ایج تھوڑی زیادہ ہے۔ اس لیے کسی طلاق والی لڑکی کا رشتہ چاہتی ہوں۔ اگر گوشی بہن نے اپنی بہن کا رشتہ کرنا ہو یا کسی دوسری بہن کے گھر میں ایسا کوئی رشتہ ہو تو مجھ سے رابطہ کریں ۔ہمیں جہیز کی ضرورت نہیں۔ میرے دیور کی اچھی تنخواہ اور اپنا گھر ہے۔

ج: مسز خالد! نے ہمیں اپنا فون نمبر دیا ہے۔ اگر بہن گوشی جمال یا کوئی اس رشتہ کے بارے میں جاننا چاہے تو فون نمبر ہم سے لے سکتا ہے۔

تہمینہ شوکت ...... مرید کے

مجھے لکھنے کا بہت شوق ہے۔ میں لکھنے کے ساتھ ساتھ خواتین ڈائجسٹ پڑھنے کی بہت شوقین ہوں۔ میں ایک حقیر سی لکھاری ہوں۔ میں نے جو دو ناول لکھے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کو نہ بھی پسند آئے تو آپ لوگ موبائل فون پر میری غلطیاں جو میں نے ان ناولوں میں کی ہیں، وہ مجھے، بتا دیں اور تھوڑا سا مجھے گائیڈ بھی کر دیں۔

ج: پیاری تہمینہ! آپ کی تحریر میں پختگی نہیں ہے ابھی آپ صرف مطالعہ کریں۔
اور یہ کیا بھئی لکھنے والا کبھی حقیر نہیں ہوتا بلکہ کوئی بھی حقیر نہیں ہوتا۔

فہمیدہ جاوید ...... ملتان

سرورق اچھا تھا مگر شعاع کا زیادہ پسند آیا تھا کہ یہ خواتین والا ذرا گاؤں کے انداز کا سا تھا پنجابی سا۔ نازیہ جمال سے ملاقات بہت اچھی رہی۔ دلچسپ و برجستہ سی ہاں اب نگہت سیما سے ملاقات کا شدت سے انتظار ہے مگر انٹرویو طویل سا ہو۔ سروے بہت ہی دلچسپ سا تھا اور پڑھ کر مزہ آیا۔ غنی علی عمیر سے ملاقات بالکل پسند نہیں آئی کہ سوالات پہلے والے تھے۔ نگہت سیما کا مکمل ناول "چلو تم کو بتاتے ہیں" سال نو کا تحفہ تھا جو کافی دلچسپ تھا جس میں غزنی کا کردار بہت اچھا لگا وہیں اس کے بھائی نے بھی [illegible] جو اپنے باپ کو [illegible] دلائی مگر اپنی ہی پسند کو انجانے میں ریجیکٹ کر رہا تھا مگر آخر میں سب صحیح ہو گیا۔ ہاں نگہت اب طویل سلسلہ وار ناول شروع کر دو بھئی کہ ہم تو پڑھنا چاہتے ہیں۔

"اسیریاں" کہانی بھی طویل و دلچسپ تھی عدینہ، مازن، حارث و سارہ کے کردار اچھے تھے۔ مازن نام پہلی بار پڑھا۔ آخر میں بڑوں کی کہانی بتا کر عرق ریزی سے اختتام ہوا وہیں سارے گلے شکوے ختم ہوئے اور سب کو ان کی مراد مل گئی۔

افسانہ "کھرا سکہ" کچھ منفرد اور اچھا رہا جس میں فیکا بھی واقعی کھرا سکہ ہی تھا جو اصل ہیرو ہی تھا۔ حمیرا کے افسانے تو ہمیشہ سے ہی سہل مگر اصلاحی سوچ پر مبنی ہوتے ہیں۔ نئی نسل کو ایک اچھی سوچ دی بہت خوب۔ قانتہ رابعہ کا افسانہ "گمان دل کے" جو شیطان کی طرف سے خاتون کے دماغ میں آتے تھے۔ آخر میں صحیح سبق ملا۔ اچھا افسانہ تھا۔ "ظرف قدح" بھی ایک اچھا گھریلو افسانہ رہا جس میں ساس کی مثبت سوچ قابل تعریف تھی جس نے سوچ بدلی اور سبق دیا۔

راحت جبیں اور صوفیہ بٹ کی کہانی پر اگلے ماہ تفصیل سے تبصرہ کروں گی۔ مالا کے لیے بہت معذرت میں نے شروع کی چند اقساط پڑھی تھیں اور پسند آئیں۔ نمرہ کی بس نمل اور مصحف پسند آیا تھا۔ فاطمہ احمد کی نظم "ڈپریشن" پسند آئی۔ شگفتہ جاہ کے سارے پھول ہی دلچسپ اور رنگا رنگ تھے۔ اہل خاتون کی ڈائری میں شروع میں جو چھوٹی سی شاعری کی تفصیل سی ہوتی ہے۔ بہت اچھی لگتی ہے۔ اشعار ویسے تو سارے اچھے تھے مگر زرینہ خانم لغاری، فاکہہ سہیل اور صدف عمران زیادہ پسند آئے۔ ام حمنہ کا کچن کا سلسلہ دلچسپ سا تھا ہاں عدنان بھائی کا سلسلہ تو مجھے بہت ہی پسند ہے جس میں دوسروں کے مسائل اور مشورے پڑھ کر مثبت و تعمیری سوچ ملتی ہے۔

ج: پیاری فہمیدہ! آپ کے طویل اور مفصل تبصرے نے ہماری حوصلہ افزائی کی، اس کے لیے ہم تہہ دل سے ممنون ہیں۔ خواتین آپ کو پسند آیا بہت شکریہ۔ ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ بہتر سے بہتر بنا کر پیش کریں۔ کامیابی اللہ کے اختیار میں ہے۔ یہ اللہ کا کرم ہے۔

فہمیدہ آپ کی فرمائش پر نگہت سیما کا انٹرویو شامل ہے۔

سونیا احمد......ملتان

آج کا خط کسی بھی کہانی کے بجائے راشدہ رفعت کے نام، اتنا اچھا لکھتی ہیں۔ اتنے اچھے سے روزمرہ کے واقعات کو سمجھاتی ہیں اتنے پیار سے اور سلجھے ہوئے انداز میں سب گرہیں اچھے سے سلجھا دیتی ہیں پڑھ کر مزہ آجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ راشدہ رفعت کو جزائے خیر عطا کرے۔ پلیز راشدہ رفعت کا انٹرویو کریں۔ میں کہتی ہوں، ہر ماں کو اپنی بیٹیوں کو لازمی راشدہ کی تحریریں پڑھوانی چاہییں۔

ج: پیاری سونیا! خواتین کی محفل میں خوش آمدید آپ یہ نہ سوچیں کہ آپ کو اچھا لکھنا نہیں آتا۔ آپ خط میں پوری سچائی سے پرچے کے بارے میں اپنی رائے لکھ دیں۔ ہمارے لیے آپ کی رائے اہم ہے خط اچھا ہو یا برا، اس سے فرق نہیں پڑتا ویسے آپ نے بہت اچھا خط لکھا ہے آئندہ خط لکھیں تو پرچے کی دیگر تحریروں پر بھی تبصرہ کریں۔

گوشی جمال......منڈی یزمان

عمدہ لباس زیب تن کیے جنوری کا ٹائٹل ایک خوش گوار احساس دلا گیا۔

اس سال ہمارے خاندان میں کافی شادیوں کا ڈھول پیٹا جا رہا ہے۔ ابھی کل ہی ہم بھی شادی کی شاپنگ کرنے بہاول پور پہنچ گئے ہمراہ دولہا اور فیملی ممبرز۔ لگتا ہے سردیاں اب جنوری سے زور پکڑ رہی ہیں کیونکہ دسمبر تو بس فوگ اسموگ کی نذر ہو گیا، جب کہ اب ٹھٹھرتی ہوئی کہر زدہ لہریں یخ بستہ بدن کو چیرتی ہوائیں عروج پر ہیں۔ آٹھ دن ہو گئے۔ دھوپ نہیں دیکھی۔ اندھیرے میں کٹتے دن رات۔ اس شدت کو کم کرنے کے لیے کمروں میں دہکتے ہوئے، ہیٹر، مچھلی کے پکوان اور دیسی مٹھائیوں سے لطف اندوز۔ سہولیات ہوں تو ہر موسم اچھا، نہ ہوں تو واویلے اور کوفت سے [illegible] کے ساتھ سردیاں یہ۔

کل چھ جنوری کو فل دھند، کہر میں ہمارا قافلہ بائیکوں پہ بہاول پور کے لیے رواں دواں ہوا تو لگ پتا

گیا کہ آخر سردی ہے کیا چیز؟ کیونکہ گاڑی ،بازاروں کے اندر لے جانا ممکن نہیں تھا۔

زوبی نے ملکی وہائٹ شرارہ اوپر سے لانگ شرٹ اور آرگنزا کا دوپٹہ زیب تن کرنے کا شوق فرمانا تھا۔ ایک گھنٹہ تو بازاروں میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بائیک پر پیچھے بیٹھ کر سن، آنکھ، کان، ناک حتی کہ پورا جسم تھر تھر کانپتے۔

بازار میں ایسا لگ رہا تھا۔ ہر طرف سے برف کے گولے برس رہے ہیں لیکن ہم، شادی میں سب سے منفرد نظر آنے کے چکر میں چکرا چکرا کر دکانوں پہ ڈھیر۔

آپا شاہانہ کی فرمائش ''میرے لیے ریشمی جوڑا مت لانا۔ کوئی ویلوٹ یا کھدر کا موٹا سوٹ ہو۔ میں نے اکڑنا نہیں۔ تم لوگ اپنے ساتھ میرا بیڑا غرق مت کرنا۔''

شاہانہ کی نصیحت پلوے باندھے۔ خریداری میں مصروف مطلوبہ سامان دریافت کرکے، بازار کے باہر اچانک نیوز ایجنسی پہ ایک تار پہ لٹکتے خواتین ڈائجسٹ پہ میری نظر پڑی۔ یقین کو پختہ کرنے کے لیے میں شاپنگ بیگز سے لبریز فوراً دکان کے اندر۔ باقی ٹولہ فرید گیٹ کراس کرگیا۔

جنوری سال نو نمبر جھٹ تار سے کھینچ کر اتارا تو اس بے چارے کے باقی شمارے ادھر ادھر۔ یقین دہانی کرکے فوراً ہزار کا نوٹ نکال کر اسے تھما دیا۔

''وہ جی! میرے پاس چینج نہیں ہے۔''

پرس کھنگال کر دیکھا صرف سو روپیہ۔ میرا قافلہ بھی آگے نکل گیا۔ اتنے میں فون بلنک ہوا، میری گمشدگی کی بابت میں...... خواتین ڈائجسٹ سینے سے لگائے، شاپنگ بیگ اس کی دکان میں رکھے کال پہ مصروف باہر۔

''توصیف بھائی، ایک پچاس کا نوٹ لے کر فرید گیٹ آنا۔'' میں نے اپنا آرڈر جاری کیا۔

پیچھے سے دکان دار آوازیں لگا رہا کہ آپ کا سارا سامان ادھر ہی رہ گیا۔ میں بھلکڑ صرف خواتین کو سینے سے لگائے کان پہ موبائل دھرے فرید گیٹ سے باہر۔

بھائی توصیف نے چھوٹی زیب النساء کو پچاس کا نوٹ تھما کے روانہ کیا اور یوں یہ پہاڑ سر ہوا۔ بائیک پہ بیٹھ کر ورق گردانی شروع۔۔۔ فہرست پر نظر ثانی کی۔ واہ! ڈھیر سارے ناولز! خوش رہیں کچھ ٹریجڈیز پڑھ کر دل آبدیدہ ہوا۔

ام حمنہ کا مختصر لیکن دلچسپ باورچی خانہ اچھا لگا۔ پکوان تین ریسپیز پہ ٹرخا دیا۔ مجبوری بھی سمجھ میں آگئی صفحات کی کمی۔ نازیہ جمال کو اتنا پڑھا تو نہیں جتنا پڑھا، عمدہ تحاریر سے فیض یاب ہوئے۔ البتہ غنی علی عمیر میں ذرا ہمیں دلچسپی کم ہے۔ میرے خط کی پسندیدگی کا احوال کچھ کمنٹس کرتی رہتی ہیں ان کا تہ دل سے شکریہ۔

ساجدہ ظفر کمالیہ کی نظر میں ابھی شاید میں ایک ''معمہ'' ہوں حالانکہ شاید اتنا تبصرہ میں نے شماروں پہ نہیں کیا ہوگا جتنا اپنے اور اپنی بہنوں کے بارے میں خاصے تفصیل سے کیے ہیں اب تو سب کو از بر ہو جانے چاہئیں۔ ''انگنا پھول کھلیں گے'' میں ثانیہ کی ناشکری سمجھ سے باہر ہے۔ ''کھرا سکہ'' فیکا جیسے کردار ہر مرد میں ہو تو کوئی عورت دکھی نہیں ہوگی۔ ''چلو تم کو بتاتے ہیں'' بہت ہی خوب صورت نظم پہ اختتام۔ نگہت سیما کی تحریر پہ تبصرہ سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

ج: گوشی جی! بہت شکریہ کہ اتنی باقاعدگی سے پڑھنا اور مصروفیات میں سے وقت نکال کر لکھنا خاصا وقت طلب کام ہے۔

لاہور سے مسز خالد نے ہمیں خط لکھا ہے آپ یا آپ کی بہن چاہیں تو ہم سے ان کا نمبر لے کر ان سے بات کرسکتی ہیں۔ آئندہ خط میں اپنی بہن کا نمبر لکھ دیں، ہم فون کرلیں گے۔

سعدیہ مصطفیٰ...... مڑہ بھنگواں

میں نے زیادہ لٹریچر تو نہیں پڑھا مگر پھر بھی اپنے آس پاس کے ماحول کا مشاہدہ کرنے کے بعد جو ادراک مجھے ہوا ہے کہ ہماری ''یوتھ'' میں اب کتابیں

بقیہ صفحہ 206 پر

راحت جبیں

آنگنا پھول کھلیں گے

پندرہویں قسط

وسیم کے لہجے سے ارم کو دھچکا سا لگا۔

''آپ کو مجھ سے وجہ تو پوچھنا چاہیے تھی کہ میں نے یہ سب کس لیے کیا؟''

''وجہ میری سمجھ میں بہت اچھی طرح آ چکی ہے۔ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بے وقوف بنانے کے لیے میں ہی ملا تھا۔ پہلے رشتہ بھجوانے کو کہا۔ پھر سارے گھر کے سامنے انکار کر دیا۔ کیا چاہتی ہو، تمہارے آگے پیچھے پھروں۔ منتیں کروں یا یہ کہوں کہ تمہارے بغیر مر جاؤں گا۔''

اتنا غصہ اتنی بدگمانی۔ وہ سادہ سی لڑکی دہل کر رہ گئی تھی۔ مقابل کے لہجے میں غصہ تھا۔ طیش و غضب تھا اور اس کے گھر کے مرد عورتوں سے بلند آواز میں بات نہیں کرتے تھے۔ اس کے لفظ حلق میں اٹک کر رہ گئے۔

''اور اب جو کچھ تم نے ثانیہ کے ساتھ کیا ہے؟''

''میں نے ثانیہ کے ساتھ کچھ نہیں کیا بلکہ اس نے میرے ساتھ کیا ہے۔ اس کی اور نتاشا کی آپس میں۔''



"مجھے میرے گھر والوں کے خلاف بغاوت کے لیے اکسا رہی ہو۔ بہن کے خلاف کرنا چاہتی ہو۔ بس کرو ارم! میری نظروں سے کتنا گرو گی؟" اس نے اتنی تیزی اور درشتی سے اس کی بات کاٹی کہ ارم کو لگا اس کا موبائل پکڑا ہاتھ کانپا ہے۔

"ہر انسان عبید نہیں ہوتا اور یاد رکھو۔ اب اگر تم نے ثانیہ پر الزام لگانے یا اسے تنگ کرنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

"کوئی ہو بھی نہیں سکتا نہ آپ سے برا نہ آپ کی بہن سے۔" وہ پھٹ پڑی۔ اس سے قبل کہ کچھ اور بھی کہتی وسیم نے گویا فل سٹاپ ہی لگا دیا۔

"منگنی کر رہا ہوں ثنا شاہ سے۔"

ارم سن سی ہوگئی۔

"کیونکہ میرے دل میں تو اب تمہارے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔ اس لیے اس بات کو لے کر ثانیہ کو پریشان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ارم نے کچھ بولنا چاہا مگر لفظ ہونٹوں پر منجمد ہو گئے۔

"افسوس ہے کہ تم سے محبت کی......"

رابطہ کاٹ دیا گیا۔ بہت بے دردی، بہت بے رحمی سے۔

ارم کا ہاتھ موبائل سمیت بے جان ہو کر پہلو میں گرا...... ایسا تو نہیں کہ وسیم کی محبت موسلا دھار بارش کی طرح برسی ہو۔ مگر شبنمی اوس کی طرح اس کے احساسات کو ڈھانپا تو تھا...... محبت کی حدت نے اس کے منجمد احساسات کو پگھلایا تو تھا۔ وہ بیکار یقین کہ وہ اس کی بات سنے گا۔ آنسو بن کر بہہ نکلا۔



کچھ نہیں بچا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔

☆☆☆

گھر کی فضا میں ایسی اداسی رچی تھی کہ اپنی ناراضی کو پس پشت ڈال کر آسیہ منانے چلی آئیں۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی بہو ناراض ہو کر میکے چلی جائے۔ وضع دار گھرانوں میں بے عزتی محسوس ہوتی تھی۔

نادرہ نے کوشش تو کی کہ آسیہ کو دوسرے کمرے میں لے جائیں مگر آسیہ کو عادت تھی دادی کے پاس گھس کر بیٹھنے کی۔ نادرہ نے بدمزگی سے سوچا۔ شکر تھا کہ کمرہ صاف تھا کہ رابعہ کر کے گئی تھی۔ دادی ہکا بکا رہ گئیں۔ انہیں اندازہ ہی نہ تھا کہ گھر میں کیا چل رہا ہے۔

''اس کا کیا دماغ چل گیا ہے ایک تو بچاری ارم کے ساتھ اتنا برا ہوا۔ اوپر سے یہ لڑ کر آ گئی۔'' دادی بدک گئیں۔

''بلاؤ ذرا میں پوچھتی ہوں۔''

جب بھی گھر میں کوئی معاملہ ہوتا، دادی فٹ سے بڑی بن جاتیں۔ اور یہ بھی بھول جاتیں کہ انہیں گھر میں پوچھتا کون ہے۔

''نہیں ہے گھر پر، رابعہ کی طرف گئی ہے۔'' نادرہ نے ٹالا۔

''ہاں تو رابعہ کا گھر کیا چاند پر ہے۔ بلالو یا فون کر کے کہو ساس لینے آئی ہیں۔''

نادرہ نے کھا جانے والی نظروں سے دادی کو گھورا۔

''ہماری تو بچی ہے۔ نا سمجھ ہے۔ ناراض ہے تو کیا ہوا؟ میں نے سوچا، میں ہی منالاتی ہوں۔'' آسیہ نے ماحول کو ہلکا پھلکا رکھنے کی سعی کی۔ ''گھروں میں چھوٹی موٹی باتیں تو ہو ہی جاتی ہیں۔''

''اس میں چھوٹی بات کیا ہے؟ بے عزتی تو ہماری ہوئی۔ گھر بلا کر انکار بھی کیا۔ پھر ہماری بیٹی پر الزام بھی لگا دیا۔ اسے جھوٹا اور سازشی بنا دیا۔ پیچھے کیا رہ گیا۔'' نادرہ تنک کر بولیں۔ ''گھر سے نکال دیا۔''

''غلط بات ہے۔'' آسیہ نے رسانیت سے ٹوکا۔ ''نہ کسی نے اس سے جھگڑا کیا، نہ گھر سے نکلنے کو کہا۔ عبید کتنی بار منانے آیا۔''

پھر انہوں نے روئے سخن دادی کی طرف کیا۔

''ثانیہ کو سمجھائیں۔ اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ دو منٹ بات کر کے تم گھر میں بیٹھ کر حل ہو جاتی ثانیہ کا گھر ہے۔ رہی ارم تو آج یہاں ہے تو کل سسرال۔''

''تو بھیجیں سسرال۔ برا نہ مانیں جس گھر میں اتنی لاڈلی بیٹیاں رہتی ہوں۔ وہاں بہوؤں کا گزارہ مشکل ہوتا ہے۔'' آسیہ کو برا لگا۔ تو نادرہ نے لہجہ دھیما کیا۔

''برا نہ ماننا آسیہ! ہم تو بیٹی والے ہیں۔ بات کرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ انسان کو صرف بیٹی کی نہیں بیٹے کے گھر کی بھی فکر کرنی چاہیے۔ ہمیں تو پہلے ہی رابعہ کی سسرال نے ٹانگ رکھا ہے۔ اب دوسری بیٹی کے سیاپے شروع ہو گئے۔'' دادی نے کھا جانے والے انداز میں بہو کو دیکھا۔

ان نظروں کی تاب نہ لا کر نادرہ نے فوراً دوپٹہ منہ پر رکھ کر سسکنا شروع کر دیا۔

''ارم کے لاڈ اٹھانے کے لیے اس کے ماں باپ موجود ہیں۔ بہتر ہے اپنی بیٹی کو سمجھائیں۔ اتنے جذباتی اور اکھڑپن سے گھر ہی خراب ہوتے ہیں۔'' آسیہ کھڑی ہو گئیں مزید بیٹھیں تو بات کا رخ کسی اور طرف ہو جاتا۔

''ان کی تو مت ماری ہوئی ہے۔ تم جاؤ بیٹی! میں بھیجتی ہوں ثانیہ کو۔ کوئی اتنی معمولی باتوں پر گھر چھوڑ کر آتا ہے۔'' دادی نے تسلی دی۔

آسیہ کچھ دل گرفتہ سی دروازے تک آئیں۔ نادرہ انہیں دروازے تک چھوڑ کر آنے کے بجائے سالن سے الجھنے لگیں کہ وہ اپنے کام سے کام رکھیں۔

آسیہ نے دروازے پر ہاتھ رکھا۔ تب ہی دروازہ کھلا اور رابعہ تیزی سے اندر آئی۔ شکر ہے ان کی طرف والے پٹ کی کنڈی لگی تھی۔ ورنہ ان کو دروازہ لگ بھی سکتا تھا۔ رابعہ دوسرا پٹ کھول کر اندر آئی۔ آسیہ کو دیکھ کر خوش ہو گئی۔

''ثانیہ نہیں آئی؟'' آسیہ نے اس کے عقب میں دیکھا۔

''ثانیہ کہاں گئی ہے؟''

آسیہ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ اور اندر ثانیہ سر پکڑ کر رہ گئی۔ رابعہ کو بھی اسی وقت ٹپکنا تھا۔

''آئیں نا آنٹی!'' رابعہ اصرار کرنے لگی۔

''نہیں، میں تو ثانیہ کو لینے آئی تھی مگر لگتا ہے، ابھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تب ہی ملنا بھی گوارا نہیں کیا۔'' انہوں نے شکوہ کناں نگاہوں سے ثانیہ کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا اور دہلیز پار کر گئیں۔ رابعہ کا شرمندگی سے برا حال ہو گیا۔ جھری سے جھانکتی ثانیہ لپک کر باہر آئی۔

''تمہیں بھی اسی وقت آنا تھا۔'' اس نے لپک کر بیرونی دروازے کو کنڈی لگائی۔

''کوئی شرم کرلو...... شرم۔''

''تمہیں کیا تکلیف ہے، یہ میری زندگی ہے۔'' ثانیہ چلائی۔ رابعہ اسے بازو سے کھینچ کر دادی کے کمرے میں لے آئی۔

''تمہاری زندگی ہے۔ مگر تمہاری وجہ سے باتیں تو مجھے سننی پڑتی ہیں۔''

''کیوں میں میکے رہنے نہیں آسکتی......'' ثانیہ زچ ہو گئی۔

''ساری دنیا کو پتا ہے، بونا راض ہو کر آئی ہیں۔'' رابعہ نے طنزیہ کہا۔

''اور امی! یہ آسیہ آنٹی سے ملی کیوں نہیں۔ اب عبید کو پتا چلے گا تو اسے کتنا برا لگے گا۔''

''تم عبید کی فکر نہ کرو۔''

''دادی! آپ ہی اس کو سمجھائیں۔ وہ اب شوہر ہے، محبوب نہیں۔''

''محبوب تھا۔ محبوب ہی رہے گا۔'' ثانیہ نے فخر سے بال جھٹکے۔

''بی بی ان چھوٹی اور بڑی ہوئی چیز میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ وجود کی کشش سے محبوب کو باندھ سکتے ہیں۔ شوہر کو خدمت، محبت اور وفا چاہیے۔'' رابعہ کا طنزیہ لیکچر شروع ہو گیا تھا۔

ثانیہ نے سر پکڑ لیا۔

''نہ...... نہ اس کو عقل والی کوئی بات نہ بتانا'' دادی نے مزید ٹانکا لگایا۔

''ہر کوئی اپنے کام سے کام رکھے، میرے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں۔ میں جب تک ان کو اچھی طرح سبق نہیں سکھالوں گی۔ واپس نہیں جاؤں گی۔'' رابعہ نے زچ ہو کر ماں کو دیکھا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر بیٹی کی بات کی تائید کی۔

''کیونکہ میرا بار بار ناراض ہو کر آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''اس زعم میں خود نہ رگڑی جانا۔'' رابعہ نے غصے سے کہا۔

''بات سن میری بچی۔ ادھر بیٹھ۔'' دادی نے پچکارا۔

''میرا آپ کی نصیحتیں سننے کا کوئی موڈ نہیں ہے۔'' وہ مزید خفا ہوئی۔

''ہم سب کو جتنا مرضی بے وقوف سمجھ لو۔ مگر یاد رکھو۔ عبید کو اتنا تنگ نہ کرو کہ وہ سچ مچ غصے میں آجائے۔ مرد

کا غصہ بہت برا ہوتا ہے۔ اسے جتنے نخرے دکھانے ہیں دکھا۔ مگر وہ نخرے بھی ایک حد تک ہی دیکھے گا۔"
ثانیہ دادی کی بات پر ایک لمحے کو چپ سی ہو گئی۔ شاید کہیں دل کو بات لگی تھی۔

☆☆☆

"ثانیہ گھر آئے تو اس کے ساتھ اپنا رویہ نارمل ہی رکھنا۔" چائے کا کپ میز پر رکھتے ارم نے گردن گھما کر بے حد حیرت سے باپ کو دیکھا۔ وہ کتاب میں گم تھے۔ ارم کے دیکھنے پر مسکرائے۔ کتاب بند کر کے کپ کے پاس رکھی۔

"کیا ہوا؟"

"مجھے لگتا ہے، سارے قصور میرے ہی ہیں۔" اس نے کس جتن سے خود کو سنبھالا تھا۔

"کسی کا قصور نہیں ہوتا۔ ہر انسان اپنا الگ مزاج رکھتا ہے۔ جب ایک نیا انسان گھر میں آتا ہے تو سب کو اپنے انداز و اطوار بدلنے پڑتے ہیں۔ عبید کے سامنے ثانیہ کی برائی مت کیا کرو۔ اس کا دل تمہاری طرف سے خراب ہوتا ہے۔ اب دیکھو ثانیہ نے خود کو کتنا بدلا ہے۔"

"ابو! میں اس کی برائی نہیں کرتی ہوں۔ وہ تو......" ماں کو آتا دیکھ کر اس نے بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔ وہ اکیلی واپس آئی تھیں اور مزاج برہم تھا۔

"کیا ہوا؟ بہو نے آنے سے انکار کر دیا۔" توفیق صاحب نے ہلکے پھلکے میں کہا جیسے یہ کوئی بڑی بات ہی نہ ہو۔

"مجھ سے ملی ہوتی۔ انکار کرتی۔ وہ تو میرے سامنے بھی نہیں آئی۔" وہ برہمی سے کہتی بیٹھ گئیں۔

"میں نے تو منع کیا تھا، مت جائیں۔ مگر امی کو لگتا تھا، وہ جائیں گی اور ثانیہ آتے ہی گلے لگ جائے گی۔" ارم سے رہا نہ گیا۔ آسیہ نے بے حد غصے سے بیٹی کو دیکھا۔

"اپنی زبان بند رکھو۔" ارم سٹپٹا سی گئی۔ "خبردار جو آج کے بعد تمہارے منہ سے کوئی فضول بات نکلی۔" ارم دو قدم پیچھے ہٹی۔ آنکھوں میں بے یقینی سی تھی۔ یہ ماں نے آج کس لہجے میں بات کی تھی۔ پھر وہ تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔

"بہو کا غصہ بیٹی پر کیوں نکال رہی ہو۔" توفیق کو برا لگا۔

"چھوٹی سی بات کا اس نے بتنگڑ بنا دیا۔ دونوں کو دیکھ بھی لیا تھا تو گھر آ کر اتنا واویلا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ رشتے سے انکار تو اس نے خود کیا تھا۔"

"اچھا بس۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ "وہ پہلے ہی بہت پریشان ہے، اسے مزید پریشان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور رہی ثانیہ، تو اسے کچھ دن رہنے دو۔ چند دنوں بعد اسے بھی احساس ہو جائے گا۔"

"اسے احساس ہوتا یا اس کے گھر والوں کو...... تو آج میرا جانا ہی کافی ہوتا۔"

☆☆☆

چاندنی میں بھیگی رات بہت ٹھنڈی تھی۔ وہ شال اوڑھے ایک ایک قدم سوچ سوچ کر ایک ایک سیڑھی پر دھرتی اوپر آئی تھی کہ اندر کی کھولن پر قابو پا سکے۔ مگر آخری سیڑھی پر اس کے قدم منجمد ہو گئے۔

چاندنی میں ڈھلے دو جسم۔

ثانیہ کا سر عبید کے کندھے پر تھا اور عبید کی گرم چادر ثانیہ کے وجود سے لپٹی تھی۔

"تمہارے بغیر ایک پل نہیں گزرتا عبید! مگر کیا کروں؟ میری سیلف ریسپیکٹ کا معاملہ ہے۔ میں بار بار اپنی بے عزتی نہیں کروا سکتی۔ ارم سے کہو، مجھ سے معافی مانگ لے۔ میں گھر واپس آ جاؤں گی۔" یوہ کی برفیلی سر سردرات میں وہ ٹھٹھر کر رہ گئی۔

"کیا اہم ہے؟ میری سیلف ریسپیکٹ یا بھائی کی خوشی۔"

ساری رات نیند بس پلکوں پر جمی رہی، آنکھ میں نہ اتری۔
باپ کا سمجھانا۔
ماں کا لہجہ۔
بھائی کی بے اعتنائی۔
ارم اتنی مضبوط کہاں تھی؟
''مجھ سے غلطی ہوگئی، معاف کردو۔ اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔''
(میرے دل میں اب تمہارے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔) اپنے لیے چائے نکالتی ثانیہ نے مڑ کر نادرہ کو دیکھا۔ انہوں نے خوشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ارم خود چل کر آ گئی تھی اور کیا چاہیے تھا۔
''آئندہ تمہارے کسی معاملے میں نہیں بولوں گی۔'' ارم نے تھوک نگلا۔ (افسوس ہے کہ تم سے محبت کی)
''کوئی بات نہیں۔ غلط فہمی ہو جاتی ہے۔'' ثانیہ مسکرائی۔ ''لیکن آئندہ غلط فہمی ہو تو مجھ سے بات کر لینا۔''
''میں ناشتا بنا رہی ہوں۔ بہتر ہے عبید کے آفس جانے سے پہلے ہی گھر واپس آ جاؤ۔ اس کا دن اچھا گزر جائے گا۔''
ثانیہ کو بہت زور سے چھینک آئی۔
''لگتا ہے عبید یاد کر رہا ہے۔'' نادرہ ہنستے ہوئے اپنا کپ اٹھا کر دادی کو خبر سنانے چلی گئیں۔
''لگتا ہے، سردی لگ گئی۔''
''دادی کہتی ہیں۔ پوہ کی راتیں بہت ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ اور میں نہیں چاہتی۔ تم اس ٹھنڈ میں بیمار پڑو۔''
ارم نے اپنی جیکٹ کی جیب سے ٹشو نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو ثانیہ چونک گئی۔
''آ جانا۔ ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' ارم واپس پلٹ گئی۔
نجانے کیوں ثانیہ نے چائے کے مگ کو دیکھتے فخریہ انداز میں مسکرانا چاہا۔ مگر وہ کھل کر مسکرا ہی نہ سکی۔
''تم کہاں چلی گئی تھیں۔ میں کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔'' آسیہ نے گرم گرم آملیٹ پلیٹ میں نکالا۔ کچن کی فضا میں گرمائش اور ناشتے کی خوشبو تھی۔ سردی کی وجہ سے وہ سب کچن میں ہی ناشتہ کرتے اور رات کا کھانا کھاتے۔
''ایک اور بنا لیں۔'' ارم نے چیز کے سلائس کھول کر ان کے سامنے رکھے۔ عبید اور توفیق آفس کے لیے تیار وہاں آ گئے۔
''چیز آملیٹ کس کے لیے؟'' آسیہ نے حیرت سے پوچھا۔
''ثانیہ کے لیے۔''
کرسی کھینچ کر بیٹھتا عبید بری طرح چونکا...... چونکے تو سب ہی تھے۔ ارم نے باقیوں کے سامنے پلیٹیں رکھتے ایک پلیٹ خالی جگہ پر ہی رکھ دی۔ عبید نے ارم کو غور سے دیکھا اور ارم نے اسے۔
''اگر میرے معافی مانگنے سے میرے بھائی کی مسکراہٹ واپس آ جائے تو مجھے اور کیا چاہیے۔'' توفیق اور آسیہ نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔ عبید نے مسکرانا چاہا۔ مگر نجانے کیوں مسکرا نہ سکا۔
''میں یہ تو نہیں چاہتا تھا کہ تم......''
''تم یہ تو چاہتے تھے نا کہ ثانیہ گھر واپس آ جائے۔'' ارم نے آہستہ سے بات کاٹی۔ عبید نے ہلکے سے اثبات میں سر ہلایا۔
''چلو ماشاء اللہ۔ یہ مسئلہ تو حل ہوا۔ میں جانتا ہوں، میری بیٹی بہت بہادر اور سمجھ دار ہے۔ کبھی کبھی ذرا سا جھک جانے سے بہت سے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ ویل ڈن میری جان۔'' توفیق صاحب پیار سے بیٹی کا ہاتھ تھپتھپایا۔

"تو پھر مانگو اس خوشی میں کیا مانگتی ہو۔" وہ لمحوں میں پہلے والا عبید بن گیا۔ آسیہ خاموشی سے انڈے پھینٹتی رہیں۔ بیٹی کے دل پر کیا گزری ہے، بس وہی سمجھ سکتی تھیں۔

ارم کی آنکھوں کی سطح گیلی ہونے لگی۔

"میرا اعتبار لوٹا دو۔" اس نے ہاتھ بھائی کے سامنے پھیلایا۔ "جو ایک بہن کو اپنے بھائی پر تھا کہ میں جھوٹ بھی کہوں گی تو وہ نبھالے گا، تم نے تو میرے سچ کو ہی جھوٹ بنا دیا۔ لیکن خیر جانے دو اب۔ چھوڑو ان باتوں کو۔" وہ خوامخواہ ہنسی۔

"ابو! آپ پراٹھا لیں گے یا بریڈ......" وہ فوراً ہی بات بدل کر باپ کی طرف متوجہ ہوگئی۔ تب ہی باہر بیل ہوئی۔

"جاؤ دروازہ کھولو۔ آ گئی ہے تمہاری ثانیہ۔" اس نے مسکرا کر بھائی کو ٹہوکا دیا تو وہ خاموشی سے اٹھ گیا۔ اس کی خاموشی میں اطمینان اور سکون تھا۔ ارم مضمحل سا مسکرا کر کرسی سنبھالنے لگی۔

☆☆☆

"اتنی پتھر کیوں ہو جاتی ہو؟" وہ آئینے میں منعکس موم کے مجسمے کو دیکھ رہا تھا۔ سرخ آرام دہ ڈھیلے ڈھالے لباس میں ملبوس وہ اپنے بال سلجھا رہی تھی۔ ثانیہ نے نظر اٹھا کر عقب میں کھڑے عبید کو دیکھا۔ اس کے دونوں ہاتھ ثانیہ کے نازک کندھوں پر دھرے تھے۔

وہ مسکرائی۔ وہی مسکراہٹ جس پر عبید فدا تھا۔

"بس ایسی ہی ہوں۔ غلط بات برداشت نہیں ہوتی۔"

"ارم نے تمہارے گھر جا کر سب کے سامنے معافی مانگی، مجھے اچھا نہیں لگا۔"

"اس نے الزام بھی تو سب کے سامنے لگایا تھا۔ تب اچھا لگا تھا۔" اس نے برش رکھ کر بالوں کو جھٹکا دیا۔ وہ کندھوں پر بکھر گئے۔

"کاش تم تھوڑا سا دل بڑا کر لیتیں تو سچویشن اتنی خراب نہ ہوتی۔" عبید کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

ثانیہ کھڑی ہوگئی۔

"جس دن میری غلطی ہوئی اللہ کی قسم سب کے سامنے معافی مانگوں گی۔ بات کو اتنا بڑھنے نہیں دوں گی۔" وہ اس کی طرف پلٹی۔

"لیکن اب کیا سامنے بٹھا کر یہی باتیں کرتے رہو گے۔ یہ نہیں بتاؤ گے کہ اس کمرے میں، اپنی زندگی میں مجھے کتنا مس کیا۔"

ثانیہ کے ہاتھ اس کے سینے پر تھے۔ لہجے میں لگاوٹ اور والہانہ پن تھا۔

"تم کون سا دور تھیں۔ جب چاہتا تھا، دیکھ لیتا تھا۔" عبید کے لہجے میں نہ لگاوٹ تھی نہ والہانہ پن وہ دریافت کر چکا تھا۔

نارسائی سے رسائی کا سفر طے ہو چکا تھا۔ اب زندگی معمول پر آ جانی چاہیے۔ وہ ہر روز ایک ہی جیسی باتیں کیسے کرے۔ عبید پلٹ کر بیڈ کے کنارے جا بیٹھا۔

"مطلب جو عام ہو جائے، وہ خاص نہیں رہتا۔" ثانیہ کو اس کی بے اعتنائی محسوس ہوئی۔

"زندگی، وقت اور جذبات کبھی ایک سے نہیں رہتے۔"

"محبت ایک سی نہیں رہتی۔" وہ پاس آئی۔

"اظہار ایک سا نہیں رہتا۔" عبید نے ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھا لیا۔ وہ روٹھ گئی۔ دوسری طرف جا کر تکیہ درست کرنے لگی۔ وہ اس کے حواسوں پر چھا جانا چاہتی تھی۔ مگر عبید کے حواس سلامت تھے۔ وہ اس کیفیت سے باہر آ

رہا تھا۔ اس کے ساتھ دکھ سکھ کی سانجھ کا رشتہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ اب صرف اس کی سننا نہیں اپنی بھی سنانا چاہتا تھا۔ زندگی تو اب شروع ہوئی تھی۔

اس نے چت لیٹی ثانیہ کو دیکھا۔ وائلن کی مدھر خوب صورت دھن ۔ مگر ایک ہی دھن ہر روز متواتر۔ یکسانیت۔ بے زاری۔

''بیوی! میں ہر روز ایک ہی ڈائیلاگ نہیں بول سکتا۔ تمہیں میری محبت پر اعتبار ہونا چاہیے۔'' عبید نے اس کے چہرے سے تکیہ کھینچا۔

''تو پھر تمہیں کوئی اچھی رومینٹک موؤی دیکھ لینی چاہیے۔'' ثانیہ نے کروٹ بدل لی۔

رومانس زندگی کا محض ایک حصہ تھا اور وہ اسے پوری زندگی بنانا چاہتی تھی۔ کیسی نادان تھی۔ رواں ہونے کی بجائے ٹھہرے رہنا چاہتی تھی۔ ٹھہراؤ سکوت۔ یہ کائنات کی سچائی تھا نہ مزاج۔

اور ٹھہرے پانیوں میں ہمیشہ بساند اٹھتی ہے۔ خوشبو باقی نہیں رہتی۔

وہ رات اس کی شادی شدہ زندگی میں عجیب انداز میں اتری تھی۔

☆☆☆

بظاہر تو سب نارمل تھا مگر غیر محسوس سا کھنچاؤ ثانیہ اور ارم کے رویے میں تھا۔ ارم خاموشی کے ساتھ ماں کے ساتھ گھر کے کام سمیٹتی رہتی۔ اور ثانیہ کا پورا زور اپنی نیندیں پوری کرنے پر تھا۔ پہلے جو کوئی گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی تھی۔ اب اس سے بھی گئی۔ سونا یا ماں کے گھر کے چکر لگانا، کھانا پسند آتا تو ٹھیک ورنہ آرڈر کر کے کمرے میں گھس جاتی۔ اس کے اس انداز سے ارم چڑنے لگی۔

''سارے کام ہم لوگ ہی کریں۔ اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔'' آسیہ نے توفیق صاحب کے کہنے پر ملازمہ رکھ لی۔

''پہلے تو کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔'' ارم کو عجیب لگا۔

''لیکن مجھے ہونے لگی ہے۔ میں اب پہلے کی طرح ایکٹو نہیں رہی اور اس طرح تم پر بوجھ زیادہ آجاتا ہے۔'' آسیہ نے بات ٹالی۔

''بہو پر کوئی ذمہ داری نہ ڈالیں۔'' ارم ناراض ہوگئی۔

''کرے گی۔ تمہیں پتا ہے من موجی ہے۔''

مگر ارم کو غصہ آ گیا تھا۔ تب ہی وہ اگلی صبح ناشتہ بنانے کے لیے اٹھی ہی نہیں۔ نماز پڑھ کر دوبارہ سوگئی۔ اسے لگا ماں کو دیکھ کر عبید ثانیہ کو جگا دے گا مگر آسیہ نے خاموشی سے سب کا ناشتہ بنا کر رکھ دیا۔

عبید اور توفیق صاحب آفس چلے گئے تو آسیہ کچن سمیٹ کر برتن دھونے لگیں۔ تب ہی ارم آ گئی۔

''اٹھ گئی میری بیٹی، تمہارا ناشتہ رکھا ہے۔ گرم کردوں۔''

''آپ نے کیوں بنایا ثانیہ کو جگا دیتیں۔'' ارم سٹپٹا گئی۔

''کوئی بات نہیں، بندوں کے ناشتے میں ٹائم کتنا لگتا ہے۔ مجھے تو اٹھنا ہی تھا۔''

''امی! اللہ کا واسطہ ہے۔ اتنی اچھی بھی نہ بنیں۔ جب عبید پورے کا پورا اس کا ہے تو ثانیہ کو اس کی ذمہ داریاں بھی اٹھانے دیں۔'' آسیہ نے مڑ کر بیٹی کو دیکھا اور مسکرا دیں۔

''عبید تمہاری ذمہ داری نہیں رہا۔ ہم ثانیہ کی ذمہ داری نہیں ہیں۔ تو کوئی بات نہیں۔ میں تو ہوں نا۔ میں سب کی ماں ہوں، سب کی ذمہ داری اٹھا سکتی ہوں۔ اب ایک ایک دو دو کاموں کی لڑائی گھر کا ماحول ہی خراب کرے گی۔'' ارم شرمندہ ہوگئی۔

''اچھا سوری۔ آئندہ ایسا نہیں کروں گی۔''

''بیٹا! ثانیہ کب تک لاپروائی برتے گی۔ ایک نہ ایک دن اسے بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو جائے۔ گھر کے کاموں کا کیا ہے کسی نے کم کر لیے تو کسی نے زیادہ۔''

''اچھا سوری نا......ناراض مت ہوں مجھ سے۔'' انہوں نے اتنے پیار سے سمجھایا کہ وہ مزید شرمندہ ہو گئی۔

''کوئی اتنی پیاری بیٹی سے ناراض ہو سکتا ہے۔ چلو تم ناشتہ کر لو۔'' وہ سر ہلا کر ہاٹ پاٹ کھولنے لگی۔

اور اگلے دن جب وہ کچن میں آئیں تو ثانیہ ناشتہ بنا رہی تھی۔ انہیں خوش گوار سی حیرت ہوئی۔ انہیں لگا عبید نے اٹھایا ہے۔

''ارے واہ بھئی آج تو ثانیہ بیٹی ناشتہ بنا رہی ہے۔'' توفیق صاحب بھی خوش ہو گئے۔

''جی کل عبید کے ناشتے کو لے کر یہاں کچن میں کافی جھگڑا ہو رہا تھا۔ تو میں نے سوچا۔ خوامخواہ بوجھ کیوں بنیں۔ میں خود بنا لیتی ہوں۔'' اس نے ٹرے میں چیزیں ترتیب سے رکھنی شروع کر دیں۔

آسیہ نے شرمندگی سے توفیق صاحب کو دیکھا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بیٹا! میں تو بہت خوشی سے۔''

''میں آپ لوگوں کے لیے بھی بنا دیتی لیکن عبید لیٹ ہو رہا ہے۔'' اس نے ٹرے اٹھاتے آسیہ کی بات کاٹی اور ٹرے اٹھا کر کچن سے نکل گئی۔

آسیہ اور توفیق ہکا بکا رہ گئے۔ پھر توفیق صاحب سنبھل کر مسکرائے۔

''بیگم صاحبہ! وہ تو اپنے شوہر کا ناشتہ لے گئی ہیں۔ آپ اپنے شوہر کو کروا دیں۔'' آسیہ ست روی سے فریج سے انڈے نکالنے لگیں۔

☆☆☆

کھٹ پٹ کی آواز پر ثانیہ کی آنکھ کھل گئی۔ عبید کو آفس بھیج کر وہ سو گئی تھی۔ ارم کو کمرے میں دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو۔''

''دھونے والے کپڑے جمع کر رہی ہوں۔ امی نے مشین لگائی ہے۔'' ارم نے بتایا۔

''حد ہے یار۔'' ثانیہ نے دوبارہ تکیے پر سر گرایا۔ ''کوئی پرائیویسی بھی ہوتی ہے۔ جب دل چاہتا ہے۔ آ جاتی ہو۔ اب یہ میرا روم ہے یار۔

''تو کپڑے باہر رکھ دیا کرو۔ امی نے کہا تو میں آ گئی۔'' ارم نے شرمندہ ہو کر وضاحت دی۔

''جب دھلوانے ہوں گے، دھلوا لوں گی۔ کل کو کمرے سے کوئی چیز ادھر ادھر ہو گئی۔ میں نے کسی سے پوچھ لیا تو طوفان آ جانا ہے۔''

''مجھے تم سے اس سے بھی گھٹیا بات کی امید کرنی چاہیے۔'' ارم کو غصہ آ گیا۔

''اور یہاں کوئی دھوبی گھاٹ نہیں کھلا کہ جب دل چاہا دھلوا لوں گی۔ اب خود ہی دھو لینا۔''

اس نے ہاتھ میں پکڑی لانڈری باسکٹ وہیں پٹخی اور چلی گئی۔

''کس قدر بدزبان ہو گئی ہے۔'' ثانیہ نے غصے سے دوبارہ کمبل تان لیا۔ مگر زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ کمبل اس کے چہرے سے کھینچ لیا گیا۔

''اب کیا تکلیف ہے۔'' وہ چلائی پھر ٹھٹکی۔

رابعہ اسے خشمگیں نگاہوں سے گھور رہی تھی۔

''خیریت۔'' وہ سیدھی ہو کر بیٹھی۔ ''صبح صبح۔''

"یہ صبح ہے؟"

ثانیہ نے کلاک پر نگاہ دوڑائی۔ پھر کھسیانی ہو کر بال سمیٹنے لگی۔

"کچھ شرم کرو۔ نند کپڑے دھو رہی ہے۔ ساس کچن میں مصروف ہے۔ اور مہارانی کی نیندیں پوری نہیں ہو رہیں۔"

"یہی تو موج ہے۔ اپنی نیند سوتی ہوں۔ اپنی نیند جاگتی ہوں۔ کسی کی جرأت نہیں ہوتی مجھے ٹوکنے کی۔"

"عبید بھی کچھ نہیں کہتا۔" رابعہ نے کمبل ہٹا کر اپنے لیے جگہ بنائی۔

"صبح کا گیا پانچ بجے واپس آتا ہے۔" اس نے ہاتھ رکھ کر جمائی روکی۔

"اور تم نے کیا آتے ہی مجھے ٹوکنا شروع کر دیا ہے۔ میری خوشی میں خوش نہیں ہوتی ہو۔" وہ ناراض ہوئی۔

رابعہ نے پیار سے اسے دیکھا۔ دبلا پتلا چہرہ بھرا بھرا سا تھا۔ چہرے کی رنگت مزید نکھر کر گلابیاں چھلکا رہی تھی۔ خوشی، آسودگی، بے فکری، حسن اور خوب صورتی کو مزید جلا بخشتی ہے۔

"تمہاری خوشیاں دائمی رہیں۔ اسی لیے سمجھاتی رہتی ہوں۔ یہ اچھے لوگ ہیں۔ ان کی قدر کرو۔"

"قدر تو یہ کریں اور شکر بھی ...... ابھی تک ان کے بیٹے کو لے کر الگ نہیں ہوئی۔" رابعہ ششدر سی رہ گئی۔

آسیہ نے چائے بنائی۔ ٹرے تیار کی اور ارم سے کہا، رابعہ کے لیے چائے لے جائے۔

"امی! میں نہیں لے جا رہی۔ ابھی کپڑے لینے گئی تو اس نے مجھے اتنی باتیں سنائی ہیں۔"

"رابعہ تو آتی ہی نہیں ہے۔ مہمان ہے اور وضع دار گھرانوں میں مہمانوں کی عزت کی جاتی ہے۔"

"ہماری ان ہی کمزوریوں کی وجہ سے ثانیہ کا میرے ساتھ ایسا رویہ ہے۔" ارم چڑ گئی۔

"اچھا چھوڑو۔ میں لے جاتی ہوں۔" آسیہ کا لہجہ بجھ سا گیا۔

"ایک تو ہر کام آپ خود کرنے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اچھی بلیک میلنگ ہے۔ پتا ہے نا۔ مجھے آپ کو تکلیف دینا اچھا نہیں لگتا۔"

وہ غصے سے ٹرے اٹھا کر چلی گئی۔ آسیہ نے تشویش کے ساتھ اسے جاتے دیکھا ...... نجانے کیوں وہ ہر بات پر چڑنے لگی تھی۔

"تم ابھی تک ...... مطلب یہ خناس تمہارے دماغ سے نکلا نہیں۔"

ارم رابعہ کی آواز پر رک گئی ...... آج کل وہ عجیب وغریب حرکتیں کرنے لگی تھی جس میں رک کر بات سننا بھی شامل تھا۔

"اچھی بھلی سچویشن بن گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا، موقعہ دیکھ کر عبید سے کہہ دوں گی کہ میرا گزارہ نہیں ہے۔ مجھے الگ گھر لے دو۔ مگر ارم نے معافی مانگ کر سب برباد کر دیا۔"

ارم ششدر سی رہ گئی ...... پھر گہری سانس لے کر اندر داخل ہوئی ...... رابعہ تھوڑا گھبرا گئی۔

ارم نے ٹرے قریب کی میز پر رکھی اور سیدھی ہو کر رابعہ کو دیکھا ...... پھر ثانیہ سے مخاطب ہوئی۔

"تھوڑا بھرم تو رہنے دو ثانیہ! ایسے پلانز بناتی ہوں تو دروازہ بند کر لیا کرو۔"

"نہیں ...... ارم! ثانیہ کا یہ مطلب نہیں تھا ......" رابعہ نے گھبرا کر وضاحت کرنا چاہی۔

"میرا یہی مطلب تھا۔ ثانیہ نے اطمینان سے بات کاٹی۔ "اور تم کیوں گھبرا رہی ہو۔ پہلے بھی غلطی کر کے معافی مانگ چکی ہے۔ ایک بار پھر مانگنی پڑے گی ...... اس کی بات پر یقین ہی کون کرتا ہے۔"

ارم کو احساس ہوا، کم ظرفوں کے سامنے جھکنا مصلحت سے کام لینا سب سے بڑی بے عزتی ہے۔

"وہ غلطی تھی نہ غلط فہمی اور میں نے معافی صرف اور صرف اپنے بھائی کی خوشی کے لیے مانگی تھی ......" ارم کا لہجہ صاف تھا۔ ثانیہ تلملا گئی۔ تب ہی طنزیہ انداز میں بولی۔

''چلو، تم نے یہ تو مانا...... تمہارے بھائی کی خوشی میں ہوں۔''
''میری تو یہی دعا تھی کہ تم میرے بھائی کی خوشی ہی بن کر رہو۔ مگر تمہاری حرکتیں ایسی نہیں لگتیں۔'' ارم نے تلخی سے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔
ثانیہ کے سر پر لگی تلوے پر بجھی۔
''دیکھی تم نے اس کی زبان۔ تم کہتی ہو، یہ بہت معصوم ہے۔''
''اس نے سن لیا تھا ثانیہ۔''
''تو سنتی رہے...... عادت ہی پڑ گئی ہے دروازوں سے لگ لگ کر سننے کی...... اب بندہ اپنے کمرے میں بات بھی نہیں کر سکتا۔''
رابعہ بس تشویش سے اس کا چہرہ ہی دیکھتی رہی۔ اس تشویش کا اظہار وہ ماں باپ کے سامنے بھی کر گئی۔
''تم اس کی فکر مت کرو۔ وہ تو عیش کر رہی ہے عیش۔ عبید پوری طرح اس کی مٹھی میں ہے۔'' نادرہ نے نمکو کا پھنکا مارا...... جو رات وسیم باقی چیزوں کے ساتھ لایا تھا۔
''خدا کے لیے اماں۔ وہ گھر سجانے کے لیے شوپیس لے کر نہیں گئے...... گھر بسانے کے لیے لے کر گئے ہیں...... مگر آپ کی بیٹی اور اس کی لاپرواہیاں۔'' رابعہ اپنا ہی سر پیٹ کر رہ گئی۔
''ابا! آپ ہی کچھ سمجھائیں۔''
ابا سکون سے چائے میں بیکری کے بسکٹ ڈبو کر کھا رہے تھے۔
''ان ماں بیٹی کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ انہوں نے کسی کی نہیں سننی۔''
''نہیں رہنے دو۔ یہ سسرالیے ہوتے ہی اس قابل ہیں کہ انہیں ان کے ٹھکانے پر رکھا جائے۔ مجھے کون سا صلے مل گئے خدمتوں کے۔'' نادرہ نے تنک کر کہا۔
رابعہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔
''ٹھیک ہے۔ کسی کی فکر نہیں کرتی۔ مگر اب وسیم کی شادی کی فکر کر لیں۔ وہ بار بار کہہ رہا ہے۔''
''کیا کہہ رہا ہے'' نادرہ چونکیں تو رابعہ نے تفصیل بتا دی...... نتاشا اور وسیم کا آپس میں رابطہ ہو گیا تھا اور وہ چاہتا تھا یہ لوگ دوبارہ رشتہ لے کر جائیں۔
نمکو نادرہ کے حلق میں پھنس گئی۔ وہ تو نتاشا اور ارم دونوں پر مٹی ڈال کر دو چار سال بیٹے کی کمائی کھانے کا پکا ارادہ کر چکی تھیں۔
''اس بڑھیا سے اب کام نہیں ہوتا مگر بہو لا کر گھر اس کے حوالے کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی۔'' شبیر کو ان کی حالت دیکھ کر لطف آیا۔
''بہو تو وسیم بھائی کے ساتھ چلی جائے گی، آپ کو کیا فائدہ ابا۔''
''کاہے کو چلی جائے گی۔ ہمیں کون سنبھالے گا۔ بہو کا کام یہی تو ہوتا ہے سسرال کو سنبھالے۔'' نادرہ بھڑک کر بولیں۔
شبیر اور رابعہ کا منہ کھل گیا۔
''اگر ثانیہ جیسی ہوئی تو۔ تو کیا کریں گی۔''
''ہائے ہائے۔ ہر وقت اسی کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔ بہن ہو یا دشمن۔'' کھسیانی بلی کھمبا نوچنے لگی۔

☆☆☆

وہ ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ جوتے پہنتے عبید نے اسے دیکھا تو چپ نہ رہ سکا۔

"یار...... ٹیبل پر ہی رکھ دیتیں۔ میں آ رہا تھا۔ پہلے بھی سب مل کر ہی ناشتہ کرتے ہیں۔"

"مجھے تو آنٹی نے ہی کہا تھا کہ عبید کا ناشتہ بنا کر لے جاؤ۔ روز ہی ان کی ناشتے کو لے کر بحث ہوتی تھی۔ میں نے اپنا بھی بنا لیا۔ تمہیں برا لگا۔" ثانیہ نے ٹرے ٹیبل پر رکھی۔

"اچھا۔" وہ چپ سا ہو گیا۔ برسوں کی عادت تھی۔ ناشتہ اور رات کا کھانا سب اکٹھے ہی کھاتے۔

"اور ہاں۔" ثانیہ نے ٹیبل قریب کی اور کرسی کھینچ کر سامنے بیٹھ گئی "آج اپنے کپڑے بھی لانڈری میں دے آنا۔"

"کپڑوں کو کیا ہوا؟ وہ تو ہمیشہ گھر میں ہی دھلتے ہیں۔" عبید ٹھٹکا۔

"ارم نے کہا ہے عبید کے اور اپنے کپڑے خود دھویا کرو۔" وہ ابلا ہوا انڈا چھیلنے لگی۔ "اور مجھ سے تو اپنے کپڑے نہیں دھوئے جاتے ہمیشہ امی ہی دھوتی تھیں...... پھر سردی کتنی ہے۔"

"اتنی بڑی لڑکی کے ہوتے اماں کام کرتی تھیں۔ سچ ہے انہوں نے تمہیں بہت بگاڑا ہے۔ اور لگتا ہے باقی کی کسر میں پوری کروں گا۔" وہ بے چارگی سے گویا ہوا۔

"ہاں بہت لاڈ اٹھاتے ہو نا میرے......" ثانیہ نے تیکھی نگاہ سے گھورا۔

"کسر بھی نہیں چھوڑی۔"

"تو پھر کپڑے لے کر جانا۔"

"اور کوئی حکم؟"

"شام کو جلدی آ جانا۔" اگلا حکم صادر ہوا۔

"میرے ابا کا آفس نہیں ہے۔ اور جتنی بار تم کال کرتی ہو۔ باس ویسے ہی خوں خوار نظروں سے گھورتے ہیں۔ وہ جیلس ہوتے ہوں گے کہ عبید کی بیوی اس سے اتنا پیار کرتی ہے۔"

"صدقے اس پیار پر۔" وہ نہال ہوا تو کھلکھلا کر ہنستی ثانیہ نے انڈا اس کی پلیٹ میں رکھا خود جیم اٹھایا۔

"رہنے دو تمہاری میٹھی میٹھی باتوں سے ویسے ہی میرا شوگر لیول ہائی ہو رہا ہے۔" وہ بے چارگی سے گویا ہوا۔

☆☆☆

دونوں تیار ہو کر باہر آئے...... چاند سورج کی جوڑی تھی۔ آسیہ نے دل میں نہیں لفظوں میں بلائیں لیں...... توفیق نے بھی پیار سے دیکھا۔ ارم خاموشی سے میگزین کی ورق گردانی کرتی رہی۔

"ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی ہو۔"

"آپ بھی حد کرتی ہیں آنٹی۔" ثانیہ کے موتیوں جیسے دانت چمکے۔ "کبھی ساس کو بھی اپنی بہو اچھی لگتی ہے۔"

عبید ٹپٹا گیا۔ ارم نے طنزیہ نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔ جو اطمینان سے مسکرائیں۔

"کیوں نہیں لگتی۔ میرے بیٹے کی زندگی کا حصہ ہو۔ اس کے دکھ سکھ کی ساتھی ہو۔ ہماری آنے والی نسل کی امین ہو۔ پیاری تو لگو گی۔"

توفیق صاحب نے اطمینان کے اظہار میں گردن ہلائی۔

"سن لیا۔" عبید نے جتایا۔

"سن لیا...... بہت ہی میٹھی باتیں کرتی ہیں آنٹی۔" ثانیہ اپنی حیرت سے باہر آئی۔

"تھوڑی مٹھاس تم بھی لے لو۔" عبید ماں کی بات پر نہال ہو گیا تھا۔ ثانیہ نے بدقت اس بات کو ہضم کیا پھر آسیہ کے لہجے سے تھوڑی مٹھاس مستعار لیتے ہوئے ارم سے پوچھا۔

"ارم! ہم ڈنر کرنے جا رہے ہیں۔ چلو گی ساتھ۔"

اسے یکسر نظر انداز کر کے میگزین میں گم ارم چونکی۔ پھر کھائی سے ناں کر دی۔ عبید نے اصرار کیا۔
"نہیں بھئی۔ میں کباب میں ہڈی بننا نہیں چاہتی۔"
"وہ اصرار کر رہے تھے چلی جاتیں بیٹا۔" آسیہ نے ان کے جانے کے بعد ٹوکا۔ ارم چپ رہی۔ اس دن جو کچھ سنا تھا۔ ماں باپ کو بتا کر دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا ان دونوں کی زندگیوں میں بالکل دخل نہیں دے گی۔ تاکہ ثانیہ کو کوئی بہانا نہ مل سکے۔
"میں چاہتا ہوں، ہمارا رشتہ ہمیشہ اسی طرح تازہ اور مہکتا رہے۔" اس کی گوری کلائیوں میں سرخ گلاب مہک رہے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھ عبید کے مضبوط ہاتھوں میں تھے۔ ثانیہ نے اپنا گال پھولوں پر رکھ دیا۔
"تم اسی طرح پیار کرتے رہو۔ ہمارا رشتہ اسی طرح مہکتا رہے گا۔"
گاڑی کے شیشوں پر دھند کا پردہ تھا۔ اندر زندگی مسکرا رہی تھی۔ جذبات کی حدت خواہشوں کی گرمائش تھی۔
"میں نے تمہارے ساتھ زندگی کی خوب صورتی کو محسوس کیا ہے۔ اپنی چھوٹی سے چھوٹی خواہش کو پورا کیا ہے۔ میں صرف تمہارے ساتھ مرنا، تمہارے ساتھ جینا چاہتی ہوں۔"
"ارے میری جان، تم کہو تو تمہارے لیے آسمان سے تارے توڑ لاؤں۔" عبید نے اس کی ناک کھینچی وہ سیدھی ہو گئی۔
"ہاں تو ڑ لاؤ۔"
وہ ٹپٹا گیا۔ "کوئی ایسے بھی کہتا ہے۔"
"میں کہتی ہوں۔"
عبید نے باہر دیکھا۔ "آج سردی بہت ہے، کسی اور دن کا پروگرام نہ رکھ لیں۔"
وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔
"جو کر نہیں سکتے، وہ کہتے کیوں ہو؟"
"غلطی ہو گئی بیگم صاحبہ...... اب گھر چلیں۔"
"میرا دل چاہتا ہے، ساری رات سڑکوں پر آوارہ گردی کروں۔" اس کا ابھی بھی ارادہ نہیں تھا۔ مگر عبید کو صبح آفس بھی جانا تھا۔
"پولیس پکڑ کر لے جائے گی۔ نکاح نامہ بھی نہیں ہے۔" عبید نے ڈرایا۔
"بزدل۔"
ارم ان کے لیے جاگ رہی تھی۔ دروازہ اسی نے کھولا۔
"امی، ابو سو گئے؟"
"ظاہر ہے، ایک بج رہا ہے۔" ارم کی اپنی نگاہوں میں نیند بھری تھی...... ثانیہ تو میں تھک گئی کہہ کر کمرے کی طرف چل دی۔
"سوری یار۔ تمہیں ہمارے لیے جاگنا پڑا۔" عبید کو شرمندگی ہوئی۔ "وہ کوئی بات نہیں کہہ کر اندر کی طرف چل دی۔ تب عبید کو احساس ہوا اس سے غلطی ہوئی ہے۔ وہ ارم کے لیے کچھ بھی نہیں لے کر آیا...... اور ایسا پہلی بار ہوا تھا اس کا دل تاسف سے بھر گیا۔

☆☆☆

دروازہ تب بھی ارم نے ہی کھولا تھا...... مگر جگہ دینے کے بجائے دونوں ہاتھ دروازے پر رکھ لیے۔
"کیا ہے؟" وہ دوستوں کے ساتھ دعوت اڑا کر آیا تھا۔

''نکالو۔'' ارم نے ہاتھ سامنے کیا۔

''سوری۔ آج جمعرات نہیں ہے۔ وہ بے نیازی سے گویا ہوا۔

''نکالتے ہو یا ابو کو بلاؤں۔''

''ندیدی...... بھوکی......'' اس نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بڑی سی چاکلیٹ نکال کر ہتھیلی پر رکھ دی۔ ارم کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔

''کیا تم آدھی رات تک دوستوں کے ساتھ تکے اڑاؤ۔ اور میرے لیے صرف ایک چاکلیٹ کوئی برگر...... کوئی پزا...... کچھ بھی نہیں۔ یعنی آدھی رات تک جاگنے کا صلہ محض ایک چاکلیٹ۔

''اب کیا پوری دکان اٹھا لاتا۔''

''یہ بھی تم ہی کھالو۔'' وہ ناراض ہو گئی اور عبید کے ہاتھ پاؤں چھوٹ گئے۔

''اچھا سوری یار! کل تمہیں پزا کھلانے لے جاؤں گا۔''

وہ ہمیشہ جلدی مان جاتی تھی...... فوراً ہی بہل گئی۔

''ثانیہ کو بھی لے جائیں گے۔''

''بالکل نہیں۔ اتنا کھاتی ہے۔ بل بڑھ جائے گا۔''

اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی ارم نے آنکھ سے ٹپکے آنسو کو ہتھیلی میں جذب کر لیا اور لیٹ گئی۔ وقت کے ساتھ سب کچھ ہی بدل جاتا ہے۔

اس بات کا احساس ثانیہ کو بھی ہوا تھا۔

جب چہرے سے میک اپ صاف کرنے سے پہلے اس نے عادتاً اپنے موبائل پر آئے میسج چیک کیے۔

''مبارک ہو میری اور وسیم کی منگنی کی ڈیٹ فکس ہوئی ہے۔''

نتاشا کا میسج...... ثانیہ کی آنکھیں تحیر و رنج سے پوری کھل گئیں۔

منگنی۔ وسیم اور نتاشا اس کے مشورے کے بغیر۔ کیا وقت نے الٹا چلنا شروع کر دیا ہے۔

وہ شاکڈ تھی۔

☆☆☆

ایسا دماغ ہوا تھا رات سے کہ جلدی میں دو انڈے فرائی کیے...... سلائس رکھے اور ٹرے اٹھالی۔ ساتھ والے چولہے پر آسیہ آلو کے پراٹھے بنا رہی تھیں ایسا روکھا سوکھا ناشتا دیکھ کر ممتا تڑپ گئی۔

''بیٹا! دو منٹ رک جاؤ...... یہ پراٹھا بن رہا ہے۔ وہ لے جاؤ۔''

ثانیہ کے جواب دینے سے پہلے ہی عبید اور توفیق صاحب ایک ساتھ کچن میں داخل ہو گئے۔

''ناشتا۔'' ثانیہ نے جلدی سے قدم بڑھائے۔ مطلب یہ تھا کہ ناشتہ لے کر جا رہی ہوں۔ تم بھی آ جاؤ۔

''یہیں رکھ دو۔'' وہ توفیق صاحب کی کسی بات کا جواب دے رہا تھا۔ ثانیہ نے بدمزہ ہو کر ٹرے میز پر رکھی۔ عبید نے ایک نظر ٹرے پر ڈالی اور مسکرا دیا۔

''تمہارے فرائی انڈے تو کھا لوں گا۔ مگر امی کے پراٹھے کے ساتھ...... اب آلو کا پراٹھا کون کافر چھوڑے۔''

اس نے باپ کے لیے کرسی کھینچی پھر خود بھی بیٹھ گیا۔

''یاد ہے امی کے پراٹھوں کے لیے کیسے ناشتا چھوڑ کر بھاگتی تھیں۔ خوشبو دیوار کے اس طرف اور یہ دیوار کے اس طرف۔''

سب ہنس دیے...... ثانیہ کو برا لگا۔ تو ٹرے اٹھالی۔

''کیا ہوا؟'' عبید نے حیرت سے دیکھا۔
''مجھے کچھ ہلکا پھلکا کھانا ہے۔''
''کھالو یار! کچھ نہیں ہوتا۔'' عبید نے اصرار کیا۔
''مجھے ہوتا ہے۔'' وہ کہہ کر ٹرے اٹھا کر چلی گئی۔ عبید ہلکا سا شرمندہ ہوا۔ مگر خاموشی سے اس پراٹھے کی طرف متوجہ ہوا جو ماں نے سامنے رکھا تھا۔
''آہستہ آہستہ عادت ہو جائے گی...... ابھی سختی نہیں کرنا چاہتا۔'' عبید کی آواز مدھم تھی۔
''کوئی بات نہیں...... وقت کے ساتھ ساتھ سب معاملات ترتیب پا جاتے ہیں۔'' توفیق صاحب نے تسلی دی۔ خود بھی تھوڑا وقت فیملی کو دو۔ بیوی کو بھی ساتھ لایا کرو۔ اسی طرح گھر کا ماحول بنتا ہے۔''
انہوں نے ہلکے پھلکے لہجے میں احساس دلایا کہ وہ کچھ دنوں سے کیسے سب سے کٹ کر رہ رہا ہے۔ عبید نے شرمندگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

''کسی کو میرا احساس بھی ہے۔ وسیم کی نتاشا کے ساتھ منگنی کی خبر جب میرے گھر جائے گی تو میرے سسرال والے کیا کہیں گے۔'' ثانیہ نے گھر جاتے ہی ہنگامہ اٹھا دیا۔ ''اس طرح اس پر لگایا ارم کا الزام سچ ہی ثابت ہوگا۔''
''میری منگنی اب کیا ان کی مرضی سے ہوگی۔'' وسیم نے بھنویں اچکا کر بہن کو دیکھا۔ دادی الگ منہ پھلائے بیٹھی تھیں۔ انہیں نتاشا ویسے ہی پسند نہ تھی۔ نادرہ کو اس بات کا قلق تھا کہ وسیم نے سارے معاملات بالا ہی بالا طے کر لیے تھے۔ کب اس کی نتاشا کے ساتھ اتنی انڈر اسٹینڈنگ ہوئی، کسی کو خبر نہ ہوئی۔ خود ثانیہ بھی بے خبر تھی۔
''آپ سمجھتے کیوں نہیں ہیں وسیم بھائی! وہ لوگ تو شاید اب بھی یہی چاہتے ہیں کہ ہم لوگ دوبارہ رشتہ لے کر جائیں۔''
وسیم کی تیوری چڑھ گئی۔
''یہ تو اب ممکن ہی نہیں اور میں یہ بات ارم کو کھل کر بتا چکا ہوں۔''
ثانیہ ٹپٹا گئی۔
''آپ کی ارم سے بات ہوئی؟''
''میری نتاشا سے ساری بات ہو گئی ہے۔ منگنی کا فنکشن اس کے گھر ہوگا تم کوئی بھی بہانا بنا کر آ جانا۔ اور یہ بھی صرف تمہاری خاطر...... تاکہ تمہیں کوئی مسئلہ نہ ہو۔ لیکن ظاہر ہے، میں نتاشا سے شادی کروں گا تو یہ بات چھپ تو نہیں سکتی۔ تمہارے پاس کچھ دن ہوں گے۔ اپنے گھر کے معاملات خود سیٹ کرو۔ کیونکہ میں تمہاری وجہ سے بلیک میل نہیں ہوں گا۔ یہ میری زندگی ہے اور اس کے فیصلے میں خود کروں گا۔''
وہ ارم کے ذکر کو گول کر کے دوٹوک لہجے میں بولا۔
سب ہکا بکا رہ گئے۔
دادی نے جتاتی نظروں سے سب کو دیکھا۔
''جب سب کچھ طے ہی کر لیا ہے تو جاؤ بیاہ کر بھی لے آؤ۔'' نادرہ بھڑک اٹھیں۔ ''ایسی بے باک لڑکی کہ شادی بیاہ کے معاملات خود ہی طے کرتی جا رہی ہے۔''
''تو کیا ہوا؟ ثانیہ نے بھی تو یہی سب کیا تھا۔'' دادی نے بھگو کر ماری۔ اور سب کو بڑے زور سے لگی۔ نادرہ اور ثانیہ نے ایک ساتھ بولنا شروع کر دیا۔

شبیر غصے سے دھاڑے۔

''بس چپ کرو۔ جب تم لوگ فکر نہ کرو گے تو وہ خود ہی فکر کرے گا۔ یہ لوگ آتے ہیں یا نہیں آتے۔ میں چلوں گا۔ تمہارے ساتھ۔ ان ماں بیٹی کے دل میں تو تمہیں دولہا بنتے دیکھنے کا ارمان ہی نہیں ہے، تمہیں کنوارا ہی بوڑھا کر دیں گے۔''

''اس سارے واویلے کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہونے والا۔ آپ لوگ تیاریاں کریں۔ اب یہ ثانیہ کو پتا ہو گا اسنے اپنی سسرال والوں کو کیسے سنبھالنا ہے۔'' وہ بات ختم کر کے اٹھ گیا۔

''دیکھا کم بخت نے کیسے قابو میں کیا ہے؟'' نادرہ رونے بیٹھ گئیں۔

''جیسے تمہاری بیٹی نے۔'' دادی نے یہ جملہ دل میں ہی کہا تھا۔

ثانیہ کے اندر غصے سے آگ بھڑکنے لگی۔

''نتاشا۔'' اس نے بہت زور سے مٹھی بند کی۔ جیسے نتاشا کی گردن مروڑی ہو۔

☆☆☆

''کیا مطلب؟ ارم نے ابھی تک تمہاری جان نہیں چھوڑی۔'' نتاشا نے بھاپ اڑاتے سوپ کے پیالے سے نظریں ہٹا کر سامنے بیٹھے وسیم کو دیکھا۔ ریسٹورنٹ کے گرم آسودہ ماحول میں خوراک کی خوشبو۔ دھیمی آوازیں اور برتنوں کی کھنک گھل مل گئی تھی۔

''اتنا بے وقوف تو نہیں ہوں کہ مجھے کھلونا سمجھ کر کھیلتی رہے گی۔ بھول ہے اس کی۔'' نتاشا نے اسے غور سے دیکھا اور مسکرا دی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر وہ دونوں اس مقام تک آئے تھے تو اس میں نتاشا کا ہی ہاتھ تھا۔ جس نے خود وسیم سے رابطہ کیا۔ ورنہ وہ خود تو کبھی بھی یہ جرات نہ کرتا۔

''تمہاری بہن کی سسرال کا معاملہ ہے۔'' نتاشا نے ہمدردی سے کہا۔

''میری بہن میں اتنے گٹس ہیں کہ اس سچویشن کو سنبھال لے۔ ارم انکار کر چکی ہے۔ اب انہیں کوئی حق نہیں کہ ہمارے معاملات میں دخل اندازی کریں۔ عبید سمجھ دار انسان ہے اور ثانیہ سے محبت بھی بہت کرتا ہے۔ پتا نہیں ثانیہ گھبرا کیوں رہی ہے۔''

وسیم نے کندھے اچکائے۔

''محبت تو تم بھی ارم سے کرتے تھے۔''

نتاشا کی بات پر وسیم نے ہاتھ روک کر نتاشا کو دیکھا۔

''مگر وہ ویسی نہیں نکلی جیسا میں نے اسے سمجھا تھا۔''

''اگر میں بھی ویسی نہ نکلی جیسا تم نے مجھے سمجھا ہے۔'' نتاشا کی بڑی بڑی آنکھوں میں سوال اور تبسم گڈمڈ ہو گیا۔

''قسمت مجھے دوسری بار بھی دھوکا دے گی؟'' وسیم سنجیدہ تھا۔

''ہرگز نہیں۔'' نتاشا نے بے ساختہ کہا۔

''مجھے بھی یہی لگتا ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''فکر نہ کرو۔ مجھ سے شادی گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔''

''میں سودا نہیں کر رہا۔ رشتہ بنا رہا ہوں۔ مجھے تم سے صرف محبت اور اعتبار چاہیے نتاشا۔''

''وسیم! تم کبھی کسی بھی معاملے مجھے خود سے الگ نہیں پاؤ گے۔''

نتاشا نے ہاتھ بڑھایا تو وسیم نے تھام لیا۔

☆☆☆

عبید نے تصویر کو چٹکی میں پکڑ کر اپنی آنکھوں کے سامنے بلند کیا...... وہ یوں جائزہ لے رہا تھا گویا ایکسرے کر رہا ہو۔ ارم نے جز بز ہو کر چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ آسیہ کو بیٹے کے انداز پر ہنسی آ گئی۔

"امی! لڑکا تو......" وہ متذبذب تھا۔

"کیا ہوا؟ اچھا نہیں لگتا۔ آسیہ کو قدرے حیرت ہوئی جبکہ تصویر اور تمام معلومات کی روشنی میں عبید کو فوراً پسند آ جانا چاہیے تھا۔

"بہت زیادہ اچھا ہے۔" اس نے بے یقینی سے ارم کو دیکھا۔

آسیہ نے عبید کے کندھے پر چپت لگائی۔

"تمہارے ولیمے میں بھی آیا تھا۔ ماں تو بزرگ اور بیمار خاتون ہیں، وہ نہیں آ سکتی تھیں۔"

"ہاں کچھ یاد تو ہے۔" پھر آنکھ سے ارم کو اشارہ کیا۔ "اس کو دکھایا؟"

انہوں نے نفی میں گردن ہلائی۔

"دیکھو گی۔ دکھاؤں۔" وہ مائل بہ شرارت ہوا...... "چپ کیوں ہو؟ بولو نا۔ ارے یہ تو شرما رہی ہے۔"

ارم کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔

"کیوں تنگ کر رہے ہو۔"

"اچھا یہ لو، دیکھ لو۔" اس نے تصویر عین ارم کے سامنے کی۔

ارم نے بنا دیکھے تصویر کو جھپٹ کر دو ٹکڑے کیا اور میز پر پھینک دیا۔ "مجھے شادی نہیں کرنی۔"

وہ دونوں متحیر رہ گئے۔

"نہ مجھے شادی کرنی ہے اور نہ کوئی میرے لیے رشتہ لے کر آئے۔"

وہ جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔

"ارم......" عبید نے حیرت سے پکارا۔ مگر وہ بنا کچھ سنے وہاں سے بھاگ گئی۔

"یہ اتنی بدتمیز تو کبھی نہیں تھی......" آسیہ کو غصہ آ گیا۔

"ہو سکتا ہے۔ اسے لڑکا پسند نہ آیا ہو۔"

"اس نے تصویر دیکھی کب ہے اور انکار کا یہ کون سا طریقہ ہے۔" انہوں نے میز پر پڑے تصویر کے ٹکڑوں کو دیکھا۔

"امی! پریشان کیوں ہو رہی ہیں۔ میں بات کرتا ہوں۔" وہ انہیں تسلی دے کر اٹھ گیا۔ "آخر اس رد عمل کی کوئی تو وجہ ہو گی۔"

("کہیں وہ وسیم) آسیہ نے اپنی سوچ کو وہیں لگام دے دی۔ انہیں خود بھی اپنی سوچ پر یقین نہ تھا۔

"پلیز! اب وجہ پوچھنے مت لگ جانا۔ کوئی وجہ نہیں ہے۔" عبید کو کمرے میں داخل ہوتے دکھ کر ہی ارم نے چڑ کر کہا۔ وہ بیڈ کے کنارے بیٹھی ایک پیر اضطراری انداز میں فرش پر مار رہی تھی۔ "اور تمہیں میرے انکار پر حیرت کیوں ہے؟"

عبید خاموشی سے آ کر پاس بیٹھ گیا۔

"انکار پر نہیں رد عمل پر حیرت ہے۔ آرام سے بات ہو سکتی تھی مگر اس طرح تصویر پھاڑنا۔"

"عبید! یہ میری زندگی ہے تو فیصلے کا اختیار بھی میرا ہونا چاہیے۔ مجھ سے میری رائے پوچھی میں نے رائے

دے دی۔''

''تمہیں کس بات پر غصہ ہے؟'' عبید نے اسے غور سے دیکھا۔

''نہیں ہے غصہ۔'' وہ جھنجلا گئی۔ بس اتنا چاہتی ہوں کہ جس طرح تم نے اپنی زندگی کا فیصلہ خود کیا ہے۔ میں بھی خود کروں۔'' یا پھر کہہ دو کہ مجھے صرف حکم سنایا گیا ہے۔ میں چپ چاپ سر جھکا دوں گی۔''

عبید کھڑا ہو گیا۔

''ٹھیک ہے۔ شاید تم ابھی کھل کر بات کرنا نہیں چاہتیں، ہم بعد میں بات کر لیں گے لیکن یاد رکھنا۔ ہم لوگ تمہاری مرضی کے بغیر کچھ بھی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

''شکریہ۔'' لیکن اس کے شکریہ میں بھی طنز تھا۔

عبید گہری سانس لے کر چلا گیا۔

ارم نے سلگتی نگاہوں سے اسے جاتے دیکھا۔ اس کے ذہن میں عجیب ابال سا اٹھ رہا تھا۔

☆☆☆

''یہ وسیم پر کیا جادو کیا ہے جو تمہاری ہر بات مانتا جا رہا ہے؟'' اس کے لہجے میں حسد تھا۔ جلن تھی۔ اس کے عین سامنے بیٹھی نتاشا نے مسکراہٹ ضبط کرتے بظاہر سادگی سے جواب دیا۔

''وہی جو تم نے عبید پر کیا ہے؟''

''وہ میرا شوہر ہے۔'' ثانیہ کو برا لگا۔ نتاشا تیز لڑکی تھی۔ اس کا دل نہیں تھا کہ اسے بھابھی بنائے۔ مگر اب جو کچھ اور جس طرح ہو رہا تھا، اسے نتاشا سے ملنا پڑا...... تب ہی اس کے گھر چلی آئی۔

''وسیم بھی ہو جائے گا۔ شوہر۔'' وہ کہہ کر ہنس دی۔ ثانیہ نے خود کو بے آرام سا محسوس کیا۔

''وسیم کو پتا چل گیا کہ اس دن تمہاری وجہ سے ارم سے انکار کیا ہے کیونکہ تم نے وہاں آ کر ہنگامہ۔''

''نہیں میری جان! تم اس بات سے گھبرا رہی ہو کہ اگر وسیم کو یہ پتا چل گیا کہ میں نے وہ ہنگامہ تمہارے کہنے پر کیا ہے۔''

ثانیہ کی رنگت متغیر ہوئی۔

''لیکن اسے بتائے گا کون؟'' نتاشا نے جملہ مکمل کیا۔ ثانیہ نے اسے دل ہی دل میں نجانے کتنی گالیاں دیں۔

''تم سناؤ۔ سسرال کے معاملات کیسے چل رہے ہیں۔'' نتاشا نے موضوع بدل دیا اور سسرال پر بولنے کے لیے ثانیہ کے پاس بہت کچھ تھا۔

''شادی کے بعد سارے مرد ایک جیسے ہی ہو جاتے ہیں۔''

''جوائنٹ فیملی میں یہی مسئلہ ہے۔ ماں کو بھی وقت دو۔ بہن کا بھی خیال رکھو۔ تم علیحدہ رہ رہی ہوتیں تو یہ مسائل نہ ہوتے۔'' نتاشا نے ہمدردی سے کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔''

''اچھا موڈ ٹھیک کرو۔ شاپنگ پر چلتے ہیں۔'' نتاشا فوراً کھڑی ہو گئی۔

''نہیں بھئی، پھر کسی نے دیکھ لیا تو۔''

''کوئی نہیں دیکھے گا۔ ہم جہاں جائیں گے، وہاں تمہاری ارم نے کبھی قدم بھی نہیں رکھا ہوگا۔''

☆☆☆

''اتنی ساری چیزیں۔'' نادرہ کی آنکھیں کھل گئیں۔

"نتاشا نے لے کر دی ہیں۔ میں نے تھوڑی کہا تھا۔ ثانیہ نے بال جھٹکے...... نتاشا نے اس کی کٹنگ کروادی تھی۔ جس سے وہ مزید ینگ اور اسٹائلش لگنے لگی تھی۔

اور امی۔ جو سامان اس نے ساس نندوں کو دینے کے لیے لیا ہے۔" وہ ایک دم پرجوش ہوئی۔ برانڈڈ سوٹ۔ بیگز۔"

"ساتھ نہیں لائی۔" نادرہ نے اشتیاق سے شاپنگ بیگز میں جھانکا۔

"وہ تو منگنی پر دیں گے۔"

"اچھا۔ اب جا کر گھر میں ذکر نہ کر دینا بے دھیانی میں۔"

"پاگل نہیں ہوں۔" وہ سامان سمیٹنے لگی۔ تب ہی شبیر چلے آئے۔ ثانیہ کو دیکھ کر حیرت سے پوچھنے لگے۔

"تم آج پھر یہیں ہو۔"

"ابا! آپ میرے ہر بار آنے پر اعتراض کرتے ہیں۔ میں نے آنا ہی چھوڑ دینا ہے۔

"احسان ہوگا ہم پر۔" انہوں نے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ نادرہ کو تاؤ آ گیا۔

"ساری عمر مجھے تو میکے جانے نہ دیا۔ اب کیا بیٹی پر بھی پابندی لگاؤ گے۔ میرا باپ بیمار تھا تو دس دن نہ رکنے دیا...... ماں مری تو قل خوانی کے بعد کہنے لگے کہ گھر چلو نہ تو اس کا باپ بیمار ہے نہ اس کی ماں مری ہے۔ اس لیے اپنے گھر جاؤ۔"

شبیر ابھی ابھی دادی کے پاس بیٹھ کر آئے تھے۔ انہوں نے ہی سمجھایا تھا۔

"یہی حال رہا تو لڑکی نہیں بسنے والی...... وہ لوگ کب تک برداشت کریں گے۔"

"جا رہی ہوں...... اب نہیں آؤں گی۔" وہ غصے سے شاپر سمیٹ کر چلی گئی۔

"ہمیشہ بیٹیوں کو ناراض کر کے گھر سے بھیجا ہے۔ رابعہ کو بھی ہاتھ پکڑ کر چھوڑ آتے تھے۔" نادرہ کی آواز بھرا گئی۔ رابعہ کے نام پر ایک لمحے کو شبیر کو چپ لگ گئی۔

"رابعہ کی دفعہ میں غلط تھا۔" انہوں نے شاید پہلی بار اپنی کوئی غلطی تسلیم کی تھی۔ نادرہ اپنا رونا بھول گئیں۔

"اب تم غلط ہو۔ اسے اپنے گھر میں دل لگانے دو نادرہ! کل کو اس گھر میں بہو نے بھی آنا ہے...... یہ ہر وقت یہاں رہے گی تو خوامخواہ بدمزگی ہوگی۔"

"ہائے ہائے...... وہ کون ہوتی ہے...... میری بیٹیوں کے یہاں آنے پر برا ماننے والی۔" وہ تو بھڑک ہی گئیں۔

☆☆☆

"اگر جواب یہ ہے تو میں سوچ سکتا ہوں۔ وہ کس قدر پریشان ہے۔" توفیق نے پھٹی ہوئی تصویر دیکھ کر کہا۔

"وہ ہمیں پریشان کر رہی ہے۔ عبید! تم نے اس سے بات کی۔" آسیہ نے تشویش سے پوچھا۔

"وہ ابھی بات کرنا نہیں چاہتی۔" عبید نے کندھے اچکائے۔

"ابھی ضرورت بھی نہیں ہے، اسے وقت دو۔ میں خود بات کر لوں گا۔" توفیق صاحب نے کہا...... تو دونوں خاموش ہو گئے۔

ثانیہ نے ان سب کو وہاں دیکھا اور خاموشی سے کمرے میں آ گئی۔ اسے اپنی شاپنگ ٹھکانے لگانا تھی۔ عبید نے نہانا تھا۔ ماں سے فرمائش کر دی کہ سر میں تیل لگا دیں۔ وہ خوشی خوشی مالش کرنے لگیں۔

"تمہارے اور ثانیہ کے درمیان کوئی بات ہوئی ہے؟" آسیہ نے اچانک ہی پوچھ لیا۔ توفیق صاحب

چونکے۔عبید چپ سا ہو گیا۔
"کیوں؟"
"پہلے تم کبھی اتنی دیر تک ہمارے درمیان نہیں بیٹھے۔اب وہ سارا دن میکے گزارتی ہے،تم ہمارے پاس بیٹھے رہتے ہو۔
"میں تو بیلنس کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔پہلے چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ لگا رہتا تھا۔"
"تو بیٹا جی، یہ بیلنس تو نہ ہوا۔ہمارے ساتھ رہ کر اسے نظرانداز کرو۔اس کے ساتھ رہ کر ہمیں......تو یہ توازن تو نہیں۔"توفیق صاحب نے نرمی سے ٹوکا۔"وقت کو تقسیم کرنا سیکھو جب ہمارے ساتھ بیٹھنے آتے ہو تو اسے بھی ساتھ لے آیا کرو اسی طرح اجنبیت ختم ہو گی۔"
"اجنبیت ہونی تو نہیں چاہیے۔اچھا بھلا گھر پر توجہ دینے لگی تھی۔اب پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔"آسیہ الجھ کر بولیں۔
بات تو کچھ خاص نہ تھی۔
یہ اس سے دوسرے دن کی بات تھی جب عبید نے ماں کے ہاتھ کے پراٹھے کھائے تھے۔اور ثانیہ ٹرے کمرے میں لے گئی تھی۔عبید نے اگلے دن جگانا چاہا تو اس نے ہاتھ ہی جھٹک دیا۔
"کیا ہوا؟ناشتہ بنا دو۔"
"جا کر ماں کے ہاتھ کے پراٹھے کھاؤ۔میرے سوکھے سلائس کھا کھا کر تو بور ہو گئے ہو۔"
"ہاں تو تم بھی ساتھ شامل ہو جاؤ۔اچھا بھلا ماحول ہوتا ہے۔بہترین روٹین بنی ہے،سب ہنستے بولتے ناشتہ کرتے ہیں۔"عبید نے سرسری لہجے میں کہا۔
وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔سوئی جاگی آنکھوں میں بلا کا غصہ تھا۔
"میں نے تمہارے ساتھ شادی روٹین لائف گزارنے کے لیے نہیں کی میرے کچھ خواب میری کچھ خواہشیں تھیں۔"
ٹائی باندھتا عبید زچ ہو کر مڑا۔
"تو یار!میں نے تمہاری کون سی خواہش پوری نہیں کی......ہنی مون منا آئے۔سارے خاندان کی دعوتیں کھالیں......سارا شہر گھوم لیا......میں آفس سے کتنا بھی تھکا ہارا آیا۔تم نے کہا،باہر چلنا ہے۔میں لے کر گیا......آدھی رات تک سڑکوں پر آوارہ گردی بھی کرلی۔حالانکہ مجھے اگلے دن آفس بھی جانا ہوتا تھا۔صرف اس لیے کہ تمہاری کوئی خواہش ادھوری نہ رہے۔"
"ہاں تو کیا احسان کیا ہے؟بیوی ہوں تمہاری......میرا حق ہے۔"
"تو ثانیہ بیگم!میرے بھی کچھ حقوق ہیں۔میری بھی کچھ خواہشیں ہیں۔اگر فرصت ہو تو کسی دن وہ بھی سن لینا۔"وہ تلخی سے کہہ کر کمرے سے نکل گیا تھا۔
"بس اسی دن سے وہ منہ پھلائے پھر رہی تھی۔عبید نے بھی پرواہ نہیں کی۔
ماں کی نرم انگلیوں کی تاثیر روح میں اتر رہی تھی۔اس نے آنکھیں بند کرلیں۔
"سکون آ رہا ہے۔"
"بہت......بس کریں۔"عبید نے ماں کا ہاتھ پکڑا تب ہی ارم آئی۔ماں کو دیکھا کہ کام ختم ہو گیا ہے تو تیل وغیرہ اٹھانے لگی۔مگر ششدر سی رہ گئی۔ماں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔
وہ اس سے ناراض تھیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

صائمہ نور



''ثوبیہ ثوبیہ......''

ثوبیہ کام کاج سے فراغت پا کر سکون سے باورچی خانے میں بیٹھی دال چاول کے ساتھ پیاز اور اچار لیے کھانا کھانے ہی لگی تھی، جب شبانہ یعنی اس کی ماں نے اسے آواز دی۔

ثوبیہ کا نوالہ منہ تک جاتا ہاتھ ہونٹوں کے کنارے تھک گیا۔

اس نے سر جھٹکا، وہ ثوبیہ کو اس کے جہیز کے چند اور نئے جوڑے جو وہ خالہ شمع کے ساتھ بدھ بازار سے لائی — تھیں دکھانے کے لیے اتنی گرم جوشی سے بلا رہی تھیں، جبکہ ثوبیہ کو رتی بھر دلچسپی نہ تھی نہ ہی شادی میں نہ ہی کپڑوں میں۔

''ثوبیہ!'' وہ ابھی اسی زاویہ پر بیٹھی تھی کہ دوبارہ صحن کے پار موجود چھوٹے سے کمرے سے آواز— ثوبیہ کی سماعت تک پہنچی اس نے بنا ہوا نوالہ تقریباً منہ میں ٹھونسا۔

''آتی ہوں۔'' ساتھ ہی جواب بھی دیا۔

ثوبیہ نے کھانا دوسری پلیٹ سے ڈھانپا اور پلیٹ جگہ پر رکھی۔ پانی کے دو گھونٹ بھر کر وہ اپنی ماں کے کمرے کی جانب چل دی۔

''ثوبیہ! یہ دیکھ خالہ لائی تھی، کل تیرے لیے۔'' شبانہ نے ثوبیہ کے آگے گہرے جامنی رنگ کا سوٹ لہرایا۔

ثوبیہ کو اتنے گہرے رنگ بالکل پسند نہ تھے پر وہ بامشکل ہی اپنی پسند ناپسند کا اظہار کیا کرتی تھی۔

اس نے اپنی ماں کا دل رکھنے کو کپڑا ہاتھ میں لیا تاکہ وہ اسے یہ نہ کہہ سکیں کہ اسے دلچسپی ہی نہیں کسی بھی چیز میں۔

''اچھا ہے۔''

ثوبیہ نے دل رکھنے کی ایک اور کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ثوبیہ کپڑے کے معیار کو پرکھ نہ پائی جو اس نے اپنے کالج کی لڑکیوں کو فیرویل پر ایک سے ایک شان دار قیمتی ریشمی نفیس اور مہین لباس زیب تن کیے نہ دیکھا ہوتا پھر بھی اسے اپنے جہیز میں شامل کسی بھی کپڑے کے کم قیمتی ہونے پر کوئی شکایت نہیں تھی۔ یہی اس کے کردار کی پختگی تھی جو اسے صرف اور صرف تعلیم کے حصول سے ملی تھی کیونکہ وہ محض نام کو کتابیں نہیں رٹ رہی تھی بلکہ تعلیم اسے واقعی شعور دے رہی تھی۔

اور یہ تو پھر— کپڑوں کی بات تھی وہ تو اپنی زندگی کے سب سے اہم معاملے یعنی اپنے منگیتر تک پر شاکر تھی حالانکہ اگر کوئی اس سے رائے لیتا تو وہ کہتی کہ جہاں بھی جس سے بھی اس کی شادی ہو وہ پڑھا لکھا ہو۔

''اے لو آپا! اس لڑکی کے چہرے پر تو بارہ بج رہے ہیں، اسے تو کوئی شوق ہی نہیں، ثوبیہ کی عمر کی لڑکیاں تو جہیز کی تیاریوں میں ہلکان ہوئی رہتی ہیں۔ ہر چیز من پسند، ہر چیز کا شوق انہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتا اور یہ ہماری لڑکی۔''

خالہ شمع اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گھما گھما کر اپنی بڑی بہن کو جتا رہی تھیں۔

ثوبیہ شمع خالہ کے گہرے مشاہدے پر چونکی۔

"نہیں شمع! ثوبیہ کے مزاج کو تو تم جانتی ہو اسے تو بس کتابوں کا شوق ہے، یہ تو ہے ہی ایسی سنجیدہ مزاج۔"

شبانہ اپنی بہن شمع کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھیں۔ یوں تو ثوبیہ اور ہارون کی بات طے ہونے کے بعد سے ہی شمع گاہے بگاہے ثوبیہ کی عدم دلچسپی کا ذکر مختلف طریقے سے کرتی آئی تھیں پر آج ان کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ شبانہ بھی کھٹک گئیں وجہ شاید یہی تھی کہ اب شادی بالکل سر پر آن پہنچی تھی اور وہ ان کو ثوبیہ کی طرف متوجہ کر رہی تھیں تو عین یقینی تھا کہ وہ ضرور اپنی اور شبانہ کی بڑی بہن راشدہ سے بھی یہ بات کہتیں جو ثوبیہ کی ہونے والی ساس تھیں۔

اسی لیے گڑبڑا کر شبانہ نے فوراً وضاحت کی تھی۔

ثوبیہ سنجیدگی سے انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔

"ثوبیہ کی تو مت ماری گئی ہے۔ پورے



خاندان کی خوب صورت لڑکیوں کو چھوڑ کر ثوبیہ کو چنا ہے میرے شہزادے نے۔"

شمع خالہ، ہارون سے بہت پیار کرتی تھیں یہ سچ تھا اور یہ بھی کہ وہ اپنی ردا کے لیے کب سے ہارون کو اپنا داماد تصور کئے ہوئے تھیں پر ہارون تو واجبی سی شکل والی ثوبیہ پر فریفتہ تھا۔

خاندان میں ایک سے ایک خوب صورت لڑکی موجود تھی پر ہارون ...... ہارون کی اس محبت اور لگاوٹ کی سب سے اہم وجہ بھی یہی ثوبیہ کی اپنی پڑھائی اور کتابوں سے عشق تھا۔

وہ خاندان کی باقی لڑکیوں کی نسبت بہت سنجیدہ، کم گو اور سمجھدار تھی۔

ہارون خود تو پڑھا لکھا نہیں تھا چھوٹی عمر میں باپ کا سایہ سر سے گزر جانے کے بعد وہ پڑھائی نہیں کر سکا ویسے وہ پڑھ بھی لیتا تو کتنا میٹرک؟

ان کے یہاں پڑھنے کا نہ تو رواج تھا نہ ہی شوق بس ضرورت کی تعلیم حاصل کی، کوئی ہنر سیکھا اور گھر کی ذمہ داری سنبھال لی۔

ہارون خود بھی تھوڑا مختلف تھا اسے خود تو وقت کی نزاکت تلے یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ وہ کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں، لیکن اسے کتابوں سے عشق کرنے والی، اپنے ان پڑھ خاندان کی یہ پڑھی لکھی لڑکی بہت پسند تھی۔

ہارون نے یہ بات کبھی اپنی ماں کے علاوہ کسی سے نہ کہی تھی اس لیے پورا خاندان ہارون کے انتخاب پر حیران تھا۔ ثوبیہ کو بھی اس بات کا اندازہ نہ تھا۔ وہ تو ہارون کو باقی خاندان کے بے ڈھنگے، لاابالی غیر سنجیدہ لڑکوں جیسا ہی تصور کرتی تھی۔

"ثوبیہ! خیالوں کی دنیا سے باہر نکل بیٹا، یہ کتابیں کچھ نہیں دیں گی۔ ہارون تو اتنا پیارا بچہ ہے اس کے کتنے ارمان ہیں۔ ہر چیز اپنی مرضی چاؤ سے لے رہا ہے تیرے لیے، سچی تو اتنی خوش نصیب ہے سب رشک کر رہے ہیں بلکہ لگی لپٹی بغیر کہوں تو حسد ہی کر رہے ہیں خاص کر یہ شمع...... ہے تو میری چھوٹی بہن اسی لیے اس کی نیت جانتی ہوں۔

وہ آج بھی اسی بات کی تلاش میں ہے کہ اسے موقع ملے، راشدہ باجی کے کان بھرے تا کہ یہ رشتہ ختم ہو سکے۔ اور وہ فوراً اپنی ردا کا رشتہ جوڑے۔ مانا کہ تو دو جماعت پڑھ گئی ہے پر اتنی افلاطون نہیں بنی کہ تیرے لیے کوئی شہزادہ آسمان سے اترے گا۔

اب اندر سے تو کتنی بھی سوگ میں ہے، پر خوشی خوشی شادی کی تیاری کر...... کہ سب کو نظر آئے کہ تو خوش ہے۔ بس یہ دن خیریت سے گزر جائیں نکاح کے دو بول میں بڑی طاقت ہوتی ہے دیکھنا خود بخود تیرا دل کھیچ جائے گا۔"

شبانہ نے اچھی خاصی باتیں ثوبیہ کو سنا دی تھیں۔ وہ ماں تھیں اپنی بیٹی کا اچھا برا خوب سمجھتی تھیں۔

ثوبیہ مجرم کی طرح سر جھکا کر بیٹھی تھی، پتا نہیں اسے ہمیشہ پڑھائی کا طعنہ کیوں ملا کرتا تھا؟ اس نے تو کبھی ایسا نہیں سوچا تھا کہ اس کے لیے کوئی شہزادہ آئے گا یا ہارون کے بارے میں کچھ بھی الٹا سیدھا، نہ خود کو کسی سے بھی برتر تصور کرتی تھی۔ وہ تو بس یہ چاہتی تھی کہ اس کی یہ محنت رائیگاں نہ جائے، بی اے کے امتحان ہو جائیں پھر جو مرضی شادی کی تاریخ ہو اسے فرق نہیں پڑتا تھا پر یہ بات کوئی سمجھنے کو تیار ہی نہ تھا۔

امی نے ثوبیہ کے اصرار پر راشدہ خالہ سے ذکر کیا تھا کہ چند دن بعد ہی ثوبیہ کے امتحان ہیں۔ اس کے بعد شادی کی تاریخ رکھ لیں پر شبانہ کی اس بات پر راشدہ خالہ نے سخت برا مانا تھا کہ امتحانوں کی اتنی اہمیت کہ شادی کی تاریخ آگے رکھ لیں حالانکہ سچ بات تو یہ تھی کہ وہ ثوبیہ اور اس کی ماں کی بات مان کر انہیں سر پر نہیں چڑھانا چاہتی تھیں۔ شبانہ اپنی بات کہہ کر کپڑے سمیٹنے لگی تھیں اور ثوبیہ اب بھی اپنی لامتناہی سوچوں میں گم صم سی بیٹھی تھی۔

☆☆☆

شمع خالہ اپنی چپل گھسیٹتی اپنی بڑی بہن راشدہ کے گھر داخل ہو چکی تھیں۔

راشدہ باجی سامنے ہی چارپائی پر بیٹھی اپنے پاندان میں سے چھالیہ نکال کر کتر رہی تھیں۔

"آؤ آؤ شمع آؤ......"

راشدہ نے مسکراہٹ کے ساتھ شمع کا استقبال کیا۔ شمع ایسے چارپائی کے ایک کونے پر ٹک گئی جیسے غم کا پہاڑ ان پر ٹوٹ پڑا ہو۔

"ثاویہ بیٹا! شمع خالہ آئی ہیں پانی لے کر آؤ۔"

انہوں نے سامنے باورچی خانے میں مصروف اپنی بیٹی کو آواز دی۔ ان کی آواز سن کر اندر سے ہارون بھی برآمد ہوا تھا۔

"سلام خالہ! بڑے دن بعد آئیں۔"

ہارون نے تپاک سے اپنی خالہ کو سلام کیا اور وہیں ایک موڑھے پر بیٹھ گیا۔ خالہ اب ہارون کو افسردہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"کیا ہوا خالہ؟" ہارون ان کی نگاہوں کے مفہوم کو سمجھ نہیں سکا تو پوچھا۔

خالہ شمع اپنی چھوٹی آنکھوں کو مزید چھوٹا کرتے ہوئے ہارون کو دیکھنے لگیں پھر راشدہ آپا کے کان کے قریب ہوئیں۔

"آپا کچھ بھی کہو صاف نظر آ رہا ہے ثوبیہ کے دل میں کچھ اور ہے، وہ ہارون سے شادی پر خوش نہیں اور یہ تم ہم سب جانتے ہیں کہ ثوبیہ کو پڑھے لکھے لڑکے پسند ہیں۔"

خالہ شمع اپنی بات کہہ کر اب راشدہ خالہ کے جواب کی منتظر تھیں۔

راشدہ خالہ چپ رہیں وہ بے بس تھیں ان کا بیٹا خود ثوبیہ سے شادی کرنے کا خواہش مند تھا۔

"تم چپ ہی رہو گی، میں تو کہتی ہوں ابھی بھی وقت ہے توڑ دو رشتہ، ہارون میں کس چیز کی کمی ہے لاکھوں نہیں تو ہزاروں کما رہا ہے۔

پڑھا لکھا نہیں تو کیا ہوا۔ کاروبار کرنا جانتا ہے۔ اور کیا چاہیے؟"

ہارون کو اب کچھ کچھ باتیں سنائی دے رہی تھیں وہ دانستہ انجان بن گیا یہ باتیں اس کے لیے بھی باعث تشویش تھیں۔ اگر ایسی کوئی بات تھی بھی تو وہ ثوبیہ سے سنے گا یا اس کے گھر میں کسی سے پوچھے گا، سنی سنائی باتوں پر وہ کان نہیں دھرے گا۔

"ہارون!" ہارون سوچ ہی رہا تھا کیا کرے اتنے میں اس کے دوست شہزاد نے اسے پکارا۔

"امی آتا ہوں۔" وہ اپنی ماں سے کہتا ہوا سامنے دروازے سے باہر نکل گیا۔

"کیا بات ہے ہارون! منہ پر بارہ کیوں بجے ہوئے ہیں؟" شہزاد اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ کوئی بات ہے اسی لیے پوچھا۔

"یار ایک بات ہے۔" شہزاد اس کا بچپن کا دوست تھا اور اس کی اپنی خالہ کی بیٹی کے لیے پسندیدگی سے اچھی طرح واقف تھا۔

"ابھی شمع خالہ آئی ہوئی ہیں گھر پر...... ان کا کہنا ہے کہ ثوبیہ ہمارے رشتے پر خوش نہیں۔"

ہارون یوں تو زمانہ شناس اور ایک زیرک لڑکا تھا پر محبت اور رشتوں کے معاملات میں وہ بہت سادہ تھا۔

ثوبیہ اسے پسند تھی، سگی خالہ کی بیٹی تھی اس نے تو کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ وہ اور ثوبیہ مختلف طرح کے انسان ہیں اور کیا ثوبیہ بھی اس کی طرح اس کو پسند کرتی ہے یا نہیں؟

شمع خالہ کی بات سن کر اب وہ حقیقتاً پریشان ہو گیا تھا کیونکہ وہ دل و جان سے ثوبیہ کو چاہتا تھا۔ اور اس کی ماں بڑی عید کے فوراً بعد اس کی شادی کی تاریخ رکھنا چاہتی تھیں۔

"اس میں اتنا پریشان کیوں ہو رہا ہے خالہ کو بول کے ثوبیہ بھابھی یا ان کی امی سے کسی طرح معلوم کریں کہ کتنی سچائی ہے اس میں؟

اور کیا اگر ثوبیہ کو تو ناپسند ہوگا تو رشتہ ختم کر دے گا؟"

یہ تو ہارون نے سوچا ہی نہیں تھا وہ ایک اور سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اس بات کی تہہ تک ضرور پہنچے گا اس نے سوچا۔

"شہزاد میں آتا ہوں۔" اس نے شہزاد سے اجازت لی اور بے ارادہ ہی اس کے قدم شبانہ خالہ کے گھر کی طرف اٹھ گئے تھے۔

"امی! میری اتنے سالوں کی محنت ضائع ہو جائے گی۔ میرا کتنا بڑا خواب تھا گریجویشن کرنا۔ وہ ادھورا رہ جائے گا۔" ثوبیہ کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

"میں کہتی ہوں ثوبیہ! بس کر دے اب۔ کیا ملے گا بی اے کے امتحان دے کر بھی؟ کون سا تو نے گورنر لگ جانا، کرنی تو وہی چولہا چوکی ہے تو نے ...... وہی ہانڈی روٹی۔ اس اتوار آ ئیں گی باجی تاریخ طے کرنے اب بھول جا امتحان اور شادی کی تیاری کر چپ چاپ۔"

شبانہ نے بات ختم کی۔ ثوبیہ اب مایوس ہو چکی تھی۔

اس نے اپنے ہاتھ میں تھاما بی اے پارٹ دوم کا ایڈمٹ کارڈ ایک کتاب میں رکھا اور اندر کی جانب چل دی اس کے قدموں میں مایوسی کی چاپ تھی جو سننے والے نے سن لی تھی۔

☆☆☆

آج اتوار کا دن تھا۔ راشدہ خالہ ثوبیہ اور ہارون کی شادی تاریخ رکھنے آ رہی تھیں جو کہ شاید مہینہ بھر بعد کی تھی ثوبیہ کے دل کو شدید ٹھیس پہنچی تھی حالانکہ وہ ذہنی طور پر تیار تھی اسے معلوم تھا کہ یہ شادی کی بات ضرور کسی نہ کسی صورت اس کے امتحانوں کے بیچ میں رخنہ ڈالے گی۔

اور وہی ہوا تھا۔ دل کو تو ہزار تاویلیں دے کر سنبھالا تھا پر آنسو بار بار گالوں پر پھسل رہے تھے۔

پھر خالہ تو نہیں آ ئیں ان کا فون آیا۔ وہ دعوت ملتوی کرنے کا کہہ رہی تھیں۔ پتا نہیں انہوں نے شبانہ سے کیا کہا تھا ان کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ ثوبیہ سامنے ہی کھڑی ان کو بات کرتے دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی سہم سی گئی الٰہی خیر پتا نہیں کیا ہوا۔

"کیا ہوا امی!" چھوٹے بھائی نے امی کو پریشان دیکھ کر پوچھا۔

"معلوم نہیں اتنے دنوں سے ہتھیلی پر سرسوں جمانے والی راشدہ آپا یکدم شادی آگے بڑھا رہی ہیں۔ کہہ رہی ہیں کچھ دن رک جائیں۔ پتا نہیں شمع نے نہ کچھ کہا ہو ان سے۔ کہہ رہی تھیں اگلے اتوار کو آ ئیں گی ہارون کے ساتھ پھر تفصیل سے بتائیں گی معاملہ کیا ہے۔ بس اللہ خیر کرے۔"

وہ سچ مچ بہت پریشان ہو چکی تھیں۔

"کچھ نہیں ہو گا امی! آپ اللہ پر بھروسہ رکھیں۔" چھوٹے بھائی نے امی کو تسلی دی تھی۔

ثوبیہ بھی پریشان ہو گئی تھی۔ اسے اب آئندہ اتوار کا انتظار تھا تا کہ اصل بات کا پتا لگے۔ اللہ اللہ کر کے اتوار بھی آ گیا۔

☆☆☆

ہارون اور راشدہ خالہ ہی آئے تھے۔ ثوبیہ نے باورچی خانے کی کھڑکی سے باہر صحن میں دیکھا۔ راشدہ خالہ کے منہ پر بارہ بج رہے تھے۔ ثوبیہ ان دونوں کے لیے چائے اور دیگر لوازمات لیے باہر آئی تو وہ شبانہ سے مخاطب ہوئیں۔ ثوبیہ اب ٹرے تپائی پر رکھ کر چائے ان کو پیش کرنے ہی والی تھی کہ وہ گویا ہوئیں۔

"شبانہ! ثوبیہ کے امتحان ہونے والے ہیں اسی لیے میں نے اور باقی گھر والوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بچی پہلے اپنے امتحان دے لے پھر تو ساری عمر اس نے گھر ہی سنبھالنا ہے۔" وہ کہہ کر خاموش ہوئیں۔

ہارون نظر جھکا کر زیر لب دھیمی مسکراہٹ لیے بیٹھا تھا۔ راشدہ خالہ کے منہ سے یہ بیان سنتے ہی ثوبیہ کی بے ساختہ نگاہیں ہارون کی جانب اٹھ گئیں۔ ہارون کی نظروں میں اس کے لیے پیار اور مان تھا۔ ثوبیہ کو لگا اس کا دل جیسے ابھی سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر نکل جائے گا۔ وہ جلدی سے چائے کی پیالیاں انہیں تھما کر جانے ہی لگی تھی کہ خالہ نے اسے اپنے ساتھ بیٹھنے کو کہا۔ وہ بے تحاشہ دھڑکتے دل کے ساتھ وہاں بیٹھ گئی۔

☆☆☆

دو دن پہلے ثوبیہ کو لگا تھا کہ اس نے کسی کی آہٹ سنی ہے۔ اسے نہیں معلوم تھا وہ ہارون ہو گا اس نے شاید اس کی اور شبانہ کی باتیں سن لی تھیں۔

لمبا، سانولا مناسب سے نین نقش والا ہارون جسے ثوبیہ نے کبھی نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا تھا اور آج یوں اچانک ثوبیہ کو لگا وہ تو پورے طمطراق کے ساتھ دل کے سنگھاسن پر براجمان ہو گیا ہے۔

ثوبیہ کے چہرے پر بھی خوشی اور محبت کے رنگ کھلے ہوئے تھے جو آج سے پہلے ہارون نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

اس دن ہارون اپنی خالہ سے پوچھنے آیا تھا کہ کیا ثوبیہ کو اس سے شادی پر کوئی اعتراض ہے؟ اس نے ان دونوں ماں بیٹی کی باتیں سن لی تھیں۔ کیا مانگا تھا ثوبیہ نے محض چند دن اور؟ ہارون نے سوچا۔ وہ ثوبیہ کو اسی لیے تو دل و جان سے پسند کرتا تھا کہ وہ یکسر مختلف و سنجیدہ اطوار کی لڑکی تھی۔

وہ خود ان پڑھ تھا لیکن اسے تعلیم کی اہمیت کا اندازہ تھا اور قدر بھی...... اس نے فیصلہ کیا کہ ثوبیہ کی خواہش کا احترام کرے گا۔ اس نے اپنی ماں کو دوٹوک کہا کہ وہ ثوبیہ کے امتحانوں کے بعد ہی شادی کی تاریخ مقرر کریں تا کہ وہ تسلی کے ساتھ امتحان دے سکے...... اور وہ اپنے فیصلے پر مطمئن تھا۔

ثوبیہ نے بھی جان لیا تھا کہ ہارون ایک ذہنی وسعت رکھنے والا بردبار شخص ہے۔ اپنے گھٹن زدہ ماحول میں ہارون جیسی سوچ والا شریک سفر کا ملنا کسی نعمت سے کم نہیں تھا، اچانک ہی اسے اپنی قسمت پر ناز ہوا۔

ہارون کا فیصلہ کتنا درست تھا، یہ ثوبیہ کی بار بار اس کی جانب اٹھتی تشکر بھری نگاہوں سے صاف عیاں تھا تو ثوبیہ محض اپنی تعلیم کے ادھورے رہ جانے کے خیال سے افسردہ اور ناخوش تھی، شادی پر اسے کوئی اعتراض نہ تھا، یہ سوچ کر ہی ہارون کے دل میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

ہارون کی بے قراری اب مزید دو آتشہ ہو گئی تھی۔ لیکن کچھ دن کی قربانی دے کر ہارون نے زندگی بھر کے لیے ثوبیہ کا دل جیت لیا تھا۔

ہارون تو پہلے بھی ثوبیہ کی قدر کرتا تھا۔ اب ثوبیہ کو بھی ادراک ہو چکا تھا کہ انسان کا فلسفہ زندگی مثبت ہو تو کسی چیز کی کمی راستے کی رکاوٹ نہیں بنتی، ہارون اسکول کالج کا ڈگری یافتہ نہ سہی، عملی میدان میں خالص سند یافتہ تھا ایسی سند جو کسی تعلیمی ادارے سے نہیں ملتی بلکہ زندگی اور تجربہ عطا کرتا ہے۔

☆☆

راشدہ رفعت

چھوٹی چھوٹی باتیں

کاموں کی تقسیم بظاہر منصفانہ تھی۔ دوپہر کو کھانا آئمہ بناتی تھی تو برتن شاہانہ بھابھی دھوتی تھیں۔ شام کو باری بدل جاتی تھی۔ شاہانہ بھابھی کے ذمے کھانا بنانا ہوتا تو برتن دھونے کی ڈیوٹی آئمہ کی ہوتی۔

آئمہ کی طبیعت میں مروّت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ جب بھی شاہانہ بھابھی کی طبیعت ناساز ہوتی یا بھی کاموں کا اضافی بوجھ آن پڑتا تو وہ بڑھ چڑھ کر ان کی مدد کرتی مگر اس خلوص کا مظاہرہ کبھی شاہانہ بھابھی کی جانب سے نہ کیا جاتا۔

آج بھی ایسا ہی ہوا شام کو اس کے ماموں سسر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ملنے آنکلے، ساس اتنے عرصے بعد بھائی، بھاوج کی آمد پر اتنی خوش ہوئیں کہ فوراً بہوؤں کو رات کا پُرتکلف کھانا تیار کرنے کا کہہ دیا۔

اگر یہ مہمان دوپہر کو آتے تو کھانے کا سارا اہتمام آئمہ کو اکیلے ہی کرنا پڑتا کیونکہ شاہانہ بھابھی تو اپنی باری کے مطابق کھانے کے بعد کچن سمیٹنے اور برتن دھونے ہی کچن میں تشریف لاتیں مگر آئمہ کی بامروّت طبیعت کو گوارا نہ ہوا کہ وہ اس اچانک ، سر پر پڑنے والی دعوت کا اہتمام کرنے کی ساری ذمہ داری شاہانہ بھابھی کو سونپ دے، اس نے ان کا برابر کا ہاتھ بٹایا تھا حالانکہ آج اس کی کمر میں بھی اچھا خاصا درد ہو رہا تھا۔

کھانے کے بعد مہمان رخصت ہوئے تو وہ برتنوں کے ڈھیر سے نبرد آزما ہونے پھر سے کچن میں گھس گئی۔ توقع کے عین مطابق شاہانہ بھابھی نے اپنی ڈیوٹی بتانے کے بعد کچن میں جھانکا تک نہیں۔

آئمہ نے کچن سمیٹ کر سارے برتن دھوئے۔ چائے کی کیتلی میں ایک کپ چائے بچی تھی جو اس کی تھی، وہ سب کاموں سے فراغت کے بعد گرم چائے کا کپ اپنے کمرے میں لے جانا چاہتی تھی۔ سوچا تھا پین کلر لینے کے بعد بستر میں بیٹھ کر سکون سے چائے پیے گی۔ جس وقت چائے گرم کر کے کپ میں ڈالنے کے بعد اس نے جھٹ پٹ کیتلی دھو کر کچن سے نکلنا چاہا۔

شاہانہ بھابھی تین چار پلیٹیں لیے کچن میں داخل ہوئیں اُن کے بچوں نے کھانا بیڈروم میں ہی کھایا اور یہ وہ ہی برتن تھے۔ آئمہ کو گمان ہوا کہ شاہانہ بھابھی اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ دیکھ کر یہ چند برتن خود دھولیں گی، لیکن وہ بنا کچھ کہے پلیٹیں سنک میں ڈال کر کچن سے چلی گئیں۔

بے مروتی کے اس مظاہرے پر آئمہ ششدر ہی تو رہ گئی، انہوں نے یہ بھی لحاظ نہ کیا کہ وہ پوری شام ان کے ساتھ برابر لگی ہے اور برتنوں کا اتنا بڑا ڈھیر اس نے اکیلے ہی دھویا ہے ٹھیک ہے اس نے یہ توقع نہ کی تھی کہ اس کی مدد کے بدلے، شاہانہ بھابھی اس کے ساتھ برتن دھلوائیں گی لیکن ان کا کیا جاتا اگر وہ چند پلیٹیں خود دھولیتیں۔

ایک بار تو آئمہ کا جی چاہا کہ وہ یہ پلیٹیں سنک میں ہی پڑی رہنے دے اور کچن کی لائٹ بند کر کے اپنے کمرے کی راہ لے لیکن صبح سب سے پہلے کچن



میں داخل ہونے والی ہستی اس کی ساس ہوتی تھیں۔
وہ فجر پڑھ کر اپنی چائے بنانے کچن میں آتیں اور سنک میں پڑا ایک بھی ان دھلا برتن انہیں سخت کھلتا تھا تو کتیں دونوں بہوؤں کو تھیں مگر شاہانہ بھابھی اطمینان سے کندھے اچکا کر باور کر دیتیں کہ رات کے برتن دھونا آئمہ کی ذمہ داری ہے۔
اب تو شاہانہ بھابھی کی ان عادتوں کو جھیلتے ایک عرصہ ہو گیا تھا لیکن آئمہ ہر بار ایسی کسی بھی بات پر پہروں کڑھتی تھی۔ برتن دھو کر اس نے نیم گرم چائے وہیں کھڑے کھڑے پی لی اور پھر وہ کپ بھی دھو کر رکھ دیا۔
کمر درد سے زیادہ شاہانہ بھابھی کی بے مروت طبیعت نے اسے تکلیف پہنچائی تھی۔ بیڈ روم میں آ کر اس نے اویس کے سامنے ان کے مزاج کا دکھڑا رویا تھا۔
اویس نے ایک منٹ کے لیے تو اس کی بات توجہ سے سن لی لیکن بات جب ذرا طویل ہوئی اور اس نے دو دن پرانی کسی بات کا حوالہ بھی شامل کرنا چاہا تو وہ بور ہو گیا۔
"ارے چھوڑو یار، رات گئی بات گئی۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر کڑھنا چھوڑ دو۔ بلاوجہ موڈ خراب کرتی ہو۔" وہ رسانیت سے بولا۔
"میرا موڈ خراب کرنا آپ کو بلاوجہ لگتا ہے۔" آئمہ نے دکھ بھرے لہجے میں دریافت کیا۔
"میں کچھ اور کہوں گا تو تم ہائنڈ کر جاؤ گی۔ یہ تم عورتوں کا عمومی مزاج ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں نوٹ کرتے کرتے ایک طویل لسٹ بنا لیتی ہو پھر ان ہی باتوں کو سوچ سوچ کر کڑھتی ہو اور اپنا خون جلاتی ہو۔ ہم مردوں کا معاملہ مختلف ہے، ہم ان معمولی باتوں کو درخور اعتنا ہی نہیں جانتے۔"
وہ لاپروا سے انداز میں گویا ہوا۔ آئمہ نے مزید بحث نہ کی حالانکہ اس کا دل دکھا ہوا تھا، کیا جاتا اگر اویس اس وقت اس کی ذہنی کیفیت سمجھ کر معمولی سی دل جوئی ہی کر دیتا۔ اس نے کس مزے سے اسے

عام عورتوں کی فہرست میں کھڑا کر دیا تھا، اگر وہ عام عورتوں کی طرح معمولی باتوں کو جواز بنا کر تعلق خراب کرنے والوں میں سے ہوتی تو ہر بار یوں، خود غرضی کے جواب میں خلوص کا مظاہرہ نہ پیش کرتی۔
جس طرح شاہانہ بھابھی اپنی فطرت کی اسیر تھیں، اسی طرح وہ بھی فطرتاً بروں کے ساتھ اچھائی کرنے پر مجبور تھی۔ زیادہ دیر کینہ بھی دل میں نہ رکھ پاتی۔
دکھ کی وقتی کیفیت سے جلد ہی باہر نکل آتی تھی وہ جانتی تھی کہ اگلے دن، وہ سب بھلا کر دوستانہ گرم جوشی سے شاہانہ بھابھی کے ساتھ مل کر کام کر رہی ہو گی لیکن آج کے دن وہ اپنے شریک حیات کے لبوں سے حوصلہ افزائی کے دو بول سننے کی متمنی تھی۔
اگر اویس اسے شاہانہ بھابھی کے حصے کا کام کرنے پر، سراہ دیتا یا کم از کم ان کی بے مروتی پر اس

کی ہاں میں ہاں ملا دیتا تو وہ اس وقت اتنی پُرملال تو نہ ہوتی۔ عام عورتوں والا طعنہ اسے بری طرح ہرٹ کر گیا تھا۔ لیکن اس وقت بحث کے بجائے اس نے پین کلر لے کر سونے کو ترجیح دی تھی۔

☆☆☆

روز وشب اپنی رفتار سے گزرتے جا رہے تھے۔ چند ماہ پہلے اویس کا دوسرے شہر ٹرانسفر ہوا تھا اور آئمہ کا بھرے پُرے گھر میں بھی جی نہ لگتا۔ وہ سسرال میں ہی رہ رہی تھی۔ پندرہ دن بعد اویس گھر آتا تھا۔ وہ دوبارہ اپنے شہر ٹرانسفر کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا امید واثق تھی کہ یہ کوشش، کامیابی سے ہم کنار ہو جائے گی لیکن فی الحال وہ سب گھر والوں سے دور وہیں رہنے پر مجبور تھا۔ جس بلڈنگ میں وہ رہ رہا تھا وہاں اکثر چھڑے ہی رہائش پذیر تھے۔

اویس نے بھی اپنے دوسرے دو کولیگز کے ساتھ مل کر چھوٹا سا پورشن کرائے پر لیا تھا۔ نجم اور حمید اس کی کمپنی میں کام کرتے تھے انہوں نے ہی اویس کو ساتھ رہنے کی آفر کی تھی، کرایہ مناسب تھا، جگہ بھی آفس سے زیادہ دور نہ تھی سو اویس نے ان کی پیش کش بخوشی قبول کر لی تھی۔

اب اسے ان کے ساتھ رہتے رہتے تین مہینے ہونے کو آئے تھے۔ لیکن ہر گزرتا دن اس کی برداشت کا پیمانہ لبریز کرتا جا رہا تھا۔ وہ بہت نفاست پسند طبیعت کا مالک تھا۔ یہ نفاست پسندی اسے ماں سے ورثے میں ملی تھی پھر شادی کے بعد بیوی بھی ہم مزاج ملی۔

اویس کو کبھی بھی آئمہ کو کچھ بتانے سمجھانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اسے اپنا کمرہ کبھی بے ترتیب نہ ملا۔ ٹاول اسٹینڈ پر ہمیشہ دھلا ہوا تولیہ موجود ہوتا۔ بیڈ شیٹ پر کوئی شکن موجود نہ ہوتی۔ فرنیچر پر گرد کا کوئی ذرہ ڈھونڈے سے بھی نہ ملتا۔

اس صاف ستھرے ماحول کے عادی اویس صاحب کو جب دو بے ڈھنگے بندوں کے ساتھ، ایک کمرہ شیئر کرنا پڑتا تو اس کے صحیح معنوں میں چودہ طبق روشن ہو گئے۔ تینوں کو ایک واش روم شیئر کرنا پڑ رہا تھا۔

اویس ان دونوں کے جاگنے سے پہلے نہا دھو کر فارغ ہو جاتا۔ اب آفس جانے سے پہلے فقط تیار ہو کر نہ صرف ناشتا کرنا ہوتا تھا بلکہ ناشتا تیار بھی کرنا پڑتا تھا۔ بیوی کے ہاتھ کا بنا گرم گرم لذیذ ناشتا تو اب پندرہ دن بعد ہی ملتا تھا، آملیٹ کے ساتھ ڈبل روٹی کے توس سینک کر کام چلانا پڑتا۔

حمید ناشتا آفس جا کر کرتا جبکہ نجم واش روم جاتے جاتے، اویس کو ہانک لگا دیتا کہ وہ چار توس اس کے بھی سینک کر ایک انڈا فرائی کر دے۔

شروع شروع میں تو اویس کو اس کا ناشتا بنانا نہ کھلتا تھا لیکن جب، اس نے مستقل ہی یہ روٹین اپنا لی تو اویس کا میٹر بھی گھومنے لگا۔ گویا اس نے اسے اپنا نوکر ہی سمجھ لیا تھا، پھر محترم صفائی ستھرائی کے معاملے میں بھی رج کر بدسلیقہ تھے۔ واش روم سلیپر لے کر کچن تک میں چلا آتا۔ اپنی بیڈ شیٹ جھاڑنے یا کمبل تہ کرنے کا تکلف نہ کرتا۔ اویس کو بکھرے کمرے سے زیادہ الجھن ہوتی تو اس کا بستر بھی تہ کر دیتا اور جس دن نہ کرتا تو نجم ذرا ناراضی بھرے لہجے میں استفسار کرتا۔

"کیا ہوا یار! آج میری چادر نہیں جھاڑی۔ رات مونگ پھلی کھائی تھی، ابھی بھی بیڈ شیٹ پر چھلکے پڑے ہیں۔" اور اس شکوے پر اویس بس اسے دیکھ کر رہ جاتا۔

نجم کی نسبت حمید کی عادتیں خاصی معقول تھیں۔ اگر اویس اس کے حصے کا کوئی کام کرتا تو وہ بھی اویس کو آسانی فراہم کرنے کی اپنی سی کوشش ضرور کرتا۔

حمید کی وجہ سے ہی وہ نجم کو بھی برداشت کرنے پر مجبور تھا ورنہ کبھی کبھار تو دل کرتا کہ اپنا بوریا بستر اٹھا کر علیحدہ کمرہ لے کر، وہاں شفٹ ہو جائے لیکن پھر سے ٹرانسفر کے امکان ہر گزرتے دن کے ساتھ روشن ہو رہے تھے، سو وہ نجم کو کڑوے گھونٹ کی طرح برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

اس دن تو حد ہی ہوگئی، رات کا کھانا حمید نے بنایا کہ بازاری کھانے کھا کھا کر تینوں ہی اوب چکے تھے۔

حمید نے کھانا تو لاجواب بنایا لیکن چھوٹے سے کچن میں خوب ابتری پھیل گئی۔ اویس نے کچن سمیٹ کر برتن دھوئے پھر چائے بنانے کا نجم کو کہا۔

"ارے چھوڑ یار! میں اب بستر میں گھس گیا ہوں۔ بستر سے نکلنے کا کوئی موڈ نہیں۔ آجا مونگ پھلیاں کھالے۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

"مجھے چائے کی سخت طلب ہے۔ شرافت سے بستر سے نکل کر چائے بنا اور ہاں پھر کپ اور کیتلی بھی تجھے ہی دھو کر رکھنی ہوگی۔" اویس نے اس کے سابقہ ریکارڈ کے پیش نظر پیشگی باور کروایا۔

"او بھائی! تجھے طلب ہے ناں تو بنا کر پی لے۔ مجھ پر زبردستی کیوں کر رہا ہے۔" وہ مونگ پھلی ٹونگتے ہوئے بولا۔

اویس نے اسے گھورا، پھر ضبط سے کام لیتا ہوا واپس کچن کی طرف مڑ گیا لیکن آج اس نے فقط دو کپ چائے بنائی اور جب اس نے حمید کو چائے کا کپ تھمایا تو نجم نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

"میرا کپ؟"

"تو نے کب کہا تھا کہ تیرا موڈ ہے؟" اویس دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاتا بظاہر ہنس کر بولا تھا۔

"یار، دو کپ تو بنا ہی رہا تھا تیسرا کپ بنانے میں کوئی اضافی محنت لگتی تھی۔" وہ ذرا خفا ہوتے ہوئے بولا اور اب اویس سے بھی رہا نہ گیا۔

"یار نجم! تم میری اور حمید کی شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہو۔ حمید نے ساری شام لگا کر کھانا بنایا۔ میں نے اتنی ٹھنڈ میں ٹھنڈے یخ پانی سے برتن دھوئے تجھ سے صرف چائے بنانے کو کہا تو بھی ہری جھنڈی دکھادی۔ میں جو روز صبح تیرا ناشتا بناتا ہوں کبھی بدلے میں تو نے میرا چائے کا کپ تک دھو کر دیا؟" اویس نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"دیکھ حمید! دیکھ اپنے جگر کو۔ عورتوں کی طرح کیسے چھوٹی چھوٹی باتوں کا طعنہ مار رہا ہے۔" نجم سدا کا ڈھیٹ، الٹا اویس کو ہی عورتوں کی صف میں کھڑا کر کے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا اور اسی لمحے اویس کو کچھ یاد آیا تھا۔ وہ نجم کی باتوں پر مزید الجھنے یا بحث کرنے کے بجائے خاموشی سے چائے کی چسکیاں لینے لگا۔

سونے سے پہلے وہ حسب معمول آئمہ سے میسجنگ میں مصروف تھا تو ادھر ادھر کی باتوں کے دوران اس نے سوری کا میسج بھیجا تھا۔

"کس چیز کی سوری — ؟" آئمہ حیران ہوئی۔

"ماضی میں تمہیں چھوٹی چھوٹی باتوں کو سر پر سوار کر لینے کے بہت طعنے دیتا تھا۔ اب خود ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھگت رہا ہوں تو تمہارا درد سمجھ میں آرہا ہے۔" اس نے فراخ دلی سے اعتراف کیا تھا۔

"ارے چھوڑیں ٹینشن کیوں لیتے ہیں۔ نجم ہی تنگ کر رہا ہوگا ناں تھوڑے دنوں کی بات ہے پھر واپس اپنے گھر آجائیں گے۔"

آئمہ کو اس کی معذرت سے گویا کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ وہ بے چاری شوہر کی پریشانی میں پریشان اسے تسلی دلاسا دینے لگ گئی تھی۔

اویس اس کی محبت پر مسکرایا لو یو کا میسج بھیج کر چیٹ کا اختتام کر دیا۔ آج اسے آئمہ نہ صرف بہت یاد آرہی تھی بلکہ اپنی کامنی سی بیوی کی اس ٹینشن کا بھی بخوبی احساس ہو گیا تھا جس میں وہ شاہانہ بھابھی کی وجہ سے مبتلا ہوتی تھی۔

شاہانہ بھابھی کی فطرت بدلنے کی تو وہ فقط دعا ہی کر سکتا تھا لیکن آج کے دن نے اسے، یہ سبق سکھا دیا تھا کہ بیوی کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر کڑھنے کا طعنہ دینے کے بجائے وہ اس کی دل جوئی کے لیے دو جملے ضرور بول دے گا۔

دل میں مصمم ارادہ کر کے وہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆

حمیرا شفیع

ناولٹ

دل کا آنگن سونا ہے

سردی کیا آئی، گھر سے بجلی، پانی اور گیس تینوں ہی غائب ہو گئے۔ بجلی اور پانی کا تو چولی دامن کا ساتھ تھا۔ بجلی نہیں آتی تو موٹر بھی نہیں چلتی تھی، لہٰذا پانی بھی نہیں آتا تھا مگر گیس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ کس وجہ سے روٹھی بیٹھی تھی۔

خیر انہوں نے ناشتہ بنانے کے لیے کچن کی بتی جلائی تو یو پی ایس نے شور مچانا شروع کر دیا۔ اس کی بھی بیٹری لو تھی۔ اب موم بتی، لالٹین وغیرہ کا تو زمانہ ہی نہیں رہا تھا۔ انہوں نے موبائل کی ٹارچ سے ہی سیلینڈر پر چائے ابلنے رکھ دی۔ پھر توس سینکے، ٹرے میں ناشتے کے لوازمات سجائے اور پپو کے کمرے کا رخ کیا۔

اندر داخل ہوئے تو وہ سامنے پلنگ پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ سامنے کتاب کھلی تھی مگر نظریں خلا میں کہیں گھور رہی تھیں۔

"پپو بیٹا! ناشتہ ......؟" انہوں نے پیار سے پکارا، اس نے کوئی رد عمل نہ دیا اور مستقل خلا میں کہیں گھورتا رہا۔

"ہائے اللہ! ساری رات پڑھتا رہا ہے۔ کہیں دماغ تو نہیں چل گیا۔" انہوں نے دہل کر سوچا۔

سارے خاندان کے لڑکے میٹرک فیل تھے۔ صرف وہی فزکس میں بی ایس کر رہا تھا۔

"اللہ نظر بد سے بچائے۔" انہوں نے منہ میں آیات پڑھ کر اس پر لمبی پھونک ماری تو وہ چونکا۔

"بچے! ناشتہ کر لو۔" انہوں نے ٹرے اس کے سامنے دھری۔

"ماموں جان! دل نہیں چاہ رہا۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

"کیوں کیا بات ہے......؟" انہوں نے تشویش سے اس کی جانب دیکھا۔

"کیا پریشان ہو......؟"

اس نے تربوز جتنا بڑا سر اثبات میں ہلا دیا۔

"یار! پریشان نہ ہوا کرو۔ اچھی تیاری ہے تمہاری۔ ان شاء اللہ پرچے بھی اچھے ہو جائیں گے۔" انہوں نے اسے تسلی دی۔ پپو تھوڑا کنفیوز سا اسٹوڈنٹ تھا۔ اچھی تیاری کے باوجود خوامخواہ بوکھلایا ہوا سا رہتا تھا۔

"نہیں ماموں! امتحان کی پریشانی نہیں ہے۔" وہ کچھ جھجکتے ہوئے بولا۔

"نہیں تو پھر کیا ہے؟" اب کے انہوں نے ذرا گہری نظر اس پر ڈالی وہ گھبرایا ہوا سا اپنی انگلیاں مروڑے جا رہا تھا۔

"کیا بات ہے بیٹا!" انہوں نے پیار سے پچکارا۔

"ماموں جان ...... ماموں وہ ذرا ...... وہ سامنے والوں کی لڑکی ہے نا......"

"کیا لڑکی ......!" وہ اس کے منہ سے غیر متوقع طور پر لڑکی کا لفظ سن کر اچھل پڑے۔

"جی ماموں جان......وہ سامنے والوں کی لڑکی۔"

"کم بخت شرم نہیں آتی۔ محلے کی بچیوں کو تاڑتے ہو......!" آناً فاناً ان کے تیور بدل گئے، لہجہ خوں خوار ہو گیا۔

"ماموں جان......وہ لڑکی۔"



"بس!" ان کا ضبط جواب دے گیا۔ انہوں نے سامنے پڑی وزنی کتاب اس کے سر پر دے ماری۔
"بے حیا! یہ تربیت کی ہے میں نے تمہاری۔ اگر ہمارے گھر میں کوئی عورت نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم دوسری عورتوں کی عزت نہ کرو۔ ڈوب مرو۔ محلے کی بچی پر نظر رکھتے ہو۔"
انہوں نے کتاب اٹھا کر دوسرا وار کرنا چاہا۔ پپو بے چارا بدک کر پیچھے ہٹا۔ پہلی ضرب سے ہی اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اس نے ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔
"خدا کے واسطے ماموں جان! پہلے میری پوری بات تو سن لیں۔ میں نے تو اسے کبھی نہیں تاڑا اور نہ چھیڑا۔ وہ تو ایک دن چھت پر دھوپ میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ وہ بھی اپنی چھت پر تھی۔ مجھے دیکھ کر اونچا اونچا گنگنانے لگی۔ میں نے نظر انداز کر دیا تو ایک کاغذ گولی بنا کر اچھالا۔ میں نیچے اتر آیا۔ پھر راستے میں بھی آتے جاتے فقرے کسنے لگی۔
ایک دن گلی کی نکڑ پر رشید کریانے والے کے پاس موبائل میں بیلنس ڈلوا رہا تھا۔ وہ بھی سودا سلف لینے آئی تھی شاید میرا نمبر نوٹ کر لیا۔ اب تو اتر سے میسج کرتی ہے۔ میں نے نمبر بلاک کیا تو دوسرے نمبر سے بھیجنے لگی۔ یہ دیکھ لیں۔"
اس نے روتے ہوئے اپنا موبائل ان کے سامنے پٹخا۔
حیرت سے گنگ انہوں نے موبائل کھولا لاتعداد میسجز کی بھرمار تھی۔ انتہائی بے ہودہ عامیانہ اشعار۔ دیدہ دلیری کی حد تھی کہ اس شتر بے مہار لڑکی نے ڈنکے کی چوٹ پر اپنا نام بھی واضح "مہ پارہ" لکھ رکھا تھا۔
"یہ تو سیدھا سیدھا ہراسمنٹ کا کیس بنتا ہے۔" وہ بڑبڑائے۔
پپو بیچارہ چپ چاپ اپنا سر سہلاتا رہا۔
"اس لیے بچہ روز بروز گم صم سا رہنے لگا تھا۔ ہائے میرے معصوم بچے کو وہ کب سے ہراساں کر رہی تھی۔ نانہجار، بدبخت لڑکی۔"

انہیں اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ جھٹ گلے لگایا۔ بال سنوارے جو کتاب کی ضرب پڑنے سے منتشر ہو چکے تھے۔
"دیکھنا! میں اس کے خلاف ہراسمنٹ کی شکایت درج کراؤں گا۔" انہوں نے پپو کو تسلی اور تشفی دیتے ہوئے کہا۔
"مگر ماموں جان! ایسی شکایت تو عام طور پر لڑکیوں اور عورتوں کی طرف سے مردوں کے خلاف ہوتی ہے۔ ایک لڑکے کی طرف سے لڑکی کے خلاف بھلا کون یقین کرے گا۔"
پپو نے رومال سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں اس لڑکی سے واضح خوف کی پرچھائیاں دیکھ کر انہیں اس پر مزید ترس آیا۔
"تم بس اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں خود دیکھ لوں گا۔" انہوں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔

☆☆☆

کہنے کو تو انہوں نے کہہ دیا تھا کہ وہ معاملہ خود دیکھ لیں گے۔ مگر جب تنہائی میں بیٹھ کر غور کیا تو احساس ہوا کہ یہ ہرگز بھی اتنا آسان نہیں تھا۔ بچی کا معاملہ تھا۔ محلے میں کسی سے بھی اس نوعیت کا معاملہ ڈسکس کرنا مناسب نہیں تھا۔ وہ لوگ بھی چند ماہ پہلے ہی کرائے کے مکان میں شفٹ ہوئے تھے۔ کوئی جان پہچان بھی نہیں تھی۔ اب ڈائریکٹ ان کا دروازہ بجا کر شکایت نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہ کون سا پڑوسیوں کے دروازے کے سامنے کوڑا پھینکنے جیسا معاملہ تھا۔ اس بات پر وہ الٹا ان کے گلے بھی پڑ سکتے تھے۔
وہ شریف آدمی تھے اور شریف آدمی کو اپنی عزت بڑی پیاری ہوتی ہے۔ ابھی اسی ادھیڑبن میں تھے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ ایک دوپہر پپو بہت گھبرایا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ پسینے چھوٹ رہے تھے۔ تندور والے سے روٹیاں اور دال لینے گیا تھا۔ لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔
"ماموں جان! جب میں واپس آ رہا تھا تو وہ

بھی اپنے گھر سے نکل رہی تھی۔ گلی میں کوئی بھی نہیں تھا۔ جب میں قریب آیا تو مجھے زور سے کہنی مار کر ہنستے ہوئے گزر گئی۔"

وہ روہانسا ہو رہا تھا۔ مارے غصے کے ماموں جان کا منہ سرخ ہو گیا۔ اب تو اس دیدہ ہوائی کا کچھ نہ کچھ علاج کرنا پڑے گا۔ آخر کب تک ان کا معصوم بچہ یہ سب سہے گا۔

☆☆☆

ایک شام جی کڑا کر کے انہوں نے سامنے والوں کا دروازہ بجایا۔

کافی دیر بعد تقریباً ان کی ہم عمر ایک عورت نے دروازہ کھولا۔

"جی فرمایئے۔" اس نے نہایت شائستگی سے دریافت کیا۔

"وہ جی دراصل میرا نام احسن ہے۔ میں آپ کے یہ بالکل سامنے والے گھر سے آیا ہوں۔ آپ کسی مرد کو بھیجیں۔ مجھے اہم بات کرنی ہے۔" انہوں نے بھی مہذب الفاظ میں مدعا بیان کیا۔

"وہ جی گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔ آپ مجھ سے ہی بات کر سکتے ہیں۔" وہ عورت نرمی سے بولی۔

"دیکھیے خاتون! معاملہ انتہائی حساس نوعیت کا ہے۔ میں یوں گلی میں کھڑے کھڑے بات نہیں کر سکتا۔"

"اچھا تو میں بیٹھک کھولتی ہوں۔ آپ تشریف لے آئیں۔"

وہ کچھ جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ عورت نے انہیں سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ان سے خاصے فاصلے پر موجود ایک پلنگ پر ٹک گئیں۔

"جی فرمایئے۔" وہ ہمہ تن گوش تھیں۔

"خاتون! آپ غالباً مہ پارہ بیٹی کی والدہ ہیں۔" انہوں نے تھوک نگلتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔

اپنی بیٹی کا نام ایک اجنبی مرد کے منہ سے سن کر وہ خاتون، چونک گئیں مگر پھر جلد ہی اپنے جذبات پر قابو پا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"محترمہ! آپ میری بات نہایت صبر اور برداشت سے سنیں۔ بخدا میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں کروں گا۔ میں اپنے بھانجے پپو کے ہمراہ اس محلے میں برسوں سے مقیم ہوں۔ میں اپنی تعریف تو نہیں کرتا مگر آپ اہلِ محلہ سے میرے اور میرے بھانجے کے بارے میں تحقیق کر سکتی ہیں۔ ایک زمانہ ہماری شرافت کا گواہ ہے۔ ہمارے خاندان میں عورتوں اور بچیوں کی عزت کرنا سختی سے سکھایا جاتا ہے۔ پپو یتیم بچہ ہے۔ میں نے ہی اسے پالا پوسا ہے۔ اب وہ ماشاءاللہ بی ایس کے فائنل ایئر میں ہے۔

چند روز قبل اس نے مجھ سے ایک عجیب سی شکایت کی۔ اسے آپ کی بچی مہ پارہ سے مسئلہ ہے۔ پہلے تو آتے جاتے چھیڑتی تھی۔ اب تو نوبت میسج تک آ چکی ہے۔ میں یہ بچے کا فون لایا ہوں۔ آپ چیک کر سکتی ہیں۔" انہوں نے موبائل ان کی جانب بڑھاتے ہوئے ڈرتے ڈرتے دیکھا۔

بات سن کر خاتون پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ مگر ان کے خدشے کے برخلاف نہ تو بھڑکیں اور نہ ہی انہیں ماں، بہن کے طعنے دیئے۔ چپ چاپ موبائل ہاتھ میں لے کر میسج پڑھنے شروع کیے۔ جوں جوں پڑھتی گئیں۔ ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہوتا گیا۔ مگر کمال ضبط سے انہوں نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا۔

"دیکھیے محترمہ! اگر معاملہ دو طرفہ ہوتا تو میں بچی کی شکایت کے بجائے اس کا رشتہ مانگنے آتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ پپو بے حد معصوم اور سیدھا بچہ ہے۔ فی الحال اس کی توجہ کا مرکز اس کی تعلیم ہے۔ بچے پر اعتماد کے باوجود میں نے اپنے طور پر بھی اس کا موبائل چیک کیا ہے۔ اس میں سے کچھ نہیں نکلا۔ میں یہ اس لیے بھی ساتھ لایا ہوں کہ اگر آپ چاہیں تو اس کا ڈیٹا نکلوا کر مزید تحقیق کر سکتی ہیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ احسن صاحب!" وہ موبائل سے سر اٹھائے بغیر شرمسار سے لہجے میں بولیں۔ "میں معذرت خواہ ہوں کہ میری بچی کی وجہ

سے آپ کو اور آپ کے بھانجے کو ذہنی اذیت برداشت کرنی پڑی۔"

بات کرتے ہوئے ان کا گلا رندھ گیا پھر وہ گھٹ گھٹ کر رونے لگیں۔ احسن صاحب تو بدحواس سے ہو گئے۔ ان کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ خاتون کو کیسے چپ کروائیں۔

"دیکھیں محترمہ! میں نے بتایا ہے کہ پپو ایک نہایت شریف بچہ ہے۔" بے ساختہ پھر وہی جملہ ان کے منہ سے نکلا۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس کی شرافت کی یہی دلیل کافی ہے کہ اس نے فائدہ اٹھانے کے بجائے آپ سے شکایت کی۔" وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

"احسن صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ مہ پارہ فقط پانچ سال کی تھی۔ جب میں بیوہ ہوئی۔ ساس سسر زندہ تھے۔ انہوں نے کفالت کی۔ مگر جب وہ وفات پا گئے تو آبائی گھر دیوروں نے بانٹ لیا اور مجھے حصے کے طور پر چند لاکھ تھما کر زبردستی رخصت کر دیا۔ میں ایک کرائے کے گھر میں منتقل ہو گئی اور ایک گارمنٹ فیکٹری میں ملازمت کر لی۔ مہ پارہ ان دنوں کالج جاتی تھی۔ بچی عمر تھی۔ آپ کو معلوم ہے۔ اس عمر میں بچے کتنی جلدی بگڑ جاتے ہیں۔ میں نے جو گھر کرائے پر لیا تھا، اس کے ایک پورشن میں ہم ماں بیٹی رہائش پذیر تھیں اور دوسرے میں مالک مکان۔

عورتوں والا گھر تھا۔ مرد کوئی تھا نہیں۔ اسی واسطے میں نے وہ گھر لیا تھا کہ کسی بھی مرد کی غیر موجودگی میں میری بچی زیادہ محفوظ رہے گی۔ مگر یہ میری غلطی تھی۔ عورت ہو یا مرد ماحول تو دونوں کے کردار سے بنتا ہے۔ مالک مکان عورتیں بہت بے باک اور آزاد خیال تھیں۔ میں سارا دن تو فیکٹری میں ہوتی تھی۔ مجھے زیادہ اندازہ نہ ہو سکا اور میری معصوم بچی پر ان کا رنگ چڑھتا گیا۔ بلاوجہ بننا سنورنا، بے ہودہ گانے سننا اور نامناسب لباس زیب تن کرنا۔ میں تو روزی روٹی کے چکر میں الجھی رہی۔ جب احساس ہوا تو پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ میں نے فوراً گھر بدل لیا۔ اب کوشش تو کر رہی ہوں۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ برائی کا رنگ چھٹتے چھٹتے بھی دیر لگتی ہے۔ میں ایک بار پھر آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔"

وہ ایک بار پھر اپنے آنسو پونچھنے لگیں اور وہ بڑے بھاری دل کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر آ گئے۔

☆☆☆

احسن صاحب کے جانے کے بعد، وہ غصے سے کھولتی ہوئی مہ پارہ کے کمرے میں گئیں مگر بستر خالی تھا۔

اوپر جاتی سیڑھیوں کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ تن فن کرتی چھت پر پہنچیں۔ سامنے چھوٹا سا ڈربہ نما کمرہ تھا۔ اندر مہ پارہ صاحبہ دروازے کی جانب پشت کیے کانوں میں ہینڈ فری ٹھونسے غالباً کسی گانے کی دھن پر تھرک رہی تھی۔

ان کا غصہ سوا نیزے پر جا پہنچا۔ پہلے بھی اس کی حرکتوں نے انہیں عاجز کر رکھا تھا۔ پیار سے ڈانٹ ڈپٹ کر ہر طرح سے سمجھا کر دیکھ لیا تھا مگر اب لگتا تھا کہ گھی ٹیڑھی انگلیوں سے ہی نکلتا تھا۔

انہوں نے چپل پاؤں سے اتاری اور دھنا دھن اس کی نازک کمر پر برسانی شروع کر دی۔

"کم بخت، بے حیا...... ڈوب مرو۔"

مہ پارہ اس ناگہانی آفت پر بری طرح سے اچھل پڑی۔ کرنٹ کھا کر جو مڑی تو سامنے ماں خطرناک تیوروں سے، ہاتھ میں چپل تھامے کھڑی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرا چھپایا جو کہ ہلکے پھلکے میک اپ سے مزین تھا۔

"اماں...... کیا ہوا ہے؟"

اس معصوم سوال پر وہ مزید بھڑک گئیں۔ رکھ کر دو چپلیں مزید جڑیں۔

"کم بخت ...... پوچھتی ہے کیا ہوا ہے۔ وہ سامنے والے پپو کا باپ آیا تھا تمہاری شکایت لے کر۔ ان کے بچے کو چھیڑتی ہو تم۔ شرم نہیں آتی اس قسم

کی شکایت آتی ہوگی بھلا کسی لڑکی کی۔ لوگ لڑکوں کی شکایت کرتے ہیں۔ اور تم......"

آگے ان کا سانس پھول گیا۔ مزید کچھ نہ کہہ سکیں۔ لمبے لمبے سانس بھرنے لگیں۔

"ہیں پپو نے میری شکایت کی۔" اس سے تو یہ بات ہضم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اتنی جرات ہے بھلا اس میں!"

"کتنا معصوم اور سیدھا سادہ سا دکھتا ہے۔"

"اب کیوں چپ ہے؟ بتا! کیوں چھیڑتی ہے تو ان کے بچے کو۔ دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے تیرے۔ تیرے پچھنوں کی وجہ سے تو محلہ بدلا ہے میں نے۔ اب یہاں بھی وہی چال چلن ہے تیرا۔ وہ تو شریف لوگ ہیں۔ باپ۔ بے چارا اسید ھا میرے پاس شکایت لے کر آیا۔ اگر محلے میں پنچایت کرتا تو ہم ماں بیٹی کو مالک مکان فوراً نکال دیتا۔ کم بخت میرے سفید بالوں کا ہی کچھ خیال کر لے۔"

ان کا غصہ ختم ہی نہیں ہو رہا تھا جبکہ مہ پارہ مجرم ہوتے ہوئے چپ سادھے کھڑی تھی۔ شکایت بالکل درست تھی۔ وہ بھلا اپنی صفائی میں کیا کہتی ٹوٹ ٹوٹ کر فقط ایک ہی جملہ اس کے منہ سے نکلا۔

اماں!

مجھے پپو بہت اچھا لگتا ہے۔" اس کے اس معصومانہ اعتراف پر وہ جہاں کی تہاں کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

☆☆☆

آج پھر بلا کی سردی تھی۔ پپو پڑھائی میں جتا ہوا تھا۔ ماموں جان دوپہر کے کھانے کے لیے گرما گرم سموسے اور جلیبیاں لے آئے۔

"مجھ سے نہیں ہوتی اتنی سردی میں ہانڈی روٹی۔" انہوں نے لفافے سامنے پڑے میز پر دھرے۔

"اف ماموں جان! روز ہی بازار سے کچھ نہ کچھ آ رہا ہے۔ اتنا خرچا ہو رہا ہے۔ ہمارا بجٹ آؤٹ ہو جائے گا۔" پپو فکرمندی سے بولا۔

"آپ مجھ سے کہتے، میں دلیہ یا کھچڑی بنا لیتا۔" پپو بے چارے کو فقط یہی دو ڈشز بنانی آتی تھیں۔

"ارے کچھ نہیں ہوتا۔ خرچے پانی کی فکر چھوڑو۔ تم بس کھاؤ۔ اتنے دن ہو گئے ہیں تمہاری خالہ نے بھی چکر نہیں لگایا ورنہ وہی دو تین سالن بنا کر فریج میں رکھ جاتیں۔"

وہ بھی اس کے ساتھ ہی پلنگ پر بیٹھ کر لفافے کھولنے لگے۔ دراصل ان کا مردوں والا گھر تھا۔ اڑوس پڑوس سے تو شاذ و نادر ہی کوئی سوغات آتی۔ سامنے شیخ صاحب رہتے تھے۔ اکثر وہ اپنی بیگم کے ہاتھ کا پکا کچھ نہ کچھ بھجواتے رہتے تھے۔ پھر وہ اپنے بیٹے کے پاس بیرون ملک سدھار گئے اور ان کا گھر مہ پارہ کی ماں نے کرائے پر لے لیا۔

اب جس طرح کی بدمزگی ہوئی تھی وہاں سے تو کچھ آنے کی امید نہیں تھی۔ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ جلیبی منہ میں رکھتے ہوئے بے اختیار اپنی مرحومہ بیوی یاد آ گئی۔ گھر میں ہمہ وقت انواع و اقسام کی میٹھی اشیاء بنا کر رکھتی تھی۔ گاجر کا حلوہ، سوجی کی کھیر، آلسی کی پنیاں، موتی چور کے لڈو، بیسن کی ٹکڑیاں، شاہی حلوہ وغیرہ۔

ہائے اللہ! عین جوانی میں ساتھ چھوڑ گئی۔ ان کا تو زندگی سے دل ہی اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ تو ان کی بڑی آپا داغ مفارقت دے گئیں اور ان کا میاں پانچ سالہ پپو کو ان کے سپرد کر کے خود دیار غیر سدھار گیا۔ یوں پپو کی خاطر انہوں نے خود کو سنبھالا۔ یہ ذمہ داری انہوں نے بخوبی تن تنہا نبھائی۔ مشورہ اور نصیحت کرنے والے بے شمار تھے۔

"بس بھائی صاحب! آج کل زمانہ خراب ہے۔ بچے کو ظالم دنیا سے بچا کر رکھنا۔" اب ان کی اپنی تو کوئی اولاد نہیں تھی۔ بچوں کی تربیت کا کوئی تجربہ وغیرہ نہیں تھا۔ ہر آئے گئے کی باتوں سے خوف زدہ ہو کر انہوں نے پپو کو کچھ زیادہ ہی سنبھال کر رکھا۔

وہ خود بھی فطری طور پر شرمیلا اور کم گو بچہ تھا۔

انہوں نے بھی دوستوں میں زیادہ گھلنے ملنے نہیں دیا۔ نتیجتاً وہ ذرا سیدھا سادا اور دبی ہوئی شخصیت کا مالک بن گیا۔

☆☆☆

پانی، بجلی اور گیس آئیں یا نہ آئیں مگر ان کا بل ضرور آتا ہے۔ اور آخری ڈیٹ ہمیشہ چن کر وہی رکھی جاتی ہے جب انسان نے دوسرے بھی بے شمار ضروری کام نپٹانے ہوتے ہیں۔

اس دن بھی گیس کے بل کی آخری تاریخ تھی۔ پپو تو امتحانات کی وجہ سے بہت مصروف تھا۔ وہ پہلے جا کر گھر کا سودا سلف لائے۔ پھر بل جمع کرانے بینک پہنچے۔ عورتوں اور مردوں کی الگ الگ قطاریں بنی تھیں۔ مردوں کی قطار عورتوں کی قطار کی نسبت چھوٹی تھی۔ وہ اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

پیچھے کھڑے شخص کی بات سننے کے لیے سر گھمایا تو عورتوں کی قطار کے، بالکل آخر میں ہاتھ میں بل تھامے مہ پارہ کی ماں نظر آئیں۔

اب جتنی دور وہ کھڑی تھیں۔ اس حساب سے تو ان کی باری شام تک ہی شاید آ پاتی اور پھر ہو سکتا ہے تب تک بینک کا وقت ہی ختم ہو جاتا۔ از راہ ہمدردی وہ پیچھے والے شخص کو اپنی جگہ رکھنے کا کہہ کر ان کے پاس پہنچے۔

"محترمہ! بل مجھے دے دیں۔ میں اپنے والے کے ساتھ آپ کا بھی جمع کروا دیتا ہوں۔" وہ اپنے دھیان میں کھڑی تھیں۔ ان کی آواز پر چونکیں۔ ان کے تھکے ہارے جسم و جان کو وہ آفر بھلی لگی۔ انہوں نے "شکریہ" کہہ کر انہیں بل تھما دیا۔ وہ بل لے کر واپس اپنی جگہ آ گئے اور وہ انہیں ممنون نظروں سے دیکھتی بینک سے باہر چلی گئیں۔

☆☆☆

آج بہت دن بعد سورج نے اپنا مکھڑا شریف دکھایا تھا۔ اس کی نرم گرم کرنیں حرارت بخش رہی تھیں۔ نیچے صحن میں تو دھوپ آتی نہیں تھی۔ پپو کا دل چاہا کہ کتاب اٹھا کر چھت پر چلا جائے۔ پھر مہ پارہ کا خیال آ گیا۔ اب جب سے ماموں اس کی شکایت کر کے آئے تھے۔ اسے زیادہ خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ کہیں وہ چھت پر جائے تو ماہ پارہ غصے سے اس کا سر ور نہ پھاڑ ڈالے۔ یوں وہ سکڑا سمٹا سا وہیں پڑھتا رہا۔

☆☆☆

بچے کی دیکھ بھال اور تربیت ماں باپ دونوں مل کر کرتے ہیں۔

سنگل پیرنٹ ہونا کتنا مشکل ہے اس کا اندازہ انہیں ماہ پارہ کی ماں کے معمولات دیکھ کر ہو رہا تھا۔ پہلے صبح سویرے بے چاری اپنی نوکری پر جاتیں۔ پھر شام میں گھر کا سودا سلف لاتیں۔ گھر کے نل میں پانی نہیں آتا تو کنستر وغیرہ بھر کر لاتیں۔

ایک آدھ بار تو انہوں نے، راستے میں ہی کنستر ان سے لے کر اپنی موٹر سائیکل پر لاد کر ان کے گھر کے دروازے تک پہنچا دیا۔ اسی طرح ایک بار قریبی مارکیٹ سے ٹماٹر پیاز وغیرہ غائب ہو گئے، وہ سبزی والے کے پاس پریشان سی کھڑی تھیں تو وہ سبزی مارکیٹ سے اپنے واسطے ٹماٹر، پیاز خرید کر لائے تو ایک تھیلا ان کے لیے بھی لیتے آئے۔ وہ اکثر تاسف سے سوچتے کہ غریب کی ایک ہی لڑکی تھی وہ بھی اتنی بے لگام اور سرکش۔ پھر وہ خدا کا شکر ادا کرتے کہ اس نے انہیں پپو جیسا فرماں بردار اور سلجھا ہوا بچہ دیا تھا۔ آج تک اڑوس پڑوس یا اسکول کالج سے اس کی کوئی شکایت نہیں آئی تھی۔

لوگوں کا کیا ہے۔ وہ تو کسی طرح خوش نہیں ہوتے۔ پہلے لوگ انہیں ہر وقت یہی باور کرواتے رہتے تھے کہ بچے کو زمانے سے بچا کر رکھنا چاہیے۔ اور جب انہوں نے اسے زمانے سے بچا کر رکھا تھا تو وہی لوگ اس کے سیدھے اور بھول پن کا مذاق اڑاتے تھے۔

☆☆☆

اگلے پیپر میں اکٹھی تین چھٹیاں تھیں۔ کپڑوں کا ڈھیر جمع تھا۔ پپو نے سوچا کہ واشنگ مشین لگالی

جائے۔ ماموں جان نے منع بھی کیا کہ دھوبی سے دھلوا لیتے ہیں۔ مگر پچھلی بار اس نے بڑی گڑبڑ کی تھی۔ تین نئی نکور شرٹ پپو کی اور دو پاجامے ماموں جان کے کسی اور کے کپڑوں کے ساتھ بدل دیئے تھے۔ پھر دھوتا بھی صاف نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے خود ہی دھونے شروع کیے۔

ماموں جان کچن میں آلو والے چاول پکا رہے تھے۔ اس نے کپڑے کھنگال لیے تو اب سکھانے کا مرحلہ دشوار تھا۔ الگنی تو چھت پر تھی۔ وہ جانا تو نہیں چاہتا تھا۔ مگر مجبوری تھی۔ اس نے کپڑوں سے بالٹی بھری اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر آیا۔

سامنے منڈیر سونی پڑی تھی۔ اسے یک گونہ اطمینان ہوا۔ اس نے کپڑے پھیلانے شروع کیے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ وہ پھر نیچے آیا۔ باقی کے کپڑے بھی بالٹی میں ڈالے اور پھر اوپر کا رخ کیا۔ اب کی بار وہ زیادہ پراعتماد تھا۔ یعنی کہ شکایت کارگر ثابت ہوئی تھی۔ وہ تسلی سے کپڑے پھیلاتا رہا۔ جب آخری پتلون ڈال رہا تھا تو اچانک پیچھے سے گنگنانے کی آواز آئی۔

''دل کا آنگن سونا ہے...... ہائے دل کا آنگن سونا ہے۔''

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی جرات نہ ہوئی۔ اس نے بالٹی اٹھائی اور تیزی سے سیڑھیوں کا رخ کیا۔ سریلی آواز نے آخری سیڑھی تک اس کا تعاقب کیا۔

''دل کا آنگن سونا ہے۔ دل کا آنگن سونا ہے۔''

☆☆☆

وہ گھر میں داخل ہوئے تو سامنے چارپائی پر پپو بیٹھا مزے سے پراٹھا کھا رہا تھا۔ کچن سے بھی ساگ پکنے کی خوشبو آ رہی تھی۔

''ماموں جان! خالہ آئی ہیں۔'' اس نے چہک کر بتایا۔

''واہ بھئی واہ!'' وہ بھی خوش ہوگئے۔

''وہ مولیوں والے پراٹھے بھی ہمراہ لائی تھیں اور ساگ کا پتیلا چولہے پر چڑھا کر خود اڑوس پڑوس میں گھومنے نکل گئی ہیں۔''

مہینوں بعد تو چکر لگتا تھا۔ میکے کا گھر تھا۔ آس پاس سب ہی گھر پرانے محلے داروں کے تھے۔ بھائی اور بھانجے کے ساتھ ساتھ ان کی خبر گیری بھی کرنا ضروری تھا۔

اب بھی وہ شام ڈھلے لوٹیں تو ماموں خفگی سے بولے۔

''کمال کرتی ہو آپا! اتنی دیر کر دی۔ میں تو ساگ میں چمچہ چلا چلا کر تھک گیا ہوں۔''

''اچھا! میں دیکھ لیتی ہوں۔'' انہوں نے سیدھا کچن کا رخ کیا۔ چہرے پر ازحد سنجیدگی تھی۔ تاثرات بھی کچھ عجیب سے تھے۔ شاید گھر میں ساس سے لڑ کر آئی تھیں۔ ماموں نے سوچا اور نماز کے لیے مسجد چلے گئے۔ پپو پڑھنے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

وہ لوٹے تو آپا ان کے کمرے میں بیڈ شیٹ تبدیل کر رہی تھیں۔

''ہاں تو آپا! اور سنائیں۔ کیا حال چال ہے۔''

''میرا حال تو ٹھیک ہے مگر تمہاری چال کچھ خراب لگتی ہے۔'' وہ تنک کر بولیں۔

''کیا ہوا آپا؟ خیریت......؟'' انہوں نے ان کے بدلے بدلے تیور دیکھ کر اچنبھے سے پوچھا۔

''نا، میں یہ پڑوس والوں سے کیسی باتیں سن کر آ رہی ہوں۔'' وہ سامنے پلنگ پر ٹک گئیں۔

''ہیں کیسی باتیں......؟'' وہ چونکے۔ یک دم ان کے ذہن میں خیال آیا کہ پپو اور مہ پارہ والے معاملے کی کچھ بھنک ان کے کانوں میں پڑ گئی ہوگی۔ جتنی مرضی احتیاط کرو۔ ان محلوں میں کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہ سکتی۔ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''وہ آپا! بچوں کی یہ عمر ہوتی ہی ایسی ہے جب وہ......''

''ارے بچوں کی بات کون کر رہا ہے؟'' انہوں نے ترنت ان کی بات کاٹی۔ ''میں تو تمہاری بات کر

رہی ہوں۔ لوگ کہہ رہے ہیں کہ تم سامنے والی بیوہ پر ڈورے ڈال رہے ہو۔ ارے میں کہتی ہوں شرم نہیں آتی۔ یہ عمر ہے تمہاری ایسی حرکتیں کرنے کی۔" وہ پھٹ پڑیں۔

"کیا...... میں......" وہ صدمے اور حیرت سے اچھل پڑے۔

"جب رفعت کا انتقال ہوا تو ہم نے تمہیں کتنا سمجھایا کہ اور شادی کرلو۔ تمہاری عمر بھی تھی۔ اچھے اچھے رشتے بھی آرہے تھے۔ مگر تمہیں تو مرحومہ کی محبت کا بخار چڑھا رہا اور اب جب عمر ڈھل رہی ہے تو یہ گل کھلانے لگے ہو۔"

"خدا کے واسطے چپ کر جائیں آپا! کیا اول فول بولے جا رہی ہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ تو بے چاری کی ایک دوبار مدد کیا کردی میں نے، کم بخت محلے والوں نے تو افسانے ہی بنا لیے۔ خدا کی قسم مجھے تو اس کا نام تک معلوم نہیں ہے۔" وہ روہانسے ہو رہے تھے۔

"عافیہ بیگم نام ہے اس کا۔" انہوں نے طنز سے کہا اور پھر پاؤں پٹختے ہوئے باہر نکل گئیں۔ وہ اپنا سر تھام کر رہ گئے۔

☆☆☆

وہ تھکی ہاری فیکٹری سے لوٹیں تو گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ انہیں سخت تپ چڑھی۔ انہوں نے ماہ پارہ کو سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ دروازہ، ہرگز کھلا نہ چھوڑے مگر وہ بدتمیز صحن کے عین بیچوں بیچ بیٹھی کینو کھا رہی تھی۔

فروٹ سے بھرا ایک اور شاپر پاس میز پر دھرا تھا۔ ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ "کون آیا تھا؟"

"اماں! چاچو اور چاچی آئے تھے۔ وہ لائے ہیں یہ پھل۔" ماہ پارہ نے پرجوش آواز میں اطلاع دی۔

"چاچو اور چچی۔" وہ حیران رہ گئیں۔

"ہاں! اتنی مشکل سے گھر ملا انہیں۔ شکوہ کر رہے تھے کہ تمہاری ماں نے تو کوئی رابطہ ہی نہیں رکھا۔ کسی دن پھر آئیں گے۔"

"کس واسطے رابطہ رکھتی۔ انہوں نے تو حصے کے نام پر کچھ رقم تھما کر گھر سے نکال باہر کیا تھا۔ آج یوں اچانک کیسے بیوہ بھاوج اور یتیم بھتیجی کی یاد آگئی۔" وہ سلگ اٹھیں۔

"اماں! ہر کسی سے بدگمان رہتی ہو۔ چچی تو اتنا پیار کر رہی تھیں کہ ماشاءاللہ سے اپنی ماہ پارہ کتنی خوب صورت نکلی ہے۔" وہ شرما کر بتا رہی تھی۔

"کاش کرتوت بھی خوب صورت ہوتے!" وہ بڑبڑاتے ہوئے اندر چلی گئیں۔

☆☆☆

چند روز بعد آپا پھر آن وارد ہوئیں۔

"معذرت چاہتی ہوں بھائی! اس دن میں کچھ زیادہ ہی بول گئی تھی۔ گھر جا کر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔" وہ سخت شرمندہ ہو رہی تھیں۔

"کوئی بات نہیں! تم عورتیں ہمیشہ سے اتنی جذباتی ہوتی ہو۔ اور کانوں کی کچی بھی۔" انہوں نے بھی فراخ دلی سے معذرت قبول کرلی۔

"مگر بھائی! ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو!" وہ ایک لمحے کو رکیں اور پھر کچھ جھجک کر کہنے لگیں۔

"دوسری شادی میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ اس گھر کو کسی عورت کی اشد ضرورت ہے۔"

"ہاں تو میں نے کب کہا ہے کہ گھر کو عورت کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ماشاءاللہ سے اپنا پپو کسی نوکری پر کھڑا ہوتا ہے تو اس کی شادی کردیں گے۔" انہوں نے چٹکیوں میں معاملہ نمٹایا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے۔ بہو سے کوئی امید نہ رکھنا۔ آج کل تو بہوویں اپنے سگے سسر کی خدمت نہیں کرتیں تم تو پھر ماموں سسر ہوگے۔

میرا خیال ہے کہ تمہیں اس سے پہلے اپنے بارے میں بھی کوئی فیصلہ کر لینا چاہیے۔ اگر تم کہو تو میں بات وات چلا کر دیکھوں؟"

انہوں نے رازداری سے ، ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دبی زبان میں کہا تو ان کے پتنگے لگ گئے۔
"آپا! آپ اپنے سنہری خیالات اپنے پاس رکھیں اور مجھے بخش دیں۔" انہوں نے ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

☆☆☆

ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھیں کہ دیور اور دیورانی کو یوں اچانک، ان ماں بیٹی کی یاد کیسے آ گئی کہ اس کا عقدہ بھی چند روز بعد کھل گیا۔ وہ جس فیکٹری میں نوکری کرتی تھیں وہاں ان کی ایک ساتھی عورت کی بہن ان کے سسرال کے محلے میں رہائش پذیر تھی۔ اسی نے بتایا تھا کہ آج کل وہ لوگ اپنا ایک آبائی پلاٹ، بیچنے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ دراصل ان کا وہ پلاٹ بالکل بے کار اور بیابان سی جگہ پر تھا۔ پہلے تو اس کی کوئی مارکیٹ ویلیو ہی نہ تھی۔ پھر قسمت کی بات وہاں تک پکی سڑک بن گئی۔ گیس کی پائپ لائن بھی بچھ گئی۔ بجلی کے لیے کھمبے وغیرہ بھی نصب ہو رہے تھے۔ یوں راتوں رات پلاٹ کے دام بھی چڑھ گئے تھے۔ وہ ان کے مرحوم کے سسر کا نام تھا۔ اب اس میں لازمی مہ پارہ کا حصہ بھی بنتا تھا۔ شاید اسی لالچ میں تعلقات بحال کرنا چاہ رہے تھے۔ اب مکان کے بعد وہ بھی ہتھیانے کے چکروں میں تھے۔

اب ان کی تو اتنی حیثیت نہیں تھی کہ کوئی وکیل وغیرہ کھڑا کرتیں۔ اس لیے انہوں نے معاملہ اللہ کے سپرد کیا اور اگلی بار جب وہ ملنے آئے تو انہوں نے بھی روکھے پن کا مظاہرہ کیا۔ دیور تو مہ پارہ کو ساتھ لے جانے کی ضد کر رہے تھے اور مہ پارہ نیم رضامند بھی تھی مگر انہوں نے ٹکا سا توڑ جواب دے دیا۔

☆☆☆

جنوری رخصت ہو رہا تھا۔ سردی کی شدت کچھ کم تو ہوئی تھی مگر ابھی بھی دھوپ خاصی دیر سے نکلتی تھی۔ جو جسم و جان کو بڑا سکون بخشتی تھی۔ پپو کے امتحانات ختم ہو چکے تھے۔ تھوڑی بے فکری تھی۔ وہ دیر سے سو کر اٹھا تھا۔ ماموں بھی اخبار پڑھ رہے تھے۔
"پپو یار! آج تو میں نے ناشتہ نہیں بنایا۔ کچھ بازار سے لے آؤ۔"
"نہیں ماموں! میں فارغ ہوں۔ کچھ بنا لیتا ہوں۔" اس نے آفر کی۔ ویسے بھی وہ ماموں کی نسبت کفایت شعار واقع ہوا تھا۔
"اچھا تو پھر چھت پر ہی لے آؤ۔ وہیں دھوپ میں بیٹھ کر کھائیں گے۔"
وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھے۔ اس نے ہری مرچ اور پیاز والا آملیٹ بنایا۔ توس سینکے، چائے بنائی۔ سلیقے سے ٹرے سیٹ کی اور اوپر چلا آیا۔ اڑتی پڑتی نظر سامنے ڈالی۔ چھت ویران پڑی تھی۔ اس نے اطمینان کا سانس بھرا اور ماموں کے سامنے ٹرے دھری۔
"واہ بھئی! بڑے مزے کا آملیٹ ہے۔ بس مرچیں تیز ہیں۔" انہوں نے چٹخارہ بھرا۔
"ماموں جان! اتنے دن سے خالہ نے چکر نہیں لگایا۔ وہ آئیں تو ان کے ہاتھ سے بنے پراٹھے کھانے کو ملتے۔"
"اچھا ہوا نہیں آئیں۔ اس کا نہ آنا ہی بہتر ہے۔" وہ پچھلی بات یاد کر کے سخت بدمزہ ہوتے ہوئے بولے۔ پپو بے چارہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیران رہ گیا۔ کہاں تو وہ خالہ کو فون کر کر کے بلاتے تھے۔
اتنے میں نیچے سے فون بجنے کی آواز آئی۔
"لو! میں تو اپنا فون بھی نہیں لایا۔ شاہ جی یاد کر رہے ہوں گے۔"
"ماموں! میں جا کر لے آؤں۔" اس نے جھٹ آفر کی۔
"نہیں بیٹا! تم تسلی سے ناشتہ کرو۔ میں تو کر ہی چکا ہوں۔ پھر برتن وغیرہ سمیٹ کر نیچے آ جانا۔" وہ اپنا چشمہ اور اخبار اٹھا کر سیڑھیاں اتر گئے۔
وہ گھونٹ گھونٹ چائے پی رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر سامنے نظر پڑی تو منڈیر پر مہ پارہ کا حسین مکھڑا سجا تھا۔ چہرے پر شرارتی مسکراہٹ تھی۔ نظریں چار

ہوئیں تو جھٹ دایاں ہاتھ سلام کے انداز میں ماتھے پر رکھ لیا۔

پپو بے چارا شرم سے کٹ کر رہ گیا۔ چائے گلے میں پھنس سی گئی۔ اتنے میں سیڑھیوں سے کسی اور کا سر نمودار ہوا۔ وہ مہ پارہ کی ماں تھیں۔ وہ ماں کی آمد سے بے خبر، مسلسل ہاتھ ماتھے پر سجائے کھڑی تھی۔ وہ آگ بگولہ اس کے سر پر پہنچیں اور چوٹی سے پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی نیچے لے گئیں۔ خوف و ہراس سے بت بنے پپو نے بامشکل خود کو سنبھالا۔ جیسے تیسے برتن سمیٹے اور دو دو سیڑھیاں پھلانگتا نیچے اتر گیا۔

☆☆☆

اس دن انہوں نے پھر مہ پارہ کی خوب ٹھکائی لگائی۔ مگر وہ ڈھیٹ خوشی خوشی مار کھاتی رہی۔ ذرا جو شرمندہ ہوئی ہو۔ وہ سمجھ گئیں کہ اب اسے مزید سنبھالنا ان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ اسے تو کسی مرد کی سرپرستی چاہیے۔ اور پھر رات کو ہی انہوں نے ایک مشکل فیصلہ کر لیا۔ اسے اس کے چچا کے پاس بھجوانے کا۔

"اپنا سامان پیک کر لو۔ میں نے تمہارے چچا کو فون کر دیا ہے۔ کل وہ تمہیں لینے آئیں گے۔"

"نہیں اماں! میں نہیں جاؤں گی۔" مہ پارہ جو پہلے جانے پر رضامند تھی۔ اب بدک گئی۔ "خود ہی تو کہہ رہی تھیں کہ لالچ میں آ کر لے جا رہے ہیں۔"

"تو کیا ہوا لالچ میں ہی سہی ذمہ داری تو اٹھا رہے ہیں۔ آج کل کے زمانے میں تو لوگ لالچ میں بھی ذمہ داری نہیں اٹھاتے۔" وہ یک دم سنگدل بن گئیں۔

"پھر آپ بھی میرے ساتھ چلو۔" وہ ٹھنکی۔

"نہیں میرا رشتہ تو ان کے ساتھ تمہارے باپ کے مرنے کے بعد ہی ختم ہو گیا تھا۔ وہ تمہارے سگے چچا ہیں۔ خیال رکھیں گے۔ میں یہاں ہی ٹھیک ہوں۔"

چلتے سمے انہوں نے خود ہی اسے بڑھ کر گلے لگایا تو وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"ماں! میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

"یہ اولاد بھی کیا چیز ہے۔ اپنی غلطیاں دکھائی نہیں دیتیں الٹا بے قصور ماں باپ کو ہی الزام دیتے ہیں۔"

وہ آنسو پونچھتی دروازہ بند کر کے چلی آئیں۔

☆☆☆

چھت بہت گندی ہو رہی تھی۔ کتنے دن سے صفائی نہیں ہوئی تھی۔ پپو چونکہ آج کل فارغ تھا۔ اس لیے ماموں جان نے کہا کہ۔ "آج دھوپ بھی تیز ہے جا کر جھاڑو لگا دو۔"

انکار تو اس کی سرشت میں نہ تھا۔ جھاڑو پکڑ کر سیڑھیاں چڑھ گیا۔ پورے تین گھنٹے صفائی کرتا رہا۔ پائپ لگا کر فرش بھی دھو ڈالا۔ آس پاس گہری خاموشی طاری رہی۔ اس نے دزدیدہ نظروں سے ایک آدھ بار سامنے بھی دیکھ لیا۔ نہ تو کوئی دھانی آنچل لہرایا۔ اور نہ ہی کوئی مدھر گنگناہٹ سنائی دی۔ ویرانی سی ویرانی تھی۔

وہ بھی اتنی دیر تک چھت کے بغیر رہتی نہ تھی۔ وہ دل ہی دل میں کچھ حیران تھا اور تھوڑا پشیمان بھی۔ اسے خود بھی اپنی کیفیت سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پہلے اسے اس کے ہونے سے مسئلہ تھا اور اب نہ ہونے سے تھا۔ اسی گم صم سی حالت میں وہ نیچے اتر آیا۔

چند دن مزید سرکے تو اس نے خود ماموں سے کہا۔ "ماموں جان! میں اوپر والے کمرے کی صفائی کر لوں۔ بھاری بستر بھی پیٹی میں رکھ دیتا ہوں۔"

"ہیں ابھی اس دن تو صفائی کی تھی۔"

"ماموں! کمرے کی تو نہیں کی تھی۔" وہ اوپر آیا۔ پہلے پیٹی سے نکال کر لحاف وغیرہ دھوپ میں ڈالے۔ پھر کمرہ صاف کرنے لگا۔ اتنا کاٹھ کباڑ جمع ہو رہا تھا۔ وہ بھی باہر نکالا۔ اچھا خاصا وقت بیت گیا۔ آج بھی ہنوز خاموشی رہی۔ کہیں وہ لوگ گھر تو چھوڑ کر نہیں چلے گئے۔

نہیں ابھی کل ہی تو اس نے ماہ پارہ کی ماں کو دروازے کا تالا کھولتے دیکھا تھا۔ صبح بھی دودھ والا

دروازہ بجا رہا تھا۔ جلد ہی اس نے اپنے خیال کی نفی کر دی۔ وہ اداس اداس سا عم میں جتا رہا۔ کانوں میں دور کہیں گانے کے دو بول رس گھولتے رہے۔

”دل کا آنگن سونا ہے...... دل کا آنگن سونا ہے۔“

☆☆☆

اس بار آپا آئیں اور اپنے ساتھ ڈھیر ساری سوغات بھی لائیں۔ پپو کھل اٹھا جبکہ ماموں جان کا رویہ نارمل رہا۔

”خالہ! اتنا کچھ بنا کر لائیں۔“ پپو اشتیاق سے ڈبے کھول کھول کر دیکھ رہا تھا۔

”اس میں کیا ہے......؟“ ایک ڈبہ الگ سے رکھا تھا۔ اس نے وہ بھی کھولنا چاہا۔

”یہ پڑوس کے لیے تحفہ لائی ہوں۔ تمہارے کام کا نہیں ہے۔“ انہوں نے ڈبہ اٹھا کر ایک سائیڈ پر رکھ لیا۔

☆☆☆

آپا کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا، جن کے سر پر جب کسی کام کا بھوت سوار ہو جائے تو پھر جب تک وہ انجام نہ دے لیں نچلے نہیں بیٹھتے، یوں تو جب ان کی بھاوج فوت ہوئیں انہوں نے اسی وقت بھائی کی شادی کروانے کی بے حد کوشش کی۔ مگر ایک تو محبوب بیوی کے غم سے نڈھال، بھائی ہی پتھے پر ہاتھ دھرنے نہیں دیتے تھے۔

پھر جب انہوں نے پپو کو گود لیا تو شادی مزید مشکل ہو گئی۔ لڑکی والوں کو تو پپو کے وجود پر ہی سخت اعتراض تھا۔ سگی اولاد ہوتی تو شاید کوئی برداشت کر لیتا۔ پھر وہ بھی گھرداری کے جھنجھٹ میں پڑ کر خاموش ہو گئیں۔ ہاں البتہ وہ بھائی اور بھانجے کی خبر گیری سے غافل نہیں رہیں۔

مگر اب انہیں شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس گھر کو کسی پختہ عمر کی عورت کی ضرورت ہے۔ ان کی ہڈیوں میں بھی اتنا دم خم نہیں رہا تھا کہ بار بار کھانے پکا پکا کر لے جائیں۔ پھر ان کی ساس بھی احساس دلاتی رہتی تھیں کہ پپو سے پہلے بھائی کا بیاہ رچانا ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے کئی رشتہ کروانے والیوں کو بھی بھاری رقم تھما رکھی تھی۔

پچھلی بار، جو وہ بھائی کا سامنے والی عورت سے افسانہ سن کر گئی تھیں تو سچی بات ہے کہ انہیں خود بھی وہ محض افسانہ ہی لگا تھا، مگر کوشش کر لینے میں کیا حرج تھا۔ اسی مقصد کے واسطے انہوں نے گاجر کے حلوے کا ڈبہ تھاما، چادر درست کی اور سامنے کے گھر میں گھس گئیں۔

کرائے کا چھوٹا سا گھر تھا۔ نفاست اور سلیقہ کونے کونے سے ٹپک رہا تھا۔

عورت بھی بہت ملنسار تھی۔ بڑی محبت سے ملی۔ وہ شدید متاثر ہو کر لوٹیں۔ اب بھائی کو بھی کسی نہ کسی طرح راہ راست پر لانا تھا۔ فی الحال تو انہوں نے گھر آ کر صرف اتنا بتایا۔

”آج میں سامنے والوں کے ہاں گئی تھی۔ نہایت پرخلوص اور ملنسار عورت ہے۔ ایک ہی بیٹی ہے ماہ پارہ۔ چچا نے اس کی کفالت کا ذمہ لے لیا ہے۔ اب وہی اس کی شادی کریں گے۔ اسی لیے ان ہی کے ساتھ روانہ کر دی ہے۔“

ان کے یہ جملے ماموں تو سر جھکا کر سنتے رہے کوئی ردعمل نہ دیا، جبکہ پاس بیٹھے پپو کی دنیا زیر و زبر ہو گئی۔

☆☆☆

رات کا نجانے کونسا پہر تھا۔ باہر کھٹکا سا ہوا۔ وہ تو پہلے ہی سوئی جاگی کیفیت میں تھیں۔ جب سے ماہ پارہ گئی تھی نیند بھی روٹھ سی گئی تھی۔

اس نے بھی پلٹ کر نہیں پوچھا تھا۔ انہوں نے خود ہی اس کے چچا کے موبائل پر فون کیا تھا تو اس نے ڈھنگ سے بات ہی نہ کی تھی۔ ماں سے اتنی متنفر ہو گئی تھی۔

انہوں نے کروٹ بدل کر دوبارہ سونا چاہا کہ آواز پھر آئی۔ شاید بلی وغیرہ کودی ہے۔ انہوں نے خود کو تسلی دی مگر چند منٹ بعد، باقاعدہ برآمدے میں

قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر کسی نے ان کے کمرے کا دروازہ کھولنا چاہا۔ چٹخنی کمزور تھی۔ دو کیل اکھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے سوچا تھا کہ مرمت کروائیں گی۔ مگر پھر بھول گئیں۔ اب وہ بستر پر بیٹھی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھل گیا اور دو ہٹے کٹے بدمعاش منہ پر نقاب چڑھائے اندر گھس آئے۔ ایک نے بڑھ کر بلب جلا دیا۔ ”نکالو رقم کہاں ہے۔“ ایک غرایا۔

”مجھ بوڑھی کے پاس کچھ نہیں ہے۔“ وہ تھوک نگلتے ہوئے بامشکل بولیں۔

”اب اتنی بوڑھی بھی نہیں ہو تم......“ ایک ان کی طرف خباثت سے دیکھتے ہوئے ذومعنی انداز میں بولا تو ان کی روح فنا ہو گئی۔

انہوں نے جلدی سے، اپنے میاں کی واحد نشانی کانوں میں پڑے جھمکے اتار کر ان کے سامنے پھینکے۔ وہ پاس پڑا ان کا موبائل اور پرس میں موجود رقم نکال کر چلتے بنے اور وہ عزت بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

☆☆☆

دو دن وہ فیکٹری بھی نہ جا سکیں۔ خوف و ہراس سے بخار چڑھ گیا۔ وہ تو ہمہ وقت مہ پارہ کے لیے فکر مند رہتی تھیں۔ اب انہیں احساس ہوا کہ یہ معاشرہ، نوجوان، ادھیڑ عمر، کم عمر اور بوڑھی ہر قسم کی عورت کے لیے غیر محفوظ ہو چکا ہے۔

اس سے اگلی شام سامنے والے احسن صاحب کی آپا ایک بار پھر چلی آئیں۔ انہیں دیکھ کر ان کو بے حد ڈھارس ہوئی۔ مختصراً واقعہ انہیں بھی بتایا۔ وہ افسوس کرتی رہیں۔ اور ساتھ ساتھ دبے دبے لفظوں میں اپنے بھائی کی شرافت و نجابت، خلوص اور وقار کے گن گاتی رہیں۔ اس سے پہلے بھی آئی تھیں تو اپنے خاندانی رکھ رکھاؤ اور ملنساری کا ہی تذکرہ کرتی رہی تھیں۔

وہ کوئی نادان بچی تو نہ تھیں جو اندر خانے ان کا عندیہ نہ جان پاتیں۔ پہلے تو انہوں نے ان کی باتوں کو کوئی اہمیت نہ دی۔ مگر اب کے وہ گئیں تو ان کے لیے سوچوں کے کئی در وا کر گئیں۔

عمر کے اس حصے میں وہ کتنی تہی دامن تھیں۔ ایک اولاد تھی وہ بھی باغی۔ اب باقی عمر کس کے سہارے کٹنی تھی۔ انہیں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

☆☆☆

ایک سال بعد......

چند ماہ پہلے ہی، عافیہ بیگم احسن صاحب سے نکاح کے مقدس بندھن میں بندھ کر ان کے ہاں منتقل ہو چکی تھیں۔ یہ معرکہ جیسے آپا نے سرانجام دیا تھا ان کی مضبوط شخصیت اور مصمم ارادے کا ہی کمال تھا۔ بہر حال جو بھی تھا عافیہ بیگم، اپنے نام کی طرح گھر کے لیے واقعی عافیت ثابت ہوئی تھیں۔ انہوں نے اپنی نوکری کو خیر آباد کہہ دیا تھا اور خود کو کلی طور پر گھر کے لیے وقف کر دیا تھا۔

احسن صاحب سرشار اور مطمئن تھے۔ پو بھی خوش تھا مگر جب کبھی ماہ پارہ کی یاد دل میں چٹکی لیتی تو بے اختیار ڈھیر سارا ملال گھیر لیتا۔ خود پر افسوس ہوتا۔ وہ کیوں بڑھ بڑھ کر بے چاری کی شکایتیں لگاتا تھا۔ بے ضرر سی شرارتیں ہی تو کرتی تھی۔ اس کا کیا بگڑ جاتا۔ اب نجانے کہاں تھی۔

اگرچہ احسن صاحب نے عافیہ بیگم پر مہ پارہ سے ملنے جلنے پر کوئی پابندی تو نہیں لگائی تھی، مگر وہ خود ہی ان سے متنفر تھی اب تو ان کی شادی کے بعد شاید اور زیادہ ہو گئی تھی۔

☆☆☆

پو کو نوکری ملی تو وہ آتے ہوئے مٹھائی کا اتنا بڑا ڈبہ لیتا آیا۔ ماموں ممانی کا منہ میٹھا کروانے کے بعد اپنے ایک دوست کو فون کیا۔

ارادہ تھا کہ اس کے واسطے بھی لے جائے۔ کہ اس نے بتایا کہ اس کا کم سن بھتیجا جھلس گیا ہے۔ ملازمہ کی غلطی سے بچے نے گرم دودھ خود پر گرا لیا تھا۔ اور اب وہ ہسپتال کے برن یونٹ میں داخل تھا۔

دوست کا بھائی چونکہ بیرون ملک مقیم تھا، اس لیے وہی اس کے بچے کے پاس ہسپتال میں موجود تھا۔

حساس دل پپو بھی فوراً پہنچا۔ بچے کی حالت تسلی بخش تھی۔ صرف دایاں بازو جلا تھا۔ شام تک چھٹی متوقع تھی۔ وہاں وارڈ میں جھلسے ہوئے دو تین مریض اور موجود تھے۔ بچے کے بائیں جانب، بیڈ پر منہ سر لپیٹے ایک نسوانی وجود بھی موجود تھا، جس کی شاید ٹانگیں جھلس گئی تھیں۔ نرس بچے کو انجکشن لگانے آئی تو اس نے بھی آواز دی۔

"سسٹر! مجھے بھی کوئی پین کلر دے دو۔ سخت جلن ہو رہی ہے۔"

جانی پہچانی آواز پر پپو کرنٹ کھا کر مڑا۔ اب کے لڑکی کا آدھا چہرہ کھلا تھا۔ وہ مہ پارہ تھی۔ وہ ششدر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

مہ پارہ کو چچا چچی نے بہت لاڈ پیار سے رکھا تھا۔ چچی کی کوئی بیٹی تو نہ تھی۔ وہ بھی بہت محبت جتاتی تھیں۔ گھر میں ہر قسم کی سہولت تھی۔ اتنی بڑی ایل ای ڈی، انواع واقسام کے کھانے، کھلا خرچ۔

چچا چچی ویسے بھی بچوں کو روکنے ٹوکنے کے خلاف تھے۔ ان کے دونوں لڑکے بھی اپنی مرضی کے مالک تھے۔

ماہ پارہ نے تو تنگی ترشی ہی دیکھی تھی۔ ماں روزی روٹی کے چکر میں بامشکل اس کی ضروریات ہی پورا کر پاتی تھی۔ عیاشی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس، پیار محبت جتانے کا بھی وقت اور ہمت دونوں ہی نہیں ہوتے تھے۔

اب چچا چچی کے ہاں آ کر اسے احساس ہو رہا تھا کہ اماں نے اسے، ان رشتوں سے دور رکھ کر اس کے ساتھ سخت زیادتی کی تھی۔

اس سے وہ بھول گئی کہ انہوں نے خود ان ماں بیٹی کو دھتکارا تھا۔ اب بھی چچا پلاٹ مہنگے سے مہنگے داموں بیچنے کے لیے تگ ودو کر رہے تھے۔

اس نے تو سارا اختیار انہیں دے رکھا تھا۔ وہ بھی کہہ رہے تھے کہ اس کے حصے کی رقم اس کے نام سے بینک میں جمع کروا دیں گے۔

زیادہ تفصیلات سے اسے دلچسپی بھی نہ تھی۔ دن اچھے خاصے عیش وعشرت میں گزر رہے تھے۔ اب تو کوئی اونچی آواز میں گانے سننے پر ڈانٹتا بھی نہ تھا۔

چچی نے اسے بھی ٹچ موبائل لے دیا تھا۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ مگر اس شتر بے مہار قسم کے ماحول کا شاخسانہ یہ نکلا کہ ان کا چھوٹا بیٹا، اپنی ایک سینئر سے جو عمر میں بھی شاید دو چار سال اس سے بڑی تھی کورٹ میرج کر کے گھر لے آیا۔

چچا، چچی روئے پیٹے تو بہت، مگر آخر کار اس شادی کو قبول کرتے ہی بنی۔ آنے والی کو سب سے پہلے مسئلہ گھر میں چلتی پھرتی، خوب صورت قیامت مہ پارہ سے ہوا جو اتنے استحقاق سے اس کے ساس سسر کے گھر میں رہ رہی تھی۔

آتے ہی اس نے ماہ پارہ کے ساتھ بیر سا باندھ لیا۔ چچی کو وہ زبردستی کی بہو ہضم نہیں ہو رہی تھی مگر بیٹے کے ہاتھوں مجبور تھیں۔ یوں اچھے خاصے خوش گوار ماحول میں کھینچا تانی سی رہنے لگی۔

ایک دن چچی گھر پر نہیں تھی۔ نئی دلہن نے نہانا تھا۔ بڑا پتیلا پانی کام والی نے ابلنے چولہے پر چڑھا دیا تھا۔ وہ تو کام ختم کر کے اپنے گھر چلی گئی۔

دلہن نے اسے حکم دیا کہ گرم پانی واش روم کے ٹب میں ڈال دے۔ مہ پارہ نے جب پتیلا ٹب میں الٹنا چاہا تو ایک کنارہ ہاتھ سے چھوٹ گیا اور گرم پانی اس کی ٹانگوں کے کچھ حصے اور دونوں پاؤں کو جھلسا گیا۔ دل خراش چیخوں سے سارا گھر گونج اٹھا۔ اب وہ ایک ہفتے سے برن یونٹ میں پڑی تھی۔

چچا چچی نے دیکھ بھال تو کی مگر چچی کو خود صحت کے بہت سے مسئلے تھے۔ وہ ہسپتال میں تو مسلسل اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھیں۔ یوں کئی راتیں اس نے اکیلے جلن اور درد سے تڑپتے گزاریں۔ ماں بے طرح سے یاد آئی۔ خواہ ان کو جتنا مرضی مسئلہ ہوتا وہ اسے یوں تنہا بھی نہ چھوڑتیں۔

☆☆☆

گھر آ کر پپو نے من و عن تمام واقعہ ماموں کے گوش گزار کیا۔

"نافرمان اولاد کا یہی حشر ہوتا ہے۔"

انہوں نے کہہ تو دیا مگر باضمیر انسان تھے۔ بچی سے لاتعلق تو نہیں رہ سکتے تھے۔ اسی وقت عافیہ بیگم کے ہمراہ ہسپتال پہنچے۔ دونوں ماں بیٹی یوں ٹوٹ کر روئیں کہ انہیں دونوں کو چپ کروانا مشکل ہو گیا۔

ماہ پارہ کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ ماں سے بڑی کوئی جنت نہیں ہوتی اور گھر سے اچھی پناہ گاہ کوئی نہیں ہوتی اور عافیہ بیگم بھی سمجھ گئی تھیں کہ بگڑی اولاد کو پیار، محبت اور صبر و برداشت سے سدھارا جاتا ہے۔ اپنی جان چھڑانے کے لیے دوسروں کے حوالے نہیں کیا جاتا۔ اب وہ احسن صاحب کی جانب دیکھنے لگیں۔

"اس کو گھر لے چلتے ہیں۔" احسن صاحب نے فوراً فیصلہ کیا۔

ماہ پارہ کو گھر آئے کئی روز ہو چکے تھے۔ ٹانگوں اور پاؤں کے زخم ابھی مندمل نہیں ہوئے تھے۔ وہ بستر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ عافیہ بیگم جی جان سے اس کی دیکھ بھال کر رہی تھیں۔

ماموں کا رویہ بھی اس کے ساتھ مشفقانہ تھا مگر اس کو گہری چپ لگی تھی۔ پپو نے ابھی تک اس کے منہ سے ایک لفظ تک نہ سنا تھا۔ پہلے وہ سامنے والے گھر میں رہتی تھی تو اسے، اپنے گھر میں ہوتے ہوئے اس کی موجودگی کا احساس رہتا تھا۔ کبھی اس کا آنچل چھت پر لہراتا۔ کبھی وہ بیٹھک کی کھڑکی سے جھانکتی۔ کبھی اس کے گنگنانے کی آواز سنائی دیتی۔

اب وہ اس کے گھر کے ایک کمرے میں موجود تھی تو لگتا تھا کہ کہیں نہیں ہے۔ اسے اس کی چپ سے خوف آتا تھا۔ اب تو اس کے زخم بھی ٹھیک ہو رہے تھے مگر ابھی تک اس نے چلنا پھرنا شروع نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں یہ جھجک تھی، ملال تھا یا پھر ندامت کا کوئی احساس۔ وہ شاید خود بھی نہیں جانتی تھی۔

☆☆☆

پپو نے آفس جانا تھا۔ اس نے الماری کھولی تو ساری شرٹس استری شدہ رکھی تھیں مگر پتلون ایک بھی نہیں تھی۔ عافیہ بیگم اس کے کپڑوں وغیرہ کا بہت دھیان رکھتی تھیں۔ آج کل ماہ پارہ کی وجہ سے مصروف رہتی تھیں، اس لیے شاید پتلون استری کرنا بھول گئی تھیں۔ پپو نے تو انہیں کئی بار اپنا کام کرنے سے منع کیا تھا مگر وہ یہ سب اسے، اپنا بیٹا سمجھتے ہوئے محبت سے کرتی تھیں۔ اس نے براؤن پتلون نکالی اور استری کرنے لگا۔ دل اداس اداس سا تھا۔ بے اختیار لب گنگنانے لگے۔

"دل کا آنگن سونا ہے دل کا آنگن سونا ہے"

اس کی بوجھل سی آواز سارے میں پھیلی یاسیت کی کیفیت کو مزید بڑھانے لگی۔ اچانک اس نے آہٹ پر مڑ کر دیکھا۔

دروازے پر مہ پارہ ساکت سی کھڑی تھی۔ اتنی خاموش اور گم صم جیسے کوئی بے جان مورت ہو۔ اس سے نظریں چار ہوئیں تو اس کی کالی گھور آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ پھر وہ پانی چھلکا نہیں بلکہ اندر ہی کہیں ٹھہر گیا۔

پپو نے اس کی جانب دیکھا اور اس کے دیکھنے میں نجانے کیا تھا کہ ماہ پارہ کے لبوں پر، ذرا سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پپو کو وہ منظر بہت حسین لگا روئی آنکھیں اور ہنستے لب، وہ سحر زدہ سا دیکھے گیا۔ یہاں تک کہ گرم استری کو بھول گیا۔ اچانک اس کی انگلی گرم استری کو چھوئی تو اس کی چیخ نکل گئی۔ جلدی سے استری اٹھائی تو پتلون میں اتنا بڑا سوراخ ہو چکا تھا۔ اس نے سوراخ اٹھا کر منہ کے سامنے کیا سامنے پھر ماہ پارہ کا ہی حسین مکھڑا دکھائی دیا۔ وہ بے اختیار جھینپ گیا اور ماہ پارہ کی ذرا سی مسکراہٹ مدھر ہنسی میں ڈھل گئی۔ وہ بھی ہنسنے لگا۔ دونوں کی ہنسی کی جلترنگ سارے میں پھیل گئی۔ نئے سال کی نرم گرم کرنوں نے بھی جان لیا کہ اب، ان دونوں کے دلوں کا آنگن بھی زیادہ دیر تک سونا رہنے والا نہیں تھا۔

☆☆

عمارہ امداد

پسِ آئینہ

''خالہ برکتے کی بہو نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔'' یہ آج کی تازہ ترین خبر تھی جو اس گلی میں کسی جیٹ طیارے کی سی رفتار سے تقریباً ہر گھر میں نشر ہو چکی تھی۔

اس گلی کی اکثریت نچلے متوسط طبقے پر مشتمل تھی۔ تمام گھروں کا آپس میں بہت میل جول تھا۔ کسی بھی گھر کی چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی بات بھی لمحوں میں سب تک پہنچتی تھی اور خیر یہ تو خبر بھی بہت بڑی اور حیران کن تھی۔ جس نے بھی سنا، حیران رہ گیا۔

''شکل سے اتنی معصوم نظر آنے والی، بمشکل انیس، بیس سالہ بانو اتنی جرأت بھی کر سکتی ہے۔'' خالہ صفیہ نے تو باقاعدہ انگلیاں دانتوں تلے داب لیں۔

''صاف خودکشی کی کوشش کی گئی ہے۔ اندر ہی اندر ڈپریشن ہوگا جو کسی کو پتا ہی نہیں چلا ہوگا۔''

یہ ثریا خالہ کی بہو تھی، جو ثریا کے سارے گھر میں سب سے پڑھی لکھی پوری بارہ جماعتیں پاس تھی اور اس پر مستزاد کہ اس نے ایف۔اے میں سائیکالوجی کو بطور اختیاری مضمون پڑھا تھا۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو کسی سائیکالوجسٹ سے کم نہ سمجھتی تھی۔

''اس لڑکی کے لچھن تو جب سے بیاہ کر آئی تھی مجھے تب سے ہی ٹھیک نہیں لگ رہے تھے، ہر وقت محلے کی کم سن کنواری لڑکیوں سے ہنسی ٹھٹھول میں لگی رہتی تھی، بھلا شادی شدہ لڑکیوں پر یہ سب جچتا ہے کیا۔'' محلے کی سب سے عمر رسیدہ خالہ بتول بولیں۔

''خالہ! اب اس کی شادی جلدی ہوگئی تو اس میں اس کا کیا قصور، وہ خود بھی تو ان لڑکیوں جتنی ہی ہے اس لیے سب سے دوستی ہے۔''

یہ بانو کی ایک سہیلی تھی۔



اسے خالہ بتول کی باتوں پر اعتراض تھا تو خالہ بتول نے بھی ہاتھ اور سر جھٹک کر ''اونہہ'' کہہ کر اس کی بات کو ناپسندیدہ قرار دیا تھا۔

''صحیح کہہ رہی ہو خالہ!'' کسی نے خالہ بتول کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''اللہ جانے کیا بات ہے؟ یہ بھی تو سوچو کہ آخر ایسا کیا ہو گیا کہ وہ کھڑکی سے ہی کود گئی، اگر کچھ ہو جاتا تو۔'' ایک اور خاتون بولیں۔

غرض یہ کہ بھانت بھانت کی آوازیں تھیں، ہر کوئی اپنی رائے دینا فرض سمجھ رہا تھا۔

یہ گرما کی ایک تپتی دوپہر تھی۔ دن کے بارہ بجے کا وقت تھا۔ مرد حضرات سارے اس وقت اپنے اپنے کام دھندے کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ شیر خوار بچوں کے علاوہ باقی سارے بچے اپنے اپنے اسکول کالجز میں تھے۔ خواتین تک جیسے جیسے خبر پہنچ رہی تھی، وہ سب گلی کے عین وسط میں خالہ برکتے کے گھر کے باہر جمع ہو رہی تھیں۔

''ارے! کوئی یہ تو بتائے کہ بانو کا کیا بنا، اسے کتنی چوٹیں آئیں اور وہ کدھر ہے۔'' خالہ برکتے کے ساتھ والے گھر سے سکینہ بھابھی بھی آ چکی تھیں۔

ان کی بات پر سب نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ اس سے پہلے کہ مزید کوئی گوہر افشانی کی جاتی، خالہ برکتے کے گھر کے عین سامنے والے گھر میں رضیہ نے محلے والوں کی باتیں سنیں تو جلدی سے دو سالہ منے کو اٹھایا اور عجلت میں باہر نکلی، بھئی اس واقعے کا اصل چشم دید گواہ تو اس کا شوہر تھا تو لوگوں کو اس بارے میں بتانا اس کا ہی تو فرض تھا۔

''اوپر والے پورشن کی کھڑکی سے چھلانگ لگائی ہے اس نے، ہڈی پسلی ٹوٹ جانی تھی جو رشید کا لوڈر ٹرالہ نہ کھڑا ہوتا۔'' اب سب خواتین خاموشی اور بھرپور دلچسپی سے رضیہ کی بات سن رہی تھیں۔

''اور کیا پتا گر کر سیدھی سر پر چوٹ لگتی تو جان سے ہی جاتی، لیکن یہ تو اس کی خوش قسمتی ہے کہ واقعہ سے تھوڑی دیر پہلے رشید گھر آئے اور وہ بھی کام کے دوران کہاں آتے ہیں، آج سعدیہ (رضیہ کی نند) کے جہیز کے لحاف جو بازار میں روئی ڈلوانے کے لیے دیے ہوئے تھے، وہ ملنے تھے تو انہوں نے سوچا کہ وہ بھی گھر دے جائیں اور کھانا بھی کھا جائیں، وہی دینے آئے تھے اور جب یہ گری تو لحاف ابھی اندر ہی تھے، ان پر ہی گری اس لیے بچت ہو گئی، ٹھیک ہے بالکل، ہلکی پھلکی خراش ہی آئی ہے۔'' اس نے ان سب کو پوری تفصیل سے آگاہ کیا۔

''اب بانو کدھر ہے؟''

''وہ جب گری تو خالہ برکتے اسی وقت گھر سے باہر آئی تھیں، تب بانو اس کے ساتھ گھر ہی چلی گئی۔''

''ویسے کوئی تو بات ہوئی ہو گی جو اس نے اتنی جرأت کی۔'' خالہ بتول اب واقعے کا پس منظر جاننے کے لیے بے تاب ہو رہی تھیں۔

''کہتی تو تم ٹھیک ہو خالہ۔'' سب نے ان کی تائید کی۔ ''کیوں نہ خالہ برکتے کے گھر جائیں، اصل بات کا پتا تو وہیں جا کر لگے گا۔'' خالہ صفیہ بولی۔

''ہاں صحیح بات ہے، کیا پتا کوئی لڑائی جھگڑا ہوا ہو، خالہ برکتے بھی مزاج کی اچھی خاصی تیز ہیں اور غصہ تو بانو کو بھی جلدی آتا ہے۔ اس سے پہلے دو تین دفعہ میں نے ان کے گھر سے لڑائی کی آوازیں بھی سنی ہیں۔'' سکینہ بھابھی نے جھٹ ان دونوں کے درمیان کبھی کبھار ہوتی نوک جھونک کو باقاعدہ لڑائی کا نام دیا۔

اب خواتین کا یہ گروہ خالہ برکتے کے گھر کی جانب چل دیا۔

☆☆☆

وہ دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے، زار و زار رو رہی تھی، آنے والے وقت کا سوچ کر اس کا دل خزاں رسیدہ پتے کی مانند لرز رہا تھا۔ ابھی تک اماں نے اس سے کوئی باز پرس نہیں کی تھی، بس خاموش نظروں سے اسے دیکھے گئی تھیں۔

''میں نے جو کچھ انہیں بتایا اگر انہوں نے اس بات کا یقین نہ کیا تو میں کیسے انہیں اپنی صفائی دوں گی؟ کیا میں اپنی صفائی میں کچھ کہہ بھی سکوں

گی؟ اگر اماں نے اسلم کو سب بتا دیا تو کیا وہ مجھے بے گناہ تصور کریں گے یا وہ مجھ سے بدگمان ہو جائیں گے؟ اگر اسلم نے مجھے غلط سمجھا اور گھر سے نکال دیا تو میں کہاں جاؤں گی؟ میرا تو اس گھر کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ اگر اسلم نے مجھ سے میرا بیٹا بھی چھین لیا تو؟'' اس نے اپنے پاس سوئے تین سالہ ''احمد'' کو ممتا کے خوب صورت جذبے سے معمور فکر مند نظروں سے دیکھا۔

آنکھیں مسلسل برس رہی تھیں۔ وہ ان ہی پریشان کن سوچوں میں گھری ہوئی تھی کہ جب اسے بیرونی دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ وہ اس وقت اوپر اپنے اسی کمرے میں بیٹھی تھی، جس کی کھڑکی سے اس نے چھلانگ لگائی تھی۔

اب اسے دروازہ کھولنے کی آواز آئی تھی۔

چھوٹا سا بمشکل تین مرلے کا گھر تھا۔ جس میں ایک کھلا صحن بھی تھا۔ اوپر نیچے کی آوازیں آسانی سے سنی جا سکتی تھیں۔ وہ بغیر دیکھے بھی جان گئی تھی کہ محلے کی عورتیں جو پہلے ان کے گھر کے باہر اس کے متعلق قیاس آرائیاں کر رہی تھیں، اب ان کے گھر میں موجود تھیں۔

''اماں اب جانے ان سے میرے بارے میں کیا کیا کہیں گی، وہ مجھ پر ہی الزام دھریں گی، وہ تو کبھی بھی اشرف کو قصوروار نہیں ٹھہرائیں گی۔'' نمکین پانی ایک بار پھر گالوں کو بھگو گیا تھا۔

''بانو اب کیسی ہے؟ زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں خالہ!'' اسے ایک آواز سنائی دی۔

''ٹھیک ہے۔ اسے کیا ہونا لیکن آج جو اس نے تماشا کیا، میں تو ابھی تک اس بات سے ہی نہیں سنبھل پائی۔'' اماں نے قدرے رکھائی سے کہا تو اس کا دل درد سے بھر گیا۔ یعنی انہوں نے اس کا اعتبار نہیں کیا تھا۔

''پھر بھی بھلا ایسی کیا بات ہو گئی کہ اس نے اتنا بڑا قدم اٹھا لیا۔'' یہ شاید بتول خالہ تھیں۔

''بس بہن! کیا بتاؤں، میں تو خود ابھی تک صدمے کی کیفیت میں ہوں۔ میرے تو یہ سوچ کر ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے ہیں کہ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو میں کیا کرتی، اپنے بیٹے کو کیا جواب دیتی کہ اس کی غیر موجودگی میں، میں اس کی بیوی کو نہ سنبھال پائی اور تو اور خدانخواستہ کچھ اونچ نیچ ہو جاتی تو مجھ جیسی سیدھی سادھی عورت نے تھانے اور پولیس کے چکروں میں خوار ہونا تھا، بدنامی الگ ہوتی، اللہ نے بڑا بچا لیا۔''

''پر ہوا کیا تھا خالہ۔'' یہ تجسس تو ابھی بھی برقرار تھا۔

''ہونا کیا ہے، کم بخت آفت ہے پوری۔''

اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اب اماں انہیں تفصیل بتائیں گی اور وہ اشرف کو تو بدنام نہیں کریں گی تو یہ طے تھا کہ بخیے اس کی ذات کے ہی ادھڑنے ہیں۔

''سارا سارا دن آرام کرتی رہتی ہے۔ آج میں نے صبح کہا کہ تفصیلی صفائی کرنی ہے تو جواب میں ناک منہ چڑھانے لگی اور بجائے اس کے کہ میری بات پر کان دھرتی اور صفائی کرتی، موا موبائل لے کر بیٹھ گئی، میں نے پیار سے دو تین دفعہ کہا لیکن اسی موبائل پر آنکھیں گاڑے گئی۔ مجھے بھی غصہ آ گیا۔ میں نے چار باتیں سنا دیں بس وہیں سے بات بڑھ گئی۔ ٹھیک ہے میں نے بھی کچھ سخت کہہ دیا تھا، طعنے بھی دے دیے، نہیں مکرتی میں، لیکن آج کل کی لڑکیوں میں تو برداشت نام کو بھی نہیں، اتنا غصہ کہ مرنے مارنے پر تل جاؤ، اصل میں غصہ کسی اور بات کا لیے بیٹھی ہے۔''

''وہ کیا خالہ؟'' سب یک زبان ہو کر بولیں۔

''دو، تین ماہ تک اشرف کی شادی کر رہی ہوں، میں نے یہ کہہ دیا کہ تم اشرف کی شادی سے پہلے نیچے والے کمرے میں آ جانا اور اوپر والا کمرہ بڑا ہے، وہ نئی دلہن کو دے دیں گے۔ بس تب سے ہی مجھ سے کھنچی کھنچی رہتی ہے اور آج اسی لیے لڑائی کا بہانا بنا لیا۔''

وہ حیران سی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ آج ایسا تو کچھ بھی نہ ہوا تھا جو اماں ان سے کہہ رہی تھیں۔

"یہ تو بڑی غلط بات ہے، بڑے کچھ کہہ ہی دیتے ہیں اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اتنا بڑا قدم اٹھالیا جائے۔"

"بس بھئی جو ہونا تھا وہ ہو گیا، میں تو ڈر گئی ہوں، اس بڑھاپے میں اب خوار نہیں ہوا جاتا، میں نے اسلم کو بلا لیا ہے، اب وہی اس کا فیصلہ کرے گا۔" اسلم کے نام پر وہ کانپ سی گئی۔

"یہ اچھا کیا تم نے خالہ! وہی اپنی بیوی کا فیصلہ کرے۔"

"میں تو کہتی ہوں، اس سے کہنا، مرد ہے اسے ایک دو جڑ بھی دے تو کوئی فرق نہیں پڑتا، آخر اتنی سی بات پر اس نے اتنی جرأت کی، دو چار لگائے گا تا تو ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔" یہ خالہ بتول تھی جو اپنے مشورے سے نواز رہی تھی۔

"ہاں، اب وہی فیصلہ کرے، یہ صلہ دیا ہے اس نے مجھے، ارے بیٹی بنا کر رکھا میں نے، نہ آگے کوئی نہ پیچھے کوئی، اکڑ کس بات کی ہے۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد میں نے سر پر ہاتھ رکھا، بیٹے سے شادی کی، پر اسے عزت راس نہ آئی، مجھے ہی آنکھیں دکھانے لگی۔"

"بس خالہ! بھلائی کا زمانہ ہی نہیں رہا۔"

"چلو! اللہ بہتر کرے گا۔"

مختلف آوازیں ابھر رہی تھیں۔

وہ ساکت بیٹھی اس من گھڑت کہانی کو سن رہی تھی تب اسے دروازہ کھلنے کی آواز آئی، یعنی وہ سب جارہی تھیں۔

اس نے اٹھ کر کھڑکی سے عورتوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔

اماں نے اصل بات کے بجائے کوئی اور ہی کہانی سنائی تھی، گو کہ سب باتیں بھی اس کے خلاف ہی تھیں۔ اماں کی غلط بیانی پر اسے دکھ بھی ہو رہا تھا لیکن اس کی اتنی برائیوں کے باوجود اماں نے اصل بات چھپالی، جانے اماں کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔

بانو کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ گھر سے نکلتے ہی انہوں نے باتیں شروع کر دی تھیں۔

"ویسے اتنی سیدھی سادی خالہ بھی نہیں ہے جتنی بن رہی تھی۔"

"ہاں! یہ تو ہے، تالی دونوں ہاتھوں سے ہی بجتی ہے، اگر لڑائی جھگڑا اتنا بڑھا کہ بانو نے اتنی جرأت کر لی تو یقیناً خالہ بھی اس لڑائی میں برابر کی قصوروار ہے۔"

"ہاں! تو اور کیا، ہمیں کیا پتا کہ اندر ہی اندر کیا چل رہا ہے۔" اوپر کھڑکی کے پاس کھڑی بانو اور نیچے دروازہ بند کرنے کی غرض سے کھڑی برکت بی بی دونوں ہی تلخی سے مسکرائی تھیں اور اس مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ بانو کے اور برکت بی بی کے گالوں پر آنسو لڑھکے تھے جنہیں بانو نے بہہ جانے دیا اور برکت بی بی نے سختی سے صاف کرتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

☆☆☆

اسلم جب کمرے میں آیا تو بانو ساتھ لے جانے والا سامان باندھ رہی تھی۔ وہ جلدی جلدی ہاتھ چلا رہی تھی لیکن مستقل طور پر جانا تھا اور اتنا اچانک پروگرام بنا تھا۔ منے کی چھوٹی چھوٹی اتنی چیزیں تھیں، وہ ذہن میں دہرائی جاتی اور رکھتی جاتی۔

"تیاری ابھی پوری نہیں ہوئی۔"

"بس تقریباً ہو ہی گئی ہے۔ ضروری چیزیں ساری رکھ لی ہیں، باقی چھوٹی موٹی چیزیں رہ گئی تھیں وہ رکھ رہی ہوں۔" وہ بنا اس کی طرف دیکھے مصروف سے انداز میں بولی۔

وہ دانستہ اس کی طرف دیکھنے سے احتراز برت رہی تھی کہ کہیں اس کی روئی روئی سرخ آنکھیں کوئی راز نہ افشا کر دیں۔ اس لیے وہ خود کو مصروف ظاہر کر رہی تھی۔

"ویسے مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ اماں نے خود مجھ سے تمہیں ساتھ لے جانے کو کہا، وہ تو تمہیں میرے ساتھ بھیجنے کے بالکل حق میں نہیں تھیں۔" بولتے ہوئے اس کے چہرے پر خوشی کی رمق تھی۔

وہ اماں کے فوری طور پر بلانے پر ابھی دو گھنٹے پہلے پہنچا تھا اور آتے ہی تھوڑی دیر بعد اماں نے بانو کو اپنے ساتھ لاہور لے جانے کی پیشکش کر دی تھی۔ اس کی تو خوشی کی انتہا نہ رہی تھی۔ وہ تو چاہتا تھا کہ اسے اپنے ساتھ رکھے، لیکن اماں کے اکیلے پن کی وجہ سے خاموش ہو جاتا تھا۔

وہ اس کے ساتھ جاتی تو اماں اکیلی رہ جاتیں، اشرف ایک مل میں ملازم تھا، صبح کا گیا رات کو آتا تھا۔ اماں کہتی تھیں کہ بانو اس کے ساتھ رہے گی تو خرچہ زیادہ ہوگا، اس کے لیے کرائے پر گھر بھی لینا پڑے گا۔ اماں بھی ٹھیک ہی کہتی تھیں ابھی اشرف کی شادی بھی کرنی تھی اس لیے وہ خاموش ہو گیا تھا کیونکہ وہ بڑا بھائی تھا، ابا کے بعد یہ اس کا فرض بنتا تھا۔ ویسے بھی وہ کوئی لاکھوں کی نوکری تو کرتا نہیں تھا دس جماعتیں پاس کر گیا تھا۔ ابا نے اپنی زندگی میں کہہ سن کر اسے ایک سرکاری دفتر میں نائب قاصد بھرتی کروا دیا تھا، گزر بسر اچھی ہو جاتی تھی۔

اب اس کی حیرانی بھی بجا تھی کہ یکا یک اماں نے یہ فیصلہ صادر کیا تھا اور کہا تھا کہ اشرف کی دو مہینے میں شادی کرنی ہے تو ان کی تنہائی بھی ختم ہو جائے گی، یہ فیصلہ تو انہوں نے پہلے ہی کر لیا تھا کہ بانو کو اس کے ساتھ بھیج دیں گی لیکن اب بانو کو جلدی اس لیے بھیج رہی ہیں کہ کچھ دنوں سے اس کے سر میں درد رہنے لگا ہے۔ لاہور بڑا شہر ہے، وہاں اچھے ڈاکٹر ہیں، وہاں اس کا علاج اچھا ہو جائے گا۔

"تو سر درد کی فکر نہ کر، میں تجھے وہاں کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤں گا، جلد ہی ٹھیک ہو جائے گی۔" اسلم اپنائیت بھرے لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے، ان شاءاللہ۔" وہ سر کو ہلکی سی جنبش دیتی پھیکی ہنسی ہنس دی۔

"چل تو بھی جلدی ہاتھ چلا اور سو جا، مجھے بھی نیند آ رہی ہے، اماں نے کہا ہے، صبح تڑکے ہی نکل جانا، تاکہ ٹھنڈے ٹھنڈے ہی پہنچ جائیں، دن چڑھ گیا تو گرمی ہو جائے گی۔" وہ لیٹتے ہوئے بولا اور جلد ہی نیند کی وادیوں میں اتر گیا۔ دن بھر کا تھکا ہوا تھا اس لیے جلد ہی نیند آ گئی۔

ذہنی طور پر تو وہ بھی بہت تھک چکی تھی لیکن نیند اس سے کوسوں دور تھی۔

بیگ کی زپ بند کر کے وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ آج کیسا دن چڑھا تھا؟ ایک ہی دن میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ دن بھر کے واقعات ذہن میں گردش کرنے لگے۔

آج صبح بارہ بجے کی ہی تو بات تھی، وہ احمد کو سلا کر خود بھی آرام کی غرض سے اس کے ساتھ ہی لیٹی تھی کہ اشرف اس کے کمرے میں آیا تھا۔ وہ گھبرا کر جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور دوپٹہ درست کرنے لگی۔ وہ اکثر اس کے کمرے میں بِلا دستک دیے دھڑلے سے آ جاتا تھا کہ وہ گھبرا جاتی تھی لیکن آج تو اسے بہت ناگوار گزر رہا تھا۔ اس کے دیکھنے کے عجیب بے باک سے انداز سے وہ اندر ہی اندر گھبراہٹ کا شکار ہونے لگی۔ وہ جو اسے ہمیشہ بڑے بھائیوں والا مان دیتی آئی تھی اس کی بدلتی نظروں سے بری طرح خائف ہو گئی۔

"اشرف بھائی! یہاں سے جائیں، ورنہ میں اماں کو بلا لوں گی۔" وہ قدرے سخت اور بلند آواز میں بولی، اندر سے وہ بری طرح ڈری ہوئی تھی لیکن خود کو مضبوط ظاہر کر رہی تھی۔

"تو بلا لو، جتنی بلند آواز میں بلا سکتی ہو، بلا لو۔"

جواباً وہ اس کی بات کو قطعاً اہمیت نہ دیتے ہوئے ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے، اس کی طرف پیش قدمی کرنے لگا تھا تو گویا کچھ عرصے سے اسے اس کا جو بدلا انداز کھٹک رہا تھا آج وہ روپ کھل کر سامنے آ گیا تھا۔

وہ بے بسی کی انتہاؤں کو چھوتی پیچھے ہٹتی ہوئی

دیوار سے ٹکرائی تھی، تب ہی اسے اپنے پیچھے کسی روزن کی طرح کھڑکی نظر آئی تھی۔ لمحوں میں اس نے فیصلہ کیا تھا اور اس کے ناپاک ارادے کو ناکام بناتے ہوئے کھڑکی سے کود گئی تھی۔

یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے بلندی سے گرنے کی وجہ سے سوائے زوردار جھٹکا لگنے کے خراش تک نہ آئی تھی۔ اسے اپنے اردگرد سب چکراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ تب اس نے اماں کو اپنے پاس کھڑے پایا تھا۔ اردگرد لوگ اکٹھے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اماں بالکل سپاٹ چہرہ لیے خاموشی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر، اسے لوگوں کے درمیان سے گزار کر اپنے ساتھ گھر لے گئی تھیں۔

گھر جا کر اس نے بے حد گھبرائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھا تھا لیکن اسے اشرف کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے یہ موقع غنیمت جان کر اماں کو روتے ہوئے ساری بات بتا دی تھی اور انہوں نے بھی بنا اسے ٹوکے خاموشی سے سب سنا تھا۔ وہ ان کی مسلسل خاموشی سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر پا رہی تھی۔

☆☆☆

یہ اسلم کے آنے سے کچھ دیر پہلے کی بات تھی جب برکت بی بی، اس کے کمرے میں آئیں۔ وہ جو مارے ڈر کے اپنے کمرے سے نہیں نکل رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر فوراً اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"آپ مجھے بلا لیتیں، سیڑھیاں چڑھ کر آئیں، پہلے ہی آپ کے گھٹنوں میں درد رہتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں، مجھے کچھ ضروری بات کرنی تھی تم سے۔" ان کے چہرے پر بے حد سنجیدگی تھی۔

وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھتی بستر پر بیٹھیں تو وہ بھی نظریں جھکائے ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"اماں! میں جھوٹ نہیں کہہ رہی، میں بے قصور ہوں۔" بولتے ہوئے اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ حلق میں نمکین پانی کا گولہ سا اٹک گیا تھا۔

"تم نے جو کچھ کہا، میں نے سن لیا، کوئی باز پرس نہیں کی۔ جانتی ہو کیوں؟" وہ سوالیہ انداز میں بولیں تو وہ سر اٹھا کر ان کی سمت دیکھنے لگی۔

"کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو، تم جب احمد کو سلانے کمرے میں لے گئی تھیں تو میں گھر کی چند ضروری چیزیں لینے بازار گئی تھی، احمد کی نیند نہ خراب ہو اس لیے تمہیں نہیں بتایا، اشرف آج گھر پر تھا کام پر نہیں گیا تھا میں اسے بتا کر چلی گئی تھوڑی دور جا کر احساس ہوا کہ جو پیسے نکالے تھے وہ تو گھر میں ہی رہ گئے، پرس میں رکھنا ہی بھول گئی، پیسے ہی پاس نہیں تھے تو آگے کیا جاتی اس لیے وہ لینے کی غرض سے میں واپس گھر کی سمت آ گئی تھی۔ دروازے کی ایک فالتو چابی ہمیشہ میرے پرس میں ہوتی ہے تم جانتی ہو لیکن اشرف نہیں جانتا تھا۔

آج جو کچھ ہوا، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کسی شبے کی تو گنجائش ہی نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اشرف کو اپنی موجودگی کا احساس دلاتی تم چھلانگ لگا چکی تھیں۔" وہ سانس لینے کو رکیں اور پھر بولیں۔

"مجھے معاف کر دو بیٹی! میں اپنے بیٹے کی اچھی تربیت نہ کر سکی بجائے اس کے کہ وہ اپنے بھائی کی عزت کی حفاظت کرتا، وہ تو خود موقع کی تلاش میں تھا۔ میں نے محلے کی عورتوں سے اس لیے غلط بیانی کی کہ میرے اور تمہارے جھگڑے پر چار دن لوگ باتیں کر کے پھر اسے روایتی ساس بہو کا جھگڑا سمجھ کر بھول جائیں گے لیکن حقیقت تلخ ہوتی ہے، لوگوں کو پتا چلتا تو اپنے اپنے انداز میں اس پر تبصرے کرتے، چار لوگ اشرف کو برا بھلا کہتے تو کچھ انگلیاں تمہارے بے قصور ہونے کے باوجود تمہاری طرف بھی اٹھ جاتیں۔"

وہ رسان سے اسے سمجھا رہی تھیں اور وہ بھی سمجھ رہی تھی کہ وہ کچھ ایسا غلط بھی نہ کہہ رہی تھیں۔

"اسلم کو میں نے فون کر کے بلا لیا ہے تھوڑی دیر تک پہنچ جائے گا، میں نے اس سے یہ کہا ہے کہ کئی دنوں سے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تمہیں اپنے ساتھ لاہور لے جائے، وہاں اچھے ڈاکٹر ہیں تمہارا

علاج اچھا ہو جائے گا۔ اب تم نے اسلم کے سامنے اس بات پر پکا رہنا ہے۔ اس درخواست کو ایک ماں کی مجبوری سمجھ لو یا التجا میں نہیں چاہتی کہ میرے دونوں بیٹے آمنے سامنے ہوں اور صبح تڑکے ہی نکل جانا تاکہ اسلم گلی میں کسی سے مل ہی نہ سکے میری بچی مجھے معاف کر دو یہ سب جو ہوا، اس میں میری ہی غلطی ہے۔"

اس نے اچنبھے سے انہیں دیکھا۔

"آپ کا اس میں کیا قصور، آپ تو میرے لیے ڈھال ثابت ہوئی ہیں۔" وہ آنسو بھری آنکھوں میں ان کے لیے تشکر کے جذبات لیے بولی۔

"غلطی ہے میری بچی! میری غرض مجھ پر حاوی ہو گئی تھی۔ شادی کے بعد اسلم کا دل چاہتا تھا کہ وہ تمہیں اپنے ساتھ رکھے لیکن میرے احترام میں اس کا اظہار نہ کرپاتا تھا اور میں اس کے دل میں دبی یہ خواہش جانتی تھی لیکن جان بوجھ کر اس سے نظریں پھیر لی تھیں۔ تم آئیں تو گھر میں رونق ہونے کے ساتھ ساتھ مجھے گھر کے کاموں کے لیے بھی سہارا مل گیا میں نے اپنا فائدہ سوچا لیکن یہ میری خطا تھی۔ میں نے تمہیں تمہارے محرم رشتے سے تو دور رکھا اور نامحرم رشتے کے پاس، ایک ہی چھت تلے اکیلا چھوڑ دیا۔ میری نیت بری نہیں تھی بس غرض حاوی ہو گئی تھی۔ اس کے لیے مجھے معاف کر دو۔"

بات کے اختتام پر برکت بی بی کی آنکھیں برس پڑیں۔ بانو تڑپ اٹھی اور ان کے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"ایک شرط پر مانوں گی اماں۔" وہ مان بھرے لہجے میں بولی۔

"وہ کیا۔"

"جب آپ کی دوسری بہو اس گھر میں آجائے گی تو پھر آپ کی گھر کے لیے فکر ختم ہو جائے گی، اس لیے تب آپ مستقل ہمارے پاس آجائیں گی۔"

"فکر نہ کرو، تمہیں اکیلی میں رہنے بھی نہیں دوں گی، صرف پاس رہوں گی بلکہ تمہارے سارے کاموں پر نظر بھی رکھوں گی۔"

بانو نے نم آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا اور دونوں روتے روتے ہنس دی تھیں۔

☆☆☆

"خالہ برکتے کی بہو اور بیٹا صبح تڑکے ہی لاہور کے لیے روانہ بھی ہو گئے۔" محلے میں یہ خبر گردش کر رہی تھی۔

"اب سمجھ آئی، بانو یہ ساری لڑائی اور فساد اسی لیے کر رہی تھی۔ شوہر کے ساتھ جانا چاہتی ہو گی۔" خالہ بتول بولی تو محلے کی کئی عورتوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"تو اس میں برائی کیا ہے خالہ! چار سال وہ سسرال میں ہی رہی ہے۔ اب اسلم بھائی کی بھی مجبوری ہے کہ ان کا روزگار دوسرے شہر میں ہے خود تو وہ نہیں آسکتے، اچھا ہے بیوی کو اپنے ساتھ رکھیں، ہاں لیکن یہ بانو نے اچھا نہیں کیا مجھ سے مل کر بھی نہیں گئی۔" بانو کی ایک سہیلی کے لبوں پر اس کی طرف داری کے ساتھ ساتھ شکوہ بھی ابھرا۔

"خالہ برکتے سمجھ دار عورت ہے، اس سے پہلے کہ آپس کے لڑائی جھگڑے اور بڑھتے، بہو کو بیٹے کے ساتھ بھیج دیا۔"

"ہاں! صحیح کہہ رہی ہو اور ویسے بھی خالہ اشرف کی شادی بھی جلد ہی کر رہی ہے، وہ کون سا اکیلی رہ جائے گی۔ جاتی ہے بانو تو جائے اس کی بلا سے۔"

گلی میں ان کے گھر کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔

تب ہی چہرے پر خجالت لیے اشرف گھر میں داخل ہوا تھا۔ اپنی صفائی میں کچھ کہنے کے لیے ابھی لبوں کو جنبش ہی دی تھی کہ برکت بی بی نے ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور بنا بات کیے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں۔

☆☆

آسیہ رئیس خان

رفاقتیں

وہ دروازے کی چوکھٹ میں ایستادہ اسے اپنے دھیمے اور محتاط انداز میں کام کرتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی یہ عادت جوں کی توں قائم تھی کہ اس کی وجہ سے بلاضرورت شور ابھرے نہ کسی کو پریشانی ہو۔ حالاں کہ اب اس کے ہونے اور پاس ہونے کا احساس اس کی سب سے بڑی آسودگی تھا۔ اس نے اتنا کچھ کھو دیا تھا کہ اب اس کی پیدا کردہ آوازیں، آہٹیں، بالوں اور دوپٹے کی سرسراہٹیں، کلائی میں ڈولتی چوڑیوں کی کھنک، قدموں کی چاپ، سانسوں کے زیر و بم سب کچھ اس میں طمانیت بھر دیتا تھا۔ اس کا خالی پن ان سب سے بھر جاتا تھا۔

وہ تکیے کے غلاف اور چادر بدلنے کے بعد، میلی چادر اور غلاف تہ کر کے پلٹی اور سینے پر ہاتھ باندھ کر کھڑے منیب کو دیکھ کر مسکرائی۔

"آپ لیٹ جائیں، میرا کام ہو گیا ہے۔"

اسے لگا تھکا ہارا شوہر اس کے وہاں سے ہٹنے کا منتظر ہے۔ اس نے میلی چادر اور غلاف کرسی پر رکھے اور الماری سے ہلکا سا لحاف نکال کر پائنتی رکھ دیا۔ تب تک وہ اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔

"بیٹھو۔" اس نے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اسے پلنگ کے کنارے بٹھایا۔ وہ اس کی سنجیدہ صورت دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"کیا ہوا؟" اس کے دو لفظ سہمے اور انجانے خوف سے لبریز تھے۔ ان سب پر ہی ہر لمحہ کسی انہونی کا خدشہ سایہ کیے رہتا تھا۔

"کچھ نہیں......" وہ اسے تسلی دینے کے لیے مسکرایا۔

"مجھے یونہی خیال آیا کہ ماضی کی کوئی بڑی بات جو حال میں بھلے ہی معمولی ہو گئی ہو اگر غلط وقت پر ظاہر ہو تو عظیم دکھ اور ملال کا باعث بن جاتی ہے اور





میرے پاس ایسی ہی ایک معمولی بات ہے جو میں خود تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔"

مثیب نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور اس کی سیدھی ہتھیلی پر اپنا انگوٹھا پھیر رہا تھا۔

مکمل ناول



"میری بات تمہیں اچھی نہیں لگے گی، تمہیں دکھ بھی ہوگا لیکن تمہیں کسی بڑے دکھ سے بچانے کے لیے مجھے یہ سچ کہنا ہے، میں نہیں چاہتا ایک طویل مسافت کے بعد کسی بھی وجہ سے رائیگانی کا احساس تمہیں زندہ درگور کردے......" اس کا دل بات سننے سے پہلے ہی ڈوبنے لگا تھا۔

☆☆☆

اطلاعی گھنٹی کے جواب میں دروازہ دیبا نے کھولا اور وہ اس کی شکل دیکھ کر ہی کوفت زدہ ہوگیا۔ یہاں آتے ہوئے راستے بھر جو سرور چھایا تھا۔ وہ دروازے پر ہی غائب ہوگیا۔

اعتماد سے مبرا الجھی جھجکتی، اپنے آپ میں گمی اور خاموش سی دیبا کو دیکھ کر ہمیشہ ہی اسے الجھن اور بےزاری گھیر لیتی تھی۔

اس کے خاندان کی ساری لڑکیاں شانو سمیت بااعتماد، اپنی اہمیت سے آگاہ اور شخصیت کی تعمیر پر بھرپور توجہ دینے والی تھیں اور ان سب میں دیبا آنکھوں میں چبھنے والا منظر تھی۔

وہ سلام کرکے واپس چلی گئی اور وہ اس کی بداخلاقی پر کڑھتا اندر آیا حالاں کہ اچھی طرح جانتا تھا یہ بداخلاقی نہیں اس گھر میں اس کے لیے مقرر کی گئی حدود ہیں۔

عروبہ کو 'سرپرائز' دینے کے فراق میں اس نے اسے اطلاع نہیں دی تھی اور اب گھر میں صرف نانی، چھوٹی ممانی اور دیبا کو دیکھ کر پچھتا رہا تھا کہ ادھر کا رخ کیا ہی کیوں۔

نانی ہال میں ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے ہی مطلع کیا کہ گھر والے سب عروبہ کی خالہ کے یہاں کسی تقریب میں گئے ہیں۔

"عابدہ!" نانی نے چھوٹی ممانی کو آواز لگائی۔

"جی اماں۔" وہ فوراً ہی دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی دروازے میں نمودار ہوئیں۔ اس نے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" انہوں نے تھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ بلاارادہ ہی سلام میں پہل کرکے اس نے انہیں عرصے بعد اپنے لیے کسی کے برتاؤ میں عزت محسوس کرکے ہونے والی خوشی سے ہمکنار کروایا تھا۔

"میرے کمرے میں الماری کے باہر ہی شاپر رکھا ہے، وہ لے آؤ۔"

"جی۔" وہ جیسے فوراً آئی تھیں ویسے ہی یکایک دروازے کے اندر غائب ہوگئیں۔

"اپنے لیے شاپنگ کو گئی تھی تو شانو اور قرۃ العین کے لیے بھی کچھ جوڑے لیے ہیں۔" انہوں نے شاپر کے مشمولات پر روشنی ڈالی۔ وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

"تم فون کردیتے ناں۔ ذرا دیر پہلے ہی سب نکلے ہیں۔"

"اس طرف اچانک کسی کام سے آنا پڑا تو سوچا مل بھی لوں، پہلے سے کوئی پلان نہیں تھا۔" یہ مکمل سچ نہیں تھا۔

"دیبا!" نانی نے منہ دروازہ کی طرف کرکے ناگواری سے پکارا۔ "سوگئی ہو کیا؟"

"اعظم اچھے ہیں؟" انہوں نے رخ دوبارہ اس کی طرف کرکے پوچھا تو پل بھر قبل والی آواز کی تختی اور ناگواری غائب تھی۔

"پاپا بھی اچھے ہیں، اس ویک اینڈ نہیں اگلے سیٹرڈے آئیں گے۔"

شہر شہر گھومنے کے بعد تین سال پہلے اعظم میر نے آبائی شہر میں مکان تعمیر کیا تھا۔ اعظم میر اور قرۃ العین نے فیصلہ کیا کہ اب وہ اور بچے اپنے گھر میں رہیں گے بس وہ ملازمت کے سلسلے میں جہاں تعنیات ہوں گے وہاں جائیں گے۔ ویسے بھی ان کو سرکاری رہائش اور ملازم کی سہولت حاصل تھی۔ وہ دو ہفتوں بعد دو دن کے لیے گھر آتے تھے۔

تب ہی دیبا اندر آئی اور ٹرے میز پر رکھی۔ چائے کے ساتھ کیک اور نمکین بھی تھا۔

"میں یہ سب نہیں لوں گا نانی......" اس نے دیکھتے ہی کہا۔

"عقل تو نام کو نہیں ہے اس لڑکی میں۔" وہ جو

کپ اٹھا کر اسے دینے لگی تھی، سہم کر اپنی دادی کو دیکھنے لگی۔ یہ ان ہی کی ہدایت تھی کہ 'مخصوص' مہمانوں کو خالی چائے نہ پیش کی جائے۔

''کھانے کا وقت ہے یہ۔'' انہوں نے جیسے اس کا چہرہ پڑھ کر ڈانٹ لگائی۔ تب ہی عابدہ وزنی سا شاپر اٹھائے اندر آئیں۔

''مجھے بالکل بھوک نہیں ہے نانی۔'' اس نے دیبا کے ہاتھ سے کپ لے لیا۔

''لیٹ لنچ کیا تھا، بس چائے کی طلب تھی۔''

اس نے دیبا کو بچانے نہیں کہا تھا بلکہ یہ واقعی سچ تھا۔ دیبا نے دوسرا کپ انہیں تھمایا اور چلی گئی۔ عابدہ نے پلاسٹک کا بڑا سا تھیلا فرش پر اس کے قریب رکھا تو اس نے دیکھا۔ ان کے دوپٹے کی لیس نکل کر جھول رہی تھی۔ وہ بھی دیبا کے پیچھے ہولیں۔

جیسا برتاؤ یہاں سب کا بیوہ ممانی اور ان کی یتیم بیٹی سے تھا اور جو رویہ ان دونوں کا تھا، وہ یہ دیکھنے کا عادی تھا۔ وہ پہلے بھی کبھار ہی نانی کے گھر آتا تھا۔ عروبہ کے لیے اپنے بدلے احساسات کے بعد وہ اسے سرپرائز دینے لیے اب اکثر آنے لگا تھا ورنہ تو ان کی ملاقاتیں باہر ہی ہوتی تھیں۔

ابھی اس نے چائے ختم ہی کی تھی کہ فون بجنے لگا۔ دوسری طرف شانو تھی۔

''تمہیں کیسے پتا چلا میں نانی کی طرف ہوں؟'' اس نے خوش دلی سے کہا۔

''بھائی۔ کہاں ہیں آپ؟'' اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔

''ہیلو۔ کہا تو نانی کی طرف آیا ہوں۔''

''امی ابھی تک گھر نہیں آئی ہیں۔'' اس نے اب غور کیا کہ وہ رو رہی تھی۔

''سلمان بھائی کب سے انہیں ڈھونڈنے گئے ہیں۔''

''اس میں رونے والی کیا بات ہے۔'' وہ ہنسنے لگا۔

''بھائی! تین گھنٹے ہونے آئے ہیں۔''

''اچھا پہلے رونا بند کرو اور پوری بات بتاؤ۔'' نانی بھی چونک کر اس کی بات سننے لگیں۔

''امی قریبی مارکیٹ گئی تھیں، وہ ہمیشہ تیس چالیس منٹ بعد واپس آجاتی ہیں لیکن دو گھنٹے ہو گئے وہ نہیں آئیں، میں نے انہیں فون لگایا تب پتا چلا فون گھر میں ہی پڑا ہے اور اب تو سلمان بھائی کو گئے بھی بہت دیر ہوگئی ہے، انہیں ابھی تک ملیں نہیں امی۔'' وہ پھر رونے لگی۔

''اچھا تم رو نہیں۔ میں آرہا ہوں۔'' وہ کھڑا ہوگیا۔

''نانی! میں چلتا ہوں۔''

''ارے یہ تو لو۔'' انہوں نے شاپر اٹھایا۔ ''کیا کہہ رہی تھی شانو؟''

''کچھ نہیں، امی فون گھر بھول کر مارکیٹ گئی ہیں، دیر ہوگئی انہیں تو شانو پریشان ہو رہی ہے، وہ اکیلی ہے گھر میں۔'' اس نے حتی المقدور وہ بات کی جسے سن کر وہ فکرمند نہ ہوں۔

''شانو بھی! اکیلی ہے تو چاچا کے یہاں چلی جائے اسی کالونی میں چار قدم پر تو گھر ہے۔''

''جی بس۔ میں چلتا ہوں۔''

وہ راستے میں تھا تب فون مسلسل بج رہا تھا۔ اس نے فون اٹھانے کے بجائے گھر پہنچنا درست سمجھا۔ گیٹ کھلا تھا۔ وہ جیسے تیسے گاڑی کھڑی کر کے اندر آیا تو ان تینوں کو دیکھ کر طمانیت اس کے اندر سرائیت کرگئی۔

''ڈرا دیا آج تم سب نے مجھے!''

''ہم خود اتنے ڈرے ہوئے تھے۔'' شانو اپنی جگہ بھائی کے لیے خالی کرنے کھڑی ہوگئی۔

''کیا ہوا تھا امی؟'' اس نے بیٹھ کے ماں کا ہاتھ پکڑا۔ وہ ماں کا لاڈلا تھا تو قرۃ العین بھی اس کی دنیا تھیں۔

''پتا نہیں بیٹا، میں تو بس واپس آرہی تھی پھر اچانک چلتے چلتے تھک گئی تب غور کیا کہ ابھی تک گھر کیوں آیا، کہاں آگئی ہوں۔ آس پاس دیکھا تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا، جانے بے خیالی میں کون سا موڑ مڑ گئی کہ پھر راستہ ملا ہی نہیں۔''

"پھر کیسے آئیں گھر؟" اس نے سوال پوچھتے ہوئے سلمان کو دیکھا۔

"ایک شاپ کے باہر بیٹھی تھیں۔"

"تھک گئی تو ایک جگہ ٹھہر کر تم سب کے فون نمبر یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی مگر کسی کا نمبر کبھی یاد ہی نہیں کیا تھا تو کیسے یاد آتا۔" وہ نڈھال سی لگ رہی تھیں۔

"شانو! اب تمہاری ڈیوٹی ہے کہ امی کبھی فون نہ بھولیں اور امی آپ بھی پلیز کسی ایک کا فون نمبر تو یاد کرلیں۔" دونوں نے اس کی بات پر سر ہلایا۔

"امی نام اور برتھ ڈیٹس کے ساتھ ساتھ اب راستے بھی بھولنے لگی ہیں۔" سلمان ہنسا۔

"میں راستہ بھولی نہیں تھی بس بے خیالی میں کہیں اور نکل گئی تھی۔" انہوں نے یقین سے کہا۔

"آپ کوشش کریں کہ چاچی کے ساتھ جایا کریں۔" منیب کا مشورہ معقول تھا۔

"یہ تو بس آج ہو گیا بیٹا! ہر دفعہ تھوڑی نہ ہوگا، ویسے شانو نے خوامخواہ تمہیں بھی پریشان کردیا۔"

"خوامخواہ۔؟ اور کیا کرتی میں؟ ایک گھنٹہ بعد بھی آپ بھائی کو ملی نہیں تھیں۔"

"اب بس کریں سب۔" سلمان بھی کھڑا ہوا۔ "کھانا ہی دے دو اب کوئی بھوک لگی ہے۔"

"کھانا۔؟" شانو نے ماں کو دیکھا۔

"امی نے بازار سے آکر بنانا تھا۔"

"تمہیں وقت دیکھ کر بنا لینا چاہیے تھا ناں۔ امی آپ کب اسے کچن کی ذمہ داری دیں گی؟" وہ جھنجھلا گیا تھا۔ بھوک کا کچا تو ہمیشہ سے تھا اور بھاگ دوڑ نے تھکا بھی دیا تھا۔

"امتحان ہو جانے دو پھر کچن یہ ہی سنبھالے گی۔" قرۃ العین نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں دیکھتی ہوں۔"

"آپ رہنے دیں امی۔ میں کچھ آرڈر کر دیتا ہوں۔" منیب نے انہیں روکا۔

"پزا منگوائیں بھائی۔" شانو نے دیر نہیں کی۔

"روٹی چاول جیسا کچھ کھانا منگواؤ ورنہ میں بنا لیتی ہوں۔" اندر جاتے ہوئے وہ رک کر پلٹیں۔

شانو نے برا سا منہ بنایا اور سلمان اور وہ مسکرا دیے۔ قرۃ العین کے کھانے کا مطلب روٹی چاول کے ساتھ گوشت سبزی اور دالیں تھا۔ ان کے علاوہ باقی چیزوں کو وہ 'کھانے' میں شمار نہیں کرتی تھیں۔

اس واقعے کے بعد سب کچھ معمول پر چل رہا تھا اتنا کہ قرۃ العین میں در آرہی تبدیلیوں کو بھی وہ معمولی ہی سمجھ رہے تھے جیسے منیب کا فون نمبر یاد کرتے وہ کوفت زدہ ہو جاتیں اور ابھی تک انہیں درست نمبر یاد نہیں ہو پایا تھا۔ وہ جب بھی انہیں نمبر سناتے ہوئے غلطی کرتیں وہ سب ہنس پڑتے۔

"امی! آپ کی اتنی لائق اولادیں ہیں پر اب لگتا ہے ہم سب پاپا پر گئے ہیں۔" سلمان کہتا۔

"میں بھی اپنی کلاس کی ٹاپر ہوا کرتی تھی، اب تو عمر کا تقاضا ہے۔"

ویک اینڈ پر اعظم میر آئے تو حسب عادت ان کے پیچھے گھر کے واقعات سنانے کے دوران شانو نے انہیں قرۃ العین کے راستہ بھٹکنے والی بات بھی سنائی اور وہ بھی بیوی کو چھیڑتے رہے۔

"بیگم! کسی دن ہمیں نہ بھول جانا۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر ان کی طرف جھکے اور قرۃ العین ہمیشہ کی طرح بری طرح شرما گئیں۔

"ہزار بار کہا ہے بچوں کا لحاظ کیا کریں۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی، چہرے پر مصنوعی ناراضی سجائے اٹھ کر جانے لگیں۔

"بچوں کے رومانس کے دن ہیں، اب آپ کے نہیں۔" انہوں نے باورچی خانے میں جاتے جاتے کہا۔ پیچھے سے ان تینوں نے ہوہو ہاہا کا غوغہ مچا دیا۔

اعظم میر معمول کی طرح اتوار کی رات واپس چلے گئے۔ اگلے دن چاچی آئیں اور قرۃ العین کو ہفتہ بھر پہلے کی بات یاد ہی نہیں آرہی تھی۔

"حد کرتی ہو قرۃ العین! تم بھی، تم نے ہی تو کہا تھا اگلے سنیچر کو نوروز جانا ہے تمہیں ڈور میٹ اور نئے تولیے وغیرہ لینے ہیں۔" انہوں نے دوکان کا نام

لے کر یاد دلانا چاہا۔
"ڈورمیٹ اور ناول......" وہ الجھی سی سوچنے لگیں۔
"چلو، لے لوں گی۔" وہ جانے کے مقصد سے تیار ہو کر آئی تھیں اور اب اگر جانا منسوخ ہوتا تو ان کا بگڑا مزاج کئی ہفتوں تک ٹھیک نہیں ہوتا تھا، سو وہ جانے تیار ہو گئیں۔

☆☆☆

"یہ کیا کر رہے ہو تم؟" سلمان بڑی دیر سے فون اور ڈائری میں الجھا تھا۔
"امی کا ڈیلی حساب کتاب ٹیلی کر رہا ہوں، جو ٹیلی ہو نہیں رہا۔" اس نے کام جاری رکھتے ہوئے جواب دیا۔
"لاؤ، میں کر دوں۔"
"تم رہنے دو۔" قرۃ العین نے ٹوکا۔
"پچھلے کئی مہینوں بلکہ سال بھر سے یہ ہی کر رہا ہے مجھ سے ہوتا نہیں اب۔" انہوں نے بے زاری سے کہا۔ وہ یہ ہی ایک کام سلمان سے کرواتی تھیں۔
"امی! آپ نے کچھ تو غلط لکھا ہے۔" سلمان نے فون ایک طرف رکھ دیا۔
"شاید۔"
"چھوڑیں بھی اور اب ڈائریوں میں کون لکھتا ہے، دنیا بھر کی ایپس موجود ہیں جو خود ہی آدھے سے زیادہ کام کر لیتی ہیں۔"
"میں نے امی کو وہ بھی انسٹال کر کے دیں لیکن ان سے نہیں ہوا مینج۔"
"اب پاپا تھوڑی نا آپ سے حساب کتاب مانگتے ہیں جو آپ اتنا تردد کر رہی ہیں، نہیں ہو رہا تو جانے دیں۔"
"یہ تو میں اپنے لیے لکھتی تھی بیٹا۔"
"امی!" شانو پکارتے ہوئے اندر آئی۔ "آپ بھائی کی شادی کب کر رہی ہیں؟" وہ دھم سے صوفے پر ان کے پاس بیٹھ گئی۔
"اتنی اچانک یہ فرمائش؟" سلمان کی بھنویں

اونچی ہوئیں۔
"میری سہیلیاں پوچھتی ہیں مجھ سے اور میں پڑھ پڑھ کے اتنا پک گئی ہوں کہ کوئی ہنگامہ چاہیے مجھے۔"
"اس بار تمہارے پاپا آئیں تو یہ مسئلہ اور حل ان کے سامنے پیش کرتے ہیں۔" قرۃ العین مسکرائیں۔
اور وہ بھی مسکراتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اب عروبہ کے متعلق گھر میں بتا دینے کا وقت ہو گیا ہے۔ وہ کزنز تھے پھر بھی دونوں نے یہ اب تک سب سے چھپا کے رکھا تھا۔

☆☆☆

اعظم میر عام طور پر جمعہ کی رات میں آتے تھے لیکن اس بار وہ سنیچر کے دن دوپہر تک پہنچ رہے تھے۔ شانو کی چھٹی تھی۔ سلمان دفتر اور وہ اپنے دفتر میں تھا۔
ایک بار پھر شانو نے اسے روتے ہوئے فون کیا اور وہ گھر پہنچا۔
قرۃ العین بھول گئی تھیں کہ انہوں نے کھیر کا برتن کم آنچ پر رکھا ہے جسے چند منٹ بعد بند کرنا تھا۔ جب پتیلی بشمول کھیر کے جل کر سیاہ ہو گئی، دھواں اور بو سارے گھر میں بھر گیا تب پڑوسی نے اطلاعی گھنٹی بجا کر کہا کہ پچھلی کھڑکی سے سیاہ دھواں نکل رہا ہے۔ شانو اپنے کمرے میں بند تھی اور قرۃ العین بھی غسل کے بعد نماز ادا کر کے اپنے تئیں سب کام ختم کر کے کچھ دیر کے لیے لیٹیں تو ان آنکھ لگ گئی تھی۔ باورچی خانے کا حلیہ خاصا بگڑ گیا تھا۔
قرۃ العین یہ سوچ کر کانپ گئیں کہ اگر دودھ کی جگہ تیل یا گھی ہوتا تو!
انہوں نے کھیر بنائی تھی اور گرم پوریاں وہ کھانے سے ذرا پہلے تلنے کا ارادہ کیے تھیں۔ انہیں احساس ہوا کہ یہ بھولنے کی عادت باورچی خانے میں کتنا شدید نقصان کروا سکتی تھی۔ سب کو ہی کچھ کھٹک رہا تھا۔ مثیب انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔
جب ڈاکٹر نے سوال پوچھے اور کچھ سوچ کر قرۃ العین کے ساتھ ساتھ انہوں نے بھی جواب دیے تو خود ہی ششدر رہ گئے کہ یہ ایک دو دن نہیں بلکہ آہستہ آہستہ چند سالوں میں ان کے اندر کئی تبدیلیاں آئی ہیں۔ جس پر کسی نے توجہ ہی نہیں دی خود قرۃ العین نے بھی نہیں۔ چیزوں کے نام اور جان پہچان والوں کے نام جلد ان کے ذہن میں نہیں آتے تھے۔ کتنی ہی سنجیدہ علامتیں تھیں جو ہنسی مذاق کی نذر ہو گئی تھیں۔
ذہنی استعداد اور آگاہی جانچنے والے ٹیسٹ اور دماغ کے اسکین کے بعد ڈاکٹر نے اپنی تشخیص بیان کی تو کوئی بھی فوری ردعمل نہیں دے پایا۔ ڈاکٹر نے مرض مفصل بیان کیا اور قرۃ العین سن ہو گئیں۔ اعظم میر اور مثیب خود کو سنبھالے تھے لیکن 'الزائمر' کی اطلاع ان کے لیے بھی اتنی ہی پریشان کن تھی۔

☆☆☆

کمرے میں پانچ نفوس موجود تھے لیکن سناٹا ایسا تھا کہ سوئی گرنے کی آواز بھی بہ آسانی سنی جا سکتی تھی۔
"کچھ تو ہوتا ہوگا نا دوائیاں، سرجری کوئی تھیراپی؟" شانو نے پہل کی۔
"جب آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ کوئی خطرناک بیماری نہیں ہے تو پھر یوں چپ کیوں ہو گئے ہیں سب؟" اس نے باری باری سب کو دیکھا۔ اس کے اکسانے پر بھی کسی نے منہ نہیں کھولا اور قرۃ العین رونے لگیں۔ سلمان نے چڑ کے بہن کے سر پر چپت لگائی اور ماں کی طرف اشارہ کیا۔
"اس لیے چپ تھے!" اس نے منہ کھولے بنا اپنی بات جتا دی تھی۔
"امی! اس میں رونے والی کوئی بات نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے، اسے کیسے سنبھالا جا سکتا ہے۔"
"اور نہیں تو کیا، ہم سب ساتھ ہیں نا مل جل کر اسے آسان بنا لیں گے۔" اعظم نے بیوی کا کاندھا تھپتھپا کر حوصلہ دیا۔
"کیسے کوئی بات نہیں ہے۔ میں کچھ دنوں میں سب بھول جاؤں گی، تم سب کے نام اور رشتے بھی، مجھ سے اپنے کام بھی مشکل سے ہوں گے، میری سوچنے سمجھنے فیصلہ کرنے کی صلاحیت ختم ہو جائے گی،

مجھے اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا اور۔" آگے ان سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

"یہ سب مشکل نہیں ہے امی۔" اس نے رسان سے کہا۔

سب کا متفقہ فیصلہ اور پہلا اقدام قرۃ العین کو باورچی خانے کے کاموں سے چھٹی دینا تھا۔

گھر کے کام کے لیے آنے والی ملازمہ نے ایک پکانے والی خاتون کا انتظام کر دیا تھا جو صبح آ کر ان سب کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا بنا کر چلی جاتی پھر شام میں آ کر رات کا کھانا تیار کرتی تھی۔ قرۃ العین نے سب کو سختی سے منع کیا تھا کہ ان کی بیماری یا حالت کے بارے میں کسی سے کچھ نہ کہا جائے۔ شانو کا زیادہ وقت پڑھائی میں گزرتا تھا لیکن اب اسے چائے بنانے تو کبھی کھانا گرم کرنے کے لیے باورچی خانے کے چکر لگانے پڑتے۔ قرۃ العین کے لیے اپنے ہی گھر میں یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا بھی مشکل تھا۔ وہ خود حد درجہ محتاط ہو گئی تھیں۔

ذہن میں بار بار اپنے پیاروں کو یاد کرنے کی مشق کرتیں کہ وہ اس طرح کسی کو بھولے نہیں۔

باورچی خانے والے حادثے سے وہ خود بھی حد درجہ سہمی ہوئی تھیں۔ نہیں چاہتی تھیں کہ ایسا کچھ دوبارہ ہو۔ سارے گھر پر ایک عجیب سی سوگواری چھائی تھی۔ اعظم میر ہر ہفتے گھر آنے لگے تھے۔ وہ بیوی کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کے متمنی تھے۔ جتنا بچا وقت تھا وہ اسے یادگار بنانا چاہتے تھے، اسے بھرپور طریقے سے جینا چاہتے تھے۔ ان دونوں کے تو بڑے بڑے منصوبے تھے کہ ان کی سبکدوشی کے بعد انہیں سارا ملک اور پھر دنیا گھومنے جانا تھا۔ قرۃ العین جو دن میں ایک بار تو قریبی بازار جاتی تھیں اب گھر سے باہر ہی نہیں نکلتیں۔ اعظم میر گھر آتے تو رات انہیں چہل قدمی کو لے جاتے۔

بخار ہو، سر درد یا کوئی اور جسمانی تکلیف تو انسان کو بستر سے لگے رہنا برا نہیں لگتا۔ ایسے میں گھر والوں کا خیال رکھنا، فکر کرنا بھی طمانیت دیتا ہے لیکن یہاں کوئی جسمانی تکلیف نہ تھی، کوئی ذمہ داری بھی نہیں رہی تھی۔ وہ جو چند دن پہلے تک گھر کی مالکن تھیں، اپنے گھر کا سارا کاروبار سنبھال رہی تھیں، چھوٹی بڑی ہر بات اور چیز کا خیال رکھتی تھیں اب بالکل فارغ تھیں۔ انہیں اپنا آپ ناکارہ لگنے لگا تھا۔ اب وہ باتیں یاد نہ آنے پر جھنجھلا جاتی تھیں، انہیں اس بات پر اب غصہ آنے لگا تھا۔ جسے پہلے عام سی بھلکڑ طبیعت سمجھ کر اہمیت نہیں دی تھی، اب وہ سب باتیں ان پر منفی طریقے سے اثر انداز ہو رہی تھیں۔ اب اکثر وہ کبھی رونے لگتیں تو کبھی بے انتہا حساس ہو جاتیں، غصہ کرنے لگتیں۔ ان کا ذہن قبول کرنے کو تیار نہیں تھا کہ ان جیسی مضبوط عورت کچھ دن بعد اس قدر محتاج ہو جائے گی کہ اپنے بارے میں بھی سب بھول جائے گی۔

ملازمہ کے ہاتھوں کا کھانا وہ سب زہر مار کر رہے تھے۔ سلمان نے تو باہر ہی کھانا شروع کر دیا تھا۔ چاچی ملنے آتیں تو وہ بھی کرید کر گھر میں ہوئی تبدیلیوں کی وجہ پوچھتیں۔ سب کے پاس جواب میں باورچی خانے والا حادثہ ہی تھا اور وہ سب بچوں پر ڈال دیتیں کہ انہوں نے معمولی بات پر زبردستی ماں سے اس کا کچن چھین لیا ہے۔ نانی ملنے آئیں تو قرۃ العین ماں کے آگے ڈھے گئیں۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا، سارا گھر کیسے الٹا ہوا پڑا ہے، لگتا ہے کئی دن سے جالے بھی نہیں اتارے تم نے۔" وہ بیٹی کی نفاست پسندی سے واقف تھیں اس لیے حیرت اور سوال لازم تھا۔

"میں ٹھیک کہاں ہوں اماں! میں بیمار ہوں۔ میں آہستہ آہستہ سب بھول جاؤں گی، میں ایک جیتی جاگتی لاش ہو جاؤں گی۔ سب کے لیے، بوجھ، کسی کو پہچاننے کے قابل نہیں رہوں گی نہ کوئی جسمانی دماغی کام ہوگا مجھ سے۔" وہ زار و قطار رو رہی تھیں۔

"ہیں!" نانی حواس باختہ سی بیٹی کو روتے اور عجیب سی باتیں کرتے دیکھ رہی تھیں۔

"کیا کہہ رہی ہو قرۃ العین! پہلے رونا بند کرو۔" پھر انہوں نے انگشت بدنداں بیٹی کی بات سنی۔

"یہ نسیان موا تو کسی کسی کو ساٹھ کے بعد ہوتا تھا، تمہیں کس لیے آ لگا؟ ہمارے خاندان میں تو دور دور ایسا کوئی ہوا نہیں، سب اللہ کے کرم سے آخری عمر تک ہوش حواس میں ہر بات اور یاد سے باخبر گزرے ہیں۔"

"میری ہی قسمت۔" انہیں خراب کہنا تھا لیکن لفظ نہ ذہن میں آیا نہ زبان پر۔

ہے اماں۔" انہوں نے یونہی جملہ مکمل کر لیا۔

نانی نے جب ملازمہ کے ہاتھ کا کھانا اور شانو کی بنائی چائے پی تو ان سب کی ایک مشکل آسان کر دی۔

"دیبا پکاتی اچھا ہے، میں اسے یہاں بھیج دیتی ہوں۔ وہ کچن سنبھالنے کے علاوہ تمہارے ہاتھ کے نیچے رہے گی۔"

ملازماؤں کے بجائے دیبا ان سب کی زیادہ فرماں بردار ملازمہ ثابت ہو سکتی تھی۔ وہ مان گئیں۔

اگلے دن ماموں دفتر جاتے ہوئے دیبا کو چھوڑ گئے۔ دیبا اپنا چھوٹا سا بیگ اٹھائے ان کے سامنے کھڑی تھی۔

"صفائی اور برتن کے لیے۔" انہیں ملازمہ کا نام یاد نہیں آیا۔ حالاں کہ گھر میں سب اسے نام سے ہی بلاتے تھے۔

"ایک ماسی آتی ہے۔ تمہیں پکانا ہے اور ماسی سے ٹھیک طرح کام لینا ہے۔ باقی باتیں تمہیں منیب سمجھا دے گا۔"

آخر انہوں نے 'ماسی' سے کام چلا لیا۔ اکلوتی پھپو کا رویہ بھی ان کے ساتھ روکھا اور لیا دیا سا ہی ہوتا تھا پھر بھی دادی، تایا تائی اور چاچا چاچی اور ان کی اولاد سے بہتر تھا۔ سال میں دوبارہ پھوپھی کی طرف سے ملنے والے کپڑے جوتے معیاری اور اچھے ہوتے تھے۔ وہ ہر عید پر اسے عیدی بھی دیتی تھیں لیکن بے تکلفی یا بات چیت نہیں تھی۔

منیب کو دیبا کی موجودگی اچھی نہیں لگی تھی لیکن رات میز دیکھ کر ہی طبیعت خوش ہو گئی۔ بڑے دن بعد روٹی، چاول اور ایک سالن یا سبزی کی جگہ اہتمام سے کھانا چنا گیا تھا اور چکھنے کے بعد اسے بس ذائقہ یاد رہا دیا نہیں۔ سب نے ہی اس دن بڑے وقت بعد سیر ہو کر کھایا تھا۔

بیگ باورچی خانے میں ایک طرف رکھ کے وہ سارا دن کام میں مصروف رہی تھی۔ اس نے ملازمہ کے لیے برتن چھوڑنے کے بجائے خود ہی دھو لیے تھے۔ سب اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ کسی نے اسے نہیں بتایا تھا اسے کہاں سونا ہے۔ اس کے لیے باورچی خانے کے علاوہ کوئی اور کونا ہے بھی یا نہیں۔

"پھپو نے کہا تھا، منیب بھائی سب بتا دیں گے۔" وہ اتنی تھکی تھی کہ فرش پر بیٹھ کر پیچھے کیبنٹ سے پیٹھ ٹکا کر آنکھ بند کر لیں۔

"انہوں نے تو کچھ کہا ہی نہیں۔ اگر مجھے یہیں سونا ہے تو بستر۔" اس نے آنکھیں کھول کر جائزہ لیا۔ وہ ایک طرف کچھ بچھا کر سو سکتی تھی لیکن بچھاتی کیا۔ اپنا دوپٹا یا کوئی جوڑا۔ اس نے چھچھاتے فرش پر ہاتھ پھیرا جو چکنا اور سرد تھا۔

"اس پر کچھ بھی نہیں نکلے گا۔" تب ہی اس کا فون بجنے لگا۔

"السلام علیکم امی۔"

"سب ٹھیک ہے بیٹا! وہاں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی ناں؟"

"ہاں امی! سب ٹھیک ہے۔" ماں کی محبت ہی ایسی تھیں کہ ساری سچائی جانتے ہوئے بھی وہ یہ سوال پوچھے بنا نہیں رہ سکتی تھیں۔

"میں بس سونے جا رہی تھی۔"

"اچھا اچھا۔" انہیں خوشی ہوئی ورنہ وہاں تو باورچی خانہ سمیٹتے ہوئے بارہ بج جاتے تھے۔

"کمرے میں ہو یا کہاں ہو؟"

"کمرے میں ہوں امی۔" ہم سب سے زیادہ جھوٹ ان ہی سے کہتے ہیں جنہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔

"اچھا سو جاؤ بیٹا۔"

"آپ بھی جلدی سو جائیے گا۔"

"ہاں ہاں اللہ حافظ۔" انہوں نے فون بند کر دیا۔

اس نے پھر سر پیچھے ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔
اب امی وہاں اکیلی رہ گئی تھیں۔ دونوں مل کر کام نپٹاتی تھیں تو آسانی تھی لیکن اب سارا بوجھ عابدہ پر آن پڑا تھا۔

مثیب کو ایک دم قدم روکنے پڑے۔ وہ دروازے سے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جب وہ کاؤنٹر کے پاس آیا تو وہ نظر آئی۔

وہ دیوار سے لگے کاؤنٹر کے دروازے پر سر ٹکائے سو رہی تھی۔ اس نے کاٹن کا دوپٹا چادر کی طرح خود پر ڈال رکھا تھا۔ اس کا بیگ بھی قریب ہی تھا۔

اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کسی نے اس کا انتظام کیا ہے نہ اسے کچھ بتایا ہے۔ گھر کا کوئی سربراہ ہی نہیں رہا تھا۔ سلمان پہلے سے ہی گھر کے معاملات میں دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ شانو پر پڑھائی کا بھوت سوار تھا۔ آنے کے بعد کھانے کے لیے ہی کمرے سے نکلتی تھی۔ وہ اسے آواز دینے یا اٹھانے کے بجائے جس کام سے آیا تھا وہ کرنے لگا۔ اس کی نیند کچی تھی جو وہ لائٹر کی آواز پر ہی جاگ گئی اور اسے دیکھ کر ہڑبڑا کر کھڑی ہوئی۔ اس نے دوپٹا بیگ پر ڈالا اور بیگ پیر سے ایک طرف کھسکایا۔ ایسی حرکتوں پر ڈانٹ ہی پڑا کرتی تھی۔

''میں بنا دیتی ہوں۔'' اس نے فریج سے دودھ کی پتیلی نکال کر سلیب پر رکھی تو دیبا نے کہا۔

''کوریڈور کے لیفٹ میں براؤن دروازے والا کمرہ خالی ہے۔ اپنا سامان وہاں رکھ دو۔'' اس نے اس کی بات ان سنی کر کے شکر اور پتی کے ڈبے نکالتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ دیر اگلے حکم کی منتظر رہی لیکن وہ یوں چائے بنانے لگا جیسے وہاں تنہا ہو۔ دیبا نے جھک کر بیگ اور اس پر پڑا دوپٹا اٹھایا۔

مثیب نے اوپر والا کیبنٹ کھول کر کوکیز کا ڈبہ اٹھایا اور اس میں سے دو کوکیز نکال کر چھوٹی طشتری میں رکھ کر ڈبہ واپس رکھ دیا۔ وہ کچھ دیر اس کے کچھ کہنے کی منتظر رہی پھر اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

اس کا بتایا کمرہ رقبے کے اعتبار سے واقعی کمرہ تھا اسٹور نہیں لیکن وہاں کافی کاٹھ کباڑ بھرا تھا۔ پرانی کرسیاں ایک میز کے اوپر رکھی تھی۔ ایک طرف پرانی واشنگ مشین تھی اور اس کے اوپر دو بڑی بڑی گٹھڑیاں تھیں۔ وہاں پلنگ تھا اور اس پر بستر بھی بچھا تھا۔ اس نے بیگ ایک طرف رکھا اور بستر جھٹک کر لیٹ گئی۔

''آج میں جلدی سو رہی ہوں تو امی کو دیر ہو گی۔'' وادیٔ نوم میں گم ہونے سے پہلے اسے آخری خیال آیا تھا۔

☆☆☆

قرۃ العین کی پہلے دن والی بات کے علاوہ اسے کسی نے کوئی ہدایت دی تھی نہ اپنے کھانے پینے کے اوقات بتائے تھے۔ اس نے چند دن کے مشاہدے کے بعد خود ہی اندازہ لگا کر اس کے مطابق اپنا معمول بنا لیا تھا۔ قرۃ العین کی بیماری اور حالت اب راز نہیں رہی تھی۔ رشتے دار اور جان پہچان والے سن گن لینے کسی نہ کسی بہانے آتے رہتے۔ وہ دلاسا بھی اس انداز میں دیتے تھے کہ بیمار انسان کا حوصلہ مزید ٹوٹ جائے۔

کھانے میں کیا بنانا ہے کبھی قرۃ العین خود اسے بتا دیتیں۔ کبھی وہ خود ان سے پوچھ لیتی۔ اس کی تائی چاچی اور دادی ملنے آئیں تو عابدہ بھی ساتھ آئی تھیں لیکن یہاں بھی وہ مہمانوں کی طرح ڈرائنگ روم میں نہیں بلکہ اس کے ساتھ باورچی خانے میں اس کے ساتھ تھیں۔ ان کی حیثیت کا جو تعین شوہر کی وفات کے بعد طے ہوا تھا اس میں تبدیلی ناممکن تھی۔

اس نے انہیں اپنا کمرہ بھی دکھایا جس کی شکل اس نے اول دن کے مقابلے میں کافی سدھار لی تھی۔ عابدہ بیٹی کے لیے خوش تھیں۔

اسے فجر کے وقت جاگنے کی عادت تھی۔ یہاں بھی وہ نماز کے بعد کام پر لگ جاتی۔ سب سے پہلے سلمان جاتا تھا۔ وہ گھر والوں کے جاگنے سے پہلے ناشتے کے لیے موجود ہوتا۔ ناشتہ بھی آملیٹ پراٹھے کے ساتھ یا چائے پراٹھا۔ پھر شانو اور قرۃ العین ایک ساتھ ناشتہ کرتیں۔ مثیب کبھی ان کے ساتھ ہوتا اور

کبھی ان کے بعد آتا۔

رات کا کھانا سب ایک ساتھ میں کھاتے تھے سوائے مثیب کے۔ وہ دیر رات گھر آتا تھا اور اس کے انتظار میں وہ باورچی خانے میں اونگھتی رہتی۔ دوپہر کے وقت شانو اور قرۃ العین ہوتیں اور جب اعظم میر آئے ہوتے تو وہ بھی۔

چھٹی والے دن سارا گھر تینوں وقت ایک ساتھ میز پر موجود ہوتا تھا۔

مثیب اور سلمان میں ڈیڑھ سال کا فرق تھا جب کہ شانو سلمان سے دس سال چھوٹی تھی۔ ان سب میں مثیب اور اعظم میر ہی تھے جو کھانے کے اوقات کے علاوہ بھی باورچی خانے میں آجاتے تھے۔ مثیب اپنے لیے چائے، کافی خود بنا لیتا تھا۔ وہ باقیوں کی طرح اسے بھی کوئی کام نہیں کہتا تھا۔

قرۃ العین، غائب دماغی اور وقتاً فوقتاً مخصوص لفظ، نام اور تاریخیں بھولنے کی عادت کے علاوہ وہ عام صحت مند انسان دکھائی دیتی تھیں۔ وہ اپنی دیورانی اور بھابھیوں کے کریدتے سوال اور ہمدردیوں کو بھی تحمل سے سنبھال رہی تھیں۔ ان کے سامنے وہ ایسے ہی پیش آتیں جیسے کوئی بڑی بات نہ ہو۔ گھر میں ملازمین کی نگرانی کے لیے اپنے طور پر کڑی نظر رکھی تھی کہ کوئی ان کی غفلت کا فائدہ نہ اٹھا سکے لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی ذہنی الجھن اور غور و فکر کرنے کی صلاحیت کمزور پڑ رہی تھی۔

وہ گھر کا ایک کونہ پکڑ کر بیٹھنا نہیں چاہتی تھیں لیکن گزشتہ حادثوں نے خوف زدہ کر دیا تھا۔ اس لیے اب وہ محتاط تھیں۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اپنی کیفیت اور بیماری کے لیے ان کی قبولیت کا درجہ بڑھ رہا تھا۔ بے یقینی، دکھ، اللہ سے شکایت اور میں ہی کیوں اور یہ ہی کیوں سے آگے بڑھ کر وہ اپنے اور گھر والوں کے لیے آسانیوں کا سوچنے لگی تھیں۔

جب تک ذہن اور یادداشت ساتھ تھی، سوچنا سمجھنا ممکن تھا، وہ اسے ماتم اور افسردگی کے سپرد نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ کمرہ بند کر کے سب سے چھپ کر بیٹھنے اور رونے کے بعد وہ نئے عزم کے ساتھ اپنی بیماری کے ساتھ جینے کے لیے تیار ہوگئی تھیں۔

آج وہ بڑے دن بعد شانو کے سر میں تیل کی مالش کر رہی تھیں۔ شانو کتاب ہاتھ میں لیے پڑھ رہی تھی۔ کچھ دن پہلے کی بات ہوتی تو وہ اس 'وقت بربادی' کے لیے کبھی ان کے آگے نہ بیٹھتی مگر اب اسے احساس تھا وقت سب کا قیمتی ہے۔

قرۃ العین نے جب چوٹی گوندھنا شروع کی تو ٹھہر گئیں۔ بالوں کے تین حصوں کو کیسے چوٹی کی شکل دیتے ہیں، انہیں یاد نہیں آرہا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ ہاتھ روکے رہیں۔ شانو کو احساس ہوا تو وہ جو اونچی آواز میں رٹے لگا رہی تھی، اس کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے بند ہوگئی۔

''میں کچر لگالوں گی امی۔'' اس نے دبی سی آواز میں کہا اور خاموش آنسو بہاتی قرۃ العین کی آواز اونچی ہوگئی۔

دیبا باورچی خانے سے دوڑتی باہر آئی اور دور ہی رک گئی۔

''امی!'' شانو ماں کی سمت مڑی۔

''میں یہ صورت نہیں پہچان سکوں گی۔'' انہوں نے تیل سے چپچپے ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھاما۔

''لیکن شانو۔'' آنسو روکتے ہوئے انہوں لہجہ مضبوط کیا۔ ''تم ہمیشہ یاد رکھنا، تم میری پیاری بیٹی ہو، مجھے بہت عزیز تمہاری ماں نے بہت پیار کیا ہے تمہیں، ہمیشہ کرتی رہے گی، کوئی بیماری اس سچ کو نہیں بدل سکتی میری جان۔'' انہوں نے ایک ہاتھ اس کے سر پر پھیرا۔

''امی!'' شانو بھی رونے لگی۔ سلمان اور مثیب ساتھ اندر داخل ہوئے تھے۔ باہر آوازیں سن کر انہوں نے دوڑ لگائی تھی۔

''کیا ہوا؟'' مثیب قرۃ العین کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔ انہوں نے شانو کا چہرہ چھوڑا اور اسے حسرت سے دیکھنے لگیں۔

''تم بھی یاد رکھنا۔'' انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دوسرا ہاتھ اٹھایا۔

''سلمان۔'' آگے آکر سلمان نے ان کے ہاتھ تھامے اور ان کے دوسری طرف بیٹھ گیا۔

''میں سب بھول جاؤں لیکن تم یاد رکھنا، میں ہمیشہ تم سے محبت کرتی رہوں گی، میری ممتا میری دعائیں تب بھی تمہارے ساتھ ہوں گی، مجھ سے تو تصور بھی نہیں ہوتا کہ میری آنکھوں میں تمہارے لیے اجنبیت اترے گی۔'' وہ رک گئیں۔

''امی!'' کافی لمحے ان کے بولنے کا انتظار ختم نہ ہوا تو منیب نے پکارا۔

''کیا کہہ رہی تھی میں۔'' وہ الجھی سی اسے دیکھنے لگیں۔ منیب کا دل جیسے کسی ٹرک کے نیچے کچلا گیا۔ شانو نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی سسکیوں کو دبایا۔ سلمان کی گرفت ماں کے ہاتھ پر مضبوط ہو گئی۔ اس پل وہ سب وقت کی ریت کے مٹھی سے پھسلنے کے تجربے سے گزر رہے تھے۔ دیبا بھی سیاکت سی اپنے ذہن میں سامنے کے منظر کا حصہ بن گئی تھی۔

''آپ شانو سے کمرے میں جا کر پڑھنے کا کہہ رہی تھیں۔'' منیب نے آواز پر قابو پا کر کہا۔

''جا رہی ہوں میں۔'' قرۃ العین اس کا چہرہ دیکھیں اس سے پہلے ہی وہ اپنی نوٹس اٹھا کر اندر چلی گئی۔

''مجھے بھوک لگی ہے، کھانا بن گیا؟'' انہوں نے سامنے کھڑی دیبا سے پوچھا۔ سلمان اور منیب بھی اسے دیکھنے لگے۔

''جج۔ ابھی نہیں بنا۔ کک۔ کچھ دیر لگے گی۔'' وہ ہکلائی۔ ذرا دیر پہلے انہوں نے کہا تھا آٹھ بجے پکانا شروع کرنا تا کہ سب ایک ساتھ کھانے بیٹھیں تو کھانا گرم ہو۔

''بہت غیر ذمہ دار ہو، کیسے گھر سنبھالو گی۔ جاؤ جلدی کرو۔ یہ دونوں بھی بھوکے ہوں گے۔'' ان کا لہجہ تیز اور حاکمانہ تھا۔

''جی۔'' وہ تیزی سے اندر چلی گئی۔

دادی اور ممانی کو کھانے کا ضیاع سخت ناپسند تھا پھر وہاں کوئی ایک وقت کے بچے کھانے کو دوسرے وقت ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا۔ یہاں بھی چند دن کے بعد اسے میزان سمجھ میں آ گیا تھا اور وہ کھانا اتنی مقدار میں ہی بناتی تھی کہ بچے نہیں۔

اس نے پیاز ٹماٹر نکالے اور ٹماٹر دھو کر پلٹی تھی کہ منیب اندر آیا۔

''ایسے وقت میں وہی جواب دیا کرو جس کی امی توقع کر رہی ہوں۔''

اسے بات سمجھ میں نہیں آئی اور یہ ناسمجھی اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ اس کی چپ پر منیب نے اسے دیکھا۔

''میرا مطلب ہے، وہ بات نہ کیا کرو جس سے ان کا موڈ بگڑے یا ٹینشن ہو جیسے ابھی کہہ دیا ہوتا کہ ہاں کھانا بن گیا ہے۔''

''اور۔ اگر وہ۔ ابھی مانگ لیتیں تو؟'' اسی خوف نے اس سے سچ کہلوایا تھا۔

''دوپہر کا دے دیتیں۔''

''دوپہر کا کچھ بچا ہی نہیں ہے۔'' اس کا انداز اقبال جرم کرنے سا تھا۔ منیب نے بس ایک نظر اس پر ڈالی اور چپ ہو گیا۔

☆☆☆

انہیں بھی بیشتر عورتوں کی طرح گھر کے آرائشی سامان اور باورچی خانے کے لیے خوبصورت اور یکتا برتن اور کٹلری اکٹھا کرنے کا شوق تھا۔ اب جب بھی وہ باورچی خانے میں کیبنٹ کھول کر اپنے برتن دیکھتیں افسردہ ہو جاتی تھیں۔ ان کے لیے یہ خیال بڑا جان لیوا تھا کہ جب انہیں یاد نہیں رہے گا تو ان کا یہ خزانہ کس حال میں ہوگا۔ وہ ان چیزوں کے گم ہونے اور ٹوٹنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

اس وقت بھی وہ سامنے رکھی ترکش ڈیزائن کی پلیٹ پر احتیاط اور پیار سے ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ اندر آتی دیبا انہیں دیکھ کر رک گئی۔

''ادھر آؤ۔'' انہوں نے اسے دیکھ کر کہا اور میز سے پلیٹ اٹھا کر کیبنٹ کے پاس آئیں۔

''یہاں جو برتن ہیں، یہ کسی خاص مہمان اور دعوت پر ہی نکالا کرو اور انہیں فوراً دھو کر خشک کر کے

رکھ دیا کرو۔ یہ سب میں نے بڑے جتن اور محنت سے جمع کیے ہیں، کہاں کہاں سے نہیں منگوائے تھے۔" انہوں نے پلیٹ احتیاط سے اندر رکھی۔

"جب بھی نکالو، مکمل سیٹ ایک ساتھ نکالنا یہ نہیں کہ پلیٹیں ایک ڈیزائن اور باول دوسرے کلر اور ڈیزائن والے، ادھر جو گولڈن کٹلری ہے، اسے دھونے کے لیے عام کچن بار یا لیکوڈ یوز نہیں کرتے۔" وہ کہتے ہوئے ایک دم رک گئیں۔

انہیں احساس ہوا کہ وہ کن چیزوں کے بارے میں فکرمند ہو رہی ہیں۔ جب کہ وہ مستقبل قریب میں خود فراموشی تک پہنچ جائیں گی۔ ان کا انداز ایک دم ڈھیلا ہو گیا۔ انہوں نے کیبنٹ کا پٹ بند کیا اور چلی گئیں۔ دریا ششدر سی وہیں کھڑی تھی۔

قرۃ العین نے کمرے میں پہنچ کر آنکھیں رگڑیں۔ وہ کیا کرتیں انہیں اپنی گرہستی کی معمولی اور چھوٹی سی بات کی بھی فکر تھی۔ انہوں نے یہ سنسار چٹکیوں میں نہیں سجایا بنایا تھا۔ گھر کے مکینوں کے ساتھ انہیں ان در و دیوار اور ان میں موجود ہر چیز سے پیار تھا۔ انہیں اپنے بعد انسانوں کے ساتھ ساتھ ان کی بھی فکر تھی لیکن اس پل انہیں ان بے جان چیزوں کے لیے اپنی فکر نادم کر رہی تھی کہ جب وہ شوہر اور بچوں کو نہیں پہچان سکیں گی تو یہ چیزیں کیا معنی رکھتی ہیں۔

وہ نڈھال سی پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ آنسو خاموشی سے گالوں پر پھسل رہے تھے۔ اپنی بے بسی قبول کرنا آسان نہیں تھا۔ ایسے موقعوں پر بھی تو وہ چپ چاپ روتی رہتیں اور کبھی ان کا دل کرتا خوب چیخیں چلائیں، سب تہس نہس کر دیں۔

☆☆☆

"اعظم!" انہوں نے دھیرے سے پکارا۔ وہ انہیں اکیلے میں ہی نام سے بلاتی تھیں۔

"ہمم۔" انہوں نے ان کی سمت کروٹ لی۔

"آپ کو پتا ہے، مجھے سب سے زیادہ ڈر کس بات کا ہے؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"کس بات کا؟"

"میں بھلے سب بھول جاؤں، کسی کو پہچانوں نہ لیکن اگر میں نے کسی پرانی، کسی آدھی ادھوری یاد یا بات سے آپ سب کا دل دکھا دیا تو؟" وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"میں نے سنا اور پڑھا ہے کہ ایسے مریضوں کو کبھی کبھی کچھ بھی یاد آجاتا کہ وہ ان پریڈیکٹیبل ہو جاتے ہیں، کبھی کبھی اپنی فیملی کے لیے شرمندگی کا باعث بھی۔"

"ایک بات کا یقین رکھو ہم میں سے کوئی بھی کبھی تمہاری وجہ سے شرمندہ نہیں ہو سکتا چاہے کچھ ہو جائے اس لیے ایسا نہیں ہوگا۔ کیوں کہ ہم سب جانتے ہیں وہ آدھی ادھوری بات اور یاد ہوگی اور پھر ماضی میں تو ایسا بہت کچھ ہوا ہوتا ہے جو آگے اہمیت کھو دیتا ہے۔ ویسے تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟"

"میں اس کے بارے میں سرچ کر رہی تھی تو۔"

"تم یہ سب نہ کرو پلیز۔" انہوں لجاجت سے کہا۔ "اس طرح تم پریشان اور فکرمند ہوگی جو اچھی بات نہیں۔ ہم سب ہیں ناں۔ تمہیں خود سب علم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس جو وقت ہے سب کے ساتھ اسے انجوائے کرو اور آگے کیا ہوگا نہ سوچو۔"

"کیسے نہ سوچوں؟" وہ رونے لگیں۔ "اس کے علاوہ میرے دماغ میں اور کوئی بات ہی نہیں آتی۔" انہیں اس بارے میں سوچنے سے روکنا بھی زیادتی تھی۔

"تمہاری کسی بات سے ہمیں دکھ پہنچے گا یہ خیال تو ذہن سے نکال سکتی ہو ناں؟ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ اگر بچوں کے سامنے تم نے خدانخواستہ ایسا کچھ کہہ بھی دیا تو میرا وعدہ ہے میں سنبھال لوں گا، انہیں دکھی نہیں ہونے دوں گا میں ہر اچھی بری سچویشن ہینڈل کر سکتا ہوں، اتنا تو یقین ہے رکھو۔"

"اور آپ؟"

"مجھے تمہاری کس بات یا انکشاف سے تکلیف ہوگی بھلا؟ ہم تو کبھی روایتی میاں بیوی نہیں رہے۔" وہ مسکرائے۔

"اتنے برسوں کی رفاقت کے بعد تمہیں کم از کم

میرے لیے قطعی پریشان اور فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔"

یہ سچ تھا۔ بچپن، لڑکپن اور جوانی ایک ہی محلے میں گزارنے کے بعد ان کی 'ارینج میرج' بہت خاص تھی۔ قرۃ العین نے ان کے بازو پر سر ٹکا دیا۔

"یہ ہی ایک بات مجھے پاگل نہیں ہونے دیتی کہ میرے ساتھ آپ ہیں، میرے بعد آپ ہیں۔"

"بعد اور پہلے نہیں ہم ہر حال میں ساتھ ہیں بیٹی!" انہوں نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"اور تم اتنا آگے کا کیوں سوچ رہی ہو، یہ تبدیلیاں بہت سلو ہوتی ہیں ابھی بہت وقت ہے ہمارے پاس۔"

لیکن ان کا یہ خیال غلط تھا۔ قرۃ العین کی دماغی صحت بڑی تیزی سے روبہ زوال تھی۔ ان کی بیماری اور ذہنی انحطاط کی رفتار تیز تھی۔

☆☆☆

اول دن تو اس کے ہاتھ پیر پھول گئے جب اس نے باورچی خانے میں قرۃ العین کو دیکھا۔ ہر سو چائے کی خوشبو پھیلی تھی۔ ایک طرف دودھ کا برتن ڈھکا تھا، سلیب پر رکھی کڑھائی بتا رہی تھی کہ کھانا بھی بنا چکی ہیں۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا کھیرا مکمل کاٹ لینے کے بعد سلاد کی پلیٹ فریج میں رکھی اور سلیب صاف کرنے لگیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ آگے بڑھ کر معافی مانگے یا ان کے ہاتھ سے گیلا پونچھا لے لے۔ وہ سانس روکے کھڑی تھی کہ وہ ہاتھ دھو کر پلٹیں۔

"میں بچوں کو اٹھاتی ہوں تب تک تم روٹی بنا کر ناشتہ لگا دو۔" وہ مصروف انداز میں کہتی جانے لگی تھیں کہ اس کے پاس پہنچ کر رک گئیں۔

"تینوں کے لفن بھی ریڈی کر دینا۔ سلاد فریج میں ہے، سلمان بھنڈی نہیں کھاتا، اس کے لیے رات کا سالن رکھا تھا فریج میں۔" اس نے سر ہلایا اور ان کے باہر نکلتے ہی رکا سانس بحال کیا۔

وہ ماضی کا کوئی دن جی رہی تھیں جب ان کے بچے اسکول جاتے تھے۔ انہیں اب رات کو نیند بھی کم ہی آتی تھی اس لیے شاید وہ اتنی جلدی جاگ کر باورچی خانے میں مصروف ہو گئی تھیں۔ ابھی گھر میں کوئی اور جاگا نہیں تھا۔ اچانک اسے خیال آیا، کہیں وہ بچوں کو جگانے نہ گئی ہوں، وہ فوراً باہر آئی۔ سب کے کمروں کے دروازے بند تھے اور کہیں سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔

"شاید کمرے میں جا کر سو گئی ہیں، اتنا کام جو کر لیا ہے۔" اس نے خود ہی اندازہ لگا لیا۔

وہ آٹا گوندھتے اور پھر پراٹھے بناتے ہوئے منتظر رہی کہ وہ دوبارہ آئیں گی لیکن وہ نہیں آئیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنے لیے چائے نکالی اور پہلا گھونٹ لیتے ہی تھم گئی۔ چائے میں چینی نہیں تھی۔ جیسے تیسے وہ گھونٹ معدے میں منتقل کرتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے کڑھائی کا ڈھکن اٹھایا۔ سبزی کے نام پر کچھ تیل کی موجودگی کے ثبوت کے ساتھ وہاں پیاز اور بھنڈی تھی۔

اس نے چائے اور بھنڈی کو 'درست' کیا اور پھر چائے کا کپ لیے اپنی مخصوص جگہ بیٹھ گئی۔ کیبنٹ سے ٹیک کر آزادی سے سامنے پیر لمبے کرنے کی عیاشی اسے اب پسند آنے لگی تھی۔ اسے اچھا لگتا تھا کہ جہاں وہ کام کرتی ہے، اس کمرے میں اسے مکمل آزادی میسر ہے۔ دادی کے گھر کی طرح ان ماں بیٹی پر نظر رکھنے کو کوئی نہ کوئی آنہیں دھمکتا۔ یہاں چینی اور گھی کے ڈبے دیکھ کر تنبیہ کی جاتی تھی۔ یہاں اس کے لیے ستانے کا وقت اور جگہ تھی۔

"امی کو آج پھر اکیلے سب کا ناشتہ بنانا پڑے گا۔" چائے کے دو گھونٹ بھرنے تک ہی اس کا فرحت بخش احساس قائم رہ پایا تھا۔ اس گھر میں آنے کے بعد جہاں وہ اپنی موجودہ صورت حال میں ذرا سا خوش ہوتی فوراً ہی ماں کا خیال اسے شرمندہ و رنجیدہ کر دیتا۔ اسے یہاں مل رہی رعایت اور آزادی نادم کرنے لگتی کہ عابدہ تو اب بھی اسی جگہ تھیں۔ تیسرے گھونٹ کے ساتھ آنسو گال پر لڑھک آیا۔

وہ دروازے سے دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اب

بھی جب وہ آئی لینڈ کاؤنٹر کے آگے آیا تو اس پر نظر پڑی۔ وہ آہٹ پر ہی کھڑی ہوگئی تھی۔ اس نے گھبرا کے دیوار پر ٹنگی گھڑی کو دیکھا کہ کہیں اس سے غلطی تو نہیں ہوگئی لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ منیب آج جلدی اٹھ گیا تھا اور اپنے تئیں وہ خود ہی اپنا ناشتہ بنانے باورچی خانے میں آیا تھا۔ اس کی موجودگی اس کے لیے بھی حیران کن تھی۔ کاؤنٹر اور چولہے پر دھرے برتن دیکھ کر وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"چائے دینا۔" اس نے اپنا کپ رکھ کر چولہا جلایا۔ آج پہلی بار اس نے چائے مانگی تھی ورنہ وہ اس کی موجودگی میں بھی خود ہی بنا لیتا تھا۔

"پہلے تم پی لو۔" اس نے یوں سر ہلایا گویا کہہ رہی ہو پی لی۔

"ٹفن کوئی نہیں لے جاتا، اس لیے اتنی صبح صبح اٹھ کر کھانا بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس کے کہنے کا انداز اگر مختلف ہوتا تو یہ جملہ حساس بندے کی پروا اور مروت ظاہر کرنے والا تھا۔ دیبا بھی اپنی سچائی سے اس قدر باخبر تھی کہ کبھی غلطی سے بھی کوئی بات یا جملہ اسے التفات نہیں لگتا تھا۔

چائے چھانتے ہوئے وہ آج کا واقعہ اس کے گوش گزار کرے یا نہیں اس شش و پنج میں تھی۔ چند پل بعد اس نے چائے کا کپ اور طشتری میں کوکیز میز پر رکھیں۔ منیب کوکیز دیکھ کر چونکا تھا۔

"اسے کیسے علم ہوا؟ شاید امی یا شانو نے کہا ہوگا۔" اپنے قیاس پر اس کا اپنا یقین ہی ڈھل مل تھا۔

"میں کچن میں آئی تو اس سے پہلے ہی پھپھو یہاں موجود تھیں۔ انہوں نے چائے اور سبزی بنا لی تھی، سلاد کاٹ کر فریج میں رکھا ہے اور مجھے سب کے ٹفن کے لیے روٹی بنانے کی ہدایت دے گئی ہیں۔" اس نے کپ واپس رکھ دیا۔ وہ اپنی الجھی سوچ کے ساتھ دیبا کو دیکھے جا رہا تھا۔

"ابھی کہاں ہیں امی؟" خیالات کی یورش کے بیچ اس نے غائب دماغی سے سوال داغا۔

"شاید کمرے میں ہیں۔" وہ اٹھ کر تیزی سے باہر نکلا۔

بنا آہٹ کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ سامنے بستر پر سو رہی تھیں۔ وہ سست قدم اٹھاتا پاس آیا اور ان پر لحاف ڈال کر کنارے بیٹھ گیا۔

عجیب سی بے بسی میں لپٹا دکھ اس کے اندر ٹھہر گیا تھا۔ ہر گزرتی ساعت ان کے درمیان اجنبیت اور فاصلہ پیدا کر رہی تھی۔ وہ پل سوچ کر ہی اس کا سانس رکنے لگتا تھا جب ان کی آنکھوں میں شناسائی کی رمق بھی نہ ہوگی۔

☆☆☆

اس رات کھانے کے بعد جب وہ باورچی خانہ سمیٹ رہی تھی تو ایک بار پھر منیب چلا آیا۔

"اب سے ماچس، لائٹر، نائف جیسی چیزوں کو ایسی جگہ رکھا کرو جہاں وہ امی کو نہ ملیں، گیس ہمیشہ سوئچ آف کروا دو۔" ادھر ادھر نظر گھماتے ہوئے اس نے فریج پر لگے پھلوں کی شکل کے میگنیٹ کوڑے دان میں پھینک دیے۔

"کچن اور کوریڈور کی لائٹس آن ہی رہنے دیا کرو، اس کے علاوہ۔" وہ قرۃ العین کے ڈاکٹر سے مل کر آیا تھا اور اب اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اسے بھی سمجھا رہا تھا۔

قرۃ العین کی نیند کم ہوگئی تھی۔ انہیں رات میں نیند نہیں آتی تھی اگر سو بھی جاتیں تو علی الصبح اٹھ جاتیں۔ سلمان اور شانو کی اپنی مصروفیت تھی اور جب بھی قرۃ العین کے کسی مسئلے پر بات ہوتی تو شانو پریشان ہو کر رونا شروع کر دیتی۔ منیب نے اب اس کے سامنے یہ ذکر چھیڑنا ہی بند کر دیا تھا۔

اس وقت بھی وہ کمرے سے نکل کر لان میں بیٹھی پڑھ رہی تھی کہ اچانک رونے لگی۔

"شانو!" وہ اسی وقت آیا تھا۔

"کیا ہوا، رو کیوں رہی ہو؟"

"بھائی! میں نے کل پورا چیپٹر یاد کیا تھا، ابھی ریوائز کرنے بیٹھی تو لگ رہا ہے، پہلی بار پڑھ رہی ہوں۔ کیا میرا دماغ بھی امی جیسا ہو رہا ہے؟" بات

قہقہہ لگا کر اڑانے والی تھی لیکن وہ بمشکل مسکرا سکا۔
"پاگل!" منیب نے اس نے سر پر چپت لگائی۔
"یہ بہانا نہیں چلے گا، محنت کرو۔ ڈاکٹر ایسے ہی نہیں بن جاتے۔" شانو نے منہ بنایا۔
"پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا، اب ہی ہو رہا ہے میرے ساتھ اور الزائمر میں جینیٹکس اور فیملی ہسٹری بھی تو اہم رول پلے کرتی ہے۔"
"ہماری فیملی میں دور دور تک امی پہلی پیشنٹ ہیں اس لیے جینیٹکس اور فیملی ہسٹری کو اتنی اہمیت دینے اور سوچنے کی ضرورت نہیں۔ پہلے تم نے کبھی توجہ نہیں دی اب سوچ رہی ہو ورنہ پچھلی بار میمورائز کیے آنسرز جلد بھول جاتے ہیں، وہ کچے کئی بار ریوائز کرنے پر ہی ہوتے ہیں۔" اس نے اسے اپنے طور پر مطمئن کر دیا تھا لیکن وہ اکثر اس قسم سے اندیشوں کا اظہار کرنے لگی تھی۔
سب ہی اپنے طور پر گوگل سرچ کر کے اپنی معلومات بڑھانے کے ساتھ ساتھ انجانے اندیشوں اور متوقع تبدیلیوں سے خوف زدہ تھے۔ وہ سب اپنے تئیں خود کو آنے والے وقت کے لیے تیار کر رہے تھے۔

☆☆☆

قرۃ العین اب بھی رات میں یا علی الصبح اٹھ کر باورچی خانے جاتی تھیں۔ منیب اپنے کمرے کا دروازہ کھلا رکھنے لگا تھا۔ اس کا کمرہ باورچی خانے سے قریب تھا۔
اس رات بھی وہ جاگ رہا تھا کہ گرنے کی آواز پر باہر نکلا۔ قرۃ العین باورچی خانے اور ڈرائنگ روم کی درمیانی راہداری کے اختتام پر بنی تین سیڑھیوں کا اندازہ نہیں کر پائیں یا پھر بھول گئی تھیں کہ وہاں سیڑھیاں ہیں۔ پیر غلط پڑا تو توازن بگڑا اور وہ فرش پر آ رہیں۔
کچھ پل بعد ہی اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر دیبا بھی باہر نکلی۔ انہیں زمین پر دیکھ کر وہ ان کی سمت دوڑی۔ اسے دیکھ کر منیب کو حیرت اور اطمینان دونوں نے گھیرا تھا۔ انہوں نے مل کر قرۃ العین کو اٹھایا۔

"کلائی سوج رہی ہے۔" انہیں صوفے پر بٹھانے کے بعد دیبا نے دھیرے سے کہا۔
"بہت درد بھی ہے۔" قرۃ العین کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ انہوں نے چہرہ فرش سے نہ ٹکرائے اس کوشش میں ہاتھ زمین پر ٹیکا تھا۔
"ابھی اسپتال چلتے ہیں امی۔" اس نے قرۃ العین کی کلائی دیکھتے ہوئے کہا۔
"میں پھپھو کی چادر لے آتی ہوں۔" وہ ان کے کمرے کی سمت بڑھ گئی۔
اتنی رات گئے وہ انہیں اسپتال لے گئے۔ شانو یا سلمان کو اٹھانے کے بجائے اس نے دیبا کو ہی ساتھ لے لیا تھا۔ وہاں ایمرجنسی میں ایکس رے کے بعد فریکچر کی تصدیق ہوگئی۔ وہ ان کے ہاتھ پر پلاسٹر لگوا کر گھر آئے تب صبح کے ساڑھے چار ہو رہے تھے۔
"آپ چائے لیں گے؟" وہ دونوں نیم خوابیدہ سی قرۃ العین کو کمرے میں بستر پر سلا کر باہر نکلے تو آگے جا رہا منیب اس کی آواز پر پلٹا۔ اسے اس وقت چائے کی شدید طلب تھی۔ وہ تو جاگ رہا تھا مگر دیبا گرنے کی آواز پر نیند سے اٹھ کر باہر آئی تھی۔ اس کے سلوٹ زدہ کپڑے اور ڈھیلی سی چوٹی سے نکل کر ادھر ادھر بکھرے بال اس کے گواہ تھے تاہم اس وقت وہ نیند غائب تھی جو اسپتال جانے سے پہلے اس کے چہرے پر بکھری تھی۔
"ہمم۔" اس نے کہا اور دیبا سے پہلے باورچی خانے میں داخل ہو گیا۔ وہ پیچھے کرسی پر بیٹھا تھا اور دیبا اس کی موجودگی میں چائے بناتے ہوئے حد درجہ زود حس اور گھبرائی سی تھی۔ منیب کے فون کی بیٹری ڈیڈ ہو گئی تھی، اس لیے وہ ہاتھ باندھے بیٹھا تھا۔
اس کے سامنے چائے کا کپ اور کوکیز کی طشتری رکھ کر وہ جانے لگی تھی کہ منیب بولا۔
"تمہاری چائے؟" یہ قطعی غیر متوقع سوال تھا۔ وہ مضطرب سی کھڑی رہ گئی۔
"تم نے اپنے لیے نہیں بنائی؟" اس نے

سادگی سے پوچھا۔

"بنائی ہے۔" وہ منمنائی۔

"تو بیٹھ کر پی لو۔" اس نے اپنا کپ اٹھایا۔

وہ سست سے قدم اٹھاتی واپس چولھے کے پاس آئی اور کپ میں اپنے لیے چائے نکال کر کپ لیے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ منیب نے کوکیز والی طشتری اس کے آگے کی۔ اسے خواہش تھی یا نہیں اس سے قطع نظر وہ اس پیشکش کو ٹھکرانے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے یہ ہی جتایا گیا تھا اس پر کی جانے والی ہر مہربانی اسے سر جھکا کر قبول کرنی ہے۔ اس نے جھجکتے ہوئے ایک کوکی اٹھائی۔ منیب نے ایک نظر اس پر ڈالی اور تیزی سے چائے کے گھونٹ بھر کے کپ خالی کیا۔

"تھینک یو۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا اور دیبا نے جھٹکے سے حیران آنکھیں اٹھائیں۔ اس میں شکریے کی کیا بات تھی۔ وہ تو اسی لیے یہاں بھیجی گئی تھی۔ منیب نے اس کی بے ساختہ حرکت اور حیرت محسوس کی۔ وہ مزید کچھ کہے بغیر چلا گیا۔ دیبا نے ہاتھ میں پکڑی کوکی کو دیکھا پھر منیب کے خالی کپ کو اور زیر لب بڑبڑائی۔

"تھینک یو۔"

☆☆☆

اس کے بعد جب تک ان کا پلاسٹر نہیں نکلا، قرۃ العین کے سارے کام دیبا کے ذمہ ہو گئے تھے۔ ان کا منہ دھلانے سے لے کر کپڑے تبدیل کرنا، بال بنانا سب کچھ۔ قرۃ العین کا رویہ بھی اب اس کے ساتھ تحکمانہ اور سرد نہیں رہا تھا۔ انہیں ہر ایک کام کے لیے دوسرے کی محتاجی کبھی جھنجھلاہٹ میں مبتلا کرتی تو کبھی عاجزی میں۔ کبھی وہ تنے چہرے کے ساتھ اس سے کام کرواتیں تو کبھی ان کے انداز میں نرمی اور شفقت ہوتی۔

شانو کے امتحان بھی ہو گئے تھے۔ اس کے بعد 'نیٹ' (میڈیکل کے لیے لازمی انٹری ٹیسٹ) سے فارغ ہوئی تو ماں کے کام وہ بھی کرنے لگی۔ کبھی وہ اسے کرنے دیتیں اور کبھی بضد ہوتیں کہ دیبا ہی کرے گی۔ جب انہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا یا کچھ کرتے یا سوچتے ہوئے وہ الجھ جاتیں تو رونے لگتیں۔

"یہ سب کیا ہونے لگا ہے میرے ساتھ؟"

"کچھ بھی تو نہیں پھپھو۔ سب کچھ تو ٹھیک ہے۔" وہ ان کے کمرے کے پردے بدل رہی تھی جب الماری کھول کر کھڑی قرۃ العین کو کوشش کے باوجود یاد نہیں آیا کہ انہیں اندر سے کیا چاہیے تھا۔

"آپ نے یہ پردے نکال کر دیے ہیں مجھے لگانے کے لیے۔ اب الماری بند کر دیں۔" ان کے ہاتھ کا پلاسٹر ابھی نکلا نہیں تھا۔

"میں نے دیے ہیں؟" وہ الجھ کر دیکھنے لگیں۔

"جی۔" اس نے اتارے ہوئے پردے دونوں ہاتھوں سے سمیٹے۔

"اور آپ نے کہا ہے کہ اب اس گھر کو نئے پردوں کی ضرورت ہے۔"

"ہاں۔" انہوں نے کھڑکی پر جھول رہے میرون پردوں کو دیکھا۔

"چلو، ابھی چلتے ہیں مارکیٹ۔" وہ ایک دم تیار ہو گئیں۔

"تم شانو سے پوچھ لو اسے چلنا ہے تو اسے بھی ساتھ لے لو۔" وہ الماری سے اپنا پرس نکالنے لگیں۔

پھر شانو اور اس کے ساتھ مل کر انہوں نے سارے گھر کے لیے پردے کا کپڑا پسند کیا اور وہاں سے درزی کو لے کر گھر لوٹیں جو سب کھڑکیوں کے ناپ اور ڈیزائن لے کر گیا۔

"تمہارے کمرے کے پردے میں نے اس بار لائٹ بلیو لیے ہیں۔" رات کھانے کے دوران انہوں نے منیب سے کہا اور شانو نے پانی کا جگ میز پر رکھ رہی دیبا کو دیکھا۔ انہوں نے سب سے زیادہ وقت منیب کے کمرے کے پردوں کا رنگ منتخب کرنے میں لگایا تھا کہ اسے گہرے رنگ کے پردے پسند تھے۔ آخر میں انہوں نے گہرا سرمئی رنگ چنا تھا۔

"اچھا کیا کمرے کو چینج کی ضرورت تھی۔" اس نے بھی ماں کو خوش کرنے والا جملہ ادا کیا۔

وہ سب وقت کی چال سے قدم ملانا سیکھ گئے تھے۔ وہ اب قرۃ العین کی باتوں کی تضحیک یا اس سے اختلاف نہیں کرتے تھے۔

☆☆☆

اس بار اعظم میر آئے تو دونوں باپ بیٹا بڑی دیر تک قرۃ العین اور گھر میں رونما ہو رہے واقعات پر تبادلہ خیال کرتے رہے اور آخر میں یہ طے ہوا کہ اب انہیں 'والینٹری ریٹائرمنٹ' لے کر ہمیشہ کے لیے گھر آ جانا چاہیے۔ ان کی نوکری کے دو سال باقی تھے لیکن اب گھر کو اور قرۃ العین کو ان کی ضرورت تھی جو ہمیشہ ان کی پہلی ترجیح تھیں۔ وہ زیادہ وقت اپنی محبوب بیوی کے ساتھ گزارنا چاہتے تھے۔

قرۃ العین کے گرنے اور فریکچر کے بعد سے ہی اعظم میر اس بات کو سوچ رہے تھے کہ قرۃ العین کے ساتھ کسی کا ہمہ وقت رہنا لازمی تھا۔ وہ رات کے کسی بھی پہر اٹھ کر باورچی خانے میں چلی جاتیں تو کبھی اٹھ کر لان میں نکل جاتیں۔ گیٹ کو مقفل کر کے چابی کی جگہ بدل دی گئی تھی۔

"جب تک میں نہیں آ جاتا، دیبا کو عینی کے کمرے میں سونے دو۔" اعظم کو اب انہیں کو تنہا چھوڑنا گوارا نہ تھا۔

"امی مانیں گی نہیں۔"

"میں کسی طرح منا لوں گا۔ تم دیبا سے کہہ دو۔"

"امی مان جائیں تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔"

"ویسے دیبا نے گھر کو احسن طریقے سے سنبھالا ہوا ہے، وہ نہ ہوتی تو پتا نہیں کیا بنتا اس گھر کا۔" ان کی آواز میں تشکر تھا۔

"کچن ہی تو دیکھنا ہوتا ہے، باقی کام کے لیے ماسیاں ہیں۔" اس کی نظر میں دیبا کا تعاون یا حصہ اتنا نہیں تھا جتنا اعظم میر اس کے ممنون ہو رہے تھے۔

"بیٹا! اس نے ہماری پسند ناپسند اور کھانے کے معاملے میں سب کی عادت اور طریقے کسی کی مدد کے بنا خوبی اور جلدی سے سمجھ لیے۔ بنا کسی بدمزگی اور چیخ و پکار کے اس قدر آسانی سے سب چلنے لگا مجھے یقین نہیں تھا۔ چند دن ہی کک کا پکایا کھایا تھا اور یاد ہے وہ ہفتہ، کچن کا کیا حال تھا گندے برتن، افراتفری۔ مشکل میں جو احساس کرائے بنا ہمارے لیے آسانیاں پیدا کرے، اس کی قدر کرنی چاہیے۔"

"جی۔" ان کی آخری بات اس کے دل کو لگی تھی۔ اس کے تصور میں کوکیز کی طشتری گھوم گئی۔

اور یہ ان کی بات کا اثر تھا کہ وہ آج دروازے سے ہی دبے پاؤں اندر آیا۔ حسب معمول وہ اپنی جگہ بیٹھی اس کا انتظار کرتے ہوئے سر ٹکا کر سو رہی تھی۔ وہ اس کی آہٹ پر جاگ جاتی تھی۔ اسے ایک بار پھر اپنے پاپا کی بات یاد آئی۔

"مشکل میں جو احساس کرائے بنا ہمارے لیے آسانیاں پیدا کرے، اس کی قدر کرنی چاہیے۔"

وہ بنا آواز کیے ہی اپنے لیے کھانا نکالنے کا سوچ رہا تھا لیکن وہ اس قدر حساس تھی کہ اس کی مسلسل نظر بھی اسے جگا گئی۔

"سوری!" وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہوئی۔ مثیب پیچھے جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس نے جب مثیب کے آگے میز پر کھانا رکھا تو اس نے اچانک سر اٹھایا۔

"آئندہ سے میرا ویٹ نہ کیا کرو، کچن کے کام ختم ہو جائیں تو کمرے میں سو جایا کرو۔" نیند سے بوجھل اس کی آنکھیں اور سوئے سوئے چہرے پر ایک دم پریشانی پھیل گئی۔

"سوری، بس ابھی آنکھ لگ گئی تھی، آئندہ نہیں سوؤں گی۔" اس کے انداز میں لجاجت تھی۔

"میں غصے سے نہیں کہہ رہا ہوں۔" اس کا ارادہ اتنی دیر تک اسے دیکھتے ہوئے بات کرنے کا نہیں تھا لیکن اس کی آنکھیں اسی پر جمی تھیں۔ اس بار اس کے سادہ لہجے میں ہلکی سی نرمی تھی۔

"مجھے کبھی کبھی بہت دیر ہو جاتی ہے اور تمہیں صبح جلد اٹھنا بھی ہوتا ہے۔ میں خود کھانا لے سکتا ہوں۔"

اس بار وہ چپ رہی۔ کھانا گرم کرنے کے بعد

اس کے سامنے رکھا تو منیب نے حکم دیا۔

"جاؤ سو جاؤ۔" اس نے توجہ پلیٹ پر مرکوز کی اور کھانے لگا۔

وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے کھانا کھانے کے بعد برتن دھو کر کمرے میں جاتی تھی۔ دیبا چند پل تعجب سے اسے دیکھتی رہی۔ اسے جھوٹے برتنوں کا خیال آیا۔ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر سختی سے بند کر لیا۔ کیا پتا کس بات پر مزاج برہم ہو اور ڈانٹ پڑ جائے اس سے بہتر تھا چپ چاپ وہاں سے چلی جائے۔

بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے سوچا۔

"ویسے انہوں نے کبھی مجھے ڈانٹا نہیں ہے۔"

☆☆☆

اعظم میر جانے سے پہلے ان سے کہہ گئے تھے دیبا اب سے ان کے کمرے میں سوئے گی۔

قرۃ العین نے پہلے دن تو کچھ نہیں کہا۔ وہ ان کے کمرے میں دروازے کے آگے اپنا بستر لگا کر سو گئی تھی تاہم اگلے دن جب وہ اپنا مختصر بستر لے کر وہاں پہنچی تو وہ پچھلا دن بھول گئی تھیں۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" ان کی پیشانی پر ناگواری کی لکیریں نمایاں تھیں۔

"میں یہاں سونے آئی ہوں پھپو۔ کل بھی تو یہیں سوئی تھی۔" ان کے بدلے انداز پر وہ ڈر گئی۔

"تم کیوں سوؤ گی یہاں؟ تمہیں جگہ دی ہے نا سونے کی۔" وہ پلنگ سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھیں، دیبا ایک طرف ہو گئی۔

"منیب!" انہوں نے باہر جا کر اونچی آواز میں پکارا۔ گھبرایا سا منیب گرتا پڑتا اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ وہ اب اپنے کمرے کا دروازہ کھلا ہی رکھتا تھا۔

"یہ کیوں یہاں سونے آئی ہے؟" وہ قریب پہنچ کر کیا ہوا پوچھتا اس سے پہلے ہی انہوں نے سوال کیا۔

"پاپا نے کہا تھا نا امی۔"

"کیا کہا تھا؟"

"اس بار وہ آئے تھے تو آپ کئی بار رات میں نیند سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔ پاپا تھے تو وہ جاگ جاتے تھے اور آپ کو دوبارہ بیڈ پر لے آتے تھے، ان کے ابسینس میں انہوں نے دیبا کو آپ کے پاس سلانے کہا ہے۔" اس نے بات کرتے ہوئے ان کے شانوں پر دونوں ہاتھ رکھے تھے۔

"آپ آرام سے سوئیں۔ اگر نیند میں آپ باہر جانے لگیں گی تو دیبا آپ کو دوبارہ بیڈ تک لے آئے گی، بس اتنی سی بات ہے، آئیں۔" وہ انہیں لیے اندر آیا۔ دیبا دروازے کے پاس بستر سینے سے لگائے کھڑی تھی۔

"یوں سمجھیں، آپ کے علاوہ کمرے میں کوئی نہیں ہے، لیٹ جائیں۔" اس نے انہیں بستر پر بٹھا کر کہا۔ وہ لیٹ گئیں۔ منیب نے ان پر لحاف ڈالا۔

"اب آپ سو جائیں اور کچھ نہ سوچیں۔ پاپا نے کہا ہے ناں، وہ اب ہمیشہ کے لیے آ رہے ہیں تو بس کچھ دن ہی دیبا یہاں ہو گی۔"

"ہمم۔" وہ کبھی اس طرح فوراً آرام ہو جاتی تھیں اور کبھی کسی صورت سننے تیار نہ ہوتیں۔ اس نے بتی بجھا کر نائٹ بلب جلایا۔ پلٹا تو وہ یونہی سہمی سی کھڑی تھی۔

"سو جاؤ۔" باہر نکلنے سے پہلے اس نے نرمی سے کہا تھا۔ اس کی صورت پر ذرا سی بات پر بھی وہ سراسیمگی اور گھبراہٹ چھا جاتی تھی کہ اس کا لہجہ خود بخود ملائم ہونے لگا تھا۔

جانے وہ ان کے کمرے میں اس کی کون سی رات تھی جب اچانک انہوں نے پکارا۔

"بیا!" اس نے سنا لیکن سمجھ نہیں پائی۔ وہ اس کی سمت کروٹ لیے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"بیا...... وہاں کیوں سوئی ہو؟ ادھر اوپر آ جاؤ، جگہ ہے یہاں۔" انہوں نے خود پیچھے دیوار کی طرف سرکتے ہوئے کنارے پر اس کے لیے جگہ بنائی۔

"آؤ۔" انہوں نے خالی جگہ پر ہاتھ رکھا۔ اسے ان کی بات ماننے اور سننے کا حکم تھا سو وہ اپنا تکیہ

اور دری ایک طرف چھوڑ کر، چادر لیے ان کے بازو میں لیٹ گئی۔

"یہ بیبہ کون ہے؟" اس نے آنکھ بند کر کے سوچا۔

اس کے بعد قرۃ العین سے مزید کچھ نہ کہا۔ وہ کروٹ بدلتے ہوئے آنکھ کھلنے پر اس سے مخاطب ہوئی تھیں اور اب پھر نیند میں ڈوبی تھیں۔

☆☆☆

دو مہینے بعد اعظم سبک دوش ہو کر گھر آ گئے۔ اس دوران قرۃ العین کو دیبا میں اپنی کزن اور سہیلی بیبا نظر آنے لگی تھی۔ اعظم کے آنے کے بعد گھر میں کچھ تبدیلیاں ظاہر ہونے لگی تھیں۔ جس میں سب سے بڑی یہ تھی کہ وہ دیبا کو اہمیت دیتے تھے، اس سے محض کام کی بات نہیں کرتے بلکہ اس کا احوال پوچھتے تھے اور ادھر کی غیر اہم بات بھی کر لیا کرتے۔ اس کی امی سے اس کی بات ہوئی ہے یا نہیں، وہ کیسی ہیں، وہ سب پوچھتے رہتے۔ اسے یاد اور پابندی سے سلمان یا منیب کے ساتھ عابدہ سے ملنے دادی کے گھر بھیجتے تو کبھی عابدہ کو ادھر بلوا لیتے۔

جب وہ میز پر سب کچھ رکھ دینے کے بعد باہر جانے لگی تو انہوں نے پکارا۔

"تم نے کھانا کھا لیا ہے؟"

"ابھی نہیں۔" وہ عشاء پڑھنے جا رہی تھی۔ ان سب کے کھانا کھا کر چلے جانے کے بعد وہ میز اور باورچی خانہ سمیٹنے کے بعد کھانا کھاتی تھی۔ یہ ہی اس کا معمول تھا۔

"تو بیٹھو، سب کے ساتھ ہی کھا لیا کرو۔"

وہ تو چونکی ہی ساتھ سب بھی لمحہ بھر کو رک گئے۔ یہ تو کبھی کسی نے سوچا نہ تھا وہ کب کھاتی ہے، کھاتی بھی ہے یا نہیں۔

"آؤ۔" قرۃ العین نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ شانو، سلمان، منیب سب مختلف تاثرات لیے دیکھ رہے تھے۔ وہ واحد خالی کرسی کھسکا کر اس پر بیٹھ گئی۔ بازو میں بیٹھے منیب نے درمیان سے خالی پلیٹ اٹھا کر اس کے آگے رکھی۔ شانو نے سالن کا پیالہ، اعظم میر نے روٹی والا ہاٹ پاٹ اور چاول باری باری اس کے قریب رکھے۔ وہ سب اپنی باتوں میں مشغول ہو گئے تھے لیکن اسے بار بار آنکھیں صاف کرنا پڑ رہی تھیں۔

"ہمیشہ کی طرح سب کچھ مزے دار تھا بیٹا۔"

اعظم میر نے اسے دیکھا۔ وہ خفیف سا آگے جھک کر مسکرا دی۔ وہ یگانگت کے اظہار کا کوئی موقع نہیں گنواتے تھے۔

وہ سب ایک ساتھ ہی باورچی خانے سے نکلے تھے۔ اس نے گہری سانس لے کر خود کو سنبھالا لیکن یہ اپنائیت اور عزت حاصل کرنے کا پہلا پہلا تجربہ اس کے ننھے سے دل کے لیے بڑا بھاری تھا۔ وہ بچپن سے آج تک اپنی امی کے ساتھ باورچی خانے کے فرش پر بیٹھ کر کھاتی آئی تھی۔ ناشتہ تو چلتے پھرتے ہوتا تھا۔ اس کی امی کو احتجاج کرنا آتا تھا نہ اپنا حق لینا تو وہ دوسرے سے اپنی عزت کیسے کرواتیں۔

جب میکے نے انہیں باور کروا دیا تھا کہ انہیں بیوگی کے بعد بھی سسرال میں ہی رہنا ہے تو وہ اچھی طرح جان گئی تھیں کہ دنیا میں سر چھپانے کے لیے اس گھر کے علاوہ کوئی اور ٹھکانہ نہیں ہے۔ انہوں نے اسے بھی اطاعت گزاری اور خاموشی کا ہی درس دیا تھا لیکن اسے رویے برے لگتے تھے اور ان کی خود غرضی اور مطلب پرستی زہر۔ اس کے اندر اپنی دبی کچلی ذات کا دکھ تھا لیکن اسے ان سب کے اظہار کا سلیقہ نہیں تھا۔ وہ تو کبھی اپنی ماں سے بھی نہیں کہتی تھی کہ اسے یہ سب اچھا نہیں لگتا ہے۔

وہ زندگی میں پہلی بار ان کے ساتھ، ان کے اونچے مقام کے برابر بیٹھی تھی جن کے لیے وہ صبح سے شام تک مشقت کرتی تھی، جنہیں آرام پہنچانے کے لیے وہ بے آرام رہتی تھی اور اس پل اسے ادراک ہوا کہ یہی بدلہ اور معاوضہ تو اس کی خواہش تھا۔

اپنا ایئر پوڈ میز پر بھول چکا منیب واپس اندر آیا تو وہ جو دونوں ہاتھ سے چہرہ ڈھانپے رو رہی تھی آہٹ پر شپٹا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے یہ بھی نہیں

دیکھا تھا کہ کون آیا ہے۔ چہرے پر ہتھیلیاں پھیرتے ہوئے اس کا سر مزید جھک گیا تھا۔ اس کے پیچھے سے گزر کر منیب نے ایئر پوڈ اٹھایا اور اس پر اچٹتی نظر ڈالتا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

شانو کا نتیجہ آیا تو بورڈ میں اس کے نمبر ٹھیک تھے لیکن 'نیٹ' میں نمبر اتنے نہیں ملے تھے کہ 'ایم بی بی ایس' میں داخلہ مل پاتا۔ اس نے ایک سال کا وقفہ لے کر دوبارہ 'نیٹ' دینے کا فیصلہ کیا۔

اس نے 'نیٹ' کے لیے باقاعدہ کوچنگ لی تھی مگر اب وہ دوسرے انسٹیٹیوٹ میں داخلہ لینا چاہتی تھی۔ منیب نے حامی بھر لی تھی کہ اگلے دن اس کا داخلہ کروا دے گا لیکن رات میں وہ اس کے پاس آئی۔

"مجھے پونا میں ایڈمیشن لینا ہے بھائی۔" اس کی بات پر سب ہی چونک گئے۔

"یہاں مل رہا ہے تو پھر کیوں۔"

"میں نے کہہ دیا مجھے پونا ہی جانا ہے وہاں انسٹیٹیوٹ کا ہاسٹل بھی ہے۔ میں نے سب معلوم کر لیا ہے۔ آپ بس میرے ساتھ چلیں، پرسوں جانا ہے۔"

"لیکن شانو۔"

"ٹھیک ہے بیٹا! جانے کی تیاری کرو۔" اعظم میر نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بیٹی کو نرمی سے کہا۔ وہ واپس کمرے میں چلی گئی۔

"پاپا! آپ بھی۔ یہاں بیسٹ انسٹیٹیوٹ ہے پونا سے بھی اچھا۔"

"بات اچھے برے کی نہیں ہے، شانو کو گھر سے بریک چاہیے۔"

ان کی بات میں اتنے الیے چھپے تھے کہ وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

اس کی خواہش کے مطابق اسے پونہ میں داخلہ مل گیا تھا۔ اور وہ اپنا سامان لیے ہاسٹل رہنے چلی گئی۔ اس نے عجیب روٹھے اور پھولے منہ سے تیاری کی تھی۔ حالاں کہ وہ جا اپنی مرضی سے رہی تھی تاہم انداز یوں تھے جیسے زبردستی اسے بھیجا جا رہا ہو۔

قرۃ العین کا رویہ اس دوران معمول سا تھا۔ کبھی کہتیں سب چیزیں رکھ لو پھر کچھ دیر بعد کہتیں کہ دو دن میں واپس آنا ہے تو اتنا سامان کیوں؟ کبھی فکر مندی کا اظہار کرتیں، کبھی خوشی کا۔

بمشکل ایک ہفتہ ہوا ہوگا کہ پھر روتی شانو نے اسے فون کیا۔

"مجھے گھر لے چلیں بھائی! مجھے نہیں رہنا یہاں۔" اور وہ اسے سامان سمیت واپس لے آیا۔

"میری خود سمجھ میں نہیں آتا میں کیا چاہتی ہوں، گھر کا ماحول اتنا ڈپریسنگ ہو گیا ہے کہ بھاگ جانے کا دل کرتا تھا اور میں نے وہی کیا مگر وہاں ایک پل کو سکون نہیں ملا۔ مجھے بار بار یاد آتا رہا کہ میں کتنی بری بیٹی ہوں۔ مجھ سے امی کا اجنبی رویہ اور شناسائی سے خالی آنکھیں برداشت ہوتی ہیں نہ ان سے دور رہنا۔" اب وہ اس کے سامنے بیٹھی رو رہی تھی۔

"شانو!" منیب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"امی وہی ہیں ہم سے پیار کرنے والی، ہم پر جان چھڑکنے والی۔ ان کی آنکھوں اور رویے کے پیچھے دیکھو۔ تمہیں سب کچھ ملے گا، ان کا دل وہی ہے ہماری فکروں اور انسیت سے بھرا بس یہ دماغ ہے جو دغا دے گیا اور اب یہ دن بہ دن ڈیٹوریٹ (انحطاط پذیر) ہو رہا ہے، امی بیمار ہیں، ہم سے دور یا ناراض یا اجنبی نہیں۔ میں نہیں کہوں گا کہ زبردستی ان کے ساتھ اور پاس رہو۔ جتنا تم ہینڈل کر سکتی ہو۔ اتنا ہی کرو، خود پر جبر نہ کرو لیکن امی کی محبت پر شک بھی نہ کرو، انہیں مریض کی طرح دیکھو، امی جو کہتی اور کرتی ہیں وہ اس مرض کی علامتیں ہیں ہماری امی کے جذبات نہیں۔ ان کے جذبات وہی ہیں جو ہم آج بھی ان کو دیکھ کر اور چھو کر اپنے اندر محسوس کرتے ہیں۔" اس کی آواز بھاری ہونے لگی تھی۔

"یہ ہمارے ساتھ ہی کیوں ہو رہا ہے بھائی؟ میں نے پڑھا ہے الزائمر تو لوگوں کو ساٹھ سال کے بعد ہوتا ہے، بہت ضعیفی میں پھر امی کو کیسے اتنی جلدی ہو گیا؟" ساری بردباری اور سمجھداری کے باوجود یہ

سوال تو وہ خود سے بھی کرتا تھا۔

"ارلی آن سیٹ الزائمر تھرٹیز اور فورٹیز میں بھی ہوسکتا ہے امی تو اگلے سال پورے پچاس کی ہو جائیں گی۔ بس ہم نے ان کی علامتوں کو سنجیدگی سے لینے میں بہت دیر کردی، خیر! ہم ہی کیوں اور امی ہی کیوں جیسے خیالات میں الجھ کر حاصل کچھ نہیں ہونا ہے اس لیے اسے ایکسیپٹ کرنے اور ڈیل کرنے پر توجہ دو۔"

شانو نے ایک سال تعلیم سے وقفہ لینے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے اس فیصلے سے اعظم اور منیب خوش نہیں تھے تاہم اس کا کہنا تھا۔ وہ اس وقت ذہنی طور پر پڑھائی کے لیے تیار نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ اس نے قرۃ العین کے ساتھ زیادہ وقت گزارنا شروع کیا۔ وہ دور سے ہی قرۃ العین کو دیبا کے ساتھ باتیں کرتا دیکھتی رہتی۔ اس مشاہدے سے ہی اس نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا اب وہ ان کے سوالوں پر روتی نہیں تھی وہ ان کی ہاں میں ہاں ملاتا اور جس سے وہ راضی اور خوش ہوں، ایسے جواب دینا سیکھ گئی تھی۔

☆☆☆

"بیا کہاں ہے؟" قرۃ العین نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔ انداز میں عجلت تھی۔

"کچن میں ہوگی۔" اس نے لیپ ٹاپ بند کر کے رکھتے ہوئے کہا۔

"کوئی کام تھا؟"

"بیا! بیا!" وہ اس کا سوال نظر انداز کر کے اونچی آواز میں اسے بلانے لگیں۔

"جی۔" وہ ہاتھ میں چمچہ لیے باہر آئی۔

"ارے آج دو تاریخ ہے ناں، بک اسٹال پر ڈائجسٹ آگیا ہوگا۔ چلو لے آتے ہیں۔" ان کے انداز میں دبا دبا جوش اور مسرت تھی۔ تب ہی کمرے سے اعظم میر بھی نکلے اور بیٹے کے بازو میں جا کر بیٹھ گئے۔

"ابھی؟" اس نے مری سی آواز میں کہتے ہوئے منیب اور اعظم میر کو دیکھا۔ دونوں نے سر کے اشارے سے اسے جانے کو کہا۔

"ہاں ہاں ابھی۔"

"میں یہ رکھ کے آتی ہوں۔" وہ ہاتھ میں پکڑا چمچہ دکھاتی اندر چلی گئی۔ قرۃ العین ان کے پاس آئیں۔

"پیسے دیں۔" انہوں نے اعظم میر کے آگے ہاتھ پھیلایا۔ ان کے بجائے منیب نے کافی ٹیبل سے بٹوہ اٹھا کر اس میں سے چند نوٹ نکال کر ان کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ تب ہی دیبا باہر آئی۔

"چلو۔" وہ دروازے کی طرف بڑھیں۔

"ایسے نہیں۔" اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر روکا۔

"دو منٹ رکیں۔" وہ بھاگتی ان کے کمرے میں گئی اور واپس آئی اس کے ایک ہاتھ میں ان کی چادر تھی اور دوسرے میں ان کے آرام دہ میڈیکیٹڈ سلیپرز تھے۔ چپلیں پیر کے پاس رکھنے کے بعد اس نے ان کے گرد چادر پھیلائی۔

"اب چلیں۔" وہ دونوں دروازے سے باہر نکل گئیں۔

"دیبا ہمارے لیے اللہ کا بڑا انعام ہے۔" اعظم نے ایک لمبی سانس لے کر سر صوفے پر گرا دیا۔ منیب نے کچھ نہ کہا۔

"عینی کے ڈائگنوسس سے پہلے ہم نے ان ماں بیٹی کا ہونا بھی اکنالج بھی نہیں کیا تھا۔ ہم رشتے داروں کو خوش اور راضی کرنے کی کوشش میں ان دونوں کو ان ہی کی طرح اگنور کرتے آرہے تھے۔ اس گھر میں بھی اسے تمہاری نانی نے بھیجا ہے، اس کی مرضی اور خوشی کا اس میں دخل نہیں لیکن۔ دیبا نے جس ذمہ داری ایمان داری اور خلوص سے اس گھر میں سب کچھ سنبھالا ہے وہ ہماری سب سے بڑی محسن بن گئی ہے۔"

ان کی خود کلامی سے فقروں پر اس کے اندر سوچ کی نئی کونپلیں سر اٹھانے لگی تھیں۔

کچھ دور چلنے کے بعد وہ بھول گئی تھیں کہ کیوں باہر آئی ہیں۔ خاموشی سے چلتے ہوئے ایک جگہ رک کر قرۃ العین کے کہنے پر اس نے سیب خریدے اور پھر دونوں واپس گھر آگئیں۔

☆☆☆

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے بھائی جان۔" وہ انہیں لان میں تنہا دیکھ کر باہر آئی تھیں۔

"جی بیٹھیں۔" انہوں نے فون بند کر کے ایک طرف رکھا جس میں وہ کوئی مضمون پڑھ رہے تھے۔ وہ انگلیاں مروڑتی، جز بزسی کرسی پر ٹک گئیں۔

"آرام سے بیٹھیں۔" ان کی کشمکش بڑی واضح تھی۔

"آپ بلا جھجک جھجک سے ہر بات کر سکتی ہیں۔" انہوں نے نرمی سے کہا۔ وہ جو انہیں بلا لیتے تھے اور دیبا کو بھی ان سے ملنے بھیج دیتے ہیں پھر دیبا نے بھی ان کے بارے میں اچھی باتیں سنائی تھیں ان سب کے بعد ہی وہ یہ ہمت کر پائی تھیں۔

"آپ مجھے غلط مت سمجھیے گا۔ میرے علاوہ کوئی نہیں ہے جسے دیبا کی فکر ہو، مجھے اس کے یہاں آپ سب کے ساتھ رہنے اور کام کرنے پر کوئی اعتراض یا شکایت نہیں ہے بلکہ میں تو ایک طرح سے خوش ہوں لیکن میں ماں بھی ہوں، ایک جوان بیٹی کی ماں جسے طرح طرح کے خوف اور اندیشے ستاتے ہیں۔ بخدا میری بات کو غلط نہ سمجھیں، مجھے آپ سب پر اعتبار ہے بلکہ میں تو شکر گزار اور احسان مند ہوں سب کی۔ لیکن۔" وہ رک گئیں۔

"جی۔ میں سن رہا ہوں۔" اعظم میر نے کہا۔

"دو جوان لڑکوں کے گھر میں اپنی بیٹی کو چھوڑتے ہوئے مجھے اللہ کا خوف ڈراتا ہے بھائی جان۔ دیبا کو یہاں بھیجنے کے لیے کسی کو میری اجازت کی ضرورت نہیں تھی نہ میں ان کے آگے کچھ کہنے کی ہمت رکھتی ہوں۔ آپ اسے میری بزدلی کہہ لیں یا خوف جو بھی سمجھیں لیکن میں اس امید پر آپ سے کہہ رہی ہوں کہ آپ سمجھیں گے۔" عابدہ نے یوں سر جھکایا جیسے جرم کا اعتراف کیا ہو۔

اعظم میر بری طرح چونک گئے۔ انہوں نے اس نہج پر تو سوچا ہی نہیں تھا۔ ان کے آنے سے پہلے شانو سارا وقت پڑھائی کے لیے اپنے کمرے میں بند رہتی تھی اور اس کے علاوہ ایک دماغی طور پر کمزور اور غائب دماغ عورت کے علاوہ یہاں ان کے دو بیٹے تھے اور ان کے بیچ ایک کمزور سی لڑکی۔

انہیں جیسے ہی اپنی غفلت کا احساس ہوا، ندامت ان کے اندر اتر گئی۔ یہ باریکیاں اور نزاکتیں سمجھنے والی ان کی نصف بہتر اب اس حال میں تھیں کہ یہ کام بھی ان کے کاندھوں پر آن پڑا تھا۔ انہیں اچانک بے چینی نے گھیرا کہ جانے ایسی کون سی معمولی مگر اہم باتیں اور چیزیں ان کی غفلت کا شکار ہو رہی ہوں گی۔ انہیں ایک دم اپنے گھر کے 'بنا عورت' کے ہونے کا احساس ہوا۔

"میں چاہتی ہوں، آپ اسے واپس بھیج دیں یا مجھے بھی یہیں بلا لیں۔" وہ بھی اتنی ہی کمزور تھیں جتنی دیبا لیکن ماں تھیں خود کو بیٹی کے تحفظ کا ذمہ دار سمجھنے والی ماں۔ اپنی حیثیت اور مجبوری کے باوجود جہاں پہلا موقع ملا انہوں نے کوشش کی۔

"آپ کی بات بالکل درست ہے۔ میں بھی اس سے اتفاق کرتا ہوں لیکن ایک گزارش ہے آپ سے، جب تک کوئی اور انتظام نہیں ہوتا آپ تب تک دیبا کو یہاں رہنے دیں۔ تب تک میں منور بھائی سے بات کرتا ہوں کہ وہ آپ کو یہاں بھیج دیں۔"

"آپ ان سے یہ مت کہیے گا کہ میں نے یہ بات۔" وہ ایک دم پریشانی سے بولیں۔

"آپ بے فکر رہیں، میں اپنے طور پر بات کروں گا۔"

☆☆☆

وہ اس مسئلے پر منیب سے بات کرنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ اس سے پہلے سلمان ان کے پاس چلا آیا۔ وہ اپنے دفتر کی ساتھی فاریہ کو پسند کرتا تھا اور فاریہ کے گھر والے اب اس کی شادی کرنا چاہتے تھے، لہٰذا وہ چاہتا تھا کہ اعظم میر اس کے گھر شادی کا پیام لے کر جائیں۔

"ٹھیک ہے، پہلے منیب کی شادی ہو گی یا پھر تم دونوں کی ساتھ میں۔" اعظم نے سلمان کو سمجھانے یا باز پرس کرنے کے بجائے دوسرے اہم امور پر توجہ

دی۔ یہ سب اب انہیں ہی سوچنا اور کرنا تھا۔

عابدہ کی بات کے بعد سے ہی وہ سنجیدگی سے منیب کی شادی کے بارے میں سوچ رہے تھے مگر انہیں منیب سے اس بارے میں بات کرنے کا وقت ہی نہیں مل پایا تھا۔

"تمہاری نظر میں کوئی لڑکی ہے تو بتا دو۔ یہ کام تمہاری امی کا تھا، یہ میں نہیں کر سکتا۔ اگر رشتہ تلاش کرنا ہے تو پھر میں آپا کو بلا لیتا ہوں۔ وہ اور ناظمہ مل کر دیکھ لیں گی۔" انہوں نے بڑی بہن اور بھابھی کا نام لیا۔

اس نے عروبہ کا نام لے کر پہلے خود اس سے بات کرنے کی خاطر ان سے ایک دن کی مہلت مانگی کہ وہ اس کے بعد نانی اور ماموں سے یہ ذکر کریں۔

☆☆☆

جب اس نے خوشی سے مسکراتے ہوئے عروبہ کو یہ خوش خبری سنائی تو اس کے تاثرات اس کے تصور اور امید کے برعکس تھے۔

"بہت کچھ بدل گیا ہے منیب! تمہیں یاد ہے ہم آخری بار باہر کب اور کہاں ملے تھے؟ اب تو میری ہر کال مِس ہوتی ہے اور تمہیں کال بیک کرنا پڑتا ہے، میسج بھی تم سونے سے پہلے دیکھتے ہو، سلام کا جواب اور تھک گیا ہوں، سو رہا ہوں، کل بات کرتے ہیں کے علاوہ کوئی اور بات نہیں لکھتے۔ سال بھر سے زیادہ ہو گیا ہے اور اس دوران ہم جب بھی ملے تمہارے پاس بات کرنے کے لیے پھپھو اور گھر کے علاوہ کوئی اور ٹاپک ہی نہیں ہوتا ہے۔"

"تم ان سب کی وجہ جانتی ہو عروبہ! ورنہ میں ایسا تو نہیں ہوں۔"

"تم ایسے نہیں تھے مگر اب ہو گئے ہو اور آئندہ بھی یونہی رہو گے۔ مجھے جو منیب پسند تھا، جس سے مجھے محبت ہوئی تھی، جس کے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھے تھے، وہ اب ہے ہی نہیں۔" منیب بے یقینی سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"ساری دنیا جانتی ہے کہ تم پھپھو کو بہت اہمیت دیتے ہو، تمہارا رشتہ عام ماں بیٹے سے بڑھ کر گہرا اور خاص ہے، مجھے اس بات پر کبھی اعتراض نہیں تھا۔ پھپھو اچھی ہوتیں تو میں۔"

منیب نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔ اگلی بات وہ بنا سنے جانتا تھا۔ کچھ بت ہم توڑنا نہیں چاہتے۔ وہ سنے بنا جانتا تھا۔ آگے ادا ہونے والے الفاظ اسے عمر بھر ستاتے رہیں گے۔ کچھ تلخ یادیں وجود ہی نہ پائیں وہی اچھا۔

"مت کہو آگے کچھ عروبہ۔ تم آسانیوں کی ساتھی تھیں میں سمجھ گیا ہوں۔" اس نے دکھ سے کہا۔ عروبہ نے پہلو بدلا، لب وا ہوئے لیکن کچھ کہا نہیں۔

عروبہ سے مل کر وہ جانے کتنی دیر سے گاڑی میں بیٹھا تھا۔ وہ ایک دم خالی تھا۔ دل و ذہن پر سناٹا چھایا تھا۔ ہم چاہے بڑی سے بڑی آفت اور کٹھنائی سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہوتے ہوں، ہمارے حوصلے اور ارادے بلا کے مضبوط ہوں تاہم جن پر بھروسا ہو وہ نظر پھیر لیں تو ہماری ساری خوبیاں شرمندہ اور تنہا رہ جاتی ہیں۔

وہ بھی سمجھ رہا تھا کہ گھر کو اس کی امی کے ایسے نعم البدل کی ضرورت تھی جو اس گھر کی نگراں، حاکم اور مالک ہو۔ سلمان کا مزاج اور پھر جس انداز میں اس نے شادی کی بات کی تھی، اس تناظر میں فاریہ سے امید رکھنا لا حاصل نہ تھا لیکن قبل از وقت اور غیر یقینی تھا پھر وہ بھی جاب کرتی تھی۔ گھر کو وقت دینا اس کے لیے مشکل ہی تھا۔

"پاپا! آپ ہی کوئی دیکھ لیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" اس نے رات میں اعظم میر سے کہا تو انہوں نے اس کا شانے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

"یہ قسمت کی باتیں ہیں بیٹا۔"

انہیں بھی ایسی امید نہیں تھی۔ جب اس نے عروبہ کا نام لیا تو وہ بھی بہو کے روپ میں اسے سوچ کر خوش اور مطمئن تھے کہ ان کے بیٹے کی پسند ہے۔

☆☆☆

اس کے بعد انہوں نے اپنی آپا سے بات کرنے سے پہلے چھوٹے بھائی سے ان کی بیٹی کے

لیے بات کی جو کچھ دن پہلے ہی اپنے فائنل امتحان دے کر گھر آئی تھی۔ انہوں سوچنے کا وقت مانگنے بنا، کسی لگی لپٹی کے بغیر معذرت کر لی، وہ حیران تھے۔ ان کے خاندان اور بیٹے میں وہ سب کچھ تھا جس کی لڑکی اور اس کے والدین تمنا کرتے ہیں۔ بس ایک بیماری کی وجہ سے سب اتنے خوف زدہ کیوں ہو رہے تھے۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ منیب اکلوتا تھا جس پر دیکھ بھال کی ذمہ داری ہوتی، نہ بیماری کوئی چھوت والی تھی۔ وہ سمجھ نہیں سکے کہ رشتے سے انکار کی وجہ محض قرۃ العین کی دماغی صحت نہیں ہے بلکہ منیب کی اپنی ماں کے لیے غیر معمولی محبت بھی ہے۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" قرۃ العین کی آواز پر وہ بری طرح چونکے۔ وہ جانے کب باہر آئی تھیں۔

"بچوں کی شادی کے بارے میں؟" انہوں نے بغور اپنی چہیتی بیوی کو دیکھا۔

"کون؟" ان کے بولنے کا انداز بھی دھیما ہو گیا تھا۔ وہ پہلے جیسی رفتار اور جوش میں بات نہیں کرتی تھیں۔

"منیب اور سلمان۔"

"اچھا مذاق کرتے ہیں آپ بھی۔" وہ ہاتھ سے مکھی اڑانے کے انداز میں ہنستے ہوئے گویا ہوئیں۔

"بیگم! منیب کو اپنی سافٹ ویئر ڈیولپمنٹ فرم اسٹارٹ کیے چار سال ہو گئے ہیں، آپ کہتی تھیں بس دو سال کی بات ہے پھر شادی کر دوں گی تمہاری۔" ان کی ہنسی میں کھو کر وہ بھی کہہ گئے۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو۔" وہ پر تشویش سی انہیں غور سے دیکھنے لگیں جیسے ان کی دماغی صحت پر شبہ ہو۔

"منیب کا لاسٹ سمسٹر ہے ابھی۔"

"مذاق کر رہا تھا بیگم۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس تبسم میں کرب تھا۔ جب آپ اپنے ساتھی، ہمراز، ہم زبان سے ہم کلام ہوں اور درمیان میں بات کے مطالب بدل جائیں تو اس سے بڑا المیہ کوئی نہیں۔

تب ہی دیبا وہاں ان دونوں کے لیے چائے لے کر آ گئی۔ ٹرے میں بسکٹ اور نمکین بھی رکھا تھا۔ قرۃ العین کو شام کی چائے کے ساتھ کچھ نمکین کھانے کی عادت تھی۔

"شکریہ بیٹا۔" انہوں نے تشکر سے اسے دیکھا۔ وہ مسکرا کر چلی گئی۔

"شکر ہے یہ لڑکی اچھی ہے۔ پچھلی والی کی طرح چوریاں نہیں کرتی۔" انہوں نے کپ کے ساتھ ایک بسکٹ اٹھایا۔

"ہمم۔" انہوں نے کپ اٹھاتے ہوئے ہنکار بھرا۔ ایسے وقت انہیں حقیقت سمجھانا لاحاصل تھا۔

☆☆☆

اب بیٹے تک بات پہنچانے کے لیے ان کے پاس ماں والا پل نہیں تھا سو خود ہی منیب سے بات کرنا پڑی۔ وہ ان کی بات سن کر ایسا شدید حیران ہوا کہ بت ہی بن گیا۔

"یہ فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ اگر تعلیم اور اسٹیٹس دیکھیں تو وہ تمہارے قابل نہیں لیکن بیٹا! اس وقت ضرورت اور سہولت ہر بات پر حاوی ہے۔ مجھے وہ بچی پسند ہے، اس کا مزاج، اطاعت گزاری پسند ہے۔ تم بھی اگر اسے دیکھنے کا نظریہ بدل لو تو وہ تمہیں بھی اچھی لگے گی۔ تمہیں لگ رہا ہوگا۔ میں خود غرض ہو کر سوچ رہا ہوں تم سے زیادہ عینی اور اس گھر کا سوچ کر کہہ رہا ہوں تو یہ کسی حد تک سچ ہے لیکن بیٹا جتنا میں تمہیں اور تمہارے اپنی ماں سے پیار کو سمجھتا ہوں، اس کے مطابق دیبا سے بہتر تمہارے لیے کوئی نہیں۔"

وہ اب بھی بولنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ بات ہی ایسی انوکھی تھی۔

"تم سوچ کر اپنا فیصلہ بتا دو، اگر تمہارا دل نہیں مانتا تو پھر میں آپا سے بات کروں گا کہ وہ کوئی قابل لڑکی دیکھ کر بتائیں۔"

وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ قرۃ العین کے مرض کی تشخیص کے بعد بھی وہ بڑا پرامید اور مثبت تھا۔ اول اول فکر اور پریشانی تھی لیکن جب یہ حقیقت قبول کر لی تو وہ پر یقین تھا کہ سب ٹھیک ہوگا، وہ سب مل کر

سنبھال لیں گے۔ کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اس کے خواب، مستقبل کے منصوبے، زندگی کے اہم فیصلے سب کچھ اس وجہ سے بدل جائیں گے۔ وہ جو اپنی زندگی کی باگ خوبی سے سنبھالے تھا، اب حالات کے دھارے پر رخ موڑنے لگی تھی۔ محبت جیسا خالص جذبہ بھی مشروط نکلا تھا، عروبہ کے جواب نے اسے دکھ دیا تھا تو کہیں اس کے اندر اطمینان بھی تھا۔ وہ یہ سب شادی کے بعد کہتی تو اس کے لیے کتنی بڑی مشکل کھڑی ہو جاتی۔

وہ جیسی تھی، اس نے ویسا فیصلہ کیا تھا، غلطی اس کی تھی وہ اسے سمجھ نہیں پایا۔ اس نے تکلیف اور دکھ کے ساتھ ہی مان لیا تھا کہ عروبہ نے پریکٹیکل فیصلہ کیا ہے۔

اور اب جو اس نے سنا۔ وہ بری طرح ٹوٹ گیا تھا۔ ایسی زندگی کا اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ زندگی کے ساتھی کا تصور اس کے لیے ایک پراعتماد، پروقار اور جدید طرز زندگی کے تقاضوں کو نبھانے والی لڑکی کا تھا۔ وہ اس خوبصورت ساتھ اور احساس کو جس کے ساتھ سوچتا آیا تھا۔

وہ فریب نکلا اور اب اسے جس سے منسوب کرنے کا اعظم میر کہہ رہے تھے۔

اس نے سختی سے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ مضبوط قوت ارادی کا مالک اور حقیقت پسند انسان تھا لیکن پھر بھی اس وقت اس کی بند آنکھوں سے نمی چھلک کر پلکوں پر چمکنے لگی تھی۔ خواب ٹوٹے تو اتنا تو ہوتا ہے!

"اس وقت ضرورت اور سہولت ہر بات پر حاوی ہے۔"

اس کے ماؤف ہوتے ذہن میں باپ کی آواز کی تکرار جاری تھی۔

☆☆☆

اعظم میر نے ماموں کے گھر جا کر بات کی تھی۔ بات ہی ایسی تھی کہ سب سکتے میں آگئے۔ عروبہ اسے انکار کر چکی تھی لیکن اس کی جگہ دیبا کا انتخاب ہوگا۔ یہ بات جتنی حیرت انگیز تھی اتنی ہی بری بھی لگ رہی تھی۔ کہاں اعلا تعلیم یافتہ، خوبرو، بااعتماد اور وجیہہ منیب اور کہاں بارہ جماعتیں پاس دبوسی اعتماد سے خالی دیبا۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کسی زاویے سے بھی ان کا جوڑ نہیں بنتا تھا۔

سب منیب کے مان جانے پر بے یقین سے تھے۔ بس ایک عابدہ پر شادی مرگ کی کیفیت طاری تھی۔ اعظم میر کو انکار کرنا آسان نہیں تھا اور پھر ان کے پاس کوئی ٹھوس وجہ بھی نہیں تھی جس کی بنیاد پر وہ دیبا اور اس کی شادی پر اعتراض کرتے۔ جنھیں تحفظات ہونا چاہیے تھے۔ وہ خود بیٹے کی رضامندی سے رشتہ لے کر آئے تھے تو ان کے پاس کہنے کو کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ پھر بھی نانی نے دبے لفظوں میں کہا کہ گھر میں اور بھی لائق بچیاں ہیں۔

"ساری بچیاں ہی ہمیں ایک سی عزیز ہیں، بس یہ ہے کہ دیبا کی ہم سب کو عادت ہوگئی ہے، وہ ہی اب سارا گھر سنبھال رہی ہے لہٰذا وہی مستقل ہمارے گھر آجائے تو ہمیں خوشی ہوگی۔" اعظم میر کی بات کے بعد دنیاداری نبھانا ہی بچا تھا۔

☆☆☆

عابدہ نے اسے فون پر بتایا تو اسے لگا، کانوں کو دھوکا ہوا ہے۔ ان سے خوشی سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ ان کے نزدیک یہ بے جوڑ یا مصلحت والا رشتہ نہیں تھا بلکہ ان کے صبر کا انعام تھا، ان کی دعاؤں کا ثمر تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا ماں کی خوشی پر کیا ردعمل دے۔ اس کے لیے ان کی خوشی اور اطمینان سے بڑھ کر تو کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ ان سے بات کرنے کے بعد پرسوچ سی فون ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ تب ہی منیب ڈرائنگ روم میں آیا۔ اس نے کار کی چابی چیسٹ کے اوپر دھرے جوٹ کے پیالے میں رکھی اور جوتے اتار کر صوفے پر گر سا گیا۔ اس نے کونے میں کھڑی دیبا کو نہیں دیکھا تھا۔ اسے علم تھا، ذرا دیر بعد وہ اٹھ کر کمرے میں جائے گا پھر نہانے کے بعد چائے کی طلب اسے باورچی خانے میں لے آئے گی۔ وہ عموماً اس وقت رات کے کھانے کی تیاری میں لگی ہوتی

تھی۔ وہ پیچھے میز پر بیٹھ جاتا اور وہ ایک چولھا خالی کر کے پہلے اس کی چائے بناتی وہ کبھی وہیں بیٹھ کر فون دیکھتے ہوئے پی لیتا اور کبھی کپ لے کر باہر چلا جاتا تھا۔ قرۃ العین کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اسے اس میز پر بیٹھنے کی ایسی عادت ہوگئی تھی کہ وہ ان کی غیر موجودگی میں بھی لاشعوری طور پر وہی کرتا تھا۔

اس نے صوفے کی پشت پر گردن ڈال کر آنکھیں موند لی تھیں۔ دیبا دم سادھے اسے دیکھ رہی تھی۔ صبح استری شدہ شرٹ سلوٹ زدہ اور ڈھیلی سی تھی۔ چہرے پر دن بھر کی مصروفیت نے اپنے نشان چھوڑے تھے۔ سیاہ الجھے سے بال اس کا حلیہ صبح کے مقابلے میں مختلف بنا رہے تھے۔ اپنی محویت اور اس قدر تفصیلی جائزے کا احساس ہوتے ہی اس کا دل شور کرنے لگا۔ اس نے پہلی بار سینے میں ایسی ہلچل محسوس کی تھی۔ خود کو سرزنش کرتی وہ آگے بڑھی اور جب اس کے سامنے سے گزری تو منیب آنکھیں کھول کر سیدھا ہوا۔

وہ باورچی خانے میں اس کی آمد کا انتظار ہی کرتی رہ گئی مگر وہ نہیں آیا۔ اسے کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ یہ منیب کی خواہش سے ہو رہا ہے۔ اس گھر میں رہتے ہوئے وہ بھی جانتی تھی کہ اس گھر کو ایک ذمہ دار شخص کی ضرورت تھی اور وہ اس کردار کے لیے موزوں امیدوار تھی۔

شانو اور سلمان کا پہلا ردعمل وہی تھا جیسا منیب کا تھا لیکن پھر اعظم میر نے انہیں قائل کر لیا۔ بدلے حالات نے سمجھوتے کی اہمیت سب پر اجاگر کر دی تھی۔ قرۃ العین دونوں بیٹوں کی شادی کا سن کر خوش ہوئی تھیں۔

شادی کے انتظامات کے لیے اعظم میر نے اپنی بڑی بہن کو بلایا تھا۔

☆☆☆

تھکے ہارے زیادہ مہمان چاچی کے یہاں چلے گئے تھے۔ انہیں بھی علم تھا، کاروبار سنبھالنے والی آج فارغ نہیں ہوگی۔ سلمان اور فاریہ کے لیے ان کے دوستوں نے ہوٹل کا کمرہ بک کیا تھا۔ اس سے بھی اعظم میر نے پوچھا تھا مگر اس نے منع کر دیا تھا۔

تھکی ہاری قرۃ العین سو گئی تھیں۔ سارا وقت ان کے ساتھ رہی شانو بھی کمرے میں بستر پر ڈھیر تھی۔ انہیں اپنے بیٹوں کی شادی کا علم تھا لیکن وہی ذرا ذرا دیر میں مختلف باتیں۔

"کس کی شادی میں آئے ہیں؟"

"دلہنیں پیاری ہیں، اپنے منیب کی دلہن کا میک اپ بھی ایسا ہی کروائیں گے۔"

"کتنے پیارے لگ رہے ہیں میرے بچے!"

"اب چلو گھر، بہت دیر ہوگئی ہے۔ صبح سب کو اپنے کام پر جانا ہے۔"

اس کے کمرے میں جانے سے پہلے اعظم میر اس کے پاس آئے تھے۔

"بیٹا! تم سمجھ دار ہو، میں لیکچر نہیں دوں گا، میری ساری دعائیں تم بچوں کے لیے ہیں۔ بس اتنا خیال رکھنا کہ دیبا کی حق تلفی نہ ہو، اسے کوئی دکھ نہ پہنچے۔ مجھے وہ بچی بھی شانو کی طرح عزیز ہے۔"

"جی پاپا۔" اس نے مسکرا کے ایک اور بوجھ شانے پر اٹھایا اور کمرے کی طرف چل پڑا۔

وہ جو دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی، دروازہ کھلنے پر خود کو گرنے سے بچاتے ہوئے ایک طرف ہوئی۔

"سوری۔" اس کے پاس پہلا ہی لفظ معافی کا تھا۔

وہ گہرے سبز اور ہلکے سنہری لہنگے، زیور اور میک اپ میں روز کی دیبا سے بہت مختلف لگ رہی تھی تاہم چہرے پر انتہا کی سنجیدگی تھی۔

وہ آگے بڑھ کر پلنگ تک پہنچ گیا لیکن وہ وہیں کھڑی رہی۔ وہ پلٹ کر اسے دیکھنے لگا جو کچھ کہنے کے لیے پر تول رہی تھی۔ وہ کئی دنوں سے خود کو سمجھا رہا تھا اس گھڑی کے لیے خود کو راضی اور تیار کر رہا تھا پھر بھی اس وقت اس کا رواں رواں احتجاج میں مصروف تھا جب کہ اسے باپ کی باتیں بھی بھولی نہیں تھیں۔

"کچھ کہنا ہے؟" وہ دو قدم آگے آیا۔ وہ شعوری طور پر دروازے سے دور ہونے کے لیے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اپنی بات کس طرح اس تک پہنچائے۔

"کہو۔" اسے یونہی جز بز اور چپ دیکھ کر اس نے پھر کہا۔

"آپ میری فکر نہ کریں۔ مطلب آپ انکل۔ میں انہیں پتا نہیں لگنے دوں گی۔ میری اور امی کی مجبوری تو آپ بھی جانتے ہیں۔ ہم کسی سے نہ نہیں کہہ سکتیں۔ ویسے امی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ۔" اس نے ذرا سا سر اونچا کر کے اسے دیکھا اور اس غلطی پر جو بے ربط سے جملے نکل رہے تھے، وہ بھی روٹھ گئے۔

"میں۔" اس نے کسی طرح گم ہوئے الفاظ تلاش کیے۔

"پریشان نہیں کروں گی۔ اور جیسا آپ کہیں گے۔" وہ آگے آیا اور دیبا سہم کر خاموش ہو گئی۔

"ڈرو نہیں، ریلیکس!" اس کے حسین چہرے پر در آئے خوف نے اس کی آواز خود بخود نرم کر دی۔

"فلحال جو سچویشن ہے اور جیسے اتنی جلدی شادی ہوئی ہے، بس اسی وجہ سے۔"

وہ اس سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ تم مجھے بیوی کی حیثیت سے پسند نہیں، میں نے یہ شادی بڑے جبر سے، مجبوری میں کی ہے، میں خوش نہیں ہوں اور میں کبھی تمہارے ساتھ خوش رہ بھی نہیں سکتا۔

اگر دیبا نے اتنے دن اس گھر میں نہ گزارے ہوتے تو وہ یہ سب کچھ شدید نفرت اور غصے میں اس سے کہہ رہا ہوتا لیکن بات تو یہ بھی سچ تھی کہ اگر اس نے کچھ دن اس گھر میں نہ گزارے ہوتے تو اس سے شادی کی نوبت بھی نہیں آنا تھی۔

وہ بات کے بیچ اچانک چپ ہو گیا تھا اور اب کسی خیال میں ڈوبا اسے دیکھ رہا تھا۔ دیبا نے آنکھ اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ ہوش میں آیا۔

"تم چینج کر لو۔" اس کا مزید کچھ بھی کہنے سے دل اچاٹ ہو گیا۔

وہ احتیاط سے لہنگا سنبھالتی کپڑے بدلنے چلی گئی۔ جب وہ حلیہ بدل کر واپس آئی تو منیب کپڑے بدل کر سو گیا تھا۔ اب جانے سچ میں سویا تھا یا سویا بن رہا تھا۔ اس کا بھی دل کیا، اپنے کمرے میں جا کر سو جائے لیکن اس وقت وہاں اس کی امی برسوں بعد پر سکون اور خوش ہو کر سو رہی تھیں۔

ادھر ادھر دیکھنے کے بعد کمرے میں ایک صوفے کی موجودگی کا احساس ہوا۔ دیوار سے لگا صوفہ چیزیں رکھنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس پر بڑے بڑے کارٹن اور کتابیں رکھی تھیں۔ سارے ممکنات پر غور کرنے کے بعد اس نے کرسی پر بیٹھ کر پیر اوپر کیے، دوپٹا پھیلا کر چادر کی طرح اوڑھا اور پیچھے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

رات کس پہر اس کی آنکھ کھلی اور کروٹ بدلتے ہوئے نظر کرسی پر گھٹڑی بنی دیبا پر پڑی تو وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے افسوس سے دونوں ہاتھ بالوں میں پھنسائے۔ اسے یوں کرسی پر رات گزارتے دیکھ کر اسے اپنے ظالم اور بے حس ہونے کا شدید احساس ہوا تھا۔

جس رات کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ غم دہ دل کے ساتھ اپنے ارمانوں اور خوابوں کا سوگ منائے گا۔

اس شب اس نے دنیا کی سب سے بڑی سچائی جان لی کہ جو ہمارے پیاروں سے اچھا سلوک کرتا ہے، ہمارا دل اس کی پروا خود بخود کرنے لگتا ہے۔

☆☆☆

وہ معمول کی طرح اٹھ کر باورچی خانے میں آ گئی تھی۔ منیب کمرے میں سو رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ عابدہ بھی اٹھ کر سیدھی ادھر ہی چلی آئیں۔

"تم کیوں ادھر آ گئیں، جاؤ کمرے میں۔ آج میں سنبھال لوں گی سب۔" اسے دیکھتے ہی وہ تیزی سے بولتے ہوئے آگے آئیں اور اس کے ہاتھ سے چاقو لے کر سامنے سے پیاز کی پلیٹ دور کی۔ وہ دھیرے سے ہنسی۔

"امی! عادتیں ایک دن میں نہیں بدلتیں۔ جیسے

آپ اس وقت اٹھ کر کچن میں آئی ہیں ویسے ہی میں بھی۔" اس نے ہلکے انداز میں بات ٹالنی چاہی۔

"تم جاؤ، منیب جاگے تب اس کے ساتھ آنا۔"

"وہ بضد تھیں۔"

"امی!" اس نے رسان سے کہا۔ "آپ اس بات کی طرف سے بالکل بےفکر رہیں کہ یہاں کوئی مجھ سے ناراض یا غصہ ہوگا یا کسی کو کچھ برا لگے گا، یہاں ایسا مزاج الحمدللہ کسی کا نہیں ہے۔" اس نے ماں کو اطمینان دلانے کی کوشش کی۔

"صدفی صد درست کہہ رہی ہے ہماری بیٹی۔" اعظم میر نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ دیبا کا گھر ہے جیسی اس کی مرضی اسے کرنے دیں۔" وہ دونوں ان آمد پر گڑبڑا گئی تھیں۔

"مجھے بھی چائے دینا بیٹا۔"

"آپ بھی جلدی جاگ گئے؟" اس نے چولہا جلاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، بیگم کو پانچ بجے چہل قدمی کرنا تھی۔ واپس آ کر خود تو سو گئی ہیں لیکن اب میری نیند چہل قدمی کو نکل گئی ہے۔" انہوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ ان کی بات پر مسکرا دی۔ عابدہ کو ان دونوں کی بےتکلفی اور باتیں خوش گوار لگ رہی تھیں۔

"آپ کہیں تو میں منور بھائی سے بات کرلوں کہ اب آپ یہیں رہیں گی؟" انہوں نے عابدہ سے کہا۔ دیبا خوشی سے ان کی سمت پلٹی لیکن اس سے پہلے عابدہ کہنے لگیں۔

"ابھی نہیں، کچھ دن رک جائیں۔" وہ سب دیبا کے رشتے اور شادی پر حیران تو تھے ہی ساتھ ناخوش بھی تھے، وہ انہیں مزید خفا نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ دیبا نے انہیں دیکھا تو انہوں نے آنکھ کے اشارے سے اسے چپ رہنے کو کہا۔

"ٹھیک ہے جیسا آپ مناسب سمجھیں۔"

☆☆☆

اسی شام عابدہ واپس چلی گئیں۔ سلمان اور فاریہ ہنی مون پر روانہ ہو گئے تھے۔ گھر میں منیب کی پھپھو کے علاوہ اور کوئی مہمان نہیں تھا۔ ان کے بہو بیٹا بھی واپس چلے گئے تھے۔

"کرسی پر مت سونا۔" وہ آدھے گھنٹے کے کام کو دو گھنٹے میں ختم کر کے آئی تو چپکے سے دروازہ کھولا تاکہ اس کی نیند خراب نہ ہو لیکن وہ تو جیسے اسے اطلاع دینے کے لیے جاگ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی کہا۔

دیبا کی نظر بےاختیار صوفے کی سمت گئی جہاں آج کوئی سامان نہیں تھا۔ اس نے کن اکھیوں سے پلنگ کی سمت دیکھا۔ منیب کروٹ بدل کر سو گیا تھا۔ صوفے پر تکیہ اور چادر بھی پڑی تھی۔ اس کی ایسی فکر ماں کے علاوہ کوئی اور نہیں کرتا تھا۔ اس نے ممنونیت بھری نگاہ سے سوئے منیب کو دیکھا۔ محرومیاں زود حس بنا دیتی ہیں۔ دکھ، انبساط سب ذرا ذرا سی باتوں کے محتاج ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆

کھانا پکانے کے علاوہ جب اسے فرصت ہوتی، وہ اپنے کمرے میں چلی جاتی تھی لیکن اب کمرہ بدل گیا تھا۔ حالاں کہ دن کا زیادہ وقت منیب کمرے میں ہوتا نہیں تھا پھر بھی وہ جانے سے کتراتی تھی۔ کبھی لان میں بیٹھ جاتی تو کبھی خالی ڈرائنگ روم میں۔ اعظم میر اور قرۃ العین کہیں ایک ساتھ ہوتے تو ان کے پاس نہیں جاتی تھی۔ ثنا تو کا رویہ اس کے ساتھ شادی سے پہلے ہی نرم اور اپنائیت بھرا ہوا تھا لیکن ان کے درمیان بےتکلفی نہیں تھی۔

وہ صبح منیب کے جاگنے سے پہلے ہی کمرے سے چلی جاتی تھی۔ رات میں وہ کمرے میں کام کر رہا ہوتا یا ٹی وی پر کچھ دیکھ رہا ہوتا، اس وقت وہ تھکی ہاری اندر آتی اور اپنی چادر تکیہ لے کر صوفے پر سو جاتی۔ وہ خود بستر پر جانے سے پہلے اس پر ایک آدھ نظر ڈال لیتا کبھی صوفے سے نیچے لٹکتی چادر اس پر ڈال دیتا۔ اس کی لاعلمی میں اسے دیکھتے رہنے کا نتیجہ تھا کہ اسے دیبا کے چہرے کے نقوش یاد ہو گئے تھے۔ اس کی کمان سی سیاہ بھنویں، چھوٹی سی ناک، چوڑی پیشانی اور بھرے سے ہونٹ جو سوتے ہوئے

ادھ کھلے رہتے تھے۔

پہلے اسے عابدہ سے ملنے جانا ہوتا تو وہ یا سلمان، ماموں کے گھر چھوڑنے اور لینے جاتے تھے۔ شادی کے بعد یہ ذمہ داری مکمل اس کی ہوگئی تھی۔ وہ اسے باہر ہی چھوڑ آتا تھا اور لینے کے لیے بھی جاتا تو فون کر کے اسے باہر بلا لیتا تھا۔

سلمان اور قاریہ صبح ایک ساتھ جاتے اور رات ساتھ گھر آتے تھے۔ اکثر تو رات کا کھانا بھی ان کا باہر ہی ہو جاتا تھا۔ چھٹی کے دن دیر سے جاگتے۔ اکثر چھٹی کے دن ان کی کسی دوست کے یہاں دعوت ہوتی اور جس دن دوست کے یہاں نہ ہوتی اس دن قاریہ کے گھر مدعو ہوتے۔

آج بھی گیارہ بجے اٹھ کر وہ اس وقت باورچی خانے میں آئی تھی جب دیبا کھانا بنا کر وہاں سے جانے والی تھی۔ برتن دھونے والی ماسی جا چکی تھی۔ چھٹی کے دن اس نے صفائی والی ماسی کو دیر سے بلانا شروع کر دیا تھا تاکہ سب کمروں کی صفائی ممکن ہو سکے۔

"میرے لیے بھی پراٹھا اور چائے بنا دو۔" قاریہ نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ روز صبح وہ دونوں بنا ناشتہ کیا جاتے تھے کہ ان کے دفتر میں ناشتے کا انتظام ہوتا تھا۔

اس نے فریج سے آٹا نکالا اور چائے رکھی۔ قاریہ اپنے فون میں مصروف تھی۔ اعظم میر کمرے کے جگ میں پانی بھرنے آئے تو وہ چائے چھان رہی تھی۔

"ابھی تک ناشتہ نہیں کیا بیٹا؟"

"یہ میرے لیے ہے انکل۔" قاریہ نے فون سے سر اٹھایا۔ انہوں نے کچھ نہیں کہا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" اس نے قاریہ کا ناشتہ میز پر رکھا تو وہ اسے ساتھ لیے باہر نکلے۔

وہ ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھے اس سے اردو اخبار سن رہے تھے جب سلمان کمرے سے برآمد ہوا۔

"مجھے ناشتہ بنا دیں۔" اس نے باورچی خانے کی سمت جاتے ہوئے رک کر کہا۔

"اندر آپ کی بیگم موجود ہیں، ان سے کہیں، آپ کی خدمت ان کا فرض ہے دیبا کا نہیں۔"

اعظم میر کا لہجہ عام اور سادہ نہیں تھا۔ سلمان تو لب بھینچتا وہاں سے چلا گیا لیکن وہ بے چین ہو اٹھی۔

"میں بس پانچ منٹ میں انہیں ناشتہ دے کر آتی ہوں۔"

"بیٹا! تم پہلے بھی اس گھر کی ملازم نہیں تھیں ہماری معاون اور محسن تھیں اور اب اس گھر کا فرد ہو بلکہ تم نے ہی سب سنبھالا ہوا ہے، سربراہ ہو تم قرۃ العین کے بعد۔ میں کسی کو تمہیں کمتر گرداننے کی اجازت دیتا ہوں نہ ایسا کرتے دیکھ سکتا ہوں۔ ایک دوسرے کے لیے کام کرنے میں کوئی عار نہیں لیکن یہ میچوئل اور ایک ہی سطح پر رہ کر ہونا چاہیے، دوسرا آپ کو کمتر سمجھے تو اسے احساس دلانا ضروری ہے کہ ہم برابر ہیں۔" وہ چپ چاپ ان کی بات سن رہی تھی۔

"یہ معاملات گھر کی عورتیں دیکھتی ہیں، گھریلو ایشوز میں مجھ میں قرۃ العین جیسی قابلیت اور سمجھ نہ سہی لیکن ناانصافی نہ ہونے دوں، اتنا تو قائل ہوں۔" وہ مسکرائے۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ آپ کی سمجھ اور قابلیت پھپھو سے بھی زیادہ ہے لیکن جواباً مدھم سا مسکرا کے رہ گئی۔ وہ اپنے طور پر بیوی کی ذمہ داریاں بھی نبھانے کی کوشش کر رہے تھے مگر بات یہاں ختم نہیں ہوئی تھی۔

کچھ دن بعد جب وہ ایک ساتھ کھانے کی میز پر موجود تھے، قاریہ کو مرچیں تیز لگیں۔ اس نے پانی کا گلاس خالی کر کے آواز کے ساتھ واپس رکھا۔

"ایسا کھانا۔" اس نے پلیٹ دور کی۔

"گھر میں موجود سبھی ممبرز کی پسند کا خیال رکھ کر کھانا بننا چاہیے، یہ نہیں کہ ایک کی مرضی اور پسند زبردستی سب کو کھانا پڑے۔" سب ہی اسے حیرت اور ناگواری سے دیکھ رہے تھے۔

"بالکل ٹھیک۔ کل سے ڈنر قاریہ بنائیں گی

اور سنڈے لنچ ڈنر دونوں، ہمیں چھوٹی بہو کے ہاتھوں کا ذائقہ بھی تو پتا چلے۔'' اعظم میر کی بات پر سب کو سانپ سونگھ گیا۔

''چھوٹی بہو کون؟'' قرۃ العین نے پرسوچ آنکھوں سے شوہر کو دیکھا۔

''فاریہ۔'' انہوں نے اس کی سمت اشارہ کیا۔
''ہمارے سلمان کی نصف بہتر، تمہاری چھوٹی بہو۔''

''اچھا۔'' انہوں نے مسرت سے فاریہ کو دیکھا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' وہ اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے پیچھے ہی سلمان بھی اپنی پلیٹ چھوڑ کر اٹھ گیا۔

''کیا ہوا؟'' قرۃ العین نے باری باری سب کو دیکھا۔

''وہ کیوں ناراض ہو گئے؟''

''کچھ نہیں ہوا، آج میٹھے میں حلوہ ہے، اس کی جگہ رکھنا ہے ورنہ تم سے کھایا نہیں جاتا ہے پھر۔'' انہوں نے دھیان بٹانے کے لیے حلوے کا پیالہ ان کے سامنے کیا۔

''آج میرا انڈے کا حلوہ کھانے کا دل تھا۔'' قرۃ العین نے منہ بسورا۔ وہ میٹھے کی شوقین تھیں۔

''وہ کل بنا لیں گے۔'' وہ انہیں باتوں میں لگا رہے تھے اور وہ تینوں خاموش تھے۔

کچھ دیر بعد فاریہ اور سلمان تیار ہو کر باہر چلے گئے۔ سب جانتے تھے، وہ باہر کھانے کے لیے گئے ہیں۔

''سلمان بھائی کتنے بدل گئے ہیں، یقین ہی نہیں آتا۔'' شانو نے افسردگی سے کہا۔

اس کے چند دن بعد سلمان نے دھماکا کیا، وہ الگ گھر کرائے پر دیکھ چکا ہے اور اگلے اتوار وہاں منتقل ہو جائے گا۔ اعظم میر نے اسے کچھ نہیں کہا جب کہ مُنیب نے سمجھانے، منانے کی کوشش کی۔ جواباً اس کا سرد اور دوٹوک رویہ اسے مزید دکھی کر گیا۔ جو جانے کا طے کر لیں وہ کسی سے نہیں رکتے۔

☆☆☆

زندگی لگے بندھے معمول پر کاربند تھی۔ سلمان کے جانے کے صدمے کے بعد کسی طرح سب نے صبر کر لیا تھا۔ قرۃ العین کو سلمان کی یاد آتی تھی۔ جب بھی وہ اس کا پوچھتیں ان کے پاس بہانے ہوتے تھے کہ وہ دفتر گیا ہے یا دفتر کے کام سے کچھ دن کے لیے شہر سے باہر۔

شانو کچھ چڑچڑی سی ہو گئی تھی۔ دوسری بار بھی 'نیٹ' میں اس کے نمبر کم آئے تھے۔ یعنی تعلیمی میدان میں دو سال سے وہ ایک ہی جگہ کھڑی تھی۔ وہ ایم بی بی ایس سے کم ڈاکٹر بننے تیار نہ تھی۔ پیڈ سیٹ پر داخلہ لینے سے اس نے منع کر دیا تھا۔ اسے بی ایس سی کرنے میں بھی دلچسپی نہیں تھی۔

''مجھے ایک سال اور ریسٹ کرنے دیں۔'' اس نے اعلان کیا۔ ''ایک بار اور 'نیٹ' دوں گی۔''

اسے مصروف رکھنے کے لیے اعظم میر نے کسی طرح اسے بیکنگ سیکھنے کے بنیادی کورس میں داخلہ کروا دیا تھا۔ قرۃ العین بیکنگ میں ماہر تھیں اور ان کی بیماری کے بعد سے وہ سب ان کے ہاتھوں کے بنے کیک، کوکیز اور مفنز کو ترس گئے تھے۔ دیبا کھانا ذائقے دار بناتی تھی لیکن اسے روایتی پکوان ہی بنانے آتے تھے۔ اسی نکتے کو استعمال کرتے ہوئے انہوں نے شانو کو منا لیا تھا۔ پڑھائی شروع کرنے کے لیے وہ اب بھی تیار نہیں تھی اور حد درجہ فراغت بھی تو بیماری ہے۔

☆☆☆

''واؤ!'' اسے دیکھتے ہی شانو کا منہ کھلا رہ گیا۔

''کتنا سوٹ کر رہا ہے آپ پر یہ کلر۔'' اس نے گہرے فیروزی رنگ کا جوڑا زیب تن کیا تھا۔ شادی کے بعد سے اس کے پہننے اوڑھنے میں تبدیلی آئی تھی۔ چار پانچ ملگجے سے جوڑوں کی جگہ اب وہ 'ریڈی میڈ' نفیس اور اعلا برینڈ کے کپڑے پہنتی تھی جو شادی کے وقت شانو اور پھپھو وغیرہ نے مل کر

خریدے تھے۔

منیب نے لیپ ٹاپ سے توجہ ہٹا کر اسے دیکھا جو مہینے بھر کے جمع اخبار ردی والے کو دینے کے لیے الگ کر رہی تھی۔ اس کی اجلی رنگت بلاشبہ اس رنگ میں مزید کھلی اور تروتازہ لگ رہی تھی، اس کے سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں بھی۔ اپنی محویت پر اس نے گڑبڑا کے دوبارہ اسکرین پر دھیان لگایا۔

"آپ یہ کلرز زیادہ پہنا کریں۔" شانو کی بات پر وہ مسکرائی۔

"ہے ناں بھائی؟" اس نے اسے گھسیٹا۔

"ہمم۔" اس نے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے سے گریز کیا۔

"شاپنگ کرتے ہوئے ہمیں یاد آیا تھا کہ آپ سے تو پوچھا ہی نہیں کون سا کلر آپ کا فیورٹ ہے، تب پھپو نے کہا، میں آئی ہوں تب سے اسے زیادہ گرین کلر ہی پہنے دیکھا تو وہی فیورٹ ہوگا۔" شانو بھی اس کے ساتھ بیٹھ کر اردو اور انگریزی اخبار الگ کرنے لگی۔ وہ اردو اخبار سے قرآنی آیات کے ترجمے تفسیر والا حصہ قینچی سے کاٹ کر الگ رکھ رہی تھی۔ وہ بس مسکرا دی۔ اس نے کبھی اپنی پسند سے کچھ نہیں خریدا تھا۔ جو اسے دیا جاتا، اسے، وہی استعمال کرنا ہوتا تھا۔ اب بھی وہ یہی کر رہی تھی۔

ویسے آپ بتا دیں، اب کیا پھپو کا اندازہ درست تھا؟

"مجھے کریم یا آف وائٹ پسند ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"اوہ! لائٹ کلرز تو لیے ہی نہیں تھے ہم نے۔" شانو نے افسوس سے کہا۔ یہ سچ تھا اس کے پاس اپنی پسند کے رنگ کا کوئی جوڑا نہیں تھا۔

اسی وقت اعظم میر قرۃ العین کے ہمراہ چہل قدمی سے واپس آئے۔

شانو ان کے لیے پانی لینے اٹھ گئی۔ اس نے ساری کترنیں اٹھا کر دراز میں ڈال دیں۔

"اخبار کی کٹنگ یہاں رکھی ہے انکل۔ آپ مسجد جاتے ہوئے لے جایئے گا۔" مسجد میں ایک ڈبہ اخبار کی عربی آیات وغیرہ کے لیے مختص تھا۔

"میں نے کہا تھا ناں چائے پی کر نہیں جاتے، اب پھر طلب ہو رہی ہے۔" قرۃ العین نے کہا۔ اعظم میر مسکرا دیے اور وہ اخبار ایک طرف رکھ کر چائے بنانے کھڑی ہوگئی۔ جاتے ہوئے قرۃ العین نے چائے پینے سے منع کر دیا تھا کہ پھر انہیں بہت پسینہ آتا ہے، اس لیے واپس آ کر پی لیں گے۔

اس کے بعد سے ہر دن منیب کا ذہن اس کے کپڑوں کا رنگ یاد کر رہا تھا اور وہ اس نئی اور عجیب پیش قدمی پر جھنجلا رہا تھا۔

"مجھے کیا جو کلر پہنے!" وہ سر جھٹک کر بڑبڑاتا لیکن یہ صورت حال اس کے اختیار سے باہر ہوگئی تھی۔ شانو کی بات بہانا بن گئی تھی۔ اسے چلتے پھرتے کام کرتے دیکھتے ہوئے اب اس کی آنکھیں اور ذہن بھی مصروف رہنے لگے تھے۔ وہ اس وقت چونک اٹھتا جب کام کے دوران اچانک اس کے بال بنانے کے انداز سے لے کر اس کی بالی، چوڑی، دوپٹا اور کبھی وہ خود ہی چھم سے تصور میں در آتی۔

اس نے آہستہ سے دروازہ بند کیا اور بالوں کو تولیے کی گرفت سے آزاد کر کے بال خشک کرنے لگی۔ تولیہ کرسی پر پھیلا کر اس نے آئینے کے سامنے رکھی اپنی چار چوڑیوں کو دیکھا۔ منیب کی پھپو نے اس کے ہاتھوں میں وہ کانچ کی چوڑیاں پہناتے ہوئے کہا تھا کہ کلائیاں کبھی خالی مت رکھنا۔ اب صرف چار چوڑیاں بچی تھیں۔ اسے عادت نہیں تھی سو اکثر کام کے دوران ٹوٹ گئی تھیں۔ اسے الجھن بھی ہوتی تھی سو وہ روز اتار دیتی کہ اب نہیں پہنے گی لیکن حکم عدولی اس کے مزاج میں تھی ہی نہیں۔ صبح کمرے سے نکلنے سے پہلے وہ پھر پہن لیتی۔ اب بھی اس نے چاروں چوڑیاں اٹھائیں اور ایک ہی کلائی میں ڈالنے لگی تھی کہ پہلے سے دراڑ پڑ چکی چوڑی ٹوٹ کر نیچے گر گئی لیکن اس سے پہلے کلائی پر سرخ لکیر چھوڑ گئی۔ اس نے ہلکی سی 'سی' کے ساتھ تین

چوڑیاں واپس رکھ دیں۔ اچانک پیچھے سے آکر منیب نے اس کی کلائی ہاتھ میں لی تو اس بری طرح ڈری کہ منیب نے فوراً کہا۔

"میں ہی ہوں۔" منیب نے اس کے سہمے چہرے کو دیکھا۔

وہ روز اس کے جاگنے سے پہلے کمرے سے چلی جاتی تھی۔ اسے خبر نہیں تھی، وہ اس وقت نہ صرف جاگ گیا ہے بلکہ پیچھے بیٹھا اسے دیکھ بھی رہا تھا۔ چوں کہ وہ حصہ آئینے میں دکھائی نہیں دیتا تھا سو اسے پتا نہیں چلا۔

منیب نے کچھ کہے بنا دراز کھول کر ذرا سی تلاش کے بعد بینڈ یج نکالی۔ سرخ سی لکیر کو بینڈ یج سے ڈھانک کر اس نے دیبا کو دیکھا۔

"یہ پہننا ضروری ہے؟" اس نے نظر اس پر رکھتے ہوئے سر سے چوڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"آنٹی نے کہا تھا، ہاتھ خالی نہیں رکھنا۔"

"آنٹی۔؟"

"آپ کی پھپھو۔"

"وہ چلی گئی ہیں اور اگر تمہیں پسند نہیں یا اس سے مسئلہ ہے تو نہ پہنا کرو۔" وہ اسے روز سونے سے پہلے چوڑیاں اتارتے دیکھ رہا تھا۔

دیبا نے سر ہلا کر جانے کیا جواب دینے کی کوشش کی، منیب کے پلے کچھ نہیں پڑا۔ وہ اپنا تولیہ لیے نہانے چلا گیا۔ واپس آیا تو دیبا کمرے میں نہیں تھی لیکن تین چوڑیاں آئینے کے سامنے پڑی تھیں۔

☆☆☆

اعظم میر اسے دو تین بار کہہ چکے تھے کہ کبھی دیبا کو باہر گھمانے پھرانے لے جاؤ۔ وہ کام کی زیادتی اور وقت کی کمی کا بہانا بنا کر ٹال رہا تھا لیکن جب قرۃ العین نے اس سے کہا تو وہ بہانا نہیں بنا سکا۔

"تم اسے کہیں لے کر ہی نہیں جاتے ہو۔ شادی کے بعد تمہارے پاپا کسی اتوار مجھے باہر نہ لے جائیں تو میرا ان کا جھگڑا ہو جاتا تھا۔"

اب وہ بہت کم اس طرح مناسب اور صحیح بات کرتی تھیں اور وہ اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکا۔

"تم ریڈی ہو جاؤ، کہیں چلتے ہیں۔"

وہ مغرب کی نماز پڑھ کے جائے نماز اٹھا رہی تھی کہ منیب کی بات پر ہونق بنی ایسے ہی رک گئی۔ اس نے مصروف انداز میں فون لگاتے ہوئے اس سے کہا اور کمرے سے چلا گیا۔

کچھ دیر بعد وہ حلیہ سدھار کر ڈرائنگ روم میں آئی تو وہاں سب کے درمیان بیٹھا منیب کھڑا ہو گیا۔ اسے یوں سب کے سامنے اس کے ساتھ جاتے ہوئے شرم آرہی تھی۔ وہ کبھی پاس پاس بھی نہیں بیٹھے تھے اور اس کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھنے کے بعد اسے بند کار کی مختصر جگہ اور اس سے نزدیکی عجیب گھبراہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔

"کہاں چلیں؟" کار سڑک پر موڑتے ہوئے اس نے پوچھا۔ وہ اسکول، کبھی کبھار محلے کی دکان اور رشتے داروں کی شادی میں شادی ہال کے علاوہ کہیں نہیں گئی تھی تو اسے کیا بتاتی۔ اس کی جز بز سی خاموشی پر اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ اپنے ازلی ٹھہرے، ہچکچاتے انداز میں گویا ہوئی۔

"کہیں۔ بھی۔" اس کے متوقع جواب پر وہ مسکرا دیا۔

مال میں بھٹک بھٹک کر خریداری کے بعد انہوں نے وہیں مال کی چھت پر ریستوراں میں کھانا کھایا اور واپس گھر آئے تو گیارہ بج گئے تھے۔ وہ کپڑے بدلے بغیر ہی باورچی خانے میں چلی گئی۔ اس کا رات کا آخری کام قرۃ العین اور اعظم میر کے کمرے میں دودھ پہنچانے اور دواؤں کی یاددہانی کا ہوتا تھا۔ آج اسے دیر ہو گئی تھی۔

"بیٹا!" وہ دستک دے کر اندر داخل ہوئی تو اعظم میر نے پیار بھرے انداز میں اسے پکارا۔

"ساری میڈیسن ... لے لی ہے اور دودھ بھی۔ آج تمہارا کام شانو نے کر دیا۔" وہ شرمندہ ہو گئی۔ باتی بھی تو ذمہ دار تھے۔

"تم آرام کرو، تھک گئی ہوگی۔"

''جی۔''

وہ کمرے میں آئی تو منیب کپڑے تبدیل کر چکا تھا۔ ساری کاغذی تھیلیاں پلنگ پر رکھی تھیں۔ وہ کپڑے بدل کر اور وضو کر کے جائے نماز اٹھانے جا رہی تھی کہ منیب نے پکارا۔

''دیبا!'' اس نے پہلی بار اسے نام سے آواز دی تھی۔ وہ رکی تو چہرے پر خوش گوار حیرت میں گھلی ملی خوشی بھی تھی۔ وہ پاس آیا تو اس نے اس کے ہاتھ میں چوڑیاں دیکھیں۔ مشہور برینڈ کا اشتہار ٹی وی پر دیکھتے ہوئے اس نے کب سوچا تھا کہ کبھی کوئی اس کے لیے یہاں سے کچھ خریدے گا۔ منیب نے اس کا بایاں ہاتھ تھاما۔

''یہ تو نئی نہیں ہیں۔'' پتلی سی نفیس اور نازک سی تین طلائی چوڑیاں اس کی کلائی میں پہناتے ہوئے اس نے کہا۔ اس نے پھر یہ ہی دوسری کلائی کے ساتھ دہرایا۔ دیبا کا دل انجانی خوشی سے معمور ہو رہا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کے ساری تھیلیاں اٹھائیں۔

''یہ بھی تمہارے ہی ہیں۔'' وہ یوں انہیں رکھ کر چلی گئی تھی جیسے کسی اور کے ہوں۔ دیبا نے قدرے تذبذب سے وہ اس کے ہاتھ سے لے لیے۔ وہ سوچ رہی تھی اسے شکریہ ادا کرنا چاہیے لیکن اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔ وہ ذرا سا سر خم کرتی وہاں سے ہٹ گئی۔

دیبا تو نماز پڑھ کے سو گئی لیکن منیب کو اس کے چہرے سے جھلکتی دبی دبی خوشی ایک عجیب سے احساس جرم میں مبتلا کر گئی تھی۔

''کیا تم اپنی خدمات کے بدلے بس اسی مادی صلے کی مستحق ہو؟ کیا میں نے تمہیں اس رشتے کو بنا کسی احتجاج اور ڈیمانڈ کے نبھانے پر یہ رشوت دی ہے؟ بنا احساس اور جذبات کے ان تحائف کی کوئی اہمیت ہے بھی۔۔؟ تمہارے لیے احساس اور جذبات تو ہیں میرے اندر لیکن محبت۔ تمہارا جائز مقام، حق۔۔؟''

وہ صوفے کے پاس کھڑا نیند میں ڈوبے چہرے پر پھیلی طمانیت کو دیکھ کر بے آواز اس سے مخاطب تھا۔ سوتے ہوئے بھی اس کے چہرے پر اندرونی خوشی کا اثر تھا۔

وہ نیچے لٹک رہی چادر ٹھیک سے اس پر ڈال کر بستر پر آ گیا لیکن اس شب نیند اس کے پاس نہیں آئی۔

☆☆☆

اعظم میر کا زیادہ وقت قرۃ العین کے ساتھ گزرتا تھا ان دونوں کے ساتھ اکثر دیبا بھی شامل ہو جاتی۔ وہ اس سے بھی ادھر ادھر کی باتیں کرتے تھے۔ وہ زندگی میں پہلی بار اپنی ماں کے علاوہ کسی اور سے آرام اور بے تکلفی سے بات کرنے لگی تھی۔ ان کی پدرانہ شفقت اس میں اعتماد بھر رہی تھی۔ قرۃ العین کو دیگر جسمانی عارضے بھی لاحق ہونے لگے تھے۔ موتیا بند کے علاوہ انہیں ذیابیطس بھی لاحق ہو گیا تھا۔ سیڑھیوں سے گرنے کے بعد سے گھٹنے کا درد بھی رہتا ہی تھا۔

وہ دونوں چہل قدمی کے لیے جا رہے تھے کہ ڈرائنگ روم میں دیبا کو دیکھ کر قرۃ العین کا ارادہ بدل گیا۔

''میں دیبا کے ساتھ جاؤں گی۔''

''آ جاؤ بھئی تم بھی ہمارے ساتھ۔'' اعظم میر نے کہتے ہوئے ہاتھ سے اسے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

''آپ نہیں۔'' انہوں نے نروٹھے پن سے کہا۔

''صرف میں اور دیبا ہم دونوں ہی واک کو جائیں گے۔''

''او کے۔ جاؤ بیا۔'' انہوں نے تو آرام سے کہہ دیا لیکن دیبا کو بڑا برا لگا۔

اتنا برا کہ اگلی صبح جب وہ اخبار پڑھ رہے تھے تو انہیں چائے دینے کے بعد وہ ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ انہیں کہنا چاہتی تھی کہ آپ ان کی بات کو دل پر نہ لیں۔ اسے قرۃ العین کا اعظم میر پر اسے ترجیح دینا

اپنی خطا لگ رہا تھا۔ وہ ان حالات میں بیوی کا جتنا اور جیسا خیال رکھ رہے تھے، وہ اس کی گواہ تھی اور وہ اس برتاؤ کے مستحق نہیں تھے جیسا ان کے ساتھ اس کی وجہ سے ہوا تھا۔ اسے اپنی پھوپھو پر رشک آتا تھا اور ان دونوں کے ایک ساتھ جانے کے بعد اعظم میر کا پیچھے تنہا رہ جانا اس کے ذہن سے نکل نہیں رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' انہوں نے اخبار بند کر کے رکھا۔

''کل پھوپھو نے مجھے۔'' اسے عادت کہاں تھی اب بھی اس سے جملے نہیں بن رہے تھے۔

''وہ۔ مجھے اپنی کزن سمجھ رہی تھیں، اس لیے۔ وہ ماضی میں تھیں۔ ورنہ پھوپھو۔ وہ آپ سے۔'' وہ جس طرح مسکرائے، وہ رک گئی۔

''تم بہت حساس ہو بیٹا۔'' ایسی شفقت سے اسے اعظم میر سے پہلے کسی مرد رشتے دار نے مخاطب نہیں کیا تھا، وہ سارے مرد جس سے اس کا خون کا رشتہ تھا۔

''تم ابھی نہیں سمجھوگی۔ محبت احساس اور خلوص جب ایک سطح پر ہو تو پھر اس سے مضبوط رشتہ کوئی نہیں ہوتا، اس کے بعد کوئی بات، کوئی راز، کوئی انہونی، کوئی جھٹکا دو نفوس کو جوڑنے والی کڑی کو کمزور کرنے کا اہل نہیں رہ جاتا اور تعلق کا حسن یہ ہی رفاقت تو ہے جس میں ماضی اور مستقبل کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی، سب کچھ حال ہوتا ہے، یہ پل جب ہم ساتھ ہیں، پاس ہیں، یہی تو سب کچھ ہے، یہ ہی تو 'ہم' ہیں۔ اور 'ہم' کا ہونا ہی خوشی ہے، زندگی ہے۔ عینی کا دل بدلا ہے نہ محبتیں، کہیں کھوئی ہیں بس اس کا دماغ دغا دے گیا ہے لیکن میں خوش ہوں، مجھے کوئی شکایت نہیں کیوں کہ وہ میرے پاس، میرے ساتھ، میرے سامنے ہے، مجھے اس کے ہر احساس کی خبر ہے۔ وہ کہنے سے قاصر ہے لیکن میں سمجھنے سے نہیں، وہ اظہار سے معذور ہے مگر میں پذیرائی سے نہیں۔'' وہ ذرا رکے۔

''مجھے عینی کی کسی حرکت، کسی بات سے تکلیف ہوتی ہے نہ برا لگتا ہے۔ ہم اس اسٹیج سے بہت آگے نکل آئے ہیں۔ تم اتنا نہ سوچو۔''

اس کے سر سے جیسے کوئی بوجھ اتر گیا۔

''تمہیں پتا ہے نا ہمارا بچپن ایک ہی محلے میں گزرا ہے؟ ہم پڑوسی تھے۔ ساتھ میں چھپن چھپائی اور کرکٹ کھیلتے تھے۔ ہمارا اسکول بھی ایک ہی تھا۔ بعد میں میں پڑھائی کے لیے دوسرے شہر چلا گیا لیکن۔'' وہ دلچسپی سے سننے لگی تھی۔

☆☆☆

خود کو ہشاش بشاش اور صحت مند سمجھنے اور دکھانے والے اعظم میر کو اچانک شام میں اس قدر گھبراہٹ نے گھیرا کہ ثنا تو انہیں لے کر اسپتال بھاگی۔ فون ملتے ہی منیب بھی وہاں پہنچا۔ انہیں دل کا دورہ پڑا تھا۔

جانے اور کون کون سی اور کتنی آزمائشیں باقی تھیں۔ اعظم دو دن اسپتال میں رہ کر ڈھیروں ہدایات اور دواؤں کے نسخے لے کر واپس آگئے۔ انہیں گھر میں موجود قرۃ العین کی فکر تھی۔ سلمان اور منیب باری باری ان کے پاس رکے تھے۔

منیب کو افسوس تھا کہ وہ باپ کی طرف سے غافل ہو گیا تھا۔ ایک عمر کے بعد سب ہی کو احتیاط اور وقتی جانچ کے ساتھ ساتھ ذہنی و جسمانی سکون کی حاجت ہوتی ہے اور اعظم میر کی زندگی میں جب یہ وقت آیا تو انہیں وہ ملا جس سے انہیں بچنے کی ضرورت تھی، ذہنی جسمانی مشقت اور فکریں۔

''میں ٹھیک ہوں اب، تم سب اپنی پریشان شکلیں درست کر لو۔'' گھر آ کر انہوں نے سب کو ڈانٹ لگائی۔

''آپ خود سے بالکل لاپروا ہو گئے ہیں پاپا۔ آپ بھول گئے ہیں، اب آپ بوڑھے ہو رہے ہیں۔ آپ کو تھوڑا اسلو ہونے کی ضرورت ہے۔'' وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہتا ان کے پاس بیٹھ گیا۔

''اس اسپیڈ بریکر نے یہ بات ذہن نشین کرا دی ہے بیٹا۔ تم فکر نہ کرو، اب خیال رکھوں گا۔

ہمیں جتنی سانسیں گن کر دی گئی ہیں وہ کسی بیماری یا صحت مندی کو دیکھ کر اپنی گنتی کم زیادہ نہیں کرتیں، وہ بس مقررہ وقت کی منتظر ہوتی ہیں، مدت پوری ہوئی اور وہ تھم گئیں اس لیے وقت سے پہلے فکر کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہونا۔ ہاں احتیاط تو لازم ہے جو میں کروں گا۔"

وہ پہلے سے فکر مند اولاد کو اپنی وجہ سے مزید تفکرات نہیں دینا چاہتے تھے۔

"تم سب بھی اسے سر پر سوار مت کرو۔" وہ حوصلہ دینے کے لیے خوش دلی سے مسکرائے تھے۔

ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس نے دیبا کو ان کی غذا اور پرہیز کا بتایا اور وہ خود ان کی دوائیوں اور وقفے وقفے سے ڈاکٹر سے جانچ کا خیال رکھنے لگا۔

سلمان اور قاریہ بھی باپ کی خیریت پوچھنے آئے تھے۔ فاصلوں نے ان کے بیچ تکلف کی دیوار کھڑی کر دی تھی۔

☆☆☆

کبھی کبھی یکسانیت بھی انسان کو تھکا دیتی ہے۔ یہاں تو یکسانیت کے ساتھ اداسی اور ذہنی پریشانیاں بھی تھیں۔ زندگی جس نہج پر چل پڑی تھی، وہ کسی نے سوچا نہ تھا۔ سلمان ان تینوں میں پہلے سے ہی قدرے خود غرض اور لاپروا سا تھا لیکن وہ اس مشکل وقت میں یوں آنکھیں پھیر لے گا ایسا بھی نہیں لگتا تھا۔ وہ مہینوں گھر آتا تھا نہ فون کرتا تھا۔ جب اعظم میر یا منیب اسے فون کرتے تو بات ہوتی، وہ اسے گھر آنے کا کہتے تو ملاقات۔ چند سالوں میں ہی ان سب کی زندگی کے منصوبے، خواہشیں اور خواب بدل گئے تھے۔ سب کچھ قبول کر لینے کے بعد بھی کبھی کبھی اسے لگتا وہ کسی اور کی زندگی جی رہا ہے۔

وہ اسی شہر میں اٹک گیا تھا۔ جب کہ اس کا منصوبہ تھا کہ وہ ایک سال بعد اپنی فرم ممبئی یا بنگلور منتقل کرے گا۔ اسے اپنا کام خوب بڑے پیمانے پر پھیلانا تھا۔ کبھی کبھی ساری باتیں ایک ساتھ اسے اداس کرنے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتی تھیں۔ اس پر تم اب اعظم میر کی گرتی صحت تھی۔ وہ اس کے لیے ہمت اور امید کی چٹان تھے اور اب اسی چٹان کو مٹی ہوتے دیکھنا اعصاب شکن تھا۔ وہ پہلی بار اس بھری دنیا میں خود کو اکیلا محسوس کر رہا تھا۔

اب اکثر اسے منفی سوچوں کا دورہ پڑنے لگا تھا۔ ماں کے بعد یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ سب کچھ ویسا ہی رکھتا جیسے قرۃ العین نے رکھا تھا۔ اس گھر کو سنبھالنا اس کی ذمہ داری تھی جس میں وہ ناکام ثابت ہوا تھا۔ شانو کی پڑھائی سے دوری اور سلمان کی گھر سے دوری اور اعظم میر کے دل کا دورہ اسے سب اپنی ناکامی لگنے لگے تھے۔

دیبا چائے کا خالی کپ لینے واپس آئی تھی۔ اسے یوں بت بنا بیٹھا دیکھ کر رک گئی۔ چائے کا کپ جوں کا توں پڑا تھا۔ پلٹ کر واپس جانے کے بجائے وہ انگلیاں مروڑتی وہیں جمی رہی پھر کچھ ہمت جمع کر کے آگے آئی۔ اس کے سپاٹ چہرے کی تھکان اور اداسی نے اسے یوں بے چین کیا تھا کہ وہ اس کے پاس پہنچ گئی تھی مگر اب کیا کہے، کیا کرے، سوجھ نہیں رہا تھا۔

اس کے اتنے پاس آنے پر منیب چونکا۔

"اوہ سوری۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا۔" اس نے گردن گھما کر کپ کو دیکھا۔

"تم گرم کر دو میں ادھر ہی آ رہا ہوں۔"

وہ بیڈ سے اٹھ کر کپڑے تبدیل کرنے جانے لگا تھا کہ دیبا نے روکنے کے لیے اچانک اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جتنا وہ حیران ہوا، دیبا اس سے زیادہ حیران تھی۔

"آپ آرام کریں، میں یہیں لے آتی ہوں۔" اس نے اپنے دائمی ہچکچاتے انداز میں کہہ کر ہاتھ چھوڑا اور کپ اٹھا کر جانے لگی تھی کہ اب کے منیب نے بے قراری سے ہاتھ پکڑ کر روکا۔ ذرا دیر پہلے اس لمس میں اسے جو تسلی اور اپنائیت ملی تھی وہ اسے گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ دیبا سراسیمہ سی اسے دیکھنے لگی۔ اس سے خطا تو سرزد ہوئی تھی۔

منیب نے اس کے ہاتھ سے کپ لے کر

سابقہ جگہ رکھا اور خود بھی پلنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ منیب نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی اپنے ہاتھ میں لیا۔ اب وہ اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر بیٹھا تھا۔ دیبا دم سادھے اسے دیکھ رہی تھی۔ منیب نے کچھ ساعتوں بعد سر اٹھایا تو اس کا چہرہ دیکھ کر خفیف سا مسکرا دیا۔

"ڈر کیوں رہی ہو، کیا میں تمہارا ہاتھ نہیں تھام سکتا؟"

"آپ مجھے بھی تھام سکتے ہیں۔" وہ یہ سوچ ہی سکتی تھی اور سوچ کے ہی رہ گئی۔ منیب کی مسکراہٹ نے اس کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں دور کر دی تھیں۔

"تم کچن میں برنر پر کچھ چھوڑ آئی ہو؟" دیبا نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو کچھ دیر بیٹھو میرے پاس۔" اس نے خود ہی ایک ہاتھ چھوڑ کر اسے پلنگ پر اپنے بازو میں بٹھا لیا۔

وہ گردن موڑے اسے دیکھ رہا تھا۔ دیبا نے سر نہیں اٹھایا۔ اس کے گال کو چھوتی بالی سے پھسلتی نظر چہرے پر ٹھہر گئی تھی۔ جب وہ بڑی دیر تک خاموش رہا تو دیبا نے جھجکتے ہوئے اسے دیکھا۔

"آپ کو کوئی بات پریشان کر رہی ہے؟"

ہاتھ پکڑ کر روکنا اس کا بے اختیاری عمل تھا لیکن اس کے بعد جو منیب کا ردعمل تھا، اس نے یہ اختیاری جملہ اس سے بلوایا تھا۔ آج اس سے جس نے یہ پیش قدمی کروائی تھی وہ پریشانی نہیں تنہائی تھی۔

"اگر کر رہی ہے تو تم کیا کرو گی؟" اس نے سر اونچا کر کے اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں دیکھا۔

"م۔ میں۔ میں آپ کو تسلی دے سکتی ہوں۔" اس کا وہی دھیما اور رکتا ٹھہرتا لہجہ۔

"کیسے؟"

"آپ ناامید نہ ہوں، اللہ پر یقین رکھیں، دعا کرتے رہیں، اس سے ہمت اور رہنمائی مانگیں۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر کہتی رک گئی۔

"مجھے سکون سے سر رکھ کر آنکھیں بند کرنے کے لیے کاندھا اور ایک ایسی پیار بھری تھپکی چاہیے جس کے بعد کچھ مشکل نہیں لگتا، سب ٹھیک ہو جاتا ہے، جیسی امی اور پاپا سے ملتی تھی۔" حسرت اس کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی اور اس کی آواز کی ایمان داری اس کے لفظوں سے زیادہ پراثر تھی۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی لیکن جب بولی تو اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"یہ دونوں تو کب سے آپ کی دسترس میں ہیں۔" منیب نے پلکیں جھپک کر آنسو روکتی دیبا کو دیکھا۔ کبھی کبھی ناممکن اور پہاڑ سی لگنے والی مشکل ایک پل میں سہل ہو جاتی ہے۔ وہ احساس اور جذبات کی ترجمانی اور اظہار کے معاملے میں صفر تھی، اسے دل کی بات کہنے کا سلیقہ تھا نہ تجربہ لیکن اس وقت بنا کسی جھجک اور تامل کے یہ راست گوئی اس کے جذبات عیاں کر گئی تھی۔ اس کے لیے اس نے کوشش کی تھی نہ ہمت کی ضرورت پڑی تھی۔ اس کا اظہار جتنا سچا تھا اتنا ہی بے ساختہ تھا۔

"اور میں بے وقوف جواب تک خود کو محروم رکھے ہوئے تھا۔" اس نے دست و بازو کو حرکت دے کر اسی پل اپنی محرومی کا ازالہ کرتے ہوئے کہا۔

ذرا دیر بعد اس کی پشت تھپکتے ہوئے اسے اعظم میر کی بات یاد آئی تھی۔

"شادی کی اصل خوبصورتی رفاقت ہے بیٹا، یعنی اس میں ربط، دوستی اور مصاحبت ہو تو یہ دنیا کا خوبصورت رشتہ بنتا ہے۔"

"جانے ان میں سے آج ہمارے بیچ کس کی بنیاد پڑی ہے۔" اس نے سوچا تھا۔ منیب میر کے اندر ذرا دیر پہلے ہوئے کوتاہ اندیشی و کوتاہ نگاہی کے احساس کے ساتھ ہی سکون اترا تھا۔ اس کی تھکن زائل ہونے لگی تھی۔ اس نے جانا کہ وہ اتنا تنہا نہیں تھا جتنا وہ خود کو سمجھ رہا تھا۔

☆☆☆

سلمان مٹھائی کے ساتھ انہیں خوش خبری

سنانے آیا تھا۔ فاریہ امید سے تھی۔

''سلمان کی شادی کب ہوئی؟'' قرۃ العین کا پہلا سوال تھا۔ ثانو نے انہیں موبائل میں تصویریں دکھائیں جن میں وہ بھی تھیں۔

''تو مثیب کی بیوی کہاں ہے؟'' تصویر دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

''یہ دیبا بھابھی تو ہیں امی! مثیب بھائی کی وائف۔'' ثانو نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

''اچھا، یہ ہے، اچھی ہے۔'' انہوں نے بغور اسے دیکھا۔

کچھ دیر بعد باتوں کے درمیان انہوں نے مٹھائی کے ڈبے سے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

''تمہاری خوش خبری پر تمہارا ابھی منہ میٹھا نہیں کیا۔'' ان کا بڑھا ہاتھ دیکھ کر وہ الجھی تو سہی ساتھ ہی حیا سے سرخ ہو گئی۔ اعظم میر نے اشارہ کیا تو وہ اٹھ کر ان کے قریب ہوئی۔ انہوں نے اس کے منہ میں مٹھائی ڈالتے ہوئے خیال رکھنے کی ہدایتیں جاری کیں۔

سلمان تو چلا گیا لیکن اس کے بعد وہ سب سے چھپتی پھرنے لگی۔

وہ رات بھی بہت دیر سے کمرے میں آئی جب مثیب بھی بتیاں بند کر کے سو گیا تھا۔ کمرے میں اتنا اندھیرا نہیں ہوتا تھا جتنا اس وقت تھا۔ دبے پیر چلتی وہ الماری تک آئی اور اندازے سے ٹٹول کر پٹ کھول کر چادر اور تکیہ نکالا۔ آہٹ پر مثیب کی آنکھ کھلی اور گھپ اندھیرا دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ بتی جلانے کی نیت سے وہ آگے بڑھا اور ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے صوفے تک پہنچنے کی کوشش کر رہی دیبا سے ٹکرا گیا۔

''دیبا؟'' اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''جی۔'' اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔

''اتنا اندھیرا کیوں، تم نے نائٹ بلب بند کر دیا؟''

''نہیں۔ میں آئی تو ایسے ہی اندھیرا تھا۔''

''دروازے کے پاس ہی سوئچ ہے، لائٹ آن کر لیتیں۔'' وہ چپ رہی۔ وہ تو یہ سوچ کر اندھیرے میں چل رہی تھی کہ وہ اندھیرا کر کے سویا ہے۔

''یہیں رکو۔'' اس نے اندازے سے اسے شانوں سے تھام کر ایک طرف کیا اور آگے بڑھ گیا۔ کچھ پل بعد کمرہ روشنی سے بھر گیا۔ وہ نائٹ بلب جلا کر سونے لیٹا تھا۔

''فیوز ہو گیا ہے، آج اندھیرے میں ہی سونا پڑے گا۔'' اس نے بلب کا جائزہ لینے کے بعد اسی جگہ کھڑی دیبا کو دیکھا۔ وہ کوئی بات کہیں کے انداز میں سر ہلاتی صوفے کے پاس آ گئی۔ تکیہ سرہانے رکھ کر وہ لیٹ گئی تب مثیب نے بتی بجھا دی اور اپنی جگہ آ گیا۔ کمرے میں پھر گھپ اندھیرا تھا۔

دیبا جو نیند سے بے حال اندر آئی تھی، اب پوری طرح جاگ گئی تھی۔ کروٹ لے کر اس نے ہاتھ یوں صوفے پر رکھا تھا جیسے وہ اب بھی مثیب کی گرفت میں ہو۔ وہاں مچل رہے ننھے ننھے جگنو اسے سونے نہیں دے رہے تھے۔ اسے خبر نہیں تھی کہ پلنگ پر لیٹا مثیب بھی کچھ اسی کیفیت سے گزر رہا ہے ورنہ اس کا دل جانے کیسے قابو ہوتا!

☆☆☆

اسے صبح سے چھینکیں آ رہی تھیں لیکن اس نے بیان نہیں دیا۔ وہ نزلہ زکام کی دوا لینے سے حتی المقدور پرہیز کرتی تھی۔ وجہ ان کو پھانکنے کے بعد آنے والی بے ہوشی جیسی نیند تھی۔

''تم دوا لو اور آرام کرو۔'' صبح اس کی سرخ ناک اور بدلی آواز پر مثیب نے کہا تھا۔

''جی۔'' اس نے سر ہلا کر ہامی بھر لی تھی کہ اسے انکار نہیں کر سکتی تھی۔

''کمرے میں رکھی ہے یا تم پاپا سے لے لینا، ان کے پاس بھی ہو گی۔'' آفس سے دیر ہو رہی تھی ورنہ وہ خود ہی اسے تھما جاتا۔

شام تک اس کی حالت مزید خراب ہوگئی۔ اعظم میر اسے کام چھوڑ کر کمرے میں آرام کرنے کا کہہ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آئے تو وہ ہنوز مصروف تھی۔

"یہ ٹیبلیٹ اور چائے کا کپ لے کر کمرے میں جاؤ اور اس کے بعد کچن میں نظر نہیں آنا۔" انہوں نے پیار بھرا حکم دیا۔

"میں کھانا تیار کردوں پھر چلی جاؤں گی۔"

"کھانا باہر سے آسکتا ہے اور باقی کام شانو دیکھ لے گی۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے، وہ آرہی ہے۔" تب ہی شانو بھی آ گئی۔

"آپ مجھے آواز دے دیتیں ناں بھابھی۔" اسے زور سے چھینک آئی۔

"آپ کمرے میں جائیں۔ میں دوائی اور چائے دونوں لاتی ہوں۔" اس نے باپ کے ہاتھ سے دوا لے کر دیبا سے کہا۔ اسے چاروناچار کمرے میں جانا پڑا۔

کمرہ اور پلنگ خالی تھا۔ وہ پلنگ کے کنارے بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد شانو چائے بسکٹ اور دوائی اسے دے گئی۔

"آپ کمرہ بند کر کے آرام کریں۔" جاتے ہوئے اس نے کہا۔

اس نے چائے کے ساتھ دوالی اور چادر اوڑھ کر صوفے پر لیٹ گئی۔ رات تو ہو ہی گئی تھی۔ اب وہ بے ہوش ہو کر بھی سوتی تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ ذرا دیر میں ہی وہ بے خبر سو رہی تھی۔

رات کے جانے کس پہر اس کی نیند ٹوٹی تھی۔ نیم تاریکی میں اسے یاد آیا، وہ دوائی لے کر سوئی تھی۔ اب بھی اس پر غنودگی سوار تھی۔ اس نے ٹٹول کر اپنی چادر اوپر کھینچنی چاہی، اس کوشش میں اس نے آنکھیں نیم وا کیں اور تھم گئی۔ وہ پلنگ پر تھی اور سامنے یقیناً منیب سو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چوپٹ کھل گئیں۔

اس نے چادر بھول کے کم سے کم ہلچل اور آواز کیے بنا پلنگ چھوڑنے کی کوشش کی تا کہ منیب کی نیند نہ ٹوٹے۔

ابھی پوری طرح اٹھی بھی نہیں تھی کہ منیب نے ہاتھ بڑھا کے اسے واپس لٹا دیا۔ اس کا سانس رک گیا اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ منیب کا ہاتھ اب بھی اس کے کاندھے پر تھا۔ اس نے دم سادھے تنفس کو بحال کرتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور اس کے چہرے کو دیکھنے کے بجائے درمیان کے خلا پر نظر ٹکا دی۔ ابھی وہ صوفے سے یہاں آنے کا سفر سوچ ہی رہی تھی کہ منیب نے اپنے اوپر پڑا لحاف اس تک پھیلا کر خلا کو مدغم کر دیا۔

اگلی صبح گھر میں دو افراد چھینک رہے تھے۔

☆☆☆

منیب کو اس کے آس پاس منڈلاتے اور دیبا کو شرماتے دیکھ کر اعظم میر سب سے زیادہ خوش تھے۔ وہ پہلے بھی ان کے فاصلوں سے واقف تھے لیکن منیب پر زور زبردستی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس نے شادی کی ہامی بھر کے ہی بہت بڑا فیصلہ کیا تھا۔ وہ عروبہ کے متعلق جانتے تھے، اس لیے سمجھتے بھی تھے کہ اس کے بعد اسے وقت چاہیے۔ انہیں اتنا تو یقین تھا کہ اس نے دیبا کی ذمہ داری لی ہے تو کوتاہی نہیں کرے گا اور بیٹے نے ان کا یقین قائم رکھا تھا۔

پہلے ایک سال تک گھر کے درودیوار نے اس کی آواز ہی نہیں سنی تھی پھر وہ چند جملے کہنے لگی تھی اور اب تقریباً تین سال بعد اس کی ہنسی کی کھنک سے درودیوار بھی خوش تھے۔

شانو سنجیدگی سے بیکنگ کو اپنا پروفیشن بنانے پر غور کر رہی تھی۔

سلمان کا خاندان بیٹی کی آمد کے بعد مکمل سا تھا۔ وہ ان سے دور ہی ہوتا جا رہا تھا۔ عابدہ ان کے ہی ساتھ رہنے لگی تھیں۔

پھر بڑی خاموشی سے ایک قیامت آئی۔ اعظم میر رات کو سوئے تو سوتے ہی رہ گئے۔ جب قرۃ العین کے جگانے پر وہ اٹھے نہیں تو انہوں نے گھبرا کے منیب کو آواز لگائی۔ باپ کے سرد جسم کو چھوتے

بے یتیمی کا احساس اسے گھائل کر گیا۔
شانو کو اگر ماں کی فکر نہ ہوتی تو وہ کبھی خود کو سنبھال نہیں پاتی۔ اس نے ان کی خاطر خود کو مضبوط کر لیا تھا۔ جب سب کے درمیان انہوں نے روتی شانو کے کان میں سرگوشی سے پوچھا۔
"کس کی میت ہے؟" تو وہ ساکت ہو گئی تھی۔ وہ اپنی ماں کو، اپنے گھر کو اس وقت دنیا کے لیے تماشا نہیں بنانا چاہتی تھی۔ باپ کا آخری سفر عزت اور وقار سے طے ہو اس کی خاطر اس نے غم منانا موخر کر کے خود کو سنبھال لیا اور ایک بار پھر ماں کا سایہ بنی ان کے ساتھ رہی۔
کبھی وہ سب کو روتے دیکھ کر رونے لگتیں تو کبھی سب کو تسلی دیتیں اور جب انہیں اپنے خسارے کا احساس ہوا تو وہ پاگلوں کی طرح چیخنے اور رونے لگیں۔
سلمان کے آنسو تھم نہیں رہے تھے۔ ہم سمجھتے ہیں بہت وقت ہے، معاملات استوار کرنے، معافی مانگنے، پلٹنے اور سنبھلنے کے لیے لیکن تقدیر کا لکھا ایسے وقت ہمیں جھنجھوڑ کر بیدار کر دیتا ہے کہ وقت کسی کا نہیں۔ سلمان کے ملال عارضی تھے یا دیرپا، یہ وقت کو طے کرنا تھا اور ریامنیب تو وہ پہلی بار رب سے شکوہ کناں تھا۔ کسی کی تسلی اور دلاسا اسے سکون نہیں دے رہا تھا۔
وہ سوجی سوجی آنکھیں لیے کام میں لگی تھی۔ اس کا دکھ کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا لیکن اپنے دکھتے دل کی وجہ سے اسے ان سب کی تکلیف کا احساس بھی بہت زیادہ تھا۔
اعظم میر اور اس کا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا مگر ان میں اس نے اپنے باپ کو دیکھا تھا۔ اسے اپنے سگے والد کی صورت بھی تصویر والی یاد تھی۔ تین سال کی عمر میں اس نے انہیں کھویا تھا۔ چاچا اور ماموں نے اسے اپنے رشتے والی محبت اور توجہ نہیں دی تو وہ باپ کی کمی کیا پوری کرتے۔ اسے لگ رہا تھا ان تینوں کے ساتھ آج وہ بھی یتیم ہوئی ہے۔

وہ چولھے کے پاس کھڑی تھی جب وہ اسے ڈھونڈتا اندر آیا۔ آہٹ پر اس نے جلدی جلدی آنکھیں رگڑیں اور کپ نکالنے لگی۔ منیب نے ہاتھ سے کپ لے کر رکھا اور اس کا رخ اپنی طرف کیا۔ وہ نظر جھکائے ضبط سے سرخ تھی۔ وہ اس کے پاپا کو ان سب کی طرح عزیز تھی، صرف یہ ہی وجہ کافی تھی مگر اب تو اس کے پاس اپنی بھی وجہ تھی۔ اس نے کچھ کہے بنا اسے خود سے قریب کیا اور اس کے سارے ضبط ختم ہو گئے۔
عروبہ دروازے پر ہی ٹھٹھک کر رک گئی۔
"وہ۔ سب وہاں۔ چائے کا پوچھ رہے ہیں۔" اس نے آہٹ پر دروازے کی سمت متوجہ ہوئے منیب سے کہا۔
"تم خود دیکھ لو۔" وہ دیبا کا ہاتھ تھامے اس کے بازو سے گزر گیا۔ عروبہ پلٹ کر انہیں راہداری کے سرے پر منیب کے کمرے میں جانے تک دیکھتی رہی۔ اسے شدت سے اپنی غلطی اور نقصان کا ادراک ہوا تھا۔
"آپ یہاں کیوں لے آئے؟ کام بہت ہیں، وہاں سب پوچھیں گے۔" اس نے پیچھے دروازہ بند کیا ہی تھا کہ دیبا نے کہا۔ اس کی روئی سی آواز تھکن کے بوجھ سے دبی تھی۔ اس کا بھی کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن عروبہ کو دیکھ کر بے اختیار ہی وہ اسے کمرے میں لے آیا تھا کہ بھرے گھر میں انہیں خلوت کی ضرورت تھی جو اس وقت یہیں میسر تھی۔
"کیوں کہ مجھے بھی تم سے کچھ پوچھنا ہے۔" وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
"تم ٹھیک ہو؟"
"کوئی بھی اس وقت ٹھیک نہیں، آپ بھی نہیں ہیں۔" وہ انجانے میں اسے لاجواب کر گئی۔ اگر وہ اسے تشفی دینا چاہتا تھا، اسے اپنے ساتھ ہونے کا احساس دلانا چاہتا تھا تو وہ بھی وہی کر رہی تھی۔
اس بار اس نے دیبا کے گرد بازو پھیلائے تو صرف اس کے ہی نہیں اپنے آنسوؤں کو بھی راستہ دیا

تھا۔

☆☆☆

قرۃ العین اب ایک دم تنہا ہو گئی تھیں۔ عابدہ ان ہی کے کمرے میں سونے لگی تھیں۔ شانو کا زیادہ وقت بھی ماں کے ہمراہ گزرتا تھا لیکن وہ ہمہ وقت ان کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی۔ جانے اعظم میر کیسے قرۃ العین کو سنبھالتے تھے کہ اب وہ تینوں مل کر بھی ویسا نہیں کر پارہے تھے۔

سلمان اور فاریہ کچھ دن ان کے ساتھ ٹھہرے تھے لیکن اس کے بعد سے پلٹ کر خبر نہیں لی تھی۔ سب کو ان کی بے رخی اور سرد مہری کا دکھ تھا مگر ان سب کے ساتھ منیب تنہا ہی ایک اور محاذ سے نبرد آزما تھا۔

کروٹیں بدل بدل کر بالآخر وہ بستر چھوڑ کے اٹھ گیا۔ اس نے گہری نیند میں ڈوبی دیبا کو دیکھا اور آہستہ سے دروازہ بند کر کے لان میں چلا آیا۔ ٹہل ٹہل کر بھی جب بے چینی کم نہ ہوئی تو وہ پورچ کے زینے پر بیٹھ گیا۔

"یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟" وہ بازو میں آکر بیٹھی تو وہ چونکا۔

"نیند نہیں آرہی۔ تم کیوں ادھر آگئیں؟"

"آپ کو ڈھونڈتے ہوئے آگئی۔" وہ کبھی ایسے رات کو اٹھ کر کمرے سے باہر نہیں گیا تھا، شادی کے اولین دنوں میں بھی نہیں جب ایک ان چاہی ہستی کی موجودگی اسے ناگوار گزرتی تھی۔

"آپ کو انکل کی یاد آرہی ہے؟" دیبا نے دھیرے سے پوچھا۔

"وہ تو ہمیشہ آتی ہے، تمہیں بھی آتی ہوگی۔"

"ہاں۔ مجھے بھی بہت یاد آتے ہیں انکل۔" وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر پورا اس کی طرف گھوم گیا۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" اس کے جملے سے زیادہ وہ اس کے انداز اور چہرے کے تاثر پر ٹھٹھکی اور اس کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی اور اسی پل منیب کا ارادہ بدل گیا۔

"کہیں ناں!" خاموشی کے طویل ہوتے وقفے پر دیبا نے کہا۔

اس نے گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنی محبت کے اظہار کے لیے انگریزی کے تین لفظوں کا سہارا لیا اور وہ بری طرح شرما گئی۔ منیب نے بازو بڑھا کر ہنستے ہوئے اسے قریب کیا اور پھر دہرایا۔ وہ مزید سرخ ہوتی چہرہ چھپانے لگی۔

"تم سن کر جیسے ری ایکٹ کر رہی ہو، اس کا مطلب ہے، میں تم سے ایسے کنفیشن کی امید نہ ہی رکھوں؟" منیب نے اس کی ٹھوری کے نیچے انگلی رکھ کے چہرہ اونچا کیا۔ اس نے جھکی آنکھوں کے ساتھ یوں سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہو۔

"نہ ہی رکھیں!"

"اوہ دیبا!" اس نے ہنستے ہوئے اسے مزید قریب کر لیا۔

جس نے اس کی نیند اڑا دی تھی، وہ بات وقتی طور پر اس کے ذہن سے محو ہو گئی تھی۔

☆☆☆

لیکن اس کا اضطراب کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا اور آخر آج وہ یہ بوجھ ہلکا کرنے کے ارادے پر عمل پیرا ہوا تھا۔

"تم میرے لیے کسی راہ چلتے اجنبی سے زیادہ نہیں تھیں، تمہیں دیکھ کر ہمیشہ ہی میرا موڈ خراب ہو جاتا تھا۔ ڈری سہمی دبو سی دیبا مجھے اپنے گھر میں بھی کوفت زدہ ہی کرتی تھی لیکن پھر امی کے ساتھ تمہارا برتاؤ اور پاپا کی باتوں کی وجہ سے مجھے احساس ہوا کہ تم دردمند اور مخلص ہو لیکن شادی میں نے تم سے مجبوری میں کی تھی، دل پر پتھر رکھ کے، وہ مجھے اپنی زندگی کا سیاہ ترین دن لگا تھا۔ میں تمہیں اپنی لائف پارٹنر کے روپ میں تصور ہی نہیں کر پا رہا تھا، تم میرے لیے ان پڑھ اور گھر میں رہنے والی اعتماد سے خالی لڑکی تھیں اور ایسی لڑکیاں مجھے سخت ناپسند تھیں۔ لیکن تمہیں اس گھر میں رکھنا ضرورت تھی، کوئی اور مجھ سے شادی کے لیے تیار نہ تھا اور تمہارا نام پاپا

نے لیا تھا۔ جب کہ مجھے عروبہ پسند تھی، مجھے اس سے محبت تھی یا مجھے لگتا تھا کہ مجھے اس سے محبت ہے، اس نے مجھے ریجیکٹ کر دیا تھا، وہ امی کی بیماری کے بعد والی سچویشن میں مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

مگر یہ گزری باتیں ہیں سچ یہ ہے کہ اب میرے دل میں، میری زندگی میں بس تم ہو تمہارے علاوہ کوئی نہیں ہے، جیسے تم نے میرے دل کو چھوا ویسے کبھی کوئی نہیں کر سکا نہ کبھی کر سکے گا۔ تم مجھے عزیز ہو، مجھے تم سے محبت ہے، بے حد، بے انتہا، بے تحاشا۔"

اس نے وہ تلخ وترش جملے کہے تھے کہ اگر وہ دوبارہ انہیں اس کے منہ سے سنے تو اسے دکھ اور صدمہ نہ ہو اور اب وہ جو کہہ رہا وہ حسین یادوں کو وقت میں قید کرنے کی سعی تھی کہ جب کبھی اس کا ذہن دغا دے جائے تو اسے یہ منظر یاد آئے، وہ انہیں دہرائے۔

دیا سب سمجھ رہی تھی اور رو رہی تھی۔ اسے اعظم میر کی باتیں اب مکمل سمجھ میں آئی تھیں۔

"خدانخواستہ کبھی میں بھی کسی وجہ سے ڈیمینشیا کا شکار ہو جاؤں، باتیں بھولنے لگوں، ماضی کی آدھی ادھوری بات اور یاد کا ذکر کروں تو میری آج کی باتیں ہمیشہ یاد رکھنا، میرا، ہمارا سچ یہ ہے کہ تم اہم ہو، عزیز ہو اور تم ہی سے مجھے محبت ہے۔" وہ کچھ دیر ٹھہر کر اپنے اور اس کے ہاتھ کو دیکھنے لگا۔

ذہنی مرض، مہلک، خطرناک اور طویل بیماری، ان میں بظاہر تو گھر کا ایک ہی فرد مبتلا ہوتا ہے لیکن یہ کسی نہ کسی سطح پر گھر کے ہر بندے کو بیمار کر دیتی ہے۔ اسے بھی اندیشوں کا مرض لاحق ہوا تھا۔

"میں یہ کسی سے کہنا نہیں چاہتا لیکن اب مجھ سے بوجھ سنبھل نہیں رہا۔ پاپا کی وفات سے پہلے شام میں، میں نے ان دونوں کی باتیں سنی تھیں۔ امی پھر کسی پچھلے وقت اور منظر میں تھیں۔ وہ پاپا سے راز داری میں کہہ رہی تھیں کہ۔" یہ اس کی زندگی کا مشکل ترین لمحہ تھا۔

"گھر واپس آتے ہوئے انہیں نوید نے خط دیا، اس نے لکھا تھا کہ وہ انہیں پسند کرتا ہے اور۔ وہ ان سے وہ سب کہہ رہی تھیں جو نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میں اس وقت پاپا کا چہرہ دیکھ نہیں سکا تھا لیکن یہ سوچ کر وہاں سے ہٹ گیا تھا کہ صبح ان سے بات کروں گا لیکن صبح۔" وہ بھاری ہوتی آواز سنبھالتے رک گیا۔

"آپ بالکل غلط سمجھ رہے ہیں۔" اس نے تیزی اور بے قراری سے کہا۔

"انکل اور پھپھو کا رشتہ ایسا نہیں تھا کہ انکل اس بات کا اس قدر صدمہ لیتے اور سب سے اہم کہ موت کا دن معین ہے، کوئی دکھ، کوئی سانحہ اسے وقت سے پہلے نہیں بلا سکتا۔"

"میں بھی خود کو یہ سب سمجھا رہا ہوں دیا! لیکن دل نہیں مانتا۔ میرے دل سے یہ خیال جاتا ہی نہیں کہ پاپا کو اس بات سے تکلیف پہنچی ہوگی، یہ ان کے لیے بہت اچانک، غیر متوقع اور شدید تھا۔ اتنا کہ وہ سہہ نہ سکے۔"

"نہیں بالکل نہیں۔ آپ غلط سوچ رہے ہیں، ایسا کچھ نہیں ہے، بچپن لڑکپن کی یہ باتیں اتنی اہم نہیں ہوتیں۔" اس نے اس کے موقف کی پرزور مخالفت کی۔

"ایک بار مجھے انکل نے کہا تھا۔ وہ سن کر شاید آپ پھپھو اور ان کے رشتے کی گہرائی اور گیرائی سمجھ سکیں۔ انہوں نے کہا تھا۔" وہ ان کی باتیں دہرانے لگیں جو آج بھی اسے یاد تھیں۔

"محبت احساس اور خلوص جب ایک سطح پر ہو تو پھر اس سے مضبوط رشتہ کوئی نہیں ہوتا، اس کے بعد کوئی بات، کوئی راز، کوئی انہونی، کوئی جھگڑا دو نفوس کو جوڑنے والی کڑی کو کمزور کرنے کا اہل نہیں رہ جاتا اور تعلق کا حسن یہ ہی رفاقت تو ہے۔ جس میں ماضی اور مستقبل کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی، سب کچھ حال ہوتا، یہ پل جب ہم ساتھ ہیں، پاس ہیں، یہی تو سب کچھ ہے، یہ ہی تو 'ہم' ہیں اور 'ہم' کا ہونا ہی خوشی ہے، زندگی ہے۔ عینی کا دل بدلا ہے نہ محبتیں کہیں

کھوئی ہیں بس اس کا دماغ دغا دے گیا ہے لیکن میں خوش ہوں، مجھے کوئی شکایت نہیں، کیوں کہ وہ میرے پاس، میرے ساتھ، میرے سامنے ہے، مجھے اس کے ہر احساس کی خبر ہے۔ وہ کہنے سے قاصر ہے لیکن میں سمجھنے سے نہیں، وہ اظہار سے معذور ہے مگر میں پذیرائی سے نہیں۔"

باپ کے الفاظ تھے، اس پر اثر کیسے نہ کرتے۔

"اس لیے آپ ایسا ہرگز نہ سوچیں نہ انکل اور پھوپھو کے لیے نہ ہمارے لیے۔" اس نے اپنا ہاتھ کھینچ کر مُثیب کے دونوں ہاتھ اپنی گرفت میں لیے۔

"پہلے تو یقین رکھیں، پھپھو جیسا کچھ آپ کے ساتھ نہیں ہوگا اور پھر یہ کہ مجھے بھی آپ کی کسی بات پر ایسا دکھ نہیں ہو سکتا، چاہے وہ بات آپ کے نزدیک کتنی ہی صدمے والی کیوں نہ ہو۔ مجھے وہ سب ملا ہے جس کا گمان نہ میں نے کیا تھا نہ کسی اور نے۔ ساری عمر کے لیے میرے اندر بس ایک احساس ہے اپنے رب کے لیے، آپ کے لیے اور وہ ہے شکر گزاری، اس پر کوئی دوسرا احساس حاوی نہیں ہو سکتا، کوئی بات اسے کمزور نہیں کر سکتی۔"

دبو، ذری سہمی سی لڑکی میں آج اس قدر اعتماد تھا کہ وہ مضبوط لہجے میں اسے سمجھا رہی تھی۔

وہ مسکرا دیا۔ اس سے بات کرنے کے بعد وہ قدرے ہلکا ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی سب کچھ جانتے بوجھتے بھی وہی بات کسی اور کی زبانی سن کر ہی تسلی ہوتی ہے۔

☆☆☆

وہ بہت دیر سے اعظم میر کا فون ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی مگر فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اسے آگے بڑھنا چاہیے یا نہیں۔ بالآخر اس نے کانٹیکٹس کے سرچ بار میں 'نوید' لکھا اور نیچے نتیجے میں ایک ہی نمبر لکھا آیا۔

اس نے ذرا سے تامل کے بعد کال ملائی۔

"ہیلو۔ جی میں دیبا بات کر رہی ہوں، اعظم میر کی بہو۔" پہلی بار اس نے اپنا تعارف کروایا تھا اور یہ حوالہ اسے سب سے پیارا تھا۔

انہیں ان کی وفات کا علم نہیں تھا۔ وہ بھی سن کر حیران اور افسردہ ہوئے۔ انہوں نے باری باری سب کے متعلق پوچھا اور پھر الوداعی کلمات کے بعد فون رکھ دیا۔

فون کے بعد اگلے اتوار ہی وہ اپنی بیگم کے ساتھ ان سے ملنے آ گئے۔ وہ دوسرے شہر سے اپنی کار سے آئے تھے۔

قرۃ العین انہیں اجنبی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے نوید احمد کو پہچانا نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد شانو انہیں واپس کمرے میں لے گئی تھی۔

"کتنا بدل گیا ہے سب!" ان کی آواز میں افسوس تھا۔

"پاپا کے بعد امی زیادہ خاموش ہو گئی ہیں۔" مُثیب نے کہا۔

"ہمم۔ ان کی دوستی اور انڈر اسٹینڈنگ کمال کی تھی۔ جب ان کی شادی کی بات چلی تو ہم سب حیران تھے کیوں کہ ہمارا سارا گروپ جانتا تھا کہ ان میں ایک دوسرے کے لیے ایسی کوئی فیلنگز نہیں ہیں۔ ہمیں یقین تھا، وہ انکار کر دیں گے لیکن دونوں نے بڑوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا اور۔" وہ ہنسنے لگے۔

"شادی کے بعد مجھے اعظم نے کہا 'کیوں بے سالے اس لیے مجھ سے کہہ رہا تھا کہ منع کر دے' اور میں اتنا شرمندہ ہوا کہ سال بھر اسے اپنی شکل ہی نہیں دکھائی۔" وہ مسکراتے ہوئے چپ ہو گئے مگر ان کی بات کے پیچھے چھپی اہم کہانی کھل گئی تھی۔

"بھائی صاحب جب بھی ملتے مجھے ضرور کہتے تھے کہ اس پر نظر رکھا کرو، اسے صنفِ نازک کو پریم پتر لکھنے کی عادت ہے۔" ان کی بیگم نے ہنستے ہوئے کہا۔

"انہوں نے اسکول میں یہ کام کیا تھا۔" مُثیب کے حیرت سے کھلے منہ کو دیکھتے ہوئے انہوں نے شوہر کو مسکرا کے دیکھتے ہوئے وضاحت کی اور چائے کی ٹرے لیے آ رہی دیبا کی آنکھیں اپنے اس جوئے کے جیتنے پر نم ہو گئیں۔

☆☆☆

شانو کی 'عینی میر بیکرز' ایک کامیاب بزنس ثابت ہوئی تھی۔ ڈاکٹر بننے کا خواب دیکھنے والی شانو اپنے کام میں خوش اور مصروف تھی۔ لوگ اسے دیکھ کر کہتے تھے وہ بنی ہی اس کام کے لیے ہے۔

مُنیب ایک کم پڑھی لکھی اور مقام و رتبے میں اپنے سے کم لڑکی کے ساتھ خوش اور مطمئن تھا۔ اس کی فرم اب بھی اسی شہر تک محدود تھی۔ اس کا دوسرے شہر جانے اور اپنا کام پھیلانے کا خواب اب بھی طاق پر تھا لیکن اہم یہ تھا کہ اسے اس کا افسوس نہیں تھا۔

دیبا اپنی ماں کو آرام دہ زندگی گزارتے دیکھ رہی تھی، جس کی اسے شدید خواہش تھی لیکن اس نے کبھی اس کے پورا ہونے کا خواب نہیں دیکھا تھا۔

سلمان کی اپنی الگ دنیا تھی۔ اسے کبھی کبھار ماں اور بہن بھائی کی یاد آجاتی تو وہ ملنے آجاتا تھا۔ وہ مکمل طور پر ان سے غافل نہیں تھا مگر اسے ہمہ وقت اس گھر میں، بیمار ماں کے ساتھ رہنا مشکل لگتا تھا۔

قرۃ العین کی یادداشت کے ساتھ اب جسمانی صحت بھی حد درجہ کمزور تھی۔ وہ خود سے چل پھر نہیں پاتی تھیں۔ انہیں ہمہ وقت ایک معاون کی ضرورت تھی۔

ایک بیماری نے کئی زندگیاں بدل دی تھیں۔ اس سے نبرد آزما افراد کی اپنی اچھائیاں، کمزوریاں اور حوصلے تھے جو انہیں اس مقام پر لے آئے تھے لیکن ان سب میں اعظم میر اگر 'اعظم میر' نہ ہوتے تو ان سب کی زندگیوں کا یہ روشن رخ بھی نہ ہوتا۔

وہ وہیل چیئر دھکیلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا جہاں سب قرۃ العین کے منتظر تھے۔ شانو کا بنایا خوبصورت کیک مرکزی میز پر سجا تھا۔ میز کے گرد شانو، دیبا، عابدہ اور سلمان کھڑے تھے۔ فاریہ بھی اپنی بیٹی کو گود میں لیے تھی۔ آج قرۃ العین کی سالگرہ تھی۔

ان سب کے چہرے دیکھنے کے بعد قرۃ العین نے کیک کو دیکھا تو مسکرا دیں۔ انہیں کسی کا چہرہ یاد نہ آیا مگر ان کا بیکنگ کا شوق اس وقت آنکھوں سے خوشی بن کر جھلک رہا تھا اور ان سب کے لیے یہ جھلک کافی تھی۔

شانو کو اتنی خوشی اپنے ڈاکٹر بننے کی نہ ہوتی جتنی اس وقت اپنے بنائے کیک کی وجہ سے ماں کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ کو دیکھ کر ہو رہی تھی۔

کیک کاٹنے کے بعد سلمان نے اس سے پلیٹ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ اسے ترکش ڈیزائن والی پلیٹ پکڑا کر ہٹ گیا۔ وہ ماں کو اپنے ہاتھ سے کیک کھلانا چاہتا تھا۔

دیبا سب کے لیے چائے لینے باورچی خانے میں گئی تو وہ بھی چپکے سے اس کے پیچھے چلا آیا۔ حسب توقع وہ چولھے کے پاس کھڑی آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اعظم میر کی یاد ایسے وقت بڑی شدت سے آئی تھی۔ اس نے کچھ کہے بنا اسے قریب کیا اور وہ رونے لگی۔

''دیبا! پاپا کی بات مجھ سے بہتر تمہیں یاد ہوگی۔ انہوں نے اسی لیے تو کہا تھا کہ سب کچھ حال ہوتا ہے، یہ پل جب ہم ساتھ ہیں، پاس ہیں، یہی تو سب کچھ ہے، یہ ہی تو 'ہم' ہیں اور 'ہم' کا ہونا ہی خوشی ہے، زندگی ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہم میں سے کوئی بھی حال میں، موجودہ پل میں کسی بھی وجہ سے اداس ہو یا آنسو بہائے۔''

دیبا آنسو صاف کرنے لگی۔ واقعی ان کی بات تو ساری رفاقتوں کے لیے تھی۔ اس نے سر اٹھا کے مُنیب میر کو دیکھا۔

''یہ ہی تو 'ہم' ہیں اور 'ہم' کا ہونا ہی خوشی ہے، زندگی ہے۔'' وہ بھیگی آنکھوں سے مسکرا دی۔

''اُفف یہ چوری چھپے والے رومانس کا چارم!'' پیچھے سے شانو کی آواز آئی۔

دیبا شرما گئی اور وہ ہنس دیا۔

☆☆

جویریہ مریم

اعتراف

شام ڈھل رہی تھی۔

شاہ خاور کی سنہری کرنیں، اس کشادہ مکان کے درودیوار پہ پڑتی بہت بھلی لگتی تھیں۔ یوں جیسے سونے کی چمک آنکھوں کو خیرہ کررہی ہو۔ کونجوں کی ڈار آسمان سے کشادہ صحن کے بیچ و بیچ لگے نیم کے گھنے درخت میں اتر آئی تھی۔

صحن میں بچھی چارپائی پہ اس مکان کے دونوں مکین بیٹھے تھے اور ان کے درمیان خاموشی بولتی تھی۔

ایک کے چہرے اور دل میں تفکر کے سائے اور کوئی خوف رقم تھا۔ کوئی اندیشہ، کسی زندگی سے عزیز کے دور ہوجانے، چھن جانے کا خوف۔

ناقدری کا ڈر اور دوسرے کے چہرے پر افسردگی و مایوسی نظر آتی تھی۔ ارمانوں کی ٹوٹی مالا کے موتی بکھرے دکھتے تھے۔

آنکھوں کی جوت بجھی بجھی سی لگتی تھی۔ وہ دیو مالائی کہانیوں جیسا حسن رکھنے والا شخص اداسی میں اور بھی ساحر لگتا تھا۔

گیٹ پر کھٹکا ہوا تھا۔ کونجوں کا دوست اٹھا اور دروازہ کھول کر اپنے ننھے منے دوستوں کو دانا پانی ڈالنے لگا تھا۔

ایک بھاری بھرکم خاتون، خورشید بیگم کے پاس چارپائی پر آ بیٹھی تھیں۔

پھر ان دونوں کی دبی دبی سرگوشیوں کو کونجیں اور ان کا دوست کان لگا کر سننے لگا۔

"خورشید، بہو لے آ دیکھو تو کیسی بے رونقی ہے۔ ایک دم بہار آجائے گی تیرے گھر میں۔ تیرا دل نہیں چاہتا پوتے پوتیوں کی قلقاریاں، چہکاریں سننے کو۔"

خاتون کے لہجے میں اچنبھا تھا۔

خورشید پھیکا سا مسکرادیں۔

"دل تو چاہتا ہے زبیدہ! مگر کچھ خوف لاحق ہیں۔ دل مطمئن نہیں ہے۔ لڑکی پہ۔"

"ارے! کہیں سرمد نے کوئی لڑکی تو پسند نہیں کرلی۔"

"ایسا ہی ہے زبیدہ! مگر یہ بات نئی نہیں ہے۔ سات سال پرانی ہے۔"

"سات سال پرانی۔ کیا لڑکی والوں نے جان بوجھ کر سرمد کے نام پہ بٹھا رکھا ہے۔" زبیدہ نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"اللہ جانے۔" خورشید کے لہجے میں بےزاری سمٹ آئی تھی۔

"تو، تو کرلے خورشید۔ اسے ہی لے آ۔ بیٹے کے دل کی دنیا آباد کردے۔ ظالم نہ بن۔"

دبی سرگوشی چمکتے جگنو مٹھیوں کو دان کرنے لگی تھی۔ آس جو پوری ہوتی نظر ہی نہ آتی تھی۔ دل میں ہمکنے لگی تھی۔

کونجیں اور وہ...... دیو مالائی حسن رکھنے والا اداس ساحر۔ دم سادھے ہوئے تھے۔ کئی برس بیت گئے تھے انہیں۔ احترام کی بلند سیڑھیوں پہ کھڑے کھڑے۔ محبت کو پکارتے۔ مناجات کرتے۔

خورشید بیگم نے گہرا سانس بھرا تھا۔

"تو۔ تو جانتی ہے زبیدہ! کہ شوہر کی وفات کے

بعد میں نے پہاڑ سی زندگی کیسے بغیر کسی کا ہاتھ تھامے سرمد پہ ہی وار دی تھی۔

تین سال کا تھا سرمد۔ اب جوان ہوا ہے تو لگتا ہے مجھے میری محنتوں کا پھل مل گیا ہے۔ کیسے میں اپنے جگر گوشے کو کسی ایسی لڑکی کو سونپ دوں جو اسے آتے ہی دبا لے گی۔ اور مجھ سے دور کر دے گی۔ تو خود بتا زبیدہ کیا میں مر نہ جاؤں گی۔ سرمد سے دور ہو کر۔ اس کی بے رخی و ناقدری دیکھ کر۔"



وہ رو پڑی تھیں۔

جگنو جو امید کا ہاتھ تھماتے تھے۔ دور دیسوں کو نکل گئے۔

ہاں آج پھر دل کا آسمان تاریک پڑا تھا۔ اور زمین میں گڑے امید و آس کے بیج سڑنے لگے تھے۔

کونجوں نے کھانے پینے سے منہ موڑ لیے تھے۔ دل میں سناٹے بولتے تھے۔

"دیکھ خورشید! برتے بغیر کسی کی بیٹی کے متعلق ایسی باتیں نہ کر۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔" زبیدہ نے نرمی سے سمجھایا تھا۔

خورشید نے گہرا سانس بھرا تھا۔

"میں کوئی دین سمجھنے والی، عالمہ بہو لانا چاہتی ہوں زبیدہ! جو بزرگوں کا ادب احترام جانتی ہو بزرگوں کا رتبہ پہچانتی ہو، خدمت گزاری کا جانتی ہو۔ ایک دنیادار، بے پردہ، مردوں کے ساتھ دفتروں میں کام کرنے والی لڑکی یہ سب خاک جانتی ہوگی۔"

شام کے منظر میں، سب ساکت تھے اس گھر میں، سوائے خورشید کے۔

"میری ایک بات یاد رکھنا خورشید!" سناٹے کو زبیدہ کی ہلکی کھنکھتی آواز نے توڑا تھا۔ "کہ سارے دنیادار برے نہیں ہوتے۔ اور سارے دین دار اچھے نہیں ہوتے۔

ہر انسان کی سوچ اور فطرت و مزاج ہوتا ہے کچھ گھر کی تربیت ہوتی ہے۔ ہر جگہ، ہر شعبے میں، ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی عالم، دین دار کسی غلط کام کا مرتکب ہوتا ہے تو اس میں دین کا مدارس کا، کتابوں کا قصور نہیں ہے۔ انہوں نے اسے غلط کرنے کو نہیں کہا۔ غلط نہیں سکھایا۔ یہ اس کی اپنی سوچ اور ذہنیت ہے۔ شیطان کا بہکاوا ہے۔ اگر کوئی دنیادار غلط کام کرتا ہے تو سارے دنیاداروں کو برا کہا جاتا ہے اور دین دار غلط کام کرتا ہے تو، تو سارے دین داروں کو عالموں کو حافظوں کو، ایک مچھلی سارے دریا کو گندا کر دیتی ہے۔ لیکن غلط صرف وہ ایک انسان ہی ہوتا ہے سارے نہیں۔"

وہ بولتی چلی گئی تھیں۔ ماں بیٹا دم سادھے سنتے رہے تھے۔ کونجوں کے رفیق کو پہلی بار علم ہوا تھا کہ زبیدہ خالہ اتنا اچھا اور درست سوچتی، بولتی ہیں۔

پھر زبیدہ خالہ اپنے گھر چلی گئیں۔ خورشید بیگم اندر کمرے میں، سورج مغرب میں جا گھسا تھا۔ فضائیں تاریک ہونے لگیں، زمین پہ رات کا راج تھا۔

خورشید بیگم کا گلا خراب تھا۔ نزلے زکام کی بھی ہلکی شکایت تھی۔ سو وہ کمرے میں ہی سو گئیں۔

اندھیرے اور سناٹوں میں ڈوبے صحن میں کونجوں کا دوست اکیلا تھا۔

گھنے نیم تلے پڑی کرسی پر، بیٹھا وہ نیم وا آنکھوں سے اماوس کی رات میں اپنی قسمت کے اجالے تلاشتا تھا، کشادہ صحن میں رات کی رانی کی خوشبو کا جادو بولتا تھا۔

"وہ ایسی نہیں ہے۔ دلوں کو توڑنے والی، وہ تو اندھیروں کو بھگا کر، اجالوں کو پکارنے والی ہے۔ امید صبح، ہاں، وہ صبح کی امید ہی تو ہے۔ صبح کی پہلی کرنوں جیسی۔"

وہ اپنے دوستوں کو بتا رہا تھا۔ اور وہ ہمیشہ کی طرح خاموشی سے سن رہے تھے۔

"دعا کرنا۔ وہ مجھے مل جائے۔ ورنہ دل کبھی آباد نہ ہو سکے گا۔ اور صحرا دلوں کی زندگی بڑی اذیت ناک ہوتی ہے دوستو!"

اب وہ کھڑا ہو کر افسردہ مسکراہٹ لبوں پہ سجائے کہہ رہا تھا۔ کئی لمحے خاموشی میں کٹ گئے۔ پھر وہ تھکے قدموں سے صحن میں بچھی چارپائی کی طرف پلٹ گیا۔ کونجیں پورے دل سے اپنے دوست کے لیے مناجاتوں میں مصروف ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

کشادہ مکان سناٹوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ برآمدے میں بچھی اکلوتی چارپائی پہ خورشید بیگم لیٹی تھیں۔

ایسے میں دروازے پہ ہونے والی زور دار دستک نے انہیں ہڑبڑا کر اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی، دوپٹے کا پلو سر پہ ڈالتی دروازہ کھولنے چل دیں، سامنے ہی اختری بیگم اپنی دو عدد نئی نویلی بہوؤں کے ساتھ کھڑی تھیں، جھپٹ کر بغل گیر ہوئیں۔

دوگلیاں چھوڑ کر گھر تھا ان کا، اچھی سلام دعا تھی خورشید بیگم کی ان سے۔

"آئے ہائے۔کیسی خاموشی چھائی ہے اتنے بڑے مکان میں۔ خورشید، توڑ دے قسم لے آ بہو۔ دیکھ میرے گھر میں کیسی رونق لگ گئی ہے، تیرا دل نہیں چاہتا ایسی رونق کے لیے؟" اختری نے دہائیاں دیتے پوچھا تو خورشید بیگم نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

"دعا کرو، کوئی عالمہ فاضلہ مل جائے۔"

"ارے یہ بھی بھلی بات کہی تو نے۔" اختری چہک سی اٹھیں۔ "خیر سے میری دونوں بہوویں عالمہ ہیں۔ کہو تو ان میں سے ہی کسی کی بہن لے آتے ہیں۔" خورشید کے چہرے پہ رونق سی بکھر گئی۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں، شام میں سرمد آتا ہے تو اس سے بات کرتی ہوں۔"

نئی نویلی دلہنیں، شرمیلی سی مسکان لبوں پہ سجائے خاموش بیٹھی تھیں۔

خورشید ٹھنڈے ٹھار شربت کے گلاس بنا لائی تھیں۔

پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں، خورشید کو دونوں ہی بہت اچھی لگی تھیں، بھلا آج کے زمانے کی لڑکیوں کے ایسے رنگ ڈھنگ کہاں ہوتے ہیں۔ ہیرے ڈھونڈے ہیں اختری نے۔ انہوں نے دل ہی دل میں سوچتے اختری کو سراہا تھا۔

"میں ذرا اس پڑوسن سے دو باتیں کر آؤں پھر چلتے ہیں گھر۔" اختری نے بہو سے کہا اور چادر سنبھالتی پڑوسن کی طرف چلی گئیں۔ خورشید کی اس پڑوسن کے پاس وہ کمیٹی ڈالتی تھیں۔ اسی سلسلے میں اس کے گھر گئی تھیں۔

خورشید گلاس اٹھا کر کچن میں چلی گئیں۔ شیشے کے گلاس دھوتے ہوئے وہ سوچوں میں ہی غرق تھیں۔ سرمد پتا نہیں مانے گا یا نہیں۔ خدا جانے اس دفتر والی چڑیل نے کیسا جادو کر دیا ہے میرے بچے پر۔

☆☆☆

"ثمرہ باجی، آپ نے نوٹ کیے ہیں ساسو ماں کے انداز؟" اختری کی چھوٹی بہو کی تیز آواز خورشید کو سوچوں سے باہر کھینچ لائی تھی۔ آواز اتنی تیز نہیں تھی انداز تیز تھا۔

"نہیں تو، کیا ہوا؟"

دھیمی سی، نرم سی آواز۔

"واہ باجی! آپ بھی کتنی بھولی ہیں۔" وہ ہنسی تھی۔ ان کی بلند سرگوشیاں خورشید کے کان کھڑے کر چکی تھیں۔

"ثمرہ باجی! ساسو ماں چاہتی ہے کہ ہم اس کی خدمت گزاری میں جت جائیں اور وہ خود مہارانی بن کر چارپائی پر بیٹھ کے حکم چلائیں اور بیٹھے بیٹھے کھائیں ذرا چار دن گزر جانے دیں۔

میں بتا دوں گی کہ وہ کس کھاتے میں ہم سے خدمت کروانا چاہتی ہیں۔ جب کہ وہ اور ان کا کام، خدمت، ہماری ذمہ داری، فرائض میں شامل ہی نہیں ہیں۔ اسلام میں سسرال کی خدمت و ذمہ داریوں کا حکم ہی نہیں ہے۔

وہ فقط اپنے بیٹے کی ذمہ داری ہیں۔ ہماری ذمہ داری اور فرائض میں ہمارے شوہر شامل ہیں اور بس!

ہونہہ! یہ پاکستانی سسرالی نظام عجیب فرسودہ رسم و رواج بنا رکھے ہیں لوگوں نے۔ بہو کو حکم کا غلام ہی سمجھ لیتے ہیں۔ سارا دن گدھوں کی طرح سسرال کی خدمت میں جتی رہے۔ اور شوہر کے آنے پر، پھر بھی شکایتوں کی پٹاریاں ہی کھلتی ہیں۔ لعنت بھیجتی ہوں میں اس سب پر، میری ذمہ داری صرف میرا شوہر ہے میرے ذمہ صرف اس کے کام ہیں۔

سسرال کے کام بہو کی ذمہ داری نہیں ہیں۔" تو ہم کیوں فضول میں اپنے ہاتھ پیر گھسائیں۔

کچن میں کھڑی خورشید بیگم پتھر ہوئی جا رہی تھیں۔ شیشے کا گلاس ان کے ہاتھ سے گرا اور پاش پاش ہو گیا۔

وہ پتھرائی نظروں سے گلاس کی کرچیاں دیکھ رہی تھیں۔

"کیا ہوا آنٹی؟"

ثمرہ دوڑی آئی تھی۔

"میں واش روم میں ہوں ثمرہ باجی!" چھوٹی کی آواز آئی تھی۔

ثمرہ کچن میں کھڑی خورشید بیگم کو دیکھ کر ایک پل میں سمجھ گئی کہ وہ ساری باتیں سن چکی ہیں۔

وہ جو خدمت گزار، ادب و احترام، بزرگوں کا احساس کرنے والی، عالمہ بہو لانا چاہتی تھیں ایک عالمہ بہو کے خیالات سن کر پتھر ہوئی کھڑی تھیں۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ خورشید بیگم کی سماعتیں، ساٹھ سال کی عمر میں بھی اچھی خاصی تیز تھیں۔

ثمرہ شرمندہ سی کھڑی تھی۔ اگلے ہی پل اس نے آگے بڑھ کر، خورشید بیگم کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

"آنٹی! آپ عالماؤں اور اللہ کے دین سے بدگمان مت ہونا۔

یہ اللہ کا حکم ضرور ہے۔ ایسے ہی، جیسے جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان کا حکم ہے۔ بدلہ لینا جائز ہے۔ لیکن معاف کرنا بلند تر، بہت بڑی نیکی ہے۔ یہ انسان کی سوچ کی بات ہے کہ کس حکم کا انتخاب کرتا ہے۔

ایسے ہی آنٹی، اسلام میں بہو کی ذمہ داریوں میں سسرالی رشتے شامل نہیں ہیں۔ ان کے کام، ان کی خدمت فرض نہیں کی گئی۔ لیکن دوسری طرف۔ بزرگوں کی خدمت کا اجر بے پناہ رکھا گیا ہے۔ رشتہ داروں کا خیال رکھنے والوں کو جنت کی خوش خبری سنائی گئی ہے۔

اور سسرال والوں سے بہو کا بہت نزدیکی اور خوب صورت رشتہ ہوتا ہے۔ وہ اس کے شوہر کے ماں، باپ اور بہن بھائی ہوتے ہیں۔ بہت اہم اور قریبی رشتہ دار، تو ان سے حسن سلوک، صلح رحمی سے منع تو نہیں کیا گیا۔

بوڑھے ساس، سسر، جن کی خدمت بہو پہ فرض نہیں لیکن انہیں بے یارومددگار، تکلیف میں تنہا چھوڑ دینا، بیماری میں خبر تک نہ لینے کا کتنا بڑا گناہ ہے۔ یہ بھی ہمیں سوچنا چاہیے۔

بہت بڑی نیکی اور جڑا ہے بوڑھے بزرگوں کی خدمت، رشتہ داروں سے حسن سلوک کی رشتہ داروں کے حقوق کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

آنٹی! جب پڑوسیوں کے حقوق کے بارے میں اتنی تاکید ہے اور حقوق ادا نہ کرنے کی اتنی سخت وعید ہے تو اللہ یہ حکم کیسے دے سکتا ہے کہ شوہر کے والدین، لاچار، بیمار گھر میں پڑے رہیں۔ ان کی مزاج پرسی، ان کی مدد نہ کرو، طبیعت نہ پوچھو اور پڑوسیوں کا خیال رکھو۔ جہاں اور جب انہیں ضرورت پڑے ان کے کام آؤ۔"

ثمرہ بول رہی تھی اور خورشید یک ٹک اسے تکے جا رہی تھیں۔

"آنٹی! اللہ کے دین کو برا مت سمجھنا۔ بس ہر انسان کی اپنی سوچ اور ظرف کی بات ہوتی ہے۔ چھوٹی شاید اتنی سمجھ بوجھ نہیں رکھتی، ہر پہلو پہ غور نہیں کرتی، صرف اسی پہلو پہ غور کیا ہے کہ اسلام میں سسرالی رشتوں کی خدمت فرض نہیں، اسلام میں تو اور بھی بہت سے حکم ہیں۔ دین اسلام کسی کی حق تلفی نہیں کرتا۔ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا۔ میرا اللہ اپنے ہر حکم میں ہر بات میں سچا ہے۔ منصف ہے، عادل ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" خورشید نے تھکی سی آواز میں کہا تھا۔

☆☆☆

ان کے جانے کے بعد بھی وہ دیر تک ثمرہ اور چھوٹی ثانیہ کی باتوں پہ غور کرتی رہیں۔ سوچوں کا موازنہ کرتی رہیں۔

"واقعی اپنے اپنے ذہن کی بات ہوتی ہے۔"

خورشید نے اعتراف کیا تھا اور ان کے دل میں خوف ابھرا تھا کہ اگر ثانیہ جیسی عالمہ بہو ہی ان کے حصے میں آ گئی تو وہ کیا کریں گی۔

"نہیں...... ہر لڑکی ثمرہ جیسے ذہن کی نہیں ہوتی۔ اللہ کے دین کو اپنے مطلب کی نظر سے دیکھنے والی زیادہ ہوتی ہیں۔"

انہوں نے سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا تھا۔ (پھر ایک مچھلی سارے دریا کو گندا کر گئی تھی)

شام میں سرمد آیا تو حسب معمول اداس اور خاموش تھا۔ خورشید نے اپنے بتیس سالہ بیٹے کو غور سے دیکھا تھا۔ کتنا مرجھا گیا تھا وہ۔

"کھانا لاؤں بیٹا؟" انہوں نے جیسے پچکار کر پوچھا تھا۔

"نہیں اماں! میں کھا آیا ہوں باہر ہی۔" سنجیدہ سے لب و لہجے میں جواب آیا تھا۔

"تم مجھ سے ناراض ہو ناں سرمد! میں تمہارا برا تو نہیں چاہتی۔"

"میں ناراض کب ہوں اماں؟"

سرمد نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔

"چلو اسی لڑکی سے کر لو شادی۔ میں کون ہوتی ہوں روکنے والی۔"

اماں کی بات سن کر، سرمد ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اور وہ ساری باتیں یاد آ گئی تھیں جو اماں نے امید صبح کے بارے میں کی تھیں۔

"بتاؤ کب لے کر جاؤں رشتہ؟"

وہ منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں وہ ساکت کھڑا زمین کو گھور رہا تھا۔

"اگر آپ ناراض ہیں تو......" وہ سنبھل کر بولا تھا مگر خورشید نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ارے نہیں ہوں ناراض۔"

اب جیسی بھی ہوگی۔ وہ ہی قبول ہے۔ اگر میں اپنی مرضی کی ڈھونڈ لائی اور وہ بھی ایسی ہی نکلی تو پھر میں کیا کروں گی۔

اگر میری قسمت میں تیری بے رخی سہنا لکھا ہوا ہے تو وہ تو ہر حال میں ہی سہوں گی۔

چاہے کیسی ہی شریف لڑکی ڈھونڈ لاؤں۔ شادی کے بعد تو لڑکیاں، لڑکے کو صرف اپنی ملکیت ہی سمجھتی ہیں۔ یہ بھول جاتی ہیں کہ جنہوں نے اسے پالا پوسا ہے۔ پڑھایا لکھایا ہے وہ بھی کچھ اس کے لگتے ہیں کمرے سے ہی نکلنے نہیں دیتیں۔

ماں اکیلی پڑی سڑتی رہے، کوئی پروا نہیں۔" وہ مان تو گئی تھیں۔ مگر بدگمانی کی دھول میں اٹی کھڑی تھیں۔

سرمد ششدر سا کھڑا اماں کا منہ تک رہا تھا۔

☆☆☆

خواہشوں کے گلاب، کیسے پتھروں کی برسات کے بیچ و بیچ کھلے تھے۔ مگر وہ خوش تھا۔ بے تحاشا خوش۔ امید صبح کو فوراً شادی کے لیے آمادہ کرنا اب اس کا کام تھا۔ جو بڑی ہونے کے ناتے چھوٹے بہن بھائیوں کی فکر میں گھلتی، شادی نامی لفظ ــــ بھول ہی گئی تھی۔

باپ کی وفات کے بعد گھر کی ذمہ داری اپنے کندھوں پہ اٹھائی تو خواب و خواہش، سب ترک کیے چھوٹے بہن بھائیوں کے خواب پورے کرنے کی کوشش میں اپنی آنکھیں بنجر ہی کروا لی تھیں۔

اسے یقین تھا کہ ذرا سی تگ و دو کے بعد وہ مان جائے گی۔

اور ایسا ہی ہوا۔ اس کے مان جانے کے بعد وہ ہواؤں میں اڑتا، خوشبوؤں میں پھرتا اسے اپنے سنگ اڑا لایا تھا۔ خورشید اس کے انداز و اطوار دیکھ دیکھ کر ہول رہی تھیں۔

"یہ تو ابھی سے قابو کر لیا ہے اس ڈائن نے، اب میرے بیٹے کو مجھ سے دور کر دے گی دو گھڑی

بیٹھنے بھی نہیں دے گی میرے پاس۔"

☆☆☆

اتوار کا دن تھا خورشید بیگم صحن میں تنہا کھڑی تھیں۔ ہر طرف سنہری دوپہر کا راج تھا۔ سونے میں نہائی گزنیں ہر طرف بکھرتی پھر کوئی بادل کا آوارہ ٹکڑا سونے کے تھال کو اوٹ میں لے لیتا۔ شاہ خاور چھپ جاتا۔ بادل کا ٹکڑا اٹھکیلیاں کرتے گزر جاتا۔ زمین پھر سنہری ہو جاتی۔

اتنے خوب صورت موسم میں بھی وہ بے کلی واضطراب کی کیفیت میں گھری کھڑی تھیں۔ وجہ تھے سرمد اور امید صبح! جو کب سے کمرے میں گھسے ہوئے تھے۔ خورشید، امید کی ٹھیک ٹھاک کلاس لینے کی غرض سے ان کے کمرے کی طرف بڑھی تھیں۔ جس نے سرمد پہ جادو کروا کر اسے مکمل طور پر پھانس کر ماں سے دور کر دیا تھا۔

مگر کمرے سے آتی آوازوں نے ان کے قدم جکڑ لیے تھے۔

"امید! تم اتنی چپ چاپ کیوں بیٹھی ہو؟" سرمد کی فکر میں گھلی آواز خورشید کو بہت بری لگی تھی۔

"سرمد! تم اماں کو زیادہ وقت نہیں دیتے۔ شادی کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ بندہ سب چھوڑ چھاڑ کمرے کا ہو کر رہ جائے۔

تم اکلوتی اولاد ہو ان کی۔ ان کا دل دکھتا ہوگا، ماں کا دل خوش ہو تو زندگی میں سکون ہوتا ہے۔ ورنہ......"

"کیا اول فول بولے جا رہی ہو امید! میں ان کی پروا کیوں نہیں کروں گا بھلا! ساری زندگی میرا وقت میری اماں کے لیے ہی وقف رہا ہے۔ اب میری نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ اس وقت پہ تمہارا حق ہے کہ میں زیادہ وقت تمہیں دوں۔"

وہ امید کی بات کاٹ کر جھنجلائی آواز میں بولا تھا۔

خورشید کا حلق خشک ہونے لگا تھا۔

سرمد! وہ ماں ہیں اور میں بیوی! مرد پہ بیوی سے زیادہ ماں کا حق ہوتا ہے۔ یہ کبھی مت بھولنا۔

ہم اگر یونہی کمرہ بند کر کے بیٹھنے لگے تو وہ اتنے کشادہ گھر میں ہمارے ہوتے ہوئے بھی تنہائی کی سزا کاٹیں گی۔ تنہائی اور انتظار بہت بری چیز ہوتے ہیں سرمد اور خاص طور پہ بڑھاپے میں بوڑھی آنکھوں میں بستی تنہائی مجھے بہت اذیت دیتی ہے۔"

امید صبح کی آواز میں نمی گھل گئی تھی۔

اور ان ہی لمحوں میں خورشید کو لگا تھا کہ جیسے ان کے گالوں پہ بھی نمی پھیل رہی ہے، انہوں نے ہاتھ پھیرا تو وہ واقعی آنسو تھے۔ شرمندگی کے آنسو۔ ندامت کے آنسو۔

"اللہ معاف کرے جو میں اماں کو رلاؤں، انہیں تنہائی کی سزا دوں۔ کیسی باتیں کرتی ہو تم بھی امید! بالکل پاگلوں جیسی۔ چلو اماں کے پاس چلتے ہیں۔"

سرمد کی آواز کانوں سے ٹکرائی تو خورشید الٹے پاؤں، ہانپتی کانپتی اپنے کمرے میں بھاگی تھیں اور چارپائی پہ بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگیں۔

واقعی! سارے دنیادار بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ یہ تو اپنے اپنے ذہن، ظرف اور سوچ کی بات ہوتی ہے۔ تب ہی سرمد اور امید صبح ان کے کمرے میں داخل ہوئے۔

"سوری اماں! ہم نے خیال نہیں کیا آپ کب سے اکیلی بیٹھی ہیں۔" سرمد کان پکڑے ان کی گود میں سر رکھ چکا تھا۔ خورشید نے اس کا چہرہ اوپر کر کے چٹاچٹ چوم ڈالا، پھر امید صبح کا بھی۔

"ارے نہیں۔ میں تو سونے لگی تھی۔ جاؤ تم بھی آرام کرو۔"

پیار سے امید کی طرف دیکھا تھا۔ اور پھر دوپٹا تان کر لیٹ گئیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیے تھے۔

☆☆

ماہنامہ کرن

فروری 2024ء کے شمارے کی ایک جھلک

- ”عائزہ خان سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اس ماہ ”جویریہ فیصل مقابل ہے آئینہ،
- ”تاش گھر“ ایمل رضا کا سلسلہ وار ناول،
- ”دامن سحاب“ مہوش افتخار کا سلسلہ وار ناول،
- ”کسوف“ قرۃ العین خرم ہاشمی کا مکمل ناول،
- ”اک لمحہ جاوداں“ عقیلہ ہاشمی کا مکمل ناول،
- ”سپاس گزار“ میمونہ صدف کا ناولٹ،
- ”شبِ ہجر“ ام اقصی کا ناولٹ،
- عطیہ خالد، قانتہ رابعہ، نازنین فردوس اور عندلیب زہرا کے افسانے اور مستقل سلسلے،
- ”کرن کتاب“

دلچسپ معلوماتی مضامین اور مزیدار ریسپیز کے ساتھ

فروری 2024ء کا شمارہ شائع ہوگیا

صوفیہ بٹ

احد

مکمل ناول

باب

وفا ہے کہ جفا ہے

ایڈووکیٹ خولہ بنت زید نے سلاخوں کے پار اس کا چہرہ دیکھا تو اپنے قدم وہیں روک لیے۔

وہ چونا پُکالی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی اور چہرے پہ رنگ ہی رنگ برس رہے تھے۔ زندگی کے رنگ، فرحت و انبساط کے رنگ، کیف و سرور کے رنگ، کچھ پالینے کے رنگ۔ نہیں۔ بلکہ سب کچھ پالینے کے رنگ۔ لگتا تھا دنیا فتح کر ڈالی۔

خولہ نے اسے بلایا نہیں۔ یہ پل اس کی زندگی میں کم ہی آتے تھے۔ یہ چہرہ دھنک رنگ کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ اگر اس وقت وہ بیتے کل کے روح افزاء لمحوں میں جی رہا تھا تو وہ ان لمحوں کے سرور سے اسے نکالنا نہ چاہتی تھی۔ حقیقت کی دنیا کے دہکتے الاؤ میں جھونکنا نہ چاہتی تھی۔

لاک اپ کا دروازہ اس کے لیے کھول دیا گیا تھا مگر وہ اندر داخل نہ ہوئی۔

اچانک اس کے چہرے پہ ایک اور رنگ ابھرا۔ دکھ اور کرب کا رنگ۔ زرد رنگ۔

آنکھیں اس کی ابھی بھی بند تھیں اور وہ اضطراب سے اپنے سر کو ادھر ادھر ہلا رہا تھا۔ وہ جلدی سے ایک قدم آگے بڑھی۔ اب اس نے اپنے سر کو دیوار سے ٹکرانا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے کہ اس زرد چہرے پہ موت کا سا سیاہ رنگ پھیلتا، اس نے جلدی سے سلاخوں کے پاس آ کر اسے پکار لیا۔

''عبدالہادی۔''

اس نے جیسے سنا نہ تھا۔ وہ اتنی ہی اذیت میں رہا۔

''عبدالہادی!''

خولہ نے دوبارہ اور پھر سہ بارہ اسے پکارا تو کہیں جا کر اس کی آواز اس کے کان کے پردوں سے ٹکرائی۔ وہ ایک پل کے لیے ساکت ہوا اور پھر آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ اس نے گردن ابھی بھی نہ موڑی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی سماعت نے اسے دھوکا دیا ہے۔

''عبدالہادی۔'' خولہ نے پھر نرمی سے پکارا۔

اب کی بار اس نے آہستہ سے گردن موڑ کر اس جانب دیکھا۔ بے تحاشہ سرخ ہوتی آنکھوں نے ایک پل کے لیے خولہ کو لرزا دیا۔ وہ چند لمحے غائب دماغی کی حالت میں اسے دیکھتا رہا اور جب یہ ادراک ہوا کہ اس کا وہم نہیں بلکہ اس کے سامنے حقیقت کی صورت ایڈووکیٹ خولہ بنت زید کھڑی ہے تو وہ ایک جھٹکے سے ہاتھ سر کے اطراف سے ہٹاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اور سلاخوں کے قریب آ گیا۔ وہ دانستہ ذرا سا مسکرائی۔

''ایڈووکیٹ خولہ بنت زید آپ۔ آپ کب آئیں؟'' اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

''ابھی ابھی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل کھولی۔ ''کچھ پیپرز پہ سائن لینے تھے۔'' اس نے فائل اور پین سلاخوں کے درمیان سے اندر بڑھاتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں چیزیں تھام کر سائن کرنے لگا۔

''پہلے غور سے ان پیپرز کو پڑھ لیں۔ کسی پر بھی اتنا اعتبار اچھا نہیں ہوتا۔'' خولہ نے تنبیہ کی مگر اس

نے سی ان سی کر کے چین چلا دیا۔

''ایک اچھی خبر ہے۔'' خولہ کا لہجہ کچھ پرجوش ہوا، وہ بولا کچھ نہیں بلکہ سر سے چونا جھاڑتے ہوئے اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ یہ چونا حوالات کی دیواروں اور چھت کا تحفہ تھا جو بن بادل برستا تھا۔

''مجھے اسد اللہ نامی ایسا شاہد ملا ہے جس کی گواہی کم از کم اتنی مفید ہوگی کہ آپ کی ضمانت ہو جائے گی اور آپ حوالات سے باہر۔''

''ایک منٹ ایڈووکیٹ خولہ بنت زید! ایک منٹ!'' اس نے انگلی اٹھا کر اسے بولنے سے روکا۔

''اچھی خبر میرے لیے یہ نہیں کہ میں یہاں سے باہر

چودہویں قسط



نکلوں۔ اچھی خبر میرے لیے یہ ہے کہ وہ وحشی اپنے انجام کو پہنچے۔"

"ایک ہی بات ہے۔" خولہ کے منہ سے نکلا۔

"ایک ہی بات نہیں ہے۔ ایک ہی بات نہیں ہے ایڈووکیٹ خولہ بنت زید۔" اس نے سلاخوں پہ مکا مارا۔ "میں تمام عمر یہیں ہنستے ہنستے گزار لوں گا اگر وہ درندہ اپنی سزا پا جاتا ہے۔" اس کی رگیں تن گئیں، لہجہ انگارے کی طرح دہکنے لگا۔

"ٹھیک ہے عبدالہادی! میں آپ کی بات سمجھ گئی ہوں لیکن۔" اس نے رسان سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ پھر اس کی بات کاٹ گیا۔

"وہ گواہ اصل مجرم کی گردن میں پھندا ڈالنے کے لیے مفید ثابت ہوگا کہ نہیں؟"

"نہیں سوری۔ اسد اللہ کی گواہی اصل مجرم کو نہ گھیر سکے گی بلکہ۔"

"پھر مجھے اس کی گواہی کی قطعی ضرورت نہیں۔"

"عبدالہادی! آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ ایک دفعہ آپ حوالات سے باہر آ جائیں تو دوسرے محاذ پہ لڑنا میرے لیے آسان رہے گا۔ ویسے بھی جب آپ باہر آ جائیں گے ناں عبدالہادی! تو ہماری تو یہ آدھی فتح ہوگی مگر دشمن کو اپنی پوری ہار محسوس ہوگی۔ اور آپ کا دشمن ایسا تو ہے نہیں کہ ہار قبول کر کے منہ چھپا کر کہیں بیٹھ جائے۔ بلکہ وہ اشتعال میں آ کر جوش میں ضرور ایسا قدم اٹھائے گا جو اس کے اپنے لیے ہی جال ثابت ہوگا۔" اب کے اس نے ایسا نکتہ پیش کیا جو اس بندے کو مطمئن کر سکے جسے اپنی پرواہ نہ تھی۔

"میں جانتی ہوں۔ باہر آپ کی جان کو خطرہ۔"

"میری پرواہ مت کریں آپ۔ موت میرا ڈر نہیں۔ آپ مجھے اسد اللہ کے بارے میں تفصیل سے بتائیں۔"

خولہ ہلکا سا مسکرا دی۔ اس کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ کر اس نے اپنی بات منوالی تھی۔ وہ اسے اسد اللہ کے بارے میں بتانے لگی کہ اس نے اس رات کب، کہاں اور کس کے ساتھ عبدالہادی کو دیکھا تھا۔ اور اس گواہی کو وہ کیسے اگلی سماعت میں اپنے کام میں لائے گی۔ وہ سنتا رہا۔ آنکھوں کی سرخی کچھ کم ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

بننا تو وہ چاہتا تھا گیت کار مگر بن گیا گورکن۔ کیا کیجیے کہ گیت لکھ لکھ کر کسی کا پیٹ نہیں بھرتا۔ وہ مردے دفنانے لگا۔ ایسا نہ کرتا تو اسے لگتا تھا کہ جلد ہی ماں کو دفنانا پڑ جاتا۔ باپ کو گزرے اتنا وقت نہ ہوا تھا کہ ماں کی جدائی کو سہنے کے لیے تیار ہو جاتا۔ وقت نے اس کے ہاتھ میں کدال تھما دی۔ وہ مٹی نکالتا، مٹی ڈالتا۔ مشقت تو وہ کر لیتا تھا مگر میت اور اس کے ساتھ آئے لوگ۔ شروع شروع میں یہ منظر دیکھ کر اس کا جسم کانپنے لگتا، ٹھنڈے پسینے آنے لگتے، کئی وقت کی بھوک مر جاتی۔ پھر وہ عادی ہونے لگا۔ لیکن ایک تدفین کے بعد اپنے کمرے میں آ کر وہ اتنا رویا تھا، اتنا رویا تھا کہ بے جان سا ہو گیا تھا۔

وہ ایک جواں سال کی میت تھی۔

خاموشی سے آنسو بہاتا، پرسے لیتا اس کا باپ جس نے اس لیے پالا پوسا ہوگا کہ اس کا بازو بنے گا۔ بڑھاپے کا سہارا بنے گا۔

پھوٹ پھوٹ کر روتا بھائی جس نے لڑتے ہوئے ہزار بار کہا ہوگا "مر جا۔" آج اپنی زبان کاٹ دینے کو سوچتا ہوگا۔

اور ایک دوسرے کے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کر روتے ہوتے یار دوست جو ہمراز تھے۔ جوانی میں سب سے قریب یہ یار ہی تو ہوتے ہیں جن سے بندہ ہر بات کہتا ہے۔

اس نے آگے بڑھ کر نوجوان کا چہرہ دیکھا تھا اور اب تک بھول نہ پاتا تھا۔ سچ ہے جوان موت آسانی سے بھلائی نہیں جاتی۔

اس کا باپ جب بھی بیٹے کی قبر پر آتا، پہلے سے زیادہ بوڑھا لگتا۔ وہ قبر کو بوسے دیتا، آنکھوں سے بہتے پانی سے آبیار کرتا۔

یہ منظر دیکھ کر وہ سوچتا۔

اچھا ہوا، اس کا باپ اس سے پہلے مر گیا۔

ہاں جوان اولاد کی موت یوں ہی بے حال کر دیتی ہے۔ اس نے اپنی پھوپھی کو دیکھا ہوا تھا جس کا اکیس سال کا جوان بیٹا مر گیا تھا۔ پھوپھی کے لیے دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ نیم پاگل سی ہو گئی تھی۔ اس مرے ہوئے بیٹے کے غم میں وہ اپنے حیات بچوں کو بھلا بیٹھی تھی۔ ہاں جوان اولاد کا جانا بڑا غم ہے۔ اس کا بیٹھنا، رینگنا، چلنا، دوڑنا ہر پل دیکھا ہوتا ہے۔ اس کا ''آں آں'' سے لے کر ''امی آپ بہت پیاری ہو'' سنا ہوتا ہے۔ پھر یہی بچہ بڑا ہو کر اتنا بولنے لگتا ہے کہ کبھی کبھی ماں باپ کو بھی سنا ڈالتا ہے۔ اس بچے کا کلکاریاں مارنا، ہنسنا، رونا، روٹھنا منانا، پہلی سانس سے لے کر جوانی تک کا ہر لمحہ نگاہ سے گزرا ہوتا ہے۔ مگر ایک نوزائیدہ یا شیر خوار بچے کی موت بھلا کب باپ کا یہ حال کرتی ہے جو وہ اس شخص کی دیکھا کرتا تھا جو اس وقت اس چھوٹی سی قبر پہ سفید پھول بکھیر رہا تھا۔

نوزائیدہ بچہ تو بس اپنا لمس دے جاتا ہے۔ اپنی صورت دکھا جاتا ہے۔ اتنے سے بچے کا باپ شاید جوان ہوتا ہے، غم سہنے کی طاقت رکھتا ہے۔ پھر یہ تسلی بھی ہوتی ہے کہ نعم البدل مل جائے گا۔ شاید اس کی پہلی پہلی اولاد تھا یہ بچہ۔ شاید اس کو ابھی تک نعم البدل نہ ملا تھا۔ بننا تو وہ چاہتا تھا گیت کار مگر بن گیا گورکن۔ وہ نہ جانتا تھا کہ ابھی اس کی قسمت میں کیا بننا لکھا ہے۔

☆☆☆

رات کے اس پہر جب ہر طرف نیند نے جادو سا کر ڈالا تھا اور سب اس کے زیر اثر تھے۔ گھروں کی بتیاں مدھم تھیں یا گل ہو چکی تھیں۔ اس چھوٹے سے خوبصورت گھر کے نیچے والے ایک کمرے میں روشنی تھی اور اس کمرے میں موجود لڑکی کی آنکھیں دیکھ کر لگتا تھا کہ برسوں سے سوئی نہیں۔ وہ لڑکی سلیپنگ بیوٹی بننا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک دن چلتی ہوئی وہ محل کے دوسری طرف نکل جائے جہاں بوڑھی عورت کے چرخے کی نوک اسے چبھے اور وہ سو سال نہیں۔ ہمیشہ کے لیے سو جائے مگر اسے کوئی بدصورت بوڑھی پری کوئی بددعا دے کر بھی نہ گئی تھی۔ اگر اسے بھی کسی بدصورت بوڑھی کرخت ظالم قسم کی پری نے بددعا نہیں دی تھی تو پھر۔ پھر زندگی بددعا سی کیوں لگنے لگی تھی۔

''فائقہ۔ یہاں بیٹھی ہو۔ میں تمہیں کچن میں ڈھونڈ رہا تھا۔'' مرتضیٰ اسے تلاش کرتا ہوا اس کمرے میں آ پہنچا تھا اور اب نرمی سے کہتے ہوئے آنکھیں ملتے ہوئے اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے چہرہ موڑ کر اپنے شوہر کی طرف نہیں دیکھا۔ حالانکہ یہ وہ شخص تھا جسے بھی وہ گھنٹوں تکتے ہوئے نہ تھکا کرتی تھی۔

''کیا بات ہے۔ نیند نہیں آ رہی؟'' شوہر کے استفسار پہ جاگتی ہوئی شہزادی نے اس کی طرف جن نظروں سے دیکھا، وہ نگاہیں چرانے پہ مجبور ہوا۔

''چلو آؤ۔'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر اٹھ کھڑا ہوا۔ برسوں سے جاگی لڑکی خاموشی کے ساتھ اٹھ کر اس کے ساتھ چل دی۔ نیچے والے کمرے کی بتیاں بھی گل ہو گئیں۔

☆☆☆

چرخے کی نوک اس عورت کو چبھ گئی تھی جو کئی ماہ سے سو رہی تھی اور جاگتی ہی نہ تھی۔ کون کون نہ آتا تھا اس کے پاس۔ کون کون نہ اس کی منتیں کرتا تھا کہ وہ اٹھ جائے۔ مگر اس تک تو جیسے کوئی آواز جاتی ہی نہ تھی۔ اس کو تو جیسے بیدار ہونے کی خواہش ہی نہ تھی۔

اور ایک دن سوئی ہوئی عورت نے آنکھیں کھول دیں۔ پتا نہیں اتنے لوگوں میں سے کس کی دعا رنگ لے آئی تھی۔ وہ اٹھ گئی تھی۔ معجزہ ہو گیا تھا۔ اس وقت کوئی نہ جانتا تھا کہ یہ معجزہ شاید کسی مہلت کے لیے ہوا۔ مہلت پوری تو زندگی پوری۔

☆☆☆

پیسے سے بندے کی زبان سے نکلنے والے الفاظ خرید لیے جاتے ہیں یا طاقت کے بل بوتے پر زبان ہی بند کروا دی جاتی ہے۔ اب دشمن نے کون سا حربہ استعمال کیا تھا، خولہ نہیں جان پائی۔ بس اتنا ہوا تھا کہ جو شاہد گواہ بن کر اتنے عرصے کی بھاگ دوڑ کے بعد منظر عام پر آیا تھا وہ کیس کی سماعت کے روز پس منظر میں غائب ہو گیا۔ یلف نے بتایا کہ جب

زہ اسے لینے پہنچا، مکان کو تالا لگا ہوا تھا۔ اور پڑوس میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں گیا۔

پچھلے گیارہ مہینوں کی طرح یہ سماعت بھی بے نتیجہ رہی۔ مجرم آزاد رہا اور بے گناہ پھر حوالات کا مکین بننے جا رہا تھا۔ وہ عبدالہادی سے نگاہ چرا رہی تھی۔ اس کو لگی ہتھکڑیوں سے نگاہ چرا رہی تھی۔

"آئم ساری عبدالہادی!" وہ اس کی طرف آئی۔ کمرہ عدالت آہستہ آہستہ نفوس سے خالی ہو رہا تھا۔ "اسداللہ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ گواہی دینے ضرور آئے گا۔ کل رات بھی میری اس سے بات ہوئی تھی لیکن۔" آگے کچھ کہنے کے لیے الفاظ نہ تھے اس کے پاس۔

"ایڈووکیٹ خولہ بنت زید! میرا ایک کام کریں گی آپ؟" عبدالہادی نے اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے سوال کیا۔

"یقیناً۔"

"یہ کام آپ کے فرائض میں شامل نہیں پھر بھی۔" وہ کچھ متامل ہوا۔

"آپ کہیں عبدالہادی! مجھے آپ کے کسی بھی کام آ کر خوشی ہوگی۔" اس کو جھجکتے دیکھ کر وہ ملائمت سے بولی۔ اور جب اس نے کام بتایا تو خولہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ دونوں گارڈ جو ان سے ذرا فاصلے پہ کھڑے تھے، ایک دوسرے کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرا دیے۔ آخر حیرت سے باہر نکلتے ہوئے خولہ نے مسکرا کر "اوکے" کہتے ہوئے سر کو خم کیا۔ وہ ان ہی گارڈز کی معیت میں کمرہ عدالت سے باہر نکل گیا اور خولہ اسے جاتا دیکھتی رہی۔

یہ عبدالہادی۔ اس نے اکثر اسے حیران ہی کیا تھا۔

اس دن بھی جب اس کیس کی پہلی سماعت تھی۔ جب وہ کٹہرے میں کھڑا تھا۔ جب فاضل جج اسے یہ پڑھ کر بتا رہے تھے کہ اس پہ کیا فرد جرم عائد کی گئی ہے۔ اس وقت۔ اس وقت بھی خولہ بنت زید اپنی جگہ پہ منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ کیا کہہ رہا تھا، وہ کس بات پر چلا رہا تھا۔

"وہ نہیں تھی وہ ایسی۔ زبان کھینچ لوں گا میں اس کی جس نے اس کے لیے یہ لفظ بولا۔ دس قتل بھی کرنے پڑے تو کر دوں گا۔"

وہ خولہ بنت زید، وکیل استغاثہ جو اپنے کاغذات سیٹ کرتے ہوئے اپنے ذہن میں ان سوالوں کو ترتیب دے رہی تھی جن سے اس نے اس سفاک شخص کے بخیے اُدھیڑنے تھے اور ہوا کیا؟

اس نے ہی خولہ کے قدموں تلے سے زمین کھینچ ڈالی تھی۔ اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

ایک ملزم جس پر قتل کا الزام لگایا جا رہا تھا، اس نے چلا چلا کر یہ نہیں کہا کہ وہ قاتل نہیں وہ خونی نہیں بلکہ وہ مشتعل اس بات پہ ہوا کہ اس لڑکی کو کاری کہا جا رہا تھا۔ اسے خود پہ لگے الزام کی پروا نہ تھی، اسے تکلیف ہوئی تھی تو اس لڑکی کے دامن پہ کیچڑ اچھالنے کی جس لڑکی کے قتل کے الزام میں وہ اس وقت کٹہرے میں کھڑا تھا۔ جس لڑکی کے لیے "کاری" سننا برداشت نہیں کیا، اس کو کاری قرار دے کر قتل کر سکتا تھا وہ؟

کیا وہ قاتل ہو سکتا تھا؟

ایک بہت بڑا سوالیہ نشان اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگا تھا۔

فاضل جج نے خاموشی سے اس شخص کو تھوڑی دیر دیکھا اور پھر سے چارج شیٹ پڑھنے لگے۔ اور جب ایڈووکیٹ خولہ بنت زید کو بطور وکیل استغاثہ سوالات کرنے کی دعوت دی گئی تب تک وہ سوالیہ نشان اس کی نگاہوں کے سامنے سے غائب ہو چکا تھا۔ وہ اطمینان سے اٹھی اور کٹہرے میں کھڑے شخص کی طرف مڑنے کے بجائے فاضل جج کے عین سامنے آ کھڑی ہوئی اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس کیس کی سماعت کو کم از کم ایک ہفتہ تک کے لیے ملتوی کر دیں۔

سماعت تین ہفتے کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ اور اکیس دن بعد وہ اسی کمرہ عدالت میں کھڑی تھی مگر وکیل استغاثہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ عبدالہادی کی وکیل صفائی کی حیثیت سے۔ حالانکہ یہ قدم انصاف کے اصولوں کے خلاف تھا اور ایڈووکیٹ خولہ بنت

زید کے اپنے اصولوں کے منافی بھی۔ ایسا وکیل قابل اعتبار نہیں رہتا۔ لوگ اسے اپنا کیس دیتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ جانے کب دوسری جانب جا کھڑا ہو۔ پھر بھی وہ اپنی ساکھ کو داؤ پر لگا کر عبدالہادی کے لیے لڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

"یہ تو میں سوچ نہیں سکتا کہ اس نے تمہیں زیادہ پیسہ آفر کیا۔ اس لیے تم اس کی طرف چلی گئیں۔ پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے بھٹکنے کی۔ کہیں اس کے خوب صورت چہرے پہ تو نہیں مر مٹیں تم؟"

وہ جو "آپ۔ جناب" ہوتا تھا، وہ گیا بھاڑ میں فوراً اصلیت پہ آ گیا تھا وہ۔ جب پہلی بار اس کے آفس آیا تھا، تب کتنا مہذب اور دکھی لگ رہا تھا جو اپنی بہن کے لیے انصاف چاہتا تھا، اس کے قاتل کو قرار واقعی سزا دلوانا چاہتا تھا۔

"وجہ کچھ بھی ہو۔ یہ اطمینان آپ رکھیں کہ آپ اپنی بہن کے لیے انصاف چاہتے ہیں، اس کے قاتل کو پھانسی کے پھندے تک لے جانا چاہتے ہیں۔ ایسا ہی ہوگا۔" اس نے مسکرا کر اپنے سامنے کھڑے شخص کو جواب دیا۔ اور آگے بڑھ گئی۔

"پچھتائیں گی آپ۔ اس کے معصوم چہرے پہ جا کر۔ بڑا اداکار ہے وہ۔" وہ پیچھے سے چلایا تھا۔

اور ایڈووکیٹ خولہ بنت زید رکی نہیں، قدم بڑھاتی رہی۔ آج بھی اس کے قدم نہیں رکے تھے۔ لیکن کیس رک سا گیا تھا۔ بہرحال جو بھی تھا، وہ پچھلے کئی ماہ سے عبدالہادی کے ساتھ اس کی طاقت بن کر کھڑی تھی جو اسے اکثر حیران کیا کرتا تھا۔ اور آج۔ آج کی اس کی فرمائش۔

وہ ابھی تک اچنبھے میں تھی۔

☆☆☆

پروفیسر زید ابصار نے قلم ہاتھ سے رکھا اور بیٹی کا چہرہ دیکھا۔ صبح سے وقفے وقفے سے انجانے نمبروں سے آنے والی کالز نے جس کو عجیب سی جھنجلاہٹ میں مبتلا کیا ہوا تھا۔ دشمن سامنے ہو تو جنگ کا مزا بھی ہے۔ یہ چوہے بلی کا کھیل تو اسے کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔

"تم جس فیلڈ میں ہو، یہ عام سی چیزیں ہیں۔ انہیں حواس پہ سوار مت کرو خولہ۔"

"میں حواس پہ سوار نہیں کر رہی بابا! مگر مجھے غصہ آ رہا ہے۔ آپ ان سب سے کیسے نپٹتے ہیں بابا؟"

"اپنا معاملہ اللہ کے سپرد رکھتا ہوں اور جہاں تک ممکن ہو، احتیاط کرتا ہوں۔"

خولہ ایک بار پھر اس شخص سے متاثر ہوئی جس کے قلم سے نکلنے والا ہر لفظ بغیر کسی شہادت کے سچ جانا جاتا تھا۔ اس نے اس شخص کو ہمیشہ سکون میں دیکھا تھا۔ حالانکہ کیسے کیسے حالات پیش نہ آئے تھے۔

"بابا!" اس نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کے ماتھے پہ بوسہ دیا اور جانے کی اجازت چاہی۔ اسی اثنا میں ثروت لائبریری میں داخل ہوئی تھیں۔

"کس کا فون آ رہا ہے بار بار خولہ؟"

ایک کالم نگار کی بیوی اور ایک وکیل کی ماں ہو کر انہیں بچویشنز سمجھ میں آتی تھیں پھر بھی پہلے انتظار کرتی تھیں کہ کوئی انہیں خود ہی بتا دے۔ یہ اور بات کہ باپ بیٹی کے کچھ سیکرٹس ایسے ہوتے تھے جن سے وہ اکثر بے خبر رہتی تھیں۔

"اقصیٰ کا۔" خولہ نے بیسٹ فرینڈ کا نام لے کر ٹالنا چاہا مگر سامنے وکیل کی ماں تھی۔

"بار بار کیوں کر رہی ہے کال؟" مشکوک انداز میں سوال کرتے کرتے کچھ یاد آیا۔ "اب آئے فون تو میری بات کروانا۔ مجھے اس سے ضروری بات کرنی ہے۔"

"مجھے پتا ہے کیا ضروری بات کرنی ہے آپ نے۔" خولہ نے ان کا گال چومتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو کیا ساری عمر شادی نہیں کرنی۔ باپ کو تمہارے تو پروا نہیں۔ اقصیٰ ہی شاید تھوڑی عقل دے دے۔"

"جو چیز اس کے پاس نہیں ہے، مجھے کیسے دے گی۔" وہ ہنسی۔

"خولہ! تیس سے اوپر کی ہو گئی ہو۔" ماما کی

فکر مندیاں آج کل اسی حوالے سے تھیں۔

"اور میری عمر میں آپ ایک دس سالہ بیٹی کی ماں تھیں۔" خولہ نے جلدی سے ان کا متوقع اگلا جملہ بولا تو ماما اسے گھور کر رہ گئیں۔ جبکہ بابا ہنس دیے تھے۔

"عبید اچھا لڑکا ہے۔ اچھا بزنس ہے۔"

"اس اچھے عبید کے بارے میں، میں واپس آ کر بات کروں؟"

"کہاں جا رہی ہو۔"

"واپس آ کر بتاؤں؟"

"تب بھی کیوں بتانا ہے۔" ماما نے خفگی بھرے انداز میں کہا تو اس نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں پھر انہیں پیار کیا۔ ماما مسکرانے پہ مجبور ہوئیں۔

ارادہ اس کا فلاور شاپ پہ جانے کا تھا مگر ایوب چاچا کو گیٹ کھولنے کا اشارہ کرتے ہوئے جب وہ گاڑی کی طرف بڑھی تو اسے کچھ خیال آیا۔

"چاچا! گیٹ بند ہی رہنے دیں۔" کہتے ہوئے وہ پھر اندر گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ باہر نکلی تو اس کے ہاتھ میں کرسٹل کا ایک جار تھا۔ وہ لان میں دیوار کے ساتھ لگے موتیا کے پودوں کی طرف آ گئی۔ اور شفاف سپید کلیوں کی سوندھی مہک کو اپنے اندر اتارتے ہوئے انہیں جار میں قید کرنے لگی۔ دو تین پودوں سے ان کی چاندنی چرانے کے بعد جار بھر چکا تھا۔ وہ اسے اپنے ناک کے پاس لائی۔ تازہ شاداب کلیوں کی خوشبو نے اس کے اندر تک تازگی دوڑا دی۔ اس کے لبوں پہ مسکان بکھر گئی۔ اس نے گنگناتے ہوئے جار کو بند کیا اور پورچ کی طرف آ گئی۔

یہ ایک ٹھنڈی سہ پہر تھی۔ اسے کسی کی انوکھی فرمائش پوری کرنی تھی۔

☆☆☆

ضامن مصطفیٰ نے "آمین" کہہ کر چہرے پہ ہاتھ پھیرنے کے بعد سامنے جو نگاہ کی تو جیسے پلٹنا ہی بھول گئی۔ سامنے کا منظر ہی ایسا تھا۔ نگاہوں اور قدموں کو گرفت میں لے لینے والا۔

وہ لڑکی اس چھوٹی سی قبر پہ موتیا کی کلیاں پھیلا رہی تھی جو پہلے ہی بے دم کلیوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس کام کے ساتھ ساتھ وہ جیسے اس قبر میں موجود خاکی سے ہمکلام بھی تھی۔ جاتی ہوئی شام کی سرخیاں اور اس لڑکی کے عارض کی گلابیاں مل کر ماحول کو ایک نئے ہی رنگ سے آشنا کر رہی تھیں۔

ضامن نے ایسا منظر پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

وہ لڑکی مصروف رہی یہاں تک کہ اس جار میں سے تمام کلیاں نکل کر اس قبر کو مہکا گئیں جو غالباً کسی نوزائیدہ بچے کی تھی۔ پھر وہ کھڑی ہو گئی۔ اپنے سر پہ دوپٹے کو ٹھیک کیا اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے لگی۔

ضامن چونک کر اس منظر کے سحر سے نکلے اور خود کو ملامت کرنے لگے کہ کیسی جگہ کھڑے ہو کر کسی انجان لڑکی کو یوں تک رہے ہیں حالانکہ ایسی ان کی نہ تو فطرت تھی نہ ہی عادت۔

وہ قبرستان سے باہر جانے والے رستے پہ آ گئے۔ اچانک ایک شور سا بلند ہوا۔ انہوں نے اس سمت نگاہ کی تو معلوم ہوا کہ یہ شور بغیر سائلنسر کی موٹر سائیکلوں اور ان پہ سوار نوجوان لڑکوں کی چیخوں اور سیٹیوں کا تھا۔ وہ قبرستان سے باہر والی کچی سڑک پر مٹی اڑاتے ہوئے آئے اور سڑک پہ آگے پیچھے کھڑی دونوں گاڑیوں کے پاس رک گئے۔ پھر چند لڑکے چھلانگ مار کر اترے۔ سلور گرے سوک پہ بیٹھے اور شور مچاتے ہوئے گاڑی اور موٹر سائیکلوں سمیت یہ جا وہ جا۔

یہ سب اتنا آناً فاناً ہوا کہ وہ گرد کی چادر میں لپٹے اس غیر واضح منظر کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہ گئے۔ صورت حال سمجھ میں تب آئی جب وہ لڑکی "رکو۔ رکو۔ میری گاڑی۔ رکو۔" کہتے ہوئے بے ربط انداز چلاتی ہوئی ان کے برابر سے گزر کر قبرستان کی چار دیواری پار کر کے باہر نکل گئی۔ صورت حال سمجھتے ہوئے وہ تیزی سے اس کے پیچھے گئے۔

"وہ۔ وہ میری گاڑی لے گئے۔" پریشانی میں ان کو دیکھ کر بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔
"میں دیکھتا ہوں۔" وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھے۔ یکایک اسے جانے کیا خیال آیا کہ ان کے پیچھے لپکی۔
"نہیں۔ آپ رہنے دیں پلیز۔ کوئی فائدہ نہیں۔"

وہ سات آٹھ لڑکے اور یہ اکیلا اجنبی۔ خدانخواستہ وہ انہیں کوئی نقصان پہنچا دیتے تو۔

وہ ایسا رسک کیونکر لے سکتی تھی۔ اور ضامن مصطفیٰ ایسا رسک تو شاید لے لیتے مگر شام کے اس سمے ایک لڑکی کو اکیلا چھوڑ کر جا نہ سکے۔ شور اپنے پیچھے دھول مٹی کا دھواں چھوڑتے ہوئے دور سے دور تر ہوتا جا رہا تھا۔ جلد ہی وہ اپنے حواس بحال کر چکی تھی اور اب اطمینان سے اس سمت دیکھ رہی تھی۔ اور کسی نتیجے پہ پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔
"آیئے۔ میں آپ کو چھوڑ دوں۔" انہوں نے شائستگی کے ساتھ پیشکش کی۔
"نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔
"رات ہونے والی ہے، یہاں سے آپ کو کوئی مناسب سواری نہیں ملے گی۔" انہوں نے مہذب لہجے میں سمجھایا۔ "اور آپ جانتی ہیں کہ یہ جگہ شہر سے کافی دور ہے۔"

اس نے سر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا۔ سورج اپنے مسکن کو لوٹ چکا تھا۔ اس کی باقی ماندہ سرخیوں کو رات کی سیاہیاں نگلنے کے چکروں میں تھیں۔ وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔
"آپ مجھے ٹیکسی اسٹینڈ تک چھوڑ دیں پلیز۔"
"میں آپ کو کسی ٹیکسی ڈرائیور سے کم قابل اعتبار لگ رہا ہوں کیا؟" ضامن اس کے چہرے کو پڑھتے ہوئے بولے۔
اس نے پہلی دفعہ ان کی طرف غور سے دیکھا۔ سفید شرٹ، سیاہ پتلون، سرمئی اور سیاہ دھاریوں والی ٹائی میں وہ بندہ لگ رہا تھا کہ آفس سے نکل کر سیدھا یہیں آ رہا ہے۔ ان کی شان دار پروقار شخصیت بلاشبہ قابل اعتبار لگ رہی تھی۔
وہ کچھ کہے بنا ان کی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔
ضامن نے آگے بڑھ کر اس کے لیے فرنٹ ڈور کھولا۔
"مجھے ضامن مصطفیٰ کہتے ہیں۔" تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد انہوں نے اپنا تعارف کروایا۔ گاڑی پکی سڑک پہ آ چکی تھی۔
"اور میں ایڈووکیٹ خولہ بنت زید ہوں۔"
"ایڈووکیٹ۔ ہوں۔ فائٹ فار رائٹ (حق)۔ رائٹ (صحیح)؟" انہوں نے اس پہ ایک نظر ڈالی۔
"رائٹ۔ (صحیح)۔" خولہ مسکرائی۔
"گریٹ۔ اچھی لگتی ہے حق کے لیے لڑتی عورت۔" یہ جملہ شاید انہوں نے اپنے آپ سے کہا تھا، اس لیے تو خولہ کے کانوں تک بمشکل پہنچ پایا۔
"حق کے لیے تو ہر کوئی لڑتا ہے۔"
"ہر کوئی نہیں لڑتا۔" انہوں نے خزاں رسیدہ لہجے میں اس کی بات کو مسترد کیا۔ عجیب حزن و ملال کی کیفیت تھی جس میں وہ یکدم گھر گئے تھے۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ وہ ہونٹ بھینچے سڑک پہ نظریں جمائے ڈرائیونگ کرتے رہے۔
"آپ کیا کرتے ہیں۔" خولہ کو خاموشی سے وحشت ہونے لگی تو یہی پوچھ لیا۔
"الیکٹرک ہوم اپلائنسز کا بزنس ہے میرا۔ ہماری کمپنی یہ اپلائنسز تیار کرتی ہے۔" انہوں نے بے حد سنجیدہ لہجے میں جواب دیا اور پھر طویل خاموشی۔
"کیا میں آپ کا سیل فون استعمال کر سکتی ہوں؟" اور کچھ سمجھ نہ آیا تو سوچا بابا کو ہی اطلاع کر دے کہ ان کی لاڈلی کیا نقصان کروا چکی ہے۔ اپنا موبائل تو گاڑی کے ساتھ ہی چلا گیا۔ اس لیے ڈیش

بورڈ پہ سگریٹ کیس کے ساتھ رکھے ان کے فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اجازت طلب کی۔

"شیور۔" یک لفظی جواب آیا۔

بابا کو ساری کتھا سنانے کے بعد اپنا نمبر ڈائل کیا۔ حسب توقع بند تھا۔

"گاڑی تو لے کر گئے، موبائل بھی چلا گیا۔ ماما بابا نے گفٹ کیا تھا۔ یا اللہ بیگ بھی تو میرا اسی میں تھا۔ اور میری فائلز۔" اب ایک کے بعد ایک نقصان یاد آ رہا تھا جسے با آواز بلند گنوایا جا رہا تھا۔

"ینگسٹرز اور ان کے ایڈوینچرز۔" ضامن نے چند لفظوں میں نئی نسل کی حرکتوں پہ تاسف کا اظہار کیا اور پھر جامد چپ۔

یہ شخص کم گو ضرور ہے مگر مزاج میں اتنی سنجیدگی تو یک دم ہی عود کر آئی تھی۔ وہ اپنے نقصانات بھول کر "ان" کو سوچنے میں محو ہو گئی۔

"کس علاقے میں جانا ہے آپ کو؟" شہر میں داخل ہونے کے بعد انہوں نے پوچھا تو وہ چونکی۔

"ایسا کریں۔ کسی اچھی سی بیکری کے سامنے اتار دیں مجھے۔ میں نے کیک لینا ہے۔"

"گاڑی چھن جانے کے غم میں کیک کھاتے پہلی بار دیکھوں گا کسی کو۔" پہلے تو وہ حیرت میں مبتلا ہوئے پھر اسی سنجیدہ لہجے میں بولے۔ خولہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

بہت انوکھے مدھم سروں سے ضامن مصطفیٰ کی سماعتیں آشنا ہوئیں۔ انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

ہنسنے میں وہ اور بھی نکھر گئی تھی۔ اس کے نچلے ہونٹ کے بالکل پاس وہ سیاہ تل بھی مسکرا رہا تھا۔ اس کی مقناطیسی کھلکھلاہٹ نے ایسا حصار باندھ دیا جس کی جانب ضامن مصطفیٰ کو اپنا آپ کھنچتا ہوا محسوس ہوا۔

☆☆☆

"بتا مولوی! کیا کر ڈالا تو نے؟" واحد نے بازو پہ بیٹھے اپنے خون سے پیاس بجھاتے مچھر کو تاک کر مارا اور پھر اس سے نکلنے والے خون کو ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

مولوی عبدالرحیم سر جھکا کر بیٹھے رہے۔

"سرکاری زمین پہ غیر قانونی طریقے سے قبضہ کر کے مسجد بنا ڈالی یا مسجد کے چندے میں خرد برد کر ڈالی؟" واحد کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

مولوی صاحب ابھی بھی چپ تھے۔ ہاں کچھ دیر بعد ان کی سسکی ضرور ابھری تھی۔ عبدالہادی نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ دانتوں میں خلال کرتا واحد بھی چونکا۔ اسی اثنا میں عبدالہادی کو بتایا گیا کہ اس کی ملاقات آئی ہے۔

"واہ بے۔ تیری بڑی ملاقاتیں آتی ہیں۔ واحد کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ گھر والی بھی سوچتی ہو گی کہ چل چند دن سکون کے گزار لوں۔ تو بتا مولوی۔ تیری کسی کو پرواہ ہے کہ نہیں۔" جیسے واحد کے لیے شرافت کی زندگی بسر کرنا مشکل تھا، اسی طرح اس کے لیے چپ بیٹھنا بھی ذرا مشکل کام تھا۔

"مجھ سے ملنے کون آ سکتا ہے اور یہ تو ملاقات کا وقت بھی نہیں ہے؟" عبدالہادی اس کی بات پہ دھیان دیے بنا حیران ہوتے ہوئے باہر آیا۔ اور پھر ملاقاتیوں والے کمرے میں ایڈووکیٹ خولہ بنت زید کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

رات کے اس وقت۔ اور ایک عام ملاقاتی بن کر۔

"آج میں تم سے تمہاری وکیل نہیں بلکہ تمہاری دوست بن کر ملنے آئی ہوں۔" خولہ نے جیسے اس کی سوچ پڑھ لی تھی۔

وہ اس لڑکی کو دیکھ کر رہ گیا جو آج کچھ مختلف لگ رہی تھی۔ شاید ایک وکیل والے سفید لباس اور کالے کوٹ میں نہیں تھی، اس لیے۔

وہ اس سے کچھ پوچھ رہی تھی مگر جواب میں اس کی چپ ہی ملی۔ وہ تو کبھی اس سے کچھ شیئر نہ کر پایا تھا جس سے وہ ہر بات کرنا چاہتا تھا۔ اپنے خواب، اپنی آرزو، اپنے جذبات، اپنے احساسات۔ کبھی

کچھ بھی تو کہہ نہیں پایا اس سے۔ اس نے صحیح معنوں میں اسے کھویا تھا۔ اب سانسیں پچھتانے کے لیے باقی رہ گئی تھیں۔ وہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ وہ قید برداشت کر رہا تھا، اس نے جسمانی تشدد بھی سہا تھا۔ وہ رویا نہیں تھا۔ اس کی آنکھ بھیگتی تھی تو صرف اس کے لیے جس نے کبھی اس سے ایک سوال پوچھا تھا اور وہ جواب نہ دے پایا تھا، جس نے کبھی ایک خواہش کی تھی اور وہ پوری نہ کر پایا تھا۔

خولہ آدھا گھنٹہ اس کے پاس بیٹھ کر چلی گئی تھی۔ وہ چاہ کر بھی اس کا شکریہ ادا نہیں کر پایا۔ یہی تو اس کی کمزوری تھی۔ جس کی وجہ سے اس نے اپنی عزیز ترین متاع کھو دی تھی۔ وہ کبھی کہہ نہیں پاتا تھا جو اس کے دل میں ہوتا تھا۔

☆☆☆

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا یہ لڑکی چاہتی کیا ہے؟"

"اس لڑکی کا دماغ خراب ہے آنٹی۔ لگتا ہے ہم دونوں کو ہی درست کرنا پڑے گا۔" اقصیٰ نے اسے گھورتے ہوئے چائے کا گھونٹ بھرا۔

اس نے دھنیے پودینے کی چٹنی میں پکوڑا ڈبویا اور منہ میں رکھتے ہوئے پھر سے موبائل کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جیسے بات اس کے متعلق نہیں کسی چوتھے پانچویں کے بارے میں ہو رہی تھی۔ ثروت کو تاؤ ہی تو آ گیا۔

"میں کرنے لگی ہوں عبید کے لیے ہاں۔"

"آنٹی! مجھے تو دکھا دیں پہلے۔ ہے کیسا؟" اقصیٰ نے کپ جلدی سے میز پہ رکھا۔

"ہیں۔ اس نے تمہیں تصویر نہیں دکھائی؟" ثروت کا منہ کھلا۔

"کہاں آنٹی۔"

"خولہ۔"

"جی ماما۔" اتنی تابعداری کے ساتھ کہا گیا جیسے کہ اس سے زیادہ فرماں بردار کوئی بیٹی اس کرہ ارض پہ نہ تھی۔

"تم نے عبید کی تصویر اقصیٰ کو کیوں نہیں بھیجی؟"

"کون عبید؟" یہ ماں کا نقطہ کھولاؤ اعلا درجے پہ پہنچانے کی حقیری کوشش تھی۔

"خولہ۔" ثروت نے غصے سے کپ میز پہ رکھا اور پھر اقصیٰ کی طرف مڑیں۔ "دیکھا دیکھا۔ اقصیٰ! یہی کرتی ہے یہ ہمیشہ اور سب کو لگتا ہے کہ ماں باپ کو اس کی فکر ہی نہیں۔ گھر بٹھایا ہوا ہے۔ شادی کرنا ہی نہیں چاہتے بیٹی کی۔"

"ماما۔ لوگوں کو سیریس نہ لیا کریں۔" اس نے ماما کو جذباتی ہوتے دیکھ کر رسان سے کہا۔

"ہاں تمہاری اور تمہارے باپ کی طرح ڈھیٹ بن جاؤں۔"

"لیں۔ اب بے چارے بابا کو کیوں لے آئیں بیچ میں۔"

"یہ تمہارے بے چارے بابا ہی ہیں جنہوں نے تمہیں سر چڑھا رکھا ہے۔ میں تمہاری عمر کی تھی تو۔ تو دس سال کی بیٹی کی ماں تھی۔" بیچ میں ایک لمحے کے لیے رکیں کہ نالائق اولاد "تو۔" سے آگے کا جملہ خود پورا کر دیتی تھی مگر آج وہ چپ رہی۔ صرف مسکرا کر ماں کو دیکھا۔

"اور آنٹی! میرا سات سال کا بڑا بیٹا ہے۔" اقصیٰ نے مزے سے کباب کھاتے ہوئے لقمہ دیا۔

"and award goes to..."

اس نے اقصیٰ کو دیکھتے ہوئے چبا چبا کر کہا پھر ماما کے تیور دیکھ کر جملہ ادھورا چھوڑنا پڑا۔ اور موبائل بھی ہاتھ سے رکھنا پڑا۔

"میں عبید سے شادی نہیں کر سکتی۔"

"وجہ؟" ماما نے ابرو اٹھا کر پوچھا۔

"وجہ یہ کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔"

"ہیں؟ تم سے کیا جھوٹ بول لیا اس۔ نے؟" ثروت حیران ہوئیں۔

"اس نے کہا کہ اس کو پڑھی لکھی خواتین پسند ہیں۔ اور اپنی بہن کو بی اے تک کرنے نہیں دیا، اس

کی شادی کر دی۔"
"تمہیں کس نے بتایا؟" اقصیٰ نے پوچھا۔
"میں نے اس کی بہن سے اگلوایا۔"
"ایک تو یہ وکیل۔" اقصیٰ نے تاسف سے سر ہلایا۔
"ہر انسان میں کوئی کمی خامی ہوتی ہے خولہ۔ مجھ میں، تم میں بھی کئی ہوں گی۔" ثروت نے سمجھانے کی کوشش کی۔
"جھوٹ بولنا کوئی ایک کمی خامی نہیں، یہ ہر کمی خامی کی جڑ ہے ماما۔"
"ایسا بھی کیا جھوٹ بول دیا اس نے۔ خولہ وقت اور حالات کی بات ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے اس وقت، بہن کی شادی کرنا ہی مناسب فیصلہ ہو۔"
"ہوسکتا ہے ماما مگر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ جس بندے کو پڑھی لکھی بیوی چاہیے، وہی کل مجھے گھر نہیں بٹھائے گا۔"
"ہاں تو بٹھا دے گھر۔ گھر بیٹھی عورت باعزت نہیں کیا۔ میں اور یہ اقصیٰ ہم بھی تو ہاؤس وائف ہیں۔ تو کیا یہ برا ہے؟ نہیں بلکہ مجھے تو لگتا ہے ہم زیادہ سکون میں ہیں۔"
"ہاؤس وائف ہونا آپ کی یا اقصیٰ کی اپنی چوائس ہے ماما۔ اس لیے آپ خوش ہیں۔ لیکن میں اپنا کیریئر شادی کے لیے داؤ پہ نہیں لگا سکتی۔ وکالت میرا شوق ہے، جنون ہے۔"
"جاب، پروفیشن، کیریئر شوق ہی رہے تو اچھا ہوتا ہے خولہ، مجبوری بن جائے تو تکلیف دیتا ہے۔ ان عورتوں سے پوچھو، جو شادی کے بعد نوکری کرنے پہ مجبور ہوتی ہیں، وہ کن حالات سے گزرتی ہیں۔"
"میں کب چاہتی ہوں ماما کہ وکالت میری مجبوری بنے۔ لیکن چھوڑوں تو اپنی مرضی سے چھوڑوں۔ کوئی مرد مجھے مجبور نہ کرے اس کے لیے۔ اور عبید کرے گا ایسا۔"
"ہاں تمہیں تو خواب آیا ہے ناں۔" ماما چڑ ہی تو گئیں۔ جبکہ اقصیٰ خاموشی کے ساتھ سنتے ہوئے

خستہ پکوڑے کھا رہی تھی۔ اسے پتا تھا بحث میں وہ خولہ سے جیت نہیں سکتی، اس لیے اب تو بس دعا ہی کرتی تھی کہ اس لڑکی کو کوئی بندہ خدا پسند آجائے۔
"میں پہچانتی ہوں لوگوں کو ماما۔"
"اتنے بڑے دعوے نہیں کرتے خولہ۔"
خولہ نے سادگی کے ساتھ کندھے اچکائے۔
"اسی طرح مین میخ نکالتی رہیں تو پسند آئے گا تمہیں کوئی بندہ بھلا۔" ثروت کو بیٹی کی حرکتیں پریشان کرنے لگی تھیں۔
"چھوڑیں آنٹی۔ جس دن کوئی بندہ پسند آگیا ناں اسے، اس دن آنکھوں پہ پٹی بندھ جانی ہے۔ پھر کوئی کمی، خامی، جھوٹ مکر فریب نظر نہیں آنا اسے۔" اقصیٰ ہنسی۔
"ہاں جیسے تمہیں پسند کرتے ہوئے تیمور بھائی کی آنکھوں پہ پٹی بندھ گئی تھی۔"
"میری جان۔ اسی کو تو کہتے ہیں محبت۔"
وہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کو چڑانے لگ گئیں اور ثروت فکر مندی ہوکر اٹھ گئیں۔

☆☆☆

"سوری میڈم! آپ کو کچھ دیر ویٹ کرنا پڑے گا۔ ایکچوئلی اتنی بڑی اماؤنٹ کا چیک ہم منیجر صاحب کے اوکے کرنے کے بعد ہی کیش کرتے ہیں اور وہ ابھی ہیڈ آفس گئے ہوئے ہیں۔" گھنگریالے بالوں والی اس لڑکی نے شائستگی سے معذرت کرتے ہوئے وجہ بیان کی۔ خولہ سر ہلا کر رہ گئی۔ اے ٹی ایم سے اتنی بڑی رقم نکلوا نہیں سکتی تھی اس لیے انتظار کرنا مجبوری ٹھہرا۔ لڑکی نے قاصد کو بلا کر ہدایت کی کہ وہ ایڈووکیٹ خولہ بنت زید کو منیجر صاحب کے کیبن میں بٹھا دے۔ وہ کوفت کے عالم میں کیبن میں داخل ہوئی لیکن منیجر کی میز کے بائیں جانب بڑی کرسی پہ براجمان شخصیت کو دیکھ کر اس کے قدم تھم گئے اور کوفت زائل ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔
"میڈم! آپ پلیز یہاں تشریف رکھیں۔"
قاصد لڑکے نے دیوار کے ساتھ رکھے صوفے کی

اشارہ کیا اور خود باہر نکل گیا۔ اخبار میں گم ضامن مصطفیٰ کی نظر بھی تب تک اس طرف پڑ چکی تھی۔ وہ اس کو یہاں دیکھ کر حیران ہوئے اور پھر جلدی سے کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ خولہ نے کھڑے کھڑے انہیں خوش دلی سے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔ بیٹھیے پلیز۔'' انہوں نے سلامتی کا جواب دیا اور صوفے کی جانب اشارہ کیا۔ جب تک وہ بیٹھ نہ گئی، وہ کھڑے ہی رہے۔

''اچھا لگا آپ کو دیکھ کر۔ کیسے ہیں آپ۔''

جس شخص نے اس کے اپنے شہر سے بہت دور، جب دن خدا حافظ کہہ رہا تھا اور رات سلام کرنے والی تھی، جہاں ٹیکسی کے ملنے کے امکانات صفر ہی تھے۔ نہایت بے چارگی کے عالم میں اس کی مدد کی تھی، اس کے لیے یہ الفاظ نہایت دل سے نکلے، لبوں سے ادا ہوگئے اور سامنے والے کو متبسم کر گئے۔

''الحمدللہ۔ بالکل ٹھیک آپ اپنی سنائیں۔''

''میں بھی بالکل ٹھیک۔ خوش و خرم۔''

''کیسی جا رہی ہے آپ کی وکالت۔ بلکہ پہلے یہ بتائیں کہ گاڑی تو لاک کر کے آئی ہیں ناں آپ اپنی؟''

خولہ نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ سر اثبات میں ہلا دیا۔

کیسی گنگناتی ہنسی تھی۔

ضامن مصطفیٰ اس ردھم میں کھو سے گئے۔

''نئی گاڑی ہے؟'' کافی دیر بعد وہ کچھ بول پائے۔

''نہیں وہی ہے۔''

''اچھا۔ کب؟ کہاں سے ملی؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ اس ملک کے حالات ایسے تو نہیں کہ چرائی گئی، چھینی گئی، لوٹی گئی چیز واپس مل جائے۔

''اگلی صبح ہمارے گھر کے سامنے سے۔'' اس نے مزے سے بتاتے ہوئے انہیں الجھن میں ڈالا۔

''کیا؟ آپ کی گاڑی آپ کی نظروں کے سامنے اڑا لے جانا پھر آپ کے گھر کے سامنے چھوڑ دینا مقصد کیا تھا اس عمل کا۔''

''مقصد ایڈووکیٹ خولہ بنت زید کو یہ بتانا تھا کہ ابھی تو صرف گاڑی لے کر گئے۔ واپس چھوڑ دی۔ اور اگر وہ اب بھی ان کی مخالف پارٹی کو حق دلوانے کے لیے انہیں کٹہرے سے جیل تک کا سفر کروانے کے لیے سرگرم رہی تو پھر کہیں بھی، کچھ بھی، کسی کو بھی اٹھا سکتے ہیں۔ واپس نہ چھوڑنے کے لیے۔'' وہ بڑے آرام سے بتا رہی تھی۔ جیسے اپنی بات نہ کر رہی ہو بلکہ کسی ڈرامے کی کہانی سنا رہی ہو۔

''اتنی بڑی دھمکی۔ پھر آپ نے کیا کیا؟ کیا ابھی بھی آپ وہ کیس لڑ رہی ہیں؟'' ضامن کے لہجے اور چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ جانے کیوں اندر ہی اندر وہ پیچ و تاب کھا رہے تھے۔

''بالکل لڑ رہی ہوں یہ کیس۔'' اس نے ایک لحہ ٹھہر کر ان کی جانب دیکھا۔ ''ضامن مصطفیٰ۔ یہ دھمکیاں تو ہمارے لیے ملٹی وٹامن کا کیپسول ہیں۔ ہمیں انرجائز کرتی ہیں۔ ہماری کمزوریوں کو دور کر کے طاقت بخشتی ہیں۔ ہم میں نئے عزم جگاتی ہیں۔''

وہ بول رہی تھی۔ اور ضامن حیرانگی، الجھن اور پریشانی کے دور سے گزر چکنے کے بعد اب دلچسپی سے اس بہادر لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔ جو موی تھی نازک تھی لیکن درحقیقت آہن تھی، چٹان تھی۔

''اور آپ بتایئے آپ کا بزنس کیسا جا رہا ہے؟'' اس نے گفتگو کا رخ ان کی ذات کی طرف موڑا اور پھر کچھ یاد آنے پہ خود ہی بول پڑی۔ ''سنا ہے پچھلے ہفتے آپ کی کمپنی کا مائیکرو ویو خریدا ہے ہم نے۔''

''یعنی کہ ہمارے کسٹمرز میں اضافہ۔ ضامن مصطفیٰ آپ کا مستقبل تابناک ہے۔'' ان کا لہجہ شگفتہ ہوا تو وہ ہنس دی۔

اس بار انہوں نے اس کی طرف دیکھنے کی جسارت نہ کی۔ خوامخواہ نظریں اس کے چہرے پہ ٹھہر جانے کو مچلتیں، بس ساعتوں نے ہی اس کی ہنسی کی

موسیقی سے لطف لیا۔

جو منیجر صاحب تھوڑی دیر میں پہنچنے والے تھے وہ قریباً گھنٹے میں تشریف لائے۔ انتظار دونوں کو برا لگتا تھا مگر دلچسپ بات یہ ہوئی کہ آج دونوں ہی اس انتظار سے اکتائے نہیں۔ دونوں کو ہی اپنی اپنی بے پناہ مصروفیات یاد نہ آئیں۔ دونوں نے اس ایک گھنٹے میں بات تو کم کی مگر اک دوجے کو محسوس بہت کیا۔

"میری آپ لوگوں سے ایک ریکویسٹ ہے۔" انتظار کے لیے معذرت کرنے کے بعد ان دونوں کے چیک پہ نظر ڈالتے ہوئے منیجر صاحب ذرا خوش آمدانہ لہجے میں ان سے مخاطب ہوئے۔ "اگر آپ یہ اماؤنٹ منڈے کو ڈرا کروالیں تو۔"

ایک لمحہ رک کر ان کے تاثرات کا جائزہ لیا۔

"ایکچوئلی۔ آج ہفتے کا آخری دن ہے۔ ہماری ویکلی بیلنس شیٹ بنتی ہے۔ اس میں کلوزنگ کریڈٹ جتنا زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی برانچ کے لیے سودمند ثابت ہوتا ہے۔ آپ تو بڑے لوگ ہیں، کئی اکاؤنٹ رکھتے ہیں۔ ذرا ہم پہ مہربانی۔" منیجر صاحب چاپلوسی پہ اترنے لگے۔

ضامن نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا اور اپنا چیک واپس لے لیا جبکہ خولہ کو یہ رقم لازماً پھوپھو کو بھجوانی تھی، ان کی بیٹی کی شادی تھی اور ماما کی ہدایت تھی کہ ان کو آج کے آج یہ رقم پہنچاؤ۔ اس لیے وہ منیجر صاحب پہ مہربانی نہ کر پائی۔ ضامن نے اس کا چیک کیش ہونے تک انتظار کیا پھر دونوں ایک ساتھ بینک سے نکلے۔

"ایڈووکیٹ خولہ۔"

وہ ضامن کو "اللہ حافظ" کہہ کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگی جب انہوں نے پکار لیا اس نے رک کر ان کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"بہادری اچھی بات ہے لیکن احتیاط بھی اچھی بات ہے۔ اپنا خیال رکھا کریں۔"

"آپ تو یوں نصیحت کر رہے ہیں جیسے بابا کرتے ہیں۔" وہ مسکرائی۔

"نصیحتیں اور ہدایت آپ کو وہی کرتے ہیں جو آپ کی پروا کرتے ہیں۔"

خولہ بنت زید کا دل جانے کس لیے پہ تھرکا۔

"ہوں۔ تو جناب آج مجھے اپنی پرواہ کرنے والوں کی فہرست میں ایک نئے نام کا اندراج کرنا پڑے گا۔" ازلی خود اعتمادی کو فوراً پکار لیا تھا اس نے۔

"ہمیں خوش گمانی تھی کہ آپ یہ کام کر چکیں۔" سامنے والا بھی کم خود اعتماد نہ تھا۔ ساتھ ساتھ غضب کا خودشناس بھی تھا شاید۔

پہلی بار۔ زندگی میں پہلی بار خولہ بنت زید کسی کی آنکھوں کی چمک کی تاب نہ لا پائی۔ بہادری سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والی کی پلکیں جھکیں اور آہستگی سے "اللہ حافظ" کہہ کر گاڑی کی طرف مڑ گئی۔

☆☆☆

"اسلام وہ دین مساوات ہے جو محمود و ایاز کو ایک صف میں کھڑا کرتا ہے۔ جس میں رنگ، نسل اور ذات پات کا کوئی سلسلہ نہیں۔ یہ۔"

"جھوٹ بول رہے ہیں آپ۔ جھوٹ بول رہے ہیں۔" عبدالہادی نے پلیٹ پٹختے ہوئے مولوی عبدالرحیم کی بات کاٹی۔

قیدیوں نے ایک پل کے لیے ہاتھ روکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا پھر مولوی عبدالرحیم کی طرف اور پھر دوبارہ اپنے اپنے ہاتھ میں موجود پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جن میں بڑی آلو چھولے کی بریانی اور ساتھ تھوڑا سا زردہ مولوی صاحب کے درس سے زیادہ کشش رکھتے تھے۔ زردے پلاؤ کی یہ دیگیں کسی سیٹھ نے بھجوائی تھیں جسے کبھی کسی وجہ سے حوالات میں دو ہفتے گزارنے پڑے تھے۔ اس عرصہ میں وہ جان گیا تھا کہ سب سے بڑی سزا یہاں کا کھانا ہے۔ تب سے وہ اکثر قیدیوں کے لیے کھانا بھجواتا تھا۔

"کھانا کھاؤ بیٹا!" مولوی عبدالرحیم نے بہت غور سے اس کی طرف دیکھا اور نرمی سے کہتے ہوئے سامنے پڑی پلیٹ نزدیک کھسکائی اور باآواز بلند کھانا شروع کرنے کی دعا پڑھنے کے بعد پہلا نوالہ منہ میں ڈالا اور پھر اس کی طرف دیکھا۔ جو بدستور بڑبڑا رہا تھا۔

"جھوٹ۔ سب جھوٹ۔"

مولوی عبدالرحیم کے لیے وہ ایک پہیلی سا تھا۔ اور سچ بات تو یہ کہ کچھ ہی عرصہ میں اس کے ساتھ انسیت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ جس وقت وہ جیل میں قدم رکھ رہے تھے اس وقت شرم سے سر جھکا جاتا تھا اور داڑھی آنسوؤں سے بھیگی جاتی تھی۔ انہیں لگتا تھا کہ عمر بھر کی عزت خاک ہوئی۔ اس پہ واحد کے ٹھٹھے، ہنسی مذاق۔

تب عبدالہادی نے ان کی طرف کیک کا ٹکڑا بڑھایا تھا۔ انہیں لگا، وہ بھی واحد کی طرح ان کی ہنسی اڑا رہا ہے۔ انہوں نے اس کا ہاتھ پرے کر دیا تھا۔

"مولوی صاحب کو کیک نہیں حلوا کھلا یار۔" واحد بڑا سا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے ہنسا تھا۔

عبدالہادی نے ناگواری کے ساتھ اسے دیکھا اور مولوی صاحب کی حالت دیکھ کر اصرار نہیں کیا۔

"کھالے مولوی! یہ بیٹ بڑی کمینی شے ہے ۔۔۔ یہ تو مرتے وقت بھی دو گھونٹ پانی مانگتا ہے۔"

واحد کی ہنسی کا ساتھ صرف اس کی توند دے رہی تھی۔ وہاں بیٹھے باقی دونوں نفوس کو یہ قہقہہ کان میں کسی دھماکے کی طرح لگ رہا تھا۔

"یہ بستر تھوڑا صاف ہے۔ آپ اس پر لیٹ جائیں۔" عبدالہادی نے اٹھ کر اپنا بستر ان کے لیے بچھایا تھا۔

وہ پہلا دن تھا اور اس کے بعد سے انہوں نے جتنا اسے جانا تھا، یہ ہی سمجھے تھے کہ ان کی طرح وہ بھی کسی ایسے جرم میں اندر ہے جو اس نے کیا ہی نہیں۔

وہ بہت سلجھا ہوا جوان تھا۔ نہ وہ گفتگو میں خود سے حصہ لیتا تھا، نہ ہی کسی سوال کا جواب ایک دو لفظ سے زیادہ دیتا تھا۔ اس کا لہجہ مہذب تھا مگر آج ایک دم سے اس کا چلا اٹھنا۔ وہ ابھی تک متعجب تھے۔

☆☆☆

"خالہ! یاد ہے ناں آج کیا دن ہے؟"

پیاری سی ماہا ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھے پوچھ رہی تھی۔ خولہ مسکرا دی۔ اور اسکرین پہ بنے مائیک پہ ہاتھ رکھا۔

"جی میری جان۔ خالہ کو یاد ہے۔" اس نے ماہا کے وڈیو میسج کے جواب میں وائس نوٹ بھیجا اور باقی میسجز دیکھتے ہوئے چیزیں سمیٹنے لگی۔ اسے مارکیٹ جانا تھا۔ ماہا کے لیے گفٹ لینا تھا۔ دو بیٹوں کے بعد آنے والی بیٹی کی سالگرہ اقصیٰ اور تیمور دونوں میاں بیوی بہت دھوم دھام سے مناتے تھے۔ زینب کے ساتھ وہ کورٹ سے نکل آئی۔

"تم گفٹ لو۔ میں جب تک یہاں ہوں۔" مال میں داخل ہوئے تو زینب کو "میک اپ ٹی" نظر آ گیا تھا۔ اب بھلا وہ جاتی کہیں اور۔

خولہ نے سر ہلایا اور اس فلور پہ آ گئی جہاں بچوں کی گفٹ شاپ تھی۔ اس نے ماہا کے لیے پنک اور وائٹ کلرز کا ایک پلے ہاؤس پسند کیا اور گریٹنگ کارڈز والے حصے کی طرف بڑھی۔

فرینڈشپ، فارگیوی، تھینکس۔

اس نے ہر طرح کے کارڈز پہ نظر دوڑائی اور زیر لب پڑھتے پڑھتے اس طرف بڑھی جہاں اس کے مطلوبہ کارڈز سجے ہوئے تھے۔ اس کا دھیان قطعاً بھی سامنے نہ تھا۔ اس لیے دائیں جانب سامنے سے نکلتے اس بندے کو نہ دیکھ پائی، جو ایک قدم اگر پیچھے نہ ہٹتا تو یقیناً وہ اس سے ٹکرا جاتی۔

"سوری۔" احساس ہونے پہ اس نے معذرت کرتے ہوئے سامنے والے کو دیکھا اور مزید جھینپ گئی۔

"السلام علیکم۔ کیسی ہیں آپ؟" ضامن مصطفیٰ نے خوش دلی سے اسے مخاطب کیا۔ اسے دیکھ کر ان کے رگ و پے میں خوش گوار سا احساس سرایت کر گیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ آپ یہاں کیسے؟"

"میرے فرینڈ کی بیٹی کا برتھ ڈے ہے۔ اس کے لیے گفٹ لینے آیا تھا اور آپ؟"

"اتفاق سے میری بھی بھانجی کا برتھ ڈے ہے۔ میں بھی اسی سلسلے میں آئی ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ اتفاقات ہی تو ہیں جو آپ کی زندگی میں سے کچھ لمحے چرا کر ہمیں دان کر دیتے ہیں۔" بالکل بے اختیاری کیفیت میں ان کے منہ سے یہ جملہ ادا ہوا اور خولہ بنت زید کو ایک نئے احساس سے روشناس کروا گیا۔

"خیر۔ تو گفٹ پسند کر لیا آپ نے؟" جلد ہی ضامن نے اس بے ختیاری پہ اختیار پا لیا۔

"جی ہاں۔ پسند بھی کر لیا، خرید بھی لیا اور پیک بھی کروا لیا۔" دلی کیفیت پہ وہ بھی قابو پا چکی تھی سو بہت اعتماد سے جواب دیا۔

"اچھی بات ہے۔ چلیں اب میری بھی مدد کریں۔ گفٹ پسند کروائیں میرے ساتھ۔ پھر خرید میں خود ہی لوں گا۔ پیک بھی خود ہی کروا لوں گا۔" انہوں نے اسی کے انداز کو اپناتے ہوئے درخواست کی تو وہ ہنس دی۔

"ہنستا تو ہر کوئی ہے۔ لیکن ہر کوئی اتنا دلکش کیوں نہیں لگتا۔" ایک سوال ضامن مصطفیٰ کے اندر جاگا۔

وہ ان کے ساتھ دوسری طرف آ گئی اور جو گفٹ خود لیا تھا اسی کا مشورہ انہیں بھی دیا۔ ایک بچی کے لیے یہ بہت بہترین تحفہ تھا۔ ضامن کو پسند آیا۔ گفٹ پیک ہو رہا تھا جب خولہ نے اجازت چاہی۔

"کیا ہم اکٹھے لنچ کر سکتے ہیں؟؟" ضامن نے شائستگی سے پوچھا۔

"پھر کبھی سہی۔ ابھی مجھے جانا ہوگا۔ فرینڈ ہے ساتھ۔ اسے جلدی ہے اور مجھے بھی ایک دو کام نپٹانے ہیں۔ پھر فنکشن میں بھی وقت پہ پہنچنا ہے۔ ورنہ اقصیٰ تو مجھے مار ہی ڈالے گی۔" اس کی معذرت سنتے ہوئے ضامن چونکے۔

"لگتا ہے ایک خوبصورت اتفاق اور ہونے والا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

ضامن نے کوئی جواب نہ دیا۔ مسکرا کر جیب سے والٹ نکالا اور کاؤنٹر کی طرف مڑ گئے۔ وہ مسکراتی ہوئی زینب کی تلاش میں نکلی جو اس کی توقع کے عین مطابق کاسمیٹکس میں ہی گم تھی۔

☆☆☆

شیفون کا سیاہ لباس جس کے گلے اور آستینوں پہ روبی اور فیروزہ کو استعمال کرتے ہوئے بہت منفرد کام کیا گیا تھا، اس پہ سج کر حقیقت میں اور بھی خوب صورت ہو گیا۔ کمر تک آتے گھرے سیاہ اور ملائم بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے اس نے آئینے پہ آخری نظر ڈالی اور دوپٹہ گلے میں ڈال کر باہر آ گئی۔ بابا تیار کھڑے تھے۔ رات کے وقت وہ اسے اکیلے کہیں آنے جانے نہیں دیتے تھے، خود چھوڑتے اور خود ہی لینے آتے۔

اقصیٰ نے فنکشن کا انتظام اپنے لان میں کر رکھا تھا۔ وہ اقصیٰ کو پیار کر کے اس کی ساس اور باقی فیملی سے مل کر اس میز کی طرف آ گئی جہاں اقصیٰ کے بیٹے معاذ اور مہد بیٹھے تھے۔ وہ ان کے پاس وہیں بیٹھ گئی اور ان کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد ہی ان کے ننھیالی ینگ کزنز کی پارٹی پہنچی تو وہ ان کی طرف چلے گئے۔

کولڈ ڈرنک کا گھونٹ لیتے ہوئے وہ یونہی ماحول کا جائزہ لینے لگی۔ اقصیٰ کے بھائی کا میوزیکل بینڈ تھا جو اس وقت کوئی فاسٹ نمبر گا رہا تھا۔ اس کی نگاہیں یونہی بھٹکتے ہوئے پاس لگے موتیا کے پودے پہ کھلی کلیوں پہ اٹک سی گئیں۔ ان کی مہک کو اپنے اندر اتارتے ہوئے اس کا دھیان عبدالہادی اور اس قبر کی

طرف چلا گیا۔ پھر تیز میوزک، بچوں کا ہلا گلہ، عورتوں اور مردوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں پس منظر میں چلی گئیں اور وہ اس کیس کی پیچیدگی پہ غور کرتے ہوئے اس قدر کھوگئی کہ اس وقت چونکی جب اس کے اور موتیا کے بیچ سیاہ مردانہ چپل میں مقید دو صاف ستھرے سے پاؤں آ کر حائل ہوئے۔ اس نے نگاہ اوپر کی۔

''لگتا ہے ایک اور خوبصورت اتفاق ہونے والا ہے۔'' اس کے کانوں میں آج دوپہر کو کہا گیا ضامن مصطفیٰ کا جملہ گونجا اور لبوں پہ بے اختیار تبسم بکھر سا گیا۔

سیاہ کرتا شلوار، کندھوں پہ براؤن شال۔۔۔ ضامن مصطفیٰ اپنی بھرپور جاذبیت کے ساتھ اس کے سامنے کھڑے تھے۔ بلاشبہ وہ لاکھوں میں ممتاز نظر آنے والا شخص تھا۔

یہ اتفاق اسے بھی بہت خوش گوار لگا۔ ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس نے ان کے لباس کا بغور جائزہ لیا اور دل میں ان کی خوش لباسی کو سراہا بھی۔

''ایک اتفاق اور۔'' انہوں نے اسے بغور اپنا جائزہ لیتے دیکھ کر اپنے اور اس کے لباس کے ہم رنگ ہونے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ہنس دی اور ساتھ ہی انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ ''شکریہ'' کہتے ہوئے میز کے دوسری جانب پڑی کرسی پہ بیٹھ گئے۔

''کس سوچ میں اتنا محو تھیں آپ؟''

''یونہی ایک کلائنٹ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔''

''تو آپ کی سوچوں میں آنے کے لیے مجرم بننا پڑتا ہے؟'' گہرا لہجہ، گہری نگاہیں۔

ایک پل کے لیے تو وہ گڑبڑا سی گئی۔ دل کی دھڑکنیں منتشر ہونے لگیں۔

''میرے کلائنٹس مجرم نہیں ہوتے۔'' جلد ہی اس نے خود پہ قابو پایا۔

''دوہری فیس لیتی ہیں کیا؟'' انہوں نے مہد کو گود میں بٹھاتے ہوئے کہا جو دور سے ان کو دیکھ کر ان کی طرف بھاگتا ہوا آیا تھا۔

''کیوں! کیا مطلب؟'' وہ واقعی نہیں سمجھی۔

''عدالت سے باہر بھی ان کی وکالت کرنے کی۔'' ٹشو پیپر کے ساتھ مہد کے منہ پہ بنے نقش و نگار صاف کرتے ہوئے انہوں نے جواب دیا تو وہ بے اختیار ہنس دی۔ ضامن سر اٹھا کر اس اسے تکنے لگے۔

ہنسی تھی یا کوئی امتحان۔

وہ نگاہیں چرا گئے اور مہد سے باتیں کرنے لگے۔ وہ بھی اپنی توتلی زبان میں ان کے ساتھ لگ گیا۔ خولہ ان کی باتیں سن کر مسکراتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد اقصیٰ ان کی جانب آئی۔

''ضامن بھائی! شکر آپ آئے۔ ورنہ آج تو تیمور نے بھی آپ سے خفا ہو جانا تھا۔''

وہ مسکرا دیے۔

''میرا خیال ہے آپ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں اس لیے متعارف کروانے کی ضرورت نہیں۔ کہیں آپ کلائنٹ تو نہیں ہماری وکیل صاحبہ کے؟'' اس نے شرارتی لہجے میں پوچھا۔

''فی الحال تو نہیں۔'' انہوں نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔

خولہ کا دل۔ اف۔ کیا مصیبت ہے۔ پہلے تو کبھی ایسے نہ دھڑکا تھا۔

اقصیٰ کچھ دیر ان سے باتیں کرنے کے بعد معذرت کر کے چلی گئی کہ اسے دوسرے مہمانوں کو بھی وقت دینا تھا۔

''آپ کو پارٹیز یا فنکشنز میں جانا پسند نہیں کیا؟'' خولہ نے پوچھا کیونکہ اقصیٰ کی باتوں سے یہی ظاہر ہوا تھا۔

''نہیں۔''

''یعنی کہ آپ سوشل نہیں ہیں۔''

''دکھاوے کا ہجوم اپنے اردگرد اکٹھا نہیں کرتا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ دنیا سے کٹ کر رہتا ہوں۔ اپنے دوستوں کی خوشی میں شریک ہونے کی

کوشش کرتا ہوں۔ جیسا کہ ابھی یہاں موجود ہوں۔"

خولہ نے ہلکا سا سر ہلایا۔

سب مہمانوں کے آجانے کے بعد ننھی سی پری بنی بابا نے کیک کاٹا۔ اس کے بعد ڈنر کا انتظام تھا۔ وہ اقصیٰ کی بہن کے ساتھ کچھ دیر گفتگو کر کے اپنی پلیٹ اٹھا کر اسی میز کی طرف آگئی۔ اس کی نظر بے خود ہو کر ضامن مصطفیٰ پر جا ٹھہری جن کو تیمور ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئے تھے۔ اور اب جانے ان سے کیا بات کر رہے تھے کہ ان کے ہونٹوں پہ نرم سا تبسم تھا جبکہ تیمور کا انداز شرارتی سا لگ رہا تھا۔

"ایسا کیا ہے ضامن مصطفیٰ تم میں کہ سارے ماحول پہ چھا جاتے ہو۔" بمشکل ان پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے اس نے دل میں ان ہی سے سوال کیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بھی آکر اس کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھ گئے۔ خولہ نے اپنی سوچوں کو جھٹکنے کی کوشش کی۔ لیکن اسے دل میں یہ اعتراف کرنا ہی پڑا کہ سامنے بیٹھا یہ بندہ ماحول پہ ہی نہیں حواسوں پہ چھا جانے کی بھرپور صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ وہ خود ایک ساحرہ تھی مگر اس شخص سے ملنے کے بعد اسے محسوس ہوتا تھا کہ ہر دفعہ وہ اس پہ ایسا سحر پھونک دیتا جس کے طلسم سے وہ باہر ہی نہ نکل پاتی تھی۔

دیار نور میں تیرہ شبوں کا ساتھی ہو
کوئی تو ہو جو میری وحشتوں کا ساتھی ہو

بینڈ کا شور ختم ہو چکا تھا اور اب کوئی مقامی غزل گائک اپنی آواز کا جادو جگا رہا تھا۔

میں اس سے جھوٹ بھی بولوں وہ مجھ سے سچ بولے
میرے مزاج کے سب موسموں کا ساتھی ہو
میں اس کے ہاتھ نہ آؤں وہ میرا ہو کے رہے
میں گر پڑوں تو میری پستیوں کا ساتھی ہو

خولہ بنت زید کو سامنے دیکھنا دو بھر لگ رہا تھا۔ دوسری جانب بیٹھا وہ ساحر وہ جادوگر منتر پہ منتر پڑھ کر اس پہ پھونکتا جا رہا تھا۔ اور وہ سحر زدہ ہوتی جا رہی تھی۔

کرے کلام جو مجھ سے تو میرے لہجے میں
میں چپ رہوں تو میرے تیوروں کا ساتھی ہو
وہ خواب دیکھے تو دیکھے میرے حوالے سے
میرے خیال کے سب منظروں کا ساتھی ہو

ضامن مصطفیٰ کے خیالوں اور خوابوں کو الفاظ کا پیراہن شاعر نے پہنا دیا تھا۔ اور انہی خوابوں، خیالوں کی مجسم صورت بن کر خولہ بنت زید بڑی شایان اور تمکنت کے ساتھ ان کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ فاتح بنتی جا رہی تھی اور ضامن مصطفیٰ جانے کیا کیا ہارتے جا رہے تھے۔

غزل ختم ہو چکی تھی اور اب کوئی اور گیت فضا میں بکھر رہا تھا۔ لیکن دونوں کے محسوسات پچھلے لفظوں کے حصار میں ہی تھے۔

راتیں خنک تھیں، فضا میں ٹھنڈک پھیلتی جا رہی تھی۔ ایک سرد ہوا کا جھونکا آیا تو وہ بے اختیار اپنے بازوؤں میں سمٹنے لگی۔ ضامن کا جی چاہا کہ وہ اپنے کندھوں سے شال اتار کر اسے اوڑھا دیں۔ مگر ایسا وہ محض سوچ کر رہ گئے۔ واپسی پہ انہوں نے خولہ کو اس کے گھر ڈراپ کرنے کی پیشکش کی تھی۔

"بابا لینے آجائیں گے۔" اس نے اپنی بالی سے کھیلتے ہوئے جواب دیا۔ جس میں چھوٹے چھوٹے فیروزے جڑے ہوئے تھے۔

"فارمل نہ ہوں خولہ! میں آپ کو گھر چھوڑ دیتا ہوں۔" ان کا لہجہ منوانے والا تھا اور وہ مان بھی گئی۔

اس نے بابا کو ٹیکسٹ کر دیا کہ وہ اسے لینے نہیں آئیں۔ اقصیٰ اور تیمور سے رخصت لیتے وقت اقصیٰ نے بڑے شریر انداز میں اسے دیکھتے ہوئے نظروں ہی نظروں میں کچھ اشارے کیے۔ جنہیں اس نے قصداً نظر انداز کیا۔ رستے میں وہ کچھ گم صم سی تھی۔ ضامن نے دو چار باتیں کیں اور اس کی چپ کو نوٹ بھی کیا۔ کھڑکی سے یخ ہوا اندر آئی تھی۔ اس نے شیفون کا دوپٹہ اپنے گرد لپیٹتے ہوئے جیسے اس ٹھنڈک سے بچنے کی کوشش کی۔

"شال لے لیں۔" انہوں نے پچھلی سیٹ کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جو انہوں نے بیٹھنے سے پہلے وہاں رکھ دی تھی۔ اس نے منع کر دیا۔ وہ بھی اصرار نہ کر سکے۔

خولہ خود کو دل میں ڈپٹنے لگی کہ کیا ضرورت تھی اس موسم میں ایسا فیشن کرنے کی جس میں دوپہریں ٹھنڈی اور راتیں ٹھنڈی ترین ہوتی ہیں۔

گھر کے سامنے وہ جلدی سے گاڑی سے باہر نکلی اور گیٹ کی طرف چل دی۔ ضامن اسے جاتا دیکھتے رہے۔ گیٹ پر پہنچ کر اس نے بیل بجائی جبکہ ضامن پہلے ہی ہارن دے چکے تھے۔ اور اب گیٹ کھلنے اور اس کے اندر جانے کا انتظار کر رہے تھے۔

اچانک وہ پلٹی اور ان کی طرف آئی۔ ''آپ اندر آیئے ناں۔'' وہ تھوڑا جھک کر شرمندہ سے لہجے میں بولی۔ وہ بے اختیار مسکرا دیے۔

''نہیں شکریہ۔ اس وقت آپ خود تھکی ہوں گی، مناسب نہیں۔ پھر ان شاء اللہ۔'' انہوں نے شائستگی سے منع کیا۔ گیٹ کھل چکا تھا وہ انہیں ''اللہ حافظ'' کہہ کر اندر چلی گئی۔ چوکیدار نے ہاتھ کے اشارے سے ضامن کو سلام کیا۔ انہوں نے سر کے اشارے سے جواب دیتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اپنے گھر تک کے سفر میں وہ خود بھی کسی گہری سوچ میں تھے جیسے کسی فیصلے تک پہنچنا چاہتے ہوں۔

☆☆☆

دکھ بولتے ہیں
جب سینے اندر سانس کے دریا ڈولتے ہیں
جب موسم پر دھوا میں چپ سی گھولتے ہیں
جب آنسو پلکیں رولتے ہیں
جب سب آوازیں اپنے اپنے بستر پہ سو جاتی ہیں
تب آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتے ہیں
دکھ بولتے ہیں

رات کا پہلا پہر تھا اور عبدالہادی اونچی چھت پہ رینگتے پنکھے پہ نظریں جمائے سوچ کی پرواز کو آوارہ چھوڑے لیٹا تھا۔ یہ پرواز کہیں سے کہیں گھوم کر پھر اسی ایک چہرے تک آ پہنچتی۔

وہ سیاہ نینوں میں آس بھرے ایک سوال کر رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسی سوال کے جواب پہ اس کی زندگی اور موت کا انحصار ہے۔

عبدالہادی اٹھ بیٹھا۔ اس کی پیشانی پہ ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔ وہ اضطرابی حالت میں اپنے بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔ اس کا تنفس تیز تھا۔ ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ اس کا دل پھٹنے کو تھا۔ وہ ایک دم کھڑا ہو کر یہاں سے وہاں چکر کاٹنے لگا۔ وہ پانی کے ننھے قطرے اب آپس میں مل کر لہر کی صورت کنپٹیوں سے بہہ کر نیچے تک آ رہے تھے۔

اچانک اس کا پاؤں زمین پہ پڑے سلور کے گلاس سے ٹکرایا اور خاموش رات کے سمندر میں تلاطم سا برپا کر گیا۔

''ابے کیا ہے یار۔ تیرے کو دن میں سکون ہے نہ راتوں کو۔'' واحد اپنے میلے چیکٹ بستر پہ کروٹ بدلتے ہوئے چلایا۔

مولوی عبدالرحیم نے سلام پھیرا اور پھر زرد مدھم روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا۔

''ابے! کوئی جرم نہیں کیا تو بے سکون کیوں ہے اور اگر کیا ہے تو ڈر کا ہے کا۔ میرے کو دیکھ۔ میرے سے بڑا مجرم تو نہ ہو گا تیرا۔ سو جا میرے بچے۔'' اس نے پچکارتے ہوئے کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں پھر سے اس کے خراٹے سناٹے میں گونجنے لگے تھے۔

''تم سے بڑا مجرم ہی تو کیا ہے۔'' وہ بڑبڑایا اور مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا اپنی جگہ پہ آ کر فرش پہ لیٹ گیا۔ یہاں کے میل سے بھرے بوسیدہ بستر کے بجائے جگہ جگہ سے اکھڑا فرش اسے زیادہ بہتر لگتا۔

اس کی نظریں غیر مرئی نقطے پہ جم گئیں جہاں ایک مدھر بھرے سیاہ نینوں والا چاندنی سا وجود نمودار ہو گیا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ سیاہ نین بھی اسے ہی تک رہے تھے۔

''تم مجھ سے خفا ہو کیا؟'' اس نے پوچھا۔
کالے نینوں اور گلابی پنکھڑیوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

''تم سے بھلا کبھی میں خفا ہو سکتی ہوں؟'' جس ادا سے اس نے جواب دیا عبدالہادی کا بسمل دل کسی اور ہی لے پہ دھڑکنے لگا۔

''تمہیں کچھ خبر ہے۔ تم میرے لیے کیا ہو۔ یہ رنگ، یہ پھول، یہ جھرنے، یہ قوس و قزح سب تمہارے سامنے کتنے پھیکے ہیں۔ تم۔ تم تو۔''

وہ بولتا رہا، وہ مسکراتی رہی۔
رنگوں کی بارش دونوں کے چہرے پہ ہوتی رہی۔

☆☆☆

''تمہارے اور ضامن بھائی کے خیالات، تم دونوں کی پسند ناپسند اس حد تک ایک جیسی ہے۔ مجھے تو اندازہ ہی نہ تھا۔'' اقصیٰ اس سے ملتے ہی شروع ہوئی۔ ''ایک جیسا گفٹ، ایک سی پیکنگ۔''

خولہ جھینپ کر نچلا لب دانتوں تلے دبا گئی۔

''وہاں وہ مسکرا دیتے ہیں، یہاں آپ شرما دیتی ہیں۔ چکر کیا ہے وکیل صاحبہ!''

'''' کیسا چکر؟''

''یہ تم پہلے ملی کب ملی ہو ضامن بھائی سے؟ اور تم نے مجھے پہلے بتایا کیوں نہیں۔''

''میں تو دن میں دسیوں لوگوں کے ساتھ ملتی ہوں۔ پھر تم کہو گی کہ میں نے ان کے بارے میں نہیں بتایا۔''

''مجھے ان دسیوں لوگوں میں کوئی دلچسپی ہے بھی نہیں۔ مجھے صرف اس ایک بندے کے بارے میں جاننا ہے جس کے ساتھ تمہارے خیالات اتنے ملتے ہیں۔ اب یہ مت کہنا کہ ایسا محض اتفاق ہے کہ تم دونوں نے ایک ہی گفٹ ماما کے لیے پسند کیا۔ خیر ملاقات اتنی پرانی نہیں لگتی۔ کیونکہ ضامن بھائی کا ذکر تو میں نے شاید پہلے بھی تمہارے سامنے کیا ہے، جب تو تم نے نہیں بتایا کہ تم انہیں جانتی ہو۔ اب کہاں مل گئے وہ تمہیں۔'' آج اقصیٰ اسے بخشنے کے موڈ میں نہ تھی۔ قسمت سے تو ہاتھ چڑھتی تھی۔

''میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ قبرستان سے باہر کچھ لڑکے میری گاڑی لے گئے اور ایک صاحب نے۔''

''اچھا تو یہ وہ ہیرو ہیں جنھوں نے عین موقع پہ تمہاری مدد کی۔'' کہانی کے سرے کچھ کچھ ملتے نظر آئے اقصیٰ کو۔

''ہیرو ویرو کوئی نہیں۔ البتہ یہ وہی جناب ہیں۔'' اس نے اقصیٰ کو گھورتے ہوئے کہا۔ البتہ دل کی کایا پلٹ اس کے اپنے سامنے تھی۔ کہاں تو وہ اس حوالے سے کسی کے نام سے، کسی کے ذکر سے بھی چڑتی تھی اور کہاں ضامن مصطفیٰ کے حوالے سے اسے کچھ برا نہ لگ رہا تھا۔

''تو ہیرو بنا لو ناں میری سکھی سہیلی۔ کیا زبردست جوڑی لگے گی تمہاری اور ضامن۔''

''چائے کے ساتھ اور کیا لو گی؟'' وہ جلدی سے اٹھنے لگی۔ ابھی تو اپنی قلبی تبدیلیوں کو خود سمجھ نہ پا رہی تھی۔ اس شخص کی ذات سے متعلق ذکر من بھاتا ضرور تھا پر وہ گھبرا بھی رہی تھی۔

''بیٹھو یہاں۔ چائے وائے بھی ہوتی رہے گی۔'' اقصیٰ نے اس کا بازو کھینچ کر پھر بٹھا لیا۔ ''جہاں ایسا ذکر چھڑے تم بھاگ کھڑی ہوتی ہو۔ خولہ ایمان سے بوڑھی ہو رہی ہو۔ شرم کرو ذرا۔ میرے تین بچے ہو گئے۔ اب تو شادی کر لو۔''

''میری شادی تمہارے بچوں کی تعداد سے مشروط ہرگز نہیں تھی۔''

''چلو میرے بچوں کی تعداد نہ دیکھو۔ اپنی عمر دیکھ لو۔ بیس کی ہونے والی ہو۔''

''پیاری دوست! بیس کی ہونا کوئی ایسی بھی قابل مذمت بات نہیں۔ مگر تم اور ماما تو لگتا ہے میری عمر کا ایک ایک دن انگلیوں پہ گننے لگے ہو۔'' وہ ایج کانشس کبھی نہ رہی تھی اس لیے اثر نہ ہوا۔

''ہاں تو کیا کریں، ہم دونوں کو تمہاری فکر ہے

ناں۔"

"فکر ہے تو زنجیریں پہنانے کی جلدی کیوں پڑی رہتی ہے؟"

"تم شادی کو زنجیر کہہ رہی ہو۔ لڑکی شادی کرلو تو جانو۔ کسی کا اپنا ہو جانے اور خود کسی کا ہو جانے کا نشہ کیا ہوتا ہے۔ کسی کے نام پہ جینے مرنے کا سرور کیا ہے۔ اپنا گھر، اپنا شوہر اپنے بچے۔ اس کائنات کا تو حسن ہی نرالا ہے۔ بہت خاص ہونے کا احساس، محبت، رنگ، خوشیاں، احساس ملکیت۔ کیا کچھ نہیں ہوتا آپ کے پاس۔" وہ شادی شدہ زندگی کی رعنائیاں بیان کرنے میں مصروف ہو چکی تھی۔

خولہ ہنستی رہی۔ اس موضوع پہ تو اقصیٰ بلا تکان بول سکتی تھی۔

"خولہ! چائے۔" اقصیٰ کی زبان کے آگے بریک صاحبہ نے کمرے میں داخل ہو کر لگائے۔ ابھی اس نے چائے کا گھونٹ بھرا ہی تھا کہ تیمور کی کال آ گئی۔

"مگر تیمور ابھی تو میں۔ پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اتنی جلدی کیسے۔ آپ بھی ناں۔ اچھا ٹھیک ہے۔" آخر میں اس نے جھنجھلا کر موبائل کان سے ہٹایا۔

"مجھے جلدی جانا ہو گا۔" جلدی جلدی گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے اطلاع دی۔

"ابھی تو آئی ہو۔ ماما آنے والی ہیں۔ ان سے مل کر جانا۔"

"ان سے اور بابا سے پھر ملنے آؤں گی۔ ابھی جانا ہو گا۔ تیمور صاحب نے کسی کو ڈنر پہ انوائٹ کیا ہے اور اطلاع اب دی جا رہی ہے۔" موڈ خاصا خراب ہو چکا تھا اس کا۔

"تو کک ہے ناں۔"

"کک کے ساتھ بھی تو خود سر کھپانا پڑے گا۔ پھر بچوں کو ابھی ہوم ورک بھی کروانا ہے کوئی نیا ٹیوٹر ہی نہیں مل رہا۔ کوئی ایک جھنجھٹ تھوڑی ہے۔ شادی کر کے تو گھن چکر ہی بن جاتا ہے بندہ۔ گھر، شوہر، بچے، سسرال۔"

خولہ زور سے ہنس پڑی تو وہ اسے گھورنے لگی۔

"ہنس لو۔ ہنس لو۔ شادی ہو گی تو لگ پتا جائے گا۔ اپنی ذات کے لیے تو وقت بچتا ہی نہیں عورت کے پاس۔"

"شوہر، بچے، محبت، جنت۔۔۔ کچھ ایسی ہی باتیں کر رہی تھیں ناں کچھ دیر پہلے آپ۔ جب شادی شدہ زندگی کی تعریفوں میں یوں رطب اللسان تھیں محترمہ جیسے اس ٹاپک پہ بولنے کے لیے کسی ٹاک شو میں بیٹھیں ہوں۔" خولہ نے خوب چڑایا۔

"کیا کریں یار!" اقصیٰ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "شادی لڈو موتی چور کا، جو کھائے پچھتائے جو نہ کھائے پچھتائے۔"

وہ پھر ہنس دی۔

☆☆☆

خولہ بنت زید کے چہرے سے نظریں ہٹا کر ضامن مصطفیٰ نے ایک نگاہ اس چھوٹی قبر پر ڈالی جو آج بھی موتیا کی کچھ تازہ اور کچھ مرجھائی ہوئی کلیوں کے ساتھ ڈھکی ہوئی تھی۔ ان کی نظر لوٹ کر خولہ کی طرف آئی جو ان کی ماں کی قبر کے سرہانے کھڑی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دوسری جانب آ کر رک گئے۔

خولہ ہاتھ اٹھائے بند آنکھوں کے ساتھ دعا مانگ رہی تھی۔ انہوں نے غور سے اس کے ہلتے لبوں کو دیکھا۔ انہیں یقین تھا کہ ان لبوں سے ادا ہونے والا ہر لفظ ان کی ماں، ان کی پیاری ماں کے لیے دعا بن کر عرش تک جا رہا ہے۔

دھند چھٹ گئی۔ رستہ واضح ہو گیا۔

فیصلہ۔ فیصلہ پل بھر میں ہو گیا۔

انہوں نے اطمینان اور آسودگی کے ساتھ ہاتھ اٹھائے اور اپنے چہرے کے سامنے پھیلا لیے۔

دور اپنے کام میں مگن گورکن نے یہ منظر دیکھا اور پھر اس قبر کی طرف متوجہ ہو گیا جسے کھودنے کا کام اسے آج صبح ہی ملا تھا۔

☆☆☆

سفید اور گلابی پھول ہوا کا جھونکا آتے ہی جھوم جھوم جاتے جن سے اسے بہت پیار تھا۔ اس بیل کا اپنے ٹیرس تک پہنچنے کا اس نے بہت بے تابی کے ساتھ انتظار کیا تھا۔ جس کے پھول رات میں کھلتے تو سفید ہوتے اور صبح سورج کی بے باک نگاہیں انہیں بالکل گلابی کر دیتیں۔

وہ روزانہ کتنی ہی دیر انہیں دیکھتی رہتی۔ پھولوں کا گچھا ہاتھ میں تھام کر نرمی سے ان پہ انگلیاں پھیرتے ہوئے ان کی مہک اپنے اندر اتارتی۔

آج بھی وہ پچھلے ایک گھنٹے سے یہاں ریلنگ پہ کہنیاں ٹکائے انہی پھولوں پہ نگاہیں جمائے کھڑی تھی مگر اس کا دھیان ان کی طرف نہ تھا۔ دھیان کا پنچھی تو شام ضامن مصطفیٰ کے آنے سے لے کر رات ماما کی گفتگو تک کے گرد ہی اڑانیں بھر رہا تھا۔

آج شام ضامن مصطفیٰ، اقصیٰ اور تیمور کے ساتھ آئے تھے اور ماما بابا سے اس کا ہاتھ مانگا تھا۔ بابا نے کہا تھا کہ وہ سوچ کر جواب دیں گے لیکن ایسا انہوں نے صرف اقصیٰ اور تیمور کا لحاظ کرتے ہوئے کہا ورنہ وہ اسی وقت منع کر دیتے۔

”کیوں؟“ ماما نے جب اسے بتایا تو ایک دم اس کے منہ سے نکلا تھا۔

مما نے کتنی حیرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ماما حیران کیوں ہوئی تھیں۔ اب تک آئے اپنے ہر رشتے کے لیے اس کے منہ سے یہ نکلتا تھا۔

”ماما! پلیز آپ انہیں منع کر دیں۔“

آج اس بدلا... انہیں حیرت تو ہونی تھی ناں۔

”خولہ! رشتہ ایسے مانگا ... ہے؟ ماں ساتھ نہ ہی باپ۔ اور تو۔“

”ان کی والدہ حیات نہیں ہیں ماما۔“ اس نے ان کی بات کاٹتے ہوئے آہستگی سے کہا تھا۔

”باپ تو حیات ہے ناں۔“

”وہ ان سے شاید کچھ ناراض ہیں۔“ ضامن مصطفیٰ اور ان کے والد کے بیچ ... تعلقات کے بارے میں وہ اندازہ بھی رکھتی تھی پھر کچھ اسے اقصیٰ سے معلوم ہوا تھا۔

”ایسی بھی کیا ناراضگی خولہ! جو اس موقع پر بھی دور نہ ہو سکے۔ جو شخص اتنے اہم معاملے میں اتنے حقیقی اور قریبی رشتوں کے ہونے نہ ہونے کی پرواہ نہیں کر رہا وہ بیوی کو کیا حیثیت کیا مقام دے گا۔ ویسے بھی یہ وڈیرے، یہ جاگیردار۔ بڑے ڈرامے آتے ہیں انہیں۔ تم نہیں جانتی کیا۔ گاؤں میں ان پڑھ خاندانی بیوی، شہر میں پڑھی لکھی خوبصورت ہمسفر۔“

اس کے بعد ماما نے جاگیرداروں، وڈیروں، رئیس زادوں کی عیاشیوں، ہرجائی پن، گھٹے ماحول، تنگ نظری، ظلم و ستم کے بارے میں جو جو کہانیاں پڑھ سن رکھی تھیں، جو جو ڈرامے فلمیں دیکھ رکھے تھے، جس جس حقیقی کردار سے اپنی زندگی میں بھی مل چکی تھیں، سب کا لب لباب اور تجزیہ اس کے سامنے پیش کیا تھا۔

”ولیکن ماما! ضامن مصطفیٰ ایسے نہیں ہیں۔“ سب کچھ سن لینے کے بعد اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے تو ماما مشکوک ہوئیں۔

”خولہ! کیا تم ضامن مصطفیٰ کو پسند کرتی ہو؟“ انہوں نے بہت غور سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”انہیں کوئی بھی بندہ ناپسند نہیں کر سکتا ہے ماما۔“ اس نے نارمل سے انداز میں کہنے کی کوشش کی مگر ماما سے نظر چرا کر بات کرنا ان کے اندازے پہ مہر ثابت ہوا۔

”میں کسی بھی بندے کی بات نہیں کر رہی، تم سے پوچھ رہی ہوں، کیا تمہاری ضامن مصطفیٰ کے ساتھ انوالومنٹ ہے؟“ ماما نے ڈائریکٹ ہو کر پوچھا۔

”نن۔ نہیں ماما! ایسی کوئی بات نہیں۔“

اس نے گہری سانس لیتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔ رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ چاند اس کے سامنے آ کر ٹھہر گیا تھا۔ اس نے

چاند میں چرخے والی نانی اور پریاں ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر وہاں تو کسی اور کی شبیہہ تھی۔

اس نے نظریں ہٹالیں اور سفید و گلابی پھولوں کو دیکھنے لگی۔

اس نے ماما سے کہہ دیا تھا کہ ضامن مصطفیٰ کے لیے اس کے دل میں کوئی خاص جذبہ نہیں۔ کیا واقعی ایسا تھا؟

اس کے دل نے نفی کی۔

کل جب وہ ایک طالبہ تھی اور آج جب وہ ایک کامیاب وکیل ہے۔ اس دوران کتنے ہاتھ اس کی طرف بڑھے۔ کتنے لوگوں نے اس کے ساتھ کی چاہ کی۔ مگر یوں اس طرح دسمبر کی سرد رات کا ایک پہر بظاہر چاند اور پھول تکتے ہوئے مگر دھیانوں اور خیالوں میں کسی اور کو سوچتے ہوئے کبھی نہ بتایا تھا۔

شاید وہ بھی ایسی تھی یا ہر لڑکی چاہتی ہے کہ اس کا زندگی بھر کا ساتھی ایسا ہو جس کی شخصیت اس سے زیادہ قد آور ہو، مضبوط ہو، حاوی ہو۔ جس کا ساتھ جس کا حصار اسے تحفظ کا احساس دلائے۔ جس کی پناہوں میں وہ ہر فکر بھلا دے۔ جبکہ اس کی طرف بڑھنے والے کچھ ایسے رہے جن کی شخصیت اس مضبوط، منفرد اور کامیاب لڑکی کے سامنے دب سی جاتی۔ اگر کوئی اس کا مقابل آیا یا اس سے بڑھ کر ہوا بھی تو بھی اس کے دل نے کچھ ایسا محسوس نہ کیا جو وہ ضامن مصطفیٰ کے لیے محسوس کر رہی تھی۔

ہاں ۔۔ ضامن مصطفیٰ ایسا شخص تھا جس کی بارعب، پروقار ذات خولہ بنت زید جیسی لڑکی کے لیے بھی ہیر و ٹنگ تھی۔

ہاں۔ ضامن مصطفیٰ ایسا نقب زن تھا جس نے خولہ بنت زید کے خوابوں، اس کے خیالوں، اس کے دل تک رسائی حاصل کر لی تھی۔

خولہ بنت زید اقرار کرے نہ کرے۔ دسمبر کی اس سرد رات نے، رات کے اس دوسرے پہر نے، فلک پہ چھب دکھلاتے چاند نے ان سفید اور گلابی پھولوں نے یہ راز پالیا تھا۔

☆☆☆

آج صبح جو خولہ گھر سے نکلی تو بھول ہی چکی تھی کہ دسمبر چل رہا ہے۔ اور ابھی جب وہ اپنے اور ماما کے چند سوٹ لے کر آؤٹ لیٹ سے باہر آئی تو ٹھٹھر کر رہ گئی۔ موسم نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلا تھا اور اب بارش کے قطرے دھرتی کے قدم چومنے تیزی سے نیچے آ رہے تھے۔ سردی شدید ہو گئی تھی۔ اس نے ٹوکن دے کر اپنا کالا کوٹ اٹھایا اور جلدی سے وہی پہن کر کام چلایا۔ پھر فائل اور باقی شاپنگ بیگز اٹھا کر ٹیکسی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ ایک خالی ٹیکسی نظر آتے ہی اس کی طرف بڑھی۔

"باجی یہ موبائل کور لے لیں۔" ایک نوعمر لڑکا اس کے رستے میں آیا۔ وہ نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی۔

"باجی! میرا باپ معذور ہے۔ چھوٹے بھائی کے داخلے کی فیس جمع کروانی ہے" وہ اس کے پیچھے پیچھے آیا۔ وہ رک گئی اور غور سے اس کی صورت دیکھی۔ اس نے دنیا بھر کی مسکینیت اپنے چہرے پہ سجا لی۔ "اللہ قسم باجی! بھائی کی فیس جمع کروانی ہے، کل آخری تاریخ ہے۔"

اور باجی نے پچاس روپے کا موبائل کور دو سو روپے میں خرید لیا جو دو سو روپے کا ہی تھی۔

"جوتے لگانے چاہئیں ایسے ڈرامے بازوں کو۔"

وہ ٹیکسی تو نکل چکی تھی۔ اس نے دوسری کی تلاش میں دو قدم ہی آگے بڑھائے تھے کہ چہرے پہ غازہ اور ہونٹوں پہ آتشی گلابی لپ اسٹک کی تہیں جمائے نیلے اور آتشی گلابی پرنٹڈ سوٹ میں ایک خواجہ سرا اس کے سامنے آ گیا۔

"صدقے جاؤں۔ کیسی سوہنی صورت دی ہے میرے رب نے۔ بالکل کرینہ کپور جیسی۔ اس صورت کے صدقے کچھ دیتی جا۔"

سامنے ایک خالی ٹیکسی نظر آئی۔ اب وہ اس کو ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہتی تھی اور خواجہ سرا تھا کہ پیچھا

چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلا تو اس نے پرس میں جلدی سے ہاتھ ڈال کر نوٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔

"دس روپے۔ بہن میری دس روپے کا کیا آتا ہے آج کل۔" اس نے نہ نوٹ تھاما اور نہ ہی اس کا پیچھا چھوڑا تھا۔ "کاجول کی آنکھوں والی۔ یہ موبائل کور ہی دیتی جا۔ تیرے کس کام کا۔ تیرے ہاتھ میں تو سیٹ ہی دوسرا ہے۔"

اسے لگا تمام بالی وڈ ہیروئنز کا صدقہ آج اسے ہی اتارنا ہے۔ موبائل کور اسے دیا اور جلدی سے ٹیکسی تک پہنچنے کی کوشش کی۔ مگر بارش نے آج ان کی مانگ خوب بڑھا دی تھی۔ اس کے پہنچنے تک اس میں کوئی اور سوار ہو چکا تھا۔ وہ تاسف سے سر ہلاتے ہوئے چھجے کے نیچے کھڑی ہو کر کسی اور ٹیکسی کی راہ دیکھنے لگی۔

"خولہ!"

کسی نے اس کے سامنے آتے ہوئے اس کا نام لیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

جس شخص کو پہروں سوچا ہو۔ جس کے لیے پہلی بار اپنی نیندیں حرام کی ہوں، جو خوابوں میں آنے کی جسارت کر چکا ہو۔ اسے اچانک یوں سامنے دیکھ کر دل کن کیفیات سے گزرتا ہے، وہ خوب آشنا ہوئی تھی اس سے۔

"آیئے! میں آپ کو گھر تک چھوڑ دوں۔" ضامن مصطفیٰ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنی گاڑی کی طرف بڑھے۔ انہوں نے تو رسمی انکار کا موقع بھی نہ دیا تھا۔ وہ ان کے پیچھے آگئی۔

"آج آپ کی گاڑی کس کی مہمان ہے؟" انہوں نے اس کے لیے دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا تو وہ بجھ کر مسکرا دی۔

"ایسی بات نہیں۔ میری پھوپھو کو لینے گئی ہے۔" اس نے بیٹھتے ہوئے بتایا۔

"چلیں پھر خیر ہے۔" وہ گھوم کر اپنی سیٹ کی طرف آئے۔ جیسے ہی گاڑی اسٹارٹ کرنے لگے سات رنگوں کے لباس میں ایک اور خواجہ سرا خولہ کی طرف آ کھڑا ہوا۔

"میڈم! پور پیپل کی ہیلپ کرنا بڑی گریٹ جاب ہے۔ جب سے ونٹر سیزن اسٹارٹ ہوا ہے۔ مجھے کف اینڈ فلو ہے اور میڈیسن۔" اس کی کہانی سنتے ہوئے خولہ نے بیگ میں ہاتھ ڈالا۔ وہ جھوٹ بولتے تھے یا سچ، یہ سوچے بغیر وہ انہیں کچھ نہ کچھ ضرور دیا کرتی تھی۔

"میڈم پلیز۔ سر پلیز ہیلپ می۔ گاڈ آپ کا مون اینڈ سن جیسا کپل قائم اور ہیپی رکھے۔"

خولہ نے جھینپ کر والٹ وہیں رکھا اور ہاتھ پرس سے باہر نکال لیا۔ اس کے چہرے پہ سرخی دوڑی جیسے کسی نے مٹھی بھر گلال لگا دیا ہو۔ ضامن نے زیر لب مسکراتے ہوئے اپنے والٹ سے ایک نوٹ نکال کر دعا گو کی طرف بڑھایا اور پھر اس کی طرف دیکھا۔

بارش کے چند قطرے اس کے بالوں میں جگنوؤں کی طرح چمک رہے تھے۔ اور چند بوندیں اس کے صبیح چہرے پہ آٹھہری تھیں۔ جس میں اب سرخیاں بھی گھل گئی تھیں۔ ضامن مصطفیٰ کے لیے اس گل و شبنم چہرے سے نگاہیں ہٹانا امتحان بن گیا۔

"پور پیپل کی ہیلپ کر کے آپ نے بڑی گریٹ جاب پرفارم کی ہے۔" اس کی شخص کی نگاہوں کی تاب لانا کوئی آسان بات کہاں تھی۔ اور ایسی خاموشیاں جو اپنے اندر ہزار ہا معانی رکھتی ہوں، ان سے باہر نکلنے کے لیے اسے باقاعدہ ایک جملہ ڈھونڈنا پڑا۔

ضامن ہلکا سا ہنستے ہوئے سیدھے ہوئے اور گاڑی بہادر آباد کی سڑکوں پہ دوڑانے لگے۔

خواجہ سرا کی وہ دعا خولہ کے ذہن سے نکل نہ رہی تھی۔ مسکراہٹ تھی کہ لبوں پہ بکھر بکھر جا رہی تھی۔ دل تھا کہ دھک دھک کی آواز ایسی کہ اسے لگ رہا تھا ضامن مصطفیٰ کو بھی سنائی دے رہی ہو گی۔ اس دل اس مسکراہٹ نے اسے پہلے تو یوں خوار نہ کیا تھا کبھی۔

"میرا ایک کیس چل رہا تھا آپ کی عدالت میں۔ پوچھ سکتا ہوں، فیصلہ کیا ہوا۔" کچھ دیر بعد ضامن اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ وہ جو اپنی کیفیات عیاں ہونے کے ڈر سے مسلسل کھڑکی کی طرف چہرہ کیے بیٹھی تھی، سیدھی ہوئی۔

"کون سا کیس؟"

"وہی۔ جس میں آپ کو پروموشن دے دی گئی ہے۔ وکیل آپ ہیں، جیوری آپ ہیں، جج بھی آپ ہیں۔" ان کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

"اوہ۔" وہ سمجھ گئی اور چپ ہو کر اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں الجھنے لگی۔

"خولہ! آپ نے جواب نہیں دیا۔" ضامن نے اس پہ ایک نظر ڈالتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

"اس کیس کی جج میں نہیں، ماما اور بابا ہیں۔" حقیقت تو یہ تھی کہ ضامن مصطفیٰ کی موجودگی میں ماما اور بابا کے خیالات اور ارادے تو اسے یاد ہی نہ تھے۔ اب جو یاد آئے تو نامعلوم سی اداسی نے اس کی ذات کا گھیراؤ کیا۔

"اچھا تو ان کا فیصلہ کیا ہے؟"

"وہ مطمئن نہیں ہیں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"وجہ جان سکتا ہوں؟"

"ان کا خیال ہے کہ آپ کو اپنے والد اور فیملی کو اس سلسلہ میں شامل رکھنا چاہیے۔"

"اور آپ۔ کیا آپ کے لیے میری ذات کافی نہیں۔ کیا آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں۔" ان کا ہاتھ ڈیش بورڈ پہ رکھے سگریٹ کیس کی طرف گیا لیکن پھر انہوں نے اسے اٹھا کر واپس وہیں رکھ دیا۔

"ماما، بابا، صرف آپ کو دیکھ کر تو کوئی فیصلہ نہیں لے سکتے ناں۔"

"خولہ! کیا آپ کو مجھ پر یقین نہیں؟" انہوں نے اپنا سوال دہرایا۔

"آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ والدین کے لیے۔"

"خولہ! کیا آپ کو مجھ پر یقین نہیں؟" گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔ انہوں نے دایاں بازو اسٹیئرنگ پہ ٹکاتے ہوئے اس کی طرف رخ کیا اور اس کی بات کاٹتے ہوئے ایک دفعہ پھر وہی سوال کیا۔

"مجھے آپ پر یقین ہے مگر بابا۔"

"بس۔ مجھے یہی جاننا تھا۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر گویا اسے آگے کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔ اور سیدھے ہو کر گاڑی چلا دی۔

باقی تمام رستہ وہ بالکل خاموش رہے۔ نچلا لب کچلتے ہوئے خولہ کی نظر بار بار ان کے چہرے پہ جا ٹھہرتی۔ اسے پہلی ملاقات یاد آ گئی۔ تب بھی تو وہ یونہی ایک دم خاموش ہو گئے تھے۔ اسے عجیب گھبراہٹ سی ہونے لگی تو موبائل اٹھا کر بے مقصد کبھی فیس بک کھولی، کبھی واٹس ایپ تو کبھی گیلری۔ ضامن کا موبائل دو دفعہ بج بج کر چپ ہو گیا۔ گاڑی اس کے گیٹ کے سامنے آ کر رکی تو اس نے موبائل کی اسکرین آف کرتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

"تھینکس۔ ویسے آپ سے اتنی بار لفٹ لی ہے کہ اب تو یہ گاڑی مجھے اپنی ہی لگنے لگی ہے۔" اتنے گھمبیر اور سنجیدہ ماحول میں وہ اس ملاقات کا خاتمہ نہ چاہتی تھی اس لیے مسکراتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

"گاڑی کیا۔ گاڑی کے مالک کے مالکانہ حقوق بھی آپ کے نام کرنے کو تیار ہیں۔ حکم تو ہو۔" لہجے اور چہرے پہ سنجیدگی ویسی کی ویسی تھی مگر آنکھوں میں نرمی ایک طائر کی طرح اڑتی ہوئی آئی اور پر کھول کر بیٹھ گئی۔

خولہ کے لیے کچھ بھی کہنا، اس شخص کی طرف مزید دیکھنا محال ہوا۔ وہ جلدی سے گاڑی سے اتر آئی۔

یہ شخص ضامن مصطفیٰ۔ واقعی جادوگر ہے۔ جب چاہے منتر پڑھ کر سامنے والے کے لبوں پہ مسکراہٹ لے آئے اور جب چاہے لبوں پہ چپ کا قفل یوں لگا دے کہ لفظ زبان پہ مچل مچل کر دم دے دیں۔ جب چاہے دل دھڑکنے کی رفتار گھٹا دے جب چاہے

پھونک مار کر بڑھا دے۔

خولہ بنت زید کو اپنا آپ ہارتا محسوس ہو رہا تھا مگر یہ شکست کیسی شکست تھی کہ جیت کا سا سرور تھا۔

☆☆☆

اور پھر یہ چند دن بعد ہی کی بات تھی۔

خولہ کورٹ میں تھی جب ماما کا فون آیا۔ انہوں نے ضامن مصطفیٰ کے والدین کے آنے کی اطلاع دے کر اسے جلدی گھر پہنچنے کی تاکید کی۔

ماما سے بات کرتے ہوئے، گھر کی طرف جاتے ہوئے اس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ ڈرائیونگ کرنا مشکل ہو رہی تھی۔ ایک یہ دل تھا جس نے کسی شرارتی بچے کی طرح اچھل کود مچا رکھی تھی۔ اتنی بوکھلاہٹ میں بھی مسکراہٹ لمحہ بھر کے لیے بھی اس کے لبوں سے جدا نہیں ہوئی تھی۔

ضامن مصطفیٰ نے اسے پل پل نئے اور انوکھے احساسات سے متعارف کروایا تھا۔ اس وقت بھی جب ضامن مصطفیٰ کی اپنے والد اور خاندان سے متعلق چپ اور ان کے آپس کے تناؤ نے اسے عجیب خدشات میں جکڑ رکھا تھا۔ وہ خود اعتمادی جو اس کی ذات کا حصہ تھی، اس میں یہ سوچ کر کمی سی آتی جارہی تھی کہ کوئی اس کے لیے ہر بازی کھیل سکتا ہے۔ کوئی اس کے لیے اپنی انا کو پس پشت ڈال کر جن رشتوں سے خفا ہے، ان کے پاس جاسکتا ہے۔ آج وہ ڈر ختم ہو گیا۔ اس کو اہم ہونے کا احساس دلا کر اس کی خود اعتمادی کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔

دھک دھک کرتے دل کے ساتھ لبوں پہ دھیمی سی مسکراہٹ سجائے وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ اندر کا ماحول ہرگز بھی اتنا خوش گوار نہیں تھا جتنا اس کے گمان میں تھا۔ بابا کے ماتھے پہ سلوٹیں تھیں۔ ماما بوکھلائی ہوئی سی تھیں۔

اس کے اندر داخل ہوتے ہی سامنے صوفے پہ براجمان خاتون کی زبان کے آگے فل اسٹاپ آیا اور سر سے پیر تک اس کا جائزہ لے ڈالا۔ ان کے علاوہ ایک عدد خاتون اور ایک لڑکی بھی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ خاتون ضامن مصطفیٰ کے والد کی منجھلی بیگم اور لڑکی ان کی بیٹی ہے۔ بابا کے ساتھ بیٹھے سوبر سی شخصیت کے مالک مصطفیٰ امین تھے جو کہ ضامن مصطفیٰ کے والد تھے اور ان سے خاصی مشابہت رکھتے تھے۔

”اچھا تو تم وہ لڑکی ہو جس کے لیے بیٹے نے باپ کو اتنے سالوں بعد منہ لگایا۔ ورنہ تو سوچ لیا تھا ہم نے کہ کندھا دینے بھی نہیں آئے گا۔“ سونے چاندی کے زیورات میں لپٹی جاہلیت بول رہی تھی۔

خولہ نے گڑبڑا کر بابا کی طرف دیکھا جن کے ماتھے کے بلوں میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔

”یہ تو آپ لوگوں کی اعلیٰ ظرفی اور بہترین اطوار ہیں کہ آپ نے ایک فرد سے رشتہ قائم کرنے کے بجائے اس سے جڑے باقی رشتوں کو بھی اہمیت دی۔“ مصطفیٰ امین نے اپنی چھوٹی بیگم صاحبہ کو خشمگیں نظروں سے گھورا۔ اور پھر بابا کی طرف دیکھتے ہوئے زوجہ عالیہ کے ادا کیے گئے شیریں کلمات کا اثر زائل کرنے کی کوشش کی۔

مصطفیٰ امین کی منجھلی بیگم نہایت سادہ سی خاتون تھیں۔ کچھ وہ ان کی زبان بھی ٹھیک طرح سے نہیں سمجھ پارہی تھیں اس لیے زیادہ تر خاموش ہی رہیں۔ جبکہ بیٹی مرک جو کہ میڈیکل کے تھرڈ ایئر میں تھی، خاصی خوش اخلاق اور سلجھی طبیعت کی مالک تھی۔

ان تینوں کو سامنے رکھتے ہوئے چھوٹی بیگم صاحبہ کی حرکات وسکنات اور الفاظ کو نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔ کیونکہ ایسے دو ایک نادر نمونے اس کے اپنے خاندان میں بھی موجود تھے جنہیں اپنے سامنے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ لیکن اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ مصطفیٰ امین اگر ایک سے زیادہ بیگمات رکھتے بھی تھے تو انہیں تمغے کی طرح یہاں سجا کر لانے کی کیا ضرورت تھی۔ اپنی اس غلطی کا احساس انہیں خود بھی خوب ہو رہا تھا۔

جب ہی تو انہوں نے بھڑکیلے لباس میں سجی اپنی اس خوبصورت اور کم عمر بیگم کو آنکھوں ہی آنکھوں میں

یوں تنبیہہ کی تھی کہ وہ پہلو پہ پہلو بدل کر رہ گئی۔ پھر بھی رخصت ہونے تک وہ ایک اور گڑبڑ یہ جتا کر کر چکی تھیں کہ ضامن مصطفیٰ کے خاندان سے باہر شادی کرنے کی صورت میں اس کی ایک دو بہنیں کنواری بیٹھی رہ جائیں گی۔ کیونکہ ان کے ہاں بیٹیوں کی شادی خاندان سے باہر نہیں ہوتی اور خاندان میں ادلے بدلے کی شادی کا رواج ہے۔ وہ خود بھی مصطفیٰ امین کی ایک بیٹی کے بدلے میں آئی ہیں۔

بابا نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت مختصر سا جواب دیا تھا کہ "ہم سوچ کر جواب دیں گے۔"

خولہ ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

ضامن مصطفیٰ کے والدین کا نہ آنا ان کے آنے سے زیادہ بہتر تھا۔ چھوٹی بیگم تو بابا کے سارے خدشات کو ہوا دے کر جا رہی تھی۔

مصطفیٰ امین نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"تم میرے لیے بخت آور ہو کہ ابھی میرے بیٹے کی زندگی میں آئی ہو اور تمہارے لیے میرا بیٹا اٹھائیس برس بعد اپنے گھر میں داخل تو ہوا۔ اس نے اپنے باپ سے بات تو کی۔ مجھے یقین ہے کہ جب تم اس کی زندگی میں باقاعدہ شامل ہو جاؤ گی تو باپ بیٹے کے بیچ کی ہر دوری مٹا دو گی۔"

اس مان پر اس کی آنکھیں نم ہو گئیں اور دل نے چپکے سے "ان شاء اللہ" کہا۔ ان کی گاڑی گیٹ سے نکلتے ہی بابا پلٹے اور اندر چلے گئے۔ وہ ان کی پشت دیکھتی رہ گئی۔ پھر اس نے ماما کی طرف دیکھا۔

"خولہ! یہ کس شخص کو چنا ہے تم نے بیٹا۔" ماما جیسے بہت بے بس سا ہو کر بولیں۔

"اگر چنتی تو سوچتی ماما۔ پر میں نے چنا نہیں پسند کیا ہے۔ اور پسند کرنے کا عمل سوچ سمجھ کر نہیں ہوتا۔ جہاں تک بات چننے اور نہ چننے کی ہے، اس کا حق آپ کو اور بابا کو ہے۔ مجھے آپ کا ہر فیصلہ دل و جان سے قبول ہو گا۔"

کہنے کو تو اس نے کہہ دیا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ بات محض پسندیدگی تک نہیں رہی۔ اس کا دل بہت آگے کی راہ پہ قدم رکھ چکا تھا۔ جب ہی تو اس نے بے اختیار دعا مانگی تھی۔

"اے میرے رب! میرے ماما بابا وہ فیصلہ کریں جو واقعی مجھے دل و جان سے قبول ہو۔"

☆☆☆

پروفیسر زید الصار کے چھوٹے سے پیارے سے گھر پہ بھی رات اتر چکی تھی۔ ٹی وی بند ہو گیا تھا، بتیاں بجھ چکی تھیں سوائے چند ایک کے۔ خولہ اپنے کمرے میں اسٹڈی ٹیبل پہ ایک فائل کھولے بیٹھی تھی اور پروفیسر صاحب کچن کا ونٹر چیئر پہ بیٹھے زوجہ کے متفکر چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ اور ان کی ہر فکر آج کل بیٹی کی شادی تھی۔ پہلے بیٹی مانتی نہیں تھی اور ضامن مصطفیٰ کا رشتہ آنے کے بعد جو رضامند نظر آتی تھی تو باپ راضی نہ لگتا تھا۔

"آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں ثروت! جو عورتیں اسی گھٹن زدہ ماحول میں پیدا ہو کر، اسی میں پل کر، بیاہ کر، اسی میں زندگی گزار دیتی ہیں، ان کے لیے اس سے باہر تو کوئی دنیا ہوتی نہیں ہے۔ اس لیے ان کے گزارے ہو جاتے ہیں۔ مگر خولہ جس روشن ماحول میں پلی بڑھی ہے وہ تو۔"

"مگر اسے وہاں تھوڑی رہنا ہے۔" ثروت نے چائے کا مگ تیار کر کے پروفیسر زید الصار کی طرف بڑھاتے ہوئے ان کی بات کاٹی۔

خدشات ان کے بھی کم نہ تھے مگر بیٹی کے دل کی تمنا انہیں آنکھیں بند کرنے پہ مجبور کر رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

عنبرین آبدال



"تم نے سنا سمیرا کی بہو کتنا سامان لے کر آئی ہے۔ ارے گھر بھر گیا ان کا تو سامان رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ بڑی ہی منتیں کر کے مجھ سے ایک کمرہ خالی کروایا ہے۔ کچھ سامان رکھنے کے لیے اور ساتھ ہی ۔۔۔ راحیلہ کی منتیں کر کے ایک کمرہ لیا۔ ارے اب مہمانوں کو سونے اور رکھنے کی جگہ کا انتظام کیا جائے یا پھر سامان کا انتظام کیا جائے۔

لیکن ایک بات تو ہے سمیرا کی بہو جہیز بہت لائی ہے۔" سمیہ بیگم نے گہری سانس بھری تھی۔ آہ۔ پاس بیٹھی ان کی دونوں بہویں کہاں سمجھ پائی تھیں۔ وہ دونوں تو بس ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر نظریں چرا کر اپنے اپنے کاموں کو نپٹانے کے لیے اٹھ کر کھڑی ہو چکی تھیں۔

"حق ہا۔ یہ اعزاز بھی کسی کسی کے حصے میں آتا ہے۔ ہماری تو دونوں بہورانیاں بس ایک کمرے کا سامان اٹھائے وارد ہوئی تھیں۔ ہماری ایسی قسمت کہاں کہ چار لوگ، چار دن بھی ہمیں حسرت سے دیکھ لیتے۔"

سمیہ بیگم نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے کہا اور سر کو جھٹک کر ٹی وی پہ چلتے اپنے پسندیدہ ڈرامے کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔

☆☆☆

سحر بیاہ کر سمیرا بیگم کے گھر آئی تو کتنے ہی دن محلے کے ہر گھر میں، اس کے جہیز کے سامان کی دھوم مچی رہی تھی۔ لیکن پھر فقط دو ماہ کے بعد ہی سمیرا بیگم اور ان کے گھر والے سحر کے جہیز کے سامان سے تنگ آ چکے تھے۔ سامان رکھنے کی جگہ کم تھی، محلے کے دو گھروں میں جو سامان رکھوایا گیا تھا۔ وہ انہوں نے واپس کر دیا تھا۔

کل شام سے آسمان پہ ۔۔۔ بادلوں نے بسیرا کیا ہوا تھا۔ سحر کی تو جیسے جان پہ بن آئی تھی۔ اس کے جہیز کا صوفہ اور ٹیبل باہر صحن میں رکھے ہوئے تھے۔

"عامر! کچھ کرو۔ میرا سامان خراب ہو جائے گا۔" سحر نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

"اچھا تم روؤ نہیں۔ میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔"

عامر اپنی نئی نویلی دلہن کی آنکھوں میں آنسو کیسے برداشت کر سکتا تھا۔

"اچھا میں ایسا کرتا ہوں برآمدے میں پڑے امی کے صوفوں کو سائیڈ پہ کرتا ہوں۔ اور ان چیزوں کو ان کی جگہ پہ رکھ دیتا ہوں۔"

عامر نے کہہ کر سحر کے ساتھ مل کر اپنی ماں کے صوفے کو ہٹایا ہی تھا کہ کمرے سے نکلتی سمیرا بیگم کو جیسے چار سو چالیس والٹ کا کرنٹ لگا تھا۔

"یہ تم دونوں کیا کر رہے ہو؟"

کمر پہ ایک ہاتھ ٹکائے سمیرا بیگم نے قدرے غصے بھری نظروں سے بیٹے اور بہو کو دیکھا تھا۔

"امی! بارش ہونے والی ہے نا تو سحر پریشان ہو رہی تھی۔"

ابھی عامر کی بات مکمل بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ سمیرا بیگم اکڑے ہوئے انداز میں آگے بڑھیں۔

"ہاں تو بارش ہونے والی ہے تو کیا تم میرے اماں ابا کی دی ہوئی چیزوں کو باہر صحن میں رکھ دو گے۔ اور اپنی چہیتی کا سامان یہاں رکھو گے۔"

سمیرا بیگم غصے سے کہتے ہوئے اب بہو کو گھور رہی تھیں۔

"ہاں تو میرا سامان بھی تو میرے لتاں ابا نے ہی دیا ہے، اسے برباد کروالوں۔ آپ کا سامان تو پھر برسوں پرانا ہے۔ میرا سامان تو۔"

"دیکھو بی بی! یہ اپنے سامان کا رعب کم سے کم مجھ پر تو جھاڑو نہیں۔ میں تمھاری کسی بات میں نہیں آنے والی۔ چلو عامر! میرے صوفوں کو واپس ان کی جگہ پہ رکھو۔"

سمیرا بیگم نے تحکم بھرے لہجے میں کہا۔

جواب میں سحر اونچی آواز میں بولنے لگی۔ اندر اپنے کمرے میں پڑھتی صوفیہ، جلدی سے کتاب بند کر کے باہر کی سمت بھاگی اور مشکل سے ماں اور بھابھی کو چپ کروایا۔

"لڑائی ہر مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔ کچھ حل نکالنے کے بجائے آپ دونوں ایک دوسرے سے الجھ رہی ہیں۔" "امی! ایسا کرتے ہیں یہ والے صوفے ہم اپنے کمرے میں رکھ لیتے ہیں۔ بیڈ کو دیوار کی سمت کھسکا دیں گے تو جگہ بن ہی جائے گی۔ بھابی کی ٹیبل کو یہاں رکھتے ہیں اور صوفوں کی بھابھی کے کمرے میں ہی جگہ بناتے ہیں۔" صوفیہ نے دماغ چلاتے ہوئے مسئلے کو حل کیا تھا۔

"لیکن۔" سمیرا بیگم نے کچھ کہنا چاہا۔

"امی! ہر لڑکی کو اپنے ماں باپ کی دی ہوئی چیزیں ایسے ہی پیاری ہوتی ہیں جیسے برسوں کے بعد آپ کو اور دو ماہ پرانی بھابھی کو۔ صحیح تو کرتا ہے نا۔" صوفیہ نے ہنستے ہوئے کہا تو جہاں سمیرا بیگم کا غصہ ٹھنڈا ہوا وہیں سحر کے چہرے پہ بھی شرمندگی کے تاثرات ابھرے تھے۔

"جلدی سے یہ کام نپٹا لیتے ہیں عامر بھائی! اس کے بعد ہمیں بھابھی کے ہاتھ کی ایک کپ چائے ملے گی۔ کیوں بھابھی ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔" صوفیہ نے سحر سے اپنی بات کی تائید چاہی۔ سحر نے جلدی سے اپنے سر کو اثبات میں ہلایا پھر صوفیہ عامر کے ساتھ مل کر سمیرا بیگم کے صوفوں کو ان کے کمرے میں منتقل کروانے لگی۔

اور یوں تھوڑی دیر کے بعد جیسے ہی بارش شروع ہوئی ان تینوں نے مل کر جیسے تیسے سامان کو سیٹ کر لیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی سحر چائے بنا کر سمیرا بیگم کے کمرے میں لے آئی تھی۔

سحر کی بہت ساری اچھی عادتوں میں ایک اچھی عادت یہ بھی تھی کہ وہ کسی کی بات کو زیادہ دیر تک دل میں نہیں رکھا کرتی تھی۔ بلکہ شرمندہ ہو کر معذرت کر لیا کرتی تھی، اس وقت بھی یہی ہوا۔ اس نے شرمندہ ہو کر سمیرا بیگم سے اپنی غلطی کی معافی مانگی۔ سمیرا بیگم نے بھی دل بڑا کرتے ہوئے اسے معاف کر

دیا۔ جب رہنا ایک ہی جگہ تھا تو منہ بنا کر کیوں رہا جائے۔ ہمیرا بیگم نے اپنے دل میں سوچا اور چائے کا کپ اٹھا کر اپنے لبوں سے لگالیا۔

☆☆☆

ہمیرا بیگم نے گھر میں قرآن خوانی رکھی تھی۔ اور محلے میں موجودگی آپابی کو خاص طور پر بلایا گیا تھا۔ آپابی سے محلے کے سب ہی بچے قرآن پاک پڑھے تھے۔ اب تو اُن بچوں کے بچے بھی آپابی سے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ پورے محلے میں آپابی کو نہایت عزت و تکریم سے دیکھا جاتا تھا۔ اوران کا ہمیرا بیگم کے گھر قرآن خوانی کے لیے آ جانا ہی ان کے لیے بڑی بات تھی۔

قرآن خوانی کے بعد کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ خواتین کھانے کے بعد اپنے گھروں کو لوٹ چکی تھیں۔ آپابی نے بھی جانے کی اجازت طلب کی تو ہمیرا بیگم کی بڑی بہو، ندا ان کے لیے چائے بنا کر لے آئی۔ ”ارے بیٹا! اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔“ آپابی نے محبت بھرے لہجے میں ندا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپا! آپ تو کبھی کبھار ہمارے گھر آتی ہیں۔ چائے پی کر بتائیں میں نے کیسی چائے بنائی ہے۔“ ندا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ آپابی نے جواباً مسکرا کر چائے کا کپ اٹھالیا۔

اسی دوران ندا کے دونوں بچے صحن میں کرکٹ کھیلنے لگے۔ برآمدے میں موجود سحر کے جہیز کی ڈائننگ ٹیبل جیسے سحر کی جان مٹھی میں لیے تھی۔

وہ بار بار اٹھ کر کمرے سے باہر جاتی اور بچوں کو صحن میں کھیلنے سے منع کرتی۔ بچے چچی کے منع کرنے پر تھوڑی دیر کے لیے رک جاتے اور پھر جیسے ہی سحر واپس کمرے میں آ کر بیٹھتی، وہ دونوں پھر سے کھیلنے لگتے۔ اس سے پہلے کہ ندا غصے میں اٹھ کر کمرے سے باہر جاتی اور بچوں کو کھیلنے سے منع کرتی۔ چائے پیتی آپابی بول اٹھی تھیں۔

”کھیلنا تو بچوں کی فطرت ہے۔ بچوں کو کھیل سے کیسے منع کر سکتی ہو۔“ آپابی نے متانت بھرے لہجے میں کہا۔

”لیکن آپابی! میرے جہیز کی اتنی مہنگی ٹیبل باہر رکھی ہے اور دیکھیں تو سہی۔ ٹیبل شیشے کی ہے ذرا سی بال لگی تو ٹیبل ٹوٹ جائے گی۔“

سحر روہانسی ہو کر بولی۔ ندا خاموشی سے اٹھی اور بچوں کو بازو سے پکڑ کر کمرے میں لے گئی۔

”دیکھو بیٹا!“ اس سے پہلے کہ آپابی سحر سے کچھ کہتیں ہمیرا بیگم درمیان میں بول پڑی تھیں۔

”ایک تو جب سے میری چھوٹی بہو کا سامان آیا ہے، گھر میں چلنا پھرنا عذاب ہو گیا ہے۔ اتنی بار سمجھایا ہے کہ بیٹا، ایسے نہیں ہوتا۔ یہ گھر صرف تمہارا ہی تو نہیں۔ ندا اور اس کے بچوں کا بھی حق ہے۔ لیکن اسے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔“

”آپ کو کیا پتا، میرے جہیز کا سامان کتنا مہنگا ہے اگر آپ لوگوں کے گھر رکھنے کے لیے جگہ نہیں تھی تو آپ میرے ماں باپ کو منع کر دیتے۔ میں تو خود ہر وقت اس سامان کی حفاظت سے تنگ آ گئی ہوں۔ آپابی آپ خود بتائیں، میں کیسے اپنے سامان سے غفلت برتوں۔ میرے ماں باپ نے اتنی محبت اور پیار سے مجھے یہ سامان دیا ہے۔ اب۔ یہ تو آپ لوگوں کی غلطی ہے نا کہ جب گھر میں جگہ نہیں تھی اور ٹرک بھر کے سامان لا رہے تھے اس وقت میرے ماں باپ کو منع کر دیتے۔ کہہ دیتے، بیٹی کو ضرورت کا سامان دیں بس وہی کافی ہے۔ لیکن تب تو سسرال والوں کو اپنے خاندان میں اپنی عزت کی پڑی ہوتی ہے۔ آپابی! یہ سامان نہیں میرے بابا کی خون پسینے کی کمائی ہے۔“

سحر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

ہمیرا بیگم تو شرمندہ ہو کر چپکی ہو بیٹھی تھیں۔ ”ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹا، لیکن یہاں تھوڑی سی غلطی تمہارے ماں باپ کی بھی ہے۔ انہوں نے جب گھر

بار دیکھ لیا تھا تو انہیں اتنا جہیز دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ ضرورت کا سامان دینے کے بعد جو پیسے بچتے، وہ ان پیسوں سے کسی غریب بچی کی شادی کروا سکتے تھے۔ لیکن بیٹا! بات وہی آجاتی ہے اگر سسرال والوں کو اپنی عزت اور نام کی فکر ہوتی ہے۔ تو یہی غلطی ماں باپ بھی کرتے ہیں۔

انہیں بھی بیٹی کے سسرال میں اپنی عزت اور ناک اونچی رکھنے کی فکر ہوتی ہے۔

سامان استعمال کے لیے ہوتا ہے اور خوشی کے لیے بھی۔ میں جب سے آئی ہوں بس یہی دیکھے جا رہی ہوں۔ تمہیں بھی اپنی ایک چیز کی فکر ہے تو بھی دوسری چیز کی۔ تم نے تو شاید سکون سے بیٹھ کر قرآن پاک بھی نہیں پڑھا کہ کہیں محلے کی خواتین کے ساتھ آئے ہوئے بچے تمہاری کسی چیز کو توڑ نہ دیں۔

لیکن بیٹا! میں تمہیں ایک مشورہ دوں۔ چیزوں کو حواس پہ مت سوار کرو۔ شوہر اور اپنے باپ سے پوچھ کر استعمال کی چیزیں رکھنے کے بعد تمہارے پاس جو بھی زیادہ سامان بنتا ہے۔ تم اس میں سے کسی غریب بچی کے جہیز کے لیے دے دو۔

دیکھو بیٹا، رشتے چیزوں سے نہیں بنتے، رشتے محبت احترام اور پیار سے بنتے ہیں۔ جب سے آئی ہوں دیکھ رہی ہوں۔ اپنی چیزوں کی حفاظت کی جھنجھلاہٹ میں تم نے ایک بھی کام ٹھیک اور توجہ سے نہیں کیا۔ یہ چیزیں تمہیں سکون نہیں دے رہیں بلکہ بے سکون کر رہی ہیں تو بہتر ہے کسی کی مدد کر کے ان سے سکون حاصل کرو۔"

آپابی نے مسکرا کر کہا اور چائے کا خالی کپ ٹرے میں رکھ کر کھڑی ہوئیں۔

سمیرا بیگم آپابی کو چھوڑنے کے لیے دروازے تک آئیں۔ اپنے کمرے سے نکلتی ندا بھابھی بھی دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئیں۔

کمرے میں بیٹھی سحر نے ندا بھابھی کی پشت کو دیکھا۔ جو اب آپابی کے جانے کے بعد کمرے سے نکلتے علی کو، واپس کمرے میں جانے کا کہہ رہی تھیں۔ علی کھیلنے کی ضد کر رہا تھا۔

ندا بھابھی کو دیکھتے ہوئے ایک خیال سحر کے ذہن میں آیا۔ رات جب وہ پانی لینے کے لیے اپنے کمرے سے نکلی تھی تو سمیرا بیگم جو رشتے میں ندا کی خالہ بھی لگتی تھیں۔ صحن میں موجود چارپائی پہ بیٹھی باتیں کرنے میں مصروف تھیں۔

فطری تجسس کی وجہ سے سحر دروازے کے پیچھے ہوئی وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کی ساس اور جیٹھانی اس کی برائی کر رہی ہیں۔

"میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا خالہ! شزا کی شادی کی تاریخ تو دے دی ہے لیکن تیاریاں تو ابھی۔" ندا خاموش ہوئی تھی۔

"فکر نہیں کرو، اللہ سب بہتر کرے گا۔" سمیرا بیگم نے بھانجی کو تسلی دی۔

"پتا نہیں خالہ! کیا سب بہتر ہوگا۔ ابو کی جب سے نوکری ختم ہوئی ہے تب سے حالات قابو میں ہی نہیں آ رہے۔ پھر یہ کرونا کے دنوں میں ساری جمع پونجی بھی ختم ہو گئی۔ امی ابو اب دونوں ہی پریشان ہیں۔ شادی کی تاریخ تو دے دی لیکن جہیز کا سامان ممکن نہیں لگ رہا۔" ندا کا لہجہ بھیگ رہا تھا۔

"فکر مت کرو۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ ہو جائے گا کچھ نہ کچھ۔" سمیرا بیگم نے تسلی دی تھی۔

رات کی بات سحر کے ذہن میں گونجی۔ لمحے بھر کے لیے اس نے کچھ سوچا۔ ذہن میں اپنے ایکسٹرا سامان کی لسٹ بنائی اور اٹھ کر اپنے بابا کو فون کرنے کے لیے اپنے کمرے میں آ گئی۔ آخر سامان کے ساتھ ساتھ بیٹی کو عزت سے اپنے گھر کا کرنے کے لیے اور بھی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اور اسے یقین تھا۔ اس کے بابا ندا کی بہن کی شادی میں کچھ نا کچھ حصہ تو ضرور ڈالیں گے۔

سحر کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے کندھوں سے ان دیکھا بوجھ کم ہو گیا ہو۔

اللہ کارساز تھا۔ کیسے سحر کی مشکل کو ندا کی بہن کی زندگی میں، آسانی کے روپ میں داخل کر دیا تھا۔ فون اٹھا لیا گیا تھا۔

اور سحر شزا کے بارے میں بات کرنے مصروف ہو چکی تھی۔

☆☆

نمرہ احمد



مکمل ناول

اس نے وہ نوٹ جیب میں رکھ لیا اور ایک نیا نوٹ اس کی جگہ پر رکھ کے اوپر گملا رکھ دیا۔ پھر پلٹا تو دیکھا۔ پیٹریشیا اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ ٹراؤزرز اور ہڈی میں ملبوس تھا۔ بیک پیک کندھوں پہ پہن رکھا تھا۔ ہلکی بڑھی شیو اور ماتھے پہ بکھرے بال۔ مسکراتے ہوئے اس نے ایک تہہ شدہ نوٹ پیٹریشیا کی طرف بڑھایا اور بنا آواز کے ہونٹ ہلائے۔

(مالا؟)

پیٹریشیا نے مسکرا کے نوٹ پکڑا اور ایک طرف اشارہ کر دیا۔ ماہر نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ سر کو خم دیا اور اس کے بتائے راستے پر چل دیا۔

مال کی رونق ہر روز کے جیسی تھی۔ خوشبوئیں۔ باتوں کی آوازیں۔ روشنیاں۔ اسے چند منٹ لگے تھے مالا کو تلاش کرنے میں۔

اور جب اسے دیکھا تو قدم ایک دم زنجیر ہو گئے۔

دائیں ہاتھ ایک راہداری اندر جا رہی تھی۔ وہ اس کے کونے میں بیٹھی تھی۔ زمین پر۔ سر گھٹنوں پر رکھے وہ رو رہی تھی۔

وہ وہیں رک گیا۔ ساکت۔

اس نے مالا کو ایسے روتے ہوئے کب دیکھا تھا؟ شاید کبھی نہیں۔ وہ ایسے بے بسی سے کبھی اس کے سامنے نہیں روئی تھی۔ وہ سر جھکائے بار بار آنسو صاف کرتی۔ وہ پھر سے ابل پڑتے۔

ایک صفائی والی خاتون اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ جھک کے اس سے پوچھ رہی تھی کہ کیا وہ ٹھیک ہے؟

وہ دھیرے سے پیچھے ہٹ گیا۔ قدم مخالف سمت میں اٹھنے لگے۔

"مالا نے جے پی کے پیسے دینے ہیں۔ صبح جے پی اس سے تقاضا کر رہی تھی۔ شاید اسی لیے وہ اَپ سیٹ ہے۔" وہ اب کافی کاؤنٹر پہ کھڑا تھا اور پیٹریشیا ساتھ کھڑی دھیرے سے بتا رہی تھی۔ وہ خاموشی سے سنتے ہوئے دور فون پہ لگی جے پی کو کاٹ دار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن کہا کچھ نہیں۔

"کتنے پیسے ہیں؟"

پیٹریشیا نے آہستہ سے رقم بتائی۔ وہ چونکا۔

"بس؟"

پیٹریشیا کے تاثرات بدلے۔ ماتھے پر بل آئے۔

وہ جلدی سے سنبھلا۔

"میرا مطلب ہے... یہ تمام رقم ہے یا صرف ایک قسط؟"

لیکن وہ پیٹریشیا کی گڈ بکس سے نکل چکا تھا۔ وہ ناک سکوڑ کے پلٹ گئی۔ وہ مالا کے فرینڈ سے صرف ایک privileged انسان رہ گیا تھا۔ تنخواہ سے تنخواہ تک گزارا کرنے والے دوسرے انسانوں کی طرح پیٹریشیا کو بھی دنیا کے سب سے برے انسان یہ پریویلیجڈ لوگ لگتے تھے۔

وہ کچھ دیر وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ اسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ لیکن وہ ماہر فرید کی مدد کبھی قبول نہیں کرے گی۔ ماہی کے پاس شاید یہ رقم نہ ہو۔ شاید مالا کی اَنا اس سے مانگنا گوارا نہ کرتی ہو۔ ایسے میں وہ اس کے لیے کیا کر سکتا تھا؟

صرف ایک انسان تھا جس کے پاس وہ اس وقت جاتا تھا جب وہ کہیں اور نہیں جا سکتا تھا۔

وہ فون پہ ایک نمبر ملاتے ہوئے کافی شاپ سے دور ہٹ آیا۔

''بولو۔'' مالک فرید کی مصروف سی آواز سنائی دی۔ ''تم نے آخری دفعہ مالا کا حال کب پوچھا تھا؟'' ایک لمحے کے لیے دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔

''اس کے حال کو کیا ہوا؟'' وہ اسی سپاٹ انداز میں گویا ہوئے۔

''تم بتاؤ، مالک! تم اس سے رابطے میں رہتے ہو۔ میرے آفس میں بنا مجھ سے پوچھے اس سے ملتے بھی ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کیسی ہے۔ اسے کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔''

''ہوں۔'' مالک فرید نے ہنکارا ابھرا۔

''ہوں کیا؟''

''اسے کوئی مسئلہ درپیش ہے۔ اور اس نے تمہاری مدد لینے سے انکار کر دیا ہے۔ اس لیے مجھے فون کر رہے ہو۔'' وہ جیسے محظوظ ہوئے تھے۔

''بتاؤ، ماہر... میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟''

وہ چند لمحے کھڑا ہونٹ کاٹتا رہا۔ اسے مالک سے درخواست کرنی تھی۔ اور یہ سب سے مشکل کام تھا۔

''تم اس کو کال کر کے اس سے پوچھ سکتے ہو کہ اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟''

''نہیں۔''

ماہر فرید کے سر پہ لگی، تلووں پہ بجھی۔

''کیوں؟''

''میں بنا مانگے کسی کی مدد نہیں کرتا۔''

اس نے فون کان سے ہٹا کے بے بسی بھرے غصے سے اسے گھورا۔

''تم میرے لیے اتنا نہیں کر سکتے کہ اس کو ایک



کال کرلو؟"

"نہیں۔اسے میری مدد چاہیے ہوگی تو وہ مجھے خود کال کرلے گی۔" پھر انہوں نے قدرے توقف کیا۔

"طلاق مشکل ہوتی ہے۔اس نے اپنی مشکل خود چنی ہے۔اسے اس میں سے خود نکلنے دو مجھے یا تمہیں اس کا مسیحا بننے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تم دنیا کے سب سے بے حس انسان ہو،عبدالمالک فرید۔"

"میں بے حس کے ساتھ خودغرض بھی ہوں۔ کچھ اور کہنا ہے یا میں فون رکھوں؟"

ماہر نے بیزاری سے کال خود ہی کاٹ دی۔اس انسان کو وہ کبھی نہیں سمجھ سکے گا۔

وہ واپس کافی شاپ کے کاؤنٹر کے ساتھ آ کھڑا ہوا تھا جب مالا اس طرف آتی دکھائی دی۔اس کا چہرہ دھلا دھلایا اور سپاٹ تھا۔ایک نظر ماہر پہ ڈالی اور آگے بڑھ گئی۔

"تمہیں کافی چاہیے؟" وہ سر جھکائے اپنی چیزیں درست کرنے لگی۔ کارڈ مشین۔کیلکولیٹر۔ ٹیکس کی دراز۔اس کی ناک ابھی تک سرخ تھی۔

"نو تھینکس۔میں اس کافی چین کی کافی نہیں پیتا۔"

مالا نے نگاہ اٹھا کے اسے دیکھا۔

"میں بھول گئی تھی کہ تم ماہر ہو۔" آواز میں ناپسندیدگی اور طنز تھا۔

"اگر تم لوگ اصرار کرتے ہو تو پی لوں گا۔" وہ کہنیاں کاؤنٹر پر جمائے ڈھٹائی سے مسکرایا۔

"میں بالکل اصرار نہیں کررہی۔"

"جے پی سے کہو۔وہ پلائے گی تمہیں کافی۔"

پیٹریشیا اپنی سیاہ فام قوم کی طرح اونچی آواز میں بولی تھی۔مالا نے چونک کر اسے دیکھا۔وہ ناک پھلائے ایک کپ پر مارکر سے کچھ لکھ رہی تھی۔وہ مسکرادی۔ماہر فرید اس کے ناپسندیدہ افراد کی لسٹ میں شامل ہوچکا تھا۔بہت اچھا ہوا۔

"یہاں کیوں آئے ہو؟" مسکراہٹ دبائے اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔اب وہ قدرے بہتر دکھائی دے رہی تھی۔

"تمہیں کہیں لے کر چلنا ہے۔"

"میں نے چھٹی مانگی تو جے پی مجھے فائر کرکے کسی اور کو ہائر کرلے گی۔" اس کی آواز میں طنز تھا۔

"میں اس سے چھٹی مانگ چکا ہوں۔چلو۔" ابرو سے اشارہ کیا۔وہ چند لمحے بے بسی بھرے افسوس سے اسے دیکھے گئی۔وہ ایسا ہی تھا۔جب کیف جمال بن کے اس کی نوکری کرتا تھا،تب بھی اس کی بات نہیں مانتا تھا۔اپنی منواتا تھا۔

"میں نہیں جانا چاہتی۔"

لیکن ماہر نے مال کی ایگزٹ کو جاتی راہداری کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

مالا نے ایپرن کی گرہ نوچنے والے انداز میں کھینچی۔یہ طے تھا کہ وہ وہاں سے نہیں ہٹے گا۔وہ اپنا سامان سمیٹنے لگی۔

"بائے کشمالہ۔" وہ دونوں ایگزٹ کی طرف جانے لگے تھے جب آواز پہ ماہر چونکا۔

کافی بار کی آخری میز پہ ایک لڑکا بیٹھا تھا۔لیپ ٹاپ سامنے رکھے،کچھ ٹائپ کرتے ہوئے اس نے مسکرا کے کشمالہ کو ہاتھ ہلایا تھا۔اس کی میز پر رکھے کپ کا رخ یوں مڑا ہوا تھا کہ صرف نام کا پہلا حرف بی دکھائی دیتا تھا۔

"بائے۔"

ماہر نے بے اختیار مالا کو دیکھا۔وہ ہلکا سا مسکرا کے اس کو جواباً ہاتھ ہلا رہی تھی۔اس کی مسکراہٹ کچھ مختلف تھی۔کچھ تھا جو اسے غیر آرام دہ کرگیا۔

"یہ کون تھا؟"

وہ راہداری میں اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"تم سے مطلب؟"

"صرف پوچھ رہا ہوں۔ مال میں بیٹھ کے کون کام کرتا ہے۔"

وہ وسط راہداری کے رکی اور سنجیدگی سے اس کی طرف پلٹی۔

"اگر تم میری زندگی میں مداخلت کرو گے تو میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں جا رہی۔"

"تمام... تمام۔" اس نے ہاتھ اٹھا دیے۔ "میں یونہی پوچھ رہا تھا۔"

وہ سر جھٹک کے آگے بڑھ گئی۔ البتہ وہ دیکھ سکتا تھا کہ کچھ تھا جو اس کے انداز میں بدلا تھا۔ جیسے وہ احتراز برت رہی ہو۔ نگاہ چرا رہی ہو۔ اس نے پلٹ کے دیکھا۔ وہ لڑکا اب وہاں نہیں بیٹھا تھا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" پارکنگ میں پہنچتے ہی اس نے پوچھا تھا۔

"اس لڑکی سے ملنے جس کے بارے میں تم ہر ایک سے پوچھتی آئی تھیں۔ سوائے میرے۔"

وہ کار کے دروازے کے ساتھ رک کے ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔ سن گلاسز لگاتے ہوئے وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"سبرینہ۔"

☆☆☆

وہ ایک وسیع و عریض سبزہ زار پر بنی دو منزلہ عمارت تھی۔ لان میں رنگ برنگی سلائیڈز اور دوسرے جھولے نصب تھے۔ اس وقت ان پر مختلف رنگ و نسل کے بچے موجود تھے۔ کوئی سلائیڈ لے رہا تھا۔ کوئی گروہ بنا کے گول گول گھوم رہا تھا۔

عمارت کے عقب میں سرمئی پہاڑوں کی سفید چوٹیاں اور ان پہ اترتی شام کی آخری روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے عمارت کے چھوٹے سے لکڑی کے گیٹ تک آئے۔ باڑ کے پار سے وہ جھولوں پر کھیلتے بچوں کو دیکھ سکتے تھے۔ لیکن وہ انہیں دیکھنے نہیں آئے تھے۔

"تم نے وہی کیا جو تم ہمیشہ کرتے ہو۔"

وہ ماتھے پر گلاسز اٹکائے، خفگی سے کہتی اندر داخل ہو رہی تھی۔ ٹھنڈ بڑھ گئی تھی اور اس نے کوٹ پہن لیا تھا۔ کھلے بال ہوا سے پیچھے کو اڑ رہے تھے اور چہرہ شام کی روشنی میں مزید زرد لگ رہا تھا۔

"تم مجھے سبرینہ کے بارے میں بتا سکتے تھے۔ میں نے تم سے پوچھا تھا۔"

"تم نے مالک سے پوچھا تھا۔"

"اس سے پہلے میں تم سے بھی پوچھنے آئی تھی۔" وہ اسے یاد دلا رہی تھی۔ لاہور کے ہوٹل کا منظر آج بھی نگاہوں کے سامنے تازہ تھا۔ جب وہ بیریل کی مداخلت کے باعث اس سے ملنے آئی تھی۔ جب اس کی ٹانگ زخمی تھی۔

"تم سبرینہ کے بارے میں پوچھنے نہیں آئی تھیں۔ مجھے لاہور سے جانے کے لیے کہنے آئی تھیں تاکہ تم سکون سے زیاد سے شادی کر سکو۔"

وہ عمارت کے دروازے پہ رک گئی۔ پلٹ کے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

"پھر اب کیوں بتا رہے ہو کہ وہ زندہ ہے؟"

ماہر فرید نے ہلکے سے کندھے اچکا دیے۔

"کیونکہ میں تم پہ اعتبار کرتا ہوں۔"

مالا چند لمحے پتلیاں سکوڑے اسے دیکھتی رہی۔ پھر آگے بڑھ گئی۔ وہ سر جھٹک کے پیچھے چلنے لگا۔

وہ کسی اسکول کی عمارت تھی۔ یا شاید ڈے کیئر تھا۔ وہ فیصلہ نہ کر سکی۔ دماغ اس وقت درست طور پہ کام نہیں کر رہا تھا۔

چند قدم کے بعد وہ نامحسوس طریقے سے آگے آ گیا۔ اب وہ اسے راستہ دکھا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سبرینہ انہیں کہاں ملے گی۔

وہ ایک کلاس روم کے قریب رک گئے۔ اس کی ایک دیوار شیشے کی بنی تھی۔ وہ اس کے پار سے اسے دیکھ سکتی تھی۔

وہ بچوں کے ایک گروہ کے وسط میں چھوٹی سی کرسی پر بیٹھی تھی۔ سر جھکائے۔ اونچی پونی ٹیل اور سیاہ آنکھوں والی لڑکی مسکرا کے ایک کتاب پر کچھ لکھ رہی تھی۔ پھر اس نے رک کے سر اٹھایا۔ ان سے کچھ پوچھا۔ وہ سب ایک ساتھ بولنے لگے۔ اس نے مسکرا کے نفی میں سر ہلایا۔ اور تب ہی اس کی نگاہ ان پہ پڑی۔

شیشے کی دیوار کے پار کھڑا ماہر۔ وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے سنجیدہ سا دکھائی دیتا تھا۔ اور اس کے ساتھ سبز آنکھوں اور گہرے بھورے بالوں والی دراز قد لڑکی جو اسے دیکھ رہی تھی۔ بنا پلک جھپکائے۔ اس نے لمبے کوٹ پر کراس باڈی بیگ پہن رکھا تھا۔ چہرہ زرد تھا اور آنکھیں... ان میں بہت کچھ تھا۔

وہ مسکرا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ ان کا انتظار کر رہی تھی۔

"کشمالہ۔" وہ کلاس روم سے نکل کے ان کے سامنے آئی اور ہاتھ بڑھایا۔

مالا نے ہاتھ کوٹ کی جیب سے نہیں نکالا۔ بس پتلیاں سکوڑے اسے دیکھے گئی۔

سبرینہ کی مسکراہٹ پھیکی ہوئی۔ ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

"مالا کو تم سے کچھ پوچھنا ہے۔ میں چاہتا تھا وہ براہ راست پوچھ لے۔" وہ اس کے کندھے کے پیچھے کھڑا تھا۔ سبرینہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ کشمالہ کچھ کہے بنا اسی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

"ماہر کو وہ البم میں نے دیا تھا۔"

وہ باہر رہ گیا۔ اندر نہیں آیا۔ وہ یہاں سے اسے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ صرف سبرینہ کو دیکھ رہی تھی۔

وہ دونوں کمرے میں تنہا تھیں۔ یہ بچوں کا کامن روم تھا۔ ایک طرف دیوار گیر شیشے کی کھڑکی تھی۔ فرش پر قالین بچھا تھا۔ سبرینہ نے جوتے ایک طرف اتار دیے تھے۔ اور آلتی پالتی کر کے کھڑکی کی طرف پشت کیے بیٹھ گئی تھی۔ جیسے یوگا کرنے لگی ہو۔

وہ البتہ نہیں بیٹھی۔ سبرینہ کے مقابل دیوار کے ساتھ کمر ٹکائے کھڑی ہو گئی۔ لانگ بوٹس قالین پر دھرے تھے اور نگاہیں اس لڑکی پہ جمی تھیں۔

وہ چند منٹ بولتی رہی تھی۔ اس کی کہانی۔ وہ وہاں کیسے پہنچی۔ اس پر قاتلانہ حملہ کرنے والا شخص کون تھا۔ اور وہ کیسے اس ملک میں سیٹل ہوئی۔

"میں نے ماہر سے کہا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ وہ نہ ہونے دے جو البم میں موجود دوسری لڑکیوں کے ساتھ ہوا تھا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ وہ تمہاری حفاظت کرے۔"

"کوئی کسی کی حفاظت نہیں کر سکتا۔" وہ تلخ ہوئی۔

سبرینہ نے گہری سانس لی۔ پھر پہلو بدلا۔

"میں کسی زیاد سلطان کو نہیں جانتی۔ نہ وہ کبھی میرا منگیتر رہا ہے۔ لیکن ہاں، جس شخص نے مجھے مارنے کی کوشش کی، پولیس کے پروفائلرز کے مطابق وہ میرے ساتھ آبسیسڈ تھا۔ جیسے وہ ہر اس لڑکی کے ساتھ آبسیسڈ رہا تھا جس کو اس نے قتل کیا تھا۔"

وہ سینے پر بازو لپیٹے، چبھتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھے گئی۔

"میں نے تمہیں کین کلر Cain Killer کا نشان دکھایا ہے۔" سبرینہ نے اپنے بجھے ہوئے ٹیب کی طرف اشارہ کیا جو قالین پر دھرا تھا جس پہ اس نے چند منٹ پہلے مالا کو وہ تمام تصاویر دکھائی تھیں جو اس کے کرائم سین پہ لی گئی تھیں۔ اس نے ٹیب کو چھوئے بنا بس گردن کو خفیف سا ترچھا کر کے انہیں دیکھا تھا۔

"کیا تم نے یہ نشان اپنے شوہر کے آس پاس دیکھا ہے کبھی؟" سبرینہ اب اس کو بغور دیکھتی پوچھ

رہی تھی۔

"نہیں۔" اس نے شانے اچکا دیے۔

"یاد کرو، مالا۔ شاید تم نے..."

"کشمالہ۔ میرا نام کشمالہ ہے۔"

"سوری۔ کشمالہ۔" وہ جھینپ گئی۔ چہرہ سرخ ہوا۔

"میں اس نشان کو نہیں پہچانتی۔" وہ اسی بے نیازی سے کہہ کے دیوار گیر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

باہر لان میں شام ابھی روشن تھی۔ ایک بچی گھاس پر بیٹھی، جھک کے جوگرز کے تسمے بند کر رہی تھی۔

"وہ ایک جادوگر کے لیے قتل کرتا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ یہ نشان اس جادوگر سے تعلق..."

سبرینہ کی آواز پس منظر میں جانے لگی۔ وہ اس قاتل کی پروفائلنگ کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اس کی عادات۔ اس کے خواص۔ مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔ اس کی سبز آنکھیں اس بچی پہ جمی تھیں۔

(کیا جو اس نے کیا وہ درست تھا؟ کیا وہ اپنے عمل کا بوجھ اٹھا سکے گی؟)

سبرینہ اب بھی کچھ کہہ رہی تھی۔ لیکن اسے آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ وہ قدم قدم چلتی کھڑکی کی طرف بڑھنے لگی۔

وہ بچی اب جھک کے دوسرا جوگر پہن رہی تھی۔ اس کے گھنگریالے بال نیچے گرتے گھاس کو چھو رہے تھے۔

مالا کو گالوں پر گرم پانی گرتا محسوس ہوا۔ اسے سبرینہ کی آواز بھی سنائی دی۔ وہ اس سے کچھ پوچھ رہی تھی۔ لیکن اس نے اپنے ہاتھوں کو کھڑکی کی سلائیڈ کھولتے دیکھا۔ کمرے میں گھٹن تھی۔ اسے تازہ ہوا چاہیے تھی۔

"ماہر سے کہو میں اس کا باہر انتظار کر رہی ہوں۔"

بچی تسمہ کس کے سیدھی ہوئی اور دوسرے بچوں کی طرف بھاگ گئی۔ وہ وہیں گھاس پر اکیلی کھڑی رہ گئی۔

سبرینہ کامن روم سے باہر نکلی تو دیکھا۔ وہ راہداری میں دیوار کے ساتھ کھڑا، موبائل پر بٹن دبا رہا تھا۔

"وہ باہر تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

ماہر نے سر کو خم دیا اور موبائل جیب میں ڈالا۔ وہ آگے بڑھنے لگا تھا جب وہ پکار اٹھی۔

"ماہر..."

ماہر نے مڑ کے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ الجھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

"وہ مجھے پسند نہیں کرتی۔"

"ظاہر ہے وہ تمہیں پسند نہیں کرتی۔ تم ایک عرصے تک اس کے لیے ربیکا ڈی ونٹر (ناول کا کردار) تھیں۔" سادگی سے کہہ کے وہ آگے بڑھنے لگا جب وہ بولی۔

"اس پہ اعتبار مت کرو۔ وہ تم سے کچھ چھپا رہی ہے۔"

وہ چونکا۔ پلٹ کے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"کیا؟"

"میں نہیں جانتی۔ بس مجھے ایک... ایک وائب سی آئی ہے۔" وہ جیسے ٹھیک سے بیان نہیں کر پا رہی تھی۔ "وہ کچھ جانتی ہے۔ لیکن بتا نہیں رہی۔"

"وہ کچھ نہیں چھپا رہی۔" وہ جیسے برا مان گیا۔

سبرینہ نے گہری سانس کھینچی۔

"تم اس کو روز کلرڈ گلاسز (رنگین چشمے) سے دیکھتے ہو۔ اس لیے میں زیادہ کچھ نہیں کہوں گی۔ سوائے اس کے کہ..." وہ اس کا راستہ چھوڑ کے ایک طرف ہٹ گئی۔ "کہ اس پہ اعتبار مت کرو۔"

ماہر فرید نے ایک نظر کامن روم کے کھلے دروازے کو دیکھا۔ وہ شیشے کی کھڑکی کے پار لان میں

کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔ ہوا سے بال پیچھے کو اڑ رہے تھے۔ اور نگاہیں ایک درخت پہ جمی تھیں۔

"میں اس پہ خود سے زیادہ بھروسہ کرتا ہوں۔" اس کا انداز قطعی تھا۔ پھر وہ رکا نہیں۔ باہر نکل گیا۔

"میں جانتا ہوں تم اس کو پسند نہیں کرتیں۔" وہ گیٹ عبور کر کے باہر جا رہی تھی جب وہ اس کے برابر آن پہنچا۔ وہ قدرے غائب دماغ لگ رہی تھی۔ جیسے ذہن الجھا ہوا سا ہو۔ اس کی آواز پہ چونکی۔ پھر سر جھٹک دیا۔

"جانتے ہو تو مجھے یہاں کیوں لائے تھے؟" وہ تلخی سے کہتی گزرگاہ پر قدم اٹھانے لگی۔ وہاں دو رویہ درختوں سے گھرا ایک طویل راستہ بنا تھا۔ ایک طرف عمارتیں تھیں۔ اور دوسری طرف سڑک۔ وقفے وقفے سے کوئی کار زن سے ساتھ سے گزرتی۔

"کیونکہ میں تم پہ اعتبار کرتا ہوں۔"

مالا نے جواب نہیں دیا۔ سینے پر بازو لپیٹے آگے بڑھتی گئی۔

"ایک بات پوچھوں؟" کچھ تھا جو اس کے ذہن کے پچھلے خانے میں کھٹکنے لگا۔ سبرینہ کی بات جیسے وہاں اٹک گئی تھی۔

"کیا تم مجھ پہ اعتبار کرتی ہو؟"

"نہیں۔"

ماہر فرید نے گہری سانس لی۔ اسے کشمالہ مبین سے اس سے زیادہ کی توقع کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔

"او کے۔ دوسرا سوال۔ کیا تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو؟"

وہ درختوں کی قطار کے ساتھ رک گئی۔ اور پھر اس کی طرف گھومی۔ اب وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ سکتا تھا۔ کیا وہ بیزار تھی؟

"میں نے تم سے مدد کا وعدہ کیا تھا۔ اعتبار کا نہیں۔ اس لیے میں تمہیں ہر بات بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔"

"اور تم میرا اعتبار کب کرو گی؟" وہ ٹھنڈے پرسکون انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"جس دن تم مجھے خود پہ اعتبار کرنے کی وجہ فراہم کرو گے۔ کیونکہ ابھی تک تم نے مجھے صرف بے اعتباری کی وجوہات تھمائی ہیں۔" جتا کے کہا اور آگے بڑھ گئی۔ اس کا رخ پارکنگ میں کھڑی کار کی جانب تھا۔

"ہمیں کبیرہ کے بیٹے عالیان کو ڈھونڈنا ہے۔"

"کیوں؟" وہ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے ٹھہری۔

"کیونکہ وہی ہے جو ہلال کے ساتھ قید ہوا تھا۔ اور وہی ہے جو اس کی مدد کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے کسی وجہ سے اپنا نام بدل لیا ہو۔" وہ اپنا دروازہ کھول رہا تھا۔ کشمالہ کے چہرے پہ سایہ سا لہرایا۔

"بدر۔" اس نے بنا آواز کے دہرایا۔

"تم نے عالیان کی بچپن کی تصاویر دیکھی ہوں گی۔ کیا اتنے برس بعد اسے دیکھ کے پہچان لو گی؟"

مالا نے بہت سا تھوک نگلا۔

"شاید۔" نگاہیں جھکا کے وہ کار میں بیٹھی۔ سیٹ بیلٹ پہنتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ کپکپا رہے ہیں۔

"آر یو او کے؟" وہ اپنی بیلٹ پہنتے ہوئے بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہاں۔ مجھے واپس جانا ہے۔ بہت کام ہیں۔"

وہ رکھائی سے کہہ کے چہرہ کھڑکی کی طرف موڑ گئی۔ وہ سائیڈ مرر میں اس کا عکس دیکھ سکتا تھا۔ کچھ تھا جو وہاں بدلا تھا۔ وہ تاثر جو مال میں اس لڑکے کو بائے کہتے ہوئے اس نے مالا کے چہرے پہ دیکھا تھا۔ کچھ ایسا جو اس نے پہلے کبھی وہاں نہیں دیکھا تھا۔

(وہ لڑکا کون تھا؟) ذہن نے سوال اٹھایا۔ لیکن ہاتھ خاموشی سے کار اسٹارٹ کرنے لگے۔

(اس پہ اعتبار مت کرو۔ وہ تم سے کچھ چھپا رہی

ہے۔) وہ لب بھینچے ڈرائیو کرتے ہوئے گاہے بگاہے ایک نگاہ اس پہ ڈال لیتا۔ وہ خاموشی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ وہ انسانوں کو بہت اچھے سے کتاب کی طرح پڑھ لیا کرتا تھا۔ لیکن کشمالہ مبین نے سرورق پر جیسے کوئی کاغذ چڑھا لیا تھا۔

کچھ تھا جو ماہر کو کھٹکنے لگا۔

(وہ لڑکا کون تھا؟)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نگینہ بیگم نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔

کمرے میں کوئی ان دیکھی سی دھند پھیلی تھی۔

جیسے سفید سا دھواں ہو۔

یا شاید ان کی آنکھوں کے سامنے کوئی پردہ تھا۔

نیند۔ دواؤں کا خمار۔ تھکان۔

انہوں نے پلکیں جھپکائیں۔

سامنے کاؤچ پر کوئی بیٹھا تھا۔

ایک ہیولہ سا۔

"کون ہے؟" ان کے ہونٹ ہلے۔ شاید عینک نہ پہننے کے باعث منظر نامہ دھندلا تھا۔

وہ کاؤچ پر ایک ہیولے کو دیکھ سکتی تھیں۔ کھلی خاکی شرٹ اور ہم رنگ ٹراؤزر۔ گردن میں لپیٹا اسکارف جس کے دونوں سرے سامنے کو گر رہے تھے۔ اور کھلے بال جو کیچر میں آدھے بندھے تھے۔

وہ ٹانگ پر ٹانگ جمائے وہاں بیٹھی تھی۔ ساتھ ہی دھیرے دھیرے پیر جھلا رہی تھی۔ وہ اس دھند میں بھی کشمالہ مبین کی سبز آنکھیں دیکھ سکتی تھیں۔

"کشمالہ..." ان کے سینے سے ہوک سی نکلی۔

کیا کچھ نہ تھا اس ہوک میں؟

درد۔ ملال۔ ایسا غم جو کبھی مٹ نہیں سکے گا۔

"کیوں کیا آپ نے ایسے بیٹے؟ اپنے بچے کی جان کون لیتا ہے۔"

"میں دو دن سے سوچ رہی ہوں کہ کیا آپ جانتی تھیں؟"

نگینہ بیگم نے تکلیف سے کروٹ بدلنی چاہی۔ ان کے چہرے کا جلا ہوا حصہ اب پھیل کے گردن اور کان کو لپیٹ میں لے چکا تھا۔ زخم کچے تھے اور ان سے بدبو اٹھ رہی تھی۔ ایسی بیماری لگی تھی جو اب تک ڈائیگنوز نہیں ہو پا رہی تھی۔

"وہ بچی بہت قیمتی تھی۔" آنسو ان کی آنکھوں سے پھسلنے لگے۔

"آپ جانتی ہیں۔ ہے نا؟" وہ سوچتی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ پیچھے کو ٹیک لگائے۔ ایک انگلی پر بال لپیٹتی۔ کیا وہ واقعی وہاں تھی یا وہ تصور کر رہی تھیں؟

"کیا؟"

"سبرینہ۔"

نگینہ بیگم نے دھیرے سے آنکھیں بند کیں۔ راستہ ختم ہو چکا تھا۔ آگے بند گلی تھی۔

"وہ ہمیشہ میرے اندر اس کی پرچھائی تلاش کرتا تھا۔" وہ ان کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کھڑکی کے بلائنڈز پہ جمی تھیں جو آدھے کھلے تھے۔ ان کی درزوں میں سے روشنی اندر داخل ہو رہی تھی۔

"وہ مجھے اونچی پونی باندھنے کو کہتا تھا۔ جب میں آنکھوں میں گہرا کاجل لگاتی تو اسے اچھا لگتا۔ ایک دفعہ اس نے کہا کہ میں سیاہ لینز استعمال کروں تو زیادہ اچھی لگوں گی۔ وہ میرے اندر اسے ڈھونڈتا تھا۔"

نگینہ بیگم کی آنکھیں بند تھیں۔ اب ہر طرف اندھیرا تھا۔ صرف مشینوں کی بپ بپ سنائی دے رہی تھی یا اس لڑکی کی آواز۔

"وہ اس سے اتنا آبسیسڈ تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ نہ جانتی ہوں کہ وہ کہاں ہے؟"

وہ خاموش اندھیرے میں لیٹی رہیں۔

"وہ پیپر ورک تبدیل کروا سکتی ہے۔ زیاد کی نگاہ سے چھپ سکتی ہے۔ مسلسل دعائیں اور اذکار پڑھنے سے آپ کے موکلوں کی نگاہوں سے بھی چھپ سکتی ہے۔ لیکن کسی دن تو وہ اذکار بھولی ہو گی۔ اتنے برس

میں کسی ایک دن تو اس نے ناغہ کیا ہوگا۔ اور آپ کے موکلوں نے اسے ڈھونڈ نکالا ہوگا۔"

"ہم اسی دن سے جانتے ہیں جب وہ اس شہر میں شفٹ ہوئی تھی۔" انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ اب منظر پہلے سے واضح تھا۔ انہیں کشمالہ کے چہرے کو دیکھنے کے لیے عینک کی ضرورت نہ تھی۔

"زیاد جانتا ہے؟" ان پہ جمی اس کی آنکھوں میں بے بسی بھرا غصہ تھا۔ نفرت تھی۔ افسوس تھا۔

"وہ جانتا ہوتا تو تم سے شادی کیوں کرتا؟"

کشمالہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ ٹانگ سے ٹانگ ہٹائی اور ہتھیلیوں کو دائیں بائیں رکھے کاؤچ پر آگے کو ہوئی۔

"جب وہ اس کے عشق میں گرفتار تھا تو اس پہ سحر عشق کیوں نہیں کیا؟ میری زندگی کیوں برباد کی؟" وہ دبا دبا سا چلائی تھی۔ آنسو گالوں پر ٹپ ٹپ گرنے لگے تھے۔

"کیونکہ وہ ماں نہیں بن سکتی تھی۔"

وہ ٹھہر کے انہیں دیکھنے لگی۔ پلکیں وہیں ساکت ہوگئیں۔

"واٹ؟"

"ہمارے مددگار... ہمارے دوست... وہ کہتے تھے کہ وہ ماں نہیں بن سکے گی۔ اور ہمیں زیاد کی اولاد چاہیے تھی۔" بستر پر لیٹی نحیف اور لاغر سی بوڑھی عورت دھیمی آواز اور دوٹوک لہجے میں بتا رہی تھی۔

"وہ ایک اسائنمنٹ تھی۔ فہرست میں لکھے لوگوں میں سے ایک نام۔ اس کا زیاد کے لیے مر جانا بہتر تھا۔"

"وہ اس کی محبت میں گرفتار تھا۔"

"اگر اسے سبرینہ سے محبت ہوتی تو اس کو نہ مارتا۔ لیکن سبرینہ کی یاد سبرینہ کے اصل سے بڑی ہوگئی۔ وہ اس کا گلٹ تھی۔ اس کا ضمیر۔"

"اور میں؟" آنسو پھر سے گرنے لگے۔

انہوں نے تکیے پر رکھا بوڑھا چہرہ اس کی طرف موڑا۔ اب ان کی آنکھوں میں صرف ایک ترحم بھرا افسوس تھا۔

"آپ اس کو اولاد دے سکتی تھیں۔ وہ اولاد جسے آپ نے مار دیا، بے وقوف لڑکی۔"

"اور میری ماں؟" وہ بستر کے سرہانے تک آئی۔ بے رونق بال چہرے کے اطراف میں بکھرے تھے۔ اور آنکھیں سرخ پڑ رہی تھیں۔

"میری ماں اس کھیل میں کیا تھی؟"

"وہ ماں... جس کو آپ... چھوڑ کے چلی گئی تھیں؟" وہ کھانسنے لگی تھیں۔ تنفس تیز ہو رہا تھا۔

مالا نے ہتھیلی کی پشت سے گال رگڑے۔

"مجھے خود کو آپ کے سامنے جسٹفائی نہیں کرنا۔ میں کچھ اور پوچھنے آئی ہوں۔"

ان کی کھانسی دھیرے دھیرے مدھم ہونے لگی۔ البتہ وہ اب بھی منہ کھول کے گہرے سانس لے رہی تھیں۔

"کبیرہ کا بیٹا عالیان کہاں ہے؟"

"آہ۔ عالیان۔" ان کے کریلے کے خول جیسے جھریوں زدہ چہرے پر مسکراہٹ اڈ آئی۔

"اس کا نام اب عالیان نہیں ہے۔"

"آپ نے اس کا نام بدل دیا ہے؟ کیوں؟" وہ پتلیاں سکوڑے ان کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس خول تلے چلتی سوچوں کو پڑھنا چاہ رہی ہو۔

"کبھی نہ کبھی آپ جان جاؤ گی۔ لیکن ابھی نہیں۔"

انہوں نے چہرہ دوسری جانب موڑ لیا۔ اب وہ اپنے مانیٹرز کو دیکھ رہی تھیں یا شاید آنکھیں بند کر چکی تھیں۔

"اور ہلال؟" وہ بے چین ہوئی۔ "وہ کہاں ہے؟"

"آپ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتیں۔"

وہ چند لمحے جیسے بے بسی سے انہیں دیکھے گئی۔

"وہ ایک چھوٹی بچی ہے جس کو آپ نے اس کے بھائیوں سے الگ کر دیا ہے۔ آپ کو اس پہ ذرا

ترس نہیں آتا؟"

"تمہیں آیا تھا ترس میری پوتی پہ؟" وہ آنکھیں بند کیے ہوئے تھیں۔

کشمالہ مبین نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ چند لمحے گہرے گہرے سانس لیتی انہیں دیکھتی رہی۔ ان کے سر کے نیچے دو تکیے تھے۔ اس نے اوپری تکیے کو دیکھا۔ پھر ان کے چہرے کو۔ پھر سے تکیے کو۔

اسے ایک چہرہ یاد آیا۔ سبز آنکھوں والا وہ خوبصورت شفاف چہرہ۔ وہ اس کے ساتھ سوئی تھیں۔ اسی کے تکیے پر۔ کروٹ لے کر۔ وہ صبح اٹھی تو وہ نہیں تھیں۔ وہ جا چکی تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ بہت کچھ نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا۔ وہ ان کی وہیل چیئر دھکیل رہی تھی۔ وہ ان کے ہاتھ پر دوا رکھ رہی تھی۔ وہ آپریشن تھیٹر کے باہر کھڑی دائیں بائیں ٹہل رہی تھی۔

اس نے پھر سے تکیے کو دیکھا۔ اور ان کے چہرے کو جو دوسری طرف ڈھلکا تھا۔

"کاش میں آپ سے اپنی ماں کا بدلہ لے سکتی۔"

"لے لو۔ مجھے مرنے سے خوف نہیں آتا۔"

"لیکن مجھے مارنے سے آتا ہے۔" وہ اپنا بیگ اٹھا رہی تھی۔

"اور میں آپ سے کیا بدلہ لوں گی؟ آپ کے حصے کی آگ بہت قریب پہنچ چکی ہے۔"

اب شاید وہ کمرے سے نکل رہی تھی۔ نگینہ بیگم کی پلکیں ایک دوسرے سے جڑی رہیں۔

جب وہ چلی گئی تو انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ کمرہ اب بھی دھندلا تھا۔ لیکن وہ کمرے کو نہیں دیکھ رہی تھیں۔ وہ کچھ اور دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

مالا بیگ کندھے سے لگائے، آنسو صاف کرتی باہر کاریڈور میں آگے بڑھ رہی تھی جب قدم ٹھہر گئے۔ وہ سامنے تھا۔ زیاد سلطان۔

وہ قطار میں لگی لوہے کی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا تھا۔ وہ ایک ہال میں بنا ویٹنگ ایریا تھا۔ بہت سے پودے۔ درمیان میں فوارا۔ چھت شیشے کی تھی اور کئی منزلہ اونچی تھی۔ بالائی منزلوں کی گیلریز یہاں سے دکھائی دیتی تھیں۔

"کشمالہ۔" اسے دور سے آتے دیکھ کے وہ کھڑا ہو گیا۔

وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر رک گئی۔ کچھ تھا جو اس میں بدل گیا تھا۔ وہ کمزور لگ رہا تھا۔ شکستہ سا۔

"کیا ہم بات کر سکتے ہیں؟"

وہ دونوں اب آمنے سامنے کھڑے تھے۔ زیاد کا چہرہ اس سے زیادہ پیلا تھا۔ جیسے روح کو یرقان لگا ہو۔

"کیا بات کرو گے اب؟ اپنی ماں کے جادوؤں کا قصہ سناؤ گے؟ یا اپنے کیے قتلوں کا اعتراف کرو گے؟"

"میری ماں..." زیاد نے تکلیف سے سانس اندر کھینچی۔ "صرف دم کرتی ہے۔ وہ جادو نہیں ہوتا۔"

"کیا تم خود کو ایسے تسلی دیتے ہو؟" مالا کے چہرے پر افسوس بھری مسکراہٹ اتری۔

پھر وہ دھیرے سے ایک کرسی پر بیٹھی۔ بیگ گود میں رکھ لیا۔ وہ دو کرسیاں چھوڑ کے ساتھ بیٹھ گیا۔

چند لمحے وہ دونوں سامنے چلتے فوارے کو دیکھتے رہے۔ اوپر شیشے کی چھت سے آتی سورج کی روشنی پانی کے قطروں پہ قوس قزح بکھیرے ہوئے تھی۔

"کیا تم کچھ دیر کے لیے میری بات سن سکتی ہو؟"

"اب میں تم سے نہیں ڈرتی، زیاد۔ جو کہنا ہے کہو۔"

اس کی آنکھیں پانی کی دھار پہ جمی تھیں۔ وہ ہوا میں اوپر اٹھتی۔ پھر یک دم سے نیچے حوض میں جا گرتی۔ اوپر۔ نیچے۔

"تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟" وہ فوارے کے قدموں میں جمع ہوئے پانی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ نہ کم ہوتا

تھا نہ زیادہ۔

"تم کیا کرتے؟ مجھے روکتے؟" حوض کا پانی اس کی آنکھوں میں بھرنے لگا۔

"مجھے بچے نہیں چاہیے تھے۔" زیاد نے سر جھٹکا۔

"تمہاری ماں کو چاہیے تھے۔ وہ کیا کرتی ہے بچوں کے ساتھ؟" مالا نے چہرہ موڑ کے اسے دیکھا۔

وہ نگاہیں جھکائے فوارے کے حوض کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھ سکتا تھا، یہ طے تھا۔

"میں نے اپنے بچے کو اس لیے مار دیا کیونکہ تمہاری ماں اس کو مجھ سے چھیننا چاہتی تھی۔ اس کا خون تمہاری ماں کے ہاتھ پہ ہے۔" آواز بھیگ گئی اور آنسو گالوں پر لڑھکنے لگے۔

زیاد نے سر دونوں ہاتھوں میں گرا دیا۔

"مجھے کسی بھی قیمت پہ بچہ نہیں چاہیے تھا، کشمالہ۔ تمہیں خود سے باندھنے کے لیے بھی نہیں۔"

اسے اس کی آواز بھی بھیگی ہوئی لگی۔ وہ افسوس سے اس کے جھکے سر کو دیکھے گئی۔

"اور اگر تم اسے رکھنے کا فیصلہ کرتیں، تب بھی میں اس بچے کی زندگی کا حصہ نہ بنتا۔ لیکن..." اس نے گیلی سانس ناک سے اندر کھینچی اور چہرہ اٹھایا تو وہ دیکھ سکتی تھی کہ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

"لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ اسے مارنے کا غم بھی اتنا بڑا ہوگا۔" وہ اب گردن اونچی کیے چھت سے آتی روشنی کو دیکھ رہا تھا۔ اور وہ اس کے چہرے کو۔

"ہلال کہاں ہے؟"

زیاد سلطان نے دھیرے سے چہرہ اس کی طرف واپس موڑا۔

"مجھے نہیں معلوم۔"

اس کی آنکھوں کی نمی اب اندر اتر چکی تھی۔ اور پرسکون سا ماسک چہرے پہ چڑھ چکا تھا۔

"کاش تم میری اتنی عزت کرتے کہ مجھ سے سچ بولتے۔" اس نے افسوس سے سر دائیں بائیں ہلایا۔

"میں نہیں جانتا وہ کہاں ہے۔ اگر میری ماں جانتی ہو تو وہ الگ بات ہے۔" وہ ٹھہرا۔

"جس تکلیف سے تم خود نہیں گزرنا چاہتے، اس سے ہلال کے بھائیوں کو کیوں گزار رہے ہو؟"

زیاد کی نگاہوں میں عجیب سا زخمی پن ابھرا۔

"تم اس کے لیے مجھے چھوڑ رہی ہو۔"

مالا نے گہری سانس لی۔ اس سانس میں افسوس بھی تھا اور ترس بھی۔

"تم کبھی نہیں بدلو گے، زیاد!" اس نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں رگڑیں۔ اور پھر جب اس کی طرف دیکھا تو چہرہ سنجیدہ تھا۔ "میں تمہیں تمہارے لیے چھوڑ رہی ہوں۔ کیونکہ تم اچھے شوہر نہیں تھے۔ تم نے مجھے ابیوز کیا۔ جسمانی، اور ذہنی طور پہ۔ تم نے میری ذات کو ایسے مسخ کیا کہ اب میں ٹوٹ ہو چکی ہوں۔ تم مجھے عزت اور محبت سے ٹریٹ نہیں کر سکے، زیاد۔ کسی تیسرے کو درمیان میں مت لاؤ۔ اپنے عمل کی ذمہ داری لو۔" وہ بیگ کا اسٹریپ کندھے پر ڈالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ جگہ سے نہیں اٹھا۔ گردن اٹھا کے یاسیت سے اسے دیکھا۔

"کیا تم طلاق لینے کے بعد اس سے شادی کرلو گی؟"

مالا چند لمحے اسے دیکھے گئی۔ پہلی دفعہ اسے زیاد سلطان سے نفرت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اسے اس پہ ترس آیا تھا۔

"تم نے مجھے اس قابل نہیں چھوڑا کہ میں کسی بھی دوسرے مرد پہ بھروسہ کر سکوں، زیاد!"

وہ تیزی سے اٹھا۔ اس کے چہرے پہ بہت کچھ ایک ساتھ ابھرا۔ امید۔ بے چارگی۔ خوف۔

"میں کروں گا۔ تم جو کہوگی میں کروں گا۔"

وہ اداسی سے مسکرائی۔

"اب دیر ہو چکی ہے۔"

"کیا تم مجھے اس حالت میں چھوڑ دو گی جب میری ماں مر رہی ہے؟"

"میری ماں یاد ہے؟ وہ بھی مر گئی تھی۔"

زیاد سلطان نے سر جھکا دیا۔ چند لمحے وہ لب کاٹتا رہا۔ اور وہ اس کے جھکے سر کو دیکھے گئی۔ فوارے کا پانی ایسے ہی اوپر سے نیچے گرتا رہا۔

"میں خود کو بدل لوں گا۔" بہت دیر بعد اس نے چہرہ اٹھایا۔ اس پہ امید تھی۔ "میں ہر وہ کام کروں گا جو تم کہو گی۔"

وہ بنا پلکیں جھپکائے اسے دیکھے گئی۔

"تم میرے لیے سب کچھ کرو گے؟"

"سب کچھ۔"

بے بسی۔ بے چینی۔ منت۔ اس کی آواز میں سب تھا۔

"پھر ہلال کو اس کے بھائی کے حوالے کر دو۔" زیاد سلطان کے کندھے ڈھلک گئے۔ چہرہ تاریک ہوتا گیا۔

"تم اب بھی اس کے بارے میں سوچ رہی ہو؟"

"اگر تم چاہتے ہو کہ ہم دوبارہ سے ساتھ زندگی گزاریں تو..." مالا بیگ کو ایک کیدھے سے گزارتے ہوئے دوسرے پر پہن رہی تھی۔ "ہلال کو چھوڑ دو۔ میں واپس آ جاؤں گی۔"

"تم اب بھی اس کا سوچ رہی ہو؟" وہ بے یقینی سے اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔ وہ اب دروازے کی طرف جا رہی تھی۔

"کشمالہ۔" اس نے پکارا لیکن وہ نہیں رکی۔ وہ جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔

"ہلال کو چھوڑ دو۔ میں واپس آ جاؤں گی۔"

اور یہ اسی وقت تھا جب کیف جمال کا میسج اس کے فون پہ موصول ہوا۔ زیاد نے جھنجھلا کے فون دیکھا۔

"مجھے اس ہفتے کی پے منٹ ابھی تک نہیں ملی، زیاد بھائی۔ اس سے بہتر تھا میں ماہر فریدے کے ساتھ ڈیل کر لیتا۔" کیف نے آڈیو میں بہت تلخی سے کہا تھا۔

زیاد سلطان نے جواب نہیں دیا۔ اس نے فون جیب میں ڈال دیا۔

☆☆☆

مالا کے جانے کے بعد انہوں نے آنکھیں کھولیں۔

کمرہ اب بھی دھندلا تھا۔ لیکن وہ کمرے کو نہیں دیکھ رہی تھیں۔ وہ کچھ اور دیکھ رہی تھیں۔

جانے سے پہلے وہ انہیں کس آگ کا ڈراوا دے رہی تھی؟ وہ کس اچھائی اور برائی کی بات کر رہی تھی؟

یہ دنیا نگینہ سلطان کے لیے ہمیشہ سے آگ تھی۔

دھندلے کمرے میں قوس قزح کے سارے رنگ بکھرنے لگے۔ ہر روشن ذرے میں ایک تصویری کہانی پنہاں تھی۔ وہ کمرے میں دائیں بائیں گھومنے لگیں۔ ایک کے بعد ایک منظر۔

وہ ایک زرد سا باورچی خانہ تھا۔ ایک طرف سے کھلا۔ چھوٹی چوکی پر بیٹھی روٹی لگاتی عورت اور چولہے سے نکلتا دھواں۔ وہ وقفے وقفے سے بھوری لکڑیوں کو پنکھے سے ہوا دیتی۔ آتش تیز ہو جاتی۔

قریب میں ایک دبلی پتلی سانولی سی لڑکی بیٹھی تھی۔ گیارہ بارہ برس کی۔ وہ انگاروں کو چولہے کے نیچے سے اڑ کے فضا میں غائب ہوتے دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً روٹی پکاتی عورت اس کی طرف پلٹی۔

"نگینہ... مجھے وہ پرات اٹھا دے۔"

"جی امی..." وہ اٹھ کے باورچی خانے کے اندرونی حصے میں آئی۔ یہاں کھلے دروازے سے برآمدہ دکھائی دیتا تھا۔ طویل برآمدہ جس کے سامنے کوئی جالی نہ تھی۔ ذرا ذرا سے فاصلے پر چارپائیاں اور ان پر دھرے جامنی گاؤ تکیے۔ لڑکی کی نگاہ ان چارپائیوں تک جا پھسلی۔ وہاں تکیے سے ٹیک لگائے، کلف لگے سفید شلوار قمیض میں ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا تھا جس کے سیاہ جوتے چمک رہے تھے۔ وہ ساتھ

بیٹھی گلابی پھول دار لباس والی عورت سے بات کر رہا تھا جس کی کلائی میں سونے کے کنگن تھے۔

دبلی پتلی لڑکی کی آنکھیں اس آدمی کے ہاتھوں پہ ٹھہر گئیں۔ چہرے پہ ہراساں سا تاثر ابھرا۔ ہاتھ میں پکڑی سلور کی پرات اٹھائی تو اپنا عکس نمایاں ہوا۔ گردن کے نیچے نیل کے نشان۔ اور ایسے کئی زخم جو دن کی روشنی میں نہیں لگائے جاتے۔ آنکھیں بھرنے لگیں۔ وہ سر جھکائے پرات لیے پلٹ گئی۔

قوس قزح کے رنگ بدلنے لگے۔ ذرات اڑ اڑ کے ایک دوسری شکل بنانے لگے۔

وہ ایک گدلے پانی کی کچی نہر تھی اور اس پر بنا میلا سا پل۔ وہ پل سے ہٹ کے ایک درخت تلے بیٹھی تھی۔ اس کی چوٹی اب قدرے کمبی اور رنگت سانولی تھی۔ دھوپ سے چہرہ جھلس سا گیا تھا۔ دور سامنے ایک مزار دکھائی دے رہا تھا جس کے ساتھ بنے درخت پر مختلف کپڑوں کی کترنیں بندھی تھیں۔ وہاں ایک کمرے کے باہر قطار لگی تھی۔ وہ یہاں سے بھی دیکھ سکتی تھی کہ اس کی ماں وہاں بیٹھی، آنے والوں کو قطار میں لگا رہی تھی۔

"پیر صاحب سب کا مسئلہ سنیں گے۔ تم اندر جاؤ۔ تم یہیں ٹھہرو۔ نہیں پہلے تم ادھر آؤ..."

وہ باری باری کسی کو اندر بھیجتی۔ کسی سے پیسے لے کر ایک ڈبے میں ڈالتی۔

دبلی پتلی لڑکی سوچتی آنکھوں سے عورتوں کے اس غول کو دیکھ رہی تھی۔

قوس وقزح کے رنگ سرمئی ہونے لگے۔ ایسے جیسے ایک روشن دن پہ سیاہ بادل چھا گئے ہوں۔

وہ ایک کچا مکان تھا جس کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ لالٹین کی روشنی دیوار پر اونچے سائے گرا رہی تھی۔ وہ چت لیٹی کھلی آنکھوں سے چھت کے لینٹر دیکھ رہی تھی۔

ساتھ لیٹی ماں نے کروٹ بدلی۔ اس کی آنکھیں کھلی دیکھ کے ابرو برہمی سے اکٹھے ہوئے۔

"سو جا نگینہ! کیا سوچ رہی ہے؟"

"پیر صاحب کیا کرتے ہیں، امی؟"

"پیر صاحب نہیں کہتے۔ سرکار کہتے ہیں۔" ماں نے گھر کا۔ آواز میں عقیدت در آئی تھی۔

"سرکار کیا کرتے ہیں؟"

"علاج۔ دم۔ تعویذ۔"

"اور تم جو لوگوں کے گھر جاتی ہو، تم کیا کرتی ہو؟"

"مجھے علم آتا ہے۔ لیکن بس اتنا کہ کسی کا مسئلہ حل ہو جائے، چوری کا سراغ مل جائے۔"

"اور سرکار؟"

"ان کے پاس بڑے جنات ہیں۔ وہ سارے مسئلے حل کر سکتے ہیں۔"

"وہ میرا کوئی بھی مسئلہ حل کر دیں گے؟"

"اتنا نہ سوچا کر۔ دماغ کو جنات چڑھ جائیں گے۔ چل سو جا۔" اس نے کروٹ بدل کے آنکھوں پر بازو رکھ لیا لیکن نگینہ کی آنکھیں کھلی تھیں۔

(سرکار کے قبضے میں جنات ہیں۔ وہ جو دکھائی نہیں دیتے۔ وہ جو سب کر سکتے ہیں۔) اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

(وہ جو سمندروں کی تہوں میں چھپے خزانے لا سکتے ہیں۔ وہ جو آسمانوں سے تارے توڑ کے لا سکتے ہیں۔ وہ جو کسی کا دل کسی کے لیے مائل کر سکتے ہیں۔ وہ جو انتقام لے سکتے ہیں۔ وہ جو چوہدریوں کے گھروں کو آگ لگا سکتے ہیں۔)

"مجھے بھی جنات چاہئیں، امی!" وہ بڑبڑائی لیکن ماں نے نہیں سنا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور خراٹے گونج رہے تھے۔ اس کے خراٹوں میں مشین کی بپ بپ گڈمڈ ہونے لگی۔

نگینہ بیگم نے آنکھیں کھولیں۔ قوس وقزح راکھ بن کے ان کے بالوں میں اتر آئی تھی۔ وہ دبلی پتلی لڑکی جانے کب جھریوں زدہ چہرے اور سفید بالوں والی یہ نحیف اور لاغر عورت بن گئی تھی، انہیں

معلوم ہی نہ ہو سکا۔
زندگی جیسے پلک جھپکتے میں گزر گئی تھی۔
انہوں نے بدقت کروٹ لینا چاہی۔ تکلیف سے کراہ نکلی۔
انہوں نے پلکیں بند کیں۔ وہ سونا چاہتی تھیں لیکن نیند کسی الوژن کی طرح تھی۔ وہ تھی اور وہ نہیں تھی۔ کیا وہ سو رہی تھیں؟ کیا وہ جاگ رہی تھیں؟
پلکیں کھولیں تو منظر بدل چکا تھا۔ وہ ہسپتال کا کمرہ نہ تھا۔
وہ ایک دھول اڑاتی لمبی کار تھی جو اونچے کھلے گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ ایک سنہرا دن۔ دھول کا بادل۔ اور وہ دوپٹے کا کونا منہ میں دبائے لڑکی جو دالان میں لگے درخت کے پیچھے سے جھانک رہی تھی۔
دھول کا بادل چھٹا۔ کار کا دروازہ کھلا اور وہ باہر نکلا۔ گورا چٹا۔ لمبا اونچا۔ سن گلاسز لگائے۔
کسی ملازم نے پیچھے سے کسی سے سرگوشی کی۔
"یہ بڑے صاحب کا بھتیجا ہے۔ سلطان۔ دبئی سے آیا ہے۔"
وہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ ساری دنیا بس اس کے سن گلاسز کے شیشے میں قید ہو چکی تھی۔
دھول چھٹنے لگی۔ ہسپتال کے کمرے کی سفیدی واپس آنے لگی۔ اسٹاف اور نرس ان کے اردگرد کھڑے تھے۔ زیاد ان کو سہارا دے کر اٹھا رہا تھا۔ وہیل چیئر سامنے تھی۔ اندرانی ان کو جوتے پہنا رہی تھی۔ وہ انہیں کسی ٹیسٹ کے لیے لے جا رہے تھے۔
بھوری دھول ایک دفعہ پھر چھانے لگی۔
قوس و قزح کے سارے رنگ مزار کے سامنے لگے درخت پر بندھی کترنوں میں اترتے گئے۔ وہ دم توڑتی شام کی ہوا میں جھول رہی تھیں۔ مغرب چھا رہی تھی۔ رش اب چھٹ چکا تھا۔ آج اس کی ماں وہاں نہیں تھی۔ اسی لیے وہ ادھر موجود تھی۔
اندر ہال کمرے میں سرکار اپنے منبر پر براجمان تھے۔ ساتھ ایک مرید بیٹھا بےزار سا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ دوزانو ہوئے ان کے سامنے بیٹھی تھی۔ سیاہ دوپٹہ سر پر لپیٹے، وہ چہرے پہ امید اور بےبسی لیے کہہ رہی تھی۔
"مجھے ایک انسان چاہیے، سرکار۔"
مرید نے خفگی سے کچھ کہنا چاہا لیکن انہوں نے انگوٹھیوں والا ہاتھ اٹھا کے روکا۔ وہ سیاہ لمبے بالوں اور سرمہ لگی آنکھوں والا ہٹا کٹا انسان تھا۔ سر پر نارنجی رومال باندھے، ہاتھ میں تسبیح کے دانے گھماتا، وہ چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"انسان کی قیمت ادا کرنی ہوتی ہے، لڑکی۔"
"جو آپ مانگیں، میں دوں گی۔" اس نے بےاختیار ان کے پیروں پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ اوپر بیٹھے تھے اور وہ نیچے۔
وہ چند لمحے اسے دیکھتے رہے۔ پھر حقے کا گھونٹ بھرا۔ گڑگڑ کی آواز آئی۔ پھر لب کھولے تو بہت سا دھواں ہونٹوں سے نکلا۔
"سحر عشق بہت بھاری جادو ہے۔ کچھ عرصے بعد اترنے لگتا ہے۔ لیکن اس کی قیمت سنگین ہوتی ہے۔"
"میں ادا کروں گی۔"
"ہم سے اپنی روح کا سودا کرو گی؟" ان کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ نگینہ نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔
"جی سرکار۔"
انہوں نے پھر سے ایک کش بھرا۔ حقے کا دھواں بڑھتا گیا یہاں تک کہ وہ سارے منظر پہ چھا گیا۔
جب وہ چھٹا تو انہوں نے خود کو وہیل چیئر پر بیٹھے دیکھا۔ اندرانی اسے دھکیل رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ کچھ بول رہی تھی اور ان کے آگے زیاد چل رہا تھا۔ وہ ہسپتال کا کاریڈور تھا۔ زیاد کے ہاتھ میں چند رپورٹس تھیں۔

انہوں نے آنکھیں بند کرلیں۔ گردن ایک طرف غنودہ سی ڈھلک گئی۔

یہ وہی باورچی خانہ تھا۔ وہ اس کی چوکھٹ میں کھڑی سینے پر بازو لپیٹے برآمدے اور صحن میں اکٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ وسط میں چارپائی پر کفن میں لپٹی لاش رکھی تھی اور وہ سونے کے کنگن والی عورت اس کے سرہانے بیٹھی اونچی آواز میں بین کررہی تھی۔ لاش کے چہرے کا ایک حصہ کفن سے اچھی طرح لپیٹا گیا تھا۔

"بے چارے ملک صاحب۔ باتھ روم میں گیزر پھٹنے سے ہلاک ہوگئے۔"

"آدھا چہرہ جل گیا ان کا۔" دو عورتیں قریب میں کھڑی سرگوشیاں کررہی تھیں۔

"اسی لیے میرا گھر والا گیزر لگوانے کے خلاف ہے۔"

"تم نے سنا نہیں؟ مولوی صاحب کی بیوی کہہ رہی تھی کہ یہ جنات کا کام لگتا ہے۔ ایسے کیسے اچانک سے گیزر..."

سیاہ دوپٹے والی لڑکی مدھم مسکراہٹ کے ساتھ کھڑی، اس منظر نامے کو دیکھے گئی۔ پھر وہ باورچی خانے کی طرف پلٹ گئی۔ دوپٹے کی گرہ سے ایک پڑیا نکالی۔ پسی ہوئی چینی۔ اور ٹرے میں رکھی چائے کی پیالیوں میں سے ایک میں گھول دی۔

کچھ دیر بعد وہ ٹرے لیے مردوں کے ایک گروہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ گورا لمبا سا سلطان وہیں بیٹھا تھا۔ اس نے وہ کپ نکال کے اس کے سامنے کیا۔ سلطان نے کپ تھام لیا اور اسے دیکھے بنا ساتھ والے کزن سے سلسلہ کلام جاری رکھے رہا۔ وہ آگے بڑھ گئی۔

ان کو نیند میں جیسے جھٹکا سا لگا۔ چونک کر آنکھیں کھولیں۔ وہ اب ہسپتال کے بستر پر لیٹی تھیں۔ سفید کمرہ اب بھی دھندلا تھا۔ اور چہرہ۔ اس کی جلن بڑھ گئی تھی۔ یوں جیسے جسم کے ایک طرف کھولتا ہوا لاوا گرادیا گیا ہو۔

یوں جیسے اس پر گرم پانی کا گیزر پھٹ گیا ہو۔

منظر بدل چکا تھا۔

وہ ایک نیم تاریک کمرہ تھا۔ کونے میں ایک چارپائی بچھی تھی۔ اس پر نحیف سا بوڑھا آدمی لیٹا تھا۔ لمبے بال جھڑ گئے تھے۔ اور نارنجی رومال ایک طرف رکھا تھا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا اور آدھا چہرہ مسخ ہوچکا تھا۔ جیسے اسے کوڑھ کھا گیا ہو۔

نگینہ پانی کا ٹھنڈا گلاس ان کی طرف بڑھائے ہوئے تھی۔

"اٹھیں سرکار۔ پانی پئیں۔"

"تیری ماں خوش نہیں ہوتی تیرے یہاں آنے سے۔" بوڑھے مرد نے کپکپاتا ہوا ہاتھ بڑھایا۔ پھر گلاس تھام کے لبوں سے لگایا۔ کچھ اندر گیا۔ کچھ چھلک گیا۔ حلق میں ایسی آگ لگی تھی کہ ٹھنڈا پانی اندر جاتے ہی کھولنے لگتا تھا۔ پیاس تھی کہ بجھتی نہ تھی۔

وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اب وہاں نہ رش تھا نہ مرید۔ وہ ایک ویران مزار تھا جہاں اب کوئی نہیں آتا تھا۔ سب کو معلوم ہوگیا تھا کہ سرکار کو کوڑھ ہوگیا ہے۔ لیکن وہ کوڑھ نہیں تھا۔ وہ کچھ اور تھا۔

"امی اس لیے خوش نہیں ہوتی کہ تمہارا کاروبار بند ہوگیا۔ اب وہ خود پیرنی بنی بیٹھی گاؤں کی عورتوں کا علاج کررہی ہے۔"

اس نے ہونہہ میں سر جھٹکا۔ سرکار نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"تیرا سحر عشق کام کررہا ہے، نگینہ۔ پھر تو ادھر روز کیوں آتی ہے؟"

"سرکار..." وہ مسکرا کے ان کی طرف پلٹی۔

"مجھے وہ سکھا دو جو میری ماں کو نہیں سکھایا۔ جو کسی کو نہیں سکھایا۔"

کوڑھی مرد نے غور سے اس کی آنکھوں میں

دیکھا۔اس کے گلے سڑے چہرے سے بدبو اٹھ رہی تھی لیکن وہ پرواہ کیے بناوہیں کھڑی تھی۔

"وہ سیکھ کے تو کیا کرے گی؟ میرا انجام نہیں دیکھ رہی؟" اس نے آنکھیں بند کیں۔آنسو پسل کے مسخ شدہ چہرے میں جذب ہو گیا۔

"میرا وقت ختم ہونے والا ہے۔تو اس چیز سے دور رہ۔جا کے اپنی زندگی بنا۔"

"میں اپنا انجام اپنی مرضی سے لکھوں گی ،سرکار۔مجھے بس وہ سب دے دو جو تمہارے پاس ہے۔" اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

کمرے کی بتیاں مدھم ہونے لگیں۔انہوں نے پلکیں جھپکائیں۔جسم میں شدید درد اٹھ رہا تھا۔حلق میں انگارے سلگ رہے تھے۔کسی کروٹ سکون نہ تھا۔

قوس وقزح اب کسی منجدھار کی طرح گول گول گھوم رہی تھی۔اور وہ اس کے درمیان کہیں پھنس کے رہ گئی تھیں۔یادوں کا سمندر تھا جوان کے آگے پیچھے دائیں بائیں ہر سمت سے حملہ آور ہوا تھا۔

وہ اونچا لمبا خوبصورت مرد...وہ کسی پروانے کی طرح اس دبلی پتلی سی لڑکی کے گرد پھر رہا تھا۔وہ اس کی کار میں بیٹھی تھی۔اور وہ کھیتوں کے درمیان کچی سڑک پر دور کہیں جا رہے تھے۔

منجدھار کے درمیان سے ایک اور منظر ابھرا۔وہ اپنے ماں باپ کے سامنے ڈٹ کے کھڑا،بلند آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔گھر چھوڑنے کی دھمکی۔خودکشی کی دھمکی۔اس کی ماں سر پکڑے ہوئے تھی۔باپ زور زور سے "نوکرانی کی بیٹی ہے وہ" چلا رہا تھا۔پھر اس منظر پہ سرخ گلابوں کا چھاتا تن گیا۔اور اس سے ایک کمرہ ابھرتا دکھائی دیا۔

وہ سنگھار میز کے سامنے کھڑی تھی۔مسکرا کے آئینے میں دیکھتی بالوں میں برش چلا رہی تھی۔اور اس کے کندھے کے پیچھے کھڑا محبت سے کچھ کہہ رہا تھا۔

نگینہ بیگم نے گیلے منجدھار میں بدقت آنکھیں کھولیں۔مناظر کسی البم کے صفحات کی طرح پلٹتے جا رہے تھے۔

اب وہ دونوں کسی پہاڑی سڑک پر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ہاتھوں میں ہاتھ تھے۔اونچی ہنسی۔کلائی میں گجرا۔

البم نے ایک اور ورق الٹایا۔

وہ رات کو تنہا کمرے میں بیٹھی،آنکھیں بند کیے تسبیح پر کچھ پڑھ رہی تھی۔پھر آنکھیں کھولیں اور پہلو میں کروٹ لیے بے خبر سوتے سلطان پر پھونک ماری۔چہرے پر مسکراہٹ تھی۔آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

پھر دھیرے دھیرے قوس قزح سیاہ سفید سی ہو گئی۔

سارے رنگ ایک ایک کر کے ساتھ چھوڑ گئے۔

بہار میں خزاں کی زردی گھل گئی۔

وہ خوب صورت مرد لاؤنج میں سیدھا چلتا جا رہا تھا۔وہ کچن میں اس کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔وہ مسکرا کے اس کو آواز دینے لگا۔

نگینہ نے بھی مسکرا کے چہرہ موڑا۔لیکن...وہ ایک دم ساکت رہ گیا۔

اس کا چہرہ...اس کی بیوی کا حسین چہرہ...کسی خونخوار کتے کے چہرے جیسا تھا۔

وہ ایک دم زور سے چلایا۔اس چیخ نے ان کی زندگی میں صور پھونک دیا تھا۔قیامت آ چکی تھی۔

جسم کے دائیں حصے میں تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔زیادان کے اوپر لحاف برابر کر رہا تھا۔وہ کروٹ بدلنا چاہتی تھیں۔لیکن کسی کروٹ آرام نہ تھا۔جسم میں درد تھا۔روح میں درد تھا۔

وہ ایک بیڈروم تھا جس کا حلیہ بگڑا ہوا تھا۔سلطان ایک ایک چیز الماری سے نکال کے پھینک رہا تھا۔ساتھ ہی وہ اونچا اونچا چلا رہا تھا۔بستر پر لیٹا ایک ننھا بچہ رو رہا تھا۔

وہ خاموش سی چوکھٹ میں کھڑی تھی۔ بالکل خاموش۔ اور بے تاثر۔ جیسے پتھر کا مجسمہ ہو۔

وہ کپڑوں اور کتابوں کے اندر سے چیزیں نکال نکال اس کے قدموں میں پھینک رہا تھا۔ گڑیا۔ سوئیاں۔ پتلے۔ الو کی کھوپڑی۔ کتے کے دانت۔ سوکھے گوشت کے ٹکڑے۔

سلطان زور سے چلایا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچے اور زمین پر بیٹھتا گیا۔ اب وہ رو رہا تھا۔ کسی بچے کی طرح۔

وہ اسی طرح خاموش کھڑی تھی۔

درد کی ایک لہر گردن میں اٹھی۔

آہ۔ ان کے لبوں سے کراہ نکلی۔ ایک کروٹ بدلی۔ جسم تپ رہا تھا۔

کیا وقت قریب تھا؟ کیا مہلت ختم ہونے کو تھی؟

وہ ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کے دروازے پہ لمبی کار کھڑی تھی۔ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھلا تھا۔ اور سلطان اس لڑکی کو بازو سے کھینچ کے باہر نکال رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک لحاف میں لپٹا بچہ تھا جو مسلسل رو رہا تھا۔

"جادوگرنی ماں کی جادوگرنی بیٹی۔" وہ اسے چوکھٹ تک لایا اور وہیں پٹخ دیا۔ وہ گری نہیں۔ بس دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے روک دیا۔

"میرے ماں باپ ٹھیک کہتے تھے۔ تم اور تمہاری ماں کے تعویذوں نے یہ سب کیا ہے۔" وہ اڑے اڑے بالوں اور کھلے گریبان کے ساتھ چلا رہا تھا۔

وہ بالکل خاموش اور بے تاثر تھی۔ برف کی ہو جیسے۔

اسی وقت دروازہ کھلا اور اس کی پریشان سی ماں باہر نکلی۔ وہ ابھی تک چلا رہا تھا۔ ماں نے ہاتھ جوڑے۔ لیکن وہ بکتا جھکتا آگے بڑھ گیا۔ کار کا انجن اسٹارٹ کیا۔

"اونہوں۔" اس نے ماں کے جڑے ہاتھوں پر ایک ہاتھ رکھ دیا۔ سلطان کی کار دھول اڑاتی دور جا رہی تھی۔

"وہ واپس آئے گا۔ ہم اس کو کھینچ کے واپس لائیں گے۔"

ماں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہم؟ ہم کون؟"

نگینہ نے جواب نہیں دیا۔ وہ بچے کو لیے آگے بڑھ گئی۔

بستر میں جیسے لوہے کے نشتر نکل آئے تھے۔ جس طرف کروٹ لو، وہ جسم میں اترتے جاتے تھے۔

کیا موت کا فرشتہ آن پہنچا تھا؟ یا ابھی کچھ مہلت باقی تھی؟

یادِ ماضی نے ایک نیا ورق الٹا۔

وہ نیا کلف لگا لباس پہنے، دروازے کے باہر کھڑی تھی۔ بچہ گود میں تھا۔ اس کی ماں پریشان سی ساتھ کھڑی تھی۔ وہ کار واپس آ گئی تھی۔ سلطان چپ چاپ باہر نکلا اور فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ اس کے کندھے ڈھلکے ہوئے تھے۔ اور چہرہ گم صم۔

"کہا تھا نا وہ آئے گا۔" اس نے بس مسکرا کے ماں کو دیکھا۔

"تو نے یہ کیسے کیا نگینہ؟" ماں کی آنکھوں میں خوف بھر آیا۔

"سحر عشق اتر جاتا ہے۔ لیکن زبان بندی کا جادو برسوں چلتا ہے ماں۔ کاش تو سرکار سے یہ سیکھ سکتی۔" وہ سرگوشی میں کہہ کے مسکرائی اور آگے بڑھ گئی۔ سلطان کسی معمول کی طرح فرنٹ سیٹ پر بیٹھا کار اسٹارٹ کر رہا تھا۔

وہ بالکل خاموش تھا۔

پھر خاموشی ٹوٹی۔

"میں ساری عمر تم سے نفرت کروں گا۔" کار

سڑک پر ڈالتے ہی وہ بول اٹھا۔
"کرتے رہو۔" وہ مسکرا کے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

سلطان کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ اس نمی میں غصہ تھا۔ نفرت تھی۔ اور مجبوری تھی۔ اسے آنکھیں بند کرنے سے خوف آتا تھا۔ پلک جھپکتا تو وہ آجاتے تھے۔ اس کو ڈرانے۔ اس کو جان سے مارنے۔ وہ اس پہ بوجھ ڈالتے تھے۔ اسے نگینہ کو واپس لانا تھا اپنی زندگی میں۔ وہ بے بس تھا۔

منظر تبدیل ہوتا گیا۔ بچہ اب بڑا ہو چکا تھا۔ وہ ایک میز پر کاپی رکھے ہوم ورک کر رہا تھا۔ ساتھ بیٹھا سلطان ہاتھ میں چھڑی لیے اسے گھور رہا تھا۔ گزرتے وقت نے اس کو بوڑھا کر کے وقت سے پہلے بڈھا دیا تھا۔ رنگت کملا گئی۔ شخصیت ماند پڑ گئی۔ ایک ایک کر کے وہ ہر رشتے سے کٹتا گیا۔ وہ اپنی بیوی کا غلام تھا۔ ایسا غلام جو اس سے نفرت کے باوجود اس کے چنگل سے دور نہیں جا سکتا تھا۔

"تیز لکھو۔ تیز۔" سلطان اس بچے کو دیکھتے ہوئے پھنکارا۔

بچے نے ڈرتے ڈرتے اوپر دیکھا۔ وہ چھڑی بہت قریب تھی۔ اس کا حلق سوکھنے لگا۔ وہ جلدی جلدی کاپی پر پنسل گھسیٹنے لگا۔ کچن سے نکلتی نگینہ بیگم نے خاموشی سے یہ منظر دیکھا اور آگے بڑھ گئیں۔ یہ ان کی پڑھائی کا وقت تھا۔ سرکار کو مرے برسوں گزر چکے تھے اور انہوں نے خود کو سرکار بنا لیا تھا۔ ان کا رخ سیڑھیوں کی جانب تھا۔ نیچے بیسمنٹ میں ان کا کام ان کا منتظر تھا۔

سارے مناظر بجھتے کوئلوں کی طرح ٹھنڈے پڑتے گئے۔ لیکن جسم کے اندر سلگتی آگ بڑھتی جا رہی تھی۔

کیا وقت قریب تھا؟ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

کیا مہلت ختم ہو چکی تھی؟

نہیں۔ انہیں کچھ وقت مزید چاہیے تھا۔
انہیں ایک آخری کام ابھی کرنا تھا۔

☆☆☆

رات سیاہ چادر کی مانند سارے پہ چھائی تھی۔ طویل دو رویہ سڑک کے کنارے بنا وہ ایک گیس اسٹیشن تھا۔ اس شہر میں ڈاؤن ٹاؤن سے دور ہوتے جاؤ تو کمرشل عمارتیں دور دور واقع دکھائی دیتیں۔ ایک منزلہ مخروطی چھت والی شاپس۔ اور ہر شاپ کئی کئی کینال پہ پھیلی ہوتی۔ ہر عمارت کھلی کھلی سی بنی تھی جیسے شمالی امریکہ میں جگہ بہت اور لوگ کم ہوں۔

ایسے میں اس گیس اسٹیشن کے عقبی طرف دو ہیولے سے آمنے سامنے کھڑے تھے۔

"مجھے میرے پیسے وقت پہ نہیں مل رہے، زیاد بھائی۔"

ناخوش سا کیف سامنے کھڑے زیاد سلطان سے کہہ رہا تھا۔

"میرے اکاؤنٹ کا تھوڑا مسئلہ چل رہا ہے ۔ میں خود ایک مفرور کی زندگی گزار رہا ہوں۔ ذرا وقت لگے گا لیکن تین دن تک میں تمہاری تمام اجرت کلیئر کردوں گا۔"

وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے بے نیاز سا کھڑا تھا۔

"اس سے بہتر تھا میں ماہر فرید کے ساتھ ڈیل کر لیتا۔" کیف نے نخوت سے ناک سکوڑی۔ وہ جیسے بے زار تھا۔ زیاد نے بہت ضبط سے سانس اندر کھینچی۔

"کیف۔" وہ دانت پہ دانت جما کے کہنے لگا۔ "تم نے مجھے ماہر فرید کی موجودگی کے بارے میں نہیں بتایا۔ کیوں؟"

"جب پیسے پورے دیں گے تو معلومات بھی پوری ملے گی۔" وہ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ زیاد کے جیبوں میں چھپے ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

"اگر تم ایک آخری کام کردو، تو میں طے شدہ رقم سے دوگنا ادا کروں گا۔"

کیف جمال چونکا۔ زمین کو مسلتا اس کا جوگر رکا۔ آنکھیں چھوٹی ہوئیں۔ سڑک پر تیز بھاگتا ایک ٹرک زن سے ان کے پاس سے گزرا۔ ایک لمحے کے شور اور روشنی کے بعد واپس اندھیرا اور سناٹا چھا گیا۔

"اس آخری کام کے بعد تم آزاد ہو۔ چاہے ماہر فرید سے ڈیل کرو۔ چاہے شیطان سے۔"

کیف جمال بڑھی ہوئی شیو کو مسلتے ہوئے بغور سننے لگا۔

زیاد کے ہونٹوں سے نکلنے والے اگلے الفاظ پہ اس کی آنکھوں میں الجھن ابھری۔

"لیکن کیوں؟" پھر اس نے خود ہی شانے اچکا دیے۔

"خیر... مجھے وجہ نہیں جاننی۔ میں تیار ہوں۔"
کہتے ہوئے اس نے موبائل نکالا۔

رات اب تاریک اور بوجھل تھی۔
بارش سے پہلے کے بادلوں کی طرح۔
ٹوٹے دل کی طرح۔

☆☆☆

اگلا سورج طلوع ہوا تو اپنے ساتھ ایک نیا دن لایا۔ وہ بظاہر ایک عام سا دن تھا۔

اسی عام سے دن کی طرح جو ایک سال پہلے کشمالہ مبین کی زندگی میں آیا تھا۔

وہ دن جس کی صبح ماہر فرید کے کیف جمال بن کے اس کی زندگی میں داخل ہونے سے ہوئی تھی۔ وہ دن جس کی دوپہر اس کا کیریئر ختم ہونے سے ہوئی تھی۔ اور وہ دن جس کی شام زیاد سلطان کی لائی گئی سحر زدہ براؤنیز سے ہوئی تھی۔

ایسے عام سے دن کسی کی بھی زندگی میں بنا چاپ کے داخل ہو جاتے ہیں۔ بھیس بدل کے۔ خود کو چھپا کے۔ اور پھر ایک دم سے ساری زندگی پلٹ دیتے ہیں۔

اس صبح شاپنگ مال کی رونق معمول کے مطابق

اپنے عروج پہ تھی۔ مالا کی کافی شاپ پہ البتہ رش کم تھا۔ وہ سیاہ ایپرن پہنے، سر پر پی کیپ جمائے، سر جھکائے سنک میں گلاس دھو رہی تھی۔ پانی کے چھینٹے اڑ اڑ کے ایپرن کو بھگو رہے تھے۔ ذہن کسی نقطے پہ پھنسا تھا۔ آج کیف بھی نہیں آیا تھا۔ اس کا صبح میں صرف ایک میسج موصول ہوا تھا کہ وہ کچھ دن کام پہ نہیں آسکے گا کیا زیاد نے اسے ایسا کرنے کو کہا تھا؟ مگر کیوں؟

اس کے ارتکاز کو توڑنے والی آواز میسج ٹون کی تھی۔ اس نے گہری سانس لی اور ایپرن کی جیب سے موبائل نکالا۔

وہاں ماہر فرید کا میسج جگمگا رہا تھا۔

''تم سبرینہ سے مل کے خوش نہیں ہوئیں، میں جانتا ہوں۔ حالانکہ اس کا اس سب میں کوئی قصور نہیں ہے۔''

کشمالہ کا چہرہ بے تاثر رہا البتہ انگلیاں تیزی سے ٹائپ کرنے لگیں۔

''میری زندگی میں سبرینہ سے بڑے مسائل ہیں، ماہر بے۔''

چند لمحے کی خاموشی چھا گئی۔ پھر ٹون بجی۔

''مجھے کبیرہ کے بیٹے عالیان کو ڈھونڈنا ہے۔''

مالا کے چہرے پہ غیر آرام دہ سا تاثر ابھرا۔

''میں نہیں جانتی وہ کہاں ہے۔'' اس نے پی کیپ سے نکلتی لٹ کو بے چینی سے کان کے پیچھے اڑسا۔

''تمہیں لگتا ہے وہ اپنا نام بدل چکا ہوگا؟''

(عالیان کا نام اب عالیان نہیں ہے، کشمالہ۔)

''مجھے نہیں معلوم۔''

''وہی ہے جو ہلال کے ساتھ قید ہوا تھا۔ وہ اس کے ساتھ بڑا ہوا ہوگا۔ مجھے ہلال نے اس کا نام بدر بتایا تھا۔''

''شاید۔'' اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ اسکرین دھندلی ہونے لگی۔ وہ اس کو بتا سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جسے وہ تلاش کر رہا ہے، وہ کہاں تھا۔ وہ چند فقروں میں یا ہر فرید کی زندگی کی سب سے بڑی مسٹری کھول سکتی تھی۔ سرکار۔ ہلال۔ بدر۔ لیکن نہیں۔

''میں کبیرہ تائی سے بات کروں گی۔'' جلدی جلدی ٹائپ کر کے بھیجا اور سیدھی ہوئی۔ ایک لڑکی اندر داخل ہوتی دکھائی دی تھی۔ مالا تیزی سے کیش کاؤنٹر کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ اور چہرے پر کینیڈین مسکراہٹ سجالی۔

''گڈ مارننگ۔ آپ کیا لیں گی؟''

''کشمالہ مبین؟'' اس نے جھکتے ہوئے پوچھا۔ وہ چونکی۔ وہ لڑکی کافی فربہ تھی۔ ایک ہاتھ میں چند شاپنگ بیگز تھے۔ دوسرے سے بار بار بال درست کر رہی تھی۔ وہ پریشان تھی۔ اس نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔ کہاں؟

''جی۔ آپ کون؟'' اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی اور ابرو اکٹھے ہو گئے۔

''میں روبی ہوں۔ ہیلو۔'' اس نے بدقت مسکراتے ہوئے ہاتھ بڑھا دیا۔ مالا نے اس کا ہاتھ ملایا۔ وہ موٹا اور بے حد نرم سا ہاتھ تھا۔ کسی بچے کے جیسا۔ اس نے غور سے لڑکی کو دیکھا۔ بھرے بھرے گالوں والا چہرہ، بے حد گھنی مڑی ہوئی پلکیں جو غالباً مصنوعی تھیں۔ نیلا آئی لائنر۔ اور لمبے لمبے مصنوعی ناخن۔

''میں کیف کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ وہ میری کال نہیں اٹھا رہا۔''

اور ایک جھماکے سے اسے یاد آیا۔ یہ وہ لڑکی تھی جس کی شادی کا شوٹ کیف جمال نے کرنا تھا۔ اس روز اس نے اسے کیف کے ساتھ دیکھا تھا۔ کیف نے بتایا تھا کہ یہ اس کی کلائنٹ تھی۔

''میں نہیں جانتی کیف کہاں ہے۔ اس نے مجھے کہا ہے کہ وہ چند دن تک کام پہ نہیں آئے گا۔'' وہ سر جھکا کے فون کھولنے لگی۔ دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ جب اس نے چہرہ اٹھایا تو دیکھا، روبی کی آنکھوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔

"کیف بھاگ گیا ہے نا؟" آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

"میں نہیں جانتی۔ اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔" اس نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے فون ایک طرف رکھ دیا۔ "تم کسی اور کو ہائر کر سکتی ہو؟"

روبی نے جواب نہیں دیا۔ وہ شکستہ قدموں سے چلتی ہوئی قریب رکھی ایک کرسی پر جا بیٹھی۔ سر ہاتھوں میں گرالیا اور ایک دم پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

"سب خراب ہو گیا۔ سب کچھ۔ میری شادی۔ میرا اہم دن۔" وہ بلک بلک کے رو رہی تھی۔

وہ چند لمحے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی اسے دیکھے گئی۔ وہ شادی کے دن کے خراب ہونے پہ کیوں رو رہی تھی؟ شاید وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا شوہر ایک اذیت دینے والا مرد نکلے گا، اور ایک دن اسے ایک باکس کے ساتھ اپنا گھر چھوڑنا پڑے گا۔ اس شادی کا فوٹو شوٹ اسے کیوں کروانا تھا جس کا انجام طلاق ہی تھا۔ یا سمجھوتہ؟

"روبی... روبی۔" اس نے سکون سے ایک گلاس میں برف بھری۔ پھر پانی ڈالا۔ اسٹرا رکھا۔ اور کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر اس کی میز تک آگئی۔ گلاس اس کے سامنے رکھا اور مقابل کرسی کھینچی۔

روبی نے بھیگی پلکیں اٹھا کے اس سیاہ پی کیپ والی لڑکی کو دیکھا۔ اس کا نیلا لائنر پھیل چکا تھا اور ناک گلابی ہو رہی تھی۔

"ہفتے کے دن میری شادی ہے۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"میں اس کو ایڈوانس دے چکی تھی۔ اب میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ کسی دوسرے فوٹو گرافر کو ہائر کروں۔ اور ایک دن کے نوٹس پہ کوئی کام نہیں کرتا یہاں۔ سب بکڈ ہیں۔ بہار کا سارا سیزن بکڈ ہے۔" ٹھنڈے پانی کا ان چھوا گلاس خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی بیرونی سطح پر پسینے کے قطرے گرتے رہے۔ وہ لڑکی اسی طرح روئے جا رہی تھی۔

"میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟"

"اس نے تمہارا نام لیا تھا۔" اس نے بچوں جیسے موٹے ہاتھوں سے گال صاف کیے۔ نیلی لکیریں چہرے پر نہروں کی صورت جمی تھیں۔

"میں اس کی کسی فوٹو گرافی کمپنی کا حصہ نہیں ہوں۔" وہ سکون سے سینے پہ بازو لپیٹے ہوئے تھی۔

"اس نے مجھے رات میں ایک میسج چھوڑا تھا۔ کہ اگر کوئی مسئلہ ہو تو میں تمہارے پاس آؤں۔"

آہ زیاد سلطان۔ اس نے افسوس سے گہری سانس لی۔ اس نے کیف جمال کو غائب ہو جانے کے لیے کہا تھا۔ ایسے کہ وہ اپنے کام کا ملبہ مالا پہ ڈال جائے۔ لیکن وہ اس کے لیے تیار تھی۔ وہ اس دن سے اس کے لیے تیار تھی جب اس نے کیف جمال کو ہائر کیا تھا۔ وہ دوسری دفعہ ایک ہی سوراخ سے نہیں ڈسی جائے گی۔ کیا کیف جمال، کیا زیاد سلطان، اور کیا ماہر فرید۔ یہ تینوں اس کی مشکلات بڑھانے آئے تھے کم کرنے نہیں۔ اور وہ اب ان میں سے کسی کے ہاتھوں میں استعمال نہیں ہو گی۔

"مجھے تم سے ہمدردی ہے، روبی۔ لیکن میں کیف کے لیے لائبل نہیں ہوں۔ میرا اس کے ساتھ ایسا کوئی کانٹریکٹ نہیں ہے جس کے تحت میں تمہاری مدد کر سکوں۔ تمہیں پولیس کے پاس جانا چاہیے یا عدالت میں۔ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔"

"میں کیا کروں؟ میری شادی ہے دو دن بعد۔" وہ پھر سے رو دینے کو تھی۔ اس نے گلاس ابھی تک نہیں چھوا تھا۔

کشمالہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بے بسی سے شانے اچکائے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی، پیچھے سے گزرتی جے پی زیر لب بڑبڑائی۔

"وزن کم کرو۔ اور کیا۔" اس نے پنجابی میں کہا تھا۔ اور روبی ایک سفید فام لڑکی تھی۔ مگر ایک دم وہ تیزی سے کھڑی ہوئی اور زور سے گلاس کو ہاتھ مارا۔ پانی اور برف کے ٹکڑے فرش پر بکھر گئے۔

"تمہیں لگتا ہے یہ اتنا آسان ہوتا ہے؟" وہ

حلق کے بل چلائی۔ آنسوؤں سے بھیگا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

جے پی ایک دم بوکھلا گئی۔

''میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ تم غلط سمجھی ہو۔''

لیکن اس ملک میں ہر انسان کو اپنے احساس کمتری کا ترجمہ ہر اس زبان میں آتا تھا جو یہاں بولی جاتی تھی۔

''وزن کم کرنا آسان نہیں ہوتا۔ تم نے میری زندگی نہیں گزاری۔'' وہ اسی طرح چلا رہی تھی۔

مالا نے ملامتی نظروں سے جے پی کو دیکھا۔ وہ بہت زیادہ گھبرا گئی تھی۔ پھر وہ روبی کے قریب آئی۔ دھیرے سے اس کا ہاتھ تھاما۔

''ریلیکس۔ تم غلط سمجھی ہو۔ وہ کچھ اور کہہ رہی تھی۔'' نرمی سے کہنا چاہا۔ روبی نے زخمی نظریں اس کی طرف موڑیں۔

''میں وزن کم نہیں کر سکی۔ اور میرا فوٹوگرافر بھاگ گیا۔ میں کیا کروں گی؟'' وہ ایک دم رونے لگی۔ مالا چند لمحے اسے روتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر اس کے کندھے پر دباؤ دے کر اسے واپس کرسی پر بٹھایا۔

''تم نے کیف کو مکمل رقم ادا نہیں کی تھی؟'' ساتھ ہی ٹشو اس کی طرف بڑھایا۔ روبی نے چونک کر اسے دیکھا۔

''نہیں۔ ایڈوانس دیا تھا۔'' اس نے ٹشو تھام لیا۔

''اگر تم باقی رقم مجھے ادا کردو تو میں تمہارا فوٹوشوٹ کردوں گی۔''

آنکھ کے کنارے صاف کرتے ہوئے اس کے ہاتھ ٹھہرے۔

''تم فوٹوگرافر ہو؟'' اسے اچنبھا ہوا۔

''نہیں۔ لیکن تمہیں فوٹوگرافر نہیں چاہیے۔ تمہیں کچھ اور چاہیے۔''

''کیا؟''

''سحر۔'' وہ اداسی سے مسکرائی۔ ''ایک الوژن۔''

روبی کی پلکیں جھپکنا بھول گئیں۔ وہ ٹھہر کے اس کے اگلے الفاظ سننے لگی۔

☆☆☆

روبی کے جانے کے بعد کئی گاہک آئے اور گئے۔ یہاں تک کہ اس کی شفٹ کا وقت ختم ہو گیا۔ آج جے پی بھی قدرے ڈھیلی تھی۔ اس نے ایک دفعہ جتاتے ہوئے انداز میں دو دن کی چھٹی مانگی تا کہ وہ روبی کی شادی کا فنکشن کور کر سکے اور جے پی نے بلا تامل اسے چھٹی دے دی۔ اگر روبی شکایت کر دیتی تو معاملہ کہاں جا پہنچتا، جے پی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

''میں کچھ دن میں تمہارے پیسے واپس کر دوں گی۔'' اس نے ایپرن اتارتے ہوئے اسی جتانے والے انداز میں جے پی کو یاد کروایا تھا۔ اس نے محض سر ہلا دیا۔

وہ ٹرنچ کوٹ پہنے، بالوں کو گول مول کر کے کیچر میں لگائے جس وقت شاپ سے نکلی، ماہر فرید سامنے مال کی راہداری میں آتا دکھائی دیا۔

''آج تمہارا باڈی گارڈ نظر نہیں آ رہا؟''

وہ ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش تھا۔ سیاہ پینٹ۔ سفید شرٹ۔ جیبوں میں ہاتھ۔ ماتھے پر بکھرے بال اور بڑھی شیو۔ کیا اس کے پاس پہننے کے لیے ان دو رنگوں کے سوا کچھ نہ تھا؟

''وہ مجھے دھوکہ دے کر بھاگ گیا ہے۔'' مالا نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں سامنے والی شاپ کو دیکھا جہاں کیف جمال بیٹھا کرتا تھا۔

''لیکن اس نے یہ پہلی دفعہ نہیں کیا۔'' اگلا فقرہ اس نے قدرے زور سے کہا تھا۔

ماہر نے جیبوں سے ہاتھ نکال کے اٹھا دیے۔

''میں کیسے بھول گیا تھا کہ ہر بات میں پہلا قصور ماہر فرید کا ہوتا ہے؟''

وہ سر جھٹک کے آگے بڑھ گئی۔ ماہر نے ایک نظر کافی شاپ کے شیلف کو دیکھا۔ شیلڈن کے گملے

تلے کوئی نوٹ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اسے مایوسی ہوئی۔

"اس دفعہ کتنا نقصان کر کے گیا ہے؟"

وہ مال کی راہداری میں آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے آیا۔

"اس کا دیا نقصان میں تول یا گن نہیں سکتی۔"

"ہم اس کو ٹریس کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ وہ ملک سے باہر نہیں گیا ہوگا۔ اس جیسا انسان کینیڈا آ کے یونہی واپس نہیں جاتا۔"

"جب مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی، بتا دوں گی۔"

وہ دونوں ساتھ ساتھ مال کی راہداری میں آگے بڑھ رہے تھے۔ چند لمحے یونہی پھسل گئے۔ اس کی خاموشی پہ وہ جیسے زچ ہو گئی۔

"تم کیا سارے شہر کی کافی شاپس بند ہو گئی تھیں جو یہاں آئے ہو؟"

"زیاد سلطان!"

وہ آگے بڑھ گئی تھی۔ ماہر دو قدم پیچھے تھا۔ اس کے ان الفاظ پہ وہ رک گئی۔

"کیا؟" چونک کر اس کی طرف پلٹی۔

"مجھے زیاد سے ملنا ہے۔" وہ وہیں کھڑا تھا۔ سنجیدہ۔ قطعی انداز۔ وہ فیصلہ کر کے آیا تھا۔

"کیوں؟" اس کا دل زور سے دھڑکا۔

"کیونکہ وہ ہلال کے بارے میں جانتا ہے۔ وہ سرکار کو جانتا ہے۔" وہ قدم قدم چلتا اس کے سامنے آ رکا۔

"ارے ہاں۔ تم اس سے پوچھو گے اور وہ فوراً سب سچ بتا دے گا۔" مالا نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

"پوچھنے پہ سب سچ نہیں بتاتے، جانتا ہوں۔" وہ غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ کیا اسے کوئی شک تھا؟

"میں تمہیں اس کا نمبر بھیج دیتی ہوں۔ جو کرنا ہے کر لو۔ میری زندگی میں اس سے بڑے مسائل ہیں۔" مالا نے چہرہ موڑ لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کی پلکوں کا ارتعاش دیکھ لے۔

"مثلاً؟" وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ اور وہ سامنے ایک چمکتی دمکتی شاپ کی شیشے کی دیوار کو۔

"جانتے ہو ہر وقت کسی کے ریڈار کے نیچے رہنا کتنا مشکل ہوتا ہے؟" شیشے کی دیوار میں بہت سے جوتے سجے تھے۔ ہائی ہیلز۔ اسٹائیلیٹو۔ ایک کچے سیب کے رنگ کی بھی تھی۔ اس کی نگاہیں اس پہ جم گئیں۔

"یہ احساس کہ ہر وقت کوئی آپ کا تعاقب کر رہا ہے۔ آپ کو دیکھ رہا ہے۔"

اس نے جواب نہیں دیا۔ بس غور سے اس کا چہرہ دیکھے گیا۔

وہ مال کی زرد روشنیوں میں مزید زرد دکھائی دیتی تھی۔ کیا وہ بیمار تھی؟ اس کی آنکھوں تلے حلقے تھے۔ چہرہ میک اپ سے پاک تھا اور زخموں کے نشان اب مندمل ہو چکے تھے۔ وہ خوف زدہ نہیں تھی۔ وہ پریشان تھی۔ یا شاید چوکنی۔ وہ فیصلہ نہیں کر سکا۔ سبرینہ درست کہتی تھی۔ وہ جو سارے زمانے کے انسانوں کو پڑھ سکتا تھا، اس لڑکی کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں کا لینس دھندلا جاتا تھا۔

"تم ٹھیک ہو؟" اس نے سنا نہیں کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ اس نے بس وہی سنا جو وہ پوچھ رہا تھا۔

مالا نے دھیرے سے سر جھٹکا۔

"مجھے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔ چلو گے؟"

اگلے چند منٹ خاموشی سے گزرے۔ وہ ایک شاپ میں داخل ہوئی۔ سیدھی ایک ریک تک گئی۔ مطلوبہ شے اٹھائی۔ ایک سفید پیکٹ۔ اور کاؤنٹر تک چلی آئی۔ بل پے کر کے وہ باہر نکل آئی۔ وہ خاموشی سے اس کے بولنے کا انتظار کیے گیا۔

"ونرز" میں داخل ہونے تک وہ نہیں بولی۔ بس ایک کپڑوں کے سیکشن تک آئی۔ وہاں بہت سے ڈریسز ہینگرز سے آویزاں کیے گئے تھے۔ بیسیوں ڈریسز پھنسے پھنسے سے۔ ایک ایک ہینگر نکالنے میں توانائی لگتی۔

"کیا ہوا ہے؟" وہ اسی طرح جیبوں میں ہاتھ

ڈالے کھڑا بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

"کیف غائب ہو گیا ہے۔" وہ ہینگرز الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ وہ مختلف شرٹس اور ٹاپس تھے۔

"تم بتا چکی ہو۔ پھر؟"

"اس نے ایک لڑکی کا اہم دن خراب کر دیا ہے۔ ہفتے کو اس کی شادی ہے۔ وہ اتنی جلدی نیا فوٹو گرافر ارینج نہیں کر سکتی۔"

مالا نے ایک ہینگر نکالا۔ تنقیدی نظروں سے اس پر لٹکا ٹاپ دیکھا۔ پھر واپس لٹکا دیا۔ اور اگلے ہینگرز کھنگالنے لگی۔ وہ اس کے دائیں جانب کھڑا تھا۔ مالا کا نیم رخ اس کے سامنے تھا۔ ماتھے پر بل۔ غصہ۔ بے بسی۔

"پھر؟"

"پھر یہ کہ میں نے اس کا فنکشن کور کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔" وہ گہری سانس لے کر اس کی طرف پلٹی۔

"لیکن تم فوٹو گرافر نہیں ہو۔" وہ چونکا۔

"فوٹو گرافر تو تم بھی نہیں تھے۔" ایک جتاتی نظر اس پہ ڈال کے وہ واپس ریک کی طرف پلٹ گئی۔ ماہر نے گہری سانس لی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ ہر بیس منٹ بعد اس کی ایک غلطی کا طعنہ اس کو نہ دے؟

"تم اس کا فوٹو شوٹ کیوں کرو گی؟ وہ اپنا بندوبست کر لے گی۔ چھوڑو۔"

"مجھے پیسے چاہئیں۔ میں نے جے پی کی رقم ادا کرنی ہے۔"

"پیسے کمانے کے اور طریقے بھی ہوتے ہیں، مالا۔"

اس نے ہینگر نکالتے ہوئے ایک خفا نظر ماہر پہ ڈالی۔

"میرے ابا میرے لیے فرید ہولڈنگ چھوڑ کے نہیں گئے تھے، ماہر بے۔" ہینگر پر آویزاں لباس اونچا اٹھا کے دیکھنے لگی۔ نیلے اور سبز رنگ کا ٹائی اینڈ ڈائی نرم کپڑے کا میکسی ڈریس جس کے گریبان پر قطار میں بڑے بڑے گول بٹن لگے تھے۔

"لیکن تم فوٹو گرافر نہیں ہو۔" اس نے نرمی سے یاد دلایا۔

"اس کو فوٹو گرافی نہیں چاہیے۔ اس کو کچھ اور چاہیے"

"کیا؟"

اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ اب قد آور آئینے کے سامنے کھڑی، اس نیلے سبز لباس کو کندھوں پر رکھ کے دیکھ رہی تھی۔ میکسی کا گھیرا اس کے ٹخنوں کو چھو رہا تھا۔

"یہ لے لوں؟"

وہ چونکا۔ وہ ابھی تک آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ یہ پہلی دفعہ تھا جب اس نے ماہر سے اس کی رائے مانگی تھی۔

"ہوں۔" اس نے کندھے اچکا دیے۔ سیاہ اور سفید کے سوا سارے رنگ ایک جیسے تھے۔ البتہ سرخ ہوتا تو۔ خیر۔ وہ اس کو مزید ناراض نہیں کر سکتا تھا۔

"تمہیں اتنا بڑا رسک نہیں لینا چاہیے۔ وہ لڑکی کوئی بھی فوٹو گرافر ڈھونڈ لے گی۔"

وہ کاؤنٹر پہ پے منٹ کر کے، شاپنگ بیگ لیے اس تک آئی تو وہ پھر سے کہنے لگا۔ مالا نے بس ایک ناراض نظر اس پہ ڈالی۔

"مجھے پیسے چاہئیں۔" اپنی بات دہرائی۔ وہ کچھ کہنے لگا، پھر رک گیا۔

"مگر تمہیں ایک کیمرہ چاہیے ہو گا۔" اس نے جیسے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ زندگی میں کچھ کام بہت مشکل تھے۔ کشمالہ تیمین کو اس کی مرضی کے خلاف کچھ منوانا ان میں سے ایک تھا۔

"صرف کیمرہ نہیں۔"

وہ لباس کو بازو پر فولڈ کیے اس کی طرف پلٹی۔

"مجھے ایک سیکنڈ فوٹو گرافر بھی چاہیے۔"

اس سارے دن میں پہلی دفعہ وہ ہلکا سا مسکرائی تھی۔

ماہر فرید نے مسکرا کے سر کو خم دیا۔

"چلو دو کیمرے رینٹ پر لیتے ہیں۔" اس نے آگے بڑھ کے شاپ کا دروازہ کھولا اور ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ راہداری میں آگے بڑھتی گئی۔

اس کو ہفتے کے دن بہت سے کام کرنے تھے لیکن وہ اپنا شیڈول خالی کر سکتا تھا۔ مالا نے اسے پہلی دفعہ ایک کام کہا تھا۔ وہ اس کو انکار نہیں کر سکتا تھا۔

شاید وہ اس کی غلطی معاف کرنے کو تیار تھی۔ شاید وہ اس پہ اعتبار کرنے کو تیار تھی۔

یا شاید وہ اسے بے وقوف بنا رہی تھی۔ اس کی آنکھ کا عدسہ پھر سے دھندلا رہا تھا۔

☆☆☆

روبی کی شادی کا انتظام کھلی فضا میں ایک سبزہ زار پر کیا گیا تھا۔ دو قطاروں میں کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک سفید پھولوں اور سبز پتوں سے سجا پلیٹ فارم تھا۔ وہاں بہت سی میڈز آف آنر قطار میں کھڑی دلہن کا انتظار کر رہی تھیں۔ مالا ان سے ہٹ کے سبزہ زار پہ کھڑی، منتظر نگاہوں سے داخلی دروازے کو دیکھ رہی تھی جہاں سے مہمان اندر آ رہے تھے۔ کیمرے کا اسٹریپ گردن میں لٹکائے، بالوں کو جوڑے میں باندھے، وہ ہاتھ میں پانی کی بوتل پکڑے ہوئے تھی۔ آج موسم قدرے گرم تھا لیکن یہ وین کوور تھا۔ چند منٹ میں ٹھنڈ ہو سکتی تھی۔

"تم لیٹ ہو۔"

جب وہ دروازے سے اندر آتا دکھائی دیا تو وہ خفا سی بولی۔ اس نے سفید ہڈی پہن رکھی تھی اور کندھوں پر ایک بیک پیک تھا۔ آنکھوں پہ سن گلاسز اور چہرے پہ مسکراہٹ۔

"خوش قسمتی سے میرے باپ نے میرے لیے فرید ہولڈنگ چھوڑی تھی۔ اور مجھے اس کے کام ختم کرتے کرتے وقت لگ جاتا ہے۔"

وہ اس کے عین سامنے آ کے رکا۔ آنکھوں سے گلاسز اتارے۔ دھوپ اب ماہر کی پشت پہ تھی۔

"اوہ ہاں۔ میں کیوں بھول جاتی ہوں کہ تم ایک ویڈنگ فوٹو گرافر نہیں ہو، جس کا نام کیف تھا۔" اس نے اپنے کیمرے کو سیدھا کرتے ہوئے ماہر کی جانب سے رخ موڑ لیا۔ وہ اب بھی دھوپ اور اس کے درمیان کھڑا تھا۔

"تم مجھے اس سب کے لیے معاف نہیں کر سکتیں؟"

ماہر فرید نے گہری سانس لے کر افسوس سے پوچھا تھا۔

"نہیں۔" اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ "روبی ہمارا انتظار کر رہی ہو گی۔"

وہ آگے بڑھ گئی۔ اور تب وہ بولا۔

"آئی ایم سوری۔"

مالا نے پلٹ کے اسے دیکھا۔ اب وہ دھوپ کی طرف تھی اور وہ سائے میں۔ وہ اس کا چہرہ ٹھیک سے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

"کیف جمال بن کے تمہاری زندگی میں آنے کے لیے۔ تمہیں سچ نہ بتانے کے لیے۔ آئی ایم سوری۔"

کشمالہ نے جواب نہیں دیا۔ بس سر ہلا دیا۔ اور آگے بڑھ گئی۔

"مجھے زیاد سے ملنا ہے۔" وہ دونوں سبزہ زار کے دہانے پر بنی عمارت کی طرف بڑھ رہے تھے جب وہ بولا۔

"تمہیں میری اجازت چاہیے؟" وہ جیسے اس موضوع سے احتراز برت رہی تھی۔

"مجھے اس کا نمبر چاہیے۔"

"بھیج دوں گی۔"

"بھیجنا ہوتا تو تم کل بھیج چکی ہوتیں۔ مگر تم نہیں چاہتیں کہ میں اس سے ملوں۔"

"تم اس سے مل کے کیا کرو گے؟" اس نے قلعے نما عمارت کا دروازہ کھولا۔ اندر باہر کی نسبت نیم اندھیرا اور ٹھنڈ تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

لبنیٰ آصف





"امی! کچھ منگوانا ہے تو بتا دیں۔ ابو کی دوائیں لینے جارہا ہوں۔"

"ہاں! احمر بیٹا! میرے موبائل کا کارڈ ختم ہو گیا ہے لیتے آنا۔"

"امی! اتنی جلدی ختم ہو گیا۔ ابھی پچھلے ہفتے تو ڈالا تھا۔"

"ہاں! ختم ہو گیا بیلنس، تمہاری آپیوں کی خیریت لیتی ہوتی ہے۔ خاندان میں بھی خیر خیریت لینی ہوتی ہے۔ جانا تو مشکل ہوتا ہے۔ فون پر ہی پوچھ لیتی ہوں۔"

"امی! ویسے تو آپ کا بہت بیلنس خرچ ہو رہا ہے۔ آپ پیکج کر کے بات کر لیا کریں۔ اس طرح بیلنس بھی کم لگے گا اور آپ بے فکر ہو کر بات بھی کر لیں گی۔"

"پیکج کیسے ہوتا ہے؟"

"امی! پیکج دو گھنٹے کا ہوتا ہے آپ اپنے نیٹ ورک پر دو گھنٹے میں جتنی جگہ فون کرنا ہو کر لیجیے گا۔ دونوں آپیوں کا، خالہ، ماموں سب کا نیٹ ورک آپ والا ہی ہے۔"

"اچھا! پہلے کیوں نہیں بتایا؟" ابھی تو کارڈ لا دو۔ پھر مجھے سمجھا دینا۔ ہفتے میں ایک دن کر کے سب کی خیر خیریت لے لوں گی۔"

پھر احمر نے کارڈ لا کر دیا اور پیکج کا ٹائم اور طریقہ بھی سمجھایا کہ اسٹار اور یہ نمبر دبائیں گی تو تھوڑی دیر بعد میسج میں درخواست موصول ہونے کی اطلاع دی جائے گی۔ پھر دوسرا میسج رقم کٹنے اور ٹائم کا ہوگا۔ بس پھر اگلے دو گھنٹے آرام سے کال کیجیے گا۔

آج سویرے ہی سارا کام جلدی جلدی نمٹایا۔ میاں صاحب صبح سے مصروفیت کا جائزہ لے رہے

تھے۔
"خیریت بیگم! آج صبح سے بڑی تیزی سے کام کررہی ہیں۔ کہیں جانا ہے کیا؟"
"نہیں، آج پیکیج کرکے سب سے بات کروں گی۔ کام پڑا رہتا ہے تو باتوں میں بھی دل نہیں لگتا۔"
"ارے ہم سے باتیں کریں۔ پیکج بھی نہیں کرنا پڑے گا۔"
"کتنی باتیں کروں، سارا دن آپ اور میں ہی تو ہوتے ہیں۔ بیٹا صبح کا گیا شام کو آتا ہے۔ بیٹیاں اپنے گھروں کی ہیں۔"
"کہاں بیگم! سارا دن تو آپ کے کام اور اخبار ہی پیچھا نہیں چھوڑتے۔"
ابھی مزید کہتے کہ گھورنے پر چپ ہو گئے۔
"مردوں کو ریٹائرمنٹ کے بعد بھی کچھ مصروف ہونا چاہیے۔"
"ہاں بھئی! ہمیں تو ساری عمر کام ہی کرتے رہنا چاہیے۔ آرام کرتے برے لگتے ہیں ناں!"

☆☆☆

کام ختم ہوئے تو جلدی سے احمر کے بتائے طریقے سے پیکج کرنا شروع کیا۔ پہلا میسج درخواست موصول ہونے کا ملا۔ دوسرا میسج رقم کٹنے کا۔
"ارے واہ! سات روپے میں دو گھنٹے آرام سے بات کرو۔ یہ تو اچھا ہے۔ چلو پہلے اریبہ کو کرتی ہوں فون۔"
"ہیلو! السلام علیکم امی! کیسی ہیں! میں خیریت سے ہوں۔"
"تمہیں تو فرصت ہی نہیں کہ ماں کا حال پوچھ لو۔"
"کیا کروں امی! گھر کے کام ہی ختم نہیں ہوتے۔ ابھی کچن صاف کر کے فارغ ہوئی ہوں۔ اب کھانا پکانے جارہی ہوں۔ بچے آجائیں گے ڈیڑھ بجے۔"
"آج احمر نے پیکیج کا بتایا تھا، وہی کیا تھا کہ تم سے بات کروں گی۔"
"آج کیوں کرلیا امی! پیکیج۔ آج تو بالکل فرصت نہیں۔"
"جاؤ جاؤ! کھانا پکاؤ! بچے آنے والے ہوں گے۔"
"خدا حافظ۔" اریبہ نے تو تین منٹ میں ہی فارغ کردیا۔
"چلو! شفق کو ملاتی ہوں ایک تو یہ بریسٹ کینسر کی تفصیلات۔ اٹھالے شفق فون! سینے میں درد محسوس ہونے لگا۔ گلٹیاں سی محسوس ہونے لگیں۔"
خیر اللہ اللہ کر کے چھوٹی نے فون اٹھایا۔
"کہاں تھیں! بھئی؟"
"اماں چھوٹے کا ڈائپر بدل رہی تھی۔ ہاتھ گندے تھے۔"
"دھو لیے ہاتھ! بدل لیا ڈائپر۔"
"جی جی امی!"
"کیا حال ہیں۔ میاں بچے سب کیسے ہیں؟"
"ارے کیا بتاؤں امی! پوری رات منے نے سونے نہیں دیا ہے۔ پوری رات وقفے وقفے سے موشن کرتا رہا ہے۔ صبح سے بھی مستقل روئے جارہا ہے۔ ڈاکٹر نے ہر تھوڑی دیر بعد او آر ایس دینے بولا ہے کہ پانی کی کمی نہ ہوجائے۔
سارا کام پڑا ہوا ہے۔ ساگودانہ بولا ہے ڈاکٹر نے دینے کے لیے وہی پکانے جارہی تھی۔"
"جاؤ! بھئی پکاؤ۔ ٹھیک ہے — اللہ حافظ۔"
دو گھنٹے۔ یہاں تو دونوں بیٹیوں نے دو، دو منٹ میں ہی فارغ کردیا۔
"ارے آپا کو کرتی ہوں۔ بڑے دن ہو گئے۔ سلام آپا! ہاں وعلیکم السلام۔"
"کیسی ہو رضوانہ۔"
"میں تو ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں آپا!"
"میں تو ٹھیک نہیں ہوں۔ گھٹنوں کا درد اتنا بڑھ

گیا ہے۔ کل لے کر آئی تھی دوا۔ ڈاکٹر نے آرام کرنے کا کہا ہے۔ مگر میری جان کو سکون کہاں۔ شام میں منزہ کو دیکھنے کچھ لوگ آنے والے ہیں۔ ماسی نے بھی چھٹی کر لی ہے۔ بہو میکے گئی ہوئی ہے۔ آخری دن چل رہے ہیں۔ ڈاکٹر کے ہاں جانا تھا۔ اپنی امی کے ساتھ جائے گی۔ میرے تو گھٹنوں میں درد اتنا ہے کہ گھر میں چل لو، وہی بہت ہے۔ منزہ یونیورسٹی گئی ہے۔ آج آخری سمسٹر کا دوسرا پیپر ہے۔

''سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کہاں سے کام شروع کروں۔ فکر سے سانس لینا بھی محال لگ رہا ہے۔''

''جائیں آپا! آپ کام دیکھ لیں۔''

''ہاں بھئی مہمانوں کو بھی پانچ بجے کا ٹائم دیا ہے۔''

''چلیں ٹھیک ہے آپا۔ خدا حافظ اپنا خیال رکھیے گا۔''

''آج تو ایسا لگتا ہے سب مصروف ہیں۔ آئے ہائے ابھی تو ایک گھنٹہ چالیس منٹ باقی ہیں۔ اب کس کو کروں۔ ارے بھائی صاحب کو کرتی ہوں۔ بھائی سے تو بات کیے کافی ٹائم ہو گیا۔ ہے بھی نیٹ ورک میرا والا۔''

''سلام بھائی!''

''کون رضوانہ؟ کیسے یاد کر لیا آج۔ سورج کہاں سے نکلا ہے آج؟ تم نے کیسے کر لیا آج فون! تم تو کبھی کرتی نہیں ہو فون۔''

دل میں تو آیا کہہ دیں۔

اور آپ کون سا بہن کی خیریت پوچھتے ہیں۔ فون کر لیا تو گلے باتیں سنانے۔ سوچا لیکن کہا پھر نہیں۔

''بس بھائی! یاد آ رہے تھے آج بہت۔ آنا تو مشکل ہے، سوچا فون کر لوں۔''

''ہاں، اچھا کیا، گھر میں سب خیریت ہے ناں؟''

''جی جی۔ سب خیریت ہے۔''

''چلو رکھتا ہوں فون۔ آج آنکھوں کے ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ ہے۔ ابھی نکلوں گا تو وقت سے پہنچوں گا۔ کراچی کا ٹریفک پتا تو ہے تمہیں۔''

''جی جی! بھائی جائیں آپ۔ اللہ نگہبان۔''

ایک بار پھر ذلت مقدر بنی۔

''بھاڑ میں جائیں منٹ! کوئی منہ لگا نہیں رہا۔ سات روپے میں ایسے لگ رہا ہے۔ ذلت خرید لی ہے۔ مگر اب ذلیل ہونے کی طاقت بھی ختم ہو گئی۔'' منہ لپیٹ کر پڑ گئیں۔ ''سب ہی مصروف ہیں! بس ہم ہی فارغ بیٹھے ہیں۔''

''کیا ہوا بیگم!''

''کچھ نہیں سات روپے میں جی بھر کر ذلیل ہو گئے۔ کسی نے منہ نہیں لگایا۔ سب مصروف ہیں۔ آنے دو اس احمر کے بچے کو۔ پیکج کر لیں۔ بڑی بچت ہو گی۔ ماں کو ذلیل کروا دیا۔''

''ارے اس بچارے کا کیا قصور! وہ تو تمہاری ہی بھلائی میں کہہ رہا تھا۔ ویسے مان لیں بیگم! سب جگہ سے ہار کر آپ ہماری طرف ہی آتی ہیں۔ ایک ہم ہی ہیں بچارے آپ کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ مگر آپ ہمیں لفٹ ہی نہیں کرواتیں۔''

''ارے بھئی، کتنی کرواؤں لفٹ۔ صبح ناشتہ بنا کر دیا۔ کھانا پسند کا بتایا ہے۔ چلتے پھرتے آپ سے ہی تو بات کرتی ہوں۔ پھر بھی آپ کی شکایتیں ہی ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں۔ اب کیا ہیروئن بن جاؤں۔ گانا گاؤں آپ کے لیے۔ دیوار میں چن جاؤں انار کلی کی طرح تب مانیں گے آپ!''

''ویسے آئیڈیا برا نہیں ہے بیگم!''

میاں بیوی کی ہنسی ایک ساتھ کمرے میں گونجی تھی۔

ثابت ہوا ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی تنہائی کے ساتھی ہیں۔

☆☆



ہاتھ خالی ہیں ترے شہر سے جاتے جاتے
جان ہوتی تو مری جاں لٹاتے جاتے

اب تو ہر ہاتھ کا پتھر ہمیں پہچانتا ہے
عمر گزری ہے ترے شہر میں آتے جاتے

اب کے مایوس ہوا یاروں کو رخصت کر کے
جا رہے تھے تو کوئی زخم لگاتے جاتے

رینگنے کی بھی اجازت نہیں ہم کو ورنہ
ہم جدھر جاتے نئے پھول کھلاتے جاتے

میں تو جلتے ہوئے صحراؤں کا اک پتھر تھا
تم تو دریا تھے مری پیاس بجھاتے جاتے

مجھ کو رونے کا سلیقہ بھی نہیں ہے شاید
لوگ ہنستے ہیں مجھے دیکھ کے آتے جاتے

ہم سے پہلے بھی مسافر کئی گزرے ہوں گے
کم سے کم راہ کے پتھر تو ہٹاتے جاتے

راحت اندوری

شام ہو اگر

بچھڑنا ہی اگر لکھا ہے قسمت میں
تو اس میں دیر کاہے کی
چلو اس پل، اسی لمحے بچھڑتے ہیں
ابھی تم آنکھ جھپکو گے
ابھی میں ہاتھ اپنے دل پہ رکھوں گی
ابھی تم مجھ سے کہہ دو گے
جدا ہیں راستے اپنے
مگر تم حوصلہ رکھنا
بچھڑنا ہی اگر لکھا ہے قسمت میں
تو اس میں دیر کاہے کی
چلو اس پل، اسی لمحے بچھڑتے ہیں

فاخرہ بتول

جنتر منتر، دھاگے شاگے، جادو ٹونے والوں نے
تیری خاطر کیا کیا سیکھا، تجھ کو کھونے والوں نے

ایک طلسمی سرگوشی پر میں نے مڑ کر دیکھا تھا
مجھ کو پتھر ہوتے دیکھا پتھر ہونے والوں نے

اچھے کی امید پہ کتنے مشکل دن کٹ جاتے ہیں
خواب محل کے دیکھے اکثر خاک پہ سونے والوں نے

کتنی ماؤں نے بچوں کو باتوں میں اُلجھایا تھا
گلیوں میں آوازیں دیں جس وقت کھلونے والوں نے

ایک طرف تو یادیں تھیں اور ایک طرف دیوان میر
دیکھ فضا افسردہ کر دی کرب سے رونے والوں نے

اسم یار کا ورد وظیفہ کر کے وقت گزارا ہے
تسبیح ایک بنا دی تیری یاد پرونے والوں نے

کومل جوئیہ

سر بہر حال جھکا، ہم نے قناعت کی تھی
اک تری بار ہی بس رب سے شکایت کی تھی

اس قدر سخت سزا بھی تو نہیں بنتی تھی
ہم نے بچپن سے نکلنے کی شرارت کی تھی

ہوش والوں کی نہ باتوں میں ہم آئے کبھی
ورنہ ہر اک نے سنبھلنے کی ہدایت کی تھی

معتبر تھے کبھی دنیا کی نظر میں ہم بھی
پھر ہوا یوں کہ مری تم نے حمایت کی تھی

ہم نے مانا کہ چلو مرکزی مجرم ہم ہیں!
پھر بھی دونوں تم نے بھی ہم سے محبت کی تھی

بے وفاؤں سے وفا خبط ہے لاحاصل سا
ہمیں معلوم تھا پھر بھی حماقت کی تھی

نفع نقصان کی باتیں نہیں جچتیں ہم کو
ہم نے کب یار ترے ساتھ تجارت کی تھی

کیوں زبانوں پہ فقط نام ترا ہے ابرک
تم سے پہلے بھی تو کتنوں نے بغاوت کی تھی

اتباف ابرک

شگفتہ جاہ



نیک اولاد

میت کے لیے زندوں کی طرف سے نفع بخش چیز اس کے لیے دعائے استغفار کرنا ہے۔ جس طرح زندہ انسان کھانے پینے کے محتاج ہوتے ہیں، اسی طرح مردے دعا کے انتہائی محتاج ہوتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''اللہ عزوجل جنت میں نیک آدمی کا درجہ بلند فرمائے گا تو آدمی عرض کرے گا۔ ''یا اللہ یہ درجہ مجھے کیسے حاصل ہوا؟'' اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ ''تیرے بیٹے نے تیرے لیے استغفار کیا تھا۔''

(مسند احمد)

اس کے علاوہ نیک اولاد کے اعمال کا ثواب بھی بغیر نیت کے والدین کو پہنچتا رہتا ہے۔

اولاد کو قرآن وسنت کا تابع بنا کر مرنے والا قیامت تک اس کی کمائی کو وصول کرتا رہے گا۔

صحابہ کرام کو برا کہنا

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو میرے صحابہؓ کو برا کہے گا اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہوگی۔''

نصیحت

اگر کسی ملازم کو برطرف کرنے کی ضرورت پیش آئے تو یہ بات اچھی طرح سوچ سمجھ لینی چاہیے کہ ملازمین کو برطرف کرنا بچوں کا کھیل نہیں۔

(ارسطو کی سکندر اعظم کو نصیحت)

اچھا منصف

جج کے لیے چار باتیں لازمی ہیں۔

(1) غور سے سنے

(2) عقل مندی سے جواب دے

(3) سنجیدگی سے سوچے

(4) غیر جانب داری سے فیصلہ سنائے

بیماری

ارشد میاں اسکول لیٹ پہنچے تو ان کی ٹیچر نے وجہ پوچھی۔ ارشد میاں بولے۔

''امی بیمار تھیں۔ انہیں ہاسپٹل لے جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ مجھے اپنا ناشتا خود بنانا پڑا۔ اس لیے دیر ہوگئی۔'' ٹیچر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے بولیں۔

''تمہاری امی کو کہیں چھوت کی بیماری نہ ہو۔ تمہاری وجہ سے یہ بیماری ہمیں بھی لگ سکتی ہے۔ فوراً گھر جاؤ اور کل اس بیماری کے بارے میں اچھی طرح پوچھ کر کلاس میں آنا۔''

دوسرے روز ارشد میاں نے کلاس میں آکر بتایا۔

''امی کہہ رہی تھیں اگر آپ شادی شدہ نہیں ہیں تو یہ بیماری آپ کو نہیں لگ سکتی کیونکہ میرا چھوٹا بھائی پیدا ہوا ہے۔''

ترکی ڈرامہ سیریلز دیکھنے کی شوقین

''انوشہ: مبارک ہو زوبی پوتے کی، کیا نام رکھا ہے؟''

زوبی: ''باریفائزان!''

انوشہ: ''ارے اس کا کیا مطلب ہے، بہن؟''

زوبی: ''اے بی بی! اس کا مطلب ہے ڈوبتے سورج کے وقت حیران و پریشان ہدہد کی کھانسی۔ اچھا بہن تمہارے گھر بھی خیر سے پوتی آئی ہے، کیا نام رکھا ہے اس کا۔''

انوشہ: ارتاناش!

زوبی: (ذرا، چلبلا کر) ''ارتاناش اس کا کیا مطلب ہوا بھلا؟''

انوشہ: ''اس کا مطلب ہے خوبانی کے خشک

پتوں کی وہ آواز جنہیں شام کے وقت بکری کا چھوٹا سا بچہ منہ مار رہا ہے۔"

بڑھاپا

سبحان صاحب کو پورے پچاس برس بعد اپنا کلاس فیلو اچانک بازار میں نظر آیا تو وہ بڑے جوش سے اس کی جانب لپکے۔
"ارے مشتاق! تم تو بالکل بوڑھے ہو گئے ہو۔"
مشتاق صاحب نے آنکھیں چندھیاتے کہا۔
"معاف کرنا باباجی! میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

قابل دید

خاتون نے ایمرجنسی نمبر پر ایمبولینس کو فون کیا۔
آپریٹر نے فون ریسیو کرتے ہوئے کہا۔"یس پلیز"
خاتون نے کہا۔"میرے پاؤں کی انگلی چائے کی میز سے ٹکرا گئی ہے۔"
آپریٹر ہنستے ہوئے بولا:"اور اس کے لیے آپ ایمبولینس بلانا چاہتی ہیں؟"
خاتون نے کہا:"نہیں ایمبولینس ،تو میرے شوہر کے لیے۔انہیں ہنسنا تو نہیں چاہیے تھا نا۔"

دشمن سے سلوک

خلیفہ منصور کا قول ہے
جب دشمن تیری طرف ہاتھ بڑھائے تو اگر تجھ میں طاقت ہے تو اس ہاتھ کو کاٹ ڈال ورنہ اسے چوم لے۔

شعر

دشت وفا میں پیاس کا عالم عجیب تھا
دیکھا تو ایک درد کا دریا قریب تھا

جھوٹی دنیا

جھوٹی دنیا میں ووٹ مانگنے والا سچا آدمی ناکام ہو جائے گا اور برے آدمی کو ووٹ دینے والا بھی برائی میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔

(واصف علی واصف)

بانو قدسیہ کہتی ہیں

خوف دراصل خواہش سے جنم لینے والی کیفیت ہے جو لوگ دنیا کے پیچھے بھاگتے ہیں،وہ خوف زدہ رہتے ہیں۔
(مرد ابریشم سے اقتباس)

محبت اور غم

"محبت اور غم سے اداسی ضرور پیدا ہو گی وہ محبت ہی نہیں جو اداس نہ کر دے۔"

(اشفاق احمد)

زرد موسم

محبت جب کسی دل میں گھر کر جائے تو وہاں زرد موسم بسیرا کر لیتا ہے۔یک طرفہ محبت تو اور بھی ستم ڈھاتی ہے خصوصاً لڑکیوں پر جو اظہار نہیں کر سکتی ہیں چپ چاپ سلگتی رہتی ہیں۔

اقوال زریں

☆بہادر: مقابلے کے وقت آزمایا جاتا ہے
☆مستقل مزاج: مصیبت کے وقت آزمایا جاتا ہے۔
☆امانت دار: مفلسی کے وقت آزمایا جاتا ہے
☆عورت کی محبت : فاقہ کے وقت آزمایا جاتا ہے۔
☆بردبار: غصہ کے وقت آزمایا جاتا ہے۔
☆شریف: معاملہ ٹوٹنے کے وقت آزمایا جاتا ہے۔

نہ جانے

برباد جس کو تو نے پرکھنے میں کر دیا
لمحہ وہ آزمائش حسن نظر کا تھا
جانے وہ کوئی موڑ کہاں پر ہے مڑ گیا
زاہد وگرنہ راستہ میرے ہی گھر کا تھا

☆☆

امت الصبور

خاتون کی ڈائری

روحیلہ خان کی ڈائری سے

میری ڈائری میں لکھی پروین شاکر کی یہ غزل مجھے بہت پسند ہے۔ آپ کو بھی یقیناً پسند آئے گی۔

گلاب ہاتھ میں ہو، آنکھ میں ستارہ ہو
کوئی وجود محبت کا استعارہ ہو

میں گہرے پانی کی اس رو کے ساتھ بہتی رہوں
جزیرہ ہو کہ مقابل کوئی کنارہ ہو

کبھی کبھار اسے دیکھ لیں، کہیں مل لیں
یہ کب کہا تھا کہ وہ خوش بدن ہمارا ہو

قصور ہو تو ہمارے حساب میں لکھ جائے
محبتوں میں جو احسان ہو! تمہارا ہو

یہ اتنی رات گئے کون دستکیں دے گا
کہیں ہوا کا ہی اس نے نہ روپ دھارا ہو

افق تو کیا ہے، در کہکشاں بھی چھو آئیں
مسافروں کو اگر چاند کا اشارہ ہو

میں اپنے حصے کے سکھ جس کے نام کر ڈالوں
کوئی تو ہو جو مجھے اس طرح کا پیارا ہو

اگر وجود میں آہنگ ہے تو وصل بھی ہے
میں چاہے نظم کا ٹکڑا، وہ نثر پارہ ہو

پروین شاکر

روبینہ کی ڈائری سے

کلیم عاجز کی شاعری میں روایتی غزل کا عکس بھی نظر آتا ہے اور جدت کے رنگ بھی یہ چیز ان کی شاعری کو موجودہ دور کے شاعروں سے علیحدہ مقام دیتی ہے۔ ان کی یہ غزل آپ سب کی نذر۔

یہ ہنسی خوشی کا موسم، یہ بہار کا زمانہ
تیرے واسطے حقیقت، میرے واسطے فسانہ

تیری بات سب نے مانی، تیرا حال سب نے جانا
میرے دل کی دھڑکنوں سے رہا بے خبر زمانہ

نہ سنبھل سکی تجھ سے تیری زلف کا یہ شانہ
میں ابھی سے دیکھتا ہوں جو دکھائے گا زمانہ

میری خانہ خرابی کا جہاں میں ہے فسانہ
یہ وہ حادثہ تھا جس کو نہ بھلا سکا زمانہ

نگاہ باغباں میں کچھ اور ہو گیا ہوں
ابھی چار دن ہوئے ہیں، جلا ہے آشیانہ

تجھے اے غم محبت، ادھر آ گلے لگا لوں
نہ تیرا کہیں گزر ہے نہ مرا کہیں ٹھکانہ

میں ہوں وہ غریب عاجز کہ گلوں کی انجمن میں
میرے پیراہن کے ٹکڑوں کا بنا ہے آشیانہ

سحر احمد کی ڈائری سے

چھوٹی بحر کی غزل کہنے میں جون ایلیا کا جواب نہیں۔ وہ اپنی غزلوں میں روزمرہ محاوروں کا استعمال بڑی خوبی سے کرتے ہیں۔ ان کی یہ غزل پڑھیے آپ کو پسند آئے گی۔

زخم امید بھر گیا کب کا
قیس تو اپنے گھر گیا کب کا

اب تو منہ اپنا مت دکھاؤ مجھے
ناصحوا میں سدھر گیا کب کا

آپ اب پوچھنے کو آئے ہیں
دل مری جان! مر گیا کب کا

آپ اک اور نیند لے لیجیے
قافلہ کوچ کر گیا کب کا

میرا فہرست سے نکال دو نام
میں تو خود سے مکر گیا کب کا

حبیبہ جان کی ڈائری سے

ہماری معاشرتی اقدار جس تیزی سے تبدیل ہو رہی ہیں۔ اس تبدیلی کو قبول کرنا آسان نہیں، اسی لیے بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں۔ اظہر عنایتی کی یہ غزل ان ہی جذبوں کی عکاس ہے۔

جب تک سفید آندھی کے جھونکے چلے نہ تھے
اتنے ہمارے پیڑوں کے پتے گرے نہ تھے

اظہار پر تو پہلے بھی پابندیاں نہ تھیں
لیکن بڑوں کے سامنے ہم بولتے نہ تھے

ان کے بھی اپنے خواب تھے، اپنی ضرورتیں
ہمسائے کا مگر وہ گلا کاٹتے نہ تھے

رہتے تھے داستانوں کے ماحول میں مگر
کیا لوگ تھے کہ جھوٹ کبھی بولتے نہ تھے

اظہر میرے بزرگ اٹھاتے تھے جب ہاتھ
اپنے لیے ہی صرف دعا مانگتے نہ تھے

زینب ظفر کی ڈائری سے

میری ڈائری میں بھی "شمشاد پرنم" کی یہ نظم آپ سب کی نذر ہے۔

شام کی خنکی کیسی ہے

چھت پر پھیلا سرمئی سکون، سرمدی آسمان!
اور میرے دھیان کا سفید کبوتر......
انجانی منڈیر پر جا بیٹھا ہے
آج پرندے کہاں گئے ہیں
سارے جیسے روٹھ گئے ہیں
اور میری چشم تخیل کی آغوش میں یادوں کا بھورا سا صندوق
ڈھکن اٹھایا اور سنہری دھند کے ہلکے ہلکے بادل
میرے چاروں سمت میں جیسے پھیل گئے ہیں
جیسے خوشبو..... جیسے جادو یاد کے کوہ قاف سے آ کر خواب کی پریاں
میرے گرد گھیرا ڈالے بیٹھ گئی ہیں
پریوں کی گلابی شفاف ہتھیلیوں پر آرزو کی سبز حنا سے
سرخ مہکتے رنگوں میں یہ کیا لکھا ہے میں کیا جانوں
شام میں رات کے تارے کہاں سے آ بکھرے ہیں
ایسے تارے؟ اتنی خوشبو؟ اتنی خنکی؟
دھیان سے چونک کے دیکھا تو..... میں چھت پر تنہا بیٹھی تھی

آمنہ زاہد کی ڈائری سے

میری ڈائری میں موجود "مبشر ہوا" کی میری پسندیدہ غزل آپ سب قارئین کی نذر۔

یقین و گماں بیچ کہیں اٹکا ہوا لگا
وہ شخص اب ملا تو بھٹکا ہوا لگا

لہجہ جو تھا کبھی کسی سمندر سا موجزن
لہجہ بھی اس کا ٹھہرا ہوا لگا

خود بھی کبھی میں گزرا تھا کسی ایسے کرب سے
سو آج مجھے یہ سب بھی دیکھا ہوا لگا

پھر اس سے ہو گئی مجھے محبت ایک بار
کہ وہ شخص مجھ کو مجھ سا ہی ٹوٹا ہوا لگا

مجھ سے گلے ملا وہ بڑے ضبط سے ہوا
لیکن وہ دل کی دھڑکنوں سے رویا ہوا لگا

☆☆

آپ کا باورچی خانہ

ثمن لیاقت

س۔ کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟ پسند ناپسند غذائیت یا گھر والوں کی صحت؟

ج۔ میں کوئی بھی ڈش بناؤں اپنے بچوں کی پسند کا خصوصی دھیان رکھتی ہوں۔ کوشش یہی ہوتی ہے کہ کھانا ٹیسٹی اور غذائیت سے بھرپور ہو۔ کھانا خوش رنگ بھی ہو تو کیا بات ہے؟ میرے شوہر چند مخصوص ڈشز ہی پسند کرتے ہیں ان کی چوائس کے مطابق علیحدہ کھانا بنتا ہے۔

س۔ گھر میں اچانک مہمان آگئے ہیں کھانے کا وقت ہے ایسی ڈش جو فوری تیار ہو جائے؟

ج۔ گھر میں کبھی اور کسی وقت بھی مہمان آجائیں۔ میں بالکل نہیں گھبراتی ماشاءاللہ پکانے کی اسپیڈ اتنی ہے کہ مشکل سے مشکل کھانا بھی منٹوں میں تیار۔ کوفتوں کی ایکسپرٹ ہوں لیکن یہاں ایک آسان ڈش کی ترکیب لکھ رہی ہوں۔ جو اچانک مہمان آنے پر پیش کی جاسکے۔

چکن پلاؤ

چکن	ایک کلو
چاول	تین پاؤ
پیاز	ایک عدد
لہسن ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	ایک چمچہ
لال مرچ	ایک چمچہ
ہلدی	ایک چٹکی
گرم مسالا	کھانے کا چمچہ
دہی	ایک پیالی
ٹماٹر، ہری مرچ	حسب ضرورت
گھی	حسب ضرورت

ترکیب:۔

چکن کو فرائی کرکے رکھ لیں۔ اب ایک دیگچی میں گھی گرم کرکے پیاز کاٹ کر ڈال دیں براؤن ہونے پہ ادرک لہسن پیسٹ ڈال کر تھوڑا بھونیں پھر پانی کا چھینٹا دے کر اس میں ٹماٹر، ہری مرچ کاٹ کر ڈال دیں۔ نمک، سرخ مرچ، ہلدی، دہی اور گرم مسالا ڈال کر بھونیں جب دہی نظر نہ آئے تو اس میں چاولوں کے مطابق یعنی تین گلاس چاول ہیں تو پانچ گلاس پانی ڈال دیں۔ ابال آنے پر چاول ڈال دیں۔ جب ایک کنی رہ جائے فرائی کیا ہوا چکن ڈال کر دم پہ رکھ دیں۔ دس منٹ بعد مزے دار چٹپٹا چکن پلاؤ تیار ہے۔ رائتے اور سلاد کے ساتھ پیش کریں۔

س۔ کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے؟ آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟

ج۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ بکھری ہوئی چیزیں ساتھ ساتھ سمیٹتی جاؤں، یہ عادت اس حد تک

ہے کہ صائمہ (چھوٹی بہن) کہتی ہے ابھی چیزیں استعمال کرنی تھیں بیگم صاحبہ نے اٹھا کر رکھ بھی دی ہیں۔ صفائی کا خبط تو ہے مگر حتی الامکان کوشش یہی ہوتی ہے کہ کچن صاف رہے۔

س۔ صبح کا ناشتہ بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے آپ ناشتے میں کیا بناتی ہیں؟

ج۔ ناشتہ جسم کے لیے پیٹرول کی سی اہمیت رکھتا ہے۔ میں ناشتے میں بچوں کو انڈا، پراٹھا یا سینڈوچ بنا کر دیتی ہوں ہم میاں بیوی رات کے سالن کے ساتھ پراٹھا کھانا پسند کرتے ہیں۔ لیکن چھٹی کے دن ایک خاص چیز ضرور بناتی ہوں ترکیب لکھ رہی ہوں۔

وائٹ پراٹھا

میدہ	تین پیالی
آٹا	ایک پیالی
میٹھا سوڈا	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
انڈا	ایک عدد
دودھ گرم (ابلا ہوا)	ایک پیالی
گھی یا آئل	آدھی پیالی سے کچھ کم

ترکیب:۔

میدے اور آٹے میں نمک، میٹھا سوڈا، گھی، انڈہ ڈال کر گرم دودھ سے گوندھ لیں۔ پھر نارمل سائز کے پیڑے بنا کر روٹی بیل لیں۔ توے پہ روٹی کی طرح پکائیں۔ بہت لذیذ اور خستہ وائٹ پراٹھے تیار ہو جاتے ہیں۔ چنے کے سالن یا کسی بھی سالن کے ساتھ کھا سکتے ہیں۔

س۔ گھر سے باہر کھانا فیشن بنتا جا رہا ہے۔ آپ مہینے میں کتنی بار کھانا کھانے باہر جاتی ہیں؟

ج۔ اکثر تو نہیں، مگر کبھی کبھار باہر کھانا کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ ہم بھی کسی خوشی کو سیلیبریٹ کرنے کے لیے کھانا تو نہیں مگر فاسٹ فوڈز وغیرہ کھانے چلے جاتے ہیں۔

س۔ کھانا پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کو مدنظر رکھتی ہیں؟

ج۔ پکوان کا مزہ موسم کے مطابق ہی آتا ہے۔ سردیوں میں گاجر کا حلوہ۔ گجریلا، مچھلی کے پکوڑے کافی کے ساتھ اور گرمیوں میں مختلف فروٹ کے ملک شیک اور کدو کا حلوا بنا کر، موسم کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔

س۔ اچھا کھانا بنانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں؟

ج۔ ہر وہ کھانا جو محنت اور پیار سے پکایا جائے بہت لذیذ بنتا ہے۔ میں بہت محنت اور شوق سے کھانا بناتی ہوں آپ اسے میری ہابی بھی کہہ سکتے ہیں۔ رضا اور جنید (میرے بھائی) کہتے ہیں، آپ کے لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ منٹوں میں محنت طلب کھانا بنا کر داد وصول کر سکتی ہیں۔

س۔ کچن کی کوئی ٹپ؟

ج۔ ہرے پتوں والی سبزیاں، بالخصوص ہرا دھنیا اور پودینہ اگر اخبار میں لپیٹ کر فریج میں رکھ دیں تو بہت دیر تک فریش رہتا ہے۔ ورنہ یہ چیزیں نمی سے گل جاتی ہیں۔

☆☆

موسم کے پکوان

واصفہ سہیل

ویجی ٹیبل منچورین

ضروری اشیاء

چھوٹے آلو	آدھا کلو
گوبھی	آدھا کلو
گاجر	ایک کپ
شملہ مرچ	ایک کپ
بینگن	ایک کپ
ہری مرچیں	چھ عدد
چکن کیوبز	دو عدد
کیچپ	ایک کپ
انڈے	چار عدد
گڑ	ایک چائے کا چمچہ
کارن فلور	حسب ذائقہ
سفید مرچ	ایک چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت
کالی مرچ	حسب ذائقہ
اناناس کا رس	ایک کپ
نمک	حسب ذائقہ
لہسن	ڈیڑھ چائے کا چمچہ

ترکیب:

انڈے میں نمک، کالی مرچ اور کارن فلور ڈال کر بیٹر بنا لیں۔ آلو، گوبھی، گاجر، شملہ مرچ اور بینگن باری باری اس میں ڈپ کر کے فرائی کر لیں۔ جب سبزیاں گولڈن براؤن ہو جائیں تو نکال کر کچن پیپر پر پھیلا لیں۔ ایک چمچہ تیل گرم کر کے اس میں لہسن ڈال کر ساتے فرائی کریں۔ اس کے بعد اس میں کیچپ، چکن کیوب، گڑ، سفید مرچ، کالی مرچ، اناناس کا رس ڈال کر پکائیں، گاڑھا کرنے کے لیے ایک چمچہ کارن فلور پانی میں گھول کر ڈالیں اور اچھی طرح پکانے کے بعد اس میں سبزیاں ہری مرچیں ڈالیں، اچھی طرح گرم کر کے اور منچورین کو چاول یا چپاتی کے ساتھ سرو کریں (سوس میں نمک اگر چاہیں تو ڈالیں ورنہ چکن کیوب میں نمک موجود ہوتا ہے۔)

چکن مکھنی

ضروری اشیاء

مرغی	آدھا کلو
دہی	ایک کپ
نمک	حسب ذائقہ
سفید مرچ	ایک چائے کا چمچہ
ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
تیل	دو کھانے کے چمچے
مکھن	دو کھانے کے چمچے
ٹماٹر پیوری	ڈیڑھ کپ
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
چکن کیوب	ایک عدد
ٹماٹر	ایک عدد
کھیرا	ایک عدد
ہرا دھنیا	حسب ضرورت
کریم	تین کھانے کے چمچے

ترکیب:

مرغی میں دہی، نمک، سفید مرچ، ادرک، لہسن لگا کر ایک گھنٹہ رکھیں، اس کے بعد چکن کو گرل کر لیں۔ ایک پین میں مکھن، تیل، پسے ٹماٹر، نمک، لال مرچ، چکن کیوب ڈال کر پکائیں۔ تھوڑا پکانے کے بعد گرل کی ہوئی چکن ڈالیں اور دو منٹ پکائیں۔ آخر میں ہرا دھنیا اور کریم چھڑک دیں۔ چکن مکھنی تیار ہے۔



لائبہ ایمن ——— آزاد کشمیر

میں کہیں خود کو مار آیا ہوں
میرے ذمے قصاص ہے میرا

فاکہہ سہیل ——— کراچی

بچھڑا تھا سال بھر کا جو پل بھر میں کھو گیا
میں رو پڑی تو اس نے گلے سے لگا لیا

نمرہ ثاقب ——— گرین سٹی

کمان جس پہ رہا منزلوں کا ایک مدت
وہ رہگزار بھی منزل پہ لا کے بھول گیا
اب اس سے بڑھ کے بھی طرز تغافل کیا ہو
کہ تجھ کو زیست کا حاصل بنا کے بھول گیا

اریبہ، زینب ——— کراچی

جن کے لیے چراغ سر شام جل گئے
دنیا کے ساتھ وہ بھی نگاہیں بدل گئے

ندا طارق ——— فیصل آباد

روز مل کے بھی کم نہیں ہوتا
دل میں وہ فاصلہ ہے برسوں سے
کس پتے پر اسے تلاش کروں
شخص اک کھو گیا ہے برسوں سے

سحر سہیل ——— کراچی

تیری شرطوں پہ ہی کرنا ہے اگر تجھ کو قبول
یہ سہولت تو مجھے سارا جہاں دیتا ہے

اقرا انس سندھو ——— گوجرہ

اک طرف طلب تیری، اک طرف زمانہ ہے
پوچھتا ہے دل مجھ سے کس طرف کو جانا ہے
آتشیں ہے لہجہ بھی، گفتگو بھی بارودی
سوچیے شفیق، اس سے کس طرح نبھانا ہے

عائشہ ——— محراب پور

آشنا درد سے ہونا تھا کسی طور ہمیں
تو نہ ملتا تو کسی اور سے بچھڑے ہوتے

صدف عمران ——— اسلام آباد

میں بار غم اٹھا سکتی ہوں تنہا
میرے شانے پہ رکھ دے ہاتھ کوئی

آسیہ جاوید ——— علی پور چٹھہ

محبت میں ذرا سی بے وفائی ضروری ہے
وہی اچھا۔ لگتا ہے جو وعدے توڑ دیتا ہے

سعدیہ خان ——— کوئٹہ

پہلے شکوہ تھا یہاں رونق بازار نہیں
اب جو بازار کھلے ہیں تو خریدار نہیں
سب کے ہاتھوں میں یہاں زہر کا پیالہ ہے مگر
کوئی سچ بولنے کے واسطے تیار ہی نہیں

تحریم فاطمہ ——— خان پور

یہاں برسے گی اب کرنوں کی بارش
کہ بادل آسمان سے چھٹ گیا ہے
بہت دشوار تھا منزل کا رستہ
خدا کا شکر، لیکن کٹ گیا ہے

حبیبہ خان ——— کراچی

امروز کا پردہ ہو، ماضی ہو کہ فردا ہو
اک بھید انوکھا ہے، اک راز یہ گہرا ہے

نشاء ادریس ——— کراچی

مجھ کو تجھ میں جگہ نہیں ملتی
تو ہے موجود اس قدر مجھ میں

صائمہ شہزاد ——— حیدرآباد

نرم الفاظ، بھلی باتیں، مہذب لہجے
پہلی بارش ہی میں یہ رنگ اتر جاتے ہیں

نادیہ یاسر ——— گوجر خان

فضا معطر ہے، ہوا ہے خنک
یقیناً یہ رستہ تیرے گھر کا ہے

بقیہ ہمارے نام

بڑھنے کا رجحان تقریباً ختم ہی ہو گیا ہے۔ اگر میں اپنی بات کروں تو میں بھی اسی یوتھ میں شامل ہوں مگر ایک ایسا پلیٹ فارم تھا۔ جس نے مجھے "ادب" کے ساتھ جوڑے رکھا۔ بالکل صحیح سمجھے آپ بلاشبہ وہ پلیٹ فارم "خواتین" ہی تو ہے۔

اگر بات 2024ء کے پہلے شمارے کی بات کی جائے۔ تو سروے میں واقعی نیا سال امید کی کرن لایا ہے۔ مگر شاید ایک لحاظ سے میرے لیے نہیں میں نے ایک افسانہ صراط مستقیم بھیجا تھا۔

اتنی محنت کے بعد نہ شائع ہو تو دکھ کرنا حق تو بنتا ہے ناں۔ "مجھ سے ملیے" میں غنی نام کچھ مختلف سا لگا۔ "سروے" میں اپنے جوابات سب سے زیادہ اچھے لگے (ہاہاہی ہی)

افسانوں میں "کھرا سکہ" بہت معصومانہ سا لکھا ہے عارفہ فضل شاہ نے۔ ویری گڈ ڈیر۔ "گماں دل کے" کیونکہ صغریٰ بیگم جیسا برتاؤ کرنے والے لوگوں کا علاج قدرت نے اپنے پاس رکھا ہوتا ہے۔ "غزل" ندیم صاحب نے خوب لکھی بہت پسند آئی۔

"احد" اسٹوری اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے اب اس کے بعد سمیرا حمید یا عمیرہ احمد سے لکھوایئے گا۔ "اسیر یہاں" کو آسیہ رئیس نے بہت حساس ہو کر لکھا اچھی کہانی تھی۔

"چلو تم کو بتاتے ہیں" نگہت سیما نے ہمیشہ کی طرح اچھا لکھا۔

"ففففففف" نمرہ احمد ان کی بہت بڑی مداح ہوں۔ نفسیاتی الجھنوں میں عدنان صاحب نے شبانہ عظیم کو بے حد مفید مشورے سے نوازا ہے جو کہ "رنگ نگار پھول" میں آپ پر واجب نہیں سے مشابہہ ہے، جزاک اللہ "نفسیات کہتی ہے" تیسرا پوائنٹ خاص پسند آیا۔

"خود سے بات کیے بھی اب تو زمانے ہو جاتے ہیں۔"

ج: پیاری سعدیہ! واقعی یہ دکھ کی بات ہے کہ آپ نے محنت کی اور آپ کا افسانہ شائع نہیں ہوا لیکن آپ کو ہمت نہیں ہارنا چاہیے۔ کوشش کرتی رہیں کامیابی ضرور ہو گی۔

آپ کا افسانہ تلاش بسیار کے باوجود نہیں ملا۔ آپ نے افسانہ ای میل کیا تھا یا ڈاک سے بھجوایا تھا؟ اور یہ بھی بتائیں کہ کب بھجوایا تھا؟

نصرت جبیں ملک......خوشاب

آج سے تقریباً آٹھ سال پہلے تک میں خواتین کی باقاعدہ قاری رہی ہوں۔ مارکیٹ میں ابھی خواتین ڈائجسٹ آتا بھی نہیں تھا کہ دو تین مرتبہ چکر لگایا کرتی کہ شاید اب آ گیا ہو پھر بی بی سی اردو کے بیورو چیف پاکستان اختر سمو صاحب نے ڈیلی جناح میں میرا کالم دیکھا تو انہوں نے رابطہ کیا کہ آپ ہمارے اخبار میں کالم لکھیں۔

چنانچہ بی بی سی اردو کا حصہ بنی تو وقت کی کمی کی وجہ سے اپنے پیارے خواتین ڈائجسٹ سے دوری پیدا ہو گئی حالات کی گردش میں محبت دب جاتی ہے، مصروفیت کے رش میں پس پشت چلی جاتی ہے مگر مر نہیں سکتی۔ سردیوں کی ٹھٹھرتی رات میں مجھے خواتین ڈائجسٹ کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگی کہ جب کڑک چائے کا ایک دھواں اڑاتا کپ، گرم بستر، خاموشی اور اس میں خواتین ڈائجسٹ کا ساتھ ضرور تھا۔

سو دوبارہ سے یہ تعلق بحال کرنے کا فیصلہ کیا اور فوراً 15 نومبر کو خواتین کی سالانہ خریدار بن گئی۔

سرورق پر پیاری سی حسینہ موجود تھیں سب سے پہلے مستقل سلسلوں کو پڑھا۔ سب ہی دلچسپی سے بھرپور تھے پھر افسانوں کی طرف گئے تو فاتحہ رابعہ نے "گمان دل کے" میں ان لوگوں کی عکاسی کی جو خود پسندی اور تکبر کا شکار ہوتے ہیں۔ انہیں خبر نہیں ہوتی کہ وہ اپنے ذات کے جس بناوٹی خول میں قید ہیں، دنیا اس سے بے پرواہ ہو کر پورے جوش سے رواں دواں ہے۔ "کھرا سکہ" میں عائشہ فضل نے معصوم اور سادہ دل لوگوں کو اجاگر کیا۔ واقعی دوہرے معیار والے

معاشرے میں فیکا جیسے کردار کی گنجائش کم ہی ہوتی ہے گوشی جمال کے بارے میں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ وہ اپنی دکان خود چلاتی ہیں، یہ عورتوں کی ہمت کی ایک اچھی مثال ہے۔ باقی افسانے اور ناول ابھی پڑھ رہی ہوں کیونکہ میں اس ماہ کے آخر تک اس تڑکے سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہوں۔

ج: پیاری نصرت! بہت خوشی ہوئی یہ جان کر کہ خواتین ڈائجسٹ سے آپ کا ٹوٹا رشتہ پھر استوار ہو چکا ہے۔ آپ کے افسانے موصول نہیں ہوئے، آپ دوبارہ ای میل کر دیں۔

ایچ ایس ایچ......سمبڑیال

کیا یہ زیادتی نہیں کہ انتظار کی سولی پہ لٹکتے رہتے ہیں پورا مہینہ اور پھر خط ہی نہ شامل ہو تو کیا بیتتی ہے ۔ہم نے تو سوچ لیا تھا کہ پھر خاموشی اوڑھ لی جائے لیکن پھر ہمیں مجبور کیا تو ریحانہ چوہدری کے سروے نے، ان کی شاعری کا انتخاب بہت بھایا۔ ریحانہ جی کی شاعری نے اچھا اثر ڈالا۔

اب بات ہو جائے صوفیہ بٹ کے ناول "احد" کی تو شکر ہے احمل اور اسود کی شادی ہو جاتی ہے۔ احمل کی ماما پہ بڑا ترس آیا، ماں بچوں کی خوشی کے لیے کیسے کیسے طوفانوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ اور مجھے لگتا ہے کہ ہمایوں کو بھی اس کی محبت واپس مل جائے گی۔ نگہت سیما کے ناول کا بھی مزہ آیا "اسیر پیاں" آسیہ رئیس کا ہر بار کی طرح شاندار بیسٹ ناول تھا۔

افسانے سارے کے سارے ہی بیسٹ تھے "یادیں باتیں" کا بہت مزہ آیا انشاء جی اور اے حمید کے بارے میں پہلے بھی پڑھا تھا، جس میں اے حمید اپنی فرینڈ کے بارے میں بتاتے ہیں، وہ بھی پڑھ کر بہت ہنسے تھے، راحت جی کے ناول میں کہانی خوب صورتی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے راحت جی اب جلدی سے ارم اور عفان کی شادی کروا دیں اور وسیم اس کے بارے میں کیا کہیں، ایک ہی بات کہہ سکتے ہیں کہ اصل سے خطا نہیں اور کم اصل سے وفا نہیں "میری بیاض سے" زرینہ خانم لغاری، ارم کمال، نمرہ عاقب اور نایاب سندھو کی شاعری بہت پسند آئی۔

ج: پیاری بہن! آپ کا خط شامل نہ ہو سکا۔ آپ کی ناراضی بجا ہے لیکن ہماری مجبوری بھی اپنی جگہ ایک بڑی حقیقت ہے۔ ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ سارے خط شامل ہوں لیکن پچھلے ماہ چونکہ سروے بھی شامل تھا اس لیے خطوط کے حصے میں کم صفحات آئے۔

حسنہ حسین پاکستانی ہیں۔

طیبہ شوکت......مرید کے

ٹائٹل گرل بہت پیاری تھی حمد و نعت سے دل کو منور کیا۔ میں ٹھہری چودہ سالہ بچی اب اسے ہر ماہ کون 500 دے تین سو ڈائجسٹ پہ لگ جاتے ہیں سو روپیہ کرایہ اور سو روپیہ خط پوسٹ کا اس لیے ہر ماہ میں خط پوسٹ نہیں کر سکتی، اب آتے ہیں تبصرے کی طرف ،انگنا پھول کھلیں گے میں ثانیہ خودسر کو جتنی بھی محبتیں مل جائیں اس نے کبھی خوش نہیں ہونا۔ صوفیہ جی......کیا تعریف کروں آپ کی، رہ رہ کے مومنہ پہ غصہ آتا اور افسوس کی بات یہ ہے کہ آپی، میری نیچر بھی ایسے ہی ہے مجھے بھی امیر لوگ پسند ہیں، مالا تو مجھے اب کچھ زیادہ پسند آ گیا کیونکہ اب۔

ماہر اور مالا کی ملاقات جو ہونے لگی ہے مکمل ناول تو مزہ ہی دے گیا، افسانے سب ہی کمال کے میں نے کچھ ماہ پہلے کتابی شکل میں من وسلویٰ پڑھا تھا مگر آخری صفحہ پڑھنے سے پہلے ہی پھٹ گیا، کیا واقعی زینب اور کرم علی مرجاتے ہیں اور ہاں عدنان بھائی کے مجھے مشورے بہت پسند ہیں۔

ج: پیاری طیبہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے اتنی کم عمری کے باوجود بہت اچھا خط لکھا ہے من وسلویٰ میں زینب مرجاتی ہے لیکن کرم علی زندہ رہتا ہے۔

☆☆

عنبرین



حالات بدلنا کس حد تک انسان کے اختیار میں ہے اور کس حد تک مقدر پر منحصر ہے۔ اس بحث سے قطع نظر صرف ایک بات کہنا ہے کہ اگر برے حالات میں ہمت ہار دی جائے تو حالات زیادہ برے ہو سکتے ہیں۔ ہمیں ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بھی زیادہ مشکلات میں گرفتار کر سکتا ہے۔ جب اللہ ہر چیز پر قادر ہے تو آخر میں ہر چیز کا نتیجہ بہتر ہی ہوگا۔ پھر پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

تمام ماہرین علم اور ماہرین نفسیات محسوس کرتے لگے ہیں کہ نماز اور مستحکم مذہبی عقیدہ، پریشانی، ڈر، خوف اور اعصابی کشمکش کو دور کرنے میں مدد دیتا ہے جو کہ ہماری نصف سے زیادہ بیماریوں کے ذمہ دار ہیں۔

"جو شخص صحیح معنوں میں مذہب کا پابند ہوتا ہے، کبھی اعصابی اور ذہنی امراض کا شکار نہیں ہوتا۔"

ایک ماہر نفسیات کا کہنا ہے "پریشانیوں کا شاہی علاج مذہب ہے۔"

ہمارے خیالات و تصورات ہماری شخصیت کا آئینہ دار ہیں۔ اگر ہم خوشی اور مسرت کے خیالات رکھیں تو ہم خوش اور مسرور رہ سکتے ہیں لیکن اگر اپنے خیالات کو بیمار بنالیں یعنی خیالات کا انداز ایسا ہو جس میں ناکامی، بزدلی، یاسیت اور قنوطیت ہو تو یقینی طور پر ہماری کیفیت بھی ایسی ہی ہو جائے گی۔

جہاں تک مسائل کا معاملہ ہے، ہمیں اپنے مسائل پر دھیان تو ضرور دینا چاہیے لیکن پریشان ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

ذہنی پریشانی دور کرنے کا بہترین حل یہ ہے کہ سب کچھ اللہ پہ چھوڑ دیں۔ یہ کہ یقین رکھیں کہ اللہ جو کچھ کرے گا بہتر کرے گا اور جو کچھ آج تک ہوا ہے اس میں اللہ کی کوئی بہتری ہوگی۔ یہ یقین آپ کی ساری پریشانیاں دور کردے گا۔

شمائلہ انجم

س: میری عمر بیس سال ہے۔ میرے والدین نے میری شادی کی بات پکی کر دی ہے، اس کو تقریباً دو سال گزر گئے ہیں، مجھے اپنے منگیتر سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی وہ سیدھا سادا سا کاروباری انسان ہے۔ شکل و صورت بھی بری نہیں، مجھے وہ پہلے برا نہیں لگتا تھا لیکن اب جبکہ تین مہینے بعد میری شادی ہونے والی ہے۔ وہ زہر لگنے لگا ہے۔

وجہ ہے الف جو بری طرح ہر وقت میرے حواسوں پر سوار رہتا ہے۔ وہ لوگ ہمارے سامنے والے گھر کے اوپری حصے میں کرائے دار کی حیثیت سے آئے ہیں۔ وہ شخص سحر انگیز شخصیت کا مالک ہے اس کا مسکرانا، بات کرنا اور مجھے دیکھنا، اب مجھے لگتا ہے کہ میں اپنے منگیتر سے شادی نہیں کر سکتی۔ الف بھی شاید مجھے پسند کرتا ہے لیکن میں کس طرح اپنا حال دل اس تک پہنچاؤں۔ میری ساس اور امی دونوں کپڑوں کے سلسلے میں میری رائے پوچھتی رہتی ہیں۔ گھر میں شادی کی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ پر میرا دل کسی بات میں نہیں لگتا۔ جی میں آتا ہے کہ صاف انکار کر دوں اس شادی سے۔

میں نے کئی بار اس سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن یہ بھی تو اچھا نہیں لگتا کہ میں لڑکی ہو کر پہل کروں۔ شاید وہ بھی کسی موقع کا منتظر ہے۔

امی، ابو، بھائی، بھابھی سب گھر والے میری شادی کے حوالے سے بہت خوش ہیں کہ میں اس گھر کی اکلوتی لڑکی ہوں لیکن کوئی میری خوشی کے بارے میں کیوں نہیں سوچتا، کئی بار اپنے گھر والوں کی خود غرضی پر بھی غصہ آتا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔

ج: عزیز بہن! جو کچھ آپ سوچ رہی ہیں، یہ سراسر حماقت اور نادانی ہے۔ اس شخص کو اگر آپ میں دلچسپی ہوتی یا وہ آپ کے لیے سنجیدہ ہوتا تو اپنے گھر والوں کو بھیج کر رشتہ کی بات کرتا۔ اس طرح مسکراتا ہو دیکھنا۔ بات کرنے کی کوشش کرنا صرف وقت گزاری کا مشغلہ ہے اور اس کے کردار کی کمزوری کہ وہ ایک کم عمر لڑکی کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ سنجیدہ لوگ ایسی حرکتیں نہیں کرتے۔ وہ سیدھے راستوں سے رسائی حاصل کرتے ہیں۔ ابھی آپ بہت کم عمر ہیں۔ آپ کی سوچ ناپختہ ہے۔ ان ہتھکنڈوں کو سمجھ نہیں سکتیں۔ ذرا سوچیں کیا اس نے آپ سے پسندیدگی کا اظہار کیا؟ آپ کے گھر والوں سے رشتہ کی بات کی؟ پھر کس بنا پر آپ اپنے منگیتر سے بیزار ہیں۔ اس معاملے میں پہل کرنے کی ہرگز کوشش نہ کریں۔ اس کا نتیجہ صرف رسوائی ہے۔

س، حور شمائل۔ حیدر آباد

میں اپنے گھر کی بڑی بیٹی ہوں مجھ سے چھوٹے تین بہن بھائی ہیں۔ میرے والد ایک معروف اخبار کے لیے کام کرتے تھے اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں ایک اسکول میں نوکری کرتی ہوں میرا رجحان سیاست کی جانب ہے۔

جب سے الیکشن کا اعلان ہوا ہے مجھ پر ایک ٹینشن سی سوار ہے۔ میری اپنی ساتھی ٹیچرز سے اکثر بحث ہوتی ہے اور بات بہت آگے بڑھ جاتی ہے۔ اس وجہ سے میری ساتھی مجھ سے کترانے لگی ہیں۔

میری والدہ مجھے بہت سمجھاتی ہیں کہ اپنی جاب پر توجہ دو، کل کو تمہیں دوسرے گھر جانا ہے، یہ سیاسی جنگیں تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائیں گی لیکن میرا اپنا موقف ہے کہ ہمیں اپنے ملک کی ترقی کے لیے سوچنا چاہیے اور آگے بڑھ کر کام کرنا چاہیے۔ میری خالہ جو میری ہونے والی ساس بھی ہیں، وہ بھی میرے سیاسی تبصروں اور بحث سے خائف رہتی ہیں۔ میں کیا کروں؟ کیا میں اپنے لب سی لوں۔ کیا اپنے ملک کو برباد ہوتا دیکھوں؟

ج: عزیز بہن آپ کا موقف غلط نہیں ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کے موقف کو غلط سمجھتی ہوں۔ موجودہ حالات میں خاموشی ہی بہتر ہے۔ جب انسان دوسرے کی بات ہی نہ سننا چاہے۔ بحث کرنا، یا کسی موضوع پر بات کرنا بے کار ہے۔ آپ اپنی بات ضرور کہیں لیکن نرمی سے کہیں، ان سے کہیں کہ ممکن ہے میں غلطی پر ہوں لیکن میرا خیال یہ ہے اپنا موقف بتا کر خاموش ہو جائیں۔ ویسے زیادہ بہتر ہے کہ سیاست پر بات ہی نہ کریں۔ آپ کی کولیگز کو سیاست سے چڑ نہیں ہے۔ آپ کے موقف سے چڑ ہے۔ ظاہر ہے آپ اپنا موقف نہیں بدل سکتیں تو پھر اس موضوع سے اجتناب ہی بہتر ہے۔

ایک ضروری بات، اپنی خالہ سے تو ہرگز بحث نہ کریں۔ وہ صرف آپ کی خالہ نہیں ہونے والی ساس بھی ہیں۔ رشتوں میں کھٹاس نہیں آنا چاہیے۔

☆☆

امتہ الصبور

بیوٹی بکس

فرحت حسین......ساہیوال

س: میری جلد چکنی ہے، جاتی سردی کا موسم ہے چہرے کی تازگی کے لیے کوئی اچھا سا اور کیننگ ماسک بتادیں؟

ج: سردی کے موسم میں جلد کے لیے انڈے کا استعمال بہترین ہے یہ خشک اور چکنی جلد کے لیے بہترین ہے۔ انڈے کی زردی میں فیٹی ایسڈ ہوتے ہیں جو جلد کو نمی پہنچاتے ہیں۔ سفیدی میں البومن نامی پروٹین ہوتا ہے، جو مسامات کو کھلنے نہیں دیتا آپ کی جلد خشک ہے۔ آپ ایک انڈا لے کر پھینٹ لیں۔ اسے آدھا کرلیں پھر اس میں ایک چمچہ شہد ڈال کر مکس کرلیں۔ یہ ماسک چہرے اور گردن پر لگالیں۔ جب خشک ہوجائے تو گرم پانی سے دھولیں۔

فریحہ نسیم......ملتان

س: سردیوں میں نہانے کے بعد میری جلد خشک اور روکھی ہوجاتی ہے میں کیا کروں کوئی آسان علاج ہے؟ میری عمر بیس سال ہے۔

ج: سرد موسم جلد کو خشک اور روکھا کردیتا ہے۔ ہر بار چہرہ یا ہاتھ منہ دھونے کے بعد موئسچرائزنگ لوشن ضرور استعمال کریں۔ اپنی جلد کو موائسچرائزر کے ذریعے غذا فراہم کرنے سے نا صرف آپ خشکی اور روکھے پن سے محفوظ رہ سکتی ہیں، بلکہ آپ کی جلد پر عمر رسیدگی کے اثرات، جھریاں بھی قبل از وقت نمودار نہیں ہوں گی۔ گلیسرین ایک اعلا قسم کی موئسچرائزنگ ایجنٹ ہے ایک بوتل میں گلیسرین اور پانی ہم وزن لے کر مکس کرلیں۔ آپ اس محلول کو اپنے ہاتھوں، پیروں اور چہرے کی جلد پر بطور موئسچرائزر استعمال کر سکتی ہیں۔

سردیوں میں زیادہ گرم پانی جلد کے لیے نقصان دہ ہے۔ اگر نہانے کے پانی میں چند قطرے زیتون یا بادام کا تیل ڈال لیں تو غسل کے بعد بھی آپ کی جلد، خشکی اور روکھے پن کا شکار نہیں ہوگی۔ بال دھونے کے لیے بھی نیم گرم پانی استعمال کریں۔

نیلما فراز......کوٹ رادھا کشن

س: میری بیٹی کی اسکن بہت مرجھائی ہوئی ہے جس کی وجہ سے اپنی ہم عمر لڑکیوں میں اس کی شخصیت دب جاتی ہے، ابھی میٹرک میں ہے، میں اس کی جلد کے لیے بہت پریشان ہوں؟

ج: آپ کی بیٹی ابھی اسکول میں ہے۔ وہاں دھوپ وغیرہ میں کھیلنے سے بھی جلد پر اثر پڑتا ہے۔ آپ مہنگی کریم اور لوشن کے بجائے آپ غذا سے اس کا علاج کریں۔ ابھی سردیاں ہیں آپ سبزی اور پھل کا استعمال کروائیں۔ اس عمر میں بچیاں تلی ہوئی تیز مصالے والی چیزیں پسند کرتی ہیں، آپ انہیں رسیلے پھلوں کو کھانے کی عادت ڈالیں۔ انار کھلائیں جلد شاداب اور تروتازہ رکھنے میں انار کا کوئی ثانی نہیں اناس میں وٹامن سی کا خزانہ ہے۔ یہ جلد کو قدرتی طور پر صاف وشفاف بناتا ہے، کیلے میں موجود پوٹاشیم نمی سے محروم جلد کو تر کرتا ہے اس میں موجود وٹامن ای اور سی جلد کو چمک دار بناتے ہیں۔ شریفہ کھلائیں اس میں موجود وٹامن اے اور سی جسم میں موجود فری ریڈیکلز سے مقابلہ کرتے ہیں۔ یہ جلد کو قدرتی طور پر نمی فراہم کرتا ہے۔ یہ ایک بہترین قدرتی اسکرب بھی ہے۔ پپیتے میں وٹامن اے کے علاوہ ایسے انزائم پائے جاتے ہیں۔ جو جلد کو چمک دار بناتے ہیں۔ بطور اینٹی اکسیڈنٹ کام کرتا ہے۔

☆☆